خدابخش لائبریری

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر : ۳۳۴۲۲/۷۷ | قیمت فی شمارہ : پندرہ رُپے

شمارہ : چھتیسواں | سالانہ : ۶۰ رُپے (ہند)

قیمت : پندرہ رُپے | ۱۲ ڈالر (ایشیا)، ۲۴ ڈالر (دیگر ممالک)

۱۹۸۶ء

فہرست

اردو غزل : ۱۹۴۰ کے شعرا کے تناظر میں

محبوب حسین نے پٹنہ لیتھو پریس، رمنا لین، پٹنہ اور لبرٹی آرٹ پریس دہلی سے چھپوا کر خدا بخش لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا۔

ایڈیٹر : عابد رضا بیدار

اردو غزل

۱۹۴۰ کے شعرا کے تناظر میں

پچھلے سال ۱۹۴۰ء تک کی غزل کا ایک بھرپور تعارف خدابخش جرنل نے اپنی ایک خصوصی پیش کش کے ذریعہ کرایا تھا۔ اس میں دسمبر ۱۹۴۲ء تک جو شعرائے متغزلین زندہ تھے انھوں نے اپنی خود نوشت اور اپنا انتخاب کلام نیاز کی فرمائش پر ان کے رسالے کے لیے عطا کیا تھا (ہم نے اس کے ساتھ، ہر شاعر کی اسی عہد کی ایک تصویر اور ہر ایک کی ایک آٹوگراف غزل / تحریر اس میں مزید شامل کر دی)۔ اس مجموعے کو پیش نظر رکھ کر اس عہد کے پانچ بڑے نقادوں آل احمد سرورؔ، کلیم الدین احمد، مجنوں گورکھپوری، تاثیر اور نیاز (بشمول فراق سے اس کے قبل کے اصل نمبر کے اندر ہی) نے نئی غزل پر بھرپور تبصرہ کیا تھا۔ یہ تبصرہ جنوری ۱۹۴۲ء میں نگار کا ایک خاص نمبر بن کر نکلا۔ غزل گو دستاویز کی پیش کش کے بعد ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کا تتمہ بھی غزل کے حسن شناسوں کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔

بار دگر ہماری غزل پر اردو کے بڑے ناقدوں کے یہ دستاویزی تبصرے پیش کرتے ہوئے خیال آیا کہ نامناسب نہ ہوگا اگر ۱۹۴۱ء سے ۱۹۸۵ء تک غزل نے جو سفر طے کیا ہے اس پر ایک گزراں نظر ڈال کر کم سے کم اس سفر کے سنگ میل گنتے چلیں۔ اس کیلیے پس گفتار کے عنوان سے پچھلے ۴۵ سال کی جاندار اور رجحان ساز غزل کے نمونے اس مجموعۂ نگارین کے آخر میں دیے جا رہے ہیں۔

▲▲

بزم نگار

(پروفیسر کلیم الدین احمد - پٹنہ یونیورسٹی)

(۱)

موجودہ شعرائے متغزلین اور ان کی غزلوں کی ادبی اہمیت کی تنقید سے پہلے صنف غزل کے امکانات و حدود کی وضاحت ضروری ہے۔ غزل پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے لیکن کہیں اس کے امکانات و حدود کی تشفی بخش تشریح نہیں ملتی ہیں اس مسئلہ کے بعض اہم پہلوؤں پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

انسان ہمیشہ انسان نہ تھا۔ اس نے ارتقا کی کتنی منزلیں طے کر کے مہذب انسان کا درجہ حاصل کیا ہے۔ ان منزلوں میں سے ایک منزل بربریت ہے۔ اس منزل سے انسان گزرتا ہے لیکن گزر نہیں جاتا یعنی تہذیب کے زینہ پر پہونچ کر بھی وہ بربریت سے نجات نہیں پاتا۔ کم از کم اسوقت تک اس نے بربریت سے نجات نہیں پائی ہے۔ موجودہ جنگ یورپ اس کی روشن مثال ہے۔ بہر کیف، بربریت اور تہذیب میں مشرقین کا فرق ہے۔ اور اس فرق کی سمجھ بھی تہذیب کی ایک نشانی ہے۔ وحشی اپنے جذبات کے وجود کو ان کے وجود کی کافی وجہ سمجھتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کی ماہیت اور ان کے اسباب کو نہیں سمجھتا اور نہ ان کی غرض و غایت کو پہچانتا ہے احساسات و اعمال کو وہ غور و فکر پر ترجیح دیتا ہے۔ فطری خواہشوں کی تکمیل اس کی نظروں میں اصل زندگی ہے۔ زندگی کے زور اور پھیلاؤ کی وہ قدر کرتا ہے جوش کی شدت، جذبات کے ہیجان میں اسے مسرت آتی ہے لیکن زندگی کے مقصد کا وہ سراغ نہیں لگاتا اور نہ زندگی کی "صورت" پر غور و فکر کرتا ہے۔ کمزوری اور کمی کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور جو چیزیں "رفعتوں کی حامل" ہیں انھیں وہ نہیں پہچانتا۔ مہذب انسان محض اپنے جذبات کے وجود کو کافی نہیں سمجھتا۔ وہ جذبات و احساسات کی تہذیب و تربیت کرتا ہے۔ ان کے اسباب اور ان کی غرض و غایت کو سمجھتا ہے۔ حسیات و اعمال پر وہ فہم کو ترجیح دیتا ہے۔ اپنی انفرادی زندگی اور حیات انسانی کے مقصد کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور دونوں کے تصور میں "صورت" کا حسن اسے جزئی حسن سے زیادہ محظوظ کرتا ہے اور جذباتی اور دماغی توازن کو اپنی زندگی کا مدعا قرار دیتا ہے۔ یہ بربریت اور تہذیب کا فرق آرٹ میں بھی نظر آتا ہے۔ وحشی اپنے آرٹ میں مواد کی زیادتی اور اس کی شوکت پر زور دیتا ہے۔ جزئیات کے حسن کو تو وہ سمجھ سکتا ہے لیکن "صورت" کے حسن اور تکمیل سے بے اعتنائی برتتا ہے۔ مہذب آرٹ کی بنیاد فہم و ادراک پر ہے جو قدر و قیمت میں پر جوش تجربات سے بلند تر ہیں وہ اپنے جذبات الگ تھلگ رہ کر دیکھتا ہے اور ان پر غور و فکر کرتا ہے اور وقتی طور پر وہ قارئین کو بھی اپنی بلند سطح پر پہنچا دیتا ہے اور انھیں حسیات سے نجات دلا کر غور و فکر سے شناسا کرتا ہے۔

بربریت کی فطرت انسان میں اسوقت تک کار فرما ہے اور ذرا سی تحریک پر یہ تہذیب کے حلقوں کو توڑ کر باہر نکل آتی ہے۔ اسی طرح بعض اصناف ادب میں بھی بربریت کا عنصر موجود ہے وحشی و نیم وحشی صنفیں مختلف مشرقی و مغربی ادبوں میں پائی جاتی ہیں۔ غزل بھی ایک نیم وحشی صنف ادب ہے یہ حقیقت اس قدر بیّن ہے کہ مزید تشریح کی ضرورت نہ ہوتی اگر اردو انشا پردازوں میں غور و فکر کی عادت عام ہوتی۔ غزل کی "صورت" ناقص ہے۔ وحشی اپنے آرٹ میں "صورت" اور اس کی تکمیل کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ وہ اپنے جذبات و خیالات کی تربیت نہیں کرتا اور انھیں ترکیب دیکر ایک متناسب و موزوں صورت کی تخلیق بھی نہیں کرتا۔ اسے "صورت" کے حسن کا تصور محظوظ نہیں کرتا اور وہ اسے دوسرے عناصر سے الگ تصور نہیں کر سکتا۔ جزئیات یا مختلف عناصر کے حسن کو وہ الگ الگ دیکھتا ہے اور اسی جزئی حسن کے مشاہدہ میں وہ اسی قدر منہمک ہو جاتا ہے کہ پھر اور کسی شے کی طرف اس کی توجہ منعطف نہیں ہوتی جزئیات کے حسن اور اس حسن کے احساس کو وہ کافی سمجھتا ہے۔ اسے یہ ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی کہ مختلف اجزا آپس میں ملکر ایک حسین، پیچیدہ اور مکمل اتحاد پیش کریں۔ غزل میں مختلف عناصر ترکیب پا کر مکمل صورت کی تخلیق نہیں کرتے۔ ہر شعر کی تاثیر تنہا مقابلہ کے اگر دیکھا جائے تو یہ حقیقت صاف نظر آسکتی کہ غزل کا

صوری حسن ہمارے دماغ کو جمالیاتی تسکین نہیں بخشتا۔ اگر ہر شعر کو مکمل اور ایک مختصر نظم تسلیم کر لیا جائے تو بھی غزل میں صوری حسن کا فقدان ہوگا اور غزل کی صورت ایک ایسے مجموعہ کی ہوگی جس میں مختلف نظمیں اکٹھا کی گئی ہوں۔ "نگار" کے صفحہ ۴۳ پر یہ پانچ شعر ملتے ہیں :۔

تکیہ کلام ہی سہی۔ رشک سے مر رہا ہوں میں ——— کیوں کہو بات بات پر "دیکھو بھلا سا نام ہے"

ادب لاکھ تھا پھر بھی اس کی طرف ——— نظر سو سیری اکثر بہکتی رہی،

قاصد پیام ان کا نہ کچھ دیر ابھی سنا ——— رہنے دے محو لذت ذوق خبر مجھے

جب کہا اس نے دعا سے کہئے ——— سوچتے رہ گئے کہ کیا کہئے

جانتا ہوں کہ نشیمن نہیں باقی صیاد ——— کچھ بھی اک لطف خلشِ حسرت پرواز میں ہے

یہ اشعار مختلف غزلوں سے چنے گئے ہیں، یہ ہم وزن، ہم قافیہ اور ہم ردیف نہیں لیکن ہر شعر کا مطلب صاف ظاہر ہے اور انھیں سمجھنے کے لئے غزل کے دوسرے اشعار سے واقفیت ضروری نہیں۔ یہ شعر کا مفہوم اور اس کے حسن کا احساس غزل کی "صورت" پر مبنی نہیں۔ غزل میں صوری حسن کا عدم ہے اور "صورت" کا احساس ایک دھوکا ہے۔ اگر غزل میں یہ حسن موجود ہوتا تو پھر یہ اشعار اس طرح غزل سے الگ نہیں کئے جا سکتے تھے اور اگر انھیں الگ کیا جاتا تو پھر ان کے حسن کا زیادہ حصہ مفقود ہو جاتا۔ زیادہ تفصیل کی ضرورت ہے نہ گنجائش۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ وہ "حسن صورت" جو نظم، افسانہ، ڈرامہ وغیرہ کی لازمی صنفی خصوصیت ہے غزل میں موجود نہیں۔ غزل کے ہر شعر میں کسی مخصوص جذبہ یا خیال کا اظہار مدنظر ہوتا ہے۔ سارے احساسات و تصورات مرتب و مرکب ہو کر ایک نقش کامل کی شکل میں جلوہ گر نہیں ہوتے۔ نہ اس نقص کی وجہ سے ہر احساس یا خیال اور اس کا وجود، اس کا اظہار کافی سمجھا جاتا ہے۔ یہی اس صنف کے نیم وحشی ہونے کی دلیل ہے۔ یہاں ایک غلط فہمی کا احتمال ہے جسے رفع کر دینا مناسب ہے۔ یہ بات تو ثابت ہو چکی کہ غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہر غزل گو شاعر بھی نیم وحشی ہے۔ ممکن ہے کہ غزل گو شاعر نے اپنے جذبات کی تربیت و تہذیب کی ہو اور وہ جذباتی و دماغی توازن کا حامل ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے اپنی انفرادی زندگی اور حیات انسانی کا مقصد اور ان کی انتہا سمجھنے کی کوشش کی ہو یعنی بہت ممکن ہے کہ وہ مہذب ہو لیکن جب وہ صنف غزل میں اس کے مخصوص، وصاف کو قایم رکھتے ہوئے طبع آزما ہوگا تو نتیجہ ایک نیم وحشی کارنامہ ہوگا۔ غزل اس الزام سے اسی وقت بری ہوگی جب یہ غزل باقی نہ رہے بلکہ نظم کی صورت اختیار کر لے۔

غزل سے قطع نظر، اگر ہر شعر کو ایک مکمل نظم تصور کیا جائے تو شعر پر بھی نیم وحشی صنف شاعری ہونے کا الزام عائد ہوگا۔ شاعر کی قوت حاسہ مختلف اثرات قبول کرتی اور انھیں ترتیب و ترکیب دیتی رہتی ہے۔ لیکن شعر مفرد کے مختصر پیانہ میں کسی پیچیدہ جذباتی یا تخیلی تجربہ کے سمانے کی گنجائش نہیں۔ شعر میں کسی ایک جذبہ یا خیال یا جزئی مشاہدہ کی ترجمانی البتہ ممکن ہے، لیکن ان کی ابتدا، ان کی غرض و غایت، ان کا دوسرے جذبات، خیالات، و مشاہدات سے تعلق، یہ سب چیزیں ایک شعر میں سما نہیں سکتیں۔ وحشی اپنے وقتی جذبہ کے وجود، اس کے احساس اور اس کی تسکین کو کافی تصور کرتا ہے۔ اسے ماضی و استقبال کی اسوقت مطلق فکر نہیں رہتی۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ یہ وقتی جذبہ اس کی انفرادی زندگی کی تکمیل میں مد یا مخل ہوگا۔ وہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی نہیں کرتا اور یہ بھی نہیں دیکھتا کہ اس کی تسکین سے دوسروں کو نفع یا نقصان پہنچے گا۔ جس طرح وہ اپنی زندگی میں ہر خواہش کو عملی شکل دینے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح وہ اپنے ہر شعر میں کسی وقتی احساس کی ترجمانی کرتا ہے اور اس ترجمانی سے اس کے جمالیاتی ذوق کی تسکین ہو جاتی ہے۔ یہی وقتی تسکین اس کی جمالیاتی کاوشوں کا مقصد ہوتی ہے۔ وہ نہ غور و فکر کرتا ہے! اور نہ غور و فکر اس کے بس کی بات ہوتی ہے۔ وہ محض ایک اضطراری کیفیت سے مجبور ہو کر اس سے فوری نجات چاہتا ہے اور یہ نجات وہ صورت شعر میں حاصل کرتا ہے۔ انسان جب ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہے اور بربریت کی قلمرو سے گزر کر تہذیب کی سرحد میں قدم رکھتا ہے تو وہ وحشیانہ عناصر سے کنارہ کش ہو جاتا ہے یا انھیں عناصر میں تغیر و تبدل کر کے اپنی مہذب زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ وہ نئی زندگی کی نئی ضرورتوں کے لئے نئے ساز و سامان کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ یہ وحشیانہ عناصر بالکل ناپید نہیں ہو جاتے اور وہ تہذیب کے زینوں پر پہونچ کر بھی ان سے کام لے سکتا ہے اور انسے محدود قسم کا لطف اٹھا سکتا ہے اور ایسا لطف جو اس کی دماغی و جذباتی ہستی کو کامل تشفی نہیں بخشتا۔ یہ تشفی اسے نظم سے حاصل ہوتی ہے جو نظم میں فوری اضطراری کیفیت یا جزئی مشاہدہ کی ترجمانی نہیں ہوتی۔ جس تجربہ کا بیان ہوتا ہے وہ قیمتی، اہم اور پیچیدہ ہوتا ہے اور اس کی ترجمانی میں غور و فکر سے کام لیا جاتا ہے۔

بہرکیف، اگر شعرِ مفرد کو نظم کی طرح مکمل سمجھا جائے اور اس کو اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا مصرف بنایا جائے تو یہ بھی ایک نیم وحشی صنفِ شاعری ہوگا اور کسی تہذیب یافتہ دماغ کو اس سے پوری تسکین نہیں مل سکے گی۔ مثلاً:

ادب لاکھ تھا پھر بھی ان کی طرف
نظر میری اکثر بھٹکتی رہی

اس شعر میں محض ایک واقعہ کا بیان ہے۔ ادب کے باوجود بھی شاعر "اس کو" دیکھتا رہا۔ اگر یہ شعر کسی ایسے شخص کے سامنے پڑھا جائے جس کے ذہن میں دنیائے تغزل کا پہلے سے کوئی نقشہ موجود نہیں تو اسے اس شعر کا مفہوم سمجھنے میں مطلق نہ آئے گا۔ ادب تھا تو کیوں تھا اور کس شخص کا تھا؟ اگر "ادب لاکھ تھا" تو پھر نظر کیوں بھٹکتی رہی؟ اگر نظر بھٹکتی رہی تو پھر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ اس نامکمل اور بظاہر غیر متعلق واقعہ کے بیان سے شاعر کا کیا مدعا ہے؟ اس قسم کے سوالات اسکے دماغ میں آسکتے ہیں۔ اس شعر کا مطلب سمجھنے کے لئے دنیائے تغزل سے واقفیت ضروری ہے۔ اردو غزلیں اور جو خیالات ان میں ملتے ہیں وہ ہمارے شعور میں اس شعر یا کسی شعر کی عقبی زمین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ عقبی زمین موجود ہے تو پھر شعر کا مفہوم نہایت آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔ شاعر کسی پر والہ و شیدا تھا وہ معشوق کا ادب کیا کرتا تھا۔ ایک روز کسی جگہ کسی محفل میں وہ معشوق کے دیدار سے شادکام ہوا۔ اسے پاس ادب تو بہت تھا لیکن عشق کے ہاتھوں مجبور! وہ بار بار معشوق کے حسن سے اپنی آنکھوں کو بہرہ ور کرتا رہا۔ اس سے بے ادبی مقصود نہ تھی۔ نظر کا بھٹکنا عشق کے زور اور حسن دلربا کی کشش کا نتیجہ تھا۔ اس تشریح سے یہ مطلب نہیں کہ کسی شعر کا مفہوم سمجھنے میں دیر ہوتی ہے یا اس کے لئے غیر معمولی ادراک یا بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہیں۔ جتنی زمین ہمارے شعور میں موجود رہتی ہے اس لئے مطلب فوراً ذہن نشین ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی پوری تسکین نہیں ہوتی۔ اس شعر میں گویا ایک غیر متعلق واقعہ کی ترجمانی کی گئی ہے۔ شعری "صورت" ناقص اور تکمیل کی محتاج ہے۔ "صورت" کے ساتھ ساتھ نفس واقعہ یا تجربہ بھی تکمیل کا محتاج ہے۔ اسے دوسرے تجربوں کے ساتھ ترکیب دے کر کسی حسین، قیمتی اور پیچیدہ نقش کی تخلیق نہیں کی گئی ہے۔ اس شعر سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی شاعر کی جذباتی دنیا میں کیا اہمیت ہے اور اس نئے تجربے نے موجودہ تجربوں کی ترکیب و ترتیب میں کیا تغیر و تبدل کیا۔ یہاں صرف ایک اضطراری کیفیت کا بیان ہے جس کی غرض و غایت سے شاعر کو کوئی بحث نہیں۔ اس لئے شعرِ مفرد بھی نیم وحشی صنفِ شاعری ہے۔

(۲)

غزل اور شعرِ مفرد نیم وحشی صنفِ شاعری ہونے کی وجہ سے کسی تہذیب یافتہ دماغ کو کامل تسکین نہیں بخشتے۔ اس کا سبب غزل کی پراگندگی اور شعرِ مفرد کی تنگ دامانی اور دونوں میں تکمیل کا فقدان ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شعر و غزل کے امکانات کیا ہیں اور ان میں کس قسم کے تغیر و تبدل کی ضرورت ہے۔ شعر و غزل میں پہلے صرف حسن و عشق کی جلوہ گری تھی لیکن اب حسن و عشق کے علاوہ بھی موضوعات داخلِ غزل کئے جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی "معیارِ تغزل" سننے میں آجاتا ہے اور اس معیار کا تعلق عموماً اسلوبِ بیان سے ہوتا ہے۔ مضمون اور اسلوبِ بیان میں ناگزیر ربط ہے۔ اگر مضمون کا دائرہ وسیع ہوگا تو پھر اسلوبِ بیان بھی نت نئی شکلیں اختیار کرے گا۔ لیکن مضامینِ غزل میں کچھ زیادہ تغیر ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ وہی پرانے خیالات کچھ نئے رنگ میں جلوہ گر ہیں۔ "بزم نگار" پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہونچ جائے گی۔ جب نئے مضامین داخلِ غزل کئے جاتے ہیں تو عموماً تنوعِ مضامین کو کافی سمجھ کر فنی اصول سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ بہرکیف، اب شعرِ مفرد کے امکانات کو لیجئے۔ ہر قسم کے تصورات، جذبات، مشاہدات، واقعات موضوعِ شعر ہو سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ انھیں تخیلی تجربہ کی شکل میں تبدیل کیا گیا ہو۔ اس نقطۂ نظر سے شعر کے حدود غیر محدود ہیں۔ اس کے حدود اور انسانی تجربات کے حدود متحد ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ شعر میں تجربوں کے ٹکڑے نظر آتے ہیں لیکن یہ ٹکڑے بے قیمت نہیں ہوتے۔ اشعار میں انسانی تجربات کا جزوی بیان ممکن ہے اور اس بیان سے ہم محظوظ بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور خاطر رہے کہ اشعار صحیح معنوں میں اشعار ہوں اور محض لفظی ردو بدل کا کرشمہ نہ ہوں۔ یعنی ان میں ذاتی یا تخیلی تجربات کا بیان ہو۔ اشعار میں اصلیت کا وجود ضروری ہے۔ خیالات بلند، جذبات پرجوش، مشاہدات دلچسپ ہوں لیکن اگر وہ رگ و پے میں محسوس نہیں کئے گئے ہیں تو پھر وہ کامیاب اشعار کی صورت میں جلوہ گر نہیں ہو سکتے۔ ہاں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اشعار میں "احساس بلند و لطیف" کی کارفرمائی ہے تو پھر ان سے مخصوص و محدود قسم کا سرور حاصل ہو سکتا ہے۔ میں نے غالب کے اشعار کی خصوصیت کے سلسلہ میں لکھا تھا۔ "اگر دریا کے کنارے کھڑے ہو کر کوئی شخص نظارہ کرے تو اکثر سطح دریا پر سکون نظر آئے گا پھر اگر وہ ایک پتھر کا ٹکڑا اٹھا کر پھینک مارے تو سطح دریا پر ایک لہر نمودار ہوگی، یہ لہر دوسری لہروں کو بیدار کرے گی۔ لہروں کا دائرہ بڑھتا جائے گا۔ ایک جنبش

کی کیفیت نمایاں ہوگی اور یہ لہریں پیچیدہ پیچیدہ نظر سے غائب ہو جائیں گی“ ضرور ہمارے دل و دماغ میں اسی قسم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے لیکن جس نے اس نظارہ کا مشاہدہ کیا ہے اس نے یہ بھی ضرور محسوس کیا ہوگا کہ اس نظارہ میں کچھ کمی ہے جسے وہ محسوس تو کرتا ہے لیکن جس کی بنا ہمارے کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر وہ غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ یہ نظارہ نامکمل، غیر متعلق اور بے معنی تھا اور اسی وجہ سے اسے کامل آسودگی نہیں ہوئی تھی۔ اشعار میں بھی ہم غیر شعوری طور پر یہی کمی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن جس طرح اس نظارہ سے ہم وقتی طور پر محظوظ ہوسکتے تھے اسی طرح اشعار سے بھی ہم مسرور و محظوظ ہو سکتے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شعر میں انسانی تجربات کا جزئی بیان ہے تو چند اشعار میں ان کا مکمل بیان ممکن ہے۔ لیکن یہ اشعار اگر انھوں نے صورت نظم نہیں اختیار کی ہے، یہ کسی تجربہ کے مکمل بیان پر قادر نہیں۔ اگر کوئی شخص موٹر یا ریل پر کسی حسین و دلفریب جگہ سے گزر جائے تو اس کے دماغ میں اس جگہ کے فطری مناظر کی مکمل تصویر مرتب نہیں ہو سکتی۔ چند جزئیات البتہ اس کے ذہن میں محفوظ رہیں گی اور اس جگہ کے فطری حسن کا ایک مبہم و غیر متعین نقش بھی حافظہ پر ثبت ہو سکتا ہے۔ بجنسہ یہی کیفیت ہوگی اگر ہم چند اشعار پڑھیں وہ صورت غزل میں ہوں یا مختلف غزلوں سے منتخب ہوئے ہوں نتیجہ واحد ہے۔ کسی ملک کے دیکھنے کا یہ طریقہ نہیں کہ ہم اس کے مختلف حصوں سے تیزی کے ساتھ گزر جائیں۔ اس کام کے لئے صرفِ وقت، غور و فکر، مفصل مشاہدہ، مختلف حصوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ پھر اس ملک کا دوسرے ملکوں سے تقابل، یہ سب چیزیں ضروری ہیں۔

اب ذرا غزل کو لیجئے۔ یہ اپنی موجودہ شکل میں قبیل سی صنف معلوم ہوتی ہے۔ یہ متفق علیہ ہے کہ غزل میں مختلف اشعار مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ دو مثالیں ملاحظہ ہوں (”نگار“ صفحہ ۸۱) :-

(۱)
میری وحشت بھی تماشا ہو گئی — جو ادھر گزرا ادھر آ دیکھا کیا،
آج ہی آ جو تجھ کو آنا ہے — کل خدا جانے میں ہوا نہ ہوا
مزے لیں گے ہم دیکھ کر تیری آنکھیں — انھیں خوب تر نامہ بر دیکھ لینا

(۲)
یہ رنگ گلاب کی کلی کا — نقشہ ہے کسی کی کمسنی کا
بلبل کی بہار مس نہ پوچھ — منہ چومتی ہے کلی کلی کا
منہ پھیر کے یوں چلی جوانی — یاد آ گیا روٹھنا کسی کا

پہلی مثال میں تین شعر مختلف غزلوں سے انتخاب کئے گئے ہیں۔ بحریں، قوافی، ردیفیں سب جداگانہ ہیں۔ دوسری مثال میں تینوں شعر ایک ہی غزل کے ہیں اور چونکہ بحر ایک ہے اس لئے انھیں پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ لیکن ان کے ہم وزن، ہم قافیہ، ہم ردیف ہونے سے ان کے شعری حسن میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ طبیعت غزل کی اس قدر خوگر ہو چکی ہے کہ یہ چاہتی ہے کہ اشعارِ غزل ہم وزن، ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوں اور اسے پہلے تین شعر پڑھنے میں دقت محسوس ہوگی۔ اسی افتادِ طبیعت کی وجہ سے مطلع و مقطع کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلی مثال کے اشعار ویسے ہی موثر ہو سکتے ہیں جیسے دوسری مثال کے۔ ممکن ہے کہ احساسِ ترنم کو کچھ صدمہ پہونچے لیکن ترنم بجائے خود قابلِ قدر نہیں۔ اس کا حسن اشعار کے معنوی و لفظی حسن سے وابستہ ہے۔ بہرکیف، اگر چند اشعار کو اکٹھا کر کے انھیں غزل سے تعبیر کیا جائے تو کوئی حقیقی فرق نہ ہوگا۔ یعنی لفظ غزل محض ایک نشان ہے۔ جس کا اطلاق چند اشعار کے مجموعہ پر ہو سکتا ہے اور اگر ان اشعار کا ہم وزن، ہم قافیہ، ہم ردیف ہونا لازمی نہ سمجھا جائے تو پھر غزل کے ایک نقص کو رفع کیا جا سکتا ہے یعنی بھرتی کے اشعار اور قافیہ پیمائی سے کس حد تک نجات مل سکتی ہے لیکن پھر بھی ہر بیت کا عنصرِ غزل سے رفع نہ ہوگا۔ غزل کا یہ نقص آسانی سے مٹایا جا سکتا ہے۔ غزل گو شعرا نے دو ناکامیاب ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ مربوط و مسلسل غزل اور قطعہ لیکن مختلف اسباب کی وجہ سے یہ دونوں صورتیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ ان اسباب کی تشریح یہاں ضروری نہیں۔ ”صورت“ نتیجہ ہے ہمارے طرزِ احساس کا اور جب تک یہ نہ بدلے اس وقت تک ”صورت“ میں کامیاب تغیر ممکن نہیں۔ تہذیب یافتہ انسان اپنی نئی زندگی کی جذباتی اور دماغی ضرورتوں سے مجبور ہو کر ”حسنِ صورت“ کی تلاش کرتا ہے اور اسے اپنی زندگی اور اپنے آرٹ میں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جب تک وہ اسے حاصل نہیں کر لیتا اسے تشفی نہیں ہوتی۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اُردو شعرا کو اس ”حسنِ صورت“ کی تلاش ہے تو پھر وہ بآسانی اس تلاش میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ بیش قیمت، پیچیدہ، مکمل تجربے رکھتے ہیں، اگر وہ مختلف

احساسات و تصورات و نقوش کو ترکیب دیکر ایک نقش کامل بنانے کی قدرت رکھتے ہیں تو وہ غزل ہی میں بغیر سطحی تغیر کے اپنی ضرورتیں پوری کر سکتے ہیں۔ اس حالت میں اشعار غزل ایک دوسرے سے بے نیاز نہ ہوں گے بلکہ ایک دوسرے کے محتاج، غزل میں ارتقائے جذبات و خیالات کا وجود ہوگا اور شاعر کا مطلب سمجھنے کے لئے پوری غزل کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ لیکن غزل کی روایتی عقبی زمین میں پراگندگی اس قدر مستحکم ہوگئی ہے کہ شاید ایک معمولی شاعر غزل کی روایتی صورت کو قایم رکھتے ہوئے کامیاب نہ ہوسکے۔ اگر مطلع و مقطع کی قید اُٹھا دیجائے تو یہ صحیح راستہ میں پہلا قدم ہوگا۔ لیکن یہ کافی نہیں۔ مختلف ترکیبیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ ایک ترکیب یہ کہ غزل میں قوافی کا التزام مثنوی کے طرز پر ہو، جیسے انگریزی میں کپلٹ کہتے ہیں۔ لیکن بہتر یہ ہوگا کہ قوافی کی ترکیب شاعر کے مذاق صحیح پر چھوڑ دی جائے۔ وہ جذبات و تصورات، ترنم، فن کی ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے قوافی کی ترتیب کی طرف متوجہ ہوگا اور مختلف غزلوں میں مختلف ترتیب نظر آئے گی نتیجۃً "حسن صورت" ہو اور اس "صورت" میں ارتقائے جذبات و خیالات کا مکمل اظہار ہو، اس نتیجہ کے حصول کے لئے مختلف ذرائع استعمال کئے جاسکتے ہیں۔

(۳)

"بزم نگار" میں منتخب اشعار ہیں نہ کہ منتخب غزلیں۔ چند اشعار کے مجموعہ کا نام غزل ہے۔ اس لئے غزلوں کے انتخاب سے کوئی خاص فرق محسوس نہ ہوتا، بہرکیف اشعار کی جانچ آسان نہیں۔ عروض و زبان کی خامی پر، اگر نقاد کو عروض و زبان کا علم ہے، آسانی سے گرفت کی جاسکتی ہے۔ پُرانی تنقید کی بنیاد عروض و زبان کی خامی کے انکشاف پر قایم ہوئی تھی۔ پُرانی تنقید اب بھی نظر آجاتی ہے لیکن اب یہ احساس ہو چلا ہے کہ اُصول عروض، قواعد زبان الہامی نہیں اور نئی ضرورتیں ان اُصول و قواعد میں تغیر و تبدل پیدا کرسکتی ہیں اور جس طرح حیات میں اُصول ارتقا کی کارفرمائی ہے اسی طرح ان اُصول و قواعد میں بھی ارتقا کی گنجایش موجود ہے۔ اگر وقتی طور پر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اشعار میں اُصول عروض و قواعد زبان کی پابندی کی گئی ہے، تو پھر پرانے رنگ کے نقاد کے لئے اچھے اور بُرے اشعار کی تمیز مشکل ہوگی اور اگر اسے اچھے بُرے کے فرق کا احساس ہے تو بھی وہ اس فرق کے احساس اور اس احساس کے سبب کو کامیابی کے ساتھ بیان کرنے پر قادر نہ ہوگا۔ کیونکہ ان اُصول و قواعد کے علاوہ وہ اور کسی معیار سے آشنا نہیں۔ اس نے شاعری کی ماہیت، اس کے اغراض و مقاصد سے شناسائی حاصل نہیں کی ہے۔ اس نے شاعری کی جانچ پرتال کے لئے صاف و متعین معیار بہم نہیں پہونچائے ہیں اس لئے وہ اپنی پسند و ناپسند کا اظہار "سبحان اللہ"، "استغفراللہ" جیسے مبہم و غیر متعین الفاظ سے کرتا ہے۔ اگر اسے یہ پسند و ناپسند کے اظہار کا طریقہ پسند نہیں ہوتا تو وہ کچھ زیادہ ہمت کرتا ہے اور الفاظ کے در و بست، بندش کی چستی، محاورات کی خوبی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور حُسن الفاظ کو شعر کی کامیابی کی دلیل سمجھتا ہے۔ کبھی کبھی الفاظ سے گزر کر معانی پر بھی نظر ڈالتا ہے اور نازک خیالی یا پسندیدہ اخلاقی یا فلسفیانہ مضامین کی تعریف میں رطب اللسان ہوتا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں حسین الفاظ یا بلند خیال کی موجودگی کسی شعر کی خوبی کی دلیل نہیں۔ شعر میں کسی ذاتی یا تخئیلی تجربہ کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اگر اس تجربہ نے شاعر کے دل و دماغ میں تلاطم خیزی کی ہے، اگر یہ تجربہ قیمتی ہے اگر اس کا اظہار حسین ترین الفاظ و موزوں ترین بحر میں کیا گیا ہے تو شعر کامیاب ہوگا ورنہ ناکامیاب۔ حُسن الفاظ یا ترنم بحر کے متعلق آسانی سے رائے زنی کی جاسکتی ہے اور عموماً لفظی خوبصورتی اور ترنم کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ تجربہ کی اصلیت اور قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہے اس لئے اس طرف توجہ کم ہوتی ہے اور شاید اس طرف توجہ کی ضرورت بھی نہیں سمجھی جاتی۔ زیادہ تر اردو شاعری کے مروجہ جذبات و خیالات کو سطحی تغیر کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اس لئے اصلیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ محض اسلوب بیان کی جانچ کے بعد شعر کی کامیابی یا ناکامیابی کے متعلق فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ شعر کا پیمانہ اس قدر مختصر ہے کہ اس کے پرکھنے کے لئے غیر معمولی باریک بین نظر کی ضرورت ہوتی ہے نظم میں اگر کوئی کمی ہوتی ہے، اگر تجربہ یا اس کی ترجمانی میں کوئی نقص رہجاتا ہے تو اس کا پتہ نسبتاً آسانی سے مل سکتا ہے لیکن اچھے بُرے اشعار کی تمیز حساس طبیعت اور باریک بین نظر ہی کرسکتی ہے مثلاً یہ پانچ شعر غالباً کامیاب سمجھے جائیں گے:-

کیا بتاؤں دل کہاں ہے اور کس جا درد ہے — میں سراپا دل ہوں دل میرا سراپا درد ہے (ناطق لکھنوی)

عدو سے وعدہ کیا وعدہ کرکے ٹال گئے — چلو وہ اب بھی بہت بات کو سنبھال گئے (ناطق گلاؤٹھی)

نکھر آئی نکھار آئی سنور آئی سنوار آئی — گلوں کی زندگی لے کر گلستاں میں بہار آئی (نوح ناروی)

ادھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا — پھر ان کی طرف اک نظر دیکھ لینا (اثر لکھنوی)

شمع مزار تھی نہ کوئی سوگوار تھا — تم جس پہ رو رہے تھے یہ کس کا مزار تھا (بیخود دہلوی)

جہاں تک زبان، نشست الفاظ، صفائی، چستی، روانی کا تعلق ہے سب ہی اچھے شعر سمجھے جاسکتے ہیں لیکن اگر قالب سے قطع نظر کرکے روحِ شاعری کی طرف توجہ مبذول کی جائے تو پھر ان شعروں کی اچھائی اس آسانی سے تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً پہلے شعر کو لیجئے۔ شاعر اس حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ دردِ عشق نے اسے سراپا درد بنا دیا ہے۔ اگر اس نے واقعی یہ کیفیت محسوس کی ہوتی تو یہ شعر تاثیر سے لبریز ہوتا۔ لیکن اس میں مطلق اثر نہیں کیونکہ اصلیت نہیں اور ہر حساس طبیعت فوراً معلوم کرلیتی ہے کہ شاعر نے محض چند الفاظ کو تصنع سے کام لیکر اکٹھا کردیا ہے لیکن اس کا دل درد آشنا نہیں یعنی الفاظ کے قالب میں روحِ جذبات کی مطلق جلوہ گری نہیں۔ اگر نقاد کی طبیعت سریع الحس اور نگاہ باریک بیں ہے۔ اگر وہ شاعری کے کامیاب نمونوں سے واقف ہے تو پھر اسے اس شعر کی ناکامیابی کے متعلق فیصلہ کرنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ یہی فیصلہ وہ بغیر کسی تاخیر کے دوسرے شعر کے متعلق بھی صادر کرے گا۔ اس شعر میں تو کسی قسم کی خوبی نہیں اور اگر یہی شاعری ہے تو پھر اس سے جس قدر جلد کنارہ کشی کی جائے بہتر ہے۔ ایک مبتذل مضمون کو مبتذل پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اور بس۔ اس قسم کے اشعار دنیائے تغزل میں بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ تیسرے شعر میں حسنِ الفاظ کچھ زیادہ جاگزیں ہے۔ مضمون تو وہی پرانا گل و بہار کا قصہ ہے۔ پہلے شعر میں مضمون داخلی تھا یہاں خارجی ہے لیکن جس طرح پہلے شعر میں ذاتی احساس کی کمی تھی، اس شعر میں ذاتی مشاہدہ کی کمی ہے۔ اگر اردو غزلوں کے مضامین سے واقفیت ہے تو پھر گل و بہار کے ذکر کے لئے کسی ذاتی مشاہدہ کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوگی۔ بہرکیف پہلا مصرعہ:- "نکھر آئی نکھار آئی سنور آئی سنوار آئی"، کسی مشاعرے میں خراجِ تحسین وصول ضرور کرے گا لیکن اس شعر میں شعریت کا مطلق وجود نہیں۔ یہ محض لفظی بازیگری کا نتیجہ ہے، وہی لفظی بازیگری جسے آجکل شاعری سمجھا جاتا ہے۔ اس قسم کی لفظی شعبدہ بازی کا نتیجہ اثر لکھنوی کا یہ شعر ہے:-

اِدھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا   پھر ان کی طرف اک نظر دیکھ لینا

اس میں بھی اگر کوئی خوبی ہے تو لفظی۔ حسنِ الفاظ بھی ایک حسن ہے اور اس سے دماغ محظوظ ہوسکتا ہے لیکن جو حظ اس میں دماغ کو ملتا ہے وہ نہایت ہی محدود قسم کا ہے اور اس کا اثر دیرپا بھی نہیں ہوتا۔ پھر جب اسی حسن کو اصل مدعا قرار دیا جائے تو طبیعت بہت جلد اُکتا جائے گی۔ بیخود دہلوی کے شعر میں اثر لکھنوی کے شعر کی طرح ایک تصویر پیش کی گئی ہے۔ یہ تصویر بظاہر زیادہ موثر ہے۔ اس کے عناصر شمع، مزار، گریۂ معشوق روایتی ہیں اور روایتی طور پر اکٹھا کئے گئے ہیں۔ تصویر تو مرتب ہوگئی ہے لیکن جیتی جاگتی، دل میں گھر کرنے والی مطلق نہیں کیونکہ اس نے شاعر کے دل و دماغ میں کسی قسم کا ہیجان نہیں پیدا کیا ہے۔ غرضکہ یہ پانچوں شعر ناکامیاب ہیں اور جسے مذاقِ صحیح و لطیف ہے وہ ان سے محظوظ نہ ہوگا۔ اشعار کو جانچنے کے لئے عام قارئین کو چاہئے کہ وہ اساتذہ کے بہترین کلام سے واقفیت رکھیں ان کے بہترین کلام کو یاد رکھیں اور ہر نئے شعر کو ان اشعار کی ترازو پر تولیں۔

شاعر زندگی کا مشاہدہ کرتا ہے اور یہ مشاہدہ ہر شاعر اپنے مخصوص رنگ میں کرتا ہے اور اس مشاہدہ سے وہ مخصوص نتائج اخذ کرتا ہے۔ کچھ ضرور نہیں کہ یہ نتائج فلسفہ کی صورت اختیار کریں لیکن ہر شاعر کا ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے اور جو وہ اس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اس کا عکس اس کی شاعری میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس طرح اس کی نظموں میں ربط پیدا ہوجاتا ہے اور یہ نظمیں ایک ہی رشتہ میں منسلک ہوجاتی ہیں۔ عموماً اردو غزل گو شعرا کا کوئی خاص ذاتی نقطۂ نظر نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کی حقیقتوں کا ذاتی مطالعہ نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو بھی وہ کسی نقطۂ نظر کے حامل نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ غزل کی پراگندہ سامانی کی وجہ سے اگر وہ زندگی کے متعلق مربوط و مسلسل خیالات بھی رکھتے تو ان خیالات کے انکشاف میں انھیں دقت محسوس ہوتی اور یہ خیالات کچھ اس طرح منتشر ہوجاتے کہ انھیں ایک رشتہ میں پرونا ممکن نہ سہی نہایت دشوار تو ضرور ہوجاتا۔ شعرائے متغزلین تو عموماً اپنے دماغ سے کام لینا گناہ سمجھتے ہیں۔ وہ زندگی کا بغور مطالعہ نہیں کرتے اور اکثر اس کی طاقت بھی نہیں رکھتے۔ پھر دنیائے تغزل سامنے ہے، اس دنیا میں انھیں وافر خیالات ملتے ہیں وہ ان خیالات کو اپنی مشترک جاگیر سمجھتے ہیں اور انھیں خیالات کو بہ ادنیٰ تغیر اپنے اشعار میں بھرتے ہیں۔ انسان تساہل پسند واقع ہوا ہے۔ اگر اسے کوئی آسان راستہ نظر آتا ہے تو پھر وہ کسی دشوار گزار رستہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ شعرا اس اصول پر عمل کرتے ہیں۔ "بزم نگار" میں زیادہ شعرا اسی قسم کے ہیں وہی پرانا راگ الاپتے ہیں۔ کچھ شعرا اس اُفتادِ طبیعت سے متنفر ہیں۔ وہ اپنے دماغ سے کام لیتے ہیں اپنے ادراک کو محض بیکار نہیں سمجھتے وہ زندگی یا خارجی دُنیا یا اپنی داخلی کیفیتوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور انھیں موضوعِ شعر بناتے ہیں۔ ایسے شعرا کی تعداد کم ہے۔ ان میں بھی اکثر مخصوص نقطۂ نظر نہیں رکھتے۔ وہ غور و فکر سے کام لیتے تو ہیں لیکن غور و فکر کے نتائج کو کسی سلسلہ میں منسلک نہیں کرتے اور یہ نتائج بس خود متضاد ہوتے ہیں کہ شاید ایک سلسلہ میں منسلک بھی نہیں ہوسکتے۔ کچھ تو طبیعت کی افتاد سے اور کچھ صنفِ غزل کی خامیوں کی وجہ سے وہ زندگی کی حقیقتوں کا مطالعہ نہیں کرتے بلکہ مخصوص

نکتوں، جزئی چیزوں پر غور و فکر کرتے ہیں اور انھیں جزئی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ ان جزئیات میں کوئی ربط نہیں ہوتا اور اکثر یہ جزئیات متضاد بھی ہوتی ہیں مگر یہ نقص حائل نہیں ہوتا، اگر وہ زندگی کا بغور مطالعہ کرتے ہیں اور اس مطالعہ کے بعد کسی خاص نتیجہ پر پہونچتے ہیں تو بھی وہ اپنے خیالات کو مسلسل پیرایہ میں بیان نہیں کر سکتے۔

(۴)

"بزم نگار" کی شانِ نزول بیان کرتے ہوئے نیاز صاحب فرماتے ہیں "یہ امر مسلم ہے کہ سخن گو ہونا اور چیز ہے اور سخن فہم ہونا دوسری۔ یعنی ممکن ہے کہ ایک شاعر خوش فکر ہو اور خوش فہم نہ ہو"۔ یہ اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن پس پردہ ایک حقیقت ہے جو اس سے زیادہ اہم ہے۔ ادب، شاعری، فنونِ لطیفہ کی ماہیت سے عوام بالکل ناواقف ہیں اور شعراء و ادبا بھی عموماً اس سے ناواقف ہی ہوتے ہیں۔ ایک شاعر کامیاب نظمیں لکھ سکتا ہے لیکن ممکن ہے کہ وہ شاعری کی ماہیت سے آگاہ نہ ہو۔ خصوصاً اُردو شعرا نے کبھی عہدِ حاضر سے پہلے اپنے فن کی اصلیت و اہمیت، اس کی خصوصیتیں، جو انسانی ضرورتیں اس سے پوری ہوتی ہیں، اس کا انسان کی انفرادی اور سماجی زندگی سے تعلق۔ ان موضوعات پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور موجودہ شعرا بھی ان موضوعات کی اہمیت اور ان کے صحیح جواب سے آگاہ نہیں۔ اُردو ادب ابھی نوخیز ہے اور اُردو میں تنقید کا فن تو اور بھی نیا ہے۔ اُردو نقاد ان مسایل کی طرف متوجہ ہوئے ہیں لیکن ان کے متعلق کہیں تشفی بخش معلومات نہیں ملتیں۔ عدم واقفیت کی وجہ سے وہ اکثر عجیب غلط فہمیوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ ادب میں انفرادی کاوش اور ماحول کے اثر کی جلوہ گری ہوتی ہے ماحول سے مراد محض خارجی دنیا نہیں۔ ذہنی ماحول زیادہ اہم ہے۔ ہر زمانہ میں مختلف دماغی تحریکیں ہوتی ہیں جو فلسفہ، سائنس، مذہب، اخلاق وغیرہ کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ شاعر یا ادیب اپنے زمانہ کے ذہنی و خارجی ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور یہ اثر کسی عہد کے مختلف شعراء کو ہم رنگ بناتا ہے۔ اس لئے کسی شاعر کے کارنامہ کو سمجھنے کے لئے اس کے ماحول کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ لیکن شاعر چند انفرادی خصوصیات کا بھی حامل ہوتا ہے اور وہ ماحول سے خاص طور پر متاثر ہوتا ہے اور اسے انفرادی رنگ میں منعکس کرتا ہے۔ ماحول کے اثر کی طرح انفرادی خصوصیات بھی ادب یا شاعری میں نظر آتی ہیں۔ روایتی نقاد انفرادی خصوصیات پر زور دیتے تھے، آجکل ماحول کی اہمیت کی طرف صرف توجہ ہی مبذول نہیں کی جاتی بلکہ شاعر یا ادیب کو محض ماحول کی پیداوار سمجھا جاتا ہے۔ یہ دونوں نقطۂ نظر صحت سے بعید ہیں۔

جس طرح شعرا اپنے فن کے متعلق کافی غور و فکر سے کام نہیں لیتے، اسی طرح وہ فنِ تنقید اس کے اصول سے بھی واقفیت بہم نہیں پہونچاتے تخلیق و تنقید میں جو ناگزیر تعلق ہے اس سے وہ ناواقف ہیں۔ تخلیقِ شعر میں تنقید کی کارفرمائی لازمی ہے لیکن اُردو شعرا میں یہ کارفرمائی تحت شعور میں واقع ہوتی ہے اس لئے وہ شعوری طور پر اس سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتے۔ اُردو شعرا عموماً اچھے نقاد نہیں ہوتے بلکہ وہ نقد کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے اس لئے اچھے بُرے شعر کی پہچان وہ عوام سے زیادہ نہیں کر سکتے۔ جو شعراء کے جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں، جن اشعار میں انھیں زبان کی خوبیاں نظر آتی ہیں یا جن اشعار میں نازک خیالی یا فلسفہ کی جھلک ہوتی ہے، وہ انھیں پسند آتے ہیں۔ وہ بھی اپنی پسند و ناپسند کا اظہار مبہم پیرایہ میں کرتے ہیں، اور اشعار کو اصولِ تنقید کی ترازو پر نہیں تول سکتے۔ اس لئے کسی شاعر کے لئے شعر فہمی ضروری نہیں۔ اور اس کی رائے اپنے یا دوسروں کے کلام پر محض اس لئے قابلِ اعتنا نہیں ہو سکتی کہ وہ شاعر ہے اور اس میں اچھے بُرے کی پہچان عام قارئین سے زیادہ ہوگی۔ ہاں اگر اس نے اپنے تخلیقی اوصاف کی طرح اپنے تنقیدی اوصاف کو بھی ترقی دی ہے یعنی وہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ نقاد بھی ہے تو اس کی رائے اہم ہوگی۔ اور غالباً شاعر ہی اگر وہ اپنے امکانات کو ترقی دے تو بہترین نقاد ہو سکتا ہے۔ "بزم نگار" میں شاید ہی ایسے شاعر نظر آئیں گے جو قابلِ تحسین تنقیدی اوصاف رکھتے ہیں۔ بہرکیف کسی شاعر کے انتخاب اور کسی غیر شاعر کے انتخاب میں کوئی خاص فرق نہ ہوگا۔ اگر شاعر نقاد بھی ہے تو اس کا انتخاب اچھا ہوگا۔ اگر وہ نقاد نہیں تو پھر غیر شاعر نقاد کا انتخاب شاعر کے انتخاب سے بہتر ہوگا۔ لیکن یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اگر شاعر اپنے کلام کا انتخاب خود کرے تو غالباً یہ بہترین انتخاب ہوگا کیونکہ وہ اپنے کلام کے محاسن و معائب سے کسی دوسرے شخص کی بہ نسبت زیادہ واقف ہوگا۔ لیکن یہ امید موہوم ہے۔ دوسرے کے کلام کے متعلق کوئی شاعر صحیح رائے قایم کرے تو یہ بعید از قیاس نہیں لیکن اپنے کلام کے متعلق وہ غالباً صحیح رائے قایم کرنے سے مجبور ہوگا۔ اپنا سارا کلام، سے اچھا نظر آئے گا۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شخص کو اپنی چیز اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً ہر شخص اپنی اولاد سے محبت رکھتا ہے اور اسے دوسروں کی اولاد سے بہتر سمجھتا ہے۔ شعرا بھی اپنی معنوی اولاد سے فطری طور پر محبت رکھتے

ہیں اور ا سے دوسروں کی اولاد معنوی سے بہتر سمجھتے ہیں۔ " بزم نگار " میں اس حقیقت کا بین ثبوت نظر آتا ہے۔ بعض شعرا نے ایسے ایسے اشعار چنے ہیں جنھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ خصوصاً حسرت موہانی کا انتخاب کلام مطلق تشفی بخش نہیں۔ حسرت موہانی موجودہ شعرائے متغزلین میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں لیکن شعر فہمی کی نایاں کمی معلوم ہوتی ہے۔ سرسری نظر سے دیکھئے پران کے انتخاب کے پہلے دو صفحوں میں یہ اشعار ملتے ہیں:

لاؤں کہاں سے حوصلہ آرزو سپاس کا ۔۔۔ جبکہ صفات یار میں دخل نہ ہو قیاس کا
رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا ۔۔۔ طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا
ہم نے کس دن ترے کوچے میں گزارا نہ کیا ۔۔۔ تو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا
محفل یار کی رہ جائے گی آدھی رونق ۔۔۔ ناز کو اس نے اگر انجمن آرا نہ کیا
بھی ہیں راہ تمنا میں سیکڑوں نگہیں ۔۔۔ کہ ناز جلوہ کرے تیری خوشخرامی کا
اس سلیقے سے کیا ذبح کہ دامن ان کا ۔۔۔ خون عشاق سے گلنار نہ ہونے پایا
بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا ۔۔۔ اب تو اظہار محبت برملا ہونے لگا

ان اشعار میں کہیں آورد ہے، تو کہیں مضمون عامیانہ۔ طرز بیان میں بھی کوئی خوبی نہیں، کوئی انفرادی رنگ نہیں۔ زیادہ اشعار اسی قسم کے ہیں اور جو کامیاب ہیں وہ بھی حسرت کے بہترین اشعار میں نہیں۔ جو غزل مجھے پہلے یاد آتی ہے اس کا مطلع ہے:-

رنگ تیری شفق جمالی کا ۔۔۔ اک نمونہ ہے بے مثالی کا

اس غزل کے اشعار منتخب کلام کے بیشتر اشعار سے اچھے ہیں۔ جگر، جلیل اور فراق نے خاص طور پر اچھا انتخاب کیا ہے۔ باقی شعرا کا انتخاب بھی ایک حد تک کامیاب ہے۔ لیکن اچھے برے انتخاب سے مختلف شعرا کی شعر فہمی کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اپنے شعر سبھی کو اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں غیر جانبدار نقاد کی طرح پرکھنا ممکن نہیں۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو پھر شعرا پر گوئی سے پرہیز کرتے اور ضخیم دیوانوں کے بدلے مختصر و منتخب دیوان شائع کرتے۔ بہرکیف اگر ہر شاعر اپنے کلام کے انتخاب کے بدلے دوسرے شعرا کے کلام سے منتخب اشعار پیش کرتا اور انتخاب کے ساتھ وجہ انتخاب بھی واضح کر دیتا تو اس وقت اس کی شعر فہمی، اسکی تنقیدی صلاحیت معرض بحث ہو سکتی تھی اور کوئی فیصلہ کن رائے کا اظہار ممکن ہو سکتا تھا۔

جو شعرا شریک بزم ہیں انھیں میں نے پانچ گروپ میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا گروپ میں وہ شعرا داخل ہیں جو غزلیں تو کہتے ہیں لیکن جنھیں نظم سے زیادہ مناسبت ہے۔ نظم کے صحیح مفہوم سے اردو شعرا اور نقاد بہت کم واقف ہیں۔ وہ چند مربوط و مسلسل اشعار کو نظم سمجھ لیتے ہیں۔ ہر نظم میں کسی مخصوص تجربہ کا وجود ضروری ہے۔ اردو شعرا کو عموماً کسی ذاتی یا تخیلی تجربہ کا بیان مدنظر نہیں ہوتا۔ نظم میں جذبات و خیالات کی ابتدا ترقی اور انتہا ہوتی ہے۔ اردو نظموں میں ارتقائے جذبات و خیالات کا وجود نہیں ہوتا نظم میں ایک مصرعہ دوسرے مصرعہ سے ایک شعر دوسرے شعر سے پیوست ہوتا ہے۔ اردو نظموں کے مختلف مصرعوں یا شعروں میں کوئی ناگزیر ربط نہیں ہوتا۔ نظمیں تو اردو میں بہت ملتی ہیں لیکن شاید ہی کوئی نظم صحیح معنوں میں نظم کہی جا سکتی ہے۔ بہرکیف جو شعرا نظمیں لکھتے ہیں ان کی طبیعت وسعت کی خوگر ہو جاتی ہے اور وہ مربوط و مسلسل اشعار لکھنا پسند کرتے ہیں اس لئے غزل کی پراگندگی یا شعر مفرد کا مختصر پیمانہ انھیں پسند نہیں ہوتا اور اگر وہ غزل کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں تو وہ ایک قسم کی رکاوٹ محسوس کرتے ہیں انھیں غیر شعوری طور پر اظہار خیال میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ وسعت پسند طبیعت اسی تنگی سے گھبرانے لگتی ہے اور وہ اپنے اشعار میں فشار قبر کی کیفیت پاتے ہیں۔ انھیں خود بھی کامل تشفی نہیں ہوتی اور نہ ان کے اشعار سے قارئین کو کامل تشفی ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ شعوری طور پر انھیں ان چیزوں کا احساس نہ ہو اور وہ اپنی غزلوں اور اپنے اشعار کی طرف سے بالکل مطمئن ہوں لیکن اگر وہ غور و فکر سے کام لیں تو انھیں یہ حقیقت نظر آ جائے گی۔ بہرکیف نقاد کو اس قسم کی کمی ان کی غزلوں میں محسوس ہوتی ہے۔ تعجب اس پر ہے کہ ایسے شعرا غزل کی طرف مائل ہی کیوں ہوتے ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل پسند عام ہے اور عوام کسی شاعر کو شاعر ہی نہیں سمجھتے جب تک وہ غزلیں نہ لکھے۔ عوام میں شہرت حاصل کرنے کے لئے وہ بھی غزلیں لکھنے لگتے ہیں اور اکثر نتیجہ محض تضیع اوقات ہے یا غزلوں کی فراوانی میں مزید غزلوں کا اضافہ۔

پہلا گروپ — اس گروپ میں میں نے نو شعرا کو داخل کیا ہے۔ احسان دانش، سلی، اختر، اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، تلوک چند محروم، اختر، پریمی، آنند نرائن ملا، روش صدیقی۔ اس گروپ میں تین شاعر تو ایسے ہیں جنھیں بھول کر بھی غزل کی طرف متوجہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ یہ غزل کے لئے نہیں پیدا ہوئے تھے اور ان کی غزلوں میں غزلیت مطلق نہیں۔ ان میں پہلا نام تلوک چند محروم کا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں "غزل میرا موضوع نہیں اگرچہ کچھ غزلیں لکھی ضرور ہیں" اس سے بہتر منتخب لیکن جامع تنقیدان کی غزلوں پر ممکن نہیں۔ محروم کہنہ مشق شاعر ہیں اس لئے وہ غزلیں بھی لکھ لیتے ہیں اور غزلوں میں پختگی پائی جاتی ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ ان کی غزلیں ایک شاعرانہ مشق سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ محروم کی آواز بلند آہنگ ہے اور اس میں زور بھی پایا جاتا ہے مثلاً پہلے چار شعر ملاحظہ ہوں:۔

اے ہمرہانِ دشتِ محبت! بڑھے چلو — اپنا تو پائے شوق، سلاسل میں رہ گیا
اے دل یہ کیا فسردگی آغاز عشق میں — کل کیوں ترا چراغ سرِ شام ہو گیا
ہو دورِ غم کہ عہد خوشی، دونوں ایک ہیں — دونوں گزشتنی ہیں، خزاں گیا، بہار گیا
سمجھ میں آیا نہ راز صنعت ذرا بھی صورت گرِ ازل کا — بنا رہا ہے مٹا مٹا کر، مٹا رہا ہے بنا بنا کر

صاف ظاہر ہے کہ محروم کی آواز بلند اور کسی حد تک کرخت ہے۔ نرمی اور لوچ کی تو یاں کمی ہے، شیرینی کا نام و نشان بھی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ محروم شاعر نہیں خطیب ہیں۔ یہ اپنے جذبات کا سیدھے سادھے پیرایہ میں بیان نہیں کرتے بلکہ کسی کو مخاطب کر کے پیغام عمل دیتے ہیں یا کسی معلم کے لہجہ میں اپنے خیال کا اظہار کرتے ہیں یا اپنی گتھی کی سی ناعمات کرتے ہیں۔ پہلے شعر میں ہم ہانِ دشت محبت سے مخاطبت ہے تو دوسرے شعر میں اپنے دل سے تخاطب ہے۔ بقیہ دو شعر میں بظاہر کسی سے مخاطبت نہیں لیکن لہجہ کہہ دیتا ہے کہ شاعر خلوت خیال میں دل کا ترجمان نہیں بلکہ کسی بزم میں خطیبانہ انداز میں مائل گفتگو ہے۔ یہی رنگ ہر جگہ ملتا ہے۔ زورِ کلام میسر ہے لیکن جوش پر دسترس نہیں۔ یہ اردو شعرا کی عام کمزوری ہے خصوصاً عصر حاضر کی نظمیں اس نقص سے بھری پڑی ہیں۔ بلند آہنگ آواز، رعب دار الفاظ، بندشوں کی چستی ان چیزوں سے جوش کی کمی پوری کی جاتی ہے یا ان کے وجود کو جوش کا وجود سمجھا جاتا ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ بہت ممکن ہے آواز نرم اور دھیمی ہو، الفاظ صاف و سادہ ہوں لیکن شعر جوش سے لبریز ہو۔ محروم کے اشعار میں جوش کی نمایاں کمی ہے جوش کی کمی کے ساتھ اصلیت کی بھی کمی نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان جذبات و خیالات نے (جنھیں وہ داخل شعر کرتے ہیں) ان کے دل و دماغ میں کچھ بھی ہیجان پیدا نہیں کیا ہے ان کے تصورنے محروم کے تخیل میں کچھ بھی تلاطم خیزی نہیں کی اس لئے ان اشعار میں تاثیر بالکل نہیں۔ ان اشعار کی پختگی، محروم کی کہنہ مشقی کی آمد یت ممکن ہے لیکن ان کے اشعار دنیائے تغزل میں کوئی خاص مرتبہ نہیں رکھتے۔ ان میں ایک قسم کی خشکی بھی ہے جس سے اثر اور زیادہ ناخوشگوار ہو جاتا ہے۔ تین شعر اور سن لیجئے:۔

پھر بہار آئی، ہوا پھر گرم بازارِ جنوں — شوق کے پھولوں میں پھر تننے لگے خارِ جنوں
اہل دُنیا کی تگ و دو دیکھ کر دیوانہ وار — ساری دنیا مجھکو آتی ہے نظر دارِ جنوں
مجھ پہ وحشت کا اثر محروم پھر ہونے لگا — پھر ترے اشعار میں پاتے ہیں آثارِ جنوں

یہ ہے محروم کا رنگ۔ ان شعروں میں کوئی خوبی نہیں، کوئی انفرادی خصوصیت نہیں، ہر پڑھا لکھا شخص اس قسم کے اشعار موزوں کر سکتا ہے۔
محروم کی طرح جوش ملیح آبادی بھی غزل کے لئے نہیں بنائے گئے تھے۔ جوش اور سیماب نے عصر حاضر میں غزل کے روایتی رنگ کے خلاف جد و جہد کی اور غزل میں نئی وسعتیں پیدا کرنے کی کوششیں کیں۔ سیماب کی طرح ان کی بھی ایک حد تک تاریخی اہمیت ہے لیکن یہ بھی دنیائے تغزل میں کوئی مخصوص مرتبہ نہیں رکھتے۔ جوش بھی محروم کی طرح بلکہ محروم سے زیادہ زور کے قائل ہیں اور زور کو جوش کا مترادف سمجھتے ہیں۔ ان کی آواز بھی بلند آہنگ ہے۔ غزل گو شعرا میں شاید ہی کسی کو اس قدر بلند آہنگ آواز میسر ہو۔ اس بلند آہنگی کے ساتھ ترکیبیں اور بندشیں بھی رعب دار ہوتی ہیں جن سے سامعہ مرعوب ہو جاتا ہے اور غزل کے بدلے قصیدہ کی فضا پیدا ہو جاتی ہے:۔

صبح، بالیں پہ یہ کہتا ہوا غمخوار آیا — اُٹھ، کہ فریاد رسِ عاشق بیمار آیا
الحمد کہ گلزار میں ہنگام صبوح — حکم آزادیٔ مرغانِ گرفتار آیا

اے نظر! شکر بجا لا کہ کھلی زلف دراز — اے صدف! آنکھ اٹھا ابر گہر بار آیا

خوش ہو اے گوش! کہ جبریلِ ترنم چہکا — مژدہ اے چشم! کہ پیغمبرِ انوار آیا

خار میں غزلیت بالکل نہیں لیکن غزلیت کے فقدان سے کوئی نقصان نہ ہوتا اگر غزلیت کے بدلے شاعر نے کسی اور اہم چیز کو داخل شعر کیا ہوتا لیکن ان ین محض الفاظ اور بندشوں کے ذریعہ قارئین کے سامعہ کو مرعوب کیا گیا ہے۔ خصوصاً آخری دو شعر میں متوازن الفاظ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ملاحظہ ہو نظر! - اے صدف!"، "شکر بجا لا - آنکھ اٹھا"، "زلف دراز - ابر گہر بار"، "خوش ہو اے گوش! - مژدہ اے چشم!"، "جبریلِ ترنم - یار"، "چہکا - آیا"۔ اس لفظی کاوش کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ جوش کے الفاظ سے قارئین ایسے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان اشعار جوش جذبات یا بلند گہرے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اگر الفاظ سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو مضمون نہایت معمولی نظر آئے گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیشہ اسی قسم کے مبتذل اشعار لکھتے ہیں لیکن ان اشعار میں ان کے مخصوص نقائص اور حدود صاف واضح نظر آتے ہیں۔ زور اور ایک خاص رنگ الفاظ کی جستجو کو وہ اصل شاعری سمجھتے ہیں، اکثر ان کے ساتھ کچھ معنی آفرینی کی طرف بھی توجہ مبذول ہوتی ہے لیکن اس سے بھی کوئی نمایاں فرق نہیں وہ "خیال بندی" کو شاعری سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ کامیاب شاعری کے اس بھید سے واقف نہیں:- "جو دل پہ گزرے کھینچے اس کی صفحہ پہ تصویر"۔ جو زرتی ہے اس کی وہ عکاسی نہیں کرتے۔ اردو شعرا اپنی قوت حاسہ سے صحیح کام نہیں لیتے۔ وہ اسے زیادہ تیز و حساس نہیں بناتے۔ وہ رنگین و بوقلموں سے بہرور نہیں ہوتے وہ ذاتی یا تخیلی تجربوں کے بدلے محض مصنوعی جذبات و خیالات پیش کرتے ہیں۔ جوش کے اشعار میں ہر شے مصنوعی اور غیر فطری ہوتی ہے۔ وہ محروم کی طرح خشک نہیں، ان کے الفاظ میں اکثر شادابی نظر آتی ہے۔ وہ نمو یابے رنگ نہیں خوش رنگ ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ کامیاب ہوتے :-

(۱)
اٹھی وہ گھٹا، رنگ سامانیاں کر — گہر پاشیاں کر، زر افشانیاں کر
وہ چہکے عنادل، وہ سنکیں ہوائیں — گلوں کی طرح چاک دامانیاں کر
سکوں پاؤں چومے وہ ہلچل مچا دے — خرد سر جھکا دے وہ نادانیاں کر
علم کھول کر جوشؔ بستیوں کے — جہاں داریاں کر جہاں بانیاں کر

(۲)
دل کا رونا ہے دل کا ماتم ہے — اب تو ہر سانس نوحۂ غم ہے
میرا صدموں میں مسکرا دینا — بدتر از صد ہزار ماتم ہے
دیکھ، وہ دل نہ توڑ او ظالم — راز کونین کا جو محرم ہے
یاد ان کی بہت نہیں آتی — شاید اب دل کی زندگی کم ہے
خون دل کی ہر ایک بوند میں جوشؔ — وسعت عرصۂ دو عالم ہے

دو مختلف رنگ کی مثالیں پیش کی گئی ہیں لیکن دونوں ناکامیاب ہیں۔ پہلی مثال سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کو الفاظ پر قدرت ہے اور اس کی ں میں روانی ہے لیکن یہ اشعار قارئین کے دماغ میں کسی قسم کے نقوش نہیں چھوڑ جاتے۔ نہ کوئی تصویر ہی پیش کی گئی ہیں اور نہ مخصوص جذبات کی ترجمانی ہے۔ اس لئے ان اشعار سے سامعہ کسی حد تک محظوظ ہو تو ہو دماغ بالکل محظوظ نہیں ہوتا۔ دوسری مثال میں رنگ دوسرا ہے۔ مضامین اس قسم کے ہیں اشعار میں یہ تیر و نشتر سے کم نہ ہوتے لیکن جوش کے اشعار میں یہ سرد و بیجان ہیں کیونکہ ان میں گرمی جذبات نہیں۔ مضامین صرف مضامین ہونے کی سے باندھے گئے ہیں۔ انھیں احساسات کی صورت میں نہیں تبدیل کیا گیا ہے:-

دل کا رونا ہے دل کا ماتم ہے — اب تو ہر سانس نوحۂ غم ہے

میں وہ کیفیت کہاں جو میرؔ کے اشعار میں ملتی ہے:-

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

تیز ہو ور ہر اچھا شاعر آپ بیتی بیان کرتا ہے یا پر بیتی کو اپنے دل میں جوش کے ساتھ محسوس کرتا ہے، دونوں صورتوں میں اصلیت کا وجود ہوتا ہے اور ہوم سے اشعار میں قیامت کی تاثیر مستور ہو جاتی ہے۔ جوش کے اشعار میں تاثیر مطلق نہیں اس لئے وہ دل میں جاگزیں نہیں ہوتے۔

محروم و جوش کی غزلوں سے کہیں زیادہ ناکامیاب احسان دانش کی غزلیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا غزلیں کہنا غلطی ہے۔ احسان دانش "غزلیں" لکھ کر اُردو غزل پر ظلم کرتے ہیں۔ احسان دانش اور شعرائے نسبتاً کم عمر ہیں لیکن وہ الفاظ پر کافی قدرت رکھتے ہیں، ان کی بندشیں پختہ اور محکم ہوتی ہیں لیکن اسے کیا کہئے کہ تاثیر مطلق نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوت حاسہ سلب کرلی گئی ہے، نہ وہ خود محسوس کرسکتے ہیں اور نہ دوسروں کو محسوس کراسکتے ہیں۔ ان کے اشعار پڑھ کر دل گھٹتا ہے۔ ایسی فضا ہے کہ سانس لینے میں مشکل ہوتی ہے اور اگر زیادہ دیر ٹھہرا جائے تو پھر سانس کے رک جانے کا اندیشہ ہے:-

وہ سوکر اُٹھ رہے ہیں اللہ اللہ کیا نظارا ہے — قیامت نے ابھی کروٹ بدل کر سر اُبھارا ہے

جوانی نے اُسے اس خوش مزاقی سے سنوارا ہے — نہ عرض شوق کی جرأت، نہ ضبط غم کا یارا ہے

سحر ہوتے ہی وہ اس طرح شرما کر سدھارا ہے — کہ مجھکو عمر بھر اب رنج خسروی گوارا ہے

کہاں صحرانوردی اور کہاں دیدار کی حسرت — مری دیوانگی تیرے تغافل کا اشارا ہے

معطر سانس، چہرہ اشک گل، مستی بھری آنکھیں — جوانی ہے کہ اک سیلاب رنگ و بو کا دھارا ہے

تمھاری یاد ہے میری کتاب غم کا دیباچہ — خدا رکھے یہی ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا ہے،

ستم کو کیا ستم سمجھوں جفا کو کیا جفا جانوں؟ — وہی جور آشنا جب زندگانی کا سہارا ہے

ہوا مغموم، منظر مضمحل، ماحول افسردہ — مجھے اے ناخدا کس گھاٹ تو نے لا اُتارا ہے

وفا کی آرزو لغزش ہے اک خوش اعتقادی کی — مجھے احسان اکثر دوستوں نے مل کے مارا ہے

اس غزل کو پڑھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بھاری گول پتھر لڑھکتا ہوا چلا جارہا ہے۔ اس کی رفتار نہ تو رکتی ہے نہ تیز ہوتی ہے۔ ایک ہی رفتار سے یہ پتھر چلا جا اور اس کے راستے سے ہٹ جانا دانشمندی ہے۔ استعارہ سے قطع نظر کرکے اگر دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہوگا کہ اس غزل میں قافیہ پیمائی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ الفا بجائے خود اہمیت رکھتے ہیں یہ محض اظہار جذبات و خیالات کا ذریعہ نہیں۔ یہ احسان دانش کا مخصوص نقص ہے۔ وہ الفاظ سے کھیلتے ہیں، الفاظ کو جس طرح جی چا ہے جوڑ دیتے ہیں۔ انھیں استعارہ و تشبیہ سے خاص شغف ہے اور وہ اپنے مشاہدے کے ثبوت میں متعدد تصویریں پیش کیا کرتے ہیں۔ اکثر ان الفاظ کے معانی استع کے موقع و محل، تصویروں کے تناسب و توازن کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتے:-

تمھاری یاد ہے میری کتاب غم کا دیباچہ — خدا رکھے یہی ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا ہے

"کتاب غم کا دیباچہ" میں استعارے کا استعمال ہے لیکن اس استعارے میں اور دوسرے مصرع کے مضمون میں کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح:

"ہوا مغموم، منظر مضمحل، ماحول افسردہ" میں محض لفاظی ہے۔ غرضکہ احسان دانش میں "احساس بلند و لطیف" کی کمی ہے اور وہ الفاظ و نقوش کے استع میں بھی غور و فکر سے کام نہیں لیتے اس لئے وہ اور کسی فن میں کامیاب ہوں تو ہوں فن غزل میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔

اسی گروپ میں چار شاعر ہیں یعلی اختر اختر، اختر شیرانی، روش صدیقی، افسر میرٹھی۔ ایسے ہیں جنھیں بظاہر غزل سے کچھ زیادہ مناسبت معلوم ہوتی ان کے شعروں میں وہ کرختگی، خشکی، بلند آہنگی نہیں جو محروم، جوش، احسان کے شعروں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کے شعروں میں ایک قسم کی تازگی، جو اتی اُمنگ ہے اور زبان میں سبکی اور روانی ہے لیکن افسر کے سوا اور کسی کا ایک مخصوص رنگ نہیں۔ ان کے اشعار میں تفرقہ مشکل ہے۔ ان میں بہت کچھ مشابہت اور یہ مشابہت انفرادی خصوصیت پر محیط ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علی اختر اختر، اختر شیرانی، روش صدیقی کی شخصیتیں اس پایہ کی نہیں کہ یہ اپنا اپنا مخصو نقش اشعار پر ثبت کردیں، ان کی نظمیں ایک دوسرے سے مختلف ہوں لیکن ان کے اشعار میں امتیازی فرق نہیں۔ اس کے علاوہ یہ شعرا کسی انفرادی نقطۂ نظر کے حامل نہیں، ان کے تجربات کسی خاص رنگ میں رنگے ہوئے نہیں ہیں، اس لئے ان کے تخیل کسی شتر بے مہار کی طرح جس طرف جی چاہتا ہے چل پڑتے ہیں۔ رو شاعر ہوتا ہے پسند نہیں کرتے چاہتے تو ہیں کہ اپنی شخصیت کو روایتی شعر گوئی سے آلودہ نہ ہونے دیں اور اپنے اشعار میں انفرادیت سے کام لیں، لیکن ان کی کوشش

ب نہیں۔ اختر شیرانی کے اشعار خصوصاً بہت زیادہ سطحی ہیں اور ان میں جوانی کی تروتازگی، جوانی کی امنگوں، جوانی کے جلد گزر جانے والے جوش وخروش
ضرورت سے زیادہ کام لیا جاتا ہے :۔

محبت کے اقرار سے شرم کب تک ؟ — کبھی سامنا ہو تو مجبور کردوں !
ترے دل کو ملنے کی خود آرزو ہو ! — تجھے اس قدر، غم سے رنجور کردوں !
نہیں زندگی کو وفا ورنہ اختر — محبت سے دنیا کو معمور کردوں،

فتنۂ غم جگائے جا، حشر ستم اٹھائے جا! — یونہی نظر کئے ہوئے بام پہ مسکرائے جا !
دل مرا سر بسر گداز، تیری حیا عدوئے راز! — مجھ سے بھی ضبطِ غم نہ ہو، تو بھی نظر چرائے جا !
دورِ جہاں سے ساقیا! سرد ہوا ہے دل مرا — برف وشراب کی جگہ، برق وشرر پلائے جا !
سایۂ ابر ہے شباب حاصلِ زندگی خراب! — عمر ہے مختصر تو ہو، عمر طرب بڑھائے جا !

جذبات سطحی اور نوخیز ہیں، ان میں گہرائی اور جوش کا وجود نہیں۔ خیالات جذبات سے زیادہ سطحی ہیں۔ اختر شیرانی غالباً غور وفکر سے کام نہیں لیتے
ختر اختر میں غور وفکر کی عادت کچھ زیادہ ہے، لیکن جس طرح اختر شیرانی کے جذبات نوخیز اور خام ہیں اسی طرح علی اختر اختر کے خیالات بھی نوخیز وخام
ہیں۔ ان کا دماغ غائر ومحیط نہیں اس لئے خیالات میں جدت، باریکی یا گہرائی نہیں :۔

حریم کعبہ بنادی وہ سرزمیں میں نے — ترے خیال میں رکھدی جہاں جبیں میں نے
مجھی کو پردۂ ہستی میں دے رہا ہے فریب — وہ حسن جس کو کیا جلوہ آفریں میں نے
چٹک میں غنچے کی وہ صوت جانفزا تو نہیں — سنی ہے پہلے بھی آواز یہ کہیں میں نے
رہینِ منزلِ وہم وگماں رہا اختر — اسی میں ڈھونڈھ لیا جادۂ یقیں میں نے

اس رنگ میں اور روش صدیقی کے رنگ میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ روش صدیقی بھی صرف جذبات نگاری پر قناعت نہیں کرتے۔ وہ بھی علی اختر اختر
رح کچھ غور وفکر سے کام لیتے ہیں لیکن اس غور وفکر کا نتیجہ اہم اور با اثر نہیں ہوتا :۔

غمِ وفا تو بہانہ نہ تھا مگر اے دل — بنادیا تری خاموشیوں نے افسانہ
ہر ایک ذرہ شریکِ غم ومسرت ہے — ملا نہ شہرِ محبت میں کوئی بیگانہ
وہ لب کھلیں تو بکھر جائیں نغمہ ہائے ارم — وہ آنکھ اٹھے تو برس جائے کیف میخانہ
ہوا نہ تکملۂ حسرتِ دلِ رنگیں ! — تمام عمر چھلکتا رہا یہ پیمانہ
پہونچ سکے نہ جہاں خواہشات کی پرواز — نہ بن سکا کسی ایسی فضا میں کاشانہ

یہاں جذبات نگاری بھی ہے اور خیالات کی ترجمانی بھی۔ دونوں میں ایک ہی طرز ہے اور یہ طرز انفرادی نہیں۔ اس میں اور علی اختر اختر کے طرز میں کوئی
نہیں۔ اور اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ یہ علی اختر اختر کے اشعار ہیں تو وہ فوراً اس بات کو تسلیم کرے گا۔ یہ انفرادی رنگ کے فقدان کا محکم ثبوت ہے۔
افسر میرٹھی کا طرز ادا ایک حد تک انفرادیت کا حامل ہے۔ وہ کہتے ہیں :۔

نظر کے سامنے آ جنگلوں میں بولنے والے — کوئی دھیمی رسیلی ہلکی آوازوں سے کیا سمجھے

آواز بھی "دھیمی، رسیلی، ہلکی" ہے۔ لیکن یہ پنچھی 'نظر کے سامنے' آکر نہیں بولتے۔ اس کی 'دھیمی، رسیلی، ہلکی' آواز کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوتا۔
اب اس گروپ میں دو شاعر اور رہ گئے ہیں :۔ حفیظ جالندھری اور آنند نرائن ملا۔ دونوں کی غزلوں میں غزلیت موجود ہے۔ دونوں نظمیں کہتے
ن میدان غزل میں بھی بے تکلف چلتے پھرتے ہیں۔ انھیں کسی قسم کی تنگی یا کمی محسوس نہیں ہوتی۔ دونوں ایک حد تک روایتی طرز میں شعر کہتے ہیں لیکن
یں روایتی عناصر زیادہ ہیں اور زیادہ محکم ہیں :۔

کچھ محتسب کا خوف ہے کچھ شیخ کا لحاظ — پیتا ہوں چھپ کے دامنِ ابرِ بہار میں
وہ سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی — دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں
جھوٹی تسلیوں سے نہ بہلاؤ جاؤ جاؤ — جاؤ کہ تم نہیں ہو مرے اختیار میں

فرسودہ مضامین کا فرسودہ بیان ہے۔ نہ حسنِ الفاظ ہے اور نہ حسنِ معانی نہ اس قسم کے اشعار سے کسی طرح کا لطف و سرور ممکن نہیں۔ حفیظ کے کلام میں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے:-

ناصح کو بلاؤ مرا ایمان سنبھالے — پھر دیکھ لیا اس نے شرارت کی نظر سے
یہ ہوا، یہ ابر، یہ سبزہ حفیظ — آج پینے میں کمی اچھی نہیں،
لحاظِ خاطرِ احباب دیرینہ ہے اسے زاہد — چلوں کیا سوئے مسجد راہ میں میخانہ آتا ہے
گوارا ہے دوامی تلخ کامی — کسی میٹھی زبان والے نے مارا

ان شعروں میں بھی خیالات مبتذل، پیش پا افتادہ ہیں اور بیان میں بھی کوئی حسن، جدت، انوکھا پن نہیں۔ خصوصاً چوتھے شعر کی رعایت لفظی تو نہایت پست مذاق کی مخبر دیتی ہے۔ اگر ہمت بلند ہوئی اور فکر نے رسائی کی تو اس قسم کے اشعار موزوں کئے:-

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات۔ یاد نہ تم کو آسکے — تم نے ہمیں بھلا دیا۔ ہم نہ تمھیں بھلا سکے
ہوش میں آچکے تھے ہم جوش میں آچکے تھے ہم — بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اٹھا سکے
رونقِ بزم بن گئے، لب پہ حکایتیں رہیں — دل میں شکایتیں رہیں، لب نہ مگر ہلا سکے
مجھ سے اور بڑھ گئی برہمی مزاجِ دوست — اب وہ کرے علاج دوست جسکی سمجھ میں آسکے
اہلِ زباں تو ہیں بہت۔ کوئی نہیں ہے اہلِ دل — کون تری طرح حفیظ درد کے گیت گا سکے

یہ اشعار تاثیر سے خالی نہیں۔ اگر "درد کے گیت" کی طرف حفیظ زیادہ سے زیادہ متوجہ ہوتے، اگر وہ "دل گداختہ" پیدا کرتے اور اس کی ترجمانی اپنی شاعری کا شعار قرار دیتے تو ان کے اشعار کی تاثیر زیادہ ہو جاتی اور ممکن تھا کہ وہ ایک محدود لیکن مخصوص مرتبہ دنیائے تغزل میں حاصل کر لیتے۔ لیکن ان کے موجودہ کارنامہ کی بنا پر انھیں دنیائے تغزل میں محدود امتیازی حیثیت بھی نہیں دی جا سکتی۔

اندر ایں ملا کے اشعار میں غزلیت کچھ زیادہ ہے۔ ان میں حفیظ کے اشعار جیسی پستی و فرسودگی بھی نظر نہیں آتی۔ زبان میں نرمی اور ملائمیت زیادہ ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ زور، شوخی، صفائی بھی موجود ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ملا کم گو ہیں اس لئے یہ محض قافیہ پیمائی کے دام میں نہیں جا پھنستے:-

جفا صیاد کی اہلِ وفا نے رائگاں کردی — قفس کی زندگی وقفِ خیالِ آشیاں کردی
یہ دل کیا ہے کسی کو امتحانِ ظرف لینا تھا — تنِ خاکی میں اک چھوٹی سی چنگاری نہاں کردی
بھرم حسنِ حقیقت کا کوئی کھلنے نہیں دیتا — نظر جب سامنے آئی تجلی درمیاں کردی
تری بے مہریاں آخر وہ نازک وقت لے آئیں — کہ اپنوں کی محبت بھی طبیعت پر گراں کردی
اسیر آنکھیں کہاں سے سیرِ گلشن کے لئے لائیں — نظر جتنی بھی تھی صرفِ تلاشِ آشیاں کردی

مضامین اور مضامین کی ترجمانی میں ابتذال و فرسودگی سے پرہیز ہے۔ لیکن جدت و باریکی کا بھی نام و نشان نہیں۔ خیالات وہی ہیں جو اردو غزلوں میں عام طور سے نظر آتے ہیں لیکن اسلوبِ بیان میں انفرادی شان پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی کوشش ہر جگہ کل میں آئی ہے۔ یعنی ملا شعوری طور پر اسلوبِ بیان میں انفرادی شان پیدا کرتے ہیں اس لئے ذرا سی جو کہ تصنع کی نظر آتی ہے اور یہ اسلوب فطری نہیں معلوم ہوتا۔ اس کمی کی وجہ سے اشعار میں تاثیر کی نمایاں کمی ہو جاتی ہے۔ اگر ملا مشق کے ذریعہ ایسی مہارت بہم پہونچا لیں کہ یہ طرز فطری و غیر مصنوعی ہو جائے تو وہ زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں اس کے علاوہ اگر وہ محض خیال بندی سے کام نہ لیں، اگر وہ اپنے دل کی واردات کی تصویر کشی کریں تو بہتر ان کے شعروں میں جان آجائے گی۔ وہ کہتے تو ہیں:-

اظہارِ دردِ دل کا تھا اک نام شاعری ۔ یارانِ بے خبر نے اسے فن بنا دیا

لیکن کسی حد تک انھوں نے بھی شاعری کو ایک فن بنا دیا ہے۔ اگر وہ "اظہارِ دردِ دل" سے زیادہ کام لیتے، اپنے ذاتی تجربات کی ترجمانی کرتے اور اگر تجربات نہ تھے تو انھیں حاصل کرتے تو پھر ایک امتیازی شان حاصل کر سکتے تھے۔ اُردو شعرا بوقلموں تجربات کے حامل نہیں ہوتے اور نہ وہ اس کی ضرورت سمجھتے ہیں اسی وجہ سے اگر صلاحیت موجود بھی ہوتی ہے تو بھی کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ اثر صاحب میں بھی اسی قسم کی کمی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ نظمیں اور غزلیں دونوں لکھتے ہیں۔ انھیں چاہئے کہ وہ اپنی ساری دماغی کسی ایک پر صرف کریں کیونکہ وہ دو مختلف میدانوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ غزل میں وہ ایسے اشعار کہتے ہیں:

گزری حیات وہ نہ ہوئے مہرباں کبھی ۔ سنتے تھے ہم کہ عشق نہیں رائگاں کبھی
آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار ۔ گزرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی
ہاں یاد ہے کسی کی وہ پہلی نگاہ لطف ۔ پھر خوں کو یوں رگوں میں نہ دیکھا رواں کبھی

اس مقام سے آگے وہ نہیں پہونچ سکتے۔ اور اس مقام کے حدود ظاہر ہیں۔

(۶)

دوسرا گروپ ۔ دوسرے گروپ میں میں نے گیارہ شعرا کا شمار کیا ہے:۔ کیفی، ناطق گلاوٹھوی، امید امیٹھوی، دل شاہجہانپوری، آسی، تاجور، بیخود، ساحر، سیماب، وحشت، یگانہ۔ اس گروپ میں نئے اور پرانے رنگ کے شعرا داخل ہیں۔ سب مشاق ہیں اور مختلف مضامین کو صفائی، زور اور پختگی کے ساتھ نظم کر سکتے ہیں۔ انھیں کہنہ مشق اور قادر الکلام کہا جا سکتا ہے۔ کم و بیش، یہ کامیابی کے ساتھ قافیہ پیمائی، جسے عموماً شاعری سمجھا جاتا ہے، کے نمونے پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن ان میں یہ جوہر نہیں کہ یہ اساتذہ، غالب، ذوق و مومن کی طرح اپنی اپنی مخصوص جگہیں ایوانِ تغزل میں بنالیں۔ یہ سب صاحبِ طرز نہیں۔ سیماب کے علاوہ سبھوں میں قوتِ ایجاد کی نمایاں کمی ہے۔ طرزِ بیان خشک، سادہ، بے رنگ ہے۔ یہ الفاظ سے زیادہ معانی پر زور دیتے ہیں اور محض الفاظ کی اُلٹ پھیر میں اپنا وقت صرف نہیں کرتے۔ اس لئے اشعار سطحی نہیں معلوم ہوتے لیکن ان کے دماغ "محشرِ خیال" نہیں۔ یہ سودا یا غالب کی معنی آفرینی سے بے بہرہ ہیں۔ یہ نئے نئے خیالات و تصورات پر قدرت نہیں رکھتے اور نہ اسلوب بیان ہی ایسا ہے جو دل میں اثر کرے۔ ان کی آنکھیں بھی وا نہیں اور نہ مشاہدۂ عالم کسی انفرادی مطالعۂ فطرت کا ثبوت اپنے اشعار میں پیش نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ ان کے دل و دماغ حساس و مبصر نہیں۔ یہ خود جوش کے ساتھ اپنے خیالات و جذبات کو محسوس نہیں کرتے اس لئے قارئین پر بھی کچھ زیادہ اثر نہیں ڈال سکتے ہیں۔ بعض ان میں سے ایسے ہیں جنھیں غزل گوئی کی طرف متوجہ نہ ہونا چاہئے تھا۔ اس قسم کی پہلی مثال امید امیٹھوی کی ہے۔ اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ انھیں شعر گوئی سے کوئی فطری لگاؤ نہیں۔ بہت سے شعرا ایسے ہوتے ہیں جو شعر کسی میلانِ ذہنی سے مجبور ہو کر نہیں کہتے وہ ایسے تجربات سے بہرہ ور نہیں ہوتے جن کا اظہار ناگزیر ہو۔ وہ اس لئے شعر کہتے ہیں کہ دوسرے شعر کہتے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ بھی بحرِ سخن میں 'شناوری' کریں گے۔ امید امیٹھوی اسی قسم کے شعرا میں داخل ہیں:۔

سیکڑوں قصے ہوس کے ہوگئے مقبولِ عام ۔ داستانِ اہلِ درد اب عرض کے قابل نہیں
میں نے مانا دوستی کا ماحصل ہے دشمنی ۔ تیری اُلفت تو وہ شے ہے جس کا کچھ حاصل نہیں
ہستی عاشق حجابِ جلوۂ معشوق ہے ۔ یہ جو اُٹھ جائے تو پردہ پھر کوئی حائل نہیں
حُسن بے پروا دماغِ امتحاں رکھتا نہیں ۔ فیصلہ عشق و ہوس کا ورنہ کچھ مشکل نہیں
اس نگاہِ لطف ہی سے کیوں نہ چل کر پوچھئے ۔ کون سی ہے وہ خطا جو عفو کے قابل نہیں

اس قسم کے اشعار ہر وہ پڑھا لکھا شخص جس کی طبع موزوں ہے یا جسے عروض سے کچھ واقفیت ہے بہ آسانی موزوں کر سکتا ہے۔

دوسری مثال پنڈت امرناتھ ساحر کی ہے۔ ان کا مخصوص نقص یہ ہے کہ کہنہ مشقی کے باوجود ان کے کلام کا کوئی خاص رنگ نہیں۔ خیالات و تصورات میں ناہمواری ہے اور یہ ناہمواری طرزِ ادا میں بھی نمایاں ہو کر نہایت ناخوشگوار اثر پیدا کرتی ہے۔ ایک طرف تو وہ اس قدر پیش پا اُفتادہ، عامیانہ خیالات کو فرسودہ رنگ میں پیش کرتے ہیں:۔

چشم و دل نزع میں ہیں محو تماشائے جمال — حشر کیا اور ہے اس سے کوئی بہتر اپنا
چمن میں آتش رخسار گل سے آگ لگی — نہ آشیانۂ بلبل بچا، نہ دام رہا
اُلفت آئینہ رویاں آخراب بس کر کے میں — دیکھتے ہی دیکھتے محو تماشا ہو گیا
اے پری رو ترے دیوانے کا ایماں کیا ہے — اک نگاہِ غلط انداز پہ قرباں ہونا

دوسری جانب وہ متین خیالات کو سنجیدگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں:-

گویا زبان حال تھی ساحر خموش تھا — یہ سعیٔ ضبط تھی وہ تقاضائے ہوش تھا
مٹایا بے خودی نے نقش پندار خودی دل سے — رہا باقی نہ کچھ نام و نشاں قطرہ کا دریا میں،
ازل سے دل ہے محو ناز و قفِ خود فراموشی — جو بے خود ہو وہ کیا جانے جفا کیا ہے وفا کیا ہے

لیکن وہ کسی رنگ میں بھی کامیاب نہیں۔

امید و ساحر سے کچھ زیادہ کامیاب "شاعری" کیفی، ناطق گلاوٹھوی، دل شاہجہاں پوری، آسی الدنی اور بیخود کے کلام میں ملتی ہے۔ لیکن یہ شعرا بھی کوئی خاص مرتبہ نہیں رکھتے۔ آسی الدنی اور امید امیٹھوی اور ساحر کی شاعری میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے مضامین کی دنیا کچھ وسیع معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے تنوع زیادہ ہے اور بیان میں زور اور بندشوں میں چستی اور الفاظ میں روانی بھی کچھ زیادہ ہے۔ لیکن اشعار پھر بھی شعریت سے مبرا ہیں۔ آسی الدنی شاعر نہیں "شعر گو" ہیں اور غالباً اسی لفظ کا دوسرے شعراء پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ جہاں سے اُٹھا کے دیکھئے آسی الدنی کے اشعار پھیکے، بے رنگ، نثر سے قریب معلوم ہوتے ہیں:-

خوشی نوایانِ چمن مٹ نہیں سکتے صیاد — چار مٹ جائیں گے تو چار نمایاں ہوں گے
موجد طرز ہے ہر وحشیٔ آشفتہ مزاج — سو کے سو طرح کے داماں و گریباں ہوں گے
غنچے بے حس ہیں یہ اندازِ جنوں کیا جانیں — وقت آئے گا تو ہم چاک گریباں ہوں گے

ہر جگہ یہی عالم ہے۔ دل شاہجہاں پوری کے اشعار بھی اسی قسم کے ہیں۔ یہ امیر مینائی کے شاگرد ہیں۔ ان کا طرز امیر مینائی کے طرز سے ملتا جاتا ہے۔ الفاظ بندشیں مضامین سب امیر مینائی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ لیکن امیر مینائی کی خشکی بھی موجود ہے۔ دل شاہجہاں پوری کہتے ہیں:- "جذباتی رنگ پسند خاطر رہا۔ تصنع سے ہمیشہ احتراز کیا" لیکن ان کے اشعار میں جذبات کی فراوانی نہیں۔ یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ شاعر کی طبیعت حساس واقع ہوئی ہے اور اس کے دل و دماغ پر تلخ و رنگین تجربات و تصورات سے بہرہ ور ہیں۔ طرز ادا میں آورد صاف نمایاں ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں لیکن آورد کو آمد میں تبدیل نہیں کرتے۔ انتخاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ پسند بھی وہی اشعار ہوتے ہیں جن میں آورد کا وجود ہوتا ہے:-

اثر عشق سے ہوں صورتِ شمع خاموش — یہ مرقع ہے مری حسرت گویائی کا
چمن دہر میں ہر پھول رہا پیش نظر — کھینچتا تھا ہمیں نقشہ تری رعنائی کا
نظر آتی ہے مجھے حُسن کی دنیا بے حس — کس کو افسانہ سناؤں شب تنہائی کا
بارہا ڈوب کے ابھرا مرے دل سے نشتر — راز پھر بھی نہ کھلا عشق کی گہرائی کا
کیا سنائیں سرگزشت زندگیٔ پر الم — آشیاں اب تو قفس ہے اس سے پہلے دام تھا
درحقیقت مضطرب دل کے لئے وہ موت تھی — اصطلاح عام میں تسکین جس کا نام تھا
یاد ہے اب تک وہ کیف انگیزیٔ جوش بہار — شاخ گل تھی دست ساقی ہر گل تر جام تھا

اشعار میں تکلف ہے جس کی وجہ بندش الفاظ ہے:- "صورت شمع خاموش"۔ "سرگزشت زندگی پر الم"۔ "کیف انگیزی جوش بہار"۔ معانی و بندشوں میں ابتذال سے پرہیز ہے اور دونوں میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں لیکن کامیاب شاعری ممکن نہیں۔

یہی ابتذال سے پرہیز اور غور و فکر کی کارفرمائی کیفی اور ناطق گلاؤٹھوی کے اشعار کی بھی خصوصیت ہے۔ لیکن کیفی کے اشعار، دل شاہجہاں پوری اور ناطق گلاؤٹھوی کے اشعار سے زیادہ خشک ہیں، اور ان میں بیرنگی اور نثریت بھی ہے، نمونۂ کلام یہ ہے:۔

حسن عشق میں ہے یا عشق حسن میں مضمر
جوہر آئینہ میں یا آئینہ ہے جوہر میں

عشق محشر آرا کی طور پر گری بجلی
حسن لن ترانی کی رہ نہ سکا چادر میں،

فرط سوز الفت میں دیکھ کر سکوں دل کا
بجلیاں مچلتی ہیں بادلوں کے محشر میں

چارہ گر کو حیرت ہے ارتقائے وحشت سے
پاؤں میں جو چکر تھا آ رہا ہے وہ سر میں

ہوں وہ رند یا صوفی مست اسکی دھن میں ہیں
جانے کتنے میخانے بھر دئے ہیں کوثر میں

تھا شعریت خیالی کا نمونہ ہے گو یہ الفاظ اس پہ پردہ کئے ہوئے ہیں لیکن اور چار شعروں میں کیفی کی جملہ خصوصیتیں موجود ہیں۔ یہ کبھی از خود رفتہ نہیں ہو جاتے ہمیشہ اپنے دامن کو سنبھالے ہوئے رہتے ہیں اور کبھی اس لغزش پا کے مرتکب نہیں ہوتے جس پہ سیکڑوں ہوشیاریاں قربان ہیں۔ کبھی کبھی ایسے اشعار بھی قلم سے نکل جاتے ہیں:۔

اک خواب کا خیال ہے دنیا کہیں جسے
ہے اس میں اک طلسم تمنا کہیں جسے

خمیازہ ہے کرشمۂ پستیٔ دہر کا
اہل زمانہ عالم عقبیٰ کہیں جسے

برہمزن حجاب ہے خود رفتگیٔ حسن
اک شان بیخودی ہے زلیخا کہیں جسے

ناطق گلاؤٹھوی کے متعلق کچھ کہنے کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔ ان چار شعروں سے ان کے رنگ کا پتہ مل سکتا ہے:۔

وہ گئے ہمت گئی رخصت شکیبائی ہوئی
رفتہ رفتہ اپنی دنیا ہی گئی آئی ہوئی،

اپنی رسوائی کا غم تھا جب ہمیں وہ دن گئے
اب تو یہ غم ہے کہ ایسی پھر نہ رسوائی ہوئی

جانتے ہیں یہ کہ پہچانا نہیں کوئی ہمیں،
یہ نہیں معلوم کس کس سے شناسائی ہوئی

کیا کہا میں اور تمنا عشرت گمگشتہ کی
وہ مری سو بار کی کھوئی ہوئی پائی ہوئی

بیخود دہلوی کہنہ مشق شاعر ہیں اور ان کی اُستادی مسلم ہے۔ ہر قسم کے مضمون کو بلا تکلف نظم کرسکتے ہیں لیکن مضامین اور اسلوب بیان دونوں روایتی ہیں اور ان کی حیثیت "اُستاد فن" کی ہے شاعر کی نہیں:۔

شمع مزار تھی نہ کوئی سوگوار تھا،
تم جس پہ رو رہے تھے یہ کس کا مزار تھا

تڑپوں گا عمر بھر دل مرحوم کے لئے
کمبخت نامراد لڑکپن کا یار تھا،

سودائے عشق اور ہے وحشت کچھ اور ہے
مجنوں کا کوئی دوست فسانہ نگار تھا

جادو ہے یا طلسم تمھاری زبان میں
تم جھوٹ کہہ رہے تھے مجھے اعتبار تھا

کیا کیا ہمارے سجدہ کی رسوائیاں ہوئیں
نقش قدم کسی کا سر رہگزار تھا

اسوقت تک تو وضع میں آیا نہیں ہے فرق
تیرا کرم شریک جو پروردگار تھا

اس گروپ کے تین شاعروں کے متعلق مفصل اظہار خیال کی ضرورت نہیں۔ آجور نجیب آبادی اور وحشت کلکتوی پڑھے لکھے شاعر ہیں جو اپنی غزلوں میں اپنی قابلیت سے ناجائز کام نہیں لیتے لیکن جن کی قابلیت کی وجہ سے غزلوں میں ایک ادبی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ آجور نجیب آبادی کے الفاظ میں خاص رکھ رکھاؤ ہے اور وحشت کلکتوی کی بندشیں جاذب نظر ہیں۔ لیکن ان کی شاعری ہمیشہ زندہ رہنے والی چیز نہیں۔ یہی حال یگانہ چنگیزی کی شاعری کا بھی ہے انھوں نے چند مخصوص وجہوں کے سبب سے صحت زبان، لطف محاورہ کی طرف زیادہ توجہ کی اور اس میں نمایاں کامیابی بھی حاصل کی۔ ان کی شاعری کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زور، شگفتگی اور انبساط ہے۔ قنوطیت کا نام و نشان نہیں۔ ان کا لہجہ بلند ہے لیکن آواز خوش آہنگ ہے:۔

قفس میں بوے مستانہ بھی آئی دردِ سر ہو کر   نوید ناگہاں پہونچی ہے مرگِ منتظر ہو کر
نگاہِ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل دھڑکتا ہے   مبادا رنگ و بو اُڑ جائے پامالِ نظر ہو کر
کہاں یہ نارسائی کی ہے پروانوں کی قسمت ہے   پڑے ہیں منزلِ فانوس پر بے بال و پر ہو کر
عدو کیا زہر دیتا ہے ہم ایسے تلخ کاموں کو   لہو کا گھونٹ اُتر جاتا ہے جب شیر و شکر ہو کر
دیا بیخودی میں امتیاز روز و شب معلوم   بلا آئی ہے بدمستوں پہ شامِ بے سحر ہو کر
نگاہِ یاس کا عالم جو آگے تھا سو اب بھی ہے   ہزاروں گل کھلے بازیچۂ شامِ بے سحر ہو کر

ان اشعار سے سامعہ اور دماغ پر خوشگوار اثر ہوتا ہے لیکن یہ اثر گہرا نہیں ہوتا۔ یہ فوراً مٹ جاتا ہے۔ ان شعروں میں وہ تاثیر نہیں جو دل کی گہرائی گیر ہو جائے، انمیں وہ لہجہ نہیں جو ابدیت کی نشانی ہے، جو میرؔ، غالبؔ، مومنؔ کے کلام میں موجود ہے۔

اس گروپ میں اب صرف سیمابؔ اکبرآبادی کا ذکر باقی ہے۔ سیمابؔ اکبرآبادی کی اہمیت تاریخی ہے، سیمابؔ ان شاعروں میں ہیں جو صرف غزلیں نہیں کہتے بلکہ اپنے فن اور اس کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ موجودہ زمانہ میں غزل گوئی پستی کے غار میں گر گئی ہے۔ پرانے خیالات کی بدولت تکرار شاعری سمجھی جانے لگی ہے، اس لئے انھوں نے غزل میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مضامین کی دنیا محدود تھی، اسے وسیع کیا اور طرزِ ادا میں بھی ابتذال اور فرسودگی سے بچ کر متانت، سنجیدگی، شوکت، ادبی شان پیدا کی۔ اس لئے موجودہ دورِ تغزل کا مورخ، جدید رنگِ تغزل کی داغ بیل ڈالنے والوں میں انھیں شمار کرے گا۔ لیکن سیمابؔ اکبرآبادی اکثر معنی آفرینیِ محض کو شاعری سمجھ لیتے ہیں اور اسی طرح "احساس بلند لطیف" کی ترجمانی کے بدلے طرزِ ادا میں، شوکت، ادبی شان اور ایک امتیازی رنگ پیدا کر لینا کافی سمجھتے ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ شاعری کو محض تفریحِ طبع کا ذریعہ نہیں سمجھتے، اس لئے اپنے دامن کو عوام پسندی کی گرد سے آلودہ نہیں ہونے دیتے۔

دنیا سمجھے فریب نویدِ حیات تم،   جب لوگ جا رہے ہوں جنازہ لئے ہوئے
تو اپنی بزمِ ناز کو دیکھ اور ازل کو دیکھ!   آیا کہاں سے تیری تمنا لئے ہوئے
اس خاکدانِ عشق کی پہنائیاں نہ پوچھ   ذرے پڑے ہیں وسعتِ صحرا لئے ہوئے
تھی کثرتِ جمال سے تاریک بزمِ دہر   آنا پڑا چراغِ تمنا لئے ہوئے

کیوں ہنسی تو اے اجل، فانی اگر سمجھا مجھے   ایک دن سب کو فنا ہے کیا تجھے اور کیا مجھے!
ہے حصولِ آرزو کا راز ترکِ آرزو   میں نے دُنیا چھوڑ دی تو مل گئی دُنیا مجھے
کب کے سویا ہوں یہ اپنے اضطرابِ شوق سے   جب وہ آئیں قبر پر فوراً جگا دینا مجھے
صبح تک کیا کیا تری امید نے طعنے دئے   آگیا تھا شامِ غم اک نیند کا جھونکا مجھے
دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا سے میں اُٹھ جاؤں گا   دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دُنیا مجھے

ان دو مثالوں سے سیمابؔ اکبرآبادی کی خصوصیتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ مشاق شاعر ہیں اور ان شعروں سے مشاقی صاف ظاہر ہوتی ہے، لیکن مشاقی کے ساتھ بھی سیمابؔ صاحب طرز نہیں۔ ان کا کوئی خاص انفرادی رنگ نہیں۔ مثلاً ان شعروں کو لیجئے۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ سب ایک ہی شاعر کی جودتِ طبع کا نتیجہ ہیں:-

میں غافل ہو کے دانستہ خرابِ بزمِ ہستی ہوں   سمجھتا ہوں کہ یہ محفل نہیں ہے خوابِ محفل ہے

ذرا کھل کر پکار اے صور، مجذوبانِ اُلفت کو   یہ دیوانے کہیں بیٹھے نہ رہ جائیں بیاباں میں

وہ جس سے سمجھ جائے روداد مرے غم کی   ایسا بھی کوئی ٹکڑا افسانے میں رکھ دینا

سرِ محفل نہ کیوں کھل کر پیوں میں   ان آنکھوں کی عنایت ہو رہی ہے

اس طرح سے مجھے ستا رہے ہو   جیسے میرا خدا نہیں ہے

اس سرسری تنقید سے یہ نتیجہ مترشح ہوتا ہے کہ اس گروپ میں جتنے شعراء میں نے داخل کئے ہیں وہ کم و بیش مشاق ہیں۔ وہ معانی کو شاعری کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اور لفظی الٹ پھیر کو حاصل شاعری نہیں سمجھتے۔ کم و بیش سب ہی غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور اس وجہ سے ان کے اشعار سطحی نہیں معلوم ہوتے۔ اشعار میں سنجیدگی اور متانت ہے لیکن جذبات کی گرمی نہیں، ان میں سے کسی نے بھی پائیدار مرتبہ حاصل نہیں کیا ہے اور غالباً نصف صدی کے گزر جانے کے بعد کوئی ان کے نام سے بھی واقف نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ سیماب کا نام شاید تاریخ غزل میں نظر آجائے۔

(۷)

تیسرا گروپ:۔ تیسرے گروپ میں پانچ شعراء داخل ہیں:۔ نوح ناروی، ثاقب لکھنوی، ناطق لکھنوی، اثر لکھنوی، آزاد انصاری۔ اس گروپ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ معانی سے زیادہ الفاظ پر زور دیتے ہیں۔ معنی آفرینی، نازک خیالی سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ ان کی ساری توجہ الفاظ سے وابستہ ہے۔ یہ لفظی الٹ پھیر کو اصل شاعری سمجھتے ہیں۔ معانی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں، حسن الفاظ، لطف زبان، محاوروں کی برجستگی، یہ چیزیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ عمیق خیالات، پر جوش جذبات، لطیف، باریک و زندہ احساس یہ چیزیں عنقا ہیں۔ ان کے اشعار میں ایک مخصوص سبکی اور روانی ہے۔ جیسے پانی سطح زمین پر بآسانی پھیل جائے۔ لیکن اس پانی میں گہرائی نہیں اور سطح زمین صاف نظر آتی ہے اور یہ زمین وہی ہے جس سے ہم واقف ہیں۔ ان شعراء کی ساری پونجی الفاظ پر منحصر ہے اس لئے ان کے شعروں کی تنقید میں بھی الفاظ ہی کی اہمیت سے بحث ہوتی ہے۔ لفظی حسن کی وجہ سے یہ اشعار سریع الاثر ہوتے ہیں اور سطحی نظر کو فوراً جذب کر لیتے ہیں اور مشاعروں میں خراج تحسین وصول کرتے ہیں۔ اس گروپ کے دو شاعر، ثاقب و ناطق، مفصل ذکر کے مستحق نہیں۔ یہ ایک مخصوص و معلوم طرز میں شاعری یا قافیہ پیمائی کرتے ہیں اور اس طرز میں انفرادی شان بھی پیدا نہیں کرتے۔ ناطق:۔

ہر ذرہ کائنات ہے اک کائنات کا ——— موصوف کل صفات ہے ہر جزو صفات کا
گل پیرہن گریباں نیم بسمل مرید نالہ ——— میری معاشرت کا شہرہ چمن چمن ہے
شاہراہ عام سے رسوائی منزل نہ کر ——— کچھ نئی راہیں نکال اے رہنما میرے لئے
دل کے ٹکڑے جلوہ زار روئے جاناں بنے ——— آئینہ جب ٹوٹ جائے آئینہ خانہ بنے
اک فریب حسرت دیدار تھا جلوہ ترا ——— نور سمجھے تھے جسے وہ بھی حجاب نور تھا

ثاقب:۔

دیار دل میں کہیں دوست کا پتا نہ ملا ——— وہ بدنصیب ہوں کعبے میں بھی خدا نہ ملا
بہت سی عمر مٹا کر جسے بنایا تھا ——— مکاں وہ جل گیا تھوڑی سی روشنی کے لئے
جب زلف دیکھ لی ہے تو چہرہ بھی دیکھ لوں ——— گردش نہیں ہے کیا مرے لیل و نہار کو
پھر اور کس طرح سے اجڑے مکاں کو سجتا ——— قبر لحد میں آکر تصویر ہو گیا ہوں
آگ یہ کیسی لگی ہے سینۂ دلگیر میں ——— چھالے آتے ہیں نظر آئینہ تقدیر میں

یہ اشعار بلا تخصیص پیش کئے گئے ہیں۔ اگر ناطق کے شعروں کو ثاقب کے دیوان یا ثاقب کے شعروں کو ناطق کے دیوان میں داخل کر دیا جائے تو قارئین کو ذرا بھی یہ احساس نہ ہوگا کہ کسی دوسرے شاعر کا کلام داخل دیوان کیا گیا ہے یا اگر ان شعروں کو عمر، زید، بکر کی طرف منسوب کیا جائے تو بھی کسی کو مجال انکار نہیں۔

اثر کے اشعار میں لطف زبان زیادہ ہے۔ قدیم رنگ تغزل سے سرمو تجاوز نہیں کرتے اور اس رنگ کو انہماک کے ساتھ برتتے ہیں۔ وہی حسن و عشق کی داستان ہے، وہی حسرت دیدار، شوق گناہ، وحشت، دیوانگی، میخواری، فریاد و فغاں، گل و بلبل، صیاد، گلشن، اسیری، نشیمن کا قصہ ہے:۔

عشق سے لوگ منع کرتے ہیں ——— جیسے کچھ اختیار ہے اپنا
حیا شیوۂ حسن، ادب شرط الفت ——— ملے بھی تو آپس میں پردا رہیگا
کیا حسرت دیدار ہے ہر بار یہ سمجھا ——— گویا کبھی دیدار میسر نہ ہوا تھا

شوق بڑھتا گیا گناہوں کا ــــــ لذت انفعال نے مارا
یہ اتفاق تو دیکھو بہار جب آئی ــــــ ہمارے جوشِ جنوں کا وہی زمانہ تھا
ہم نے رو رو کے رات کاٹی ہے ــــــ آنسوؤں پر یہ رنگ تب آیا
صیاد نے چھیڑا وہیں افسانۂ گلشن ــــــ جب قصد اسیروں نے کیا ترکِ فغاں کا

ظاہر ہے کہ اثر روایتی شاعر اس میں ہیں۔ مروجہ خیالات و مضامین کی تکرار کرتے ہیں۔ نئے ڈھانچے میں وہی "اگلے برس کی تیلیاں" ہیں۔ اسلوب بیان پر مضامین سے زیادہ توجہ ہے اور اس اسلوب میں ظاہری حسن موجود ہے۔ زبان صاف، شستہ، رواں، چست، شاداب، نکھری ہوئی ہے۔ یہی زبان کی خوبی قارئین کی توجہ کو کھینچ لیتی ہے۔ اگر کوئی تاثیر بھی ہے تو وہی جو حسین الفاظ کے حسین استعمال کا نتیجہ ہوتی ہے یعنی یہ تاثیر اسی قسم کی ہے جو گلزارِ نسیم میں ملتی ہے اور جس کا دائرہ نہایت محدود ہے۔

نوح ناروی اور آزاد انصاری بھی الفاظ سے کھیلتے ہیں اور اسی "کھیل" کو شاعری سمجھتے ہیں۔ عموماً شعرائے دہلی معانی پر زیادہ زور دیتے ہیں اور لفظی گورکھ دھندے سے پرہیز کرتے ہیں لیکن نوح ناروی اور آزاد انصاری اسی شغل میں منہمک نظر آتے ہیں۔ آزاد انصاری اپنی سادگی کے باوجود کبھی کثرت سے رعایت لفظی کا استعمال کرتے ہیں۔ در اکثر نتیجہ اس قدر مضحکہ ہوتا ہے:

زلفوں والو! یہ اندھیر ــــــ دُہرے دُہرے کالے ناگ

تعجب ہے کہ یہ شعر انھوں نے اپنے انتخاب میں کس طرح داخل کیا۔ رعایت لفظی کی اور مثالیں ملاحظہ ہوں:

اچانک نزولِ بلا ہو گیا ــــــ یکایک ترا سامنا ہو گیا
یوں یاد آؤ گے ہمیں اصلا خبر نہ تھی ــــــ یوں بھول جاؤ گے ہمیں وہم و گماں نہ تھا
سمجھتا ہوں کہ تم بیداد گر ہو ــــــ مگر پھر داد لینی ہے تمھیں سے
حق بنا، باطل بنا، ناقص بنا، کامل بنا ــــــ جو بنانا ہو بنا لیکن کسی قابل بنا
یہ کیفیت بارشوں کی یہ مستی سحاب کی ــــــ توفیق ہو تو نہر بہا دوں شراب کی

ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ الفاظ کی تکرار میں ایک خاص لطف محسوس کرتے ہیں:

تم اور دل آزادی اربابِ محبت ــــــ اربابِ محبت کا یہ شیوہ نہیں ہوتا
شاد کر ہم غمزدوں کو شاد کر ــــــ یاد کر حق ہائے خدمت یاد کر
خیالِ نگاہِ محبت عبث ــــــ کہ تابِ نگاہِ محبت کہاں
ارمانِ التفاتِ دلِ دوستاں درست ــــــ شایانِ التفاتِ دلِ دوستاں کہاں

"اربابِ محبت"، "شاد کر"، "نگاہِ محبت"، "التفاتِ دلِ دوستاں" کی تکرار ظاہر ہے۔ اسی قسم کی مثالیں ہر جگہ آزاد انصاری کی غزلوں میں نظر آتی ہیں اس تکرار سے قارئین محظوظ بھی ہوتے ہیں لیکن اکثر تکرار اصل مدعا ہو جاتی ہے اور اس سے کسی خاص اثر کی تخلیق مد نظر نہیں ہوتی یا کسی پر جوش جذبے کے ماتحت عمل میں نہیں آتی۔ بہرکیف آزاد انصاری نہایت سادگی سے کام لیتے ہیں، جب ان کی توجہ الفاظ میں اُلجھ کر نہیں رہ جاتی ہے تو ان کی سطحیت گہرائی سے بدل جاتی ہے اور قارئین کی توجہ الفاظ کو چھوڑ کر معانی کی طرف رجوع کرتی ہے:

آ گرو اس قدر قریب نہ آ ــــــ کہ تماشا محال ہو جائے
اعتبارات سے بالا ہو جا ــــــ اعتبارات میں کیا رکھا ہے
بے خبر کا خبر مشکل نہیں ــــــ بے خبر ہو جا، خبر ہو جائے گی
مرا بارِ گرانِ مہربانی کون اٹھا سکتا ــــــ ترا نامہرباں ہونا کمالِ مہربانی ہے

نوح ناروی کے شعروں میں اتنی بھی گہرائی نہیں ملتی۔ یہ داغ کا تتبع کرتے ہیں، زبان کی روانی، چستی، برجستگی، شگفتگی موجود ہے لیکن اس میں یہ اپنے اُستاد سے بہت پیچھے ہیں۔

دکھا دے پانچ عالم اک پیام شوق نے مجھ کو — اُلجھنا، روٹھنا، لڑنا، بگڑنا، دور ہو جانا

کیوں کر بسر ہوئی شبِ فرقت نہ پوچھئے — سب مجھ سے پوچھئے یہ مصیبت نہ پوچھئے

ہمیشہ بادہ خواروں پر خدا کو مہرباں دیکھا — جہاں بیٹھے گھٹا اُٹھی جہاں پہونچے بہار آئی

آپ ہیں ہم ہیں مے ہے ساقی ہے — یہ بھی اک امر اتفاقی ہے

وہ نادم ہوئے قتل کرنے کے بعد — ملی زندگی مجھ کو مرنے کے بعد

جو اس قسم کی "شاعری" پسند کرتے ہیں انھیں نوح ناروی کے کلام میں کافی لطف و سرور حاصل ہو سکتا ہے۔

اس گروپ کے شاعروں کو میں لفظی بازیگر تصور کرتا ہوں۔ یہ لفظوں کی مدد سے حیرت انگیز کرشمے دکھاتے ہیں، جن سے ظاہر بیں نظر فریب میں آجاتی ہے اور ان بازیگروں کی چابکدستی سے مرعوب و متحیر ہو جاتی ہے لیکن ذرا غور سے دیکھنے سے اس چابکدستی کا بھید کھل جاتا ہے۔

(۸)

چوتھا گروپ:۔ اب تین شاعروں کی باری ہے:۔ جگر، آرزو اور جلیل۔ یہ بھی قدیم رنگ تغزل کے علمبردار ہیں لیکن کسی حد تک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تینوں شعراء غزل کے محدود میدان میں خوش نظر آتے ہیں، اس کی تنگی سے ذرا بھی نہیں گھبراتے۔ غالباً انھیں اس تنگی کا احساس بھی نہیں۔ مضامین غزل اور اسلوب بیان میں بھی یہ کوئی انقلاب برپا نہیں کرتے اور نہ کسی انقلاب کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اپنے اپنے رنگ میں یہ مروجہ خیالات و جذبات کو چمکاتے ہیں اور پُرانی باتوں کو نئے پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔ زبان پر کامل قدرت ہے اور اسی کے استعمال میں انفرادیت سے کام لیتے ہیں۔ اور اسی انفرادی استعمال کی وجہ سے انھوں نے اپنے لئے ایک نہایت ہی محدود لیکن مخصوص جگہ بنالی ہے۔

جگر مرادآبادی نئے اور پُرانے رنگ تغزل دونوں میں طبع آزما ہوتے ہیں اور اس وجہ سے ان کی اہمیت زیادہ نہیں کم ہو جاتی ہے، ایک طرف تو یہ رنگ ہے:۔

ترے بیاں میں قاصد کچھ اشتباہ نہیں — خبر ایں قدر، کہ یہ فرمودہ نگاہ نہیں

جو ساز کہ خود نغمۂ حیراں تھا اسی کو — اندیشۂ مضراب ہے معلوم نہیں کیوں

ہر حقیقت کو بہ انداز تماشا دیکھا — خوب دیکھا ترے جلوؤں کو مگر کم دیکھا

حسن بے حسن بے اماں، غمزہ کرا، غم نہاں — پھر یہ نگاہ دل کہاں پردہ اگر اُٹھا دیا

سوز تمام چاہئے رنگ دوام چاہئے — شمع تہ مزار ہو، شمع سر مزار کیا

اور دوسری جانب یہ عالم:۔

آنکھوں کا تھا قصور نہ دل کا قصور تھا — آیا جو میرے سامنے میرا غرور تھا

ہم سے پوچھو تو عشق کی بھی نگاہ — سخت کافر نگاہ ہوتی ہے

ان کے بہلائے بھی نہ بہلا دل، — رائگاں سعی التفات گئی،

کوچۂ عشق میں نکل آیا، — جس کو خانہ خراب ہونا تھا

مجھ ناتوان عشق کو سمجھا ہے تم نے کیا — دامن پکڑ لیا تو چھڑایا نہ جائے گا

تعجب ہوتا ہے کہ ایک ہی شاعر نے ایسے دو مختلف رنگ کیوں اختیار کئے۔ جگر کا اپنا رنگ ان دونوں کے بیچ میں واقع ہوا ہے اور جب وہ قصداً نئے یا پُرانے رنگ میں طبع آزما نہیں ہوتے تو کامیاب ہوتے ہیں۔ ان کے کامیاب اشعار میں (اور ان کی تعداد نسبتاً کم ہے) آمد، روانی، بیساختگی اور توازن کا وجود ہے لیکن بنظاہر یہ خوبیاں ان کے سارے اشعار میں نظر آتی ہیں اس لئے سطحی نظران کے کامیاب و ناکامیاب اشعار میں تمیز نہیں کرتی اور بعضوں کو برابر کامیاب تصور کرتی ہے۔ مثلاً ان شعروں پر شاعروں میں ضرور "سبحان اللہ" کی صدا بلند ہوگی:

اللہ اللہ رے مستی شاعر ــــ قلب غنچے کا آنکھ شبنم کی
ان لبوں کی جاں نوازی دیکھنا ــــ منہ سے بول اٹھنے کو ہے جام شراب
تو نے جس اشک پہ نظر ڈالی ــــ جوش کھا کر وہی شراب ہوا
دل دھڑکتے ہی پھر گئی وہ نظر ــــ لب تک آئی نہ تھی کہ بات گئی

لیکن ان شعروں میں حقیقی تاثیر نہیں وہ تاثیر جو اس شعر میں موجود ہے :۔

کلی کوئی جہاں پر کھل رہی ہے ــــ وہیں اک پھول بھی مرجھا رہا ہے

مضمون نیا نہیں لیکن اسلوب بیان نے اسے نیا اور پر اثر بنا دیا ہے۔

جلیل مانک پوری، قدیم و جدید رنگ تغزل کے جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔ وہ اپنے رنگ سے واسطہ رکھتے ہیں اور یہ رنگ قدیم رنگ تغزل کی یادگار ہے نیاز صاحب فرماتے ہیں :۔ "جناب جلیل کے یہاں، سلاست بیان کا یہ عالم ہے گویا ایک نرم و سبک رو چشمہ ہے جو ہلکے ترنم کے ساتھ بہتا چلا جا رہا ہے ..... جلیل کے یہاں نہ تصوف ہے نہ فلسفہ نہ کوئی مضمون آفرینی ہے نہ فکر و خیال کی بلندی لیکن ان کے کلام کی سادگی، روانی، بے تکلفی اور خیالات کا سلجھا ہوا ہونا اس گلاب کا سا حسن ہے جس کے قبا کو گل ہونے کی ضرورت نہیں"۔ یہ تعریف اپنی جگہ پر موزوں ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس سے بہتر تعریف ممکن بھی نہیں۔ تعجب ہے تو اس پر کہ دور حاضر کی نئی تحریکوں سے یہ متاثر نہ ہوئے اور اپنی ساری توجہ غزل پر صرف کر دی۔ بات یہ ہے کہ جلیل نے اپنی نظر ماضی پر رکھی اور کبھی مستقبل و حال کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ ان کی شاعری کی جڑیں ماضی کی زمین میں پیوستہ ہیں اس کی شاخیں ماضی کی فضا میں جھومتی ہیں اور اس کے پھولوں میں بھی عہد رفتہ کی خوشبو ہے اس لئے ان کے کلام سے کامل تشفی حاصل نہیں ہوتی :۔

او آنکھ چرا کے جانے والے ــــ ہم بھی تھے کبھی تری نظر میں
مزے بے تابیوں کے آ رہے ہیں ــــ وہ ہم کو ہم انھیں سمجھا رہے ہیں
آپ اور سوگ مرا کیا کہنا ــــ دیکھئے لب پہ ہنسی آئی ہے
مار ڈالا مسکرا کر ناز سے ــــ ہاں مری جاں پھر اسی انداز سے
چھپنے والے تجھے خبر بھی ہے ــــ نگہ شوق پردہ در بھی ہے
میرے آنے کی تو بندش ہے مگر ــــ کیا کریں گے میں اگر یاد آیا

دیکھا! یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ جلیل ان کوششوں سے باخبر ہیں جو غزل میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے عمل میں آئی ہیں۔ ان کی شاعری بیسویں صدی کی فضا میں سانس نہیں لیتی۔ زبان سے ظاہر ہوتا ہے کہ داغ و امیر اپنا اثر ڈال چکے ہیں۔ زبان سے قطع نظر یہ شاعری میر و مومن کی شاعری کی فضا میں سانس لے سکتی ہے۔

آرزو لکھنوی کا مقام جلیل و جگر کے بعد ہے۔ یہ بھی کہنہ مشق ہیں اور "صحت زبان و بیان کے لحاظ سے استنادی حیثیت رکھتے ہیں" ان کے شعروں میں جگر کی رنگینی جگر کا جوش و ولولہ نہیں اور نہ جلیل کی تازگی ہے۔ لیکن ان کے سادہ شعروں میں بھی اکثر اثر جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ انھیں درد بھرے مضامین پسند اور مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے اپنے ہمعصروں میں یہ حسرت و فانی سے قریب معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے مرتبہ تک نہیں پہونچتے۔ مضامین کی یکرنگی سے طبیعت گھبرانے لگتی ہے اور یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کے خیالات کی دنیا نہایت تنگ ہے :

رہنے دو تسلی تم اپنی دکھ جھیل چکے دل ٹوٹ گیا ــــ اب ہاتھ سے ہوتا ہے کیا جب ہاتھ سے ناتا چھوٹ گیا
لطف بہار کچھ نہیں گو ہے وہی بہار ــــ دل کیا اجڑ گیا کہ زمانہ اجڑ گیا،
کیا سوز محبت میں جس ضبط نے کی ہو ــــ در بند ہے اور چار طرف آگ لگی ہے
دبائے بیٹھا ہوں سینے میں راکھ کا اک ڈھیر ــــ نہ دل ہے اب نہ جلے دل کی آہ کا شعلہ
آگ دل میں لگی نہ ہو جب تک ــــ آنکھ اشکوں سے تر نہیں ہوتی

اے سانس نہ آکر دل میں ہے غم　　　ٹیس اُٹھی ہے جب جاگی ہے
سب تو خیر ان کی حال پُرسی پر　　　دل امنڈ آیا اشک بھر آئے

یہ چند مثالیں تھیں۔ ان سے اُفتادِ طبیعت صاف ظاہر ہوتی ہے۔ انھیں شیون و فریاد سے خاص موافقت ہے لیکن یہ موافقت فطری کم اور اختیاری زیادہ ہے۔ شیون و فریاد کرنا اُردو شعرا کا محبوب شیوہ ہے اور آرزو لکھنوی بھی اس روایتی طریقہ کے پیرو ہیں لیکن مضامین کا انتخاب صرف تقلید کا نتیجہ نہیں انھیں اس قسم کے مضامین سے کچھ فطری موافقت بھی ہے اور اسی وجہ سے ان کے اشعار میں تاثیر نظر آجاتی ہے اور اسی تاثیر کی وجہ سے میں نے انھیں اس گروپ میں جگہ دی ہے ورنہ ان کی جگہ بھی دوسرے گروپ میں ہوتی۔

(۹)

پانچواں گروپ :- آخری گروپ میں وہ تین شاعر ہیں جنھیں میں حقیقی معنوں میں شاعر سمجھتا ہوں، حسرت، فانی اور فراق۔ یہ غزل کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور غزل کے محدود میدان میں خوش و قانع ہیں۔ غزل کے نقائص و حدود واضح کئے جا چکے ہیں۔ ان کی شاعری میں وہ نقائص و حدود موجود ہیں بہر کیف موجودہ زمانہ میں غزل اپنے محدود محاسن کھو چکی تھی، یہ محض رسمی اور تقلیدی چیز ہو کر رہ گئی تھی۔ ان شعرا نے غزل کے کھوئے ہوئے محاسن کو پھر حاصل کیا، اسے خود گی، ابتذال تقلید سے نجات دلا کر اسے اصلیت، حقیقت اور تاثیر سے مزین کیا۔ یہ شعرا اپنے دل کی ترجمانی کرتے ہیں، اسی لئے ان کے شعروں میں تاثیر ہے۔ ان کے اشعار دل سے نکلے ہیں اسی لئے دلوں میں گھر کرتے ہیں۔ ان کے دل درد آشنا ہیں اس لئے جو شیون و فریاد ان کے شعروں میں ہے وہ رسمی نہیں۔ اس کی بنا حقیقت پر ہے لیکن ان کی قوت حاسہ بیسویں صدی کے ماحول سے متاثر نہیں ہوئی ہے۔ ان کی شاعری بغیر کسی تغیر و تبدل کے میر و مومن کی فضا میں سانس لے سکتی ہے یہ ضرور ہے کہ بنیادی جذبات کبھی بدلتے نہیں لیکن قوت حاسہ مختلف زمانہ میں مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے اور ترجمانی جذبات میں قوت حاسہ کا تغیر، ماحول کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔

مثلاً ان شعروں کو لیجئے :-

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا　　　ابتو اظہارِ محبت بر ملا ہونے لگا
دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا　　　شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا
سُن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی　　　آج تیرا نام لیکر کوئی غافل ہو گیا،
اس کو بھولے تو ہوئے ہو فانی　　　کیا کروگے وہ اگر یاد آیا،
ہم سے کیا ہو سکا محبت میں　　　تو نے تو خیر بے وفائی کی
یونہی فراق نے عمر بسر کی　　　کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں

ان شعروں میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ یہ عصر حاضر کی پیداوار ہیں۔ مضامین اور اظہار مضامین دونوں موجودہ ماحول، موجودہ فضا، موجودہ قوت حاسہ سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے۔ کہا جا سکتا ہے کہ جو جذبات غزل میں داخل کئے جاتے ہیں وہ بنیادی ہیں۔ یہ ہر زمانہ میں سطحی تغیرات کے باوجود بھی یکساں ہیں اسلئے ان کے اظہار میں بھی کسی مقامی اور کسی خاص زمانہ و ماحول کے اثر کا وجود ضروری نہیں۔ لیکن شاعری اور شاعر خلا میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ شاعر اپنے انفرادی حس کے ساتھ بھی ایک حد تک اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے، اس لئے اس کی شاعری بھی ماحول کی رنگ آمیزی سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

حسرت، موجودہ شعرائے متغزلین میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ بظاہر ان کے اشعار اور دوسرے شعرا کے اشعار میں کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا۔

ہم نے کس دن ترے کوچے میں گزارا نہ کیا　　　تو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا،
ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاریِ دل،　　　التفات ان کی نگاہوں نے دوبارا نہ کیا
محفلِ یار کی رہ جائے گی آدھی رونق　　　ناز کو اس نے اگر انجمن آرا نہ کیا

وہی کوچۂ یار، گرفتاریِ دل اور نازکی انجمن آرائی کا قصہ ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ یہاں فضا سراسر مختلف ہے اور پُرانی داستان نئی طرح میں جلوہ گر ہے۔ یہاں الفاظ کی بے مزہ اُلٹ پھیر نہیں، یہاں فرسودہ مضامین کی خشک و بے لطف تکرار نہیں بلکہ سیدھے سادے الفاظ میں صفائی، اختصار اور

کامیابی کے ساتھ، زندہ اور لطیف احساسات کا بیان ہے:

حُسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

جو سمجھ نہ کرے شانِ توجہ پیدا — دیکھ بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی — دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

ان شعروں میں اصلیت کی صاف جلوہ گری ہے، یہی ان کی تاثیر کا سبب ہے۔ دوسرے شعرا زیادہ کاوش، زیادہ تکلف و تصنع، شاید زیادہ غور و فکر سے بھی کام لیتے ہیں لیکن وہ حسرتؔ کی طرح کامیاب نہیں ہوتے، حسرتؔ کی طبیعت حساس واقع ہوئی اور دل سوز و گدازِ عشق سے آشنا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی شاعری کی ایک مخصوص فضا ہے جو الفاظ و مضامین سے وابستہ نہیں الفاظ و مضامین معمولی ہیں، دوسرے بھی ان الفاظ و مضامین پر قدرت رکھتے ہیں لیکن ان کے شعر کسی انفرادی فضا میں سانس نہیں لیتے۔ حسرتؔ کی شاعری کی جان یہ انفرادی فضا ہے جو ان کے شعروں میں جان ڈال دیتی ہے اور مردہ الفاظ و خیالات زندہ اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ جس کی طبیعت حساس، جس کی نظر باریک بیں ہے وہ اس فضا اور اس کی "فسونکاری" سے فوراً واقف ہو جاتا ہے اور یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ کسی زندہ اور زندگی بخشنے والی دُنیا میں جا پہونچا ہے:-

تاثیرِ برقِ حُسن جو ان کے سخن میں تھی، — اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی

واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب — آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی

اک رنگ التفات بھی اس بے رُخی میں تھا — اک سادگی بھی اس نگہِ سحر فن میں تھی

محتاج بوئے عطر نہ تھا جسم خوب یار — خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی

کچھ دل ہی بجھ گیا ہے مرا، ورنہ آج کل، — کیفیت بہار کی شدت چمن میں تھی

معلوم ہوگئی مرے دل کو زراہ شوق — وہ بات پیار کی جو ہنوز اس دہن میں تھی

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی — جو روشنی کہ شام سوادِ چمن میں تھی

اسی غزل میں حسرتؔ نے اپنی مخصوص فضا پیدا کی ہے۔ یہ دو شعر،

محتاج بوئے عطر نہ تھا جسم خوب یار — خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی — جو روشنی کہ شام سوادِ وطن میں تھی

مضمون کے لحاظ سے بالکل مختلف ہیں۔ پہلے شعر میں مضمون معمولی ہی نہیں عامیانہ بھی ہے۔ اگر کوئی دوسرے شاعر اس کا ترجمان ہوتا تو ترجمانی میں ابتذال کا وجود ممکن تھا۔ دوسرے شعر میں کسی غربت نصیب کے احساس کی ترجمانی ہے اور صاف ظاہر ہے کہ یہ احساس ذاتی ہے، اس میں اصلیت موجود ہے۔ دوسرا شعر مضمون کے لحاظ سے پہلے شعر سے بلند ہے اور اس میں کسی قسم کے ابتذال کا احتمال نہیں۔ لیکن دونوں شعر کی فضا ایک ہے اور اس فضا کی ایک خصوصیت گداز ہے۔ پہلے شعر میں، جہاں تک مضمون کا تعلق ہے، غمگینی کا وجود نہیں لیکن پھر بھی اثر غم فزا ہوتا ہے۔

مخصوص فضا کی طرح حسرتؔ کی ایک مخصوص "آواز" بھی ہے۔ ان کا لہجہ دوسروں کے لہجوں سے یکقلم مختلف ہے۔ ممکن ہے کہ کسی ایک شعر کو سنکر کہنا ممکن نہ ہو کہ یہ حسرتؔ کی آواز ہے لیکن کسی ایک غزل کے دو تین شعر سنکر جسے مذاق صحیح ہے وہ کہہ اُٹھے گا کہ یہ حسرتؔ کے سوا اور کسی کے نہیں ہو سکتے۔ ان کی آواز مترنم ہے۔ انکے لہجہ میں نرمی اور بے ساختگی ہے لیکن یہ چیزیں اور شعرا میں بھی مل سکتی ہیں۔ حسرتؔ کے لہجہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کبھی بلند و پست نہیں ہوتا۔ وہ سامعہ کو مرعوب کرنے کے لئے اپنی آواز بلند نہیں کرتے، اسی طرح وہ سرگوشیاں بھی نہیں کرتے۔ ان کی آواز عموماً اسی سطح پر ہوتی ہے جو ہم عام بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔ جذبات پر جوش ہوں لیکن وہ اپنے لہجہ کو بلند آہنگ نہیں ہونے دیتے کیونکہ انھیں اپنے جذبات پر کامل اختیار ہے۔ لہجہ کی یکسانی سے کوئی بُرا اثر نہیں ہوتا کیونکہ اس کی یکسانی کے باوجود اس میں ہلکے ہلکے تغیرات ہوتے رہتے ہیں، یہ تغیرات اسی قسم کے ہیں جو عام بول چال میں ہوتے ہیں:-

چھپ کے اس نے جو خود نمائی کی — انتہا تھی یہ دلربائی کی،

دام سے ان کے چھوٹنا تو کہاں ‏ ‏ ہاں ہوس بھی نہیں رہائی کی
ہو کے نادم وہ بیٹھے ہیں خاموش ‏ ‏ صلح میں شان ہے لڑائی کی

ترے درد کو جس سے نسبت نہیں ہے ‏ ‏ وہ راحت مصیبت ہے راحت نہیں ہے
ترے غم کی دنیا میں اے جانِ عالم ‏ ‏ کوئی روح محروم راحت نہیں ہے
مجھے گرم نظارہ دیکھا تو ہنس کر ‏ ‏ وہ بولے کہ اس کی اجازت نہیں ہے

دیکھا! یہ ہے حسرت کی آواز۔ اشعار کو بار بار پڑھئے۔ لہجہ بظاہر یکساں اور عام بول چال کی سطح پر ہے لیکن ساتھ ساتھ اس میں ہلکی تبدیلیاں بھی ہیں۔ مثلاً دوسرے، پانچویں اور آخری اشعار میں لہجہ مختلف ہے لیکن یہ اختلافات اس قدر شدید نہیں کہ اس لہجہ کی یک رنگی میں خلل انداز ہوں۔

فانی بدایونی کے کلام میں دو قسم کے اشعار ملتے ہیں۔ ایک طرف وہ غالب کے زیرِ اثر فلسفیانہ خیالات کو نظم کرتے ہیں اور دوسری جانب جذبات نگاری پر اپنا شعار قرار دیتے ہیں، معنی آفرینی ارادی ہے اور جذبات نگاری فطری، اس لئے جذبات نگاری میں وہ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ یہاں ان کی جذبات نگاری کے متعلق کچھ لکھا جائے گا۔ وہ کہتے ہیں:-

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں ‏ ‏ جو اجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

اس "نرالی بستی" کا بیان ان کی شاعری کی بنیاد ہے۔ فانی کی لغت میں زندگی اور غم مترادف الفاظ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "غمِ جاوداں" ان کی زندگی ہے انھیں دکھا ہوا دل عنایت ہوا ہے۔ وہ اسی زندگی، اسی غمِ جاوداں، اسی دکھے ہوئے دل کی تشریح کرتے ہیں۔ اور اپنی زندگی میں زندگی انسان کو منعکس دیکھتے ہیں اسی لئے ان کی دنیا غم سے مملو نظر آتی ہے اور اس دنیا میں مسرت کی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ یہ دنیا وسیع نہیں تنگ ہے لیکن اپنے حدود میں کافی پُر اثر بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانی ‏ ‏ وجود دردِ مسلّم علاج نامعلوم

وہ ایک مصرعہ میں اپنے خیالات کو قلمبند کر دیتے ہیں: "وجود دردِ مسلّم علاج نامعلوم" یہ ہے زندگی کی حقیقت اور اسی حقیقت کو وہ موثر پیرایہ میں اپنے شعروں میں بیان کرتے ہیں:-

پچھتائیں گے آپ دل کو لیکر ‏ ‏ کمبخت غم آشنا بہت ہے

طولِ رودادِ غم معاذاللہ ‏ ‏ عمر گزری ہے مختصر کرتے

ہاں ناخنِ غم کمی نہ کرنا ‏ ‏ ڈرتا ہوں کہ زخمِ دل نہ بھر جائے

زندگی یادِ دوست ہے یعنی ‏ ‏ زندگی ہے تو غم میں گزرے گی

فانی امیدِ مرگ نے بھی دے دیا جواب ‏ ‏ جینے کی ہجر میں کوئی صورت نہیں رہی

کس غم میں ہے اے رہروِ غم دھوکے میں نہ آنا منزل کے ‏ ‏ یہ راہ بہت کچھ چھانی ہے اس راہ میں منزل کوئی نہیں

یہ اشعار بلا تخصیص پیش کئے گئے ہیں۔ بعض اشخاص ایسے ہوتے ہیں جنھیں غم و الم میں ایک خاص مسرت ملتی ہے، جو غمِ زندگی سے گریز نہیں کرتے بلکہ غمِ زندگی کا خیر مقدم کرتے ہیں، جو انبساط و سرور سے واقف نہیں ہوتے اور نہ واقف ہونے کی کوشش کرتے ہیں، جن کا دلچسپ مشغلہ "غم کی جستجو" ہے۔ فانی اسی قسم کی طبیعت رکھتے ہیں۔ وہ صرف وجودِ درد اور درد کے لاعلاج ہونے کو تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ اس حقیقت کا علم انھیں مسرت بخشتا ہے اور وہ ہل من مزید کی صدا لگاتے ہیں:

ہاں ناخنِ غم کمی نہ کرنا ‏ ‏ ڈرتا ہوں کہ زخمِ دل نہ بھر جائے

فانی زخمِ دل کی دوا نہیں چاہتے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں زخمِ دل نہ بھر جائے۔ گویا زخمِ دل نہیں بلکہ اس کا علاج انھیں بُرا معلوم ہوتا ہے۔ وہ تلقین کرتے ہیں:-

غیرت ہو تو غم کی جستجو کر ‏ ‏ ہمت ہو تو بے قرار ہو جا

وجود غم کو تسلیم کرنا، غم سے گریز نہ کرنا، غم کو ہمت کے ساتھ برداشت کرنا، یہ چیزیں لائق تحسین ہیں اور یہ شعر کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتی ہیں، لیکن قصداً غم کی "جستجو" کرنا، سمجھ بوجھ کر بے قراری کو اپنا شعار قرار دینا لائق تحسین نہیں۔ اس سے شاعر کا طبعی رجحان ظاہر ہوتا ہے اور یہ رجحان شاعری میں طاقت کے بدلے کمزوری کا سبب ہوتا ہے۔ فانی کے کلام میں بھی اس رجحان کا نتیجہ کمزوری ہے اور اس مسلسل شیون و فریاد سے ناخوشگوار اثر پیدا ہو جاتا ہے۔

فراق گورکھپوری ان چند پڑھے لکھے شعرا میں ہیں جو مغربی ادب سے بھی واقف ہیں۔ یہ صرف شاعر ہی نہیں نقاد بھی ہیں اور اپنی شاعری پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں اور فن شاعری پر بھی غور و فکر کرتے ہیں اور اس غور و فکر میں مغربی خیالات سے استفادہ کرتے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ مغربی ادب سے واقفیت کے بعد بھی وہ غزل کی خامیوں کو محسوس نہیں کرتے اور اپنے احساسات کو صورت نظم میں جلوہ نہیں کرتے۔ اگر دوسرے اردو شعرا غزل کو شاعری کی تکمیل سمجھیں تو چنداں مضائقہ نہیں لیکن فراق کی یہ بے خبری باعث استعجاب و تاسف ہے۔

فراق اپنی شاعری کی ایک خصوصیت اتحاد ضدین بتاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے اور یہ صفت انھیں موجودہ شعرا میں امتیازی حیثیت عطا کرتی ہے:۔

تھی یوں تو شام ہجر مگر پچھلی رات کو — وہ درد اٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

دل دُکھ کے رہ گیا یہ الگ بات ہے مگر — ہم بھی ترے خیال سے مسرور ہو گئے

عشق کے اضطراب میں پہلا یہ نرمیاں کہیں — سوز نہاں کی شکل میں کون یہ مسکرا دیا

دوسری خصوصیت جس کا وہ ذکر کرتے ہیں وہ اجتماع ضدین ہے۔ اس کی بھی مثالیں ہر جگہ نظر آتی ہے:۔

اک فسوں ساماں نگاہ آشنا کی دیر تھی — اس بھری دُنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

حیات ہو کہ اجل سب سے کام لے غافل — کہ مختصر بھی ہے کارِ جہاں دراز بھی ہے

کچھ نہیں کہتیں وہ نگاہیں مگر — بات پہونچتی ہے کہاں سے کہاں

لیکن اکثر فراق اجتماع ضدین کو ایک دلچسپ کھیل سمجھ کر اس میں منہمک ہو جاتے ہیں:۔

تیری رنگینیٔ طبیعت سے — عشق کی سادگی بھی دور نہیں

شام ہجراں سُنا گئی اکثر — خامشی بھی کہانیاں تیری

حسرت و فانی کی طرح فراق کا دل بھی زخمی ہے، اس لئے ان کی آواز بھی درد بھری ہے لیکن وہ بھی حسرت کی طرح کبھی آواز بلند نہیں کرتے، چیخ پکار سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنی درد بھری داستان کو نرم، دھیمی، شیریں آواز میں بیان کرتے ہیں، درد کی شدت میں بھی وہ اپنی آواز پر کامل اختیار رکھتے ہیں اور اسے بلند آہنگ نہیں ہونے دیتے۔ وہ امیر مینائی کی لے میں ٹھہراؤ اور بہاؤ کا امتزاج پاتے ہیں۔ یہ امتزاج امیر مینائی کی لے میں تو موجود نہیں لیکن فراق کی لے میں بدرجۂ اتم موجود ہے:۔

تیرے چھونے سے بھی دُکھے جو — کون اس دل کی پھانس نکالے

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں — تو نے تو خیر بے وفائی کی

بعد مدت کے تیرے ہجر میں پھر — آج بیٹھا ہوں دل کو سمجھانے

زندگی اے دوست غم کا نام ہے — یہ تو شاید شکوۂ بیجا نہیں

ابھی فکر علاج عشق نہ کر — ابھی کچھ دن یہ درد سہنے دے

دل میں کچھ غم سے کچھ سرور بھی ہے — کوئی نزدیک بھی ہے دور بھی ہے

نیاز صاحب، فراق کی انفرادی خصوصیت کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:۔ "وہ شعر نہیں کہتا، زندگی اور محبت کے نکات پر تبصرہ کرتا ہے اور اتنا لطیف و عمیق تبصرہ کہ شاعری سے علیحدہ ایک مستقل لذت محسوس ہونے لگتی ہے"۔ بات یہ ہے کہ نوجوان شعرا مغربی ادب اور مغربی تنقید سے واقف ہو گئے ہیں۔ وہ خصوصاً آرنلڈ کے اس مقولے سے کہ "شاعری زندگی کی تنقید ہے" بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ فراق بھی غالباً اس سے متاثر ہوئے ہیں اور اس سے متاثر ہو کر اسے عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے اشعار میں "زندگی اور محبت کے نکات پر تبصرے" ملتے ہیں:۔

ابھی فطرت سے ہوتا ہے نمایاں شانِ انسانی ابھی ہر چیز میں محسوس ہوتی ہے کمی اپنی
تجھے دنیا کو سمجھنے کی ہوس ہے اے کاش تجھے دُنیا کو بدل دینے کا ارماں ہوتا
خیال کو ہے اثر نہ جانو عمل کی چنگاریاں ہیں اس میں کہ آج ظلمت سرائے دل میں جو نور ہے کل وہ نار ہوگا
احساس بس احساس ہے یہ غم یہ خوشی کیا اے عشق تجھے کار اہم اور ہی کچھ ہے
ہزار حیات کی منزلوں میں وہ فرق ناز و نیاز بھی کہ جہاں ہے عشق برہنہ پا وہیں حسن خاک بسر بھی ہے
سکوت ہوش کو مرکز بنا محبت کا جنوں کا غلغلہ نزدیک و دور ہونے دے

لیکن فراقؔ محض اس تنقید کو کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ تنقید قیمتی نہیں ہو سکتی جب تک اس میں "شاعرانہ حسن و شاعرانہ صداقت" موجود نہ ہو۔ اس کے علاوہ فراقؔ کے خیالات میں اکثر خامی نظر آتی ہے مثلاً:-

تجھے دُنیا کو سمجھنے کی ہوس ہے اے کاش تجھے دُنیا کو بدل دینے کا ارماں ہوتا

بغیر دُنیا کو سمجھے ہوئے دُنیا کو بدل دینے کا ارمان کسی طرح بھی لائقِ تحسین نہیں ہو سکتا۔ یہ تو اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جس کی وجہ آج ہر شخص بغیر سمجھے بوجھے "انقلاب! انقلاب!" کی صدا بلند کرنے لگتا ہے۔ اس کا سبب غالباً فطری رومانیت ہے اور اسی رومانیت کی وجہ سے غالباً اس قسم کے "کچھ" "شعروں کے مرکب" ہوتے ہیں:-

جب دیکھو اس کو، ہے یہ عالم اک انگڑائی آئی ہوئی سی،
آ نہ گئی، آ نہ گئی تیری یاد چھا نہ گئیں چھا نہ گئیں بدلیاں
اب فضا میں وہ اک کسک سی نہیں مٹ چلی ہیں نشانیاں تیری،
آج تو کفرِ عشق بول اُٹھا آج تو بول اُٹھے ہیں بُت خانے
رو کر عشق خموش ہوا ہے وقت سہانا اب آیا ہے،

(۱۰)

ہندوستان میں شعر کہنے والے تو بہت ہیں لیکن شاعروں کی تعداد بہت کم ہے۔ ہر پڑھا لکھا جو عروض سے واقف ہے یا ہر موزوں طبع شعر کہہ سکتا ہے۔ اس آسانی کی وجہ سے ہندوستان میں شعرائے متغزلین کی تعداد بیشمار ہے۔ "بزمِ نگار" میں صرف وہی شعرا ہیں جنھوں نے اپنے لئے غزل گوئی میں کوئی نہ کوئی مخصوص جگہ بنالی ہے اور جن کی غزلیں زبان کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ لیکن اس سرسری تنقید سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ان اکتیس شعرا میں صرف پانچ ایسے ہیں جنھیں شاعروں کی صف میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ غزل خود کوئی بلند صنفِ شاعری نہیں۔ اگر اس کی بقا کی ضرورت سمجھی جائے تو کم از کم اس کے معیار کو بلند رکھنا چاہئے، تاکہ ہر کس و ناکس غزل گو شعرا کی فہرست میں داخل نہ ہو سکے۔ اور یہ معیار صرف زبان کی صحت وغیرہ صحت پر مبنی نہ ہو۔ جو چیز اچھے اشعار کو بُرے اشعار سے ممیز کرتی ہے وہ اصلیت ہے اور اس اصلیت کی پہچان عوام کے لئے آسان نہیں۔ بہترین اساتذہ کے بہترین اشعار سے واقفیت، اگر اس واقفیت میں ادراک کا بھی دخل ہے، قوت حاسہ کی تربیت کر سکتی ہے اور اسے تیز و حساس بنا کر اسے اچھے بُرے میں تمیز کرنا سکھاتی ہے۔ جنھیں شعر و شاعری سے شغف ہے انھیں چاہئے کہ وہ اس طرح اپنی قوت حاسہ کی تربیت کریں اور ذوقِ صحیح طبیعت پیدا کریں۔

(نگار) پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب نے مقالہ نہایت محنت سے لکھا ہے اور کسی شاعر کو اپنی

رائے سے محروم نہیں رکھا۔ ابتدا میں انھوں نے غزل کی مخالفت میں کافی زوردار بحث کی ہے جسکی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ مدعا اس بات کا فیصلہ کرنا نہ تھا کہ غزل گوئی کوئی معقول مشغلہ ہے یا نامعقول، بلکہ مقصود صرف یہ تھا کہ جن شعراء نے اپنا کلام انتخاب کیا ہے وہ تغزل کے نقطۂ نظر سے کس مرتبہ کے شاعر ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ان کی یہ حرکت وحشیانہ ہے یا غیر وحشیانہ، اور جس چیز کو تغزل سمجھا جاتا ہے وہ ہماری موجودہ ضروریات زندگی کو پورا کرتی ہے یا نہیں۔

نقاد کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ آرٹ کے نقطۂ نظر سے ہٹ کر آرٹ پر رائے زنی کرے۔ اگر کلیم صاحب نقاش ہوتے اور میں اُن کے سامنے کوئی عریاں تصویر رائے زنی کے لئے پیش کرتا، تو کیا ان کا یہ فرض تھا کہ وہ پہلے عُریانی کی مذمت پر لکچر دیتے۔

بہرحال میں کلیم صاحب کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے ہر شاعر کے متعلق اپنی بے لاگ رائے پیش کر دی اور یہی میری خواہش تھی۔

انھوں نے، حسرت، فانی اور فراق کو حقیقی معنے میں شاعر مانا ہے، باقی شعراء کے متعلق جو رائے انھوں نے دی ہے وہ کسی جگہ دوسرے نقادوں سے مختلف ہے اور کہیں موافق بہرحال انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہ حیثیت مجموعی ایک ایسے "محتسب" کی رائے نہیں ہے جسے ہم "درونِ خانہ چہ کار" کہکر نظرانداز کرسکیں!

تبصرہ

(پروفیسر آل احمد سرور۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)

نگار کے خاص نمبر (جنوری سنہ ۶۲ء) میں اس دور کے غزل گو شعرا کا جو انتخاب پیش کیا گیا ہے وہ دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی۔ اس سے بہت سی کام کی باتیں
معلوم ہوتی ہیں اور بہت سے اچھے اشعار ایک جگہ مل جاتے ہیں۔ اس انتخاب پر نظر ڈالتے ہی سب سے پہلے یہ احساس ہوتا ہے کہ غزل گوئی کا زوال ابھی شروع نہیں ہوا
ہمارے شعرا کی سب سے محبوب صنعت سخن ابھی تک غزل ہی ہے۔ اور غزل کے نام لیوا صرف وہی لوگ نہیں جو لکیر کے فقیر ہیں یا جن کی حیثیت اُستاد سے زیادہ نہیں
ان میں وہ شاعر بھی ہیں جو ابتداء غزل سے کرتے ہیں مگر اب بھی اچھی نظمیں کہنے کے علاوہ اچھی غزلوں میں بھی اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسے بھی شعرا کم نہیں جو
اس دور کی ہنگامی زندگی کا سارا ہیجان اور اضطراب غزل میں بھر دیتے ہیں، جن کی اصطلاحیں نئی ہیں، جو غزل کی آراستہ و پیراستہ زبان کو چھوڑ کر عام فہم گر پر اثر زبان
استعمال کرتے ہیں، جو اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں لکھنے کے علاوہ اپنی۔ دُھنیں بھی ایجاد کرتے ہیں، جو پُرانے الفاظ سے کام لیتے ہیں، جو غزل کو صرف حسن و عشق کے لئے
نہیں، دُنیا کے سارے مسایل کی عکاسی کے لئے برتتے ہیں۔ غرض اس دور میں جو ترقی غزل کے میدان میں ہوئی ہے وہ اس قدر اہم ہے کہ اس سے چشم پوشی کرنا
ناانصافی کے مترادف ہے۔ اس ترقی کی طرف بہت سے اشارے نگار کے اس نمبر میں مل جائیں گے۔

ولی کے وقت سے لیکر غالب اور اُن کے ہمعصر شعرا تک تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوتے ہیں۔ اس عرصہ میں غزل نے تکمیل فن کے تمام مراحل طے کئے اور وہ ہماری
شاعری کی سب سے اہم اور سب سے مقبول صنف بن گئی۔ کہا جاتا ہے کہ آزاد اور حالی نے سب سے پہلے غزل کے خلاف بغاوت کی۔ مگر در اصل آزاد اور حالی غزل
کے باغی نہ تھے۔ اُس غزل کے خلاف تھے جو رسمی، محدود اور مصنوعی ہو گئی تھی۔ رسمی اس معنی میں کہ اُستادی، شاگردی کی روایت صنعتی معیار سے آگے بڑھ کر
شاعری کی راہ کو بھی مقید کرتی تھی، محدود اس معنی میں کہ معاملہ، روزمرہ، صنایع و بدایع تصوف اور فلسفہ کی آمیزش وغیرہ وغیرہ غزل کے لئے لازمی چیز ہو گئے
اور مصنوعی اس حیثیت سے کہ ناسخ اور ان کے دہلوی مقلد شاہ نصیر نے غزل کو بھی دماغی ورزش یا کمال فن کا ایک ذریعہ سمجھ لیا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ
شروع سے غزل رسمی، مصنوعی اور محدود تھی۔ غزل میں شروع ہی سے بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق بھی ہے اور مشاہدۂ نفس بھی۔ مگر متاخرین کے دور
میں صنعتی معیار زیادہ اہم ہو گیا تھا اور قدرا دالی قدریں ذرا دھندلی ہو گئی تھیں۔ اس لئے مشاہدۂ گرد و پیش جو غزل میں برابر ملتا ہے اس زمانہ میں اتنا نمایاں نہ رہا۔

اُردو کے غزل گو شاعر کے متعلق یہ خیال بہت عام ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بے نیاز، اپنے خیالات کی دنیا الگ بنائے رہتا تھا۔ در اصل ان کے خیالات کی
دنیا اتنی الگ تھلگ نہ تھی۔ وہ ان تمام چیزوں سے پوری طرح اثر لیتا تھا جو سیاسی، معاشرتی، یا اس زمانہ کی ادبی زندگی پر اپنا سایہ ڈالتی تھیں۔ وہ اس دُنیا کی
زنجیروں میں جکڑا ہوا ضرور رہتا تھا مگر اپنی شاعری میں ان زنجیروں کو اس طرح جھٹکے دیتا تھا کہ قید میں آزادی بھی نصیب ہو جاتی تھی۔ ان کے یہاں انتشار ضرور پراگندگی
بھی ملتی تھی مگر ذاتی کرکوئی خاص مرکزی خیال یا تصور سب سے حاوی ہو۔ حسن و عشق اس کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے تھے مگر ان کے سوا کچھ اور چیزوں کا
بھی وہ قایل تھا۔ "چیزے دگر" کے لئے وہ غزل سے پورا پورا فایدہ اُٹھاتا تھا اور بادہ و ساغر اور قفس و آشیاں کے پردے میں صرف تصوف اور فلسفہ ہی
نہیں بلکہ اور بہت کچھ بیان کر جاتا ہے۔ اُردو شاعری میں یہ رمزیت (Symbolism) اس قدر عام تھی کہ اس سے ہر بڑے چھوٹے شاعر نے
فایدہ اُٹھایا۔ یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم نے اپنے شعرا کے یہاں سوائے محاورہ، روزمرہ، معاملہ بندی، فکر شاعرانہ، خمریات، پند و نصایح، صنعت مراعاۃ النظیر کے
کچھ تلاش نہ کیا۔ حالی اور آزاد کے بعد وہ کمی اور بھی زیادہ ہو گئی جو ہمارے شعرا محسوس تو کرتے تھے مگر عشق پر دہ نقش میں بھلانا چاہتے تھے۔ مغربی کے اثر

سے شاعر کے نصب العین میں آزادی ہوئی۔ مغربی ادب پر نگاہیں جمنے لگیں۔ سیاسی حالات بد سے بدتر ہوتے گئے، یہاں تک کہ حکومت کی بساط بھی بدل گئی۔ اور اب نظموں میں وہ باتیں صاف صاف بیان ہونے لگیں جن کے لئے غزل میں پردے تلاش کئے جاتے تھے۔ جدید غزل قدیم غزل سے علٰحدہ کوئی چیز نہیں اسی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ صرف زبان اور فن کے لحاظ سے اس میں قدیم غزل کے مقابلہ میں تھوڑی سی بے راہ روی ہو گئی ہے اور اچھے اچھے شاعر خیال کے پیچھے لفظ کی صحت کو قربان کر دیتے ہیں یا کسی شاعرانہ جواز کے پردے میں پناہ لیتے ہیں۔ مگر شاعر کی ذہنی زندگی پہلے سے بہت بدل گئی ہے۔ اس میں اجتماعی نقطۂ نظر آ گیا ہے وہ بیک وقت محبوب کی کم نگاہی اور ساقی کی زیادتی دونوں کو محسوس کرتا ہے۔ دُنیا صرف مغرب ہی میں چھوٹی نہیں ہوئی بلکہ مشرق میں بھی چھوٹی ہو گئی ہے۔ سیاسی حالات نے زیادہ تلخی اور شدت حاصل کر لی ہے۔ برسوں کی غلامی کا بوجھ بعض وقت اتنا گراں معلوم ہوتا ہے کہ ساقی کی مست نگاہی بھی اسے بھلا نہیں سکتی۔ اس وجہ سے اس دور کی غزل میں ایک بیرونی لہر جوش و گرمی کی اور ایک اندرونی لہر ناکامی و مایوسی کی پائی جاتی ہے۔ غزل اور نظم کے درمیان خلیج بھی کم ہو گئی ہے مگر پھر بھی اشارے اور کنائے غزل میں اور صاف صاف باتیں نظم میں بیان ہونے لگی ہیں۔ اس سے دونوں کو فایدہ ہوا ہے۔

غزل کے میدان میں جو تجربے اس زمانہ میں کئے گئے ہیں، ان کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ تجربے غزل کے لئے بڑے مفید ثابت ہوئے ہیں۔ ایک بڑی کوشش تو وہ ہے جو حالی کے وقت سے شروع ہوئی اور آج تک جاری ہے۔ غزل کی زبان کو آسان، عام فہم اور بول چال سے قریب لانے کی بہت سوں نے کوشش کی ہے۔ اس سادگی میں اور میر و درد کے زمانہ کی سادگی میں باوجود تھوڑی سی قدر مشترک کے فرق بھی ہے۔ چنانچہ آرزو، اثر، حفیظ، افسر، آزاد انصاری وغیرہ کے یہاں جو رجحان ہے وہ خود روز نہیں ایک بہت بڑی ادبی تحریک کا نتیجہ ہے اور اس سے شاید ہی کوئی شاعر محفوظ رہ سکا ہو۔ غزل میں مسلسل مضمون نظم کرنے کا خیال نیا نہیں مگر شاید کسی شاعر نے اتنی پابندی اور استقلال سے اسے سنبھالنے کی کوشش کی ہو جتنی جوش نے کی ہے۔ مسلسل مضمون قدما کے یہاں بہت ملتے ہیں اور میر و غالب کی بہت سی غزلیں اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر جوش کا تتبع عام طور پر نہیں کیا گیا اور شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مسلسل غزل، غزل نہیں رہتی، نظم بن جاتی ہے اور جوش کے یہاں رجز خوانی زیادہ ہے جو غزل کے لئے اتنی موزوں نہیں۔ اس کے علاوہ غزل کے مضامین کو وسیع کر کے اس میں ایک طرف حیاتی اور دوسری طرف آفاقی رنگ پیدا کرنا بھی لوگوں نے سیکھا ہے، اگرچہ یہ روش ابھی عام نہیں ہوئی۔ غالب کی تقلید نے لکھنؤ والوں کو لفظی اور نقشی سے نجات دلائی اور عام طور پر فرسودہ نقشی سے پرہیز سکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہمارے شاعر فرسودہ زبان برتنے کے بجائے خود زبان ایجاد کرتے ہیں۔ یعنی جو الفاظ وہ استعمال کرتے ہیں ان میں ان کا جذبہ زیادہ شریک ہوتا ہے، وہ اتنے عام نہیں ہوتے کہ اپنی انفرادیت کھو چکے ہوں۔ اس دور کا تفلسف بھی غالب کی تقلید کا نتیجہ ہے۔ ایک عرصہ تک یہ خشک فلسفہ نظم کرنے اور علمیت بگھارنے کے مترادف رہا، مگر اب اس کی وجہ سے غزل میں محض جذبہ کے بجائے فکر کا جزو بھی آ گیا ہے۔ جو قدیم رنگ پر چلنے والے ہیں وہ بھی اپنی غزلوں میں ایک نیا نکھار اور نئی شگفتگی پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں غزلوں کا سرمایہ کسی طرح دوسرے دوروں سے کم اہم نہیں ہے بلکہ بعض حیثیتوں سے زیادہ اہم ہے۔

کیا اچھا شاعر اچھا نقاد نہیں ہو سکتا، کیا سخن گو ہونا اور چیز ہے اور سخن فہم ہونا بالکل دوسری چیز، کیا شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ مجذوب کی بڑ سے زیادہ نہیں؟ کیا اس کی شاعری ایک 'شیریں دیوانگی' سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی یا بقول بن جانسن صرف شاعر ہی شعرا کے متعلق صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں۔ دراصل یہ بات اتنی قطعی نہیں۔ شاعری اور تنقید دو علٰحدہ چیزیں ہیں مگر دونوں میں ایک اہم رشتہ بھی ہے۔ کوئی شاعر اسوقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک وہ شعر، شاعری، شعرا کے متعلق شعور نہیں رکھتا، نہ کوئی نقاد اس وقت تک اچھا نقاد بن سکتا ہے جب تک وہ شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی اس خیال کو اپنے ذہن میں دوبارہ بیدار نہ کرے جو شاعر کے ذہن میں تھا، دوسرے الفاظ میں وہ جب تک شعریت اور اس کے لوازم سے پوری طرح آگاہ نہ ہو اُسے نقاد نہیں کہا جا سکتا، ظاہر ہے کہ سب سے پہلا خود شاعر اس جذبہ سے قریب ہوتا ہے اور اس کے متعلق کچھ نہ کچھ بیان کر سکتا ہے۔ لیکن بعض غیر شاعر بھی یہ جذبہ پیدا کر لیتے ہیں اور پھر ہم اُن کی رائے کو اہمیت دے سکتے ہیں۔ اچھا شعر کہنے والا محض عروض و قوافی پر قدرت نہیں رکھتا، وہ شاعری کا شعور بھی رکھتا ہے۔ وہ اپنے جذبہ کے ہاتھوں میں ایک بے بس کمزور اور بے ارادہ تنکے کی حیثیت نہیں رکھتا۔ اُسے اس مجبوری میں کچھ اختیار بھی ہوتا ہے۔ وہ اس جذبہ میں ایک عمومیت، ایک کائناتی رنگ، ایک آفاقی نسبت دیکھتا ہے۔ ایک بظاہر چھوٹی سی بات اُسے ایک بہت بڑی چیز کی طرف لے جاتی ہے۔ معمولی شاعر کے یہاں خیال کہیں ہوتا ہے، الفاظ اُسے کہیں اور لے جاتے ہیں، رٹے رٹائے الفاظ کی وجہ

شعر میں خود شاعر شریک نہیں ہوتا۔ ان میں جو مطلب اور خیال ہوتا ہے وہ اُس کا اپنا نہیں، رسمی سا ہے۔ ایسے شعراء جیس کوئی واسطہ نہیں، ہمیں تو ان شعراء سے واسطہ ہے جن کی دیوانگی میں بھی ایک ہوشمندی، جن کے بہکنے میں بھی ایک منزل، جن کے تکلف میں بھی ایک بات ہوتی ہے۔ یہ شاعر، زندگی کو ایک خلا نہیں سمجھتا، اس کے متعلق ایک نہ ایک نظریہ رکھتا ہے۔ بعض وقت اپنے اشعار کا انتخاب کرتے وقت وہ اپنے اس ذوق کو پوری طرح استعمال نہیں کر پاتا (بعض خارجی حالات زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں جنھیں شعری خوبی سے کوئی تعلق نہیں، بعض اوقات شاعر اپنے لاأبالی پن کی وجہ سے اپنا صحیح انتخاب آپ کرنے سے قاصر رہتا ہے) مگر عام طور پر شاعر کا رنگ اور اس کے رنگ کی اہمیت دونوں معلوم کرنے کے لئے شاعر کا اپنا انتخاب بہت مفید ہے۔ کوئی بڑا شاعر ایسا نہیں جو سخن فہم نہ ہو اور وہ سخن فہم جو محض "فن" کا قائل ہے اس کے جادو کا قائل نہیں، ریاضی داں کہلایا جا سکتا ہے، شاعری کا نقاد نہیں۔

آرزو :۔ آرزو نے اپنے کلام کا جو انتخاب کیا ہے اُس سے ان کے ذوق اور نظر دونوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ آرزو اُن شعرا میں سے ہیں جو چلتے تھے لکھنؤ کی آخری بہار یعنی جلال کی گرمی اور چستی سے، لیکن اس سے انھوں نے انداز بیان کی سادگی بھی پیدا کی، یہاں تک کہ آج اُردو کے ممتاز شعرا میں آرزو کا نام دو حیثیتوں سے قابل ذکر ہے۔ ایک خیال کی سادگی اور نرمی کی وجہ سے، دوسرے زبان کی عام فہم شیرینی کی وجہ سے۔ غزل کی زبان کو بول چال کی زبان کے قریب لاکر شاعر نے یہ واضح کیا ہے کہ شاعری بولی۔ دُنیا والوں کی بولی سے الگ نہیں ہوتی اور نہ وہ قدیم بحروں کی قید میں ہمیشہ اسیر رہتی ہے، وہ عام لوگوں کی بولی میں بھی گفتگو کر سکتا ہے مگر اس کا لہجہ اور اس میں چھپی ہوئی شعریت اس طرح کم نہیں ہوتی اور بڑھ جاتی ہے۔ اشعار کے انتخاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا یہ آخری رجحان موسم کی چیز نہیں بلکہ ایک ارتقائی حیثیت رکھتا ہے۔ حسن و عشق کی دلاویز مگر ذرا دھندلی تصویروں کے علاوہ اُن کے یہاں احباب کا ماتم اور پند و نصائح کی کثرت بھی ہے مگر انداز بیان کی نرمی اور دھیما پن اسے گوارا بنا دیتے ہیں۔ ان کے کئی اشعار اُردو شاعری کے ہر انتخاب میں جگہ پا سکتے ہیں۔

آسی :۔ جناب آسی الدنی، نقاد کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں اور ان کی یہ شہرت حق بجانب بھی ہے۔ ان کا مذہب شعر بھی ایمان لانے کے قابل ہے۔ اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ "شعر خواہ کسی کے طرز پر ہو...... پھر بھی کوئی ندرت بیان، اثر، اور جوش کلام ضرور ضرور شامل ہو" مگر یہ کہے بغیر رہا نہیں جا سکتا کہ شاعری میں آسی کا کوئی کارنامہ نہیں ہے، نہ ان کے کلام میں کوئی منفرد مخصوص اور مختص تجربہ کارفرما نظر آتا ہے۔ کلام پختہ اور اُستادانہ ہے، اچھے اشعار بھی ملتے ہیں۔ مگر یہ احساس نہیں ہوتا کہ شاعر نے جس طرح کسی چیز کو دیکھا ہے اُس طرح کوئی اور نہ دیکھ سکا، یا اُس پر کوئی ایسی واردات گزری ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے ہم سانس روک لیں۔ دوسرے الفاظ میں ان کے یہاں نہ وہ انوکھا پن ہے جو ہمیں چونکا دے، نہ وہ والہانہ پن ہے جو تھوڑی دیر کے لئے ہمیں بے خود کر دے اور نہ وہ جادو ہے جو ہمیں کسی دوسری دُنیا میں لا کھڑا کر دے۔ ایک مثال کے ذریعہ سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ آسی، حقیقتاً سے بہت زیادہ بلند با معنی ہیں تمام اساتذہ کا کلام اور اُن کے ہلکے اور گہرے رنگ ان کے سامنے ہیں مگر ان کے اشعار میں وہ سرپا پن، وہ رس، وہ مزا نہیں جو باوجود تمام لغزشوں، الجھنوں اور پیچیدگیوں کے حقیقتاً کے یہاں موجود ہے۔

اثر :۔ اثر کے گرد جو خس و خاشاک تھا وہ آسی سے زیادہ تھا۔ وہ لکھنویت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ تیغ و سناں اور آہ و بکا کے کوچہ میں وہ کافی رسوا ہوئے مگر میر کے اثر اور زبان پر کامل عبور نے انھیں سنبھال لیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ میر کا اثر اُردو شاعری میں کس کس طرح چھپ چھپ کر ظاہر ہوتا رہا ہے۔ جس نے میر کی شریعت سے انکار کیا وہ کافر ٹھیرا، جو میر کے پاس سے بھی ہو کر گزر گیا وہ پارس بن گیا۔ صرف اثر میں نہیں فانی کو بھی راہ راست پر لانے والے میر ہی ہیں۔ اثر اس وقت جس مقام پر ہیں وہ کافی بلند ہے۔ لکھنؤ کی شاعری میں کوئی مست نہیں معلوم ہوتا۔ یا خشک آہیں ہیں یا سرد فلسفہ، غالب کی تقلید بھی انھیں تفلسف کی طرف لے گئی، وجد میں نہ لا سکی۔ تمام لکھنوی شعرا میں اگر کہیں بھی رنگینی اور شادابی ملتی ہے تو وہ بہار آں کی بعض غزلوں میں۔ اُن کے یہاں قدیم رنگ کی پختگی ہے اور جدید رنگ کی سادگی، وہ کبھی بدمست اور بے خود نہیں ہوتے ان کی لطیف اور ہلکی چاشنی بھی مزا دے جاتی ہے۔

احسان :۔ احسان کو دراصل اس مجموعہ میں شامل نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ دراصل نظمیں لکھتے ہیں نظموں میں ان کا رنگ پختہ ہو گیا ہے وہ اپنے آپ کو پا چکے ہیں۔ اُن کی غزلیں اُن کے عارضی اور کبھی کبھی کے جذبات کا آئینہ ہیں ایسے اچھے اشعار :۔

سحر ہوتے ہی وہ اس طرح شرما کر سدھارا ہے کہ مجھکو عمر بھر اب رنج محرومی گوارا ہے

اُن کی غزلوں میں زیادہ نہیں۔ غزل کے لئے جس تیز احساس اور شدید جذبہ کی ضرورت ہے وہ ان کے بس کا نہیں۔ وہ اپنی نظموں کی وجہ سے بہار

تفصیل سے اور ٹھہر ٹھہر کر بیان کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ غزل کے ہر شعر میں اگر وار ہر پر نہیں تو کچھ نہیں۔

علی اختر :- علی اختر، اگرچہ زیادہ مشہور نہیں مگر ان کے اشعار پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اچھے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں اس دور کے شعراء خصوصاً اقبال اور اصغر سے نہ صرف شناسائی بلکہ فیض بھی ملا ہے۔ اقبال کی نادر ترکیبیں اور کائناتی اور آفاقی لہجہ اور اصغر کا لطیف تغزل اور ہلکا تصوف ان کے یہاں بھی موجود ہے۔ اختر ان لوگوں میں سے ہیں جو کسی خاص اسکول یا ادارہ سے وابستہ نہیں، نہ ان کے یہاں کوئی خاص، نمایاں رنگ ہے مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار میں سلیقہ حاصل ہے اور اس تخلص کے دوسرے شاعر اختر شیرانی کے مقابلہ میں وہ زیادہ ہوشمند اور زیادہ سنجیدہ ہیں۔

اختر شیرانی :- اختر شیرانی کے یہاں ایک ایسی سرمستی، ایک ایسا شدید احساس، ایک ایسی تندی و تیزی پائی جاتی ہے کہ اُن کی غزلیں بھی جو ان معلوم ہوتی ہیں۔ اختر شیرانی کے یہاں معمولی اشعار بہت ہیں یادِ سلمیٰ میں جوانی کو گنوا دینا، کیا واقعی جوانی کا گنوا دینا ہے۔ مگر پھر بھی اختر کی شاعری اپنی طرف متوجہ کر ہی لیتی ہے۔ اختر کی دُنیا سلمیٰ اور اس کے عشق کی دنیا ہے، ان کے یہاں نشۂ جوانی ہی سب سے بڑی چیز ہے۔ ممکن ہے بعض نقاد اختر شیرانی کو رومانیت پسند اور پناہ گزیں کا لقب دیکر نظرانداز کر دیں، ان میں رومانیت اور پناہ گزینی دونوں کی جھلک ہے۔ مگر پھر بھی اس قسم کے اشعار کی قدر و قیمت ضرور ہے :-

یہ کس کو دیکھکر دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو　　　　کہ جو شے ہے خدائی میں حسین معلوم ہوتی ہے

اختر کی نظمیں اور غزلیں یکساں معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی شاعری میں کوئی چونکا دینے والی بات یا رہ رہ کر یاد آنے والا خیال نہیں ملتا، یہ ایک موج کی طرح ہے جو اپنی رو میں ہمیں بھی بہائے جاتی ہے، یا بعض وقت ہمارے اوپر سے گزر جاتی ہے اور ہمارا دامن بھی تر نہیں ہوتا۔ نفسیاتی گہرائی بھی ان کے بس کی نہیں، جوانی اور جوانی کا اُبال ہے، اس وجہ سے اختر کا کلام عنفوانِ شباب میں بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اختر فنی یا ارتقائی نقطۂ نظر سے اب بھی وہیں ہیں جہاں پانچ چھ سال پہلے تھے۔

اُمید :- امید امیٹھوی کو میں جلال کے شاگرد کی حیثیت سے جانتا تھا مگر وہ جلال سے اس قدر مختلف اور اس پایہ کے شاعر ہیں یہ انکے انتخاب سے معلوم ہوا۔ یہ غنیمت ہے کہ انھوں نے اپنے حالات میں ذرا تفصیل سے کام لیا ہے اور اس سے ان کی شاعری کے ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ غالب کی تقلید نے اُن کی شاعری میں ایک خوشگوار رنگ پیدا کیا۔ بہرحال اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اور زیادہ مشہور ہونا چاہئے تھا۔

یہی تیری جنت ہے اے تیری قدرت　　　　کہاں کی بہاریں کہاں دیکھتا ہوں

بیخود :- بیخود دہلوی اگرچہ خدا کے فضل سے ابھی ہم میں موجود ہیں مگر دراصل وہ اُنیسویں صدی کے آخری دور کے شاعر ہیں۔ انھوں نے دہلی کی آخری بہار اور رامپور کا دربار دونوں دیکھے ہیں اور اُن کے کانوں میں وہی نغمے گونج رہے ہیں۔ داغ اپنی زندگی میں بہت مقبول ہوئے اور موت بھی اس مقبولیت میں کمی نہ کر پائی۔ مگر ان کے شاگردوں نے (سوائے اقبال یا جگر کے) داغ کی دو ایک خصوصیات کو سب کچھ سمجھ لیا۔ مولانا احسن پختگی پر توجہ کرتے رہے۔ نوح محاورہ کے لئے وقف ہو گئے، بیخود اور سائل نے شروع شروع میں داغ کے پر چلے اور شوخی کو زندہ رکھا مگر جب جوانی رخصت ہوئی تو تصوف، محاورہ اور الفاظ کے اُلٹ پھیر پر اُتر آئے۔ ان اشعار کو دیکھئے :-

نیازِ عشق و نازِ حسن کی تصویر کھنچتی ہے　　　　ہمارے ہاتھ پر دل ہو تمھارا ہاتھ دل پر ہو،

دعائے باثر پیدا کروں گا توڑ کر دل کو　　　　دعائے دردِ دل مل جائے گی ٹوٹے ہوئے دل میں

یہ شعر بہت برے نہیں، بلکہ دوسرے میں تو ایک بے ساختگی ہے۔ مگر ان سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ بیخود کے یہاں اب ہمارے لئے کچھ نہیں۔ انکے جوانی کے اشعار میں دہلی کے اثر سے جا بجا، کوئی چبھتی ہوئی بات یا کوئی سیدھا سا مزے کا شعر مل جاتا ہے، مگر عمر کے ساتھ ان کی شاعری میں بھی بڑھاپا آگیا اور اب تو وہ صرف ایک روایت ہیں۔

تاجور :- تاجور نے اپنے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس سے تعلّی کی بو آتی ہے مگر ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک ضرور ہیں۔ وہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو کبھی اپنی ساری قوتوں سے کام نہیں لے سکتے، ان کے یہاں شاعری موجود ہے، مگر یہ گہرے اور

ندید احساس کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتی، ایک پختہ کار، ذہین اور طباع فطرت کے ٹیڑھے، ترچھے نقوش کا مجموعہ ہے۔ کلام میں گرمی ضرور ہے، مگر جادو نہیں۔
ثاقب :۔ ثاقب خالص لکھنوی شاعر ہیں مگر اُن کی لکھنویت ایک ایسی آن بان رکھتی ہے کہ اُسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ عزیز، صفی اور ثاقب کی کوششوں سے لکھنؤ میں غالب کا اثر شروع ہوا۔ ان سب میں ثاقب کا رنگ زیادہ پختہ، زیادہ متوازن اور زیادہ وقیع ہے۔ ثاقب کی دنیا، اُنکا تخیل، ان کی اصطلاحیں، اُن کی زبان سب اُن کے لکھنوی معاصرین کی سی ہے، مگر اسی دنیا میں اور انھیں الفاظ میں ثاقب نے ایسے اشعار کہے ہیں جو کبھی دل پر اور کبھی دماغ پر اثر ضرور کرتے ہیں۔ اگر لکھنؤ اسکول میں کوئی صاحب فکر کہا جاسکتا ہے تو وہ ثاقب ہیں۔ یہ روتے بھی ہیں تو ان کے رونے پر ہنسی نہیں آتی بلکہ ہمدردی ہوتی ہے اور بعض وقت تو ان کے ساتھ ہماری آنکھیں بھی نم ہو جاتی ہیں۔ بعض نقاد ان کے اشعار میں (بلکہ اُردو کے اکثر شعرا میں) آشیاں و قفس، صیاد و باغباں، دفن و ماتم، چھری اور خون کی کثرت سے گھبراتے ہیں۔ یہ سب علامتیں ہیں انھیں کے پردے میں اُردو کے سارے شعراء نے اپنا درد دل بیان کیا ہے۔ کیونکہ اُردو کے شاعر کے گرد یہ سب چیزیں موجود رہی ہیں اور اب بھی ہیں۔ علامتیں اچھی بُری نہیں ہوتیں، اُن کا بیان اچھا یا بُرا ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ علامتیں شعر نہیں ہوتیں۔ جس طرح محض انقلاب کا نام آنے سے یا خون کا ذکر کرنے سے کوئی شعر اچھا نہیں ہوسکتا اسی طرح محض قفس اور آشیاں کسی شعر کو بُرا نہیں بنا سکتے۔ سوال یہ ہے کہ یہ قفس و آشیاں واقعی شاعر کی زندگی یا اُس کے تجربات کا جز ہیں یا اُس نے انھیں شاعری میں ضروری سمجھ کر نظم کر دیا ہے۔ ثاقب نے نہ تو نئے مضامین نظم کئے ہیں نہ اسلوب میں کوئی غیر معمولی تبدیلی کی ہے، مگر انھوں نے نہایت مشاقی اور صفائی اور بعض وقت بڑے مزے سے انھیں بیان کر دیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ثاقب کا انتخاب اس لحاظ سے سب سے اچھا ہے کہ اس میں ان کے سب سے زیادہ اچھے شعر ملتے ہیں۔

جلیل :۔ جلیل، شاگرد تو امیر کے ہیں مگر ان کے یہاں داغ بھی جلوہ گر ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ داغ کے جانشینوں سے زیادہ امیر کے پرستاروں نے داغ کے رنگ کو صحیح معنوں میں چمکایا اور اسے وسعت دی۔ ریاض اور جلیل کا نام اس سلسلہ میں لیا جاسکتا ہے۔ جلیل کی دُنیا بہت سیدھی سادی سی ہے، جذبات بھی سادے ہیں۔ فکر سرے سے نہیں، صرف جذبہ اور جذبہ کا نکھار ہے۔ مگر ان کا انتخاب انھیں بیخود سے بہتر شاعر قرار دیتا ہے۔ جلیل کی نفسیات اور اس دور کے دوسرے شعرا کی نفسیات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلیل کے زمانہ میں نہ تو شاعر کے سامنے اتنے مسایل تھے نہ زندگی اس قدر پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی تھی۔ اس قسم کے اشعار اب شاید کوئی شاعر انتخاب نہ کرے :۔

چلے ہائے دم بھر کو مہمان ہوکر — مجھے مار ڈالا مری جان ہوکر

پھر بھی اُن کے اشعار ہمیں اکثر ریاض کی یاد دلاتے ہیں۔ دونوں بہکتے ہیں مگر ریاض کے بہکنے میں کچھ اور ہی لطف ہے۔

جگر :۔ اس دور کے سب سے زیادہ مقبول اور مشہور غزل گو شعرا میں سے ہیں۔ اُن کو لوگ مانیں یا نہ مانیں، ان کے کلام پر سبھی سر دھنتے ہیں۔ جگر کے یہاں داغ، حسرت اور کچھ کچھ مومن کی شان پائی جاتی ہے۔ بعض کے نزدیک ان میں "دعوت فکر کم اور دعوت کام و دہن زیادہ ہے بجائے والہانہ انداز کے ایک ہیجانی اضطراب کی کیفیت نظر آتی ہے"۔ کلیم الدین احمد صاحب کے الفاظ میں ان کی شاعری قدیم و جدید رنگ تغزل کا ایک مضحک نمونہ بن کر رہ گئی ہے ... ان کی شاعری کی دنیائے تغزل میں کوئی خاص اہمیت نہیں، مگر یہ سب خیالات اصلیت سے فرار دور ہیں۔ جگر کے یہاں جدید رنگ نہیں قدیم رنگ کا نکھار ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں وہ بات پائی ہے جو تغزل کی جان ہے۔ یعنی ان کا آبگینہ بھی تندی صہبا سے پگھل جاتا ہے۔ اُن کے کلام میں عشق کی ساری گرمی بشدت موجود ہے۔ وہ سننے والے یا پڑھنے والے کو اپنی دُنیا میں پہونچا دیتے ہیں۔ حسرت کو چھوڑ کر اس دور میں تغزل جس کے یہاں سب سے زیادہ پایا جاتا ہے وہ جگر ہیں۔ اُن کے یہاں تصوف یا تفلسف یا الفاظ کی بازیگری بھی ملتی ہے مگر یہ جگر کا رنگ نہیں۔ انھوں نے حُسن کو جس جس طرح دیکھا ہے عشق کی نفسیات کی جیسی تصویریں کھینچی ہیں، اُن سے ہماری شاعری اور بھی رنگین ہوگئی ہے۔ انھوں نے عشق بیچارہ کو حسن پر مسکرانے کی توفیق عطا کی ہے اور رنگ رنج بافی یاد میں مظلوم کی فریاد کا عالم دیکھا ہے۔ اُن کے یہاں داغ، غالب اور ریاض اور حسرت کے بعد بھی خمریات کے اچھے شعر ملتے ہیں۔ جگر کو اس دور کے سنئے خیالات سے کوئی واسطہ نہیں، وہ جہاں کھڑے ہیں تنہا ہیں، مگر نوجوان شعرا پر ان کا بہت اثر ہوا ہے۔ ان کی شاعری کی اہمیت اس وجہ سے واضح نہیں ہوتی کہ ان کے کلام کا کوئی اچھا انتخاب موجود نہیں ہے اور اگرچہ شاعر خود اپنے رنگ سے واقف ہے مگر موجودہ انتخاب بھی اس کے کلام کی تمام خوبیوں کو واضح نہیں

گیا ہے بے پروائی اور بے نیازی سے کیا گیا ہے، قدیم اور جدید غزلوں کے اشعار خلط ملط ہو گئے ہیں۔ بعض اشعار دوبارہ درج کر دئے ہیں، ایک غزل کا ایک شعر یہاں ہے ایک وہاں۔ جو ضبط و تنظیم جگر کی شاعری میں مفقود ہے وہی ان کے انتخاب میں ناپید ہے۔ اس زمانہ میں بعض مشاقوں کے ہاتھوں ایک غلط قسم کی غالبیت (یعنی تفلسف اور بھاری بھاری ترکیبیں) مقبول ہونے لگی تھیں، نئی نئی ترکیبوں کا شوق بے راہ روی کی حد تک پہونچ گیا تھا، جگر نے اردو غزل کو حافظ کی رنگینی و سرمستی پھر سے دلا دی۔ حسرت کے یہاں شگفتگی و شادابی ہے، جگر کے یہاں تندی و تیزی۔ مگر اس دور کے تمام شعرائے زیادہ سپردگی Abandon اور سرمستی جگر کے یہاں ہے۔

جوش :۔ جوش اُن شعرا میں سے ہیں، جو نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اقبال کے بعد شاید یہی غزل کو نظم کا تسلسل اور کا ... لباس اور نظم کو غزل کی رنگینی اور شیرینی بخشنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں جگر سے زیادہ بلند آہنگی اور دانائی پائی جاتی ہے۔ جگر کے یہاں رنگینی اور مستی زیادہ ہے۔ جوش کو شاعر شباب اور شاعر انقلاب کے نام سے اکثر یاد کیا جاتا ہے۔ نظموں میں انھوں نے بہت سے انقلابی مضامین لکھے ہیں اور غزلوں میں اکثر رجحان کے زیر اثر مسلسل مضامین نظم کئے ہیں مگر نظموں اور غزلوں دونوں میں ان کی لذتیت یکساں موجود ہے۔ جوش کی سب سے نمایاں خصوصیت یہی ہے انتخابیات سے بھی زیادہ نمایاں، ان کی غزلوں کو اسی لئے دلچسپی سے پڑھتے ہیں، بعد بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ غزل کی شیرینی اور نرمی اور روانی جوش کے بس کی نہیں۔ ان کے اسلوب میں اتنی شگفتگی نہیں جتنی شدت ہے۔ ان کی فطرت تغزل کے لئے موزوں نہیں ہے، انھیں تشبیہات و استعارات پر بڑی قدرت ہے۔ رنگینی و سرمستی بھی اُن کے یہاں خوب ملتی ہے۔ منظر نگاری کے لحاظ سے وہ اُردو کے تمام شعرا میں امتیازی خصوصیات رکھتے ہیں مگر جبریل ترنم اور پیغمبرانہ آواز جیسی ترکیبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غزل کا شیریں نغمہ اُن کے بس کا نہیں۔ ان کا انتخاب باوجود اچھے اچھے اشعار کے اسے پوری طرح ظاہر کرتا ہے۔

حسرت :۔ حسرت اپنی زندگی ہی میں کلاسیکل حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ انھوں نے جو استادوں سے فیض اُٹھایا ہے، لکھنؤ کی زبان کے باوجود رنگ دہلی کی نمود قائم رکھی ہے۔ مومن، جرأت، نسیم، تسلیم، سب کا نام روشن کیا ہے۔ ان کا حسن، عشق، اُن کے ہجر و فراق، سب اسی دنیا کی چیزیں ہیں مگر انھوں نے انھیں ایک ابدی چاشنی بھر دی ہے اور زمان و مکان سے بے نیاز کر دیا ہے۔ حسرت نے عام واقعات و حالات بیان کئے ہیں۔ لباس کی خوشبو، سونے کی کیفیت، ہنسی کی دبک، دانتوں میں انگلی دبانا، ننگے پاؤں کوٹھے پر آنا، یہ سب باتیں ہیں بظاہر معمولی، مگر حسرت نے انھیں اس طرح دیکھا اور ان میں اتنا کچھ پایا ہے کہ یہ نئی معلوم ہوتی ہیں۔ حسرت کے یہاں رعایت لفظی بھی ہے اور عریانی بھی مگر اُن کا یہ رنگ نہیں ہے، اُنھوں نے حُسن کی ہر ادا کو دیکھا ہے اور اُس سے لطف اُٹھایا ہے۔ اتنی سادہ، معمولی اور پیش پا افتادہ چیزوں سے حسرت نے اس قدر اثر کیسے پیدا کر لیا، اس کا جواب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ان چیزوں کو اس طرح دیکھا کہ ان کا حُسن بے نقاب کر دیا۔ مگر ان کا انتخاب اچھا نہیں۔ اُن کے بہت سے مشہور شعر درج ہونے سے رہ گئے اور بہت سے معمولی شعر درج ہو گئے۔ مثلاً یہ شعر:۔

کبھی چُرا کے جو روزن سے بھی تجھے دیکھا تو چُپ رہی جو سزا ہو وہی سزا میری

امانت کے کلام کے انتخاب میں درج ہونا چاہئے تھا حسرت کے کلام کے انتخاب میں نہیں۔

حسرت کی بحروں کا سارا ترنم، ان کا سارا حُسن خرابی، اس انتخاب میں نہ آیا اور یہ ایک کمی رہ گئی۔ ہمارے کتنے شعرا نے خیالی دُنیا کا حُسن پیش کر کے ہمارا دل بہلایا ہے۔ حسرت نے ہماری روزمرہ زندگی کو اس قدر حسین بنا کر پیش کیا ہے کہ کوئی کی شقاوت بھی اُس کا حُسن کم نہیں کر سکتی۔

حفیظ :۔ حفیظ کے یہاں آرزو اور اختر کی طرح گیتوں کا سریلا پن پایا جاتا ہے۔ غزل میں ایک سادگی تو وہ تھی جو تیر و درد نے برتی، دوسری وہ جو حالی اور عظمت اللہ خاں کے اثر سے آئی۔ اس میں موسیقی کا زیادہ لحاظ، ہندی کے نرم و شیریں الفاظ، بول چال کی زبان، لمبی لمبی بحریں، نمایاں ہیں۔ حفیظ نے پہلے پہل گیتوں کے ذریعہ سے شہرت پائی - - - - - - - - - - - - مگر اُن کی غزلوں میں بھی گیتوں کی سادگی اور شیرینی موجود ہے حفیظ کے یہاں نئے مضمون ہیں نہ نئے اسالیب لیکن ایک نئی سادگی اور دلکشی ضرور ہے۔ الفاظ بلکہ پورے پورے فقروں کی تکرار سے کسی نے اتنا لطف پیدا نہ کیا ہو جتنا حفیظ نے۔ اُن کا یہ انتخاب اُن کی اس خصوصیت کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ تفلسف اور تصوف ان کے یہاں بہت ہی کم ہے۔ غم عشق اور غم روزگار اس دور کا موضوع ہے۔ ایک سے بچ کر شاعر دوسرا آغوش تلاش کرتا ہے۔ مگر اسے پناہ کہیں نہیں ملتی کیونکہ اس کے نیم خوابیدہ احساس میں کچھ اور پھانسیں بھی ہیں۔

ی ہے۔ ولی اپنے آپ کو امیر کا شاگرد بتاتے ہیں مگر ان کے یہاں جلال کی گرمی بھی مل جاتی ہے۔ ان کی پختگی اور مشاقی میں کوئی کلام نہیں۔
ر، **کیفی** :- یہی حال ساحر اور کیفی کا ہے، مگر ولی، ساحر اور کیفی سے بہتر شاعر ہیں۔ تصوف کی چاشنی اور بندش کی چستی، ساحر کے یہاں نمایاں ہے
شیخ و برہمن سے چھیڑ چھاڑ بھی کرتے جاتے ہیں، مگر ان کا کلام پھیکا اور بے لطف ہے۔ ساحر اور کیفی نے شاعری پر کوئی اثر نہیں کیا۔ زمانہ انھیں اس حیثیت
بہت جلد بھلا دے گا۔ وہ اگر یاد رہیں گے تو اپنے فن اور اپنی اُستادی کی وجہ سے۔
سیماب :- سیماب، اس زمانہ کے اچھے شاعروں میں سے ہیں۔ وہ اُن لوگوں میں نہیں جو کوئی ذاتی اُپج، کوئی نیا جذبہ، کوئی نیا احساس رکھتے ہیں
خوشگوار خوش فکر ضرور ہیں۔ ان کے یہاں اچھی اور خوشنما ترکیبیں بھی ہیں اور لطیف اور نرم جذبات بھی، مگر باوجود اُستاد ہونے کے کبھی وہ اقبال کبھی جوش
س وقت جگر کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں۔ سیماب کے کلام سے اس دور کے تمام رجحانات معلوم ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے ہر رنگ میں شعر کہے ہیں اور ہر جذبہ کی ترجمانی
ہے۔ اپنی بساط کے مطابق کچھ تجربے بھی ہیں مگر زیادہ تر بحران تک محدود ہیں۔ منظر نگاری کا انھیں اچھا سلیقہ ہے اور اسلوب میں شگفتگی بھی پیدا کر لیتے ہیں
وجہ ہے کہ وہ نظموں میں زیادہ کامیاب سمجھے جاتے ہیں۔ مگر یہ انھیں قدرت ہر اسلوب سخن پر حاصل ہے۔
نی :- فانی کے یہاں فلسفہ طرازی، غم، تغزل، زبان، سبھی کا امتزاج ہوتا ہے۔ اس دور میں غالب کی پیروی میں اگر کوئی صحیح معنی میں کامیاب ہوا ہے
فانی اور اقبال ہیں۔ اقبال نے نظم میں غالب کی رفعت تخیل اور بلاغت اسلوب سمو لی، فانی نے غالب ہی کے میدان میں غالب کی تقلید کی۔ ان کے یہاں
ذیت بھی ہے لاش، کفن، نالہ و فریاد بھی، مگر ان کے یہاں یہ چیزیں روایت کی حیثیت سے نہیں آئیں۔ فانی کی زندگی ان سے عبارت ہے۔ جو لوگ یہ کہہ کر
کی عظمت کو کم کرنا چاہتے ہیں کہ اس میں سوا سوز و گداز اور سوگ کے اور کچھ نہیں وہ سطحی تنقید کرتے ہیں۔ فانی نے زندگی اور موت دونوں کی آنکھوں میں
یں ڈال کر ان کے چہرے سے نقاب اُٹھایا ہے۔ اُنھوں نے موت سے اس کی ہیبت اور پراسرار کیفیت چھین لی ہے، اور اسے زندگی کی طرح گوارا بنا دیا
یہ خیال کہ فانی کے مطالعہ کے بعد کائنات نہایت چھوٹی معلوم ہوتی ہے صحیح نہیں۔ فانی کے یہاں غم ہے تو غم کا عرفان بھی ہے، وہ اُن شعرا میں سے نہیں جو تلخی حیات
گھبرا کر جام سے یا آغوش محبوب میں پناہ لیتے ہیں، اور شتر مرغ کی طرح یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ دُنیا جوان تھی مرے عہد شباب میں۔ فانی کی تصویریں غمناک ہونے کے
حسن کا مارا ہیں وہ فلسفی نہیں فلسفیانہ استدلال یا طرز بیان رکھتے ہیں۔ اصل وہ مصور ہیں اور واردات انسانی کے بہت کامیاب مصور۔ ان کے
حسرت کے رنگ کے بھی اچھے اچھے اشعار ملتے ہیں اور ان میں وہ زبان کی چاشنی سے خاص لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ قدیم رنگ برتنے والوں میں فانی کا
سب سے زیادہ آفاقی اور اُن کا رنگ سب سے زیادہ کامیاب ہے۔ اس دور کے نوجوان شعرا پر اُن کا کافی اثر ہوا ہے۔ جو انتخاب فانی نے اپنے کلام کا کیا ہے
سے اُن کا رنگ اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے، اگرچہ بہت سے اچھے اشعار نظر انداز بھی کئے ہیں۔
اق :- ہمارے تمام شعرا میں فراق گورکھپوری سب سے زیادہ مغربی ادب سے واقف اور مغربی سانچوں سے آشنا ہیں مگر اس سے انکی مشرقیت
زیادہ گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی شاعری میں ہمیں سب سے زیادہ تنقید حیات کی ایک مسلسل کوشش ملتی ہے اور یوں بھی انھیں اُردو کا
شاعر کہا جاتا ہے۔ مختلف اور بظاہر بے تعلق چیزوں میں فراق اکثر ایک رشتہ دیکھ لیتے ہیں، اس وجہ سے اُن کے یہاں ایک قسم کا ابہام ہے یعنی خیال
ے منظوم ہوتا ہے مگر پوری طرح واضح نہیں ہو پاتا، وہ فانی سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں اور ان کے یہاں فانی کا کافی اثر ملتا ہے مگر ایک تو فانی کی طرح فراق
غم پرست نہیں دوسرے فانی کی پختہ کاری اور شگفتگی ابھی ان میں نہیں آنے پائی۔ شاید اس سے نیاز صاحب ابھی سے ڈرتے ہیں، فراق کے یہاں
یاتی تجزیہ بھی ہے، اجتماع ضدین بھی، ان کی اُکھڑی اُکھڑی سی مگر منفرد زبان بھی ایک دلکشی رکھتی ہے مگر جس تو سے شناسی کی طرف وہ محدود
رہ کرتے ہیں ابھی وہ نیم خوابیدہ سی ہے۔ شاید وقت اسے بیدار کر دے۔
شس - محروم :- روش صدیقی اور محروم دونوں اپنی نظموں کی وجہ سے مشہور ہیں، مگر ان کے انتخاب سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں
ں بھی اچھی کہہ سکتے ہیں۔ محروم کے یہاں قدرتی طور پر اقبال کا اثر نمایاں ہے، مگر اُن کا اپنا مزاج اقبال سے بالکل مختلف ہے، روش سراپا احساس
اس حد تک کہ بعض وقت یہ احساس الفاظ میں آکر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ مگر ان ٹکڑوں میں اصل کی کچھ جھلک ضرور ملتی ہے۔
:- قا کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم لکھنویت اب لکھنؤ میں بھی ختم ہو رہی ہے اور وہاں بھی ہر طرف دروازے کھل رہے ہیں اور ہر طرف سے

ہوائیں آرہی ہیں، ملّا ابھی جوان ہیں۔ انھوں نے اس دور کے تمام شعرا کا کلام دیکھا اور اس سے اثر قبول کیا ہے۔ کہیں کہیں یہ اثر صرف ہم طرح غزلوں میں ظاہر ہوتا ہے، کہیں بعض اشعار میں بھی :-

ہم نے بھی کی تھیں کوششیں، ہم نہ تمھیں بھلا سکے — کوئی کمی ہمیں میں تھی، یاد تمھیں نہ آسکے (ملّا)

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات، یاد نہ تم کو آسکے — تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمھیں بھلا سکے (حفیظ)

ابھی ان کے کلام میں انوکھاپن تو نہیں آنے پایا مگر بعض اشعار میں وہ انفرادیت اور مخصوص تجربات کا ثبوت ضرور دیتے ہیں۔ مگر ان کا انتخاب اور مختصر ہوتا تو شاید بہتر ہوتا۔

نوح :- نوح ناروی اُن شعرا میں سے ہیں جو ایک چھوٹی سی چیز کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ انھوں نے اظہارِ خیال کے سارے اسالیب کو چھوڑ کر صرف محاورہ اور صفائی زبان پر توجہ کی۔ ان کی مثال اُن لوگوں کی سی ہے جو ساری عمر (Miniature Painting.) کرتے رہے۔ داغ کے یہاں بھی محاورہ ہے اور نوح کے یہاں بھی، مگر داغ اور نوح میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ان دو اشعار سے جو نوح نے اپنے منتخب کلام میں شامل کئے ہیں اُن کا رنگ واضح ہو جاتا ہے۔

(۱) دکھائے اپنے عالم، اک پیامِ شوق نے پہلو — اُلجھنا، روٹھنا، لڑنا، بگڑنا، دور ہو جانا

دوسرا مصرعہ اچھا سہی، مگر پہلے مصرعہ میں گنتی صرف نوح ہی گِن سکتے تھے۔

(۲) غریقِ بحرِ ستم نہ کیوں ہوں، یہ جاں نثاری ہے اور ہم ہیں — کہ آپ ہیں آپ کی چھری ہے، چھری کا پانی ہے اور ہم ہیں

(Too much of a poor thing) اس کو کہتے ہیں۔ مگر سادگی زبان بھی بڑی چیز ہے کہ اس نے نوح کے بہت سے اشعار کو گوارا بنا دیا ہے۔

وحشت :- وحشت پُرانے اور کہنہ مشق شاعر ہیں، غالب کی سی زمینیں نظم کرتے ہیں، انھیں ضرور ملکہ حاصل ہے مگر اُن کے کلام میں علمیت زیادہ اور شعریت کم ہے۔ وہ نہ خود مست ہوتے ہیں نہ کسی کو مست کرتے ہیں۔

ہر دو ناطق :- ناطق لکھنوی اور ناطق گلاؤٹھوی دونوں پُرانے مشق والے ہیں اور ان کے یہاں پختگی اور مشاقی قدم قدم پر ملتی ہے۔

یاس :- یاس یگانہ کا پہلا شعر ہی اُن کے اوپر بہترین تبصرہ ہے :-

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا — خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

لکھنؤ اسکول سے ردِ عمل کے طور پر یاس کے یہاں بندگی و بیچارگی کے خلاف بغاوت ضرور ملتی ہے، مگر اسے فرحت بخش نہیں کہہ سکتے۔ طاقت سے زیادہ ان کے یہاں اکڑ ہے، وہ حریمِ حسن میں بھی اپنے آپ کو بھلا نہیں سکتے، ان کے یہاں نہ وہ مردانگی ہے جو جوش میں ہے ....، نہ وہ رعنائی جو حسرت میں، نہ وہ نفاست جو اصغر کے یہاں ہے، نہ وہ مستی جو جگر کے یہاں ہے، نہ وہ ندرت جو اقبال میں ہے۔ اس انتخاب میں بھی بہت سے معمولی شعر ملتے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو اتنا بڑا سمجھتے ہیں اور ان میں طنزیاتی روح اس قدر نمایاں ہے کہ ان کی شعریت پر برا اثر ڈالتی ہے۔ غزلوں سے زیادہ یہ رباعیوں میں اور قطعات میں کامیاب ہوتے ہیں، جہاں کوئی ایک خاص بات یا خاص اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ ان کے یہاں قوتِ ایجاد کی کمی نہیں، انھیں کوئی کسی کا مقلد نہیں کہہ سکتا مگر ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انھوں نے تیکھے پن ہی کو آرٹ سمجھ لیا ہے۔

آزاد انصاری - افسر :- آزاد انصاری اور افسر دونوں سادگی کے پجاری ہیں مگر افسر کی سادگی میں نرمی زیادہ ہے۔ افسر بھی دراصل گیتوں کی دُنیا سے غزل کے کوچے میں آئے ہیں، ان کی سادگی میں وہ حُسن ہے جو تاثیر اور دل کو لبھانے والی کیفیت ہے۔ اُسے نشتریت کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے قدیم اساتذہ کی بحروں پر قناعت نہیں کی، بلکہ الفاظ کو تھوڑا بہت کھینچ تان کر اپنے جذبے کے مطابق چھوٹی بڑی بحروں میں شعر کہے ہیں۔ اس سے ان کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔ افسر کی غزل اتنی حسن و عشق کی کہانی نہیں جتنی ایک حساس اور دردمند دل کی کہانی ہے۔ یہ بات افسر ہی کے یہاں نہیں، اردو غزل میں عام طور پر آتی جاتی ہے۔

(نگار) پروفیسر سرور کا مضمون بہ نسبت مختصر لیکن بہت جامع ہے اور چونکہ وہ خود ناقد و پروفیسر ہیں اس لئے اُن کی ہر بات سے "شیوۂ نگار آگہی" ظاہر ہوتا ہے۔

غزل اور عصر جدید

(پروفیسر مجنوں گورکھپوری - سینٹ اینڈروز کالج گورکھپور)

ایک مُعتبر کی رائے ہے کہ شاعری جدید دنیا کے لئے بہت کم اہمیت رکھتی ہے اور آجکل کی انسانیت کو شاعری کی کچھ زیادہ پروا نہیں ہے۔ اس کی تردید میں دستے کے دستے اشعار کے پیش کئے جا سکتے ہیں جو اسوقت بھی دُنیا کے ہر گوشہ میں آئے دن رنگے جا رہے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پچھلے پچیس تیس برس کے اندر شاعری کا ایک انبار لگ گیا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ علامت اس بات کی ہے کہ ابھی دُنیا میں شاعری کا جوہر اور شاعری کا مذاق دونوں موجود ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے اور انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ گزشتہ چوتھائی صدی میں دُنیا نے جو شاعری پیدا کی ہے اس کا زیادہ حصہ ایسا ہے جو کسی گلدستہ کے مؤلف کے لئے تو یقیناً دلچسپی کی چیز ہو گا مگر کسی سبھر کو اس میں کوئی نئی یا مستقل لذت مل سکتی اور نہ کوئی عامی ہی اس سے دیر تک لطف اُٹھا سکتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس سے شاعری کا نقص نہیں ثابت ہوتا بلکہ یہ دلیل صرف اس امر کی ہے کہ اسوقت زندگی میں جو نئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ ہم کو بُری طرح پراگندہ اور بدحواس کئے ہوئے ہیں اور ہم کو اب اتنی فرصت نہیں کہ ہم کسی "کاروبارِ شوق" میں بھی اطمینان و فراغت کے ساتھ چند لمحے گزار سکیں اور اپنے "ذوقِ نظارۂ جمال" کا ثبوت دے سکیں۔ یہ غلط نہیں ہے مگر یہی ساری حقیقت بھی نہیں ہے۔ ہم کو اپنے دور کے ادبی اختراعات بالخصوص اکتسابات شعری سے زیادہ دلچسپی نہیں۔ اس کا ایک سبب تو یقیناً یہی ہے کہ: "فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی"

لیکن اس کے علاوہ بھی ایک سبب ہے جو زیادہ اہم اور زیادہ اصلی ہے۔ ایک طرف تو ہماری شاعری نے پُرانے روایات اور تصورات اور پُرانے معیار کو بیکار یا ناکافی سمجھ کر ترک کر دینے کی ضرورت محسوس کر لی ہے دوسری طرف ابھی وہ کما حقہ زمانہ کے میلانات اور مطالبات سے موانست اور مطابقت پیدا نہیں کر سکی ہے۔

سعی و عمل کی سطح پر تو ہم زندگی کی نئی کروٹوں کے ساتھ مطابقت پیدا کر لیتے ہیں اور نئے ماحول سے ہماری عملی اور خارجی زندگی نسبتاً زیادہ سہولت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ لیکن فکر و تخئیل کی سطح پر ماضی کا بھوت غیر محسوس طور پر زیادہ عرصہ تک ہم سے لپٹا رہتا ہے اور قدیم روایات و صور رہ رہ کر اور کھسیانے بن کر اپنا لوکھڑاتا ہوا تسلط جمانے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر ہم کو اس کا شعور بھی نہیں ہوتا۔ نتیجہ وہ تناقض اور انتشار ہے جو کسی نئے دور میں ہماری عملی زندگی اور خیالی زندگی کے درمیان عرصہ تک قایم رہتا ہے اور ہماری مجموعی زندگی میں طرح طرح کی پیچیدگی پیدا کرتا رہتا ہے۔ زیادہ تر یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری اس وقت یا تو ہم کو مس ہی نہیں کرتی اور اگر مس کرتی ہے تو ہم اس سے ناآسودہ رہ جاتے ہیں۔ قدامت پرست طبقہ اس سے اس لئے بے پروا ہے کہ وہ اس کے عتیق معیار پر پوری نہیں اُترتی۔ نئی روشنی والے اس سے اس لئے غیر مطمئن ہیں کہ وہ نئی زندگی کی نئی تحریکوں سے خاطر خواہ ہم آہنگ نہیں ہے۔

اُردو شاعری میں نئے میلانات کی ابتداء حالی اور آزاد کے زمانے سے ہوتی ہے اور انھیں دو بزرگوں نے جدید اُردو شاعری کی داغ بیل ڈالی اور جو لوگ اردو شاعری کو یکدم بے مایہ سمجھتے ہیں ان کو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ حالی اور آزاد کے گروہ نے جس نظم جدید کی بنیاد رکھی وہ اس وقت سے لیکر ابتک مسلسل اور ہموار ترقی کرتی رہی ہے اور مواد اور اسالیب دونوں کے اعتبار سے اندر نئی وسعتیں پیدا کرتی گئی ہے۔ حالی، آزاد اور اسمٰعیل کے بعد اقبال، چکبست اور سرور جہان آبادی اور ان کے بعد نظم نگاروں کا موجودہ گروہ جس میں جوش کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اُردو نظم بڑی ثابت قدمی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی ہے اور زندگی کے نئے میلانات اور نئے امکانات کو اپنے اندر سموتی گئی ہے۔

لیکن یہ دعویٰ اُردو شاعری کی صرف اس صنف کے متعلق کیا جا سکتا ہے جس کو نظم کا نام دیکر غزل سے الگ کر دیا گیا ہے۔ اُردو غزل میں اتنے تنوعات پیدا نہیں ہو سکے اور وہ اب تک زندگی کی نئی وسعتوں اور نئے امکانات کے ساتھ اس قدر ہم آہنگ نہیں ہو سکی ہے جس قدر کہ ہونا چاہئے تھا۔ جدید غزل اور قدیم غزل میں جو فرق ہے وہ زیادہ تر لہجہ اور انداز کا ہے معنوی اعتبار سے اُردو کی نئی غزل اور پرانی غزل میں زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا۔ جدید اُردو غزل نے ہماری شاعری میں اسلوبی وسعتیں کافی پیدا کی ہیں اور کچھ نئے نفسیاتی اشارے بھی دئے ہیں لیکن مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابتک ہماری غزل کا عام آہنگ وہی "عیش غم" (Luxury of sorrow) ہے جو پرانی غزل کا آہنگ تھا اور جو عشق اور عشقیہ شاعری کی تخئیل چلی آرہی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ آج تک اُردو غزل نئی نئی سمتوں سے مانوس نہیں ہو سکی ہے۔ اس وقت غزل کا سب سے بڑا انقلابی ادیب یا شاعر غزل کے میدان میں آتا ہے تو عجیب قسم کی مخلوق معلوم ہونے لگتا ہے اور بہت ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد بھی اس والہانہ انداز سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہے جسکو "متنزلانہ ربودگی" (Lady abandon) کہنا چاہئے۔ یہ انداز تغزل سے خالی نہیں اور زندگی میں اس کی بھی ضرورت ہے اور رہے گی لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے۔

غزل کی ترکیب اور اس کی صورت پر غور کیجئے تو اس کی امکانی وسعتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک اکائی ہوتا ہے اور تنہا ایک پورے مضمون پر حاوی ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ اگر ہم چاہیں تو اختصار کے ساتھ اشعار کی صورت میں ایک غزل میں اتنے مختلف الاصل اور مختلف النوع مضامین ادا کر سکتے ہیں جتنے کہ اس میں اشعار ہیں۔ پھر کیوں ہر شعر عشق اور متعلقات عشق ہی کی دھن میں کہا جائے؟ کیوں نہ ان اشعار کو زندگی کے اور میلانات اور مسایل کا بھی حامل بنایا جائے غزل سے بڑھکر حفظ شاعری کی کوئی اور صنف نہیں اور غزل کے اشعار میں زندگی کی اہم باتوں کو مقولات کی صورت میں پیش کرکے حیات انسانی کی بہت بڑی خدمت کی جا سکتی ہے۔ لیکن نہ جانے وہ کونسی گھڑی تھی جب پہلے پہل غزل کی لغت مقرر ہوئی کہ آج تک غزل کا مفہوم عورت سے بات کرنا سمجھا جا رہا ہے۔

میں غزل کے مخالفوں میں سے نہیں ہوں۔ اور نہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو یہ رٹ لگا رہے ہیں کہ غزل جو کچھ ہم کو دے سکتی تھی دے چکی۔ اب وہ بیکار ہو گئی اور اب اس کا دور نہیں ہے۔ میں غزل اور تغزل کو شاعری کا مرادف سمجھتا ہوں اور میرا دعویٰ یہ ہے کہ کسی طویل نظم کے صرف وہ اشعار بلا محنت و ارادہ کے یاد ہو جاتے ہیں جن میں غزلیت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ تغزل فطرتِ انسانی کا وہ تقاضا ہے۔ جو ہمیشہ پورا ہوتا رہے گا اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

میرے کہنے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ غزل نے ہم کو کچھ نہیں دیا۔ اس نے ہم کو بہت کچھ دیا اور اس سے ہمارے ادب میں بہت بڑا اضافہ ہوا۔ اس کا ایک سطحی ثبوت یہ ہے کہ جتنے اشعار ضرب الامثال ہو کر خاص و عام کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں ان میں کم سے کم ننانوے فیصدی غزل ہی کے اشعار ہیں۔ یہ کوئی معمولی اکتساب نہیں ہے۔ یہ غزل کی وہ متیازی خصوصیت ہے جو صرف اپنی بنا پر غزل کو غیر فانی بنائے رہے گی۔ یعنی اس کے ہر شعر میں یاد رہ جانے کی طبیعی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اُردو شاعری کو جو روایات اور جو رموز و کنایات ملے ہیں وہ غزل ہی کی بدولت ملے ہیں۔ غزل نے ہماری شاعری کی تربیت اور تہذیب میں جو حصہ لیا ہے وہ شاعری کی کسی اور صنف نے نہیں لیا اور دے سکتی تھی۔ یہ غزل ہی کا کام تھا کہ سیکڑوں انفرادی تصورات کو رموز تمثیلات بنا کر ان میں ایسی کائناتی وسعت پیدا کر دی کہ آج "گل و بلبل" اور "سرو و قمری" کی اصطلاحیں اپنے لغوی معنوی کے تنگ دایرہ سے نکل کر ساری زندگی پر حاوی ہو جانے کے قابل ہو گئی ہیں۔ اور "بادہ و ساغر" میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ "مشاہدۂ حق کی گفتگو" میں بھی اُن سے کام لیا جا سکے۔ یہ وہ لوگ خصوصیت کے ساتھ سُن رکھیں جو بغیر سوچے سمجھے یہ کہا کرتے ہیں اُردو غزل میں سوا "گل و بلبل" اور "بادہ و ساغر" کے دھرا ہی کیا ہے۔ اُردو غزل میں "گل و بلبل" اور "بادہ و ساغر" ہی کے طفیل میں وہ رموز و کنایات ملتے ہیں جن کو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T. S. Eliot) "ملزومات خارجی" (Objective correlatives.) کہتا ہے۔ غزل نے اُردو شاعری میں وہ بلیغ مجازیت (Symbolism) اور وہ آفاقی تمثیلیت (Universal allegorism.) پیدا کی ہے جس کی مثال کسی دوسری زبان کی شاعری مشکل ہی سے پیش کر سکتی ہے

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اُردو غزل کی چند کوتاہیوں کو بھی نظر میں رکھنا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس نے اپنے تصورات اور تاثرات اپنی محاکات اور تخئیل کا گوشہ بہت محدود رکھا جس کی وجہ سے اس کے اسالیب و روایات میں ایک تھکا دینے والی یکسانی پیدا ہو گئی ہے اور ان میں

تنوع کا امکان کم رہ گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اُردو غزل کی فضا میں نہ صرف انحطاط بلکہ جمود کے آثار محسوس ہونے لگے ہیں۔ غزل میں دوسری کمی یہ ہے کہ جہاں تک موضوع اور مواد کا تعلق ہے وہ ابتک سماجی شعور اور عام انسانی زندگی کے احساس سے خالی رہی ہے۔ تیسری ناگوار مگر ناقابل تردید حقیقت یہ ہے کہ موجودہ اُردو غزل میں وہ کس بل نہیں ہے جو متقدمین کی غزلوں میں ملتا ہے اور وہ کچھ بیجان سی ہو رہی ہے۔

یہاں تک تو اُردو غزل سے کلی حیثیت سے بحث تھی۔ اب ہم اپنے دور کے غزل گو شعرا پر فرداً فرداً نظر ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ صحیح اندازہ ہو سکے کہ اُردو غزل اس وقت کس مقام پر ہے اور اس کا مستقبل کیا ہے؟ اس کے لئے ہم کو ان شعراء کے دائرہ سے باہر جانے کی ضرورت نہیں جو ابھی زندہ ہیں اور غزل کہہ رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ گزشتہ سال نگار نے اپنا سالنامہ موجودہ اُردو غزل گو شاعروں کے کلام کے لئے وقف کر دیا۔ یہ اپنی نوعیت کا نہ صرف نیا سالنامہ ہے بلکہ اب تک اس قسم کا کوئی گلدستہ بھی نہیں شائع ہوا ہے۔ شاعروں نے اپنے کلام کا خود انتخاب کر کے اپنے مختصر حالات زندگی کے ساتھ بھیجا ہے جس سے شاعر کے کلام کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کی ایک ہلکی سی جھلک بھی ہم کو مل جاتی ہے۔ شاعر کے اندر تنقید و انتخاب کی قوت اتنی قوی اور شدید نہیں ہوتی جتنی کہ تخئیل و تخلیق کی قوت ہوتی ہے اور وہ عموماً اشعار کا انتخاب کرتے ہوئے چوک جاتا ہے۔ خاصکر خود اپنے کلام کا انتخاب کرتے وقت تو وہ طرح طرح کے دھوکوں میں پڑ جاتا ہے۔ "نگار" کے اس سالنامہ میں بھی جا بجا یہ چوک نظر آتی ہے لیکن اس سے سالنامہ کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا اور ہم اس کو سامنے رکھکر اطمینان کے ساتھ عصری اُردو غزل پر رائے دے سکتے ہیں۔

حسرت:- اُردو میں اسوقت جتنے شعراء غزل کہہ رہے ہیں ان میں سب سے پہلے جس کا نام ذہن میں آتا ہے وہ حسرت موہانی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے حسرت سے زیادہ عمر والے اور زیادہ مشق رکھنے والے غزل گو بھی ابھی زندہ ہیں۔ یہ سچ ہے۔ لیکن حسرت اور دوسرے بڑے شعراء میں فرق یہ ہے کہ حسرت نہ صرف ایک قدیم روایت عظمیٰ کی آخری بڑی یادگار ہیں بلکہ اُردو غزل میں برائے نام جو کچھ نئی تحریک کے آثار پائے جاتے ہیں ان کے موجد بھی ہیں۔ اُردو غزل کی نئی نسل کی ابتدا حسرت ہی سے ہوتی ہے۔ حسرت اُردو غزل کی تاریخ میں قدیم و جدید کے درمیان ایک عبوری حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس اعتبار سے اگر ان کا مقابلہ انگریزی کے مشہور شاعر رابرٹ برجز (Robert Bridges) سے کیا جائے تو بہت مناسب ہوگا۔ لیکن ان کی شاعری میں اس الجھاؤ اور تزلزل یا تذبذب کی کوئی علامت نہیں ملتی جو عبوری دور کی لازمی علامت ہوتی ہے اور جس سے کسی عبوری شخصیت کا کوئی کارنامہ خالی نہیں ہوتا۔

حسرت کی شاعری جسوقت شروع ہوئی اسوقت امیر اور داغ ہر طرف چھائے ہوئے تھے اور گوشہ گوشہ میں انھیں کی تقلید ہو رہی تھی۔ اُردو غزل میں کوئی نیا امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہماری غزل اپنے تمام بہترین امکانات بروئے کار لا چکی ہے اور اب اس میں صرف انحطاط کا امکان باقی ہے۔ اسی اثنا میں حسرت کی آواز کانوں میں پڑتی ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اُردو غزل میں کہیں سے زندگی کی نئی لہر آ گئی ہے جس نے اس کے اندر نئی توانائیاں پیدا کر دی ہیں۔

حسرت کے تغزل کو متعین کرنا اور اس کو کوئی ایک نام دینا بہت دشوار ہے اس لئے کہ وہ "بسیار شیوہا است بتاں راکہ نام نیست" کے عنوان کی چیز ہے۔ نیاز صاحب کا یہ کہنا اس لحاظ سے بہت صحیح معلوم ہوتا ہے کہ "ہندوستان" میں اس وقت حسرت ہی وہ شاعر ہے جس کے کلام کی داد سوا خاموشی اور کسی طرح نہیں دی جا سکتی۔"

بات یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ حسرت جدید اُردو غزل کے امام ہیں اور نئے دور کے نئے رجحانات کا صحیح شعور رکھتے ہیں اُنھوں نے اپنے نفس شعری کی تربیت ان اساتذۂ غزل کے مطالعہ سے کی۔ ہے جن کی بدولت آج اُردو غزل اُردو غزل ہوئی ہے۔ حسرت کے کلام میں ان کی اپنی فطری اُپج کے ساتھ قدما کے بہترین عناصر نے مل کر ایک عجیب مکمل اور پختہ آہنگ پیدا کر دیا ہے جس کا دوبارہ تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خود تسلیم کے واسطے سے خاندان مومن سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ صرف ظاہری اور رسمی بات ہے۔ ان کے کلام میں میر، مصحفی، جرأت اور مومن کے رنگ کا یکساں امتزاج ہے۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ حسرت نے ان اساتذہ کے رنگ میں علحدہ علحدہ غزلیں کہی ہیں یا ایک ہی غزل میں ان میں سے ہر ایک کے رنگ کے اشعار ملتے ہیں۔ حسرت نے دو چار غزلیں علحدہ سے بھی متقدمین بالخصوص مصحفی اور جرأت کے رنگ میں کہی ہیں اور اُن کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی نکل آئیں گے، جن پر میر یا مصحفی یا جرأت یا مومن کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ لیکن میں جو بات کہہ رہا تھا وہ یہ تھی کہ میر، مصحفی، جرأت اور مومن کا رنگ حسرت کے اپنے رنگ کے ساتھ مل کر ان کے تغزل کی

کیمیاوی ترکیب بن گیا ہے۔

لیکن حسرت کو تقلیدی شاعر سمجھنا بڑی فاش غلطی ہوگی۔ اُن کا انتقابی تغزل (Eclectic Lyricism.) اپنے عنوان کی ایک بالکل نئی چیز ہے جو نہ تقلید سے پیدا ہو سکتی اور نہ جس کی تقلید کی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جدید نسل کا ہر غزل گو شاعر شعوری یا غیر شعوری طور پر حسرت سے متاثر ضرور رہا ہے لیکن کوئی اُن کی تقلید نہیں کر سکا ہے۔

حسرت کی غزلوں کو پڑھکر جو مجموعی اثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شاعر کو نفس مطمئنہ کی قوت حاصل ہے جو اس کو کسی حال میں بھی پراگندہ اور پریشانی نہیں ہونے دیتی۔ یہ ان کی شاعری اور ان کی شخصیت دونوں کی خصوصیت ہے۔ یہ اشعار پڑھئے اور پھر اُن سے جو اثر باقی رہ جائے اس پر غور کیجئے

کٹ گئی احتیاط عشق میں عمر　　ہم سے اظہار مدعا نہ ہوا
تم جفا کار تھے کرم نہ کیا　　میں وفادار تھا خفا نہ ہوا

شوق جب حد سے گزر جائے تو ہوتا ہے یہی　　ورنہ ہم اور کرم یار کی پروا نہ کریں
حال کھل جائے گا بیتابی دل کا حسرت　　بار بار آپ اُنھیں شوق سے دیکھا نہ کریں

آپ کا شوق بھی تو اب دل میں　　آپ کی یاد کے سوا نہ رہا
آرزو تیری برقرار رہے　　دل کا کیا ہے رہا رہا نہ رہا
راہ و رسم وفا وہ بھول گئے　　اب ہمیں بھی کوئی گلا نہ رہا

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرت　　ان سے ملکر بھی نہ اظہار تمنا کرنا

یا ہماری ہی یہ قسمت ہے کہ محروم ہیں ہم　　یا مگر ان کی محبت کا نتیجہ ہے یہی

ہے سے شوخی ہو اُنکہوں سے حیا　　اسے فریب نگاہ یار یہ کیا

کسی پرمٹ کے رہ جاتا ہو حسرت　　ہمیں کیا کام عمر جاوداں سے

حسرت جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا　　آئین اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا

ان اشعار سے یہ اثر ہوتا ہے کہ نہیں کہ شاعر شعور حسن و عشق کی تمام منزلیں طے کئے ہوئے بیٹھا ہے اور اب اس کے اندر ایک عارفانہ بے نیازی پیدا ہو گئی ہے۔ ضبط و توازن۔ اعتماد و اطمینان۔ سنجیدہ اور بے شکن تیور۔ بیک وقت تعلق اور بے تعلقی کا احساس جس کو تصوف یا ترک کی مجہولیت سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ جو انسانی درک و بصیرت کی صحیح آخری بلندی ہے۔ یہ ہیں وہ نقش جو حسرت کی غزلیں ہر اس شخص پر چھوڑ جاتی ہیں جس کے اندر غزل کا مہذب مذاق موجود ہے اور جو صرف اپنے مطالعہ کی وسعت اور کثرت کے زور سے شاعری کا مبصر نہیں بنا ہے۔

آخر میں جو بات حسرت کے بارے میں یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اردو غزل گوئی کی تاریخ میں حسرت پہلے شاعر ہیں جن کا کلام غزل کے تمام خصوصیات و لوازم کا حامل ہوتے ہوئے بھی یاس انگیز نہیں ہوتا۔ ان کے مسلک کو کسی طرح قنوطیت (Pessimism.) نہیں کہہ سکتے اگرچہ ان کے اشعار میں نہایت پختہ اور بلیغ قسم کا سوز و گداز ہوتا جو اکثر میر کے لب و لہجہ سے ملجاتا ہے۔ حسرت کی شاعری اس منزل کی چیز ہے جہاں رنج اور خوشی بچوں کی اصطلاحیں معلوم ہوتی ہیں۔ جہاں آنکھوں میں آنسو آتے آتے چہرے پر ایک مسکراہٹ آجاتی ہے اور مسکراتے مسکراتے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔ یہ وہ منزل ہے جہاں پہونچ کر احساسات میں ادراک کا عنصر داخل ہو جاتا ہے اور ہماری ہر کیفیت کو ایک تبسم میں تبدیل کر دیتا ہے۔ شیکسپیر کی آخری تمثیلیں اسی منزل کی چیزیں ہیں جن کو نہ آپ المیہ کہہ سکتے نہ نشاطیہ۔ اور جن کا آخری اثر ایک اشک آلود تبسم ہی ہو سکتا ہے۔

حسرت میں ایک ہی عیب ہے جو بعض کو بہت بڑا عیب نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ حسرت ہر قسم اور ہر سطح کے شعر کہہ ڈالتے ہیں۔ یہ دراصل اس وسعت مذاق خلوص نیت اور فراخ دلی کا نتیجہ ہے جس سے نہ صرف حسرت کی شاعری بلکہ ان کی ساری شخصیت کا خمیر ہوا ہے۔ لیکن اس سے ان کو نقصان بھی پہونچا

ان کے کلام کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو معلوم ہوتا ہے صرف اس لئے کہا گیا ہے کہ قافیہ ردیف ہاتھ آگیا اور شاعر کو خیال ہوا کہ لاؤ یہ بھی کہہ ڈالو۔ لیکن اسکو شاعر کی شخصیت سے کوئی لگاؤ ہے اور نہ اس پر کسی سنجیدہ تنقید کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے چنانچہ "کامرانی تجھے مبارک ہو" والی غزل جس کا ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اپنے مضمون میں خاکہ اُڑایا ہے اسی عنوان کی چیز ہے۔ دیوان حسرت میں اس قبیل کے اشعار بھی کافی تعداد میں ملیں گے اگر کوئی ایسے ہی اشعار کا انتخاب کرنا چاہے اور انھیں پر اپنی تنقید کی بنیاد رکھنا چاہے لیکن ایسی تنقید شاعر کی غلط نمائندگی کرے گی اس لئے لائق توقیع نہ ہوگی۔

خود حسرت نے "نگار" کے سالنامہ میں اپنے کلام کا جو انتخاب دیا ہے وہ یا تو یونہی روا روی میں کر دیا گیا ہے یا حسرت کی اسی فراخدلی اور وسعت ذوقی کا کرشمہ ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ انتخاب شاعر کے کلام کا صحیح انتخاب نہیں ہے۔

اُردو غزل کو نئی سمتوں سے آشنا کرنے میں عزیز۔ محشر۔ صفی اور ثاقب نے شروع میں جو حصہ لیا ہے اس کو کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان شاعروں نے لکھنؤ کی فضا میں پرورش پائی اور لکھنوی عناصر سے جن میں مرثیت کا عنصر یقیناً غالب رہا ان کا خمیر ہوا۔ عزیز اس جذباتی مدرسہ کے بانی ہیں جسکو اگر اُردو غزل کا گورستانی مدرسہ (Churchyard School .) کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اور اس اعتبار سے عزیز کسی قدیم یا اپنے ہمعصر شاعر کے مقلد نظر نہیں آتے۔ ان کی شاعری کو مجموعی طور پر "موت کا راگ" کہہ سکتے ہیں۔ بیمار محبت اور اس کا آخری سکراتی عالم اُنکی شاعری کا عام موضوع ہے جو سرتاسر ماتمی اور رقتی شاعری ہے۔ یہ یقیناً مرثیہ کا فضائی اثر ہے جو غیر شعوری طور پر غزل میں سرایت کر گیا ہے۔

لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عزیز کی شاعری دراصل زمانہ کی وہ نئی کروٹ تھی جس کو ردعمل کہتے ہیں تو اس کی اہمیت کا قائل ہونا پڑتا ہے اُردو غزل میں امیر اور داغ کی سرکردگی میں جو سستے قسم کی خوش باشی اور لذت پرستی پیدا ہو گئی تھی وہ لکھنؤ اور دلی سے نکل کر چاروں طرف پھیل چکی تھی اور اس کی لے اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اب اس کے خلاف بغاوت ایک فطری تحریک تھی۔ عزیز کی شاعری بھی بغاوت تھی۔ عزیز نے اُردو غزل کو از سر نو مہذب اور سنجیدہ بنانے کی کوشش کی اور ابتذال اور سوقیت سے ہٹا کر اُس کی سطح کو پھر بلند کر دیا۔

عزیز سے اُردو غزل کو جو نئے اسالیب اور نئے آہنگ ملے ہیں وہ اپنی نوعیت کے پہلے اضافے ہیں اور ان کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکے گا۔ انھوں نے غزل میں جو معنوی وسعتیں پیدا کی ہیں وہ بھی یادگار حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ ان کی غزلیں پڑھتے وقت ایسا احساس ہوتا ہے جیسے کسی جنازہ کے اُٹھنے اور روانہ ہونے میں ناقابل برداشت حد تک دیر ہو رہی ہو۔

محشر بھی اسی مدرسہ کے شاعر ہیں لیکن ان کا ماتمی لب و لہجہ کچھ زیادہ دبا ہوا ہے۔ اگرچہ بہ حیثیت ایک موثر اور محرک قوت کے وہ عزیز کے مقام سے رہ جاتے ہیں۔

عزیز کی ماتمی دھن کو جو بے اختیار ہو چلی تھی جس نے سنبھالا یا وہ صفی اور ثاقب ہیں صفی نے اپنے ماتمی انداز پر ضبط و خودداری کا پردہ ڈالا اور سوگ میں فکر و تامل کا میلان پیدا کیا اور غزل کی زبان اور اسلوب کی تہذیب و تحسین میں تو اُن کا حصہ عزیز سے بھی زیادہ ہے۔

ثاقب :- ثاقب کی غزلگوئی "مدرسہ عزیزیہ" سے کچھ اور زیادہ الگ ہو گئی ہے۔ ان کے کلام میں نہ وہ والہانہ بے اختیاری ہے نہ جذبات کی وہ گرمی جو صفی اور ان کے دوسرے معاصرین کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔ لیکن حُسن و عشق اور ان کے روایتی لوازمات کے پردہ میں ہم کو ایسے اشارات ملتے ہیں کہ ہم ٹھیر کر خاموش سوچنے لگتے ہیں۔ ثاقب کو حُسن و عشق کا شاعر سمجھنا غلطی ہے۔ حُسن و عشق کو اُنھوں نے زندگی کی تمثیل بنایا ہے اور اُنکی شاعری کا موضوع زندگی کے حادثات ہیں۔

ایک جداگانہ مدرسہ کے بانی اور نئے اسالیب و صور کے بانی یا مبلغ ہونے کی حیثیت سے عزیز اور صفی کا جو مرتبہ بھی ہو یا کامل فن ہونے کے اعتبار سے ثاقب سے جس قدر بھی فائق ہوں مگر میرا خیال ہے کہ ثاقب کی غزلوں سے ہمارے اندر پہلی بار یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اب نئے دور کی نئی نفسیات شروع ہو رہی ہے۔ ثاقب کی شاعری بھی اپنے اکثر ہمعصروں کی شاعری کی طرح غم کی شاعری ہے۔ لیکن اس کے تیور دیکھ کر ہمارے اندر ایک تازہ توانائی و جسارت پیدا ہو جاتی ہے اور ہم نہ صرف اس قابل ہو جاتے ہیں کہ برداشت کر لیں بلکہ اپنے اندر سنجیدہ ضد اور بغاوت کا ایک خفیف ارتعاش بھی

محسوس کرنے لگتے ہیں۔

ضبط، خودداری اور ایک گہرے قسم کی متانت اور ایک بے نیاز انداز، یہ ہیں وہ خصوصیات جو ثاقب کے کلام کی پیشانی پر جلی حروف میں لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ مندرجۂ ذیل اشعار ادھر اُدھر سے ملاحظہ ہوں:-

یہ گوارا نہ کیا دل نے کہ مانگوں تو ملے　　ورنہ ساقی کو پلانے میں کچھ انکار نہ تھا

جمالِ شمع کسی کو کسی کو جلوۂ گل　　وہ ایک میں ہوں جسے کوئی خونبہا نہ ملا

سر چڑھایا میں نے چن چن کر خس و خاشاک کو　　باغ کے تنکے تھے وہ جن کا نشیمن نام تھا

چل اے ہمدم ذرا سازِ طرب کی چھیڑ بھی سن لیں　　اگر دل بیٹھ جائے گا تو اٹھ جائیں گے محفل سے

یہ آشیانۂ ستم چمن میں ہو تو خوب ہو　　جی میں ہے کہ لے اڑوں قفس تو اپنا ہو چکا

شہیدِ غم کی لاش پر نہ سر جھکا کے روئیے　　وہ آنسوؤں کو کیا کرے جو منہ لہو سے دھو چکا

بزمِ رنگیں میں تری ذکرِ ستم آیا تو سہی　　خوش رہے چھیڑنے والا میرے افسانے کا

بہت سی عمر مٹا کر جسے بنایا تھا　　مکاں وہ جل گیا تھوڑی سی روشنی کے لئے

تمام بزم میں چھایا ہوا ہے سناٹا　　چھیڑا تھا قصۂ دل ان کی دل لگی کے لئے

شبِ غم آ گئی جلنے کا پھر پیغام آتا ہے　　لباسِ آتشیں پہنے چراغِ شام آتا ہے

ثاقب کی شاعری شدتِ کیف سے خالی ہے اور یہ ہونا تھا اس لئے کہ جب انسان کے اندر خود اپنے کیف کی آگاہی پیدا ہونے لگے تو کیف کی شدت گھٹنے لگتی ہے۔ ثاقب کو "شعورِ کیف" کا شاعر کہنا زیادہ مناسب ہوگا اور ان کے کلام میں شدید کیفیتوں کی تلاش بے محل سی ہوگی۔

آرزو :- آرزو لکھنوی کو بھی اسی جماعت کا شاعر سمجھنا چاہئے۔ وہ جلال لکھنوی کے شاگرد ہیں اور جلال اور تعشق دونوں سے کافی حد تک متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کے دو مجموعوں "فغانِ آرزو" اور "سریلی بانسری" سے عوام روشناس ہو چکے ہیں اور ان کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ماہرِ فن کار (Artist) ہیں۔ وہ نہ صرف زبان اور محاورہ پر قابو رکھتے ہیں بلکہ عروض کے رموز و نکات سے بھی واقف ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ شعر میں آہنگ کیسے پیدا کیا جاتا ہے۔ ان کا کوئی شعر شاید ہی ایسا ہو جو محض اپنے ترنم سے اپنی طرف متوجہ نہ کرے اور یہ ترنم ایک تمثیلی کیفیت (Dramatic Quality) اپنے اندر رکھتا ہے۔

جہاں تک زبان اور بیان کے مجموعی انداز کا تعلق ہے آرزو لکھنوی دلی کے دبستانِ غزل سے کافی قریب نظر آتے ہیں۔ خیالات و جذبات میں بھی وہی خلوص اور سادگی محسوس ہوتی ہے جس کو ہم دلی کے متقدمین سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ شاید جلال کی شاگردی کا اثر ہے۔ مگر ان کے یہاں سوز و گداز مرثیت کی دُھن لئے ہوئے ہیں اور لکھنؤ کے دبستانِ تغزل کا ترکہ ہے۔

اُردو غزل میں آرزو لکھنوی نے جو اسلوبی اضافے کئے ہیں وہ مستقل قدر و قیمت رکھتے ہیں خاصکر "سریلی بانسری" لکھ کر تو انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ انسان اپنے جذبات و واردات کو ایسی زبان میں ظاہر کر سکتا ہے جو عامیانہ ہوئے بغیر لغوی اور منطقی حد تک عام فہم ہو سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ زبان اور یہ اسلوب اس قابل نہیں کہ اس میں زندگی سے متعلق گہرے خیالات ادا کئے جا سکیں۔ مگر پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آرزو لکھنوی افکار کے شاعر نہیں ہیں اور نہ ان کا طرز مفکرانہ شاعری کے لئے بنا ہے۔ مگر جہاں تک انسان کے عام جذباتی نفسیات و معاملات کا تعلق ہے اس طرز سے زیادہ دلنشین اور عوام سے قریب طرز مشکل ہی سے تصور میں آ سکتا ہے۔

بہر حال میرا خیال ہے کہ آرزو لکھنوی کی شاعری اور خصوصیت کے ساتھ ان کی "سریلی بانسری" اُردو شاعری کے اسالیب میں ایک نئے سمت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اس قابل ہے کہ اس کے امکانات کا جائزہ لیا جائے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

رہنے دو تسلی تم اپنی دکھ جھیل چکا دل ٹوٹ گیا　　اب ہاتھ ملے سے ہوتا ہے کیا جب ہاتھ سے ناوک چھوٹ گیا

کھا کے پھر کے تنسو یہ بات ہے اور　　　آرزو جی ہی جانتا ہو گا
جو سینے میں دل ہے تو بارِ محبت　　　اُٹھے یا نہ اُٹھے اُٹھانا پڑے گا
دفعتاً ترکِ تعلق میں بھی رسوائی ہے　　　اُلجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دیکر
کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی　　　جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی
نہ اس کو پوچھو کہ کس لئے تھا یہ رو کے ہنسنا یہ ہنس کے رونا　　　اک ان کہی دکھ بھری کہانی دکھا دی تم کو الٹ پلٹ کر
کہہ کے یہ اور کچھ کہا نہ گیا　　　کہ ہمیں آپ سے شکایت ہے
معمہ بن گیا رازِ محبت آرزو یوں بھی　　　وہ مجھ سے پوچھتے جھجکے مجھے کہتے حجاب آیا
چاہت کی ہر بات ہے اُلٹی مت اُلٹی رونا اُلٹا　　　جتنا سوسو بھی امنڈے بوند رہے ندی بہہ جائے
جیسے آرزو کوئی تاکے نہ چھینے　　　مجھے راج گدی ہے وہ مرگ چھالا
تارا ٹوٹتے دیکھا سب نے یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی　　　کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا کس کا سہارا ٹوٹ گیا

اسی دور اور کم و بیش اسی مجلس سے تعلق رکھنے والے ہم کو چند ایسے شعرا بھی نظر آتے ہیں جو اپنی اپنی جگہ ایک زبردست قوت کے مالک ہیں اور کامل فن کہے جانے کے مستحق ہیں اور ایسا ہی کہے بھی جاتے ہیں۔ لیکن جو کسی طرح بھی ایسی قوت نہیں جو مستقبل کی تعمیر میں کوئی حصہ لے سکیں یعنی جن کی شاعری کسی زاویہ سے بھی میلاناتی (Tendentious) نہیں ہے۔

بیخود - نوح :۔ مثال کے طور پر بیخود دہلوی یا نوح ناروی کو لے لیجئے۔ دونوں داغ کے شاگرد ہیں اور اپنی محفل کے چشم و چراغ بھی ہیں اور اس کی آخری بڑی یادگار بھی۔ ان لوگوں کی کہنہ مشقی اور اُستادانہ مہارت کا بہرحال اعتراف کرنا پڑے گا۔ زبان اور محاورہ اور روزمرہ کا لطف اُٹھانا ہو تو اب بھی انھیں بزرگوں کے کلام کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اب ہمارے لطف اور لذت کا میلان اور معیار ہی بدل گیا ہے اور ان کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت ہم کو یہ احساس ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ یہ ایک ایسی آواز کے آخری ارتعاشات ہیں جس کو رُکے ہوئے خاصی دیر ہو چکی ہے یہی حال ان لوگوں کے کلام کا ہے جو امیر کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور لکھنؤ کے روایتی دبستان کے آخری نام لیوا کہے جا سکتے ہیں۔

جلیل :۔ جلیل، غزل کے روایتی آہنگ کے اُستاد ہیں۔ نکھری ہوئی زبان اور ترنم اور رچی ہوئی موسیقیت اُن کے کلام کی وہ ممتاز خصوصیت ہے جس نے ان کو اس قدر مقبول عام بنا رکھا ہے۔

دل :۔ دل شاہجہاں پوری کے وہاں دبستان امیر کی بعض عام نمایاں خصوصیات کے علاوہ ایک خاص دردمندی اور دل گداختگی بھی ہے جو متانت اور وقار لئے ہوئے ہے اور خالص ان کی اپنی چیز معلوم ہوتی ہے۔

ساحر :۔ امرناتھ ساحر، پُرانے کہنے والوں میں اپنا ایک خاص رنگ رکھتے ہیں۔ وہ زبان اور اسلوب میں دلی کے مدرسہ سے متاثر ہیں۔ اور متصوفانہ تغزل کے روایتی تصورکی کامیاب نمایندگی کرتے ہیں۔

کیفی :۔ دتاتریہ کیفی کا کلام متجرانہ ہوتا ہے۔ وہ اُردو زبان کے ساتھ وہ اُنس رکھتے ہیں جو ایک محقق زبان کے لئے لازمی ہے۔ ان کے اشعار میں کیف کا وہ غلبہ کہیں نہیں ملتا جو شاعری کی اصل روح ہوتا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ شاعر سے زیادہ فاضل کہے جانے کے مستحق ہیں۔ مشاعروں کی صدارت اب بہت سستی ہو گئی ہے۔ ہر کس و ناکس اب مشاعرہ کا صدر بنا دیا جاتا ہے اور اب "شیوۂ اہل نظر" کی آبرو جا چکی ہے ورنہ مجھ کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوتا کہ دتاتریہ کیفی شاعری سے زیادہ مشاعروں کی صدارت کے لئے مناسب اور موزوں ہیں۔

وحشت :۔ وحشت کلکتوی باوجود قدیم اور روایتی دبستان کے شاعر ہونے کے اپنے کلام میں ایک انفرادی لہجہ کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں فارسی کا لطیف عنصر ایک خاص چیز ہے جو غزل کے مزاج کو قائم رکھتے ہوئے شاعر کے کلام کو عام سطح سے کچھ بلند کر دیتا ہے ان کو خود اعتراف ہے کہ وہ غالب کا تتبع کرتے رہے ہیں جس کو مولانا حالی نے محسوس کیا اور مانا ہے۔

وحشت کی شاعری کی سب سے زیادہ محسوس اور نمایاں خصوصیت جذبات کا نہایت رچا ہوا توازن اور انداز بیان کا عارفانہ ضبط اور سنجیدگی ہے لیکن یہ لوگ اپنی اپنی جگہ جو حیثیت بھی رکھتے ہوں اس سے انکار نہیں جا سکتا کہ یہ ایک گزرے ہوئے زمانہ کی یادگار اور اب فسانہ ہو چلے ہیں۔

اسی سلسلہ میں ہم کو چند ایسے شعراء بھی نظر آتے ہیں جو قدیم دور سے وابستہ تو ہیں لیکن جو اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے اشعار میں جدید دور کی علامتیں آجائیں اور وہ آگئی ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی شاعری کا محرک اصل زندگی نہیں ہے بلکہ شاعری یعنی اساتذہ کا کلام ہے اس لئے ان کے الہامات شعری میں مطالعہ کے ارتعاشات صاف محسوس ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ باوجود اس کے کہ اچھے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں لیکن کسی خاص انفرادیت کے مالک نہیں ہیں۔

آسی:- عبدالباری آسی اسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ آسی نہ جانے کیوں لکھنوی مشہور ہو گئے جو وہ نہ پیدائش کے اعتبار سے ہیں نہ اپنے میلانات کے اعتبار سے۔ وہ بہت وسیع المطالعہ شخص ہیں۔ متقدمین اور متاخرین میں سے شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کا کلام آسی کی نظر سے نہ گزرا ہو اور جس سے انھوں نے خذ ما صفا کے قاعدے سے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ لیکن ان کی شاعری کا مجموعی آہنگ دبستان دلی سے کافی قریب ہے۔ نیاز صاحب نے ان کی شاعری کے لئے "دامن دار" کی اصطلاح استعمال کی۔ میری رائے میں آسی کی شاعری کے لئے اس سے زیادہ جامع لفظ نہیں مل سکتا۔ نہ صرف اس لئے کہ وہ ایک اچھی خاصی جماعت اپنے شاگردوں کی بھی رکھتے ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ مضامین اور اسالیب دونوں کے اعتبار سے جو انتخابی اور تقلیدی تنوع ان کے وہاں پایا جاتا ہے اس نے ان کی شاعری کے دامن کو واقعی پھیلا دیا ہے۔ ان کی غزلوں میں وہ سپردگی اور خود رفتگی نہیں ملتی جو تغزل کی اصل جان ہوتی ہے۔ مگر کبھی ایک ٹھیری اور سلجھی ہوئی دردمندی ان کے اشعار میں ملتی ہے جو بے تاثیر نہیں ہوتی۔ آسی نہ صرف شاعر ہیں بلکہ سخن شناس بھی ہیں اور اچھی تنقیدی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اثر:- مرزا جعفر علی خاں اثر اس گروہ میں سب سے ممتاز شخصیت ہیں۔ ان کے مذاق شعری کی تربیت اساتذہ کے کلام کے بہترین عناصر سے ہوئی ہے وہ شاگرد تو عزیز کے ہیں لیکن اساتذہ میں میر اور آتش سے بہت متاثر ہیں وہ نقاد بھی ہیں اور ان کا تنقیدی توازن شیفتہ کی یاد تازہ کرتا ہے اور یہی توازن اور رکھ رکھاؤ ان کے کلام کی بھی جان ہے۔ ان کے اشعار میں نہ کہیں سستی قسم کی جذبات نگاری ہے اور نہ چھچھورے انداز کی معاملہ بندی الفاظ کا صحیح اور برمحل استعمال۔ محاوروں اور فقروں کی برجستگی اور بے ساختگی۔ تخیل کی بلندی اور لب و لہجہ کی متانت یہ ہیں وہ خصوصیات جو ان کی شاعری کو ممتاز کئے ہوئے ہیں اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اثر کے کلام میں کوئی ایسی چیز نہیں جو سچے ہوئے ذوق جمال کا پتہ نہ دیتی ہو۔ یہ سب کچھ ہے لیکن ان کی شاعری میں اس حرارت کا احساس نہیں ہوتا جو دوسروں کو بھی محو کر دے۔ ان کی شاعری فطری شاعری ہوتے ہوئے بھی کتابی شاعری معلوم ہوتی ہے۔ ان کے اشعار سے دل پر وہ اثر ہوتا ہے جو گزرے ہوئے زمانے کی دھندلی یادوں سے ہوتا ہے۔ مندرجۂ ذیل اشعار قابل ملاحظہ ہیں:-

وہ گزرا ادھر سے جو بیگانہ وار
چراغ لحد جھلملانے لگا

جن خیالات سے ہو جاتی ہے وحشت دونی
کچھ انھیں سے دل دیوانہ بہلتے دیکھا

ہم نے رو رو کے رات کاٹی ہے
آنسوؤں پہ یہ رنگ تب آیا

فریاد کا شنوا کوئی نہیں بیکس کا سہارا کوئی نہیں
کچھ دیکھ لیا اس دنیا میں کچھ حشر میں دیکھا جائے گا

آج کچھ مہربان ہے صیاد
کیا نشیمن بھی ہو گیا برباد

پھر ہم کہاں کہاں تم جی بھر کے دیکھنے دو
اللہ کتنی مدت ہم تم جدا رہے ہیں

وہ خمار آلودہ آنکھیں دیکھ کر
موج مے لینے لگی انگڑائیاں

زندگی اور زندگی کی یادگار
پردہ اور پردے پہ کچھ پرچھائیاں

ظہور عشق حقیقت طراز تھا ورنہ
یہ دلکشی کہیں داستان میں آئی ہو

یہ جلد جلد بدلتا ہوا زمانہ ہے
کہ آج ہے جو حقیقت وہ کل فسانہ ہو

نہ جانے بات یہ کیا ہے تجھیں جیدرں سے دیکھا ہے — مری نظروں میں دنیا بھر حسین معلوم ہوتی ہے
چل گیا اس نگاہ کا جادو — کہہ گئے دل کی بات کیا کہئے

سیماب :- سیماب اکبرآبادی جدید اُردو غزل کی مجلس میں ایک ایسی ہستی ہیں جو عمر اور تعلیم و تربیت اور ذاتی مناسبت مزاج کے اعتبار سے ایک گذرے ہوئے دور سے وابستہ ہیں لیکن جو نئے دور کے نئے میلانات کا ایک بے تشنج احساس رکھتے ہیں۔ اور جدید اسلوب کے اشعار کہنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے اشعار جدید غزل میں بڑے مزے سے کھپ جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے کلام میں کہنگی اور فرسودگی تو نہیں آنے پاتی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کر رہے ہیں اور قدم ٹھیک نہیں پڑ رہے ہیں۔
ان کا کلام کسی انفرادی خصوصیت کا حامل نہیں۔ ان کے رسمی شاگردوں کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو مگر جدید نسل پر ان کا کوئی کارگر اور مستقل اثر نہیں ہے۔ وہ خود بڑے مشاق شاعر ہیں اور شعر کہنے میں ان کو مطلق کوئی زحمت نہیں ہوتی۔ ان کے وہاں کافی تعداد اچھے اشعار کی نکل آتی ہے مگر ان میں کسی جمالیاتی بصیرت یا وجدانی تاثر کا پتہ نہیں چلتا۔

آزاد :- آزاد انصاری نے حالی کی شاگردی سے متاثر ہو کر اُردو غزل میں ایک بالکل نئے اسلوب کی بنیاد ڈالی تھی۔ مگر چونکہ ان کی شاعری اس عنصر سے بالکل خالی ہے جس کے بغیر ایک غزل غزل نہیں ہو سکتی ہے اس لئے کوئی ان کی تقلید کی طرف مائل نہ ہو سکا۔
بہرحال وہ خود اپنے رنگ کے بڑے قادر الکلام غزل گو ہیں۔ الفاظ اور فقروں کی تکرار سے جس جس طرح انھوں نے اشعار میں لطف اور معنی بڑھائے ہیں انھیں کا حصہ ہے۔
آزاد اپنے رنگ کے اکیلے شاعر ہیں اگر ان کے وہاں شدت کیف یا کوئی متفکرانہ بصیرت بھی ہوتی تو آج وہ جدید اُردو غزل میں بڑی زبردست قوت ثابت ہوتے۔ مگر شاید ان کا یہ اسلوب کسی قسم کی گہرائی یا شدت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

فانی :- حسرت اور عزیز کے بعد جس شاعر نے جدید اُردو غزل کا رخ متعین کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے وہ فانی بدایونی ہیں جو ابھی چند مہینوں کی بات ہے زندوں کی محفل میں شریک تھے۔ فانی رسمی طور پر شاید کسی کے شاگرد نہیں ہیں اور ان لوگوں میں سے ہیں جو خود اپنی فطری اپج کو اپنا رہبر بناتے ہیں مگر پھر بھی ان کا آہنگ تغزل عزیز لکھنوی کے آہنگ سے ایک حد تک مماثلت رکھتا ہے لیکن فانی کے وہاں جو سوز و گداز ملتا ہے اُسے مرثیت سے دور کی بھی نسبت نہیں جو عزیز کے وہاں ساری فضا پر چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ فانی کی غزلوں میں اُداسی ہوتی تو ضرور ہے مگر یہ اُداسی گہری اور پرتامل ہوتی ہے۔
غالب کے بعد اگر اقبال سے تھوڑی دیر کے لئے قطع نظر کر لیا جائے تو اُردو غزل میں فانی پہلے شاعر ہیں جن کے کلام میں شروع سے آخر تک حکیمانہ بصیرت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے وہاں جذبات و واردات فکر و تامل کے احاطے سے گزر کر ہم تک پہونچتے ہیں اور ان کی دردمندی ہم کو کسی حکیم یا عارف کی دردمندی معلوم ہوتی ہے۔ فانی کے تغزل کو ہم میر اور غالب کا ایک کامیاب امتزاج کہہ سکتے ہیں۔
فانی کا مقابلہ انگریزی کے مشہور یاس انگیز شاعر اے۔ ای ہاؤسمین (A. E. Houseman) سے کیا جا سکتا ہے۔ فانی کی غزلوں میں جو حزن و یاس ہے وہ ایک مابعد الطبیعیاتی تصور ہے اور ان کی قنوطیت ایک حکیمانہ توازن لئے ہوئے ہے۔ عزیز یا اُردو کے کسی دوسرے مشہور یاس انگیز غزل گو سے اگر فانی کا موازنہ کیا جائے تو فانی کے لہجے میں ہم کو ایک مردانہ تحمل اور ایک خوددارانہ بے نیازی کا بھی احساس ہوگا جو دوسروں کے وہاں قریب قریب مفقود ہے۔
فانی کی شاعری میں ادراک و فکر کی جو بلند آہنگی ہے وہ یقیناً جدید اُردو غزل کے لئے ایک نئی وسعت تھی اور ایک خاصے عرصہ تک اُردو غزل کی نئی نسل اس نئی جولانگاہ کا جائزہ لیتی رہی۔
باوجود اس کے کہ فانی ایک متفکر شاعر ہیں اور دقت نظر اور فلسفیانہ تعمق ان کی شاعری کی عام امتیازی خصوصیت ہے لیکن ان کی زبان اور ان کے اسلوب میں کہیں سے وہ پیچیدگی یا غرابت محسوس نہیں ہوتی جو عموماً ایسی شاعری میں آپ سے آپ پیدا ہو جاتی ہے۔ فانی کی زبان سنجیدہ اور پرتامل ہوتے ہوئے بھی نہایت پاکیزہ اور دلنشیں ہوتی ہے۔ اگر کہیں انھوں نے کچھ اسلوب میں جدتیں پیدا بھی کی ہیں تو ان میں کوئی اجنبیت کا احساس آنے نہیں دیا ہے الفاظ

کا انتخاب اور ان کی ترتیب فانی کے وہاں اس قدر خوش آہنگ ہوتی ہے کہ شعر کے معنوی اشارات کی طرف ذہن بعد کو منتقل ہوتا ہے۔ پہلے اس کا پر ترنم ہی ہم کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

فانی کی شاعری میں جو سب سے بڑی کمی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے موضوع کا دائرہ تنگ ہے۔ وہ زندگی کے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈالتے۔ محبت، موت اور تاریکی کا احساس اس طرح ان کی شاعری کائنات پر چھایا ہوا ہے کہ معلوم ہوتا ہے زندگی اس کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ اس سے ان کی شاعری میں تھکا دینے والی یکسانی پیدا ہو گئی ہے۔

فانی کی شاعری کا مجموعی اثر ایک قسم کی غنودگی ہے مگر یہ غنودگی ہے بڑی بلیغ اور پر کیف۔ چند اشعار نمونہ کے طور پر یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

ہر شاخ ہر شجر سے نہ تھی آشیاں کو لاگ　　　ہر شاخ ہر شجر پہ میرا آشیاں نہ تھا
تو نے کرم کیا تو بعنوان رنج زیست　　　غم بھی مجھے دیا تو غم جاوداں نہ تھا

مذاق تلخ پسندی نہ پوچھ اس دل کا　　　بغیر مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا
وہ نامراد اجل بزم یاس میں بھی نہیں　　　یہاں بھی فانی آوارہ کا پتا نہ ملا

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانی　　　دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار رہیں ہم

عجز گناہ کے دم تک ہیں عصمت کامل کے جلوے　　　پستی ہے تو بلندی ہے راز بلندی پستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے　　　دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

تجھے خبر ہے ترے تیر بے پناہ کی خیر　　　بہت دنوں سے دل ناتواں نہیں ملتا

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا　　　زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی　　　زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

ہم ہیں اور عزم آشیاں یعنی　　　رہ گئی دور طاقت پرواز
ہے کہ فانی نہیں ہے کیا کہئے　　　راز ہے بے نیاز محرم راز

ہر مژدۂ نگاہ غلط جلوہ خود فریب　　　عالم دلیل گمرہی چشم و گوش تھا

کس کی کشتی تہ گرداب فنا آ پہونچی　　　شور لبیک جو فانی لب ساحل سے اٹھا

ہم کو مرنا بھی میسر نہیں جینے کے بغیر　　　موت نے عمر دو روزہ کا بہانا چاہا

سکون خاطر بلبل ہے اضطراب بہار　　　نہ موج بوئے گل اٹھتی نہ آشیاں ہوتا

زندگی جو کیا ہے فانی یہ تو کیا کہئے مگر　　　موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

نہیں معلوم راہ شوق میں بھی ہے کوئی منزل　　　جہاں تھک کر نظر ٹھہرے وہیں معلوم ہوتی ہے

محشر میں صبر دوست سے طالب ہوں داد کا　　　آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی　　　گرداب کی ہر تہ میں ساحل نظر آتا ہے

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبض کائنات　　　جب مزاج دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے

بہار نذر تغافل ہوئی خزاں ٹھیری　　　خزاں شہید تبسم ہوئی بہار ہوئی

اسی زمانہ میں اصغر گونڈوی کی شاعری کا شہرہ ہونے لگا اور ایک عرصہ تک اہل ذوق کی زبانوں پر اصغر ہی کا نام رہا۔ اصغر نے اردو شاعری میں ایک بالکل نئی سی چیز پیدا کی جو تھی تو تصوف کے عنوان کی چیز مگر جس کو روایتی تصوف سے کوئی نسبت نہ تھی۔ اصغر نے انسانی زندگی کے مرکز اور اس کی سطح کو بلند کیا۔ ان کے دیوان کے اشعار پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری زمین نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہے اور اب فضائے بسیط میں اڑی چلی جا رہی ہے۔

اصغر نے اُردو غزل میں نئی لطافتیں پیدا کیں۔ اور اس میں فکر و تامل کے لئے ایک بالکل نئی سمت نکالی۔ ان کے اسالیب نے بھی اُردو غزل میں نئے
ہوئے۔ وہ ہم کو انگریزی کے مشہور شاعر ورڈسورتھ کی یاد دلاتے ہیں۔ ان کے کلام میں وہی ماورائی (Transcendtal .)
شروع سے آخر تک چھائی ہوئی ملتی ہے جس سے ورڈسورتھ کی شاعری ممتاز ہے۔ اُن کی شاعری اُردو میں ایک ایسا نیا میلان ہے جو قدیم اور جدید
میں کسی کے وہاں نہیں ملتا۔ قدیم غزل کے اسالیب و صور انھوں نے استعمال ضرور کئے ہیں مگر ان سے اُنھوں نے بالکل نئے نمونے بنائے ہیں۔

اصغر کے کلام میں انسانی دلچسپیاں سرے سے مفقود ہیں۔ انھوں نے انسانی زندگی پر ایک ماورائی نظر ڈالی ہے۔ جس نے اس زندگی کو ایک سحابی چیز بنا کر
یا ہے۔ انسانی فطرت کا وہ اہم اور ہمہ گیر عنصر جس کو شعور جنسی کہتے ہیں اصغر کے وہاں نہیں ملتا اور اگر ملتا ہے تو اپنی اصلیت سے بیگانہ نظر آتا ہے۔ اس نے ان کی
ری کو کچھ صوفی سی بنا رکھا ہے۔

اصغر کے اشعار پڑھتے وقت ہم ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے ہم پر کوئی تنویم کا عمل کر رہا ہو اور ہم پر غشی سی چھا رہی ہو اور ہر ٹھوس چیز ہمارے سامنے تحلیل
جا رہی ہو۔

رۃ۔ اصغر کے ساتھ ہی جگر مرادآبادی کی آواز بھی بلند ہوئی اور ہماری غزل کی ساری فضا میں اس طرح گونج اُٹھی کہ ابتک اس کی جگہ کوئی دوسری آواز
نہیں سکی ہے۔ جگر کی شخصیت اور ان کی شاعری دونوں ملکر ایک داستان (Legend .) بن گئی ہے اور باوجود اس کے کہ وہ کسی کو اپنا
ردنہیں بناتے اسوقت سارے ہندوستان میں غزل میں نوجوان طبقہ سب سے زیادہ اُنھیں کی تتبع کرتا نظر آتا ہے۔ وہ جدید اُردو غزل میں ایک مستقل طرز کے
جگر اکثر غزل گو شاعر ہیں اور حسن و عشق کے احساس سے علیحدہ ہو کر انھوں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ ان کے کلام میں بیشتر وہ ربودگی پائی جاتی ہے جس کو تغزل کا اصلی
بتایا گیا ہے اور ان کی زبان اور انداز بیان میں جو بے اختیاری ہوتی ہے وہ ان کی اپنی چیز ہے اور اُردو غزل میں بالکل نیا عنوان ہے۔ عشقیہ زندگی کے واردات
املات کی نزاکتوں کو جدید نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے بیان کرنے میں وہ اکثر قابل رشک حد تک کامیاب رہتے ہیں۔

لیکن جگر کے وہاں التباسات اتنے ہیں کہ ہم غزل کی طرف سے اندیشہ ناک ہو جاتے ہیں۔ اُن کی ساری شاعری ہیجان اور عصبی بے اختیاری کی شاعری ہے جس پر
کیفیت کا دھوکا ہوتا ہے۔ جگر میں ایک زبردست صلاحیت یہ ہے کہ وہ چند سطحی تاثرات اور ظاہری خصوصیات میں ہم کو مبہوت کر لیتے ہیں اور گہرائیوں میں جانے
از رکھتے ہیں۔ اسی لئے میں نے ان کو ایک خطرہ بتایا ہے۔ لیکن جو لوگ ٹھیر کر اور اپنے کو روک کر غور کرنے کے خوگر ہیں وہ محسوس کرتے ہیں کہ جگر کی شاعری ایک ایسا
ن ہے۔ جو صرف ہماری جلد میں پیدا ہوتا ہے اور بات کی بات میں ختم ہو جاتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

بیٹھے ہیں بزم دوست میں گم شدگان حسن دوست — عشق ہے اور طلب نہیں نغمہ ہے اور صدا نہیں

وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اس کا کیا علاج — دل مانتا نہیں کہ نظر کامیاب ہے

وہ کچھ سہی نہ سہی پھر بھی زاہد ناداں — بڑے بڑوں سے محبت میں کافری نہ ہوئی

صبا یہ ان سے ہمارا پیام کہہ دینا — گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی

ہم کہیں جاتے ہیں واعظ ترے بہکانے میں، — اسی میخانہ کی مٹی اسی میخانے میں،

حرم و دیر میں رندوں کا ٹھکانا ہی نہ تھا — وہ تو یہ کہئے اماں مل گئی میخانے میں

اگر تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں — جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

ان کے بہلائے بھی نہ بہلا دل — رائگاں سعیِ التفات گئی

سحر ہونے کو ہے بیدار شبنم ہوتی جاتی ہے — خوشی منجملۂ اسباب ماتم ہوتی جاتی ہے

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی — وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

شکن کاش پڑ جائے اپنی جبیں پر — پشیماں بہت ہیں ستم ڈھانے والے

نظر سے ان کی پہلی ہی نظر یوں مل گئی اپنی، — کہ جیسے مدتوں سے تھی کسی سے دوستی اپنی

وہ ان کی بے رخی وہ بے نیازانہ ہنسی اپنی
بھری محفل تھی لیکن بات بگڑی بن گئی اپنی

جنونِ محبت یہاں تک تو پہونچا
کہ ترکِ محبت کیا چاہتا ہوں

ان لبوں کی جاں نوازی دیکھنا
منھ سے بول اٹھنے کو ہے جامِ شراب

وہ رند ہوں کہ الٹ دی جب آستیں میں نے
دکھا دئے حرم و دیر سب یہیں میں نے

تو بھی اب سامنے آئے تو لٹا دوں تجھکو
تیری غیرت کی قسم اپنی حمیت کی قسم

ہائے ! مجبوریاں محرومیاں ناکامیاں
عشق آخر عشق ہے تم کیا کرو ہم کیا کریں

وہ زلفیں دوش پر بکھری ہوئی ہیں
جہاں آرزو تھرا رہا ہے

فکرِ منزل ہے نہ ہوشِ جادۂ منزل مجھے
جا رہا ہوں جس طرف لیجا رہا ہے دل مجھے

عشق کی قسمت محرومِ الٰہی توبہ
یادِ جاناں بھی فراموش ہوئی جاتی ہے

اُردو غزل میں اس وقت ایسوں کا بھی ایک گروہ نظر آتا ہے جو درحاصل نظم نگار ہیں اور نظم کی دنیا میں نمایاں حیثیت حاصل کر چکے ہیں لیکن جنھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور غزل گویوں کی محفل میں بھی شریک رہنا چاہتے ہیں۔ ان میں جوشؔ ملیح آبادی کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔

جوشؔ :- جوشؔ اپنی طبعی مناسبت کے اعتبار سے نظم نگار شاعر ہیں۔ لیکن انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور اچھی غزلیں کہی ہیں۔ اگرچہ وہ خود شاید غزل کو اپنے کارنامہ کا کوئی اہم جزو نہیں سمجھتے۔

جدید اُردو نظم میں جوشؔ اس حیثیت کے مالک ہو چکے ہیں جس کے متعلق دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ اُن کی نظمیں جدید میلانات سے معمور ہوتی ہیں اور عصری تشنجات کی بہت صحیح نمایندگی کرتی ہیں۔ ان کی شاعری کو بجا طور پر انقلابی شاعری کہا جا رہا ہے جو انقلاب و ترقی کے مطالبات سے بہت اچھی طرح ہم آہنگ ہے اور ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ جوشؔ نے اقبالؔ کی جگہ لے لی ہے اور ترقی کی سمت اقبالؔ سے زیادہ فراخ حوصلگی، بلند آہنگی اور جسارت کے ساتھ قدم بڑھا رہے ہیں۔

لیکن یہاں ہم کو ان کی نظم نگاری سے بحث نہیں ہے۔ غزل میں بھی وہ اپنی نئی جولانیاں دکھاتے ہیں اور ان کے اشعار میں یہاں بھی ولولۂ شباب کی تازگی اور بالیدگی محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ اس میدان میں وہ بھی عشق و حسن کے موضوع سے علٰحدہ ہوکر کم کہتے ہیں۔ کہیں کہیں زندگی کے اور مسائل کی طرف بھی اشارے ہیں۔

وہی رندی اور سرمستی اور وہی عاشق و معشوق کے واردات و معاملات جو اب تک غزل کے عام موضوع رہے ہیں عموماً جوشؔ کی غزلوں میں بھی ہیں البتہ ان میں جوانی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن مجموعی اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جوشؔ کی غزلوں میں وہ زور اور تندی کا وہ خروش نہیں ملتا جو ان کی نظمیں اس قدر ممتاز کئے ہوئے ہے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں :-

ارض و سماں کو ساغر و پیمانہ کر دیا
رندوں نے کائنات کو میخانہ کر دیا

کچھ روز تک تو نازشِ فرزانگی رہی
آخر ہجومِ عقل نے دیوانہ کر دیا

فراغ روزِ مسرت سے ڈھونڈنے والے
شبوں کو محرمِ سوز و گداز کرتا جا

آؤ سپرِ جلوۂ جاناں پہ نثار دیں کونین
محفل پاریۂ اربابِ نظر تازہ کریں

ہنوز شہسواریاں رہینِ کبر و ناز ہیں
آل تاج و تخت کی کہانیاں سنائے جا

رخِ نگارِ زندگی نقاب در نقاب ہے
نہ ہو کا ختم سلسلہ مگر نقاب اٹھائے جا

فغاں کہ مجھ غریب کو حیات کا یہ حکم ہے
سمجھ ہر ایک راز کو مگر فریب کھائے جا

ہاں آسمان اپنی بلندی سے ہوشیار
لے سر اٹھا رہے ہیں کسی آستاں سے ہم

شباب رفتہ کے قدم کی چاپ سن رہا ہوں میں ——— ندیم عہد شوق کی کہانیاں سنائے جا
سمجھ کے گا اس کا درد کون شورش کائنات میں ——— تو نے جسے مٹا دیا پر دۂ التفات میں
پتہ منزل کا ہم کو تو ملا جوشؔ ——— بغاوت کر کے میر کارواں سے

ان اشعار سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جوشؔ نے غزل میں بھی چند نئے اسلوبی امکانات پیدا کئے ہیں۔ وہ اکثر ایسے الفاظ اور فقرے استعمال کر کے شعر کی معنوی وسعت بڑھا دیتے ہیں جن کا استعمال ابتک روایتی غزل میں غیر فصیح نہیں تو خلاف وضع ضرور سمجھا جاتا رہا ہے۔

نظم نگار غزل گو شاعروں میں حفیظؔ جالندھری اور اخترؔ شیرانی بھی قابل لحاظ حیثیت رکھتے ہیں۔ حفیظؔ کو چونکہ موسیقی سے فطری مناسبت ہے اسلئے وہ نظم لکھیں یا غزل ان کے وہاں بہر صورت ایک ہلکے قسم کا تغزل لے کا جو ہموار ہوگا۔ مگر حسن میں تصور سے زیادہ غنا کا عنصر غالب رہے گا۔ حفیظؔ کا موضوع شاعری شباب اور عشق کا ایک رومانی تصور ہے جو محدود اور سطحی ہے مگر جس کی دلکشی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی نظمیں اور غزلیں دونوں اس مقام کی چیزیں ہیں جہاں جوانی دیوانی ہوتی ہے۔

حفیظؔ:- حفیظؔ نے اُردو غزل اور اُردو نظم دونوں میں جو اسلوبی جدتیں کی ہیں وہ اپنی غنائی کیفیت کی وجہ سے اس قدر دلکش ہیں کہ اُن کو قبول کر لینے میں کبھی کسی کو پس و پیش نہ ہوگا۔ اُن کے یہ نئے شعریات اُردو شاعری میں یقیناً اضافے ہیں۔

اخترؔ:- اخترؔ شیرانی بھی اسی عنوان کے شاعر ہیں مگر بہ حیثیت حسن کار (Artist) کے وہ نہ صرف حفیظؔ جالندھری سے بلکہ اس دبستان کے اکثر شعراء سے فائق ہیں ان کی جمالیاتی بصیرت یقیناً زیادہ رچی ہوئی ہے اور بڑی نازک بلاغت اپنے اندر رکھتی ہے۔ اخترؔ شیرانی کے وہاں بھی جوانی کے بلا اختیار جذبات کے سوا کچھ نہیں ہوتا ان کی نظمیں اور غزلیں بھی ان کے جنون شباب کا راز بری طرح فاش کرتی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اپنی جوانی کی رعنائیوں کو خود برداشت نہیں کر سکتا۔ روانیت اور موسیقیت ان کی شاعری کی بھی نمایاں خصوصیتیں ہیں مگر اُن کے وہاں ایک سچے قسم کا گداز ایک بلند قسم کی انسانی بھی ہوتی ہے جو حفیظؔ کے وہاں نہیں ہے۔ اخترؔ شیرانی کی نظموں اور غزلوں میں کوئی معنوی فرق نہیں ہوتا اس لئے کہ دونوں کی جان سلمیٰ ہوتی ہے۔ اخترؔ کے اسلوب اور ان کی زبان میں جدت اور بے ساختہ پن کے باوجود پختگی ہوتی ہے جو ان کے اشعار کی دلکشی کو بڑھا دیتی ہے۔

علی اخترؔ:- علی اخترؔ ایک ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں ہم کو ایک نئے انداز کا فلسفیانہ تعمق ملتا ہے اور ان کی شاعری تاملات (Meditations) کے لئے بنی ہے۔ وہ بھی نظمیں اور غزلیں دونوں کہتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ تاثرات اور تاملات غزل میں بیان کئے جا سکتے ہیں لیکن اخترؔ نظموں میں زیادہ اپنی شخصیت شعری کو ظاہر کر سکتے ہیں۔ غزلوں میں وہ کچھ بند ہونے لگتے ہیں اور کم رو پڑ جاتے ہیں۔

ملاؔ:- آنند نرائن ملاؔ نظم اور غزل دونوں میں ایک کامیاب معیار قائم کئے ہوئے ہیں۔ جذبات کا توازن اور زبان کی سنجیدگی اور سلاست ان کی وہ نمایاں خصوصیتیں ہیں جو کبھی کبھی چکبستؔ کی یاد تازہ کر دیتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان میں ایک نہایت صالح اور پاکیزہ قسم کا ذوق تغزل پایا جاتا ہے جو ان کی نظموں کی بھی جان ہوتا ہے۔ موضوع اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے وہ اُن نظم نگار غزل گو شاعروں سے بالکل الگ ہیں جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔

افسرؔ:- افسرؔ میرٹھی اُن لوگوں میں سے ہیں جو جدید اُردو غزل اور جدید اُردو نظم دونوں میں ایک تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہماری شاعری میں نئے امکانات پیدا کئے اور اس کے لئے بہت سی آزادیاں حاصل کیں۔ نئی تحریک کو فروغ دینے میں ان کی شاعری کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن بجائے خود وہ کسی شدید کیف یا شدید قوت کی مالک نہیں ہے۔ افسرؔ کی اہمیت بھی اسلوبی اجتہادات پر مبنی ہے۔

روشؔ۔ احسانؔ:- روشؔ اور احسانؔ دانش کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہ لوگ خالص نظم نگار شاعر ہیں اور غزلیں کہہ کر اپنی قوت کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ ان لوگوں کو غزل کے میدان میں آنا ہی نہیں چاہئے۔

میں نے قصداً ابھی تک دو نہایت اہم غزل گو شاعروں کا ذکر روک رکھا تھا اس لئے کہ انھیں پر میں اپنا یہ تذکرہ ختم کرنا چاہتا تھا۔

یاسؔ و فراقؔ:- میری مراد مرزا یاسؔ یگانہ اور فراقؔ گورکھپوری سے ہے۔ دونوں نے اُردو غزل میں نئی لب و لہجہ پیدا کی ہیں اور مزید نئی بصیرتوں کے امکانات کی طرف اشارے کر رہے ہیں۔ دونوں جدید دور کی جدید نفسیات کے شاعر ہیں

یاسؔ اُردو غزل میں پہلا شخص ہیں جن کی شاعری میں وہ کس بل محسوس ہوتا ہے جس کو ہم صحیح اور توانا زندگی سے منسوب کرتے ہیں۔ اس سے پہلا بھی میں کسی موقع پر کہہ چکا ہوں کہ یاسؔ پہلے شاعر ہیں جو ہم کو زندگی کا جبر۔تی رُخ دکھاتے ہیں اور ہمارے اندر سعی و پیکار کا ولولہ پیدا کرتے ہیں۔ غزل کو جو ابتک صرف حسن و عشق کی شاعری سمجھی جاتی رہی ہے یاسؔ نے زندگی کی شاعری بنایا اور انسان اور کائنات کی ہستی کے رموز و اشارات کو اپنی غزلوں کا موضوع قرار دیا۔ میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں کہ ان کے دیوان حسن و عشق سے متعلق اشعار نہیں ملتے ملتے ہیں مگر ان میں بھی حسن و عشق کا احساس عام اور عالمگیر زندگی کے احساس میں سمویا اور کھویا ہوا ہوتا ہے۔

یاسؔ اس کشاکش اور تصادم کا احساس ہمارے اندر بڑی سہولت اور کامیابی کے ساتھ پیدا کر دیتے ہیں جو زندگی کا اصل راز ہے اور جس کا احساس عصر جدید کا سب سے بڑا اکتساب ہے۔ مگر یاسؔ احساس سے ہم کو سراسیمہ نہیں کرتے۔ ان کی غزلوں کی سب سے نمایاں خصوصیت مردانہ عزم اور اعتماد ہے۔

یاسؔ، آتشؔ اور غالبؔ کا ایک نہایت صحت بخش امتزاج ہیں۔ ان کے کلام میں جو گمبھیر قسم کی مردانگی ہے وہ آتشؔ کی یاد دلاتی ہے اور جو مفکرانہ بلاغت اور عارفانہ آگاہی ہے وہ غالبؔ کے رنگ کی چیز ہے۔ مگر یاسؔ مقلد کسی کے نہیں ہیں۔ انھوں نے غزل میں واقعی بت شکنی کی ہے۔ اور روایتی موضوعات اور اسالیب دونوں سے انحراف کر کے ہم کو غزل کی امکانی وسعتوں سے آگاہ کر دیا ہے۔ پھر چونکہ یاسؔ نہ اپنے اور ہمعصر اور ہم چشم شعرا کی طرح زبان کو کبھی توڑا مروڑا نہیں بلکہ ایک واقفکارانہ اعتماد اور ایک ماہرانہ وثوق کے ساتھ قاعدہ اور ضابطے کے ساتھ اجتہادات کئے اس لئے کڑ سے کڑ زبان کا نقاد بھی ان کے اکتسابات کو بدعت نہ کہہ سکا۔ اور اسالیب اور موضوعات دونوں میں ان کے اجتہادات تسلیم کر لئے گئے۔ یاسؔ کے وہاں ماضی کے بہترین عناصر پائے جاتے ہیں مگر وہ مستقبل کی تعمیر میں کام لے رہے ہیں۔ یاسؔ اُن لوگوں میں سے ہیں جن کے کلام کی رہنمائی میں غزل کی ایک بالکل نئی نسل پیدا ہو سکتی ہے جو اس قابل ہو کر زندگی کے نئے میلانات اور نئے مطالبات سے عہدہ برآ ہو سکے۔ لیکن ہم کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یاسؔ کا کلام اب منظر عام پر بہت کم آتا ہے۔ معلوم نہیں کہتے ہی کم ہیں یا کہتے ہیں اور اشاعت سے رُکے رہتے ہیں۔ وجہ جو کچھ بھی ہو مگر یہ بات ہے قابل افسوس۔

آخر میں ایک بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ یاسؔ کی غزلوں میں زندگی کی جو قوت ہم کو ملتی ہے اور جد و جہد کا جو احساس ہمارے اندر پیدا کرتے ہیں اسکو ان کے ذاتی مزاج کے اس عنصر سے زیادہ تعلق نہیں ہے جو ایک عرصہ تک ان کے چنگیزی معرکوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ بلکہ جب کبھی اور جہاں کہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ چنگیزی عنصر ان کی شاعری میں داخل ہو گیا ہے تو بجائے قوت و جبروت کے خشونت اور کرختگی کا احساس پیدا کر دیا ہے۔

یاسؔ کیا ہے اور ان کے اشعار کا کیا اثر ہوتا ہے؟ ۔ اس کا ان چند اشعار سے کیجئے:۔

رفتارِ زندگی میں سکوں آئے کیا مجال
طوفاں ٹھہر بھی جائے تو دریا بہا کرے

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

سمجھے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

اسی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی دور
اس آجکل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ راز پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

آندھیاں رکیں کیونکر زلزلے تھمیں کیونکر
کارگاہ فطرت پاسبانی رب کیا

بہارِ زندگی نادان بہار جاوداں کیوں ہو
یہ دنیا ہے تو بر گردش وہی آرام جاں کیوں ہو

مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں ہے
مزاج اس دلِ بے اختیار کا نہ ملا

امیدوار رہائی قفس بدوش چلے
جہاں اشارۂ توفیق غائبانہ ملا

ہزار ہاتھ اسی جانب ہے منزلِ مقصود
دلیلِ راہ کا غم کیا ملا ملا نہ ملا

سمجھ میں آ گیا جب عذرِ فطرت مجبور
گناہ گارِ ازل کو نیا بہانہ ملا

امید و بیم نے مارا ہمیں دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

زمانے کی ہوا بدلی نگاہِ آشنا بدلی — اُٹھے محفل سے سب بیگانۂ شمعِ سحر ہو کر

کارگاہِ دُنیا کی نیستی بھی ہستی ہے — اک طرف اُجڑتی ہے ایک سمت بستی ہے

ہمیشہ منتظرِ انقلاب رہتے ہیں — مزاجداں ہیں جو ہنگامہ زار فطرت کے

براہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا — کبھی گمراہ ہو کر راہ پر آنا نہیں آتا

دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا — نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر — ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا

جرس نے مژدۂ منزل سنا کے چونکایا — نکل چلا تھا دبے پاؤں کارواں اپنا

وبالِ رنگ و بو سے چھوٹتے ہی پر نکالیں گے — گرانبار بہار آخر سبکدوشِ خزاں ہو کر

ارے او جلنے والے کاش جلنا ہی تجھے آتا — یہ جلنا کوئی جلنا ہے کہ رہ جاتا دھواں ہو کر

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی — لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

موجِ ہوا سے خاک اگر آشنا نہ ہو — دُنیائے گرد و باد کی نشو و نما نہ ہو

ایسا رونا بھی کوئی رونا ہے — آستیں آنسوؤں سے تر نہ ہوئی

اسیروں کی یہ خاموشی کسی دن گل کھلائیگی — قفس سے چھوٹ کر سر پر اُٹھا لیں گے گلستاں کو

لپٹی ہے بہت یادِ وطن جب دامنِ دل سے — پلٹ کر اک سلامِ شوق کر لیتا ہوں منزل سے

تس کی شاعری ہمارے اندر یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ زندگی ایک جدلیاتی حقیقت اور تصادم اور پیکار اس کی نمو اور بالیدگی کے لئے ضروری ہے۔
۔ فراق کی شاعری کا عنوان بدلا ہوا ہے۔ زندگی کے نئے میلانات نے ہماری نفسیات میں جو اہم پیچیدگیاں پیدا کی ہیں اور زندگی کی جو جدلیاتی لہریں
ندر اُبھر رہی ہیں آن کو بلیغ اور سنجیدہ اشاروں میں ہم تک پہونچا دینا فراق کی ایک بہت عام خصوصیت ہے۔ جو معنوی تہیں ہم کو فراق کی غزلوں میں
رہ عموماً دوسرے اُردو شاعروں کے وہاں نہیں ملتیں۔ کبھی کبھی تو ان کے دو مصرعوں میں اتنی تہہ اور گہرائیاں ہوتی ہیں کہ معنی یاب سے معنی یاب طبیعت
ل ہونے لگتی ہے کہ تھاہ کہیں ملیگی بھی یا نہیں۔

فراق کی شاعری میں حیات اور کائنات کے ساتھ ایک شدید اور گہری یگانگت کا احساس پایا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں زندگی اور عشق دونوں ایک آہنگ
ہر ہوتے ہیں اور ایک متبرک اور قابلِ احترام حقیقت بن جاتے ہیں۔ فراق کے وہاں ہجر اور محرومی اور تنہائی کا شدید احساس ملے گا۔ لیکن اس سے ہمارے
ہ تلخی نہیں پیدا ہوتی اور نہ ہم محبت اور زندگی سے بیزار ہوتے۔ اُن کی تلخی میں یہ احساس بھی شامل ہوتا ہے کہ زندگی ایک قابلِ قدر چیز ہے اور اس کی
اس کی قدر کا ایک لازمی اور اہم جزو ہے۔

فراق بھی ہمارے اندر زندگی کی جدلیت کا تیز شعور پیدا کرتے ہیں لیکن وہ یاس کی طرح زندگی کا صرف جبر وتی رُخ نہیں پیش کرتے۔ وہ حُسن اور قوت کو
ع بنا دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کی شاعری میں ہم کو وہ نرمیاں ملتی ہیں جو یاس کے وہاں نہیں ہیں اور جو قوت کے انتہائی احساس کا نتیجہ ہوتی ہیں۔
ی شاعری میں ایک عنصر ہم کو ایسا ملتا ہے جو بیک وقت ذاتی اور غیر ذاتی ہوتا ہے اور ہم کو غم اور خوشی اور اس قسم کے دوسرے نجی احساسات کی سطح سے
ر ہماری فکر و نظر کو بلند اور ہمہ گیر بنا دیتی ہیں۔ اس خصوصیت کے اعتبار سے وہ اپنے ہمعصر شعراء سے بہت ممتاز نظر آتے ہیں۔ وہ جب کسی لمحہ یا کسی موقع یا
لت سے متاثر ہوتے ہیں تو وہ تاثیر ایک آفاقی تاثر اور ایک کائناتی احساس بن جاتا ہے۔ اس سے ان کی شاعری میں ایک مسکن اور صحت بخش قوت آگئی
ی وقت کسی دوسرے اُردو غزلگو کے وہاں نہیں ملتی۔

فراق کے اسلوب میں بھی ایک ایسی پختہ گھلاوٹ ہے جو بالکل اُن کی اپنی چیز ہے اور جو ان کے کسی معاصر کے کلام میں نہیں ہے۔ اُن کے اشعار کی ایک
زیادہ نمایاں خصوصیت اُن کا آہنگ (Rhythm) ہے جو شاعر کی شخصیت شعری کا آئینہ ہے۔ جس بحر اور جس زمین میں بھی

وہ شعر کہیں گے اُن کا آہنگ ممتاز رہے گا اور یہ آہنگ محض صوتی نہیں ہوتا بلکہ شعر کے معنی ہی سے پیدا ہوتا ہے اور پھر معنی ہی کا جزو بن کر اس کی بلندی بڑھا دیتا ہے۔

فراق سے ہم کو صرف ایک بات کہنا ہے وہ یہ کہ غزل میں اُتنے اشعار نہ کہا کریں جتنے کہ اکثر وہ کہہ جاتے ہیں۔ غزل یوں بھی طویل اچھی نہیں ہوتی۔ شاعری جس عنوان اور جس نوعیت کی ہوتی ہے اس کا اور بھی مطالبہ ہے کہ وہ غزل میں شعروں کی تعداد اتنی نہ رکھا کریں۔

اب فراق کے کچھ اشعار نمونۃً پیش کئے جاتے ہیں:۔

حیات ہو کہ اجل سب سے کام لے غافل　　کہ مختصر بھی ہے کارِ جہاں دراز بھی ہے

کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اُٹھتا ہے　　بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی

کچھ گراں ہو چلا ہے بارِ نشاط　　آج دکھتے ہیں حسن کے شانے

اُسی دل کی قسمت میں تنہائیاں تھیں　　کبھی جس نے اپنا پرایا نہ جانا

اس سے زیادہ اور کیا اب کوئی نامراد ہو　　آج نظر سے گر چلیں عشق کی کامرانیاں

ابھی فطرت سے ہوتا ہے نمایاں شانِ انسانی　　ابھی ہر چیز میں محسوس ہوتی ہے کمی اپنی

قفس سے چھٹ کے وطن کا سراغ بھی نہ ملا　　وہ رنگِ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

ہجر میں پچھلے پہر کا عالم　　تاروں کو نیند آئی ہوئی سی

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں　　تو نے تو خیر بے وفائی کی

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہونے لگا　　خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

رموزِ عذرِ جفا تک خیال جا نہ سکا　　میں چپ رہا تو بُرا ماننے کی بات نہیں

فراق زیرِ چرخ کچھ چمک بھی ہو دھواں بھی ہو　　کہ جیسے اُٹھ رہی ہو وہ نگاہِ سرمگیں کہیں

نگاہِ یار کچھ ایسی پھری ہجراں نصیبوں سے　　کہ اب تو جس کا جی چاہے وہی غمخوار ہو جائے

تیری رنگینیِ طبیعت سے　　عشق کی سادگی بھی دور نہیں

تجھے دُنیا کو سمجھنے کی ہوس ہے اے کاش　　تجھے دُنیا کو بدل دینے کا ارماں ہوتا

ترے جمال کی تنہائیوں کا دھیان نہ تھا　　میں سوچتا تھا کوئی میرا غمگسار نہیں

سنگ و آہن بے نیازِ غم نہیں　　دیکھ ہر دیوار و در سے سر نہ مار

یہ کیا دُنیا ہے اے دل شیخ کوئی برہمن کوئی　　بتا ابھی نہیں اہلِ محبت کا وطن کوئی

دیارِ عشق آیا کفر و ایماں کی حدیں چھوٹیں　　یہیں سے اور پیدا کر خدا اور برہمن کوئی

اے رازِ جہاں بتانے والے　　اک اور جہانِ راز بھی ہے

جولانگہِ حیات کہیں ختم ہی نہیں　　منزل نہ کر حدودِ دنیا ابھی نہیں

شامِ غم کچھ اس نگاہِ ناز کی باتیں کرو　　بیخودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا　　کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

ہزار بار ادھر سے زمانہ گزرا ہے　　نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگزر پھر بھی

غرض کہ کاٹ دئے زندگی کے دن اے دوست　　وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

ان اشعار میں جو لطیفت اور درد، رس فرزانگی ہے وہ ہم کو شاذ و نادر ہی کسی دوسرے شاعر کے وہاں مل سکتی ہے فراق کے اکثر اشعار پڑھتے

ہمارے پاؤں زمین پر جمے ہوئے ہیں اور ہمارے ہاتھ ستاروں تک پہونچے ہوئے ہیں۔
یہ ہے ہماری موجودہ غزل گوئی کا اکتساب۔ گنتی کے دو ایک شاعروں اور بعض شعراء کے کچھ اشعار سے قطع نظر کر لیں تو ماننا پڑتا ہے کہ اردو غزل ابھی اسی خواب
دنیا کا جائزہ لینے میں لگی ہوئی ہے جہاں پہلے پہل اس کو ڈالا گیا تھا۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ غزل کے آئندہ امکانات بالکل رک گئے ہیں۔ لیکن نہ ایسا
ہونا چاہئے۔ اگر نظم میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ زندگی کی نئی سمتوں سے آشنا اور اس کے نئے میلانات اور نئی قدروں سے ہم آہنگ ہو سکے تو کوئی وجہ نہیں
بدلتی ہوئی دنیا کے بدلتے ہوئے معیاروں اور نئی قدروں کے ساتھ موافقت نہ پیدا کر سکے۔ اگر اجتماعی اور آفاقی زندگی کی وسعت اور انسانیت کی ہمہ گیری نظم کے لئے
کوئی چیز نہیں ہے تو غزل کے لئے بھی نہ ہونا چاہئے۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل چھوٹی سے چھوٹی نظم ہوتا اور سالماتی (Atomic) توانائی اپنے اندر
رکھتا ہے جو بڑے کام کی چیز ہے اور جس سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔
ہم نے ابھی غزل کے ان امکانات کی طرف توجہ نہیں کی ہے جن کی ایک جھلک اقبال ہم کو دکھا گئے ہیں۔ اقبال کی غزلیں بھی اسی قدر میلاناتی (Tendencious) ہوتی ہیں جس قدر کہ ان کی نظمیں اور ان میں بھی حیات انسانی کے متنوع پہلو اور کائنات کے مختلف زاویے ہم کو اسی طرح نظر آتے ہیں جس طرح کہ
نظموں میں۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق جو حکیمانہ اور مبصرانہ اشارے اقبال کی غزلوں میں ملتے ہیں وہ ہمارا دل بڑھانے اور ہم کو نئے اجتہادات پر آمادہ کرنے
والے ہیں۔ میری مراد اقبال کے صرف ان اشعار سے ہے جن کو خدا اور مذہب اور نظام ملی سے تعلق نہیں ہے۔ اقبال کی غزلوں کو اگر ہم دھیان میں رکھیں اور اس
کے کلام سے صحیح بصیرتیں حاصل کرتے رہیں تو ہمارے درمیان ایسے غزلگویوں کا پیدا ہوتا ممکن نہیں جو غزل کو زندگی کی نئی سمتوں اور نئی پیچیدگیوں سے مانوس
اور آشنا کر کے اس کو موجودہ جمود اور پستی سے بچا لیں۔ غزل کو اگر زندہ رہنا ہے تو اس کو یقیناً اجتہاد سے کام لینا پڑے گا اور روز بروز بدلتی اور پیچیدہ سے پیچیدہ
ہوتی ہوئی دنیا کی باہم متضاد ضرورتوں پر محیط ہو کر ان میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہوگا۔ ورنہ ہمارا تغزل زندگی سے بیگانہ رہ جائے گا اور خود زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکے گا۔

(نگار) پروفیسر "مجنوں" نے باوجود اس کے کہ ان کے پاس وقت و اطمینان دونوں کی کمی تھی، انھوں نے محض میری خاطر سے یہ بسیط مقالہ سپرد قلم کیا، جس کا میں بہت
ممنون ہوں۔ مجنوں صاحب اپنی تنقاد ادبیت و سخن فہمی کے لحاظ سے ملک میں کافی اعتبار رکھتے ہیں، اس لئے ان کی رائے خاص وزن رکھتی ہے۔ گو کہیں کہیں ان کی
حیثیت ایک نرم متعصب کی سی ہو گئی ہے۔

اُردو غزل

ڈاکٹر تاثیر - ایم - اے - پی - ایچ - ڈی (کینٹب)

"نگار" بابت جنوری فروری ۱۹۴۱ء پیش نظر ہے +

نقادانِ غزل کے لئے یہ مجموعہ استنادی حیثیت رکھے گا +

شعراء کے خود نوشت حالات خصوصیت کے ساتھ دلچسپ ہیں۔ اکیس شعرا کا تذکرہ ہے۔ ان میں سے پانچ ہندو ہیں۔ تین حضرات نے حالات ہم نہیں پہونچائے باقی تیئیس رہ گئے۔ ان کی ایک مشترک صفت قابلِ توجہ ہے۔

(۱) آرزو لکھنوی - "جدِ اعلیٰ ہرات کے رہنے والے تھے"

(۲) اختر شیرانی - "الافغانی"

(۳) امید امیٹھوی - "مورثِ اعلیٰ ... ولایت عراق سے ... ہندوستان آئے"

(۴) تاجور - "درانی افغانی"

(۵) ثاقب - "وطن طبرستان +" "مولد آگرہ"

(۶) جوش - "بزرگ کابل سے آئے۔ اکثر افراد اس خاندان کے سلطنت اودھ میں اعلےٰ عہدوں پر مامور رہے۔"

(۷) فانی - "اصلی وطن کابل"

(۸) ناطق - "مورثِ اعلیٰ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ تشریف لائے"

(۹) ناطق لکھنوی "جدِ اعلیٰ ... بغداد سے ہندوستان آئے"

(۱۰) یگانہ "چنگیزی"

(۱۱) آزاد - "سلسلہ حضرت ایوب انصاری تک پہونچتا ہے"

ان گیارہ حضرات نے تو وضاحت اور التزام سے اپنا "غیر وطنی" ہونا ظاہر کیا ہے۔ باقی بزرگوں کے متعلق چند معلومات توجہ طلب ہیں :-

(ا) اثر لکھنوی - "اسلاف خاندانِ شاہی سے متوسل تھے"

(ب) جلیل - "نظام دکن کے اُستاد ..... شاہزادگان اور صاحبزادگان بھی حسب حکم سرکار ..... کلام دکھاتے ہیں"

(ج) جگر - "مورثِ اعلےٰ ..... شاہجہاں کے اُستاد"

(د) حفیظ - "میرا خاندان دو سو برس پہلے چوہان راجپوت کہلاتا تھا ..... سورج بنسی ہونے کا غرور"

(ہ) فراق - "میرے بزرگوں کو پانچ گاؤں شیر شاہ کے دئے ہوئے" ہیں +

(و) کیفی - "بزرگ ... فرخ سیر ... کے مرکزی دفاتر میں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز ہو گئے"

(ز) ساحر - "رنجیت سنگھ ... اور ان کے جانشینوں کے مشہور راجہ دینا ناتھ آپ ہی کے خاندان کے ایک معزز رکن تھے۔ آپ رائے بہادر ... رئیس دہلی

کے خلاف اکبر ہیں"۔

۔ اٹھارہ حضرات رئیسوں، نوابوں، اور بادشاہوں سے خاندانی تعلقات رکھتے ہیں۔ شاید تین چار، اور بھی اسی قسم کی روایاتِ نسبی کے حامل ہوں گے۔ اور اس امر کو شعوری طور پر وجہِ فخر سمجھتے ہوں گے + باقی ماندہ شعراء میں سے چند ایک فرو طبقۂ امراء کی طرزِ خیال اور سماجی روایات کو پسند کرتے ہوں گے + (کبھی حسرت کو کبھی جگر کو بھی کری اور کو شاید اسی رعایت سے "رئیس المتغزلین" کے لقب سے نوازا جاتا ہے۔۔۔۔ نادانستہ طور پر سہی!) ایک شاعر تو یہ کہہ کر "جدید اُردو ادب کی تعمیر کرنے والے ۸۰ فیصدی میرے شاگرد ہیں" مطمئن نہیں ہوا اور جب تک "ذاتی سرمایہ تیس ہزار" کا بتا نہیں دیا چین نہیں آیا۔ ان حضرت نے صوبجاتی نفاق کو بھی بھڑکانا چاہا ہے!۔۔ رئیسوں، نوابوں کے درباریوں کی طرح + غرض بیشتر متغزلین حضرات کا علاحی رشتہ طبقۂ رؤسا سے ہے +

میں یہ توضیحات تمدیح یا تنقیص کی غرض سے نہیں کر رہا۔۔ ایک جاذبِ توجہ حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں ایک اور بات قابلِ ذکر معلوم ہوتی ہے ان شعراء میں سے جو نظم گو بھی ہیں۔ یعنی احسان دانش، اختر شیرانی، جوش، حفیظ، سیماب، ملوک چند، ملا، افسر میرٹھی، کسی نے بھی اپنے رئیسی تعلقات کا خود ذکر نہیں کیا۔ (حفیظ بھی کہتا ہے کہ یہ "فخر میری ذات تک پہونچا اور ختم ہوگیا") + غزل گو کہنگی پسند ہیں۔ اور نظم گو روایات کے بندھن سے آزاد معلوم ہوتے ہیں + کیا یہ افتادِ طبیعت خود غزل اور نظم کی صنف سے متعلق تو نہیں؟ (واضح رہے کہ "غیر وطنی" ہونا۔۔۔۔ "ولایتی" ہونا۔۔۔۔ موجبِ فخر سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ "افغان" اور "مغل" حاکم اقوام تھیں۔ ان کے عمائد "ولایتی" تھے۔ اب صورتِ حالات مختلف ہے۔ مگر وہ افتخار کی روایت موجود ہے۔ آج کل "ولایت" سے مراد یورپ ہے اور "ولایت زدہ" ہونا وجہ ناز ہے +) ان اکتیس شعراء میں سے کوئی بھی (آنند نرائن ملا اور فراق کے علاوہ) بی۔ اے سے آگے نہیں بڑھا + پانچ (اثر، حسرت، ثاقب، محروم، افسر) بی۔ اے پاس ہیں + اور ان ساتوں میں سے غالباً فقط فانی اور اثر نظم نہیں کہتے۔ حسرت نے بھی بہت کم نظمیں کہی ہیں +

نظم گو شعراء انگریزی سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اختر۔ جوش۔ حفیظ۔ سیماب۔ کیفی۔ روش۔ علی اختر۔ محروم۔ ملا۔ افسر۔ یعنی احسان کے علاوہ سب لیکن خالص غزل گو شعراء کی اکثریت انگریزی تعلیم سے بے بہرا ہے!۔۔ پرانی رئیسی روایات سے وابستگی اور نئی تعلیم سے بے تعلقی۔۔ یہ عام متغزلین کے ذہنی پس منظر کا ایک نمایاں پہلو ہے!۔۔

مدیر "نگار" نے ان شعراء کو "دورِ غزل گوئی کی آخری نشانیاں" کہا ہے + غزل سے ان کی مراد "غریب حسن و عشق والی غزل" ہے + تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ حسن و عشق کا بازار سرد پڑ گیا ہے۔ یا یہ کہ "غزل" بحیثیت ایک صنفِ سخن حسن و عشق کے محرکات کے اظہار کے لئے بیکار ہوگئی ہے؟

مگر مجھے یہ استدلال کچھ ایسا قابلِ قبول معلوم نہیں ہوتا +

"غزل" سے مراد یا تو محض "یک قافیہ" کلام ہے۔ مگر قصائد اور نظمیں بھی یک قافیہ ہوسکتی ہیں اور ہوتی ہیں +

یا "غزل" سے مراد حسن و عشق کے مضامین ہیں۔ اور یہ غزل اور نظم میں مشترک ہیں + یا ان دونوں کا امتزاج یعنی یک قافیہ عشقیہ کلام۔۔ یہ قصائد کی تشبیب میں اور نظموں میں بھی ہوسکتا ہے۔ اور پھر مروجہ غزل میں غیر عشقیہ مضامین بھی ہوتے ہیں +

میری رائے میں "غزل" کے لئے یک قافیہ ہونا ضروری ہے۔ یہ فنی وصف ہے اور اس کا دوسرا بنیادی وصف یہ ہے کہ مختلف اشعار میں منطقی تسلسل نہ پایا جائے۔ اشعار متفرق ہوں۔۔ مضمون کے اعتبار سے۔۔ جب تسلسل ہوتا ہے تو ہم صراحت سے اسے مسلسل غزل یا قطعہ وغیرہ کا نام دیتے ہیں۔ گویا غزل کے لئے تسلسل غیر معمولی ہے!۔۔ غزل کی ساخت میں مماثلت (برائے بحر و قافیہ) ہوتی ہے۔ اور مضمون متفرق ہوتے ہیں!۔

کیا یہ اوصاف ہماری تمام شاعرانہ ضروریات کے منافی ہیں۔ اور لازمی طور پر فنا پذیر ہیں؟

یک قافیہ اشعار دنیا کی شاعری میں ہر دور میں کہے گئے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ یہ انتظام بیکار ہو جائے + حسن و عشق کے مضامین کی عالمگیری بھی مسلم ہے فطرتِ انسانی حسن و عشق سے وابستہ رہی ہے۔ اور رہے گی + اشعار میں منطقی تسلسل کا نہ ہونا بھی کسی طرح طبعِ انسانی کے منافی نہیں۔ ہمارے احساسات اور جذبات رو گویا غیر مسلسل اور غیر منطقی ہوتی ہے۔ اس لئے عدمِ تسلسل عین مطابق فطرتِ انسانی ہے۔ آج کل تو نثر میں بھی (بالخصوص فسانوں میں) شعورِ انسانی کا اظہار اس طرح کیا جاتا ہے کہ خیالات آگے پیچھے چلے آتے ہیں + کبھی ماضی۔ کبھی حال کبھی مستقبل میں اُچٹتے ہوئے سے!۔۔ (Tomas Joyce)

اس انداز کا امام تھا اور شاید ہی کوئی جدید مصنف ہو جس پر اس کا اثر نہ ہو۔ تو پھر یک قافیہ گر غیر مسلسل اشعار یعنی غزل کے متعلق، کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ صنف مٹنے والی ہے!۔

حقیقت یہ ہے کہ غزل مٹ نہیں رہی بلکہ جس نہج کی غزل داغ کے وقت تک مروج تھی وہ مٹ رہی ہے۔ داغ کے وقت تک بھی غزل کے دو واضح طریق تھے۔ نقاد دلی اور لکھنؤ سکول کا نام دیکر ان میں امتیاز کرتے ہیں) + اس کی وجہ ظاہر ہے ×

ہماری غزل درباروں کی پیداوار تھی۔ سجے ہوئے نوابوں اور مٹے ہوئے رئیسوں کے درباروں کی!۔۔ اس میں اسی قسم کے تاثرات کا اظہار ہوتا تھا جو اس فضا میں پنپ سکتے تھے +

نواب صاحب کا دربار ہے۔ درباریوں کے جتھے ہیں جو توڑ جوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کے رقیب ہیں۔ اور نواب کی توجہ، شاعر ہو یا کوئی اور، پرور دۂ سرکار ہو۔ ان لوگوں کی زندگی اور موت کا باعث ہے + نواب مطلق العنان ہے۔ جسے چاہا نوازا جسے چاہا ختم کر دیا۔۔ اور اس کے ہاں باریابی ایک مشکل مہم ہے۔ دروازے پر دربان ہیں!۔

یہ نواب کے دربار کا نقشہ ہماری "غزل" کا سرمایۂ حیات تھا۔ غزل کا بھی اور غزل گو کا بھی۔

چنانچہ شعرا کا معشوق بھی نواب تھا۔ وہی "رقیب" وہی "دربان"۔ وہی مطلق العنان، متلون المزاج شخص!۔

ادب اور فن کی سرپرستی انھیں درباروں میں ممکن تھی عوام اس قابل نہ تھے کہ شعراء کی قدر کر سکیں۔ یا ان کو زندہ رکھ سکیں۔۔ طباعت اور عام تعلیم کا دائرہ بہت مختصر تھا + (خواندگی چند مقررہ کتابوں تک محدود تھی) +

اس دربار میں شاعر کی حیثیت بہت ادنیٰ تھی۔۔ اس کی جنس محض تفریح کا سامان بن سکتی تھی۔ چنانچہ غزل میں شاعر ہمیشہ بدنصیب، اور نامراد عاشق ہوتا تھا۔ اور بوالہوس رقیب کامیاب!۔۔ ہوس، دنیاداری، افادی کاروبار ایک طرف اور عشق، ادب، رومانی تحریکات دوسری جانب!۔۔ ظاہر ہے کہ نواب کے دربار میں افادی قدریں زیادہ بلند مرتبہ تھیں اور ادب و فن محض تفریحی حیثیت رکھتے تھے۔ اگر شاعر تفریحی دائرے سے باہر جانا چاہتا تو نامقبول ہوتا تھا +

یہ ہلکی پھلکی تفریحی غزل کی شاعری۔ درباری فضا میں کامیاب ہوئی۔۔ چلتے ہوئے فقرے۔ اچھوتے ہوئے خیالات۔ پھبتی، طعن، ہوسکاری!۔۔ یہ تھا درباری غزل کا سرمایہ +

مگر جب یہ دور بدلا۔ جب رئیسی نظام ٹوٹنے لگا۔ تو غزل نے بھی پلٹا کھایا۔۔ خود رئیسوں اور نوابوں کو جان کے لالے پڑ گئے۔ ساہوکار، تاجر، کارخانہ دار متوسط طبقے کے لوگ، صاحب امر ہوئے اور پرانے حاکم نواب دیوالیہ ہونے لگے + طاقت کا توازن بدلا۔۔ اور اس میں کئی "دربار" اُلٹ گئے! نوابوں نے اپنے اخراجات کا بجٹ بنانا شروع کیا۔ اور سب سے۔ پہلے سب سے زیادہ غیر ضروری مدعین شعراء اور صناع خارج ہوئے + درباروں کے ساتھ درباری شاعری بھی مٹنے لگی +

اس پر ستم یہ ہوا کہ نئے فرمانروا بدیشی تھے۔ ان کی زبان۔ ان کا ادب۔ ان کی معاشرت بالکل مختلف تھی + اور جب انھوں نے سیاسی استقامت کے بعد یہاں کے ادب کی طرف توجہ کی تو شاعری کے پہلے دربار میں جو لاہور میں منعقد ہوا "نظم" ظہور پذیر ہوئی + ۔ انگریزی شاعری کے "مضامین" اردو میں نظم ہونے لگے +

مگر غزل مٹی نہیں۔ کیونکہ اس کی روایات بہت گہری تھیں اور اس کی بنیادیں فطرت انسانی میں پیوست تھیں +

واضح رہے کہ غالبؔ جو اس نئے دور میں سب سے زیادہ مقبول تھا۔ وہ درباری غزل سے طبعاً بغاوت کر چکا تھا۔ صاف صاف کہتا تھا ۔

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل　　　　کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غرض شاعر درباروں سے خارج ہو کر آزاد ہو گئے۔۔ نوابوں سے دور ہو کر وہ عام فطرتِ انسانی اور جذبات کے نزدیک آ گئے +

چنانچہ حسرتؔ کا تصورِ عشق نوابی نہیں۔۔ انسانی ہے!۔

اس طرح "غزل" کو ایک نئی زندگی حاصل ہو گئی۔۔ مگر یہ زندگی ایک نہایت معین اور محدود دائرے میں محصور ہے +۔

ہمارے موجودہ متغزلین میں فقط جلیلؔ کا تعلق "دربار" سے ہے۔ اور یہ "دربار" بھی پرانی قسم کا دربار نہیں۔ اصلاح شدہ دربار ہے!۔ لیکن یہ دربار بھی۔ اور حالات کے بدلنے کے باوجود ذہنی روایات وہی پرانی ہیں ۔۔۔ اس قسم کی غزل یقیناً ختم ہو رہی ہے۔ میرے خیال کا یہ کہنا کہ جلیلؔ اس وقت اپنے رنگ کے تنہا لکھنے والے ہیں"

...ل بیاہے۔ اور یہ قول کہ "جلیل کے یہاں نہ تصوف ہے نہ فلسفہ، نہ کوئی مضمون آفرینی نہ فکر و خیال کی بلندی" میرے اس نظریے کی تائید کرتا ہے کہ کامیاب ...اری شاعری لازماً تفریحی ہوتی تھی۔ ایسی کہ دماغ پر آنچ آئے نہ دل میں پیچ و تاب پیدا ہو + لفظوں، محاوروں کا الٹ پھیر" روانی بے تکلفی"۔ واہ، واہ، روز مرہ ہے کیا نایاب قافیہ ہے۔ ردیف زندہ کردی ہے!۔ یہ زبان، یہ محاورے تو اظہارِ خیالات کے ذرائع ہیں۔ مگر جب کوئی سماج زوال پذیر ہوتی ہے تو ذرائع مقصد ...جاتے ہیں اور جب کوئی آرٹ (شاعری یا ادب) زوال آمادہ ہو تو ذریعۂ اظہار بذاتِ خود مقصدِ اظہار ہو جاتا ہے + جب "خیال و فکر کی بلندی" نہ ہو تو پھر الفاظ، محاوروں کی "روانی" اور "بے تکلفی" ہی رہ جاتی ہے۔ شاعر میں کچھ جوہر ہوا تو "فن برائے تفنن" ہو گیا اور محض مہارت ہوئی تو "فن برائے فن"!۔

حسرت نے اس پرانی درباری غزل سے آزاد ہو کر ایک نئے دور کی ابتدا کی۔۔ اس کا عشق خلوص و نیاز کا آئینہ دار ہے۔ عالمگیر ہوتے ہوئے ایک انفرادی حیثیت ...تا ہے + یہ نہیں کہ وہ محض روحانی ہوائی تعلقات کو بیان کرتا ہے اور محسوسات کو ہوسناکی سمجھتا ہے + اس کا مخاطب ایک انسان ہے۔ انسان کی لطیف ترین ...س، عورت!۔ وہی عورت جو دل، دماغ، بدن، روح، ہر قوتِ انسانی پر چھا جاتی ہے۔ اور اپنی نزاکت اور بے بسی کے باوجود سطوت و جبروت کا مجسمہ ہوتی ہے ...س کے سامنے ہوس، ہوس رہتے ہوئے عشق بن جاتی ہے اور مجاز کا ایک پہلو حقیقت!

دل میں کیا کیا ہوس دید بڑھائی نہ گئی | روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی
ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی ان کا | جستجو کی کوئی تمہید اٹھائی نہ گئی
ہم رضا شیوہ ہیں تاویلِ ستم خود کر لیں | کیا ہوا ان سے اگر بات بنائی نہ گئی

یہ کوئی نادیدہ خیالی تصور نہیں۔ "ان" کا نام و نشان بھی ہے جستجو کا امکان بھی ہے!۔ حسرت نے عشقیہ شاعری میں محسوسات کا ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ واختر شیرانی جیسے شبابی رومانی شاعروں کا مخصوص مضمون بن گیا ہے۔ معشوق ایک معین "شخص" ہے۔ جس کا حواس خمسہ سے شعور پایا جا سکتا ہے۔

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں | یا عکس مے سے شیشہ گلابی
محبوبی و رنگینی ہیں جزوِ بدن تیری | سرشارِ محبت ہے خوشبوئے دہن تیری
محتاج بوئے عطر نہ تھا جسم خوب یار | خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی
رونقِ پیرہن ہوئی خوبیِ جسمِ نازنیں | اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

اس پیکرِ رنگ و بو کے اثرات بھی حسی ہیں ۔ اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی!۔۔

شدتِ خلوص۔ موضوعِ عشق کا تعین، جذبات کی انفرادیت ۔۔۔ یہ ہیں اس نئی غزل کے اوصافِ خصوصی۔ منجملہ اور اوصاف کے ۔۔ اور جب تک انسان ...پنی فطرت پر قائم ہے۔ غزل کے یہ اوصاف شاعری سے الگ نہیں ہو سکتے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ہر دور کے بنیادی حقائق مختلف ہوتے ہیں۔ اور انسانی ذہن کی توجہ پہلو ...لتی رہتی ہے + راگ تو اپنی اپنی جگہ سب اچھے ہیں مگر بے وقت کی راگنی ناگوار گزرتی ہے + اگر ملک پر ایک خونخوار غنیم حملہ آور ہو تو اس وقت بانسری کا نغمہ اگر جاذبِ توجہ ...ہو گیا تو تمام قوم ہلاک ہو جائے گی + نہیں تو وہ بگل کی آواز میں فنا ہو جائے گا اور قوم اپنی توجہ اپنی مدافعت کی جانب مبذول کر سکے گی!

اقبال، حافظ کی شاعری کا منکر نہ تھا۔ وہ اس کی ساحری کا ایسا معتقد تھا کہ اسے ڈر تھا کہیں تمام قوم ان دلکش نغموں کے اثر سے مبہوت اور بے کار نہ ہو جائے ...ور ایسی حالت میں جب ملکی ضروریات، حقائقِ حاضرہ، اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہر جوانمرد کے ہاتھ میں تلوار ہو۔ کہیں یہ نہ ہو کہ بانکے سپاہی بانسری سنبھالے ...محوِ رقص ہو جائیں +

اقبال، حافظ کو بہترین غزل گو سمجھتا تھا ۔۔ اور موجودہ دور کی غزل کا اندازہ فرقِ مراتب وہی حافظ کا سا ہے!۔۔

ہمارے "ترقی پسند مصنف" اس معاملہ میں اقبال کے پیرو ہیں۔ اختلاف اگر ہے تو بنیادی حقائق کی توضیح اور تعین میں ہے۔ شاعری کا نظریہ مختلف نہیں ...آج، جب دنیا ایک خونخوار جنگ کا تختۂ مشق بنی ہوئی، جب آزادی اور زندگی کے بنیادی اصول سرِ بخطر ہیں ہیں۔ مشرق و مغرب، ہر دو جانب سے ایک خون کا سیلاب ہماری طرف امڈتا ہوا چلا آ رہا ہے + جسم انسانی کے لختے، چیتھڑے، پنڈلیاں، انتڑیوں میں الجھے ہوئے پھیپھڑے، عورتوں بچوں، نوجوانوں، بڈھوں کی لاشیں، شکستہ کشتی کے تختوں کی طرح ہوئی لہروں میں ابھرتے ڈوبتے دکھائی دے رہے ہیں۔ کھوپڑیوں کے انبار، لاشوں کے مینار، قدم قدم پر استوار ہو رہے ہیں

اس وقت اس قسم کے اشعار ؎

عشق پر بھی چھاگئیں رعنائیاں اُف تری ٹوٹی ہوئی انگڑائیاں (آرزو)
فصلِ بہار ذوقِ نظر عالمِ شباب اب کیا خبر رہا ہے کہ ایماں نہیں رہا (آسی)
یہ اُڑی اُڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ (احسان دانش)
جب میں نے سنا ہے نام ان کا دل پر اک چوٹ سی لگی سے ہے (علی اختر)
کون آیا مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ زلف برہم کئے با چشم حجاب آلودہ (اختر شیرانی)
آپ کل گزرے ہیں جس رہگذر سے پہلے وہیں بیٹھا ہے کوئی جا کے سحر سے پہلے (امید امیٹھوی)
کیا آگ لگائے کوئی تارے کے اثر کو پہلو میں وہ بیٹھے ہیں جھکائے ہوئے سر کو (بیخود)
ملامت گر وان کو ضد پر تمہاری نہیں بھی اگر چاہتا چاہتا ہوں (تاجور)

(غرض الف سے لے کر تے سے تی تک یہی حال ہے) — ایسے اشعار ایسے سنگین دور میں کسی ہوشمند انسان کو بھلا کس طرح قابلِ توجہ معلوم ہو سکتے ہیں! وہی نیرو والی بات ہوئی کہ روم جل رہا ہے اور حضرت سارنگی بجا رہے ہیں!—

میں نے جنگ کا نام اس لئے لیا ہے کہ یہ دورِ حاضر کی ایک مبین حقیقت ہے + یوں ہندوستان میں صلح کا زمانہ بھی جنگ سے کم ہولناک نہیں — اوندھا کر دینے والا افلاس، اور ہمت شکن سیاسی ادبار — یہ کیا کم مصیبتیں ہیں + مگر ہمارے شاعر ہیں کہ جھلے بجائے جاتے ہیں + ہم وطن سانس توڑ رہے ہیں مگر ان کی سُر تال کا حساب قائم ہے! شاید اس لئے کہ ان کی اکثریت رسمی روایات کی حامل ہے +

مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ضروری نہیں کہ یہ حالات قائم رہیں — اچھے دن بھی تو آ سکتے ہیں — جب ان شعراء کا کلام کام آئے گا + اور یہ بھی کہ جری سپاہی بھی ہر وقت باوردی نہیں رہتے۔ ہنستے ہنساتے بھی ہیں اور سستانے کے وقت لوریاں سننا چاہتے ہیں + اور پھر یہ بھی کہ جو کمبخت مصیبت سے تنگ آ کر ہمت ہار دے آخر اسے بھی کوئی جائے قرار درکار ہوگی!

میں اسوقت ان مختلف نظریات کا محاکمہ کرنا نہیں چاہتا — افادی، اخلاقی اور جمالیاتی اقدار کی یہ الجھن ایک الگ سلسلۂ مضامین کی محتاج ہے +

یہاں اجمالی طور پر اتنا کہنا کافی ہے کہ نظم گو شعراء کے لئے حقائقِ حیات کی تلاش شاید زیادہ اہم ہے — کیونکہ ان کی ہر ایک نظم ایک مستقل اور مسلسل نقطۂ نظر کی ترجمان ہوتی ہے — مگر غزل گو تو چلتی پھرتی دُنیا کا آدمی ہے — ہر رنگ ہوتا ہے — وہ زندگی کو بیک وقت مختلف پہلوؤں سے دیکھتا ہے — اس کو جانچنے کا معیار یہ ہوگا — کہ اس کا عام جذباتی اور فکری رجحان کیا ہے اور کیا یہ رجحان سطحی ہے یا ایک گہرے خلوص کا نتیجہ ہے — ہم عام زندگی میں بھی تو یہی کرتے ہیں — دوستوں اور عام انسانوں کو بھی اسی طرح جانچتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شاعری ہمیشہ ایک واضح تنقیدِ حیات ہوتی ہے — مگر یہ ضروری ہے کہ نظم ہو یا غزل اس سے شاعر کا ایک واضح شعری کردار نمایاں ہوتا ہے — نقاد کا کام اس شعری کردار کی پرکھ ہے — اور یہ پرکھ زندگی کی بنیادی اقدار سے تعلق رکھتی ہے +

قدیم درباری غزل میں نہ انفرادیت تھی نہ خلوص — اس لئے اس کے نقاد محض وضع قطع کو دیکھتے بھالتے تھے — درباروں میں انسانوں کی جانچ بھی کچھ اسی طرح ہوتی تھی — اور آج بھی سوسائٹی کے مہذب چائے نوش حلقوں میں انسان و سندی کے سلے ہوئے سوٹ کی کاٹ اور چائے کی پیالی پیش کرنے یا اُٹھانے کی روش سے قابلِ قبول یا مردود قرار دیا جاتا ہے + مگر جب انسانوں کے باہمی تعلقات فطرت کے جذبات بروئے کار لائیں، جب معاشقہ نہیں عشق کیا جائے، کیا نہ کیا جائے بلکہ ہو جائے، تو پھر معیاری اقدار بھی گہری ہو جاتی ہیں ان "مہذب" لوگوں میں بھی +

دلی سکول اور لکھنؤ سکول کا فرق بھی یہی ہے — اُردو شاعری کی روایات اس وقت قائم ہوئیں جب دلی کا شاہی دربار بے طاقت ہو چکا تھا — نوابوں نے جا بجا نقلی دربار قائم کر رکھے تھے، شاعری، پتنگ اور نجوم کی طرح رئیسانہ کھیل سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی — ان نقلی درباروں میں سب سے زیادہ باثروت لکھنؤ کی نوابی تھی — فوج سے لیکر مذہب تک سب "اندر سبھا" کی طرح مشغلے تھے — تھکے ہوئے مفلوج احساس کو برانگیختہ کرنے کے مختلف ذریعے! — چونکہ دلی کے دربار میں ابھی فارسی کا زور تھا اس لئے وہاں اُردو شاعری ان مسموم اثرات سے کچھ بچی رہی اور پھر چونکہ آسے دن کی طوائف الملوکی نے تصوف کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اس لئے شعراء

طبیعت میں کچھ کچھ تفکر اور عمیق خیالی کا عنصر پایا جاتا تھا۔ اور کچھ کچھ انفرادیت کی جھلک بھی نظر آتی تھی + لکھنؤ کی طرح تصنع کی یکسانیت نہیں تھی۔ (لکھنؤ میں واقعیت زیادہ تھی اور دلی میں موہومیت!) مگر خود میر تقی کو پورب کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ اور دلی اور لکھنؤ ایک ہو گئے۔ ناسخ لکھنؤ میں اور جگت اُستاد نصیر دلی میں ایک ہی بولی بولنے لگے! ۔ اُردو غزل ہموار ہو کر رہ گئی + (فارسی غزل نے بھی مطلق العنان سلاطین کے دربار میں پرورش پائی۔ اور جس قدر وہ طرز حکومت منضبط تھی اسی قدر اس دور کی غزل بھی باوقار تھی۔ دلی سکول کی غزل کو ایرانی روایت کی قربت نے ایک حد تک سنبھالے رکھا +) غالب میں رئیسانہ شان اور طبعی رجحان نے ایک معین انفرادیت کا انداز پیدا کر دیا تھا + مگر جب غدر نے رئیسی نظام کو پاش پاش کر دیا تو شعراء کو ایسا جھٹکا لگا کہ جس میں جو کچھ تھا۔ بہت نمایاں ہو کر ظاہر ہونے لگا۔ رامپور اور حیدرآباد نے درباری نظام کو کچھ سہارا دیا۔ اور داغ کا تفنن اور امیر کا فن کچھ دیر فروغ پاتا رہا۔ مگر سماج پلٹا کھا چکی تھی اور یہ کچے پٹھے طوفان کو روک نہ سکے +

مگر پرانی سماجی روایات صدیوں تک اثر انداز رہتی ہیں۔ حالی وغیرہ نے نئے حقایق کا جایزہ لینا شروع کیا مگر مسدس کے مرثیاتی انداز کے علاوہ وہ شاعری کو کچھ اور نہ دے سکے۔ ملک بہت تیزی سے بدل رہا تھا۔ اور ایک نیا نظام تعمیر ہو رہا تھا۔ یہاں وہاں سیاسی تحریکوں کا آغاز ہو رہا تھا۔ اور نئی امیدیں بندھ رہی تھیں۔ چنانچہ اقبال کا "شکوہ" "مسدس" حالی کے انداز میں ہے۔ وضع میں اور مرثیہ خوانی میں بھی۔ مگر "نیا شوالہ" اور خضر راہ اور طلوع اسلام ایک تعمیری طرز خیال کے حامل ہیں۔ غزل بھی ان رجحانات سے اثر پذیر ہوئی۔ عاجزانہ لہجے کی جگہ سمت مند اور با تمکین فطرتی جذبات لینے لگے۔ شاعر دوبارہ انسان بن گیا + دلی سکول اور غالب کی روایات کا احیاء ہونے لگا۔ اور ان پرانی روایات کے ساتھ ساتھ ایک نئے قسم کی انفرادیت رونما ہونے لگی۔ اس روش کا عروج حسرت کے کلام میں نظر آتا ہے + مگر جیسے کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ انفرادی عشق اور خلوص کی شاعری حقائق وقت سے بہت دور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسوقت اکثر نئے شاعر نظم گو ہیں + مگر غزل کے ایک نئے دور کا آغاز اقبال کی بال جبریل سے ہوتا ہے۔ اقبال کے ایمان کی حدت نے بارد اور مجرد خیالات کو جذبات کی سی گرمی عطا کر دی۔ اس نے یقین نے فلسفہ کو شاعری کا رتبہ بخش دیا ہے ؎

یہ کون غزلخواں ہے پرسوز و نشاط انگیز　　اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

اس لئے یہ کہنا کہ غزل مر گئی یا مرنے والی ہے کچھ ایسا معقول قیاس نہیں۔ لیکن یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ اقبال کی غزل یک قافیہ اور غیر مسلسل ہونے کے باوجود معنوی یکانگت رکھتی ہے۔ یہ ایک طرح کی نظمیہ غزل ہے + متفرق اشعار، مختلف مضامین، ایک واضح نظام خیال کے ماتحت تنوع کے باوجود متناقض نہیں۔

؎　کرے جو پرتو خورشید عالم شبنستاں کا

نگار کے متغزلین (اُستادوں کے علاوہ کہ ان کا انداز وہی میراث روایتی "فن برائے فن" کا ہے) حالی اور اقبال کے درمیانی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ دور تاریخی طور پر بہت "انقلابی" ہے + اس "انقلابی" فضا کا ہی یہ اثر تھا کہ غزلیں کہنے والے نظمیں کہنے لگے۔ اور شعراء محض درباری آرائش کا سامان اور رئیسوں کی محفل کا دل بہلاوا نہ رہے + ذمہ دار لوگوں کی طرح زندگی کے بنیادی تجربات سے متاثر ہونے لگے! بسا اوقات ان کی شاعری خطابت بن کر رہ جاتی ہے۔ مگر یہ اور بحث ہے + غزل گو اس طوفان حوادث سے گھبرا کر اور زیادہ اندر کی طرف سمٹ گئے۔ گہری گہری خندقیں کھود کر محصور ہو گئے + انفرادیت اور نازک تجزیات نفسی، مدافعتی دھندے ہیں۔ جن کے سہارے متغزلین سماجی حقائق سے جان بچانا چاہتے ہیں + مگر اس دُنیا میں ایسا طلسماتی خلد کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ جس میں باہر کی ہوا نہ پہونچ سکے۔ خارجی اور داخلی دُنیا کو سیسہ بند دیواروں سے الگ الگ کیسے کیا جا سکتا ہے +

ان متغزلین کے کلام کو دیکھئے۔ جو سب سے زیادہ قدامت پسند "اُستاد" ہیں ان پر بھی اس انقلابی دور کا اثر موجود ہے۔ جس طرح ان کی شاعری سطحی ہے اسی طرح یہ اثر بھی محض لفظوں تک محدود ہے + یہ لوگ اپنے وقت کے ضمیر سے ناآگاہ ہیں۔ اس لئے ان کا ضمیر وقت کے اثرات سے آزاد ہے +

آسی کو لیجئے۔ مانے ہوئے اُستاد ہیں۔ "میرے شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ سو تک ہے" اور ان کی شاعری کا نتیجہ یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کے مختلف مشاقوں اور مختلف اسکولوں کا اتباع کیا۔ ابتدا میں ناسخ کے رنگ پر بہت سی غزلیں کہیں۔ بعدہٗ ...... حالی کے رنگ میں شعر کہے۔ ایک زمانہ میں ایہام و تناسب مرغوب طبع رہا۔ ایک زمانے میں یہ سودا ہوا کہ ہر شعر میں ایک محاورہ نظم ہونا چاہئے ..... کلام، غزل، نظم، قصیدہ ..... تمام اصناف سخن میں بہت کافی ہے۔" غرض چاروں اور چھائے ہوئے ہیں +

مگر دیکھئے، اصل انقلاب تو نہیں مگر "انقلاب زندہ باد" کا یہ نیا نعرہ اس طرح گلی گلی کوچے کوچے گونجا ہے کہ اس کہنہ مشق اُستاد کے اپنے انتخاب کردہ

واشعار کے چند صفحوں میں بھی "انقلاب" کا لفظ بار بار آیا ہے ؎

جب چمن میں کچھ انقلاب ہوا ـــــ اک نہ اک آشیاں خراب ہوا

مجھے احساس کم تھا ورنہ دو ہی زندگانی میں ـــــ مری ہر سانس کے ہمراہ مجھ میں انقلاب آیا

حیرت آباد وفا میں لاکھ آئے انقلاب ـــــ جو مرا دل تھا وہ اب آئینہ وار ناز ہے

ہو چکا تھا روشناس واقعات انقلاب ـــــ میں نے ہر آغاز کو سمجھا کہ انجام آگیا

ٹھہر گیا اسی مرکز پہ انقلاب آسی ـــــ شکست دل کی صدا بن کے رہ گیا ہو نہیں

خدا جانے اب دل کہاں جاکے ٹھہرے ـــــ بڑے انقلابات سے ہو رہے ہیں !۔

آسی سے مراد اُستادی کی شہرت میں کہیں بڑھکر میرزا ثاقب لکھنوی ہیں۔ یہ ستر سال کی عمر ہے + اس لئے ان کے اشعار میں نئے فیشن کے رواجی لفظ نسبتاً کم ہیں + یہ "انقلاب" شایان کے انتخاب میں بھی دو تین بار آگیا ہے !۔

نقلی اظہار پر زیادہ بحث بیکار ہے۔ اس دور کی اہم خصوصیت شعراء کی دروں بینی ہے۔ جس کی بڑی وجہ تلخ حقایق سے چشم پوشی اور جس کا ایک نتیجہ احساسات وجذبات کا خود بینی تجزیہ ہے !۔ خودنگری کم اور خود بینی زیادہ !۔۔ شاعر نظر اُٹھا کر نہیں بلکہ نظر جھکا کر آثار حیات پر نہیں بلکہ اپنی ذات پر ٹکٹکی جمائے رکھتا ہے !

اس تجزیاتی انداز کا ایک مظہر "سا"، اور "سی"، کے الفاظ کا رواج ہے۔ گویا شاعر بار بار ایک کیفیت کو جانچ رہا ہے۔ تول رہا ہے + اندازہ کرتا ہے اور چھوڑ دیتا ہے۔ پھر پرکھتا ہے اور مماثلت کو بھی مشابہت سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ جانتا ہے کہ ہر تجربہ، ہر کیفیت اپنے محل پر یکتا ہے۔ اس لئے تشبیہ تام کا استعمال اگر ناروا نہیں تو بے محل ضرور ہے اور یہ بھی نہیں تو اسے ناتسلی بخش کہنا بڑی حد تک جائز ہے۔ بہرصورت پوری طرح تسلی بخش نہیں + یہ "اگر مگر" یہ ڈگمگایا ہوا خیال، خود بینی اور بے یقینی، دورِ حاضر کی نمایاں خصوصیت ہے + حالات زندگی ہی کچھ اس طرح کے ہیں۔ ہندوستان میں پرانا زرعی نظام ٹوٹ رہا ہے۔ زراعتی زندگی ختم ہو رہی ہے۔ اور صنعتی دور کا آغاز ہے۔ سڑک پر بیل گاڑی اور موٹر کا تصادم اور اوپر ہوائی جہاز غرا رہے ہیں۔ اور خود یورپ کی سطوت خونریز جنگوں میں مبتلا ہے۔ طرابلس کی جنگ کے بعد بلقان کی لڑائی، اور پھر گزشتہ جنگ عظیم۔ عالمگیر بدحالی کے بعد ابی سینیا کی تباہی، اسپین کی خانہ جنگی، چین، جاپان کی مسلسل پیکار اور اس پر موجودہ ہولناک جنگ، خود اپنے ملک میں خلافت اور کانگریس کی معرکہ آرائیاں، ہندو مسلم آویزش، سامراجیہ کی گرفت، بے کاری اور ایک انقلابی اشتراکی نظام کی ابتدا۔۔ کوئی نظر جائے تو کس حالت پر ؟۔

اس ایک "سا"، "سی"، کے استعمال ہی سے اس ذہنی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔[1]

۔[ان الفاظ کا فیشن اس قدر ہے کہ آسی "بڑے انقلابات" کے ساتھ بھی "سے"، کو برت رہے ہیں]۔

---

[1] ڈاکٹر صاحب نے سا اور سی پر بنیاد رکھ کر جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ ممکن ہے فلسفیانہ ہو لیکن محققانہ اور شاعرانہ تو قطعاً نہیں ہے۔ ان لفظوں کا استعمال، چین و جاپان کی لڑائی، بلقان کی جنگ، اسپین کی خانہ بربادانہ شورش اور موٹروں اور طیاروں کے وجود سے بہت پہلے کی بات ہے۔ اس سے تو شاید ڈاکٹر صاحب کو بھی انکار نہ ہوگا کہ میر و درد کے عہد میں بھی ان الفاظ کا رواج تھا، حالانکہ اس وقت کسی انقلابی یا اشتراکی نظام کی تحریک نہ پائی جاتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب اسے تذبذب اور حقایق کی طرف سے چشم پوشی کا نتیجہ بتاتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاعرانہ انداز بیان میں اس سے زیادہ ایقان کی کوئی صورت ہو ہی نہیں سکتی۔ میر اگر کسی کی نیم باز آنکھوں میں "ساری مستی شراب کی سی" پاتا ہے تو اس کے معنے یہ نہیں کہ "شراب کی مستی" اس سے زیادہ ہے، بلکہ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ شراب میں بھی مستی ہو سکتی ہے تو اتنی ہی ! لفظ سی اور سا سے شاعروں نے کسی جگہ ایقان و اذعان کا کام لیا ہے جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا، اور کبھی بیان میں "لطیفی" اشاروں کی مدد سے حسن پیدا کرنے کا۔ اگر ڈاکٹر صاحب کو نقاشی سے کچھ لگاؤ ہے تو انھوں نے دیکھا ہوگا کہ ایک نقاش اپنے نقش میں کہیں کہیں ایسے ہلکے سائے بھی رکھ دیتا ہے جو پس منظر اور نقش دونوں کو اُبھارنے میں مدد دیتے ہیں۔ شاعری میں سا اور سی بھی بالکل اسی قسم کی چیز ہے اور بعض اوقات لطیف جذبات کو لطیف انداز میں ظاہر کرنے کے لئے ان کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ڈاکٹر صاحب "لطف زبان" کے اس پہلو سے ناواقف ہیں، لیکن چونکہ وہ "حقایق" کے زیادہ گرویدہ معلوم ہوتے ہیں، اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ ان "دقایق" کو پسند نہ فرماتے ہوں۔

نیاز

فانیؔ، فراقؔ اور ملاؔ کو لیجئے۔ بی۔اے۔ ایم۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی تک پڑھے ہوئے ہیں ع " نہ مشرقی ہیں نہ مغربی ہیں عجیب سانچے میں ڈھل رہے ہیں "
فانیؔ کی عمر ترسیٹھ سال کی ہے۔ مگر اس کی یاسیت اور متذبذب خیالی اس کی اپنی زندگی اور حالات حاضرہ کے عین مطابق ہے ؎

درپیش ہے پھر مسئلۂ طاقت دیدار

(پہلا مصرعہ غالبؔ کے طرز میں ہے) اور دوسرا مصرعہ ؎

پھر کچھ نگہ شوق ہے گھبرائی ہوئی سی

(داغؔ کے انداز میں ہے) داغؔ اور غالبؔ کا یہ امتزاج ہمارے متقولین کی عام روش ہے ۔ دوسرا شعر ہے :۔

اک عالم دل ہے یہی دنیا یہی فردوس — ہر شے نظر آتی ہے نظر آئی ہوئی سی

اور ع — دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

داغؔ نے بھی ایک اسی قسم کی غزل لکھی ہے۔ ع

آنکھوں میں کچھ ملال سا دل میں کچھ احتمال سا

مگر اس نے حسب عادت ظاہری احساسات پر اکتفا کیا ہے ۔
فراقؔ کی عمر پینتالیس سال کی ہے ۔ چند مصرعے ہیں ع

دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں
ع — تاروں کو نیند آئی ہوئی سی
ع — اک انگڑائی آئی ہوئی سی
ع — حسن افسردہ سا تھا اور عشق کو حیرت دی تھی
ع — بچی بچی سی وہ نظر ملی ملی سی وہ نظر
ع — آسمانوں کو بھی جیسے آرہی ہو نیند سی

انند نرائن ملاؔ کی عمر چالیس ہے ۔ مدتوں انگریزی شعر کہتے رہے ہیں ۔ کہتے ہیں ؎

تا بہ دامن آئی اک بے رنگ سی پانی کی بوند — تھا ہی کیا آنسو میں عرض التجا ہونے کے بعد

چند مصرعے ہیں ؎ — آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی یادگار ! — ع — قفل سا اک زباں پہ تھا آنکھ میں کچھ نمی سی تھی ۔

گویا کھل کے رو بھی نہیں سکتے ۔ قدم قدم پر رکاوٹ اور احتیاط ہے ۔ داغؔ اور فانیؔ کے یہاں یہ حالت معشوق کی ہے ۔ اور فانیؔ عشق سے بیزار (کہ اس کے نزدیک شاید عشق کا جذبہ ہی ایک یقینی حقیقت ہو سکتا ہے)۔ باقی سب کچھ واہمہ اور فریب ہے ۔ جو مشاہدات ہیں ان کو بے یقینی سے دیکھتا ہے ۔ فراقؔ نے معشوق سے گزر کر عاشق کو بھی شرم، احتیاط اور ضبط میں شریک کر لیا ہے ۔ اور ملاؔ نے عاشق کو معشوق بنا دیا ہے ۔ یہاں تک کہ ؎

مجھے ڈر ہے کہیں کچھ کہہ نہ دے نظر میری — انھیں گلہ کہ پیام نظر زباں پہ نہیں

یعنی معشوق تقاضائے بے باکی کر رہا ہے اور عاشق ڈر رہا ہے !۔ اور یہ کہ ع — وہ تو اُٹھا چکا نقاب ہم نہ نظر اُٹھا سکے ۔
لیکن جہاں ملاؔ اندرونی جذبات کے متعلق اس قدر منفعل ہے وہاں حقایق حیات کے متعلق کھلم کھلا بغاوت کا اعلان کرتا ہے ۔ تلافی کے طور پر ۔ فانیؔ کے برعکس
اسوقت ملاؔ کی نظمیں معرض بحث میں نہیں۔ اُن میں یہ اثبات زیادہ قوی ہے ۔ مگر غزل میں بھی دیکھئے ۔ کس طرح ڈانٹ کر کہتے ہیں ؎

سر محشر یہی پوچھوں گا خدا سے پہلے — تو نے روکا بھی تھا مجرم کو خطا سے پہلے

جواب دہی کی بجائے جرح بازی (ملاؔ وکیل بھی تو ہیں) شروع کر دی ہے !۔ اقبال کا انداز ۱۔۔۔۔ جہاں تیرا ہے نہ میرا) بھی بظاہر کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ مگر وہاں بے باکی کا سبب عقیدت کا جوش ہے۔ اور یہاں بے اطمینانی اور انکار کے جھکولے !۔

۳۔ تری ہستی کے منکر ہوتے جاتے ہیں خدا والے　　سنبھال اپنی خدائی کو ارے او آسماں والے!

۵۔ یاس بھی کہدے کہ راحت تری قسمت میں نہیں　　یاجوج دیتا ہے تو دے آج قیامت میں نہیں

(یہاں بھی لہجہ وہی "ارے او" کا ہے۔ گو مضمون خیامی ہے!) خدا سے گزر کر مذہب کے متعلق کہا ہے ؎

تجھے مذہب مٹانا ہی پڑے گا روئے ہستی سے　　ترے ہاتھوں بہت تو ہینِ آدم ہوتی جاتی ہے[۱]

اس رومانی الحاد کے پیشکار جوشؔ اور نیازؔ ہیں۔ اور ان شراروں کو کالجوں کی بے تعلیمی ہوا دے رہی ہے! یقینی الحاد کے لئے مثبت تعلیم[۲] درکار ہے!—— اور یقینی اعتقاد کے لئے بھی!—

آجکل نئے لوگ عموماً اسی قسم کے خیالات رکھتے ہیں + فرقہ داری کا احیاء تو محض اقتصادی اور سیاسی حالات کی وجہ سے ہو رہا ہے ورنہ بقول اقبالؔ۔ ع

ہوسِ منزلِ لیلےٰ نہ تو داری و نہ من!— یہ "نامحکمی" اس زمانہ کی پیداوار ہے +

فراقؔ اور ملاؔ ابھی ناپختہ ہیں۔ مگر (شاید اسی لئے) وہ پختہ کاروں سے زیادہ نئی پود کے صحیح ترجمان ہیں۔ ان میں ہضم و تحلیل کم ہے۔ رائج تاثرات کو زیادہ شخصی مداخلت کے بغیر اُگل دیتے ہیں +

نگار کے اس گلدستے میں چار پختہ کار شاعر ایسے ہیں جنھیں معاصرین میں بوجوہ نمایاں امتیاز اور قبولِ عام و خاص حاصل ہے + حسرتؔ۔ جوشؔ، حفیظؔ اور جگرؔ!— [میرے نزدیک اثرؔ کی مہذب غزل موجودہ دور میں ایک بالکل الگ حیثیت رکھتی ہے۔ مگر اسے قبولِ عام حاصل نہیں۔ ہو بھی نہیں سکتا + اسکے جانچنے کے لئے ایک مستقل مضمون درکار ہوگا۔]

جوشؔ کی نظم اس کی غزل پر اس قدر حاوی ہو گئی ہے کہ اب اسے متغزلین میں شمار کرنا شاید مناسب نہ ہوگا۔ جوشؔ کا شاعرانہ ارتقا ہمارے دور کے خیالات کی ایک مکمل تاریخ ہے! اس کا جائزہ یہاں بے محل ہوگا +

حفیظؔ کا سب سے بڑا معرکہ اس کے گیت ہیں اور اس کی وہ نظمیں جن میں اس نے فنی تجربات کچھ ایسی سادگی اور یک نظری سے کئے ہیں۔ کہ ہمارے نہایت ہی جدید شعرا بھی اس سے اثر پذیر ہو رہے ہیں۔ ان میں سے ایک لکھتا ہے کہ "حفیظؔ نے جو فنی تجربات بحر اور ہیئت کے لحاظ سے کئے ان کا اثر بڑھ کر نہ صرف مختلف نئی صورتوں میں ظاہر ہوا بلکہ آزاد نظم کی حد تک جا پہونچا" + اور اب وہ عرصہ سے "شاہنامۂ اسلام" لکھ رہا ہے!۔ مگر اس کی غزل اب تک زندہ ہے + اور اردو ادب میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے +

حفیظؔ کی غزل میں سادگی اور خلوص تو ہے مگر انفرادیت کم ہے۔ وہ واضح اور شخصی تجربات کا اظہار ضرور کرتا ہے۔ مگر اس کی واردات عام تجربات سے مختلف نہیں۔ مگر اس کی یہ عامیت عالمگیر ہے اور اس کی سبک روی مترنم ہے!—

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے　　تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمھیں بھلا سکے

ہوش میں آچکے تھے ہم جوش میں آچکے تھے ہم　　بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اُٹھا سکے

رونقِ بزم بن گئے لب پہ حکایتیں رہیں　　دل میں شکایتیں رہیں لب نہ مگر ہلا سکے

اہلِ زباں تو ہیں بہت کوئی نہیں ہے اہلِ دل　　کون تری طرح حفیظؔ درد کے گیت گا سکے

۲— "ہوش میں آچکے تھے ہم جوش میں آچکے تھے ہم" + پے بہ پے ہم آہنگ الفاظ ہیں اور "لب پہ حکایتیں رہیں" + "دل میں شکایتیں رہیں" نہ دو لخت

---

[۱] کیا "حقائقِ حیات" سے انکار کی یہ مثال صحیح ہے۔ اگر مذہب واقعی "حقائقِ حیات" میں داخل ہے تو پھر کفر و اسلام کی تمیز کیوں، اور اگر مذہب سے مراد صرف اسلام ہے تو صرف اسکو "حقیقتِ حیات" سمجھنے کی وجہ؟ (نیازؔ)

[۲] مثبت تعلیم کیا؟ غالباً وہ تعلیم جو ٹھوس حقیقتوں کے علم پر مبنی ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ٹھوس حقیقت کسے کہتے ہیں۔ مذہب کو یا انکارِ مذہب کو؟ اس کا جواب تاریخ آسانی سے دے سکتی ہے کہ جب مذہب کی ابتدا ہوئی تھی انسان کا کیا حال تھا اور جب اس نے مذہب سے انکار کیا تو اس کا ذہنی ارتقا کس قدر پختہ ہو چلا تھا۔ (نیازؔ)

اعتقاد اور یقینی! عجیب!! اعتقاد نام ہے روایت پر یقین لانے کا اور یقین کا تعلق صرف درایت سے ہے، روایت سے نہیں۔ (نیازؔ)

بھی ہیں اور پیوستہ بھی! مطلع کس قدر ہلکا پھلکا ہے اور نیاز مندانہ خلوص سے لبریز! — محض لفظی الٹ پھیر نہیں + مقطع میں اپنے متعلق وہی کہا ہے جو میں نے کہا تھا! ہے + ساری غزل میں ایک واردات کیفیت ہے اور ایک موضوع ذہنی سے خطاب! سہلِ ممتنع کلام ہے! —

حسرت کی جذباتی طبیعت پر حقایق وقت نے ایسا گہرا اثر کیا کہ وہ شدتِ احساس کی وجہ سے خاموش ہو کر رہ گیا۔ اس کی غزل اس کے ان تاثرات کے اظہار کی کفیل نہ ہو سکی اور نظم کے لئے اس میں مناسب تسلسل اور افکار کی یک جہتی نہ تھی۔ یہ اس کے خلوص کا ایک خارجی ثبوت ہے کہ اس نے شدت سے کبھی ہوئی وارداتوں کو کھوکھلے الفاظ میں دہرانے سے انکار کر دیا ہے +

جگر خالص غزل گو ہے اور اسے اس پر ناز بھی ہے۔ جگر خود کہتا ہے کہ "حسن و عشق ہی میری زندگی ہے"۔ مولانا سلیمان ندوی "شعلۂ طور" کے تعارف میں لکھتے ہیں کہ "جگر کی شاعری کے معنوی خیالات بہت مختصر ہیں۔ وہ انھیں الٹ پلٹ کر دہراتے رہتے ہیں۔ اور یہ کہ جگر کسی نادیدہ کا سراپا مشتاق ہے" +

جگر کی شاعری میں انفرادی واردات اور تجربات بہت کم ہیں۔ اس کا شاعرانہ معشوق نادیدہ ہے۔ اور جہاں کہیں معمولی واردات ہیں ان میں داغ کا سا عامیانہ پن ہے اور وہ جو "رئیس زادہ ہے داغ آپ کا غلام نہیں" میں "عشق کو ذلیل و رسوا صورت میں" پیش کرنے سے انحراف ہے وہ جگر میں بھی ہے۔ مگر جگر نے داغ کی طرح حسن کو "رسوا" نہیں کیا + حسن و عشق کے تعلقات کو فطری سطح پر رکھا ہے۔ مگر جگر کا عشق عموماً عشقبازی ہو کر رہ جاتا ہے +

اُف یہ تیغ آزمائیاں توبہ	تیری نازک کلائیاں توبہ
آستینوں کا وہ چڑھا لینا	گوری گوری کلائیاں توبہ
نظروں نظروں میں سرگزشتِ فراق	دونوں جانب دہائیاں توبہ
پھر وہی چشمِ مست و جام بدست	پھر وہی نغمہ زائیاں توبہ

بقولِ جگر یہ غزل ان کی "زندگی معاشقہ کے ایک اہم واقعہ سے متعلق ہے"۔ مگر اس واردات میں وہ داغ سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ "آہ"، "توبہ"، "اُف" قسم کے الفاظ سے شخصی احساس کی شدت ظاہر ہوتی ہو تو ہو۔ شاعرانہ احساس کا خلوص ثابت نہیں ہوتا۔ اور محض شدتِ احساس کسی ذاتی یا شاعرانہ تجربہ کو عمیق نہیں بنا سکتی + لیکن اس قسم کے اشعار بھی اس کے ہاں بہت کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی واردات کی سطحیت عموماً نظرانداز کی جاتی ہے اور اس کے "نادیدہ" معشوق ہی کو وجہِ فوقیت قرار دیا جاتا ہے + اور نیک پاک لوگ داغ کو "بازاری" مگر جگر کو روحانیت کا آرزومند گردانتے ہیں + تو پھر جگر کی غزل کی اس قدر دھوم کیوں ہے؟ — اس کی بڑی وجہ جگر کی "مستی" ہے۔ ذاتی مستی اور شاعرانہ مستی! — جگر کہتا ہے "میری زندگی اور میری شاعری میں بالکل مطابقت ہے"۔ اور جگر کی زندگی جہاں رندمشرب لوگوں کے لئے مدافعت کا ذریعہ ہے وہاں آرزو کشتہ محروموں کو تمثیلی لذت کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ نوجوان اسے "بغاوت" سمجھتے ہیں اور یہ صرف زندگی گزارنے والے اسے "رومان" تصور کرتے ہیں! — غرض جگر ایک جیتا جاگتا افسانہ بن کر رہ گیا ہے۔ اور ناکردہ کار لوگ اس کی رندانہ زندگی میں معقول طریقے سے شریک ہو کر بے چھوٹے ہیں! اور اس کے پرستار اس کی موجودہ "خشک" زندگی کو "شاعرانہ توبہ" کہہ کر دل کو تسلی دے لیتے ہیں! اس کی شاعرانہ مستی کی بنیادی وجہ بھی وہی عشقیہ تجربات کی کمی ہے۔ اسے عشق کی تلاش ہے اور وہ اپنی محرومی سے کبھی کبھی کراہتا بھی ہے۔ "آپ میرے کلام میں۔۔۔۔ بہت ہی نازک سی موج درد ضرور محسوس کریں گے"۔ مگر یہ محرومی اسے "خوارِ جہاں" نہیں ہونے دیتی اور اس کی مستی کو افسردگی سے بچا لیتی ہے + اس طرح اس کے کلام میں ایک قسم کی تندی پائی جاتی ہے۔ اور ایک قسم کی منفی طہارت بھی! یہ مستی کامرانی یا کامرانی کی امید کی مستی نہیں + نشاط انگیز مستی نہیں، اندوہ ربا نشہ ہے +

جگر کے معرکے کے اشعار عموماً عشق کے متعلق ہوتے ہیں۔ وہ دور سے عشقیہ واردات کا تجزیہ کرتا رہتا ہے + اس نے ایک طرح کا فلسفۂ عشق وضع کر لیا ہے جو مضمحل مزاجوں کے لئے فلسفۂ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی کے حقایق کے متعلق کسی قسم کی تلخ تبدیلی کے بغیر خوش اوقات لوگ ذاتی جذبات کی آغوش میں پرورش پاتے رہتے ہیں۔ اور اپنی پرانی اقدار پر نہ فقط قانع رہتے ہیں بلکہ ان شخصی عشقیہ اقدار کو نئی اقدار سے بہتر سمجھنے لگتے ہیں + اس نے حقائقِ حیات کی مخالف اقدار کو جانچنے کی بجائے حقائق ہی سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ حقایق غیر حقیقی ہیں۔ اصل حقایق تو محض شخصی جذبات کی اُچھل کود ہے۔ اور یہ اُچھل کود اصلِ حیات ہے! —

زیست ہے زیست جو رگ رگ میں رواں ہو عشق	موت ہو موت اگر رقص نہیں جوشش نہیں

ساری غزل دیکھئے۔ حسن و عشق کے متعلق کلیئے مرتب کئے گئے ہیں۔ دونوں کو آمنے سامنے نہیں کیا۔ کوئی تجربہ بیان نہیں کیا ؂

حسن سے عشق جدا ہے نہ جدا عشق سے حسن　　کونسی شے ہے جو آغوش در آغوش نہیں
عشق اگر حسن کے جلووں کا ہے مرہونِ کرم　　حسن بھی عشق کے احساں سے سبکدوش نہیں

کہیں اپنا اندازہ کیا ہے۔ ہوش کو بے ہوشی قرار دیا ہے ؂

رند جو مجھ کو سمجھتے ہیں انھیں ہوش نہیں　　میکدہ ساز ہوں میں میکدہ بردوش نہیں
کون سا جلوہ یہاں آتے ہی بے ہوش نہیں　　دل مرا دل ہے کوئی ساغرِ سرجوش نہیں
اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں　　میرے آغوش کو اب حسرتِ آغوش نہیں

اور تجربات کی بجائے ان کی یادیں ہیں ؂

کبھی ان مدبھری آنکھوں سے پیا تھا اک جام　　آج تک ہوش نہیں ہوش نہیں ہوش نہیں !
مٹ چکے ذہن سے سب یادِ گزشتہ کے نقوش　　پھر بھی اک چیز ہے ایسی کہ فراموش نہیں
مل کے اک بار گیا ہے کوئی جس دن سے جگر　　مجھ کو یہ وہم ہے جیسے مرا آغوش نہیں

یا تجربات کی تلاش ؂

پاؤں اٹھ سکتے نہیں منزلِ جاناں کے خلاف　　مجھ کو یہ وہم ہے جیسے مرا آغوش نہیں

غرض غزلوں کی غزلیں اسی طرح کی ہیں - واردات کم، تاثرات اور انفرادات زیادہ !۔ چونکہ انتقاد جذبات کے متعلق ہے اس لئے اس میں تجرد خیالی کی بات نہیں آتی۔ اور سننے والے کو ایک قسم کا احساس برتری ہوتا ہے جیسے وہ بلندی سے ایک طوفان کا نظارہ کر رہا ہو +

جگر کی مقبولیت کی ایک اور وجہ اس کا ترنم ہے۔ وہ بارہا جلیلہ بحروں میں لکھتا ہے اور مضامین رقص و سرود کے ساتھ، رقص و سرود کا آہنگ بھی قائم رکھتا ہے۔ اس سات ساڑھے سات صفحے کے انتخاب میں کوئی ڈیڑھ پونے دو سو اشعار ہوں گے + ان میں سے پچیس فیصدی، ایک چوتھائی کے قریب اشعار دو تین بحروں میں ہیں۔ بیشتر غزلوں میں متفاعلن۔ مفاعلن اور فعولن کے ارکان یعنی متوالی حرکات کے الفاظ ہیں۔ چودہ پندرہ اشعار تو۔ فعولن فعولن فعولن فعولن ہی کے وزن میں ہیں۔
ع جوانی کا عالم ہے سرشاریاں ہیں + ع وہ آنسو نہیں ہیں نظر آنے والے + ع ذرا پھر تو ارشاد فرمایئے گا + ع وہ کچھ اور ہے مہربانی نہیں ہے
ع ٹھہرنے جو دے اضطرابِ محبت + ع کہ ترکِ محبت کیا چاہتا ہوں + ع زمانے کو پیچھے ہٹاتا چلا جا +

اس کی لغت (لفظوں کے انتخاب) میں بھی وہی بچ بچاؤ ہے جو اس کی شاعری میں ہے۔ جس طرح وہ عام واردات سے بھی بچا کر تنقید عشق کرتا ہے۔ اسی طرح الفاظ میں بھی بازار اور مکتب کا فرق ملحوظ رکھتا ہے۔ مگر دور حاضر کے عام شعراء کا یہی انداز گفتگو ہے۔ جگر نے کوئی نیا اسلوب بیان نہیں نکالا !۔

جگر در حقیقت "کالج والوں" کا شاعر ہے۔ جنھیں آزادی سے زیادہ آزاد مشربی کی حسرت ہے !۔ مگر یہ جگر کا قصور نہیں + جگر کے مشرب میں پندار نہیں "+ ہاں اس کے بہت سے پرستار اپنی ریاکاری کو اس کی شاعری میں چھپا کر ناکردہ گناہوں کی حسرت نکالتے ہیں +

جگر کا ممتاز وصف یہ ہے کہ اس نے اردو غزل میں ایک ہمہ گیر رندانہ فضا پیدا کر دی ہے + مٹھی میں لیجئے تو یہ سمندر کی جھاگ ہے۔ اور جو نظارہ بازی کیجئے تو یہ ایک طلسماتی غبارہ ہے۔ جو لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتا رہتا ہے !

نغمہ ہا شادابِ رنگ و سازہا مستِ طرب !

[جگر کا قابلِ توجہ کلام وہ چند غزلیں ہیں جو اس کے دیوان کی اشاعت کے بعد مختلف رسائل میں شائع ہوئی ہیں + اور یہ پرکیف غزلیں اُردو غزل میں واضح حیثیت رکھتی ہیں۔ شعلۂ طور بڑی حد تک مایوس کن ہے۔ اور اس میں "بھرتی" کی کثرت ہے !] ——

(نگار) ڈاکٹر تاثیر نے علٰحدہ علٰحدہ ہر شاعر پر رائے زنی نہیں کی اور شاید اس لئے کہ ان میں سے اکثر اُن کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ انھوں نے مرف

شاعروں (حسرت، جوش، حفیظ اور جگر) کو بہتر طور سمجھ کر ان کا ذکر نمایاں طور پر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

اُن کے مقالہ کی حیثیت ایک ایسے عمومی تبصرہ کی سی ہے، جس میں افراد کو نظر انداز کر کے زیادہ تر اُصول یا شاعری کی تاریخ انقلاب اور اس کے اثرات سے بحث کی گئی ہے۔ انھوں نے اُردو شاعری یا غزل گوئی کو دو زمانوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جب شاعری صرف دربار داری کی چیز تھی اور شاعر نام تھا محض رونق دینے کا، یا ایک ایسے "گداگر" کا جو اپنی بیکسی کے اظہار سے نہیں بلکہ رئیس و امیر کو اپنی منفعت وسیلہ "اپنی مدح سے خوش کر کے اپنا پیٹ پالتا تھا۔ دوسرا دور وہ جب بساط سلطنت اُلٹی اور اسی کے ساتھ غزل گوئی کا وہ رنگ بھی بدلا جو صرف نوابوں اور رئیسوں کے خوش کرنے کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ مختلف قسم کے ذہنی انقلابات رونما ہوئے اور شاعری اس سے متاثر ہوتی رہی، یہاں تک کہ لوگوں کا رجحان نظم کی طرف ہوا اور غزل میں بھی زیادہ تر ان باتوں پر غور کیا جانے لگا جو حقائق حیات (تجربات حیات کہنا شاید زیادہ موزوں ہوگا) کی طرف رہبری کرنے والے تھے۔

اس مقالے ڈاکٹر تاثیر کی رائے میں غزل تو ختم نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے، لیکن اس کے رجحانات ضرور بدلے اور بدلتے رہیں گے۔ انھوں نے جوش، حفیظ اور جگر کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے، اس سے ممکن ہے کسی کو اختلاف ہو لیکن حسرت کی بابت انھوں نے جو کچھ لکھا ہے (گو بہت کم لکھا ہے) اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ ڈاکٹر تاثیر زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے غزل کو بدلنے یا بگاڑنے کے متعلق خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہیں، لیکن اُن کے دل میں جیتی ہے وہی "حسن و عشق" والی شاعری جسے "برلیو کی تحریروں" کی طرح آسانی سے مٹانا ممکن نہیں!

تلخیص و تبصرہ

پچھلے سال جب جنوری سنہ ۴۲ء کا نگار زیر ترتیب تھا تو یہ بات بھی میرے ذہن میں تھی کہ شعراء کے انتخاب کلام کے ساتھ ہی ساتھ اس پر تفصیلی تبصرہ بھی ہونا چاہئے، لیکن چونکہ پرچہ کا حجم بہت بڑھ گیا تھا، اس لئے ایک مختصر و سرسری تبصرہ سے زیادہ میں کچھ نہ کر سکا۔
اس کے بعد پرچہ شائع بھی ہوا، لوگوں نے پسند بھی کیا، بات گئی گزری ہو گئی، لیکن تبصرہ کا خیال بدستور دل میں کھٹکتا رہا اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا کہ اس خدمت کو کس طرح انجام دیا جائے۔ چند ماہ گزرنے کے بعد جب مجھے یہ سوچنا پڑا کہ جنوری سنہ ۴۳ء کا نگار کس موضوع کے لئے مخصوص ہو، تو پھر یہی خیال زیادہ قوت کے ساتھ میرے سامنے آیا اور فیصلہ یہ ہو گیا کہ اس اشاعت کو تبصرہ ہی کے لئے مخصوص ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں جبکہ پورا رسالہ اس کے لئے وقف ہونا تھا، صرف میرا یا کسی ایک کا تبصرہ کوئی معنی نہ رکھتا تھا، اس لئے ایک سے زائد حضرات کی رائیں حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا، اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ ہر اس صوبہ سے جہاں اردو کا رواج زیادہ ہے ایک ایک نقاد کا انتخاب کیا جائے۔

چونکہ اسی دوران میں پٹنہ سے پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب کی ایک کتاب "اردو شاعری" پر شائع ہو کر میری نگاہ سے گزر چکی تھی اور بعض حیثیتوں سے میں نے اسکو پسند بھی کیا تھا، اس لئے صوبہ بہار میں ان سے زیادہ مستحق (اس خدمت کے انجام دینے کے لئے) مجھے اور کوئی نظر نہ آیا اور میں ممنون ہوں کہ انھوں نے میری درخواست کو قبول کر لیا۔ صوبہ پنجاب کے انشاپردازوں اور نقادوں کے متعلق میں غور ہی کر رہا تھا، مسعود علی ذوقی ایک دن اتفاق سے تشریف لائے اور انھوں نے ڈاکٹر تاثیر کا نام تجویز فرمایا، اور مجھے بڑی مسرت ہے کہ انھوں نے بھی میری التجا کو رد نہ کیا۔ حیدرآباد میں پروفیسر محی الدین قادری زور کی طرف میرا خیال منتقل ہوا اور میں نے ان کو لکھا بھی، لیکن افسوس ہے کہ وہ اپنی مزید کم فرصتی کی وجہ سے اس خدمت کو انجام نہ دے سکے۔ اپنے صوبہ سے میں پہلے ہی دو آدمیوں کو انتخاب کر چکا تھا، پروفیسر مجنوں —— پروفیسر سرور اور ان دونوں نے بھی میری خواہش کو مسترد نہ کیا

آپ ان حضرات کے تبصرے ملاحظہ فرما چکے ہیں، لیکن زیادہ مناسب ہوگا اگر اختصار کے ساتھ ہر شاعر کے متعلق چاروں نقادوں کی آرا کو ایک جگہ کر دیا جائے تاکہ آپ آسانی سے اکثریت کا رجحان معلوم کر سکیں

آرزو لکھنوی:— پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب کی رائے یہ ہے کہ: "وہ کہنہ مشق ہیں، زبان و بیان کے لحاظ سے استادی حیثیت رکھتے ہیں، انھیں درد بھرے مضامین پسند ہیں، اس لئے حسرت و فانی سے قریب معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کے خیالات کی دنیا تنگ ہے۔ ان میں نہ جگر کی رنگینی ہے نہ جلیل کی رعنائی، اس لئے ان کا مرتبہ جلیل و جگر کے بعد ہے۔"

پروفیسر سرور فرماتے ہیں: "آرزو صاحب اردو کے ممتاز شعراء میں سے ہیں، خیال کی سادگی و نرمی، زبان کی عام فہم شیرینی، ان کی شاعری کی خصوصیت ہے، انھوں نے ہم کو بتایا کہ شاعر کی بولی دنیا والوں کی بولی سے الگ نہیں ہوتی۔"

پروفیسر مجنوں کی رائے یہ ہے کہ: "جناب آرزو ایک ماہر فن شاعر ہیں۔ زبان، محاورہ، عروض سب کے ماہر ہیں، وہ شعر میں آہنگ پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اردو غزل میں جو اسلوبی اضافے انھوں نے کئے ہیں وہ مستقل قیمت رکھتے ہیں۔ ہر چند ان کی شاعری مفکرانہ نہیں ہے، لیکن بہت مترنم ہے اور جذباتی معاملات و نفسیات کو نہایت دلنشین انداز میں پیش کرتے ہیں۔"

ڈاکٹر تاثیر نے علیحدہ کوئی رائے نہیں دی۔

میری رائے میں پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ انھیں درد بھرے مضامین پسند ہیں، لیکن ان کے رنگ کو حسرت و فانی کے رنگ سے قریب کہنا درست نہیں، کیونکہ حسرت صرف معاملات و واردات کا شاعر ہے۔ "درد بھرے مضامین" کا نہیں اور فانی کی شاعری کو صرف "درد بھری" شاعری کہنا اس کی "شدید و تلخ درد مندی" کی توہین ہے۔ اسی طرح جگر و جلیل سے بھی آرزو کا تقابل صحیح نہیں، کیونکہ ان سب کا رنگ ایک دوسرے سے جدا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جناب آرزو اپنی عاشقی، زبان و بیان کی صفائی اور فنی معلومات کی وجہ سے استادی حیثیت رکھتے ہیں، یہ بھی صحیح ہے کہ انھوں نے "سُریلی بانسری" کے ذریعہ سے ایسے عام فہم ترانے ملک میں پیش کئے ہیں جن سے لطف اٹھانے کا حق ہر شخص کو حاصل ہے، لیکن پروفیسر مجنوں ان کے اشعار میں جو آہنگ و ترنم پاتے ہیں، اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ "عروض" کے ایقاع (Rhythm) پر ٹھیک اترتا ہے، ورنہ یوں ان میں کوئی کیفیت موسیقی کی نہیں ہے۔ جس شعر میں فطری و جذباتی ترنم ہوتا ہے، اس کو ہم پڑھتا نہیں بلکہ گنگنانا چاہتے ہیں اور آرزو صاحب کے سادہ اشعار میں یہ رنگینی نہیں پائی جاتی۔ یہ درست ہے کہ وہ جذبات و محاکات کے اچھے شاعر ہیں لیکن ان کے اس آرٹ میں کوئی گہرا خلوص یا کوئی داخلی شدتِ کیفیت ہم کو نظر نہیں آتی۔ اُن کی شاعری اس نقاش کی سی تصویر ہے جس کا آرٹ خطوط کے پیچ و خم کو اس طرح نمایاں کرتا ہے کہ اس میں کہیں ایک نقطہ کا بھی فصل نہ پایا جائے اور دیکھنے والے کو اپنے ذہن سے مطلقاً کوئی خلا پر نہ کرنا پڑے، وہ جو کچھ کہتے ہیں اُس کو اتنا چبا چبا کے کہتے ہیں کہ اس کے ہضم کرنے کے لئے ہمارے ذہن کو کچھ کام کرنا ہی نہیں پڑتا۔ اور اسی لئے باوصف انتہائی سادگی کے اُن کے اشعار میں ہم کو "فطرت" سے زیادہ "صناعت" نظر آتی ہے اور بجائے بے ساختگی کے "اہتمام" اور "قصد و ارادہ" کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ اُن کے سادہ سے سادہ شعر کو لے لیجئے اور بار بار پڑھئے۔ ہر بار اس کا لطف کم ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ آپ محسوس کرنے لگیں گے کہ ان کی "سادگی" دماغ پر بار ہوتی جا رہی ہے اور الفاظ میں اُلجھے جا رہے ہیں۔ اُن کے سہل الفاظ، اُن کے آسان محاورات، اُن کی سلیس زبان، ان میں سے ہر چیز بجائے خود بہت قیمتی و مفید ہے، لیکن ہم کو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید کسی لغت یا قواعد کی کتاب میں مثالیں دینے کے لئے اُن کو قصداً نظم کیا گیا ہے۔

آرزو صاحب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

پوچھی تھی چھیڑ کر جو آپ، کہنے نہ دی وہ بات بھی ۔۔۔ تم نے کھٹکتی پھانس کو چھوڑ دیا اُبھار کے

اس شعر کے آخری مصرعہ کو دیکھئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک لفظ پہلے سے سوچ لیا گیا تھا اور محض اس استعارہ کے لئے پورا شعر لکھا گیا ہے۔

کالی گھٹا میں کوندا لپکا روکے بڑکویل کوک گئی ۔۔۔ جتنی گہری سانس کھنچی تھی اتنی لمبی ہوک لگی

یہ شعر بہت سادہ ہے لیکن بغیر رُکے ہوئے ایک والہانہ کیفیت کے ساتھ اُسے پڑھنے کی کوشش کیجئے، آپ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔

کھلنے کی آس میں یہاں ڈھل گئے تھے اک کلی ۔۔۔ روئے اُٹھا رہے ہیں آج پنکھڑیاں ٹھی دی ٹھی

کالی گھٹا میں کوندا لپکا روکے جو کویل کوک گئی ۔۔۔ جتنی گہری سانس کھنچی تھی اتنی لمبی ہوک گئی

تیسرے شعر کو پڑھئے اور غور کیجئے کہ کیا واقعی اس میں کوئی رونے کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔

ان اشعار میں جتنے استعارے، کنائے یا شاعرانہ تعبیریں ہیں، ان میں کسی سے کوئی شاعرانہ بیخودی ظاہر نہیں ہوتی، بلکہ ان میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے، گویا یہ الفاظ کسی جگہ علاحدہ رکھے ہوئے تھے اور پھر انھیں ایک ایک کرکے چُن دیا گیا ہے، ان اشعار میں سب سے زیادہ بے ساختگی آخری شعر میں پائی جاتی ہے۔ لیکن اسے بھی پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ "سرہانے ہاتھ دھر کے"، سونے کی ادا کا اظہار شاید کسی "سنیریو" کا ٹکڑا ہے، یا کوئی آرٹسٹ "فلم بندی" کے وقت خاص اہتمام سے اس طرح سونے کی کوشش کر رہا ہے۔

آرزو صاحب اس میں شک نہیں فنی حیثیت سے بڑی چیز ہیں اور زبان کے باب میں ان کا فیصلہ "فیڈرل کورٹ" کا سا فیصلہ ہے، لیکن تغزل جس چیز کا نام ہے وہ اُن کے یہاں بہت کم پایا جاتا ہے۔ محبت و وارداتِ محبت کی کوئی پُرخلوص جھلک ہم کو ان کے کلام میں نہیں ملتی۔ اُن کے یہاں "چھاتی کی جلن"، "تلوے کا کانٹا"، "کلیجے کا چھالا" اور اسی قسم کے بہت سے الفاظ ملتے ہیں، جنھیں لکھنوی شاعری میں تاریخی حیثیت اور لسانی اختراع کی منزلت حاصل ہے، لیکن حقیقی سوز و گداز سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔۔۔ چاہت کے کٹھن رستے میں جب لہو پانی ہوتا ہے[1] اس وقت بھی ان کا اہتمام زباندانی اسے "تلوے کا چبھا کانٹا آنکھوں سے نکلتا ہوا"

[1] آرزو صاحب کا شعر ہے :۔ چاہت کے کٹھن رستے کرتے ہیں لہو پانی ۔۔۔ تلوے کا چبھا کانٹا آنکھوں سے نکلا ہے

دکھتا ہے۔ اور ـــ جب محبت میں " ایک پھوڑا بہ گیا " اس کی جگہ " دوسرا چھالا اُٹھتا ہے "[1] تو اس میں آرزو صاحب کو " آگ سے پانی پیدا ہونے کا شعبدہ نظر آتا ہے۔

لیکن باوجود اس کے ۔ یہ ماننا پڑے گا کہ آرزو صاحب نے لکھنوی اسکول کے تصنع، ایہام، ضلع جگت اور جذبات شیون و ماتم میں بہت خوشگوار تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ یہاں تک کہ ہم گروہ اپنے استاد " جلال " سے بھی علٰحدہ نظر آتے ہیں، اور اس حیثیت سے انھیں لکھنؤ کے دبستان شعرا میں ایک مصلح استاد کا سا مرتبہ حاصل ہے۔ یہ تاریخ ادب میں کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آرزو صاحب کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ باوجود اس امر کے کہ ان کی شاعری کا نشو و نما لکھنؤ کی صنعتی فضا میں ہوا، وہ یہاں کی روایتی شاعری سے بالکل متاثر نہیں ہوئے اور انھوں نے تقلید و اتباع کو چھوڑ کر اپنا رنگ بالکل علٰحدہ اختیار کیا اور جدید جذبات کا ساتھ دینے میں اپنی زبان کو قائم رکھتے ہوئے ترقی کے بہت سے امکانات پیدا کر دئے اور اس خصوصیت میں اُن کے دور کا کوئی شاعر ان کا ہمسر نہیں !

آسی :- پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب : " آسی صاحب مشاق شاعر ہیں، ان کے مضامین کی دنیا کچھ وسیع معلوم ہوتی ہے، اس لئے تنوع زیادہ ہے مگر صرف " شعر گو " ہیں، شاعر نہیں۔"

پروفیسر سرور : " ان کی شاعری کا کوئی خاص کارنامہ نہیں، نہ ان کے یہاں کوئی مخصوص تجربہ کار فرما نظر آتا ہے، کلام پختہ ہے، لیکن عناصر میں کوئی انوکھا پن جو کہیں چونکا دے، نہ کوئی والہانہ کیفیت جو کہیں بیخود کر دے۔"

پروفیسر مجنوں : " دبستان دلی کے شاعر ہیں، مضامین و اسالیب بیان کے لحاظ سے ان کی شاعری میں تنوع ہے، ان کے یہاں سپردگی اور خود رفتگی نہیں لیکن ایک ٹھہری ہوئی درد مندی ضرور ہے۔"

پروفیسر تاثیر نے علٰحدہ کوئی رائے نہیں دی۔

پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب کا یہ فیصلہ کہ آسی صاحب شعر گو ہیں، شاعر نہیں، نادرست معلوم ہوتا ہے۔ وہ ان کے مضامین کی دنیا بھی وسیع بتاتے ہیں تنوع بھی کلام میں پاتے ہیں، لیکن شاعر نہیں سمجھتے !

پروفیسر سرور کا یہ کہنا صحیح ہے کہ آسی صاحب کے یہاں کوئی انوکھا پن یا والہانہ کیفیت نہیں لیکن " مخصوص تجربہ " والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی، محبت کی دنیا میں تجربہ کی نوعیت تو ایک ہی ہوا کرتی ہے، اس کے بیان میں البتہ تنوع ہوا کرتا ہے۔ اس لئے شاید سرور صاحب کا مقصود یہ کہنا ہو گا کہ ان کے بیان میں تنوع نہیں لیکن پروفیسر مجنوں اُن کے یہاں کافی تنوع پاتے ہیں اور اسی کے ساتھ ایک ٹھہری ہوئی درد مندی بھی۔

افسوس ہے کہ آسی صاحب نے اپنے کلام کا انتخاب اچھا نہیں کیا، ورنہ شاید تبصرہ کرنے والوں کا لب و لہجہ یہ نہ ہوتا۔ آسی صاحب کی شاعری میں یقیناً کوئی انوکھا پن نہیں ہے، لیکن دبستان دلی کا تتبع کرنے والے شعرا میں وہ ایک کامیاب شاعر کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں۔ پچھلے چند سالوں کے اندر تغزل میں جو انقلاب رونما ہوا ہے اسکو سامنے رکھکر آسی صاحب کی شاعری کو جانچنا اصولی غلطی ہے، ان کا تغزل اس دور کی یادگار ہے۔ اور جس ذوق کے زیر اثر وہ غزل کہتے ہیں، اس میں ہم کو نہ فلسفہ کی گہرائیاں دیکھنا چاہئے، نہ انداز بیان کی گیرائیاں، بلکہ صرف یہ کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں اسے پختگی کے ساتھ کہہ لیتے ہیں یا نہیں اور آسی صاحب کے کلام میں یہ بات ہم کو یقیناً ملتی ہے۔

آسی صاحب مشاق شاعر ہیں، اور اگر وہ " بسیار گوئی " سے کام نہ لیں تو " خوشگوئی " سے بھی عاری نہیں ہیں۔ اُن کے یہاں پختگی ہے، روانی ہے، انداز بیان میں کہیں کہیں جدت و خصوصیت بھی ہے اور باوجود سوز و گداز کی کمی کے ایک ہلکی سی " کسک " بھی پائی جاتی ہے۔

اس رنگ کی شاعری میں ہم کو " جوش و مستی " یا " ربودگی و تنادگی " بھی نہیں مل سکتی، اور ترنم و خوش آہنگی بھی نہیں، لیکن حسن و عشق کے بعض دلکش پہلو ضرور نظر آ سکتے ہیں، اس لئے آسی صاحب کے کلام میں حسن تعبیر اور حسن بیان آپ اکثر جگہ پائیں گے اور اگر کہیں حسن خیال بھی اس کے ساتھ شامل ہو جاتا تو ان کا اُستادانہ رنگ پوری طرح نکھر جاتا ہے لیکن افسوس ہے کہ ان کے انتخاب میں ہم کو بہت کم شعر اس قسم کے نظر آتے ہیں۔

---

[1] شعر یہ ہے: آگ سے پانی نکالے دل کا کھیل ہے، دوسرا چھالا اُٹھا جب ایک پھوڑا بہ چکا

آسی صاحب خالص غزل گو شاعر ہیں اور روایات تغزل کی پوری پابندی کے ساتھ وہ غزل کہتے ہیں، چنانچہ اُن کے یہاں آپ کو جدید میلان یا مغربی طرزِ بیان مطلق نظر نہ آئے گا، لیکن باوصف اس کے ہم اُن کے اشعار سے کافی لطف اندوز ہوتے ہیں بشرطیکہ انھیں ہمیں خود پڑھیں، اُن سے نہ سنیں!

اثر: — پروفیسر کلیم الدین احمد: "قدیم رنگ کے شاعر ہیں، اس لئے ان کی شاعری روایتی ہے، لطف زبان البتہ پایا جاتا ہے"

پروفیسر سرور: "لکھنوی شاعری میں اگر رنگینی و شادابی کہیں ملتی ہے تو اثر کے کلام میں، ان کے یہاں قدیم رنگ کی پختگی اور جدید رنگ کی سادگی دونوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں مستی و بیخودی نہیں ہے۔ لیکن ان کی ہلکی چاشنی بھی مزا دیجاتی ہے"

پروفیسر مجنوں: "میر و آتش سے زیادہ متاثر ہیں، ان کے یہاں نہ چھچھورے پن کی معاملہ بندی ہے، نہ ادنیٰ جذبات نگاری۔ کلام میں برجستگی، بے ساختگی، تخیل کی بلندی اور لب و لہجہ کی متانت ہے، لیکن مجموعی حیثیت سے ان کی شاعری کتابی شاعری ہے، جس سے محویت کا احساس پیدا نہیں ہوتا!"

ڈاکٹر تاثیر: "ان کی مہذب غزل موجودہ دور میں الگ حیثیت رکھتی ہے، مگر اسے قبول عام حاصل نہیں ہو سکتا؛

اثر صاحب کے متعلق پروفیسر کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر تاثیر دونوں کی رائے میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس میں شک نہیں کہ اثر صاحب قدیم رنگ کے شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری بالکل روایتی نہیں ہے، بلکہ اس میں "روایت جدید" کی بھی علامتیں نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر تاثیر کو "الگ حیثیت" کی صراحت کرنا چاہئے تھی، محض اتنا کہہ دینے سے یہ ظاہر نہیں ہو سکتا کہ وہ "الگ حیثیت" اچھی ہے یا بُری۔ اور باوجود مہذب ہونے کے اگر ان کی غزل کو قبول عام حاصل نہیں تو یہ قصور ان کی مہذب غزل کا ہے یا غیر مہذب "قبول عام" کا!

پروفیسر سرور اور پروفیسر مجنوں کی رائیں اثر صاحب کی شاعری کے متعلق قریب قریب یکساں ہیں اور اتنی جچی تُلی ہیں کہ ان میں کسی اضافہ کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی اثر کے یہاں زبان، بیان اور خیال تینوں کا اتنا دلکش امتزاج پایا جاتا ہے کہ اُن کے دورِ شاعری کی تعیین کر ہی نہیں سکتے۔ یہاں تک کہ باوجود تلمذ عزیز کے وہ عزیز سے بھی علیحدہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی شاعری کی بیک گراؤنڈ وہی ہے جو امیر و داغ کے زمانہ میں پائی جاتی تھی، لیکن انکے نقوش کچھ اور ہیں، یہاں تک کہ اساتذۂ متقدمین و متاخرین سب کا کچھ نہ کچھ رنگ ہم کو اُن کی شاعری میں نظر آتا ہے اور چونکہ وہ مغربی لٹریچر سے بھی آشنا ہیں، اس لئے جدید اسلوب بیان کی مثالیں بھی اُن کے یہاں ملتی ہیں۔

مومن کے رنگ کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں:

ہوا ہی دفا سے اُٹھنے لگا تھا دم — خوش ہوں کہ تم نے قصد کیا امتحان کا
اب کہاں اضطراب تاب شکن — اب کہاں شوق مرحلہ فرسود
تکیہ کلام ہی سہی رشک سے مر رہا ہوں میں — کیوں کہو بات بات پر "دیکھو بھلا سا نام" ہے

میر کا انداز:

جب سے اُن سے آنکھ لڑی ہے آنکھوں میں اپنے خواب نہیں — اس پہ مصیبت یہ ہے ہمدم صبر کی دل کو تاب نہیں
وضع بھی کوئی شے ہے آخر، دل کو اثر سمجھاتا تھا — در سے کسی کے اک بار اُٹھ کر کاش دوبارہ نہ جاتے تم

آتش کی گرمیاں:

اثر تیرے کوچہ سے بچ بچ کے نکلا — ابھی ہوش اتنا ہے دیوانگی میں
ہر میں کچھ ہوا سا اُٹھے تو اُچھل جاتا ہے — قفس میں یاد جب آتا ہے میرا آشیاں مجھ کو

اثر نے محاکات کی شاعری بھی کی ہے اور عام سطح سے بہت بلند ہو کر مثلاً:

نظر سوئے زمیں ہے، گوشۂ دامن ہے ہاتھوں میں — معاذ اللہ کوئی کیا کہے ایسے پشیماں کو
نظریں جھکیں وہ اٹھ کے جھکیں تمکنت کے ساتھ — گویا یہی جواب تھا میرے سوال کا

جدید اسلوبِ بیان کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں :

کوئی موسم ہو ساں ہو کہ تغیر کوئی — تم کو جب دیکھ لیا وقت فراموش ہوا

تعبیر حرف و صوت کوئی کس طرح کرے — عالم تمام اک سخن ناتمام ہے

کہیں کہیں ان کے کلام میں قدیم لکھنوی رنگ بھی پایا جاتا ہے، لیکن کافی نکھرا ہوا، مثلاً :

وہ گزرا ادھر سے جو بیگانہ وار — چراغِ لحد جھلملانے لگا

جھلملاتے ہوئے تارے کیا ہیں — ٹکڑے پھول ترے بستر کے

یہ درست ہے کہ ان کے یہاں مستی و بیخودی اور جوش و ولولہ نہیں ہے، لیکن ایک سنجیدہ سپردگی، ایک متین فنا دگی ضرور پائی جاتی ہے۔ اثر اچھے جذبات سے مغلوب ہو جانے کے بعد بھی پاسِ وضع و خودداری کو ہاتھ سے نہیں دیتے اور اسی لئے ان کے کلام میں ابتذال و سوقیت یا "کھل کھیلنے" کی کیفیت کہیں نہیں پائی جاتی۔ اس میں شک نہیں کہ دبستانِ لکھنؤ کا قدیم رنگ بدلنے میں اثر کی شاعری نے بڑی مدد کی ہے اور وہ عہدِ حاضر کے لکھنوی شعرا میں بہت نمایاں امتیاز کے

احسان دانش :- پروفیسر کلیم الدین احمد : "الفاظ پر کافی قدرت ہے، بندشیں پختہ ہیں، لیکن بلند و لطیف احساس کی کمی ہے، ان کے اشعار پڑھکر دل ٹھہرانے لگتا ہے اور غزل سے انھیں کوئی لگاؤ نہیں۔"

پروفیسر سرور : "غزل کے لئے جس تیز احساس اور شدید جذبہ کی ضرورت ہے وہ ان کے یہاں نہیں ہے، وہ اپنی نظموں کی وجہ سے ہر بات تفصیل سے ٹھہر ٹھہر کر بیان کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔"

پروفیسر مجنوں : "خالص نظم نگار شاعر ہیں اور غزلیں کہکر اپنی قوت کا غلط استعمال کرتے ہیں۔"

ڈاکٹر تاثیر نے علیحدہ ذکر نہیں کیا۔

یہ تو صحیح نہیں کہ ان میں بلند و لطیف احساس کی کمی ہے، یا یہ کہ وہ شدید جذبہ سے یکسر محروم ہیں، لیکن چونکہ اُن کا ماحول ایسا نہیں تھا کہ وہ غزل گوئی کی طرف توجہ کرتے، اس لئے مشق و رجحان کی کمی کی وجہ سے اُن کی غزلوں میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی کہ ہم انھیں غزل گو شعرا میں کوئی مخصوص جگہ دے سکیں میں سمجھتا ہوں کہ اگر ابتدا سے حالات و واقعات اُن کو غزل کی طرف متوجہ کر دیتے تو اُن میں غزل گوئی کی کافی صلاحیت موجود تھی کہ اس وقت اُن کا شمار اچھے غزل گو شعرا میں ہوتا۔ ان کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں جن سے اُن کے تحت الشعور ذوقِ تغزل کا پتہ چلتا ہے :

نہ جانے محبت کا انجام کیا ہے — میں اب ہر تسلی سے گھبرا رہا ہوں

وہ اک شے میں تم مسکراتے ہو گویا — ہزاروں حجابوں میں یہ بے حجابی

احسان جس مکاں میں کبھی جشنِ شوق تھا — روتا ہوں اس کے اب در و دیوار دیکھ کر

علی اختر اختر :- پروفیسر کلیم الدین احمد : "غزل سے کچھ مناسبت رکھتے ہیں، غور و فکر کی عادت کچھ زیادہ ہے، لیکن جذبات نوخیز و ناتمام ہیں، کلام میں کوئی جدت یا کوئی گہرائی بھی نہیں ہے۔"

پروفیسر سرور : "اقبال کی نادر ترکیبیں، اصغر کا لطیف تغزل اور ہلکا تصوف ان کے یہاں پایا جاتا ہے۔ خیالات کے اظہار کا سلیقہ حاصل ہے۔"

پروفیسر مجنوں : "ان کے کلام میں ہم کو اک نئے انداز کا فلسفیانہ تعمق ملتا ہے، لیکن نظموں میں وہ اپنی شخصیت شعری کو زیادہ اچھی طرح ظاہر کر سکتے ہیں۔ غزلوں میں وہ کچھ کمزور پڑ جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر تاثیر نے علیحدہ کوئی رائے نہیں دی۔

علی اختر صاحب اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، جو غزل کے حدود کو بہت وسیع دیکھنا چاہتے ہیں، یہاں تک کہ اگر کائنات کے تمام جھگڑے اس سے طے ہو سکتے ہیں

بیان "حسن وعشق" کے ترک کردینے میں بھی مضایقہ نہیں۔

اُن کی غزل سے ہم کو کسی جا یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انھوں نے واقعی کبھی کسی سے محبت کی ہے اور اسی لئے جب وہ بر بنائے رسم و رواج معاملات محبت بیان کرتے ہیں تو اُن میں مطلق جان نہیں ہوتی۔ ان کا فطری میلان تفلسف کی طرف زیادہ ہے، اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص بیان حسن وعشق میں کبھی لوچ اور دردمندی پیدا نہیں کر سکتا۔ علمی آخر نظمیں خوب لکھتے ہیں اور ان کے فکر کی بلندی ان میں بہت کامیاب نظر آتی ہے، لیکن چونکہ غزل کی زبان اور غزل کا انداز بیان دونوں نظموں سے مختلف ہیں اس لئے تغزل میں کامیاب نہیں ہیں اور مشکل ہی سے کوئی شعر ان کی غزل کا ایسا ہوتا ہے جو ہمارے دل پر دیرپا نقش چھوڑ جائے۔

...تر شیرانی :- پروفیسر کلیم الدین احمد : "سطحی کلام ہے جس میں جوانی کے جلد گزر جانے والے جوش و خروش سے کام لیا گیا ہے"۔

پروفیسر سرور : "ان کی شاعری میں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں، جوانی کا اُبال ہے اور وہ فنی یا اتفاقی نظر سے بھی وہیں ہیں جہاں ۵ سال پہلے تھے"۔

پروفیسر مجنوں : "جوانی کے بے اختیار جذبات کے سوا کچھ نہیں ہوتا، رومانیت و موسیقیت ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے جس میں ہلکے قسم کا گداز بھی پایا

...تاثیر:

ڈاکٹر تاثیر نے علحدہ کوئی ذکر نہیں کیا۔

میری رائے بھی وہی ہے جو پروفیسر سرور اور پروفیسر کلیم الدین احمد کی۔

...ید امیٹھوی :- پروفیسر کلیم الدین احمد : "مشاق ہیں اور مختلف مضامین کو پختگی کے ساتھ نظم کر سکتے ہیں، لیکن شعر گوئی سے کوئی فطری لگاؤ نہیں، انھیں (اُلوں کی طرف متوجہ نہ ہونا چاہئے"۔

پروفیسر سرور : "جلال کے شاگرد، لیکن جلال سے بہت مختلف، غالب کی تقلید نے ان کی شاعری میں ایک خوشگوار رنگ پیدا کر دیا ہے"۔

پروفیسر مجنوں اور ڈاکٹر تاثیر نے علحدہ ان کا ذکر نہیں کیا۔

...ید صاحب حقیقتاً فارسی کے اسکالر ہیں اور ان کا ذوق شعری فارسی ہی میں زیادہ نمایاں ہے۔ اول اول جب انھوں نے لکھنؤ میں قیام اختیار کیا تو فارسی شاعری کا ذوق معدوم تو نہ ہوا تھا، لیکن کم ضرور ہو گیا تھا اسی لئے اثید صاحب نے اُردو کی طرف توجہ کی۔ ظاہر ہے کہ فطری مناسبت سے ہٹ کر جب کوئی مشغلہ اختیار کیا جاتا ہے تو وہ دبا دبا سا رہتا ہے اور اس لئے ان کی اُردو شاعری اس شخص کی سی شاعری نہ ہو سکی، جس نے اپنی زندگی اس کے لئے تج دی ہو، لیکن جس حد تک فنی اکتساب کا تعلق تھا، انھوں نے اُستادی کا درجہ حاصل کر لیا، اور جب ان کو فارسی ترکیبوں کے استعمال کا موقعہ ملا، تو اُن کا رنگ تغزل جس میں بیدل و غالب دونوں کی باتیں سموئی ہوئی تھیں صرف خواص کی چیز بن کر رہ گیا۔ تاہم اُن کے انتخاب سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ الفاظ نہیں بلکہ جذبات کے شاعر ہیں اور ایک محدود دائرہ کے اندر اسی رنگ میں تنوع پیدا کرتے ہیں۔

...ود دہلوی :- پروفیسر کلیم الدین احمد : "کہنہ مشق اُستاد ہیں، لیکن مضمون و اسلوب بیان دونوں روایتی ہیں، صرف اُستاد ہیں، شاعر نہیں"۔

پروفیسر سرور : "اُنیسویں صدی کے آخری دور کے شاعر ہیں، جوانی کے اشعار میں دہلی کے اثر سے جا بجا کوئی چبھتی ہوئی بات یا سیدھا سادا مزے کا شعر مل جاتا ہے، اب ان کی شاعری صرف روایتی ہے"۔

پروفیسر مجنوں : "کہنہ مشق ہیں، اُستادانہ مہارت رکھتے ہیں، لیکن صرف زبان و محاورہ کے شاعر ہیں"

ڈاکٹر تاثیر نے علحدہ اُن کے کلام پر کوئی رائے نہیں دی۔

بیخود، داغ کے شاگرد ہیں اور شاید اس وقت کے جب داغ کا "گلزار داغ" وجود میں آرہا تھا، کیونکہ بیخود کے کلام میں اسی وقت کی "داغیت" پائی جاتی ہے ...تاب داغ نہ ماہتاب داغ کا رنگ بیخود کے یہاں بہت کم ہے۔

= بالکل صحیح ہے کہ بیخودؔ زبان و محاورے کے شاعر ہیں، یہ بھی درست ہے کہ اُن کی شاعری روایتی ہے اور ہونا چاہیئے کیونکہ جس زمانہ میں بیخودؔ کی شاعری کا شباب تھا، غزل میں نئے رجحانات کا نام و نشان بھی نہ تھا، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بیخودؔ کے کلام میں اُستادانہ پختگی پائی جاتی ہے اور کہیں کہیں و ایسے اشعار بھی کہہ جاتے ہیں :

راہ میں بیٹھا ہوں میں تم سنگِ رہ سمجھو مجھے — آدمی بن جاؤں گا کچھ ٹھوکریں کھانے کے بعد

ہم نے یہ مانا نہیں، دشوار کچھ ترکِ وفا — گفتگو تو صرف اس میں ہے کہ ہم ایسا کریں ؟

تاجورؔ :- پروفیسر کلیم الدین احمد : "مشاق، پڑھے لکھے شاعر ہیں، الفاظ میں خاص رکھ رکھاؤ ہے، مگر زندہ رہنے والی شاعری نہیں۔"

پروفیسر سرورؔ : "ان کی شاعری گہرے احساس کا نتیجہ نہیں، ایک پختہ کار ذہین فطرت کے ٹیڑھے ترچھے نقوش کا مجموعہ ہے۔ کلام میں گرمی ہے، جادو نہیں۔"

ڈاکٹر تاثیرؔ اور پروفیسر مجنوںؔ نے علٰحدہ ان کی شاعری کا ذکر نہیں کیا۔

تاجورؔ کے تغزل میں ہم کو کوئی چیز چونکا دینے والی نظر نہیں آتی۔ اُن کے کلام سے یہ پتہ تو ضرور چلتا ہے کہ وہ مضمون آفرینی اور انداز بیان میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اس کوشش میں وہ اس سے زیادہ کامیاب نہیں ہوتے کہ کہیں کہیں تھوڑا سا ولولہ و جوش ظاہر ہو جاتا ہے۔
الفاظ و معنی کے لحاظ سے غزل کی جتنی خصوصیات ہیں، ان میں سے کوئی تاجورؔ کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کے یہاں فنی معائب و اسقام بہت کم ہیں۔

ثاقبؔ لکھنوی :- پروفیسر کلیم الدین احمد : "مخصوص و معلوم طرز میں قافیہ پیمائی کرتے ہیں اور کوئی انفرادی شان نہیں رکھتے۔"

پروفیسر سرورؔ : "خالص لکھنوی شاعر ہیں۔ عزیزؔ و صفیؔ سے زیادہ پختہ و متوازن کلام ہے۔ مگر نہ نئے مضامین ہیں، نہ نیا اسلوب۔ مشاقی و صفائی البتہ پائی جاتی ہے۔ لکھنؤ اسکول میں صاحبِ فکر شاعر صرف ثاقبؔ ہیں۔"

پروفیسر مجنوںؔ : "ان کے کلام میں نہ والہانہ بے اختیاری ہے، نہ جذبات کی گرمی، لیکن ان کے یہاں بعض اشارات ایسے ضرور مل جاتے ہیں کہ ہم سوچنے لگتے ہیں، یہ حسن و عشق کے شاعر نہیں بلکہ حادثاتِ زندگی کے شاعر ہیں، ان کی غزلوں سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اب نئے دور کی نفسیات شروع ہو رہی ہے۔ ضبط و خودداری، متانت و بے نیازانہ انداز ثاقبؔ کی خصوصیات ہیں، لیکن کلام بے کیف ہے۔"

ڈاکٹر تاثیرؔ نے کوئی رائے نہیں دی۔

ثاقبؔ صاحب موجودہ دور کے سب سے پہلے لکھنوی شاعر ہیں جنھوں نے اپنی تغزل کی بنیاد زیادہ تر فلسفیانہ نکتہ سنجیوں پر قائم کی۔ اُن کے یہاں یقیناً عزیزؔ کی "رثیت" نہیں پائی جاتی، لیکن صفیؔ کا سا لکھنوی رنگِ تغزل بھی نہیں پایا جاتا۔ انکے اسلوبِ بیان میں کوئی غیر معمولی جدت تو نہیں ہوتی لیکن خیال کا نیا پن اکثر و بیشتر کہیں نہیں بہت دلکش ہوتا ہے۔ مثلاً قفس و آشیاں کا ذکر لکھنوی شاعری میں بہت پایا جاتا ہے، اور ثاقبؔ کے یہاں بکثرت نظر آتا ہے، لیکن انھوں نے بیک گروہ دل کو اس میں بہت تازگی پیدا کر دی ہے :-

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

غنیمت ہے قفس فکرِ رہائی کیا کریں ہمدم — نہیں معلوم اب کیسی ہوا چلتی ہے گلشن میں

تڑپا دیا ہے دل کو شاباش ہم صفیرو — رہنے بھی ہم کہ ہمدرد، ٹوٹا قفس جلا میں

ان کی بعض شاعرانہ تعبیروں میں غیر معمولی مفکرانہ پختگی پائی جاتی ہے۔ مثلاً :-

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو — بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

اک نیا دل ظلم سہنے کو بنانا چاہیے — ہو تو سکتا ہے مگر اس کو زمانہ چاہیے

بسے گل پھولوں میں دیتی تھی مگر رہ نہ سکی — میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا

ثاقب صاحب بہت متین کہنے والوں میں سے ہیں، اور اسی لئے ان کے یہاں کوئی کیف وارفتگی یا آہنگ و ترنم نہیں پایا جاتا۔ جدید میلانات کے ساتھ ساتھ غزل کے امکانات پر غور کرنا اور ان کو بروئے کار لانا برا نہیں، لیکن نظم سے اسے علٰحدہ رکھنے میں ہم اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں، جب غزل کی زبان اور اس کا اسلوب نہ بدلتے۔ ثاقب صاحب کے اکثر اشعار ایسے ہیں جو بجائے غزل کے نظم کا جزو معلوم ہوتے ہیں، اور یہ عیب کہیں پورے شعر میں ہے اور کہیں صرف ایک دو لفظ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً:

بچھڑے ہوؤں کو ہمرا کرتے ہیں کرم والے — جہاں ہے سبزہ گلشا بھی وہیں برستی ہے

دوسرا مصرعہ غزل کی پوری کیفیت لئے ہوئے ہے، لیکن پہلے مصرعہ نے شعر کو تغزل سے خارج کر دیا،

میرے ماضی پر خفا ہونے سے سب واقف ہیں — ورنہ جو ہے وہ شکایت سے خفا ہوتا ہے

اس میں بھی پہلا مصرعہ آہنگ تغزل سے عاری ہے۔

بعض جگہ وہ مضمون آفرینی کے شوق میں حد درجہ غیر دلچسپ ہو جاتے ہیں:

ابھی تو نقطۂ موہوم ہستی ہوں زمانے میں — کسی دن دیکھ لینا پھیل جاؤں گا بڑھ کر

گویا غالب کے اس مصرعہ کا جواب دیا گیا ہے:— "میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں" لیکن کس قدر گرا ہوا جواب ہے۔

کہیں کہیں ان کی لکھنویت بھی اپنا کام کر گئی ہے:—

جب زلف دیکھ لی ہے تو چہرہ بھی دیکھ لوں — گردش نہیں ہے کیا مرے لیل و نہار کو
دل سے جھگڑا کس لئے بیکار پیدا کیجئے — توڑ کر شیشہ کو کیوں تلوار پیدا کیجئے
عجب ہے اترے وہ ذہن ان کے آنکھ میں خون — کٹیں کہاں کی رگیں اور کہاں لہو آئے
پھر اور کس طرح سے اجڑے مکاں کو سجتا — قصر لحد میں آ کر تصویر ہو گیا ہوں

لیکن مجموعی حیثیت سے ثاقب کا شمار لکھنؤ کے اُن شعرا میں سے ہے، جنھوں نے دبستان لکھنؤ کی فضا کو بدلا اور ایہام و رعایت لفظی ترک کر کے غزل میں خوشگوار بنیادیں کام لیکر اس کی سطح کو بہت بلند کر دیا۔

جلیل:— پروفیسر کلیم الدین احمد: "قدیم رنگ تغزل کے علمبردار ہیں، لیکن امتیازی حیثیت کے ساتھ۔ ان کی شاعری کی جڑیں ماضی کی زمین میں پیوستہ ہیں، ان کے کلام سے تشفی حاصل نہیں ہوتی۔ دور حاضر کی نئی تحریکوں سے بے خبر ہیں۔"

پروفیسر سرور: "جلیل کی دنیا بہت سیدھی سادی ہے، فکر سے بالکل نہیں، صرف جذبہ اور جذبہ کا نکھار ہے۔"

پروفیسر مجنوں: "غزل کی روایتی آہنگ کے استاد ہیں، نکھری زبان اور رچی ہوئی موسیقیت ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔"

ڈاکٹر تاثیر نے ان کے کلام پر علٰحدہ کوئی رائے نہیں دی۔

جلیل یقیناً پرانے رنگ کے شاعر ہیں اور ان کے یہاں جدید رجحانات نظر نہیں آتے۔ لیکن ان کی شاعری کا ماحول اسی کا مقتضی تھا۔ ابتدا میں وہ اپنے استاد امیر مینائی کے ساتھ رام پور میں رہے اور پھر حیدرآباد چلے گئے۔ اس طرح ان کی شاعری درباری اثرات سے کبھی علٰحدہ نہ ہو سکی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس قدیم روایتی درباری شاعری میں جلیل ایک کامیاب شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں یا نہیں۔

امیر مینائی اپنی شاعری کے لحاظ سے دو مختلف ذوق کے شاعر تھے، مرآۃ الغیب میں وہ اسیر کے قدم بہ قدم چلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور صنم خانۂ عشق میں داغ کے۔ جلیل نے ان کا تلمذ اس وقت اختیار کیا جب امیر مینائی "صنم خانہ" کی بنیاد ڈال رہے تھے اور اسی لئے جلیل کا رجحان آخر آخر انھیں داغ کی طرف لے گیا اور اس رنگ کی شاعری میں انھوں نے مشق کر کے استادی کا درجہ حاصل کیا، گو وہ داغ کی طرح بالکل "کھل کھیلنے" کی طرف کبھی مائل نہ ہوئے۔

بنے گئے ہیں۔ اشعار میں گہرے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے حالانکہ مضمون نہایت معمولی ہوتا ہے۔ ان کے یہاں شاعری خیال بندی کا نام ہے۔ ان کے اشعار میں بیشتر معنوی وغیر فطری ہے اور تاثیر مطلق نہیں۔"

پروفیسر سرور: "جگر سے زیادہ بلند آہنگی و مردانگی پائی جاتی ہے لیکن غزل کی نرمی، شیرینی اور روانی جوش کے بس کی نہیں اور ان کی طرز تغزل کیلئے موزوں نہیں۔"

پروفیسر مجنوں: "نظم نگار شاعر ہیں، لیکن غزلیں بھی اچھی کہی ہیں، جن میں ولولۂ شباب کی تازگی و بالیدگی محسوس ہوتی ہے لیکن مجموعی طور پر زندگی کا وہ رخ نہیں ملتا جو ان کی نظموں کی خصوصیت ہے۔"

ڈاکٹر تاثیر: "ان کی نظم غزل پر اس قدر حاوی ہے کہ متغزلین میں شمار کرنا انھیں مناسب نہ ہوگا۔"

جوش کی زبان اور ان کا انداز بیان، تغزل کی لطافت کے بالکل منافی ہے، اسی لئے ان کی غزلوں پر بھی نظم یا قصیدہ کا رنگ نمایاں ہے۔ وہ غزل گو شاعر نہیں ہیں اور نہ اس حیثیت سے وہ اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں۔ اول اول جب انھوں نے غزلیں لکھنا شروع کیں تو ان میں سے اکثر "مسلسل" انداز کی تھیں، یعنی اگر آپ چاہیں تو انھیں نظمیں بھی کہہ سکتے ہیں۔ جوش فطرتاً طنزیاتی و استہزائی شاعر ہیں اور غزل و نظم دونوں میں ان کا یہ ذوق نمایاں ہے۔ مومن بھی طنزیاتی شاعر تھا لیکن جوش کے یہاں طنز کے ساتھ غصہ و انتقام بھی ہے۔ اور مومن کے یہاں عجز و فتادگی، اسی لئے جوش کا یہ ذوق غزل میں بڑا مسموم ہوتا ہے۔

جوش کی شاعری بلند آواز کی شاعری ہے، شاندار الفاظ کی شاعری ہے، چیخ پکار اور لسانی ہنگامہ و پیکار کی شاعری ہے۔ ظاہر ہے غزل میں ان باتوں کی گنجائش کہاں؟ نظم میں البتہ ان کی یہ شاعرانہ خصوصیات ہماری توجہ جذب کر سکتی ہیں، بشرطیکہ ہم ان کے کرخت لہجہ، غضبناک انداز، طنزیہ تلخی اور ساری دنیا سے بیزار انتقامی کیفیت کے اظہار کو برداشت کر سکیں۔

ان کی نظموں کو پڑھئے یا خود ان سے سنئے، ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ کھلم کھلا گالی نہ دے سکنے کا جذبہ گھٹ کر شعر بن گیا ہے۔ جوش کی شاعری میں کوئی مخلصانہ جوش و ولولہ نہیں ہے، جس سے لوگوں کے ذہن و دماغ متاثر ہوں، بلکہ ایک باغیانہ بلند آہنگی ہے، سامع کو مرعوب کر کے زیادہ سمجھنے کا موقعہ نہیں دیتی۔

ممکن ہے الفاظ کی تراش و خراش اور ترکیبوں کی ندرت کا خیال جوش میں اقبال کے مطالعہ سے پیدا ہوا ہو، لیکن جس چیز کو "آہنگ" کہتے ہیں وہ جوش کے یہاں اقبال سے بالکل مختلف ہے۔ اقبال کا کلام باوسعت اس لئے کہ اس میں کائناتی وسعت نہیں، سوز و گداز کی کیفیت رکھتا ہے اور جوش کی شاعری باوسعت اس لئے کہ اس میں آفاقی تاثرات کا اظہار ہے۔ کوئی نرمی و لطافت اپنے اندر نہیں رکھتی۔ جس وقت ہم جوش کی شاعری میں داخلی کیفیت کی جستجو کرتے ہیں، تو ہم سطح کے نیچے تھوڑی ہی دور جا کر کسی سخت چیز سے ٹکرا جاتے ہیں اور گہرائی میں ڈوبتے چلے جانے کی جگہ پھر سطح پر ابھر آتے ہیں۔ اسی لئے جوش کی شاعری میں وہ لوچ اور نرمی نہیں ہے جو باریک تاروں کے ارتعاش و تموج کا نتیجہ ہوتا ہے، بلکہ ایک کرخت آواز ہے جو دو سخت چیزوں کے تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جوش کو الفاظ کے خوبصورت صرف اور ترکیبوں کے دلکش استعمال کا خاص سلیقہ حاصل ہے، نقوش شعری میں نئے نئے خطوط و زوایا سے کام لینا ان کا حصہ ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی تجزیاتی مہارت بہت بڑھی ہوئی ہے اور اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ "محاکات و تخییل" میں وہ بالکل اچھوتی بلکہ گاہ گاہ انداز اختیار کرتے ہیں، لیکن یہ تمام باتیں ان رنگ آمیزیوں سے زیادہ نہیں، جو ہمیں اسٹیج کے پردہ پر نظر آتی ہیں ــــ کہ دور سے دیکھ کر جتنا جی چاہے خوش ہو لیجئے، لیکن قریب گئے اور لطف ختم!

جوش کو شاعر انقلاب کہا جاتا ہے لیکن انقلاب جوش کا مذہب (Creed) نہیں ہے بلکہ ذریعہ تفریح ہے، وہ قطعاً اس سے واقف نہیں کہ "انقلاب" "سوقت" "سپردگی" ([illegible]) دور سے گزرتا ہے، اور اس میں صرف "سوختہ جانی" درکار ہے۔ جوش صرف دوسروں کو خون میں نہایا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور خود اس سے گریز کرتے ہیں۔ اس ہولی میں وہ دور سے پچکاری چھوڑ کر دوسروں کے کپڑے تو رنگین کر دینا چاہتے ہیں، لیکن خود بچے رہتے ہیں۔ گویا وہ انقلاب سے کھیل رہے ہیں اور اسی لئے جب وہ اس کی دعوت دیتے ہیں تو اس میں بجائے "خلوص" کے نمائش اور بجائے موعظت کے "استہزاء" نظر آتا ہے۔

جوشؔ کا ماحول، جوشؔ کی فطرت، اور جوشؔ کی زندگی، ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اُن میں "جذبۂ انقلاب" پیدا کر سکتی، اسی لئے اُن کی انقلابی شاعری بے روح ہے اور ہم اسے صرف آرٹ کا مکمل نمونہ کہہ سکتے ہیں، جسے ہم بھول تو کہہ سکتے ہیں۔ وائے چیدن نیست"
انقلابی شاعری کے آغاز سے پہلے جوشؔ پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب وہ صرف منظریہ شاعری کرتے تھے، اگر وہ اسے پر قائم رہتے تو زبان کی بہتر خدمت انجام دے سکتے۔

حسرت موہانی :- پروفیسر کلیم الدین احمد "حقیقی معنی میں شاعر ہیں اور موجودہ شعراء متغزلین میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں اصلیت اور تاثیر۔ ان کی طبیعت حساس ہے اور دل سوز و گداز عشق سے آشنا۔ حسرتؔ کی شاعری کی فضا اور آواز دونوں مخصوص ہیں، ان کے لہجہ میں نرمی، بیساختگی اور ترنم ہے، ان کا لہجہ بلند و پست نہیں ہوتا اور وہ سامعہ کو مرعوب کرنے کے لئے اپنی آواز بلند نہیں کرتے۔"

پروفیسر سرور : "حسرتؔ اپنی زندگی ہی میں کلاسکل حیثیت اختیار کر چکے ہیں، ان کا حسن و عشق، ان کا ہجر و وصال سب اسی دُنیا کی چیزیں ہیں جن میں انھوں نے ایک ابدی چاشنی بھر دی ہے اور زمان و مکان سے بے نیاز کر دیا ہے۔ انھوں نے حسن کی ہر ادا کو دیکھا ہے اور اُس سے لطف اُٹھایا ہے۔"

پروفیسر مجنوں : "حسرتؔ نہ صرف قدیم روایات کی آخری بڑی یادگار ہیں، بلکہ اُردو غزل میں جو کچھ نئی تحریک کے آثار نظر آتے ہیں، اس کے موجد بھی یہی ہیں۔ حسرتؔ کے تغزل کو متعین کرنا دشوار ہے۔ وہ بعدیات اُردو غزل کے امام ہیں، ان کی فطری اُپچ اور قدما کے عناصر نے مل کر عجیب کمل و پختہ آہنگ پیدا کر دیا ہے ان کے یہاں میرؔ، مصحفیؔ، جراتؔ اور مومنؔ کے رنگوں کا یکساں امتزاج ہے، لیکن حسرتؔ تقلیدی شاعر نہیں ہیں اور غزل کی تمام خصوصیات کا حامل ہوتے ہوئے بھی ان کا کلام یاس انگیز نہیں ہے"

ڈاکٹر تاثیر : "حسرتؔ نے پُرانی درباری غزل سے آزاد ہو کر ایک نئے دور کی ابتدا کی، اس کا عشق خلوص و نیاز کا آئینہ دار ہے اور انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے عشقیہ شاعری میں محسوسات کا ایک نیا باب کھول دیا ہے۔"

حسرتؔ کے رنگِ تغزل کے متعلق کچھ لکھنا مسلمات و حقائق پر گفتگو کرنا ہے۔ حسرتؔ کی شاعری ایک ایسی حقیقت ہے، جس سے کسی کو مجال انکار نہیں۔ حسرتؔ کے یہاں فلسفہ ہے، تصوف ہے، معنی آفرینی کی کوشش ہے، "واردات" پیدا کرنے کی کاوش، لیکن یہ تمام باتیں اُس کے لہجہ تغزل پر قربان ہیں۔ حسرتؔ کی غزل کا ترنم، نرم و لطیف اندازِ بیان، الفاظ کی شیرینی، فارسی ترکیبوں کی حلاوت اور متوازن خیالات سے پیدا ہونے والی ہم آہنگی، یہ سب مل کر کچھ ایسی چیز بن جاتی ہیں جو ہمیں اس وقت کسی اور کے کلام میں نہیں ملتی۔ پچھلے پچاس سال کے اندر سب سے پہلے جس نے تغزل کا صحیح معیار پیش کیا اور لکھنؤ کی ایہامی شاعری کی طرف سے جس نے دفعتاً زمانہ کا رُخ پھیر دیا وہ صرف حسرتؔ کی ذات تھی۔ حسرتؔ کی نغمہ سنجیوں کو سُن کر لوگ چونک پڑے، روحیں وجد کرنے لگیں اور شعر و سخن کی فضا چمک اُٹھی۔

حسرتؔ نے جس وقت غزل گوئی شروع کی اس وقت بھی وہ اپنے رنگ میں منفرد تھے اور اب بھی کہ تغزل کا معیار بہت بلند ہو گیا ہے۔ ان کا کوئی ہمسر نہیں

حفیظ :- پروفیسر کلیم الدین احمد : "ان کے کلام میں روایتی عنصر زیادہ ہیں اور خیالات پیش پا اُفتادہ"

پروفیسر سرور : "ان کی غزلوں میں گیتوں کی سی سادگی و شیرینی پائی جاتی ہے۔ مضمون و اسلوب بیان نیا نہیں، لیکن سادگی و دلکشی ضرور نئی ہے۔"

پروفیسر مجنوں : "حفیظؔ کو چونکہ موسیقی سے فطری مناسبت ہے اس لئے اُن کی نظم میں بھی ہلکا سا تغزل ملتا ہے جس میں تصور سے زیادہ غنا کا عنصر غالب ہے۔ ان کا موضوع شباب و عشق کا رومانی تصور ہے۔"

ڈاکٹر تاثیر : "غزل میں سادگی و خلوص تو ہے مگر انفرادیت کم۔ وہ واضح و شخصی تجربات کا اظہار کرتے ہیں مگر ان کے واردات عام تجربات سے مختلف نہیں۔ اس کی وجہ سے عالمگیر اور سبک روی مترنم ہے۔"

حفیظؔ کا اصلی ذوق غزل گوئی ہے اور اسی ذوق نے اُن کی رہبری گیتوں کی طرف کی۔ ان کے یہاں سادگی و ترنم دونوں بہت توازن کے سا

ے جاتے ہیں اور اسلوب بیان میں بھی کافی جدت نظر آتی ہے۔ وہ واردات و معاملات کے شاعر ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اس میں وزن ہوتا ہے، موجود ہوتی ہے، لیکن اس تمام رکھ رکھاؤ میں بھی کسی جگہ صنع نظر نہیں آتا۔ ان کی شاعری میں درد مندانہ شکوہ و شکایت بھی ہے، ہلکا سا خود داری کا طنز بھی ہے لیکن محبت کا نرم و لطیف لہجہ لئے ہوئے۔ اسی لئے ان کی شاعری میں اثر بھی ہے اور کیفیت بھی لیکن پختگی نہیں پائی جاتی اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جس زمانہ میں ان کے رنگ تغزل کو پوری طرح سے جا نا چاہئے تھا، اسو قت بقول ہمارے ایک دوست (مسٹر نگاری) کے انھیں مشاہدات اسلام ہو گیا ہے۔

دل :۔ پروفیسر کلیم الدین احمد: "ان کے کلام سے ان کی حساس طبیعت کا پتہ نہیں چلتا، طرز ادا میں آورد ہے گو معانی و بندش میں ابتذال نہیں"

پروفیسر سرور: "امیر کے شاگرد ہیں، لیکن جلال کی گرمی بھی پائی جاتی ہے، پختگی و مشاقی میں کلام نہیں"۔

پروفیسر مجنوں: "دبستان امیر کی تمام خصوصیات کے ساتھ درد مندی و دل گداختگی بھی ہے، لیکن متانت لئے ہوئے"

ڈاکٹر تاثیر نے ان کے کلام پر کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔

امیر کے شاگردوں میں دل کی شاعری سب سے الگ ہے، یہاں تک کہ جلیل سے بھی۔ دل کی شاعری اتنی ہلکی نہیں ہے جتنی امیر کے دوسرے شاگردوں کی۔ ان کے یہاں غور و فکر کا عنصر غالب ہے اور کہیں کہیں آواز میں بلندی بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن نہایت گوارا قسم کی! پختگی و مشاقی ان کے ہر ہر شعر سے نمایاں ہے لیکن والہانہ بے خودگی یا خود رفتگی بہت کم پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام میں موسیقیت تو نہیں ہے، لیکن سنبھلی ہوئی درد مندی ضرور ہے، جو کہیں کہیں ترنم کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہے چونکہ اظہار جذبات میں کبھی بے اختیار نہیں ہوتے، اس لئے ابتذال و سخافت ان کے یہاں بالکل نہیں پائی جاتی۔

روش :۔ پروفیسر کلیم الدین احمد: "غزل سے کچھ مناسبت رکھتے ہیں، کچھ غور و فکر سے بھی کام لیتے ہیں، لیکن اس کا نتیجہ اہم و با اثر نہیں ہوتا"

پروفیسر سرور: "اپنی نظموں کی وجہ سے مشہور ہیں مگر ان کے انتخاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غزل بھی اچھی کہہ سکتے ہیں"۔

پروفیسر مجنوں: "خالص نظم نگار شاعر ہیں اور غزل کہکر اپنی قوت کا غلط استعمال کرتے ہیں"

ڈاکٹر تاثیر نے ان کا ذکر علحدہ نہیں کیا۔

روش اپنے فکر و احساس کے لحاظ سے غزل کہنے کی صلاحیت ضرور رکھتے ہیں، لیکن نہ انھوں نے غزل کی زبان پائی ہے اور نہ اس کا انداز بیان۔ وہ جس قسم کی فارسی ترکیبوں کے شائق، ان کو تغزل میں جگہ نہیں مل سکتی اور اسی لئے ان کی غزلیں بے کیف و بے اثر ہیں۔

امرناتھ ساحر :۔ پروفیسر کلیم الدین احمد: کہنہ مشق ہیں، لیکن کوئی خاص رنگ نہیں، خیالات بھی ناہموار ہیں"

پروفیسر سرور: "شاعری پر انھوں نے کوئی اثر نہیں چھوڑا۔ زمانہ انھیں جلد بھلا دے گا"

پروفیسر مجنوں: "متصوفانہ غزل گوئی کے روایتی تصور کے نمائندہ ہیں"

ڈاکٹر تاثیر نے ان کے کلام پر کوئی رائے نہیں دی۔

ساحر رہنے والے دہلی کے ہیں، لیکن ان کی شاعری اس زمانہ کی ہے جب لکھنؤ کا خبط عالمگیر تھا، اسی لئے ان میں دہلی کا جذبہ باقی رنگ کہیں نظر نہیں آتا اور کلام بے کیف و بے اثر ہے۔

سیماب :۔ پروفیسر کلیم الدین احمد: "محض معنی آفرینی کو شاعری سمجھتے ہیں اور بلند و لطیف احساس کی جگہ طرز ادا میں شوکت اور ادبی شان نمایاں ہے۔ مشاق ضرور ہیں، لیکن صاحب طرز نہیں اور نہ کوئی انفرادی رنگ رکھتے ہیں"

پروفیسر سرور: "کوئی آفاقی اپیچ، کوئی نیا جذبہ، کوئی نیا احساس نہیں رکھتے، مگر خوشگوار و خوش فکر ضرور ہیں، خوشنما ترکیبیں بھی ہیں، لطیف و نرم جذبات بھی مگر باوجود استاد ہونے کے کبھی اقبال اور کبھی جوش و جگر کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں"

پروفیسر مجنوں: "زمانہ کا تیور پہچان کر ساتھ چلنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن قدم ٹھیک نہیں پڑتے، کوئی انفرادی خصوصیت نہیں رکھتے۔ مشاق ہیں اور اچھے اشعار کی کافی تعداد ان کے کلام میں پائی جاتی ہے، لیکن کوئی خاص جمالیاتی بصیرت یا وجدانی تاثر نہیں ہے۔
ڈاکٹر تاثیر نے کوئی رائے نہیں دی۔

سیماب صاحب چونکہ نظم نگار اور غزل گو دونوں قسم کے شاعروں میں برابر کی جگہ لینا چاہتے ہیں، اس لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ انھیں واقعی کس صنف میں ملنا چاہئے۔ ابتدا میں انھوں نے غزل ہی کہی ہے اور عرصہ تک کہی ہے اس لئے ان کی مشاقی کی زمین تو غزل ہی ہے، گو اب اُن کا رجحان نظم کی طرف زیادہ ہے۔ سیماب ان لوگوں میں سے ہیں جو مشق و محنت اور کوشش و کاوش سے سب کچھ بن سکتے ہیں، لیکن بے اُصولی کی وجہ سے انفرادیت انھیں کسی بات میں حاصل نہیں۔ ان کی نظم اور غزل دونوں بالکل فنی چیز ہیں اور اس لئے ان میں احتیاط، رکھ رکھاؤ اور نمود و نمایش زیادہ ہے۔ ان کی نظموں میں گو جوش کی سی خشونت تو نہیں لیکن وہ نرمی بھی نہیں ہے جو ایک آفاقی شاعر کے کلام میں پائی جانا چاہئے، غزلوں میں وہ جذبات نگاری سے اکثر کام لیتے ہیں، لیکن چونکہ زبان میں لطافت و ترنم نہیں اس لئے اس کی حیثیت ایک منطقی استدلال کی سی ہو جاتی ہے۔
ان کی مشاقی و اُستادی میں شک نہیں لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ہر مشاق شاعر دلوں پر حکومت کرنے والی شاعری بھی کر سکے۔

فانی: ۔ پروفیسر کلیم الدین احمد: "حقیقی معنی میں شاعر ہیں۔ ان کے یہاں دو قسم کے اشعار ملتے ہیں، ایک غالب کے زیر اثر، دوسرے جذبات نگاری کے۔ معنی آفرینی ارادی ہے اور جذبات نگاری فطری جس میں وہ زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ فانی کے یہاں زندگی و غم مترادف ہیں، لیکن وہ غم سے گھبراتے نہیں، اس کا خیر مقدم کرتے ہیں، وہ زخم دل کی دوا نہیں چاہتے بلکہ ڈرتے ہیں کہیں وہ بھر نہ جائے۔"
پروفیسر سرور: ان کے یہاں فلسفہ، غم، تغزل، زبان سبھی کا امتزاج ہے، اس دور میں غالب کی صحیح پیروی فانی نے کی ہے یا اقبال نے، فانی کے یہاں غم اور غم کا عرفان بھی۔ وہ فلسفی نہیں، لیکن استدلال و طرز بیان فلسفیانہ ہے، وہ واردات انسانی کے کامیاب مصور ہیں اور قدیم رنگ کے برتنے والوں میں ان کا لہجہ سب سے زیادہ آفاقی ہے۔"
پروفیسر مجنوں: "ان کے یہاں سوز و گداز ہے، مرثیت نہیں۔ حکیمانہ بصیرت بھی ان کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میر و غالب کا کامیاب امتزاج ہے۔ زبان و اسلوب بیان میں پیچیدگی یا غرابت نہیں، زبان سنجیدہ، پاکیزہ و دلنشین ہے۔ محبت، موت اور تاریکی ان کے احساس کا محدود دایرہ ہے۔ اس کی شاعری غنودگی پیدا کرنے والی ہے، لیکن پُر کیف۔"
ڈاکٹر تاثیر: "فانی کی عمر ۲۲ سال کی ہے۔ مُریاسیت و متذبذب خیالی اپنی زندگی و حالات حاضرہ کے عین مطابق ہے۔ ان کے یہاں داغ و غالب ہے جو ہمارے متغزلین کی عام روش ہے۔"

فانی نے تغزل میں جو جگہ اپنے لئے پیدا کرلی تھی، وہ میر تقی کی طرح انھیں کے لئے مخصوص تھی۔ بہت لوگوں نے اس کی تقلید کرنا چاہی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ فانی کی غزلگوئی ان کے شدید و تلخ احساس کی زبان تھی جس میں کوئی دوسرا شاعر ان کا ہمسر نہ تھا۔ اُن کے بیان غم میں کوئی تیغ نہ تھی، بلکہ ایک دلدوز نشتر کی تھی جو اندر ہی اندر پیوست ہوتا چلا جاتا تھا، فانی کی اس خصوصیت کو اُن کی صاف ستھری زبان اور دلنشین انداز بیان نے بہت اُبھارا اور ان کا سارا اُن شعروں کے جن میں کھلا ہوا تصوف پایا جاتا ہے، معیاری چیز ہے۔

فراق: ۔ پروفیسر کلیم الدین احمد: "حقیقی معنی میں شاعر ہیں، نہ صرف شاعر بلکہ نقاد بھی، فراق کی خصوصیت اتحاد ضدین ہے، ان کی آواز درد... لیکن نسبت درد میں بھی وہ اپنی آواز پر کامل اختیار رکھتے ہیں ان کی شاعری تنقید حیات ہے۔"
پروفیسر سرور: "مغربی ادب کی وجہ سے ان کی شاعری میں زیادہ گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی ہے، ان کے یہاں تنقید حیات کی مسلسل کوشش ملتی ہے۔ ... امید ... ہے، ان کی شاعری نشاطی ہے ... نیکن مکمل غم پرست نہیں۔ فانی کی پختہ کاری و شگفتگی ابھی ان میں نہیں آئی ہے۔ ان کے یہاں

ہے، اجتماع ضدین بھی اور ان کی اکھڑی اکھڑی مگر منفرد زبان بھی ایک دلکشی رکھتی ہے۔

پروفیسر مجنوں : نفسیاتی پیچیدگیوں اور زندگی کے جدلیاتی پہلوؤں کی طرف بلیغ اشارات ان کی عام خصوصیت ہے۔ حیات و کائنات کے ساتھ شدید یگانگت کا احساس ہمہ رنگ ہے، ان کی شاعری میں ہم کو نرمی بھی ملتی ہے اور آفاقی تاثر بھی۔ اسلوب بیان میں ایک پختہ گھلاوٹ ہے جو بالکل ان کی اپنی چیز ہے اور نمایاں خصوصیت ان کا ہم آہنگ بھی ہے۔

ڈاکٹر تاثیر : " فراق نے معشوق سے گزر کر عاشق کو بھی شرم، احتیاط اور ضبط میں شریک کر لیا ہے، ابھی ناپختہ ہیں اور اس لئے ان میں ہضم و تحلیل کم ہے، اور ماحول کی کثرت اور زیادہ شخصی مداخلت کے بغیر اگل دیتے ہیں۔"

اپنے ہم عمر و ہمعصر شعراء میں، فراق کا مرتبہ غزل گوئی میں سب سے بلند ہے، فراق کی غزل گوئی اپنے اندر جس مستقبل کو لئے ہوئے ہے، اس میں خطرے زیادہ ہیں، کیونکہ صحیح خطوط پر قائم رہکر اس رنگ کو کامیابی کے ساتھ نبا ہنا بہت مشکل ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات مجھے خود فراق کی طرف سے بھی اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ فراق نے جس شاعری کو دنیا کے سامنے پیش کیا، وہ دنیائے تغزل میں بالکل نئی چیز ہے اور فراق ہی اس کے سنوارنے یا بگاڑنے کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ اگر اپنی کیفیات سے مغلوب ہو کر ان کی شاعری خود انگیز مایوس ہو گئی تو فراق کی زندگی ہی میں اسے ختم ہو جانا ہے، ورنہ یہ رنگ تغزل اتنا بلند و پاکیزہ ہے کہ ہم اسے ذہنی لطافت کی انتہائی حد کہہ سکتے ہیں۔

[…]فی :۔ پروفیسر کلیم الدین احمد : "خشک و بے رنگ شاعری ہے جس میں نثریت پائی جاتی ہے۔"

پروفیسر سرور : " کلام پھیکا اور بے لطف ہے"

پروفیسر مجنوں : " ان کے کلام میں کیفیت کا غلبہ کہیں نہیں ملتا جو شاعری کی اصل روح ہے۔"

ڈاکٹر تاثیر نے علٰحدہ ان کا ذکر نہیں کیا۔

[…]فی پرانے رنگ کے لکھنے والے ہیں اور ان کا یہ رنگ جدید رجحانات پیدا ہونے سے قبل ہی اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ اس پر کوئی دوسرا رنگ چڑھ نہ سکتا تھا، اس لئے ہم کو ان کی غزلوں میں کوئی چیز ایسی نہیں ملسکتی جو قابل ذکر ہو، اور نہ اس توقع کو سامنے رکھکر ان کے کلام پر تبصرہ کرنا چاہئے۔

محروم :۔ پروفیسر کلیم الدین احمد : "ان کی غزل گوئی شاعرانہ مشق سے زیادہ کچھ نہیں، آواز بلند و کرخت ہے، شیرینی کا نام نشان نہیں، بجائے شاعر کے خطیب معلوم ہوتے ہیں جوش و اصلیت کی بھی کمی ہے۔"

پروفیسر سرور : "اپنی نظموں کی وجہ سے مشہور ہیں مگر انتخاب سے معلوم ہوتا ہے کہ غزل بھی اچھی کہہ سکتے ہیں، ان کے یہاں اقبال کا اثر نمایاں ہے مگر ان کا مزاج اقبال سے بالکل مختلف ہے" —————— پروفیسر مجنوں اور ڈاکٹر تاثیر نے علٰحدہ ذکر نہیں کیا۔

میں پروفیسر سرور کی رائے سے متفق ہوں کہ محروم غزل بھی اچھی کہہ سکتے ہیں غزل کی زبان اور انداز بیان دونوں پر ان کو قدرت حاصل ہے لیکن چونکہ انھوں نے زیادہ تر نظموں کی طرف توجہ کی، اس لئے غزل گوئی میں پختگی نہ پیدا ہو سکی۔

ملّا :۔ پروفیسر کلیم الدین احمد : "غزلیت حقیقت سے زیادہ ہے، زبان میں نرمی بھی ہے اور شوخی و صفائی بھی، ابتذال و فرسودگی سے بھی پرہیز کرتے ہیں لیکن بہت مغلوب ہوئے۔"

پروفیسر سرور : "ملّا کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم لکھنویت اب لکھنؤ میں ختم ہو رہی ہے، ابھی ان کے کلام میں انوکھا پن تو نہیں آیا مگر بعض اشعار میں وہ انفرادیت بعض دلنشیں تجربات کا ثبوت ضرور دیتے ہیں۔"

پروفیسر مجنوں : " جذبات کا توازن، زبان کی سنجیدگی و سلاست ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان میں نہایت صالح قسم کا ذوق تغزل پایا جاتا ہے۔"

ڈاکٹر تاثیر : " اندرونی جذبات کے اظہار میں منفعلانہ انداز رکھتے ہیں لیکن حقائق حیات کے متعلق کھلم کھلا بغاوت کا اعلان کرتے ہیں، ابھی ناپختہ ہیں۔"

ملّا کے تغزل میں ذہانت کا عنصر غالب ہے اور اسی لئے ان کا انداز بیان ہم کو انوکھا سا نظر آتا ہے، وہ سامنے کے مضامین کو بھی نئے انداز سے ظاہر کرتے ہیں لیکن اس میں ہلکی سی خشونت بھی پائی جاتی ہے اور تھوڑا سا (Patronizing effect) بھی۔ اس لئے نرمی و حلاوت جو غزل کی جان ہے، ان کے یہاں کم ہے۔

ناطق گلاؤٹھوی :۔ پروفیسر کلیم الدین احمد : " ان کے کلام میں کوئی خاص بات نہیں"

پروفیسر سرور : " پرانے لکھنے والے ہیں اور مشاق ہیں" —————— پروفیسر مجنوں اور ڈاکٹر تاثیر نے علٰحدہ ذکر نہیں کیا۔

ناطق گلاؤٹھوی، داغ اسکول کے شاعر ہیں اور انھیں شعراء میں سے ہیں، جن کو اب نئے شاعروں کے لئے جگہ خالی کر کے خاموش ہو جانا چاہئے۔

پس گفتار

جدید اردو غزل ۱۹۴۰ء سے ۱۹۸۵ء تک

(عابد رضا بیدار)

غزل کے ایک متوالے (رشید احمد صدیقی) کی زبان سے غزل کی مدح میں جو یہ نثری شعر سرزد ہوئے ہیں اس مجموعۂ نقدِ غزل کے لیے اس سے بہتر دیباچہ شاید اور کہیں نہ ملے :-

○ غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں - ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے -

○ غزل فن ہی نہیں فسوں بھی ہے : شاعری ہی نہیں تہذیب بھی ؛ وہ تہذیب جو دوسری تہذیبوں کی نفی نہیں کرتی بلکہ ان کی تصدیق بھی کرتی ہے، کبھی کبھی تنقیہ و تزکیہ بھی ! ہندستان نے اردو کے آئینہ میں پہلی بار جمہوریت کی تصویر دیکھی -

○ غزل کی اہمیت کا انحصار اب اس پر نہیں ہے کہ کبھی اس میں عشق و شباب کی باتیں کی جاتی تھیں یا اس کے وسیلے سے عورتوں سے گفتگو کی گئی یا کی جاتی ہے - اس کا احترام اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس سے گفتگو کرنی آجاتی ہے -

○ غزل میں ہمارے یہاں بے راہ روی ملتی ہے، ہر طرح کی بے راہ روی اور بچھڑ کے بلاوہ روی ! یہ غزل کا قصور نہیں ہے - یہ اس راہ رو کا قصور ہے جو اپنی کم ہمتی یا کم ظرفی سے رہ گزر کے قریب کو منزلِ مقصود سمجھ لیتا ہے - ادنیٰ درجے کے لوگوں نے زندگی کی بڑی قدروں کی اس طرح بے حرمتی کی ہے !

○ غزل کی مہم میں جبری بھرتی ممنوع ہے ؛ پروپیگنڈا بھی نہیں کر سکتے - بہ الفاظ دیگر غزل کے صحیفہ میں دو غزلہ، سہ غزلہ، شعبدہ بینتر ے، اوباشی، نعرہ زنی، تو بہ استغفار ممنوع ہے - 'ستارہ می شکنند آفتاب می سازند' کا عمل شراب سے کہیں زیادہ غزل کے ہر شعر پر کرنا پڑتا ہے - غزل صنفِ سخن ہی نہیں معیارِ سخن بھی ہے !

○ غزل میں اس کی آزادی ہے کہ آپ جو بحر، ردیف، قافیہ، مواد، موضوع، لب و لہجہ چاہیں اختیار کریں جیسا کہ بیشتر شعرا کرتے آئے ہیں۔ البتہ وہ اس نکتہ سے بے خبر رہے کہ جہاں آزادی دی جاتی ہے وہاں پابندی خود بخود عائد ہو جاتی ہے، جس کو نظر انداز کرنے سے شاعر اور اس کا کلام دونوں پایۂ اعتبار سے گر جاتے ہیں... شاعر کو اپنی ذہنی کیفیت کے مطابق بحر اختیار کرنی پڑتی ہے۔ ردیف اور قافیہ کی ظاہری اور معنوی رعایت کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ زبان اور لہجہ کیا ہوگا، کس طرف کس حد تک بڑھ سکتے ہیں، بات کتنی ظاہر کی جائے گی، کتنی چھپائی جائے گی، کہاں پردے سے بے پردگی اور کہاں بے پردگی سے پردہ متصور ہوگا، بحر فن، ذوق اور زبان کی تمام خوبیوں کا اظہار، غرض بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست۔ ان تمام پابندیوں سے وہی شاعر عہدہ برآ ہو سکتا ہے جو شاعری اور شرافت کے تقاضوں کا احترام کرنا جانتا ہو!

○ اردو نثر و نظم دونوں کا اسلوب اور لہجہ متعین کرنے میں اردو غزل کا بہت بڑا حصہ ہے۔

○ غزل کا ایک قابل لحاظ وصف یہ بھی ہے کہ ہم اس کے مطالعہ سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ متاثر، مسرور، مستفید ہوتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ جو باتیں دوسرے اصناف سخن میں زیادہ پھیلی ہوئی ہیں غزل میں ان کا خلاصہ یا مرکزی تصور ایک کلیہ کی صورت میں ایک ہی مصرع یا شعر میں ہمارے سامنے آجاتا ہے اور چونکہ غزل کے اشعار منفرد ہوتے ہیں اس لیے ہر شعر میں نئی بات نئے انداز سے نئے موقع و محل میں کہی ہوئی مل جاتی ہے اور مطالعہ میں تکان نہیں محسوس ہوتا۔ چنانچہ غزل کے جو عیوب بتائے جاتے ہیں اگر در پردہ غزل کے ہنر بھی ہوں تو کیا عجب! ذوق سلیم ساتھ دے تو اس نکتے یا لطیفے کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ایک مربوط نظم کی اہمیت کو پورے طور پر تسلیم کرتے ہوئے غزل کی اس طرفہ ماجرائی کو کیا کہیں گے کہ وہ غزل ہوتے ہوئے ایک طور پر متعدد مربوط نظموں کا مجموعہ ہوتی ہے!

○ اردو غزل کی مقبولیت میں جہاں اور باتیں معین ہوئی ہیں وہاں غزل کی صحیح، سلیس، شیریں، شستہ اور شائستہ زبان بھی ہے۔

○ اردو ہندوستان کی مشترک اور صحت مند تہذیب کی کیسی معتبر اور دلکش علامت ہے اور اس نے اس تہذیب کو کس درجہ محکم اور بارآور کیا، اس حدیث دلکش پر گفتگو کا یہ محل نہیں۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ زبان ہو کہ ادب ہو، تہذیب و معاشرت ہو، ان کی توانا اور صحت مند صلاحیتوں اور امکانات کو ان کی تقدیر سے ہمکنار کرنے میں اردو کا بہت بڑا دخل رہا ہے! اور اردو کو ہندوستان گیر بنایا غزل نے!!

○ شاعری کا منصب یافن خوب کو خوب تر بنانا بھی ہے، دکھانا بھی ہے، ________ اور کوئی شاعر اس منصب کا اہل نہیں اگر وہ عظیم سے واقف ہو اور حقیر پر اکتفا کرے! دوسرا سبب اس کی مقبولیت کا یہ ہے کہ اچھی اور اعلیٰ غزل کے پیالے میں جذبات یا فکر کی صہبا ہوتی ہے، وہ دو آتشہ سہ آتشہ سے بھی زیادہ آتشہ ہوتی ہے یہ جہاں آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے اس صہبا کا طبائع پر کیا اثر ہوتا ہوگا۔

○ غزل نے ہر موقع کے لیے برمحل اشعار اس کثرت سے فراہم کردیے ہیں کہ ان کا بے اختیار زبان پر آتے رہنا تعجب کی بات نہیں۔ غزل ضرب الامثال کی دارالضرب ہوتی ہے۔

○ غزل کو مقبول عام بنانے میں مشاعرے، رزم و بزم کی محفلیں، تحریر و تقریر میں برمحل اشعار کا استعمال اور اس طرح کی دوسری تقریبیں بھی بہت زیادہ معین رہی ہیں۔ غالباً کسی اور معاشرے میں اچھے اشعار کی اتنی زبردست طلب محسوس نہ کی جاتی ہوگی جتنی اردو سماج میں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ہماری زبان میں متنوع اور متفرق اشعار کی کثرت ہو۔ یہ مطالبہ صرف غزل پورا کرسکتی تھی اور کرتی رہی ہے۔

○ گانے کے لیے اردو غزل سے زیادہ کوئی صنف کلام ہے تو ہوسکتی ہے، اس لیے کہ غزل کا ہر شعر نو بہ نو احوال و کوائف کا مکمل اظہار کرتا ہے اور مختصر سے مختصر مدت میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو متاثر و محظوظ کرسکتا ہے۔

○ غزل کہنے میں سہولت یہ ہے، اور اتنی ہی دقت بھی، کہ جو بات کہنی ہوتی ہے مختصر سے مختصر الفاظ میں جلد سے جلد کہہ کر ختم کردی جاتی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ غزل کا شعر بڑے سے بڑے پیمانے پر بیان کرتے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹے پیمانے پر مرصع و مکمل کرتے ہیں۔ غزل میں داستان نہیں سناتے، تاثر دکھاتے یا تجربہ بیان کرتے ہیں... غزل میں ہر شعر مختصر ترین اور ساتھ ہی مکمل ترین افسانہ ہوتا ہے، اب زندگی کی مصروفیتیں اور مطالبات اتنے سریع اور شدید اور اتنے زیادہ ہوگئے ہیں کہ طویل رزمیہ یا بزمیہ لکھنا ناممکن ہوگیا ہے۔

○ غزل کی اہمیت و مقبولیت کا یہ پہلو قابل لحاظ ہے کہ مرور ایام سے دوسرے اصناف کلام سے کہیں زیادہ غزل کا معیار بدلتا اور بلند ہوتا رہا ہے، یہاں تک کہ کچھ دن پہلے کے اکثر اچھے غزل گو اور ان کا کلام اب زیادہ قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا... اب غزل میں ذہن اور ذوق دونوں کی آسودگی کا مطالبہ کیا جانے لگا ہے۔

اور غزل اس کو اس طور پر پورا کر رہی ہے جیسے وہ اس کی نوع و بنیاد کا تقاضا ہو... کسی اور صنفِ سخن پر اردو والوں کا اتنا سخت اور متواتر احتساب نہیں رہا جتنا غزل پر۔ یہ اسی نگہداشت کا تصرف ہے کہ غزل میں کہنگی راہ نہ پا سکی۔ جس صنفِ سخن پر اردو سماج کی ایسی کڑی نظر ہو وہ اور اس کے شاعر کبھی معیار سے پست نہیں ہو سکتے۔

ذوق سے آگے بڑھ کے ذہن کی آسودگی کی جو بات رشید صاحب نے اپنے آخری شعر میں کہی ہے اسی میں اردو غزل کی عہد بہ عہد کی تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے ــــ پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
جو اس شور سے میر روتا رہے گا ــــ تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
یہ لوگ بھی غضب کے ہیں دل پر یہ اختیار ــــ شب موم کر لیا سحر آہن بنا لیا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام ــــ آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا
امیر زادوں سے دلی کے مت ملا کر میر ــــ کہ ہم غریب ہوئے ہیں انھیں کی دولت سے

میر (م ۱۸۱۰ء) کے ان پانچ شعروں میں پانچ واضح ارتقائی سطحیں ملتی ہیں، تاہم گفتار راست ہے کوئی اینچ پینچ، گہرا سوچ بچار کرنے اور کرانے کا جتن، اور اپنے سے الجھنے اور دوسرے کو مزید الجھانے کا کوئی جوکھم نہیں ملتا۔ یہ اٹھارویں صدی عیسوی کی بات تھی۔ انیسویں صدی میں وہ بہت کچھ آگیا جو اس سے پہلے ناپید تھا، ڈاک، تار، ریل کی محسوس علامات کے پیچھے دو تہذیبوں کے ٹکراؤ میں نئی تہذیب کی فتحمندی کا آغاز اور اس کے جلو میں خیالات و افکار کی ایک دنیا! اردو غزل نے بڑھتے ہوئے ذہن کے ساتھ ایک چھلانگ لگائی:

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا ــــ واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں
رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو ــــ ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب ــــ اک آبلہ پا وادیِ پُرخار میں آوے
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ ــــ رہنے دے ابھی یاں کہ مجھے کام بہت ہے
ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا ــــ ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

غالب (م ۱۸۶۹ء) کے ان پانچ اشعار میں پانچ مختلف سطحیں ابھرتی ہیں واضح ہیں اور یہ بات واضح ہے کہ شاعر سوچ سوچ کے بات کر رہا ہے مگر سانچوں میں توڑ پھوڑ بالکل نہیں ہے۔

یہ توڑ پھوڑ انیسویں صدی کے آخری ربع میں شروع ہو گئی (جب ہندستان کی پرانی دنیا ختم ہو کے نئی دنیا کو جانشینی بخش چکی) مذہبی، تہذیبی، تعلیمی، معاشرتی اور دوسری سطحوں پر سر سید کی قیادت میں علی گڑھ تحریک جو فکری انقلاب برپا کر رہی تھی ادب اور خصوصاً غزل کو اس کا نقیب حالی کی صورت میں مل رہا تھا۔ حالی کے ہاتھوں اردو غزل کا جو نیا سانچہ ڈھلا اس سے اردو غزل کے ایک صدی آگے تک کے امکانات سامنے آ گئے:

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش عشق ——— رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

بلبل و قمری میں یہ جھگڑا کہ وطن کس کا ہے ——— کل بتا دے گی خزاں آ کے چمن کس کا ہے

گھبرا گئے ہیں بیدلی ہمرہاں سے ہم ——— اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم

روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا ——— دیکھا ہے ہم نے برسوں لطف و کرم تمھارا

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی ——— بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

غزل کو اتنی وسعت دی جا سکتی ہے کہ اس میں ساتھیوں کی بیدلی سے لیکر وطن کی تباہی تک سب کچھ بیان کیا جا سکے، حالی (م ۱۹۱۴ء) نے یہ اندازہ کرا دیا۔ لیکن غزل کے اسلوب اور اس کی لفظیات کا احترام اب بھی ملحوظ تھا کہ اقبال (م ۱۹۳۸ء) نے غزل پر شبخون مارا اور راتوں رات اس کی لفظیات، اس کا آہنگ، اس کا دروبست سب بدل کر رکھ دیا۔

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا ——— میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک ——— جس کو آواز رحیل کارواں سمجھا تھا میں

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا ——— زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر ——— تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق ——— عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

کلاسیکی غزل واضح طور سے پہلی بار اپنی ڈگر بدل رہی تھی۔ لیکن یہ نیا سانچہ صرف اقبال سے مخصوص رہا اور انہی پر ختم ہو گیا۔

اگلا دھماکا یگانہ (م ۱۹۵۶ء) نے کیا۔

ارے کیسی سزا کہاں کی سزا — بچکچاتا تو کام کیا کرتا

مشکل تو اک دن آسان ہوگی — یہ کون جانے دم پر بنی کیا

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے — اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے — وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

چلے چلو جہاں لے جائے ولولہ دل کا — دلیل راہ محبت ہے فیصلہ دل کا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائیگا — مجھے سر مار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا

جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہو — کس قدر واعظ مکار ڈراتا ہے مجھے

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا — چال سے تو ظالم کی سادگی برستی ہے

مزاج آپ کا دنیا سے کچھ کشیدہ سہی — فریب کھاؤ گے پھر بھی، فریب دیدہ سہی

خدا کی بات خدا جانے، کوئی کیا جانے — بڑھاپے میں نے بھی قرآن چیدہ چیدہ سہی

ہوا جو بگڑی تو ٹھنڈا ہی کر کے چھوڑے گی — ہزار شعلہ بیباک سرکشیدہ سہی

مری نظر کی خطا ہوگی یا گلوں کی خطا — تمہارے راج میں کانٹے ہی برگزیدہ سہی

نکل ہی جاتا ہے مطلب تری قسم کھا کر — تو بندگان ضرورت کا آفریدہ سہی

اگلا شدید تر دھاکا شاد عارفی (م ۱۹۶۴ء) کے ہاتھوں ہوا۔ شاد عارفی نے (یگانہ کے ساتھ مل کر) جدید غزل کے ایوان کے نقش و نگار واضح طور سے ابھار دیے۔ (اب غزل جدید میں ڈھلنے کے لئے پوری طرح آمادہ ہو چکی تھی):

ہے تو احمق چونکہ عالیشان کاشانے میں ہے — اس لئے جھک مارنا بھی اس کا فرمانے میں ہے

تمہیں جس حال میں سجدہ کیا ہے — اسے اللہ بہتر جانتا ہے

یہاں چراغ تلے لوٹ ہے اندھیرا ہے — کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں

جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی — چوم لوں منہ آپ کی تلوار کا

چھا گیا ہو جیسے رعب اقتدار برہمن — شیخ کو کس درجہ دلچسپی صنم خانے میں ہے

[illegible]ضعیف العمر ہے لیکن اس کے شعر جواں ہوتے ہیں — ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں

[illegible] نہیں کہہ سکتا کانٹے بھی پامال خزاں ہوتے ہیں — ان کے نام و نشاں مٹتے ہیں جن کے نام و نشاں ہوتے ہیں

کیا تھی کیوں تھا یہ مت سوچو کیا ہے اس پر غور کرو ۔۔۔ شاخوں پر آنے سے پہلے ہوں گے پھول جہاں بکتے ہیں
چند بڑے لوگوں سے مل کر میں نے یہ محسوس کیا ہے ۔۔۔ اپنی بابت نااہلوں کو کیا دلچسپ گماں ہوتے ہیں

یگانہ اور شاد کے عہد میں اور لوگ بھی استادوں کا ایسے شعر کہہ جاتے تھے جن پر آنے والے دور کی پرچھائیاں پڑتی لگتی تھیں۔ مثلاً

قابل اجمیری

رکا رکا سا تبسم، جھکی جھکی سی نظر ___ تمہیں سلیقۂ بیگانگی کہاں ہے ابھی
راستہ ہے کہ کٹتا جاتا ہے ۔۔۔ فاصلہ ہے کہ کم نہیں ہوتا
وقت کرتا ہے پرورش برسوں ۔۔۔ حادثہ ایکدم نہیں ہوتا
_____
آداب تری بزم کے جینے نہیں دیتے ۔۔۔ دیوانوں کو جینے کی تمنا تو بڑی ہے
دل رسم و رہِ شوق سے مانوس تو ہو لے ۔۔۔ تکمیل تمنا کے لئے عمر پڑی ہے

حمید امجد

جب اک چراغ راہ گزر کی کرن پڑے ۔۔۔ ہونٹوں کی لو لطیف حجابوں سے چھن پڑے
یکسر حسین دیار کی ٹھنڈی ہوا چلی ۔۔۔ ہر موجۂ خیال پہ صد ہا شکن پڑے
اک پل بھی کنج دل میں نہ ٹھہرا وہ رہ نورد ۔۔۔ اب جس کے نقش پا میں چمن در چمن پڑے
اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ ___ میں اپنی زندگی انہیں دیدوں جو بن پڑے
میں جب ادھر سے گزرتا ہوں کون دیکھتا ہے ۔۔۔ میں جب ادھر سے نہ گزروں گا، کون دیکھے گا

جاذب صدیقی

زندگی دل کا سکوں چاہتی ہے ___ رونق شہر سیا کیا دیکھیں
ہر ایک آدمی اڑتا ہوا بگولا تھا ۔۔۔ تمہارے شہر میں ہم کس سے گفتگو کرتے

ذوالفقار بخاری

بیشتر خدا پایا اور پیر ملا پایا ___ ہم نے تیرے بندوں کو تجھ سے بھی سوا پایا
مہر و ماہ و انجم کی بے نیازیاں تو یہ ۔۔۔ دوست ہو کہ دشمن ہو آدمی غنیمت ہے

فرق ہے رات رات میں پیارے ـــــ رات کس کی بسر نہیں ہوتی

غیب کی ودیعت عشق، عشق کی عنایت غم
غم ہزار نعمت ہے کوئی غم کو کیا جانے

بزم میں تو ہم دونوں اجنبی سے رہتے ہیں
کوئی تم کو کیا جانے کوئی ہم کو کیا جانے

نشور واحدی

تاریخ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں
اک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا

جمیل مظہری

یہ میری آگ یوں کجلا نہ جاتی میرے سینے میں ـــــ اگر میں آگ کو بھی تاپنے والے مے ہوتے

موت طاری ہوئی ہر شوق پہ رفتہ رفتہ ـــــ تجھ پہ مرنے کے جو ارمان تھے وہ بھی نہ جیے

دیر میں وہ حرم میں نہ، عرش پہ وہ زمیں پہ وہ ـــــ جس کی پہنچ جہاں تلک، اس کے لئے وہیں پہ وہ

آذری بھی حیراں ہے اس صنم تراشی پر ـــــ سو بتوں کو جوڑا ہے اک خدا بنایا ہے

وہیں تک خودی ہے وہیں سے خدا ہے ـــــ جہاں بیکسی ڈھونڈتی ہے سہارا

حرم کو بھی بتکدہ سمجھتا ہے دوسری منزل ارتقا کی ـــــ وہ پہلا زینہ شعور کا تھا کہ بتکدے کو حرم بنایا

اجتبیٰ رضوی

جو ساری پونجی ہار چلا وہ عشق کی بازی ہار چلا ـــــ اس کھیل کی ریت انوکھی ہے یاں تم ہو وہی جو کھوتے ہیں

تہمت کعبہ آپ نے لی بدنام کلیسا آپ ہوئے ـــــ طور پہ تجلی قصوں میں شیریں نجد میں لیلیٰ آپ ہوئے

فتنے جگا کے دہر میں، آگ لگا کے شہر میں
جل کے الگ کھڑے ہوئے کہنے لگے کہ ہم نہیں

ہری چند اختر

نوید سربلندی دی منجّم نے تو میں سمجھا
سگانِ دہر کے آگے دوتا ہونے کا وقت آیا

حفیظ ہوشیارپوری

تو نے اسے تعبیر کیا عشق سے ورنہ ـــــ کس کے لیے اے دوست پریشاں نہ ہوئے ہم

آبادیٔ دل کی ہے فقط ایک ہی صورت ـــــ بربادیٔ دل کے لیے سامان ہزاروں

نہ اب وہ ذوقِ طلب ہے نہ اب وہ عزمِ سفر ـــــ رواں ہے قافلہ تسکین راہبر کے لیے

تمام عمر ترا انتظار ہم نے کیا
اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا

محشر بدایونی

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ — جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائیگا

شاہد عشقی

اک زمانے کو رکھا تیرے تعلق سے عزیز — سلسلہ دل کا بہت دور تلک جاتا ہے

ضیا جالندھری

میں کہاں پہنچا کر ہر بت سے پوجا میں نے — ہے شکستہ سر خاک اور میں شکستہ تر ہوں

○

یگانہ اور شاد عارفی میں شاعرانہ عمر کا جو فرق تھا، شاد اور احمد ندیم قاسمی میں بھی قریب قریب اتنا ہی فرق رہا ہوگا۔ اردو غزل کی اس نئی روایت کو آگے بڑھانے میں اگلا بڑا رول ندیم کا ہے۔ ندیم کی اہمیت یہ ہے کہ بہتوں کے لیے یگانہ و شاد کی مانند وہ خاموش انسپریشن بنتے گئے! لیکن بہت سے دوسروں کے لیئے جو اس خاموش انسپریشن کے اہل نہ تھے، وہ ایک تحریک میں ڈھلتے چلے گئے، ایسی تحریک جو غزل کو ایک بہتر ڈگر پر ڈالتی تھی، اور فیشن اور فضول گوئی سے باز بھی رکھتی تھی۔ جس میں ان کے لہجوں وسیع المشربی بھی اور عالی حوصلگی!

ندیم کے ساتھ ساتھ فیض کی آواز بھی ابھر کر آہستہ روی مگر بڑی مضبوطی کے ساتھ نئے اردو شعر کی سب سے گراں ارز آواز بن چکی تھی۔ اقبال کے بعد کسی ایک شاعر کا پوری پہچان کے ساتھ نام لیا جا سکتا تھا تو وہ فیض ہی تھے:

ہوئی ہے حضرت ناصح سے گفتگو جس شب — وہ شب ضرور سر کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا — وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

جنھیں خبر تھی کہ شرط نوا گری کیا ہے — وہ خوش نوا گلۂ قید و بند کیا کرتے

محتسب کی خیر اونچا ہے اسی کے فیض سے — رند کا، ساقی کا، خم کا، مے کا پیمانے کا نام

دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی ___ بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے ___ مقام ہے اب کوئی نہ منزل فرازِ دار و رسن سے پہلے

آخرِ شب کے ہمسفر فیض نہ جانے کیا ہوئے ___ رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

مشکل ہیں اگر حالات وہاں دل بیچ آئیں جاں دے آئیں ___ دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں ___ ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے ___ ناصحو، پندگرو، راہ گزر تو دیکھو

پیمانِ جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک ___ دل والو گریباں کا پتا کیوں نہیں دیتے

تری کج ادائی سے ہار کر شبِ انتظار چلی گئی ___ مرے ضبطِ حال سے روٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے ___ رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

ہم ایسے سادہ دلوں کی نیاز مندی سے ___ بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیاں کیا کیا

ہمیں سے اپنی صدا ہمکلام ہوتی رہی — یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی
مقابلِ صفِ اعدا جسے کیا آغاز — وہ جنگ اپنے ہی دل میں تمام ہوتی رہی

فیض کے یہ شعر بڑے خوبصورت شعر ہیں لیکن اس میں خیال بھی محدود ہے اور اندازِ سخن میں بھی نہ پھیلاؤ کا کوئی امکان ہے نہ تقلید کا ——— اور ایسی تقلید کا تو مطلب نہیں جس سے اجتہاد کے سوتے پھوٹتے ہوں۔ تقلید ہوئی ضرور، سردار جعفری کی متعدد غزلیں اور تاباں کی غزلیں جو ان لوگوں نے غزل کی طرف 'واپسی' کے بعد کہیں اکتسابِ فیض کی چغلی کھاتی ہیں لیکن بات آگے نہیں بڑھ سکی۔ ایک شاعر نے البتہ اس رنگ کو اس خوبصورتی سے اپنایا تھا کہ وہ اسے بہت کچھ نکھار دیتا مگر وہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ مرحوم عرشی بھوپالی کی ۱۹۵۳ء کی یہ غزل فیض کے رنگ میں فیض سے زیادہ خوبصورت غزل ہے:

تختۂ دار محبت کی سزا ٹھہری ہے — جان لینا مرے قاتل کی ادا ٹھہری ہے
ساتھیو کب مرے گلشن کی کھلیں گی کلیاں — کچھ بتاؤ تو کہاں بادِ صبا ٹھہری ہے
راہ دشوار، سحر دور، گھنی شب لیکن — قافلے ٹھہرے نہ قدموں کی صدا ٹھہری ہے
رنگِ گل کا ہے سلیقہ، نہ بہاروں کا شعور — ہائے کن ہاتھوں میں تقدیرِ حنا ٹھہری ہے
میکشو ٹوٹ پڑو چھین لو ساقی سے ایاغ — کب سے میخانے پہ رنگین گھٹا ٹھہری ہے

رازِ صیاد کیا سارے چمن نے افشا — کیا قیامت ہے کہ بلبل کی خطا ٹھہری ہے
کتنے جانباز ہیں حق گوئی کے مجرم لیکن — قابلِ دار فقط تیری انا ٹھہری ہے

یہ مقصد زدہ غزل، جو فیض کے ساتھ اور بھی اسی درجہ کے شاعر کہہ رہے تھے، بڑی خوبصورت لگتی تھی، مدت تک باقی رہنے والے شعر اس میں تخلیق ہو رہے تھے:

مخدوم کا یہ شعر: منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے — اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا آخرِ شب

یا جذبی کے یہ شعر: ان بجلیوں کی چشمک باہم تو دیکھ لیں — جن بجلیوں سے اپنا نشیمن قریب ہے
تاریکیاں اور بھی تاریک ہو گئیں — اب آ لگا ہے مہرِ درخشاں قریب ہے

شریکِ محفلِ دار و رسن کچھ اور بھی ہیں — ستمگرو ابھی اہلِ کفن کچھ اور بھی ہیں
ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار — ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

دانائے غم نہ محرمِ رازِ حیات ہم — دھڑکا رہے ہیں پھر بھی دلِ کائنات ہم

دل اگر دل ہے تو جس راہ پہ لے جائے گا — خود منزلوں کی وہی راہ گزر بھی ہو گی

عجب تضاد تھا اس شاعری میں اور اس عہد میں، ان کے حسن شناسوں کو یہ شاعری غالباً شاعری بھی لگتی تھی اور یہ غیر شاعری بھی کہ فیض کے شعر کی طرح یہ بھی امکانات سے خالی تھی!

زندگی کی رنگا رنگی اور بھرپور توانائیوں کے ساتھ سارے تجربوں اور احساسات کے ساتھ فکر اور جذبے کے ہر پہلو کی عکاسی کرتے ہوئے غزل کے شعر جس سرچشمہ سے فیضان حاصل کر سکتے تھے اور کر رہے تھے وہ نہ اقبال تھا، نہ فیض نہ فراق؛ وہ تو یگانہ اور شاد عارفی کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے احمد ندیم قاسمی اور ان کا قبیلہ تھا۔ احمد ندیم قاسمی کے یہ شعر، دیکھئے تو فیض، مخدوم جذبی سب ان سب سے کتنے مختلف، اور ہزار شیوہ زندگی سے کتنے قریب ہیں:

احمد ندیم قاسمی

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا — میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا
دشمن بھی جو چاہے تو مری چھاؤں میں بیٹھے — میں ایک گھنا پیڑ سرِ راہگزر ہوں
اک ہمیں کو نہ تجھے اپنا بنانا آیا — انجمن تیری ہے، مے تیری ہے، ساغر تیرے

گو مرے دل کے زخم ذاتی ہیں ان کی ٹیسیں تو کائناتی ہیں

آدمی کشمکش حیات کا دولہا وقت کی گردشیں براتی ہیں

خلا کے کام جو آئے خدا بنائے گئے میں سوچتا ہوں کہ انسان ہی کے کام آؤں

ہمہ استعداد ہے تاروں کا جمال صبح کا نور ہے تاروں کا کفن

میں کب سے گوش برآواز ہوں پکارو بھی زمیں پر یہ ستارے کبھی اتارو بھی

یہ کائنات ازل سے سپرد انسان ہے مگر ندیم تم اس بوجھ کو سہارو بھی

ابتلا ابتدا سے ذوق عمل یعنی طوفاں اٹھا تو ناؤ چلی

عروس زندگانی کا سویمبر رچنے والا ہے سنگار حسن مشیت کی کماں لچکانے آئے ہیں

چاند جب دور افق میں ڈوبا تیرے لہجے کا تھکن یاد آئی

سو بچا لائے ہو لیکن یہ زیاں تو دیکھو کتنا ویران ہے تاحد نظر منظر دار

ہر لفظ میں ماضی کے کئی گیت گندھے ہیں تاریخ کی اک گونج ہے گویائی ہماری

جو پھول کھلا اس میں گھلا خون ہمارا جو جام بجا اس میں کھنک آئی ہماری

صبح ہوتے ہی نکل آتے ہیں بازار میں لوگ گٹھریاں سر پہ اٹھائے ہوئے ایمانوں کی

نارسائی کی قسم اتنا سمجھ میں آیا حسن جب ہاتھ نہ آیا تو خدا کہلایا

ہم گونج ہیں سازِ ارتقا کی گونجیں گے ابھی زماں زماں ہم

وہ دھندلکا جسے سب حد نظر کہتے ہیں اب تو انسان کی ہے راہ گزر کہتے ہیں

جانے کیوں اب شب ہجراں پہ بھی پیار آتا ہے تیرا غم میری محبت کو بہا لے آیا

آدم کی سلگتی ہوئی تاریخ رقم ہے جبریل کے شہپر سے مرے دامن ترنگ

اے خدا اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے تو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

فرار کا یہ نیا روپ ہے اگر ہم لوگ چراغ توڑ کے نور قمر کا ذکر کریں

برسوں سے تری طرف رواں ہوں ہمت ہے تو انتظار کر لے

ہر لمحہ اگر گریز پا ہے تو کیوں مرے دل میں بس گیا ہے

کچھ کھیل نہیں ہے عشق کرنا یہ زندگی بھر کا رتجگا ہے

تیرے آگے جو کھڑا ہوں تو کرم ہے تیرا مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

ہم تجھ سے بچھڑ کے جب بھی اٹھے — جیسے ترے حضور آ گئے ہیں
یکساں ہیں فراق و وصل دونوں — یہ مرحلے ایک سے کڑے ہیں
پا کر بھی تو نیند اڑ گئی تھی — کھو کر بھی تو رت جگے ملے ہیں

آئی ارزاں تو نہ تھی درد کی دولت پہلے — جس طرف جائیے زخموں کے لگے ہیں بازار
عمر بھر جلنے کا اتنا تو صلہ پائیں گے ہم — بجھتے بجھتے، چند شمعیں تو جلا جائیں گے ہم

آپ سے جھک کے جو ملتا ہوگا — اس کا قد آپ سے اونچا ہوگا
جس بھی فنکار کا شہکار ہو تم — اس نے برسوں تمہیں سوچا ہوگا
ساری دنیا ہمیں پہچانتی ہے — کوئی ہم سا بھی نہ تنہا ہوگا

ندیم جو بھی ملاقات تھی ادھوری تھی — کہ ایک چہرے کے پیچھے ہزار چہرے تھے
مسکرا دے جو اس عالم میں — بخدا مجھ کو خدا لگتا ہے

○

ان اشعار میں راست انداز بھی ہے، آڑا ترچھا بھی! راست کم آڑا ترچھا زیادہ۔

نئی حسیت اپنے تاری کے بالیدہ ذہن پر زیادہ اعتبار کرتی ہے۔ راست انداز بیان کے بجائے آڑے ترچھے کچھ کہہ کر نکل جاتی ہے۔ کچھ یہ بھی ہے کہ تجربہ اب اتنا سادہ نہیں رہا کہ دو اور دو چار میں سمٹ جائے۔ فکر اور جذبے کی اتنی سمتیں ہیں جتنے انسان؛ اور انسان کے اندر خود اتنی دنیائیں آباد ہیں کہ ان کا اپنا ہی کوئی اور چھور نہیں۔ تجربہ کی اس بے نہایتی نے غزل کی روایتی لفظیات کی ہیئت ہی بدل کے رکھ دی ہے۔

ان اشعار میں راست انداز بھی ہے اور آڑا ترچھا بھی۔ اور جب میں جدید ترین اردو شاعری کے کچھ نمائندہ اشعار آپ کو سناؤں گا، تو احمد ندیم کو سن لینے کے بعد اب آپ ان اشعار سے نہ بدکیں گے نہ اجنبیت محسوس کریں گے، بلکہ بڑی رسانیت سے ان کی گرفت میں آتے چلے جائیں گے۔

پہلے ایسے چند غزل گویوں کو سنیں جو ندیم کے معاصر ہیں:

<u>مختار صدیقی</u>

میں تو بر دھوپ میں سایوں کا رہا ہوں جویا — مجھ سے لکھوائی سرابوں کی کہانی تم نے
کیا کیا پکاریں سسکتی دیکھیں، لفظوں کے زندانوں میں — چُپ ہی کی تلقین کرے ہے غیرت مند ضمیر ہمیں

شیر افضل جعفری

اس کو اپنی ذات خدا کی ذات لگی ہے — میرے دل کو پاگل کی یہ بات لگی ہے

میں انساں کو موت کا دولہا کہہ دیتا ہوں — مجھ کو ماتم کی ٹوٹی بارات لگی ہے

بجلیاں پی کے جو اڑ جاتے ہیں — وہ قیامت سے بھی لڑ جاتے ہیں

قلب انساں کی جواں طاقت سے — آگ پر آبلے پڑ جاتے ہیں

سید ضمیر جعفری

زندگی تیرے تقاضے اگر آساں ہوتے — کتنے آباد جزیرے ہیں جو ویراں ہوتے

شعلوں کی گفتگو میں صبا کے خرام میں — آواز دے رہا ہے کوئی ہمسفر مجھے

تنگئے تن سے کاٹی ہم نے قہر دوپہر خزاں کی — ہم لفظوں میں رونے والے دھو گئے گرد جہاں کی

رات اندھیری ہے تنک لیکن اسکو کچھ اجلاؤ — جس جس طاق چراغ جلے ہیں انکی لو الکساؤ

خورشید الاسلام

دیکھا انہیں قریب سے ہم نے تو رو دیے — جن بستیوں کو آگ لگانے چلے تھے ہم

کچھ تو ہو جس کے فیض سے دل کو ہو تاب و تب بہم — کوئی خیال، کوئی خواب، کوئی خدا، کوئی صنم

یہ کیفیت ہے زتاد طوالت سے کچھ آگے — کہ دل ہے خلد تماشا دماغ سوز جحیم

جنہ سے دلِ مایوس میں گرمی کی رمق تھی — وہ لوگ بھی جب دل سے اتر جائیں تو کیا ہو

قہر یزید و قہر خدا، سب کو مرحبا — ہم کو تو اپنا شوق شہادت عزیز ہے

میں آپ گم رہا قامت سے اپنی ساری عمر — کسی کی ہستی کو میری کمی سے کب دیکھا

خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ جاں نثار اختر کی نئی غزل ہے۔ یہ روایتی ترقی پسند شاعر تھے یا پھر فلمی شاعری کرتے تھے۔ لیکن بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں کی غزل کا ساتھ انھوں نے کچھ اس طور سے نبھادیا کہ نئی غزل انھیں بآسانی اپنے اکابر میں شمار کرے گی۔

جاں نثار اختر

زندگی ڈوب گئی درد کے طوفانوں میں — چند یادوں کے سوا کچھ نہ بچا کچھ نہ رہا

یہ کیا ہے کہ بڑھتے چلو بڑھتے چلو آگے ___ جب بیٹھ کے سوچیں گے تو کچھ بات بنے گی

سوچو تو بڑی چیز ہے تہذیب بدن کی ___ ورنہ تو بدن آگ بجھانے کے لیے ہے

وہ لوگ جو دیوانۂ آداب وفا تھے ___ اس دور میں تو ان کی کہاں بات کرے ہے

ساری دنیا میں غریبوں کا لہو بہتا ہے ___ ہر زمیں مجھ کو مرے خون سے تر لگتی ہے

شکستہ میز پہ رکھی ہوئی یہ بند گھڑی ___ نہ جانے کیوں مری ہر بات کا جواب لگے

ذرا سی بات پہ ہر رسم توڑ آیا تھا ___ دل تباہ نے بھی کیا مزاج پایا تھا

آپ اپنے کو بھلانا کوئی آسان نہیں ___ بڑی مشکل سے یہاں بے خبری آوے ہے

کچھ سمجھ کر ہی خدا تجھ کو کہا ہے ورنہ ___ کون سی بات کہی اتنے یقیں سے ہم نے

جتنے وعدے کل تھے اتنے آج بھی موجود ہیں ___ ان کے وعدوں میں ہوئی ہے کچھ کمی یہ مت کہو

فاصلہ چند قدم کا ہے، منا لیں چل کر ___ صبح آئی ہے مگر دور کھڑی ہے یارو

وہ تند وقت کی رو ہے کہ پاؤں ٹک نہ سکیں ___ ہر آدمی کوئی اکھڑا ہوا شجر سا لگے

اجڑی اجڑی ہوئی ہر آس لگے ___ زندگی رام کا بن باس لگے

فرصت کار فقط چار گھڑی ہے یارو ___ یہ نہ سوچو کہ ابھی عمر پڑی ہے یارو

آج بھی جیسے شانے پر تم ہاتھ مرے رکھ دیتی ہو ___ چلتے چلتے رک جاتا ہوں ساڑی کی دوکانوں پہ

سستے داموں لے تو آتے لیکن دل تھا بھر آیا ___ جانے کس کا نام کھدا تھا پیتل کے گلدانوں پہ

شہر کے تپتے فٹ پاتھوں پر گاؤں کے موسم ساتھ چلیں ___ بوڑھے برگد ہاتھ سا رکھ دیں میرے جلتے شانوں پہ

ہم سب سے پہلے قتل ہوئے تم گواہ ہو ___ مرنے پہ دوسروں کو ابھار آئے، یہ نہیں

نہ کوئی خواب نہ کوئی خلش نہ کوئی خمار ___ یہ آدمی تو ادھورا دکھائی دیتا ہے

آنکھوں میں جو بھر لوگے تو کانٹوں سے چبھیں گے ___ یہ خواب تو پلکوں پہ سجانے کے لیے ہے

اب یہ نیکی بھی ہمیں جرم نظر آتی ہے ___ سب کے عیبوں کو چھپایا ہے بہت دن ہم نے

وطن سے عشق، غریبی سے بیر، امن سے پیار ___ سبھی نے اوڑھ رکھے ہیں نقاب جتنے ہیں

سمجھ سکے تو سمجھ زندگی کی الجھن کو ___ سوال اتنے نہیں ہیں جواب جتنے ہیں

اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں ___ جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں

میں سو بھی جاؤں تو کیا میری بند آنکھوں میں — تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے
تو نہ اب آئے تو کیا، آج تلک آتی ہے — سیڑھیوں پر ترے قدموں کی صدا رات گئے
یہ لفظ ترے جسم کی خوشبو میں ڈھلا ہے — یہ طرز یہ انداز سخن ہم سے چلا ہے
انقلابوں کی گھڑی ہے — ہر نہیں ہاں سے بڑی ہے
کس عقیدے کی دہائی دیجئے — ہر عقیدہ آج بے اوقات ہے
زندگی تنہا سفر کی بات ہے — اپنے اپنے حوصلے کی بات ہے
میں سوچتا تھا وطن جا کے گھر رہوں گا کبھی — مگر فساد میں وہ گھر بھی جل گیا ہے میاں
دیکھوں ترے ہاتھوں کو تو لگتا ہے ترے ہاتھ — مندر میں فقط دیپ جلانے کے لیے ہے

اور اب ندیم (اور جاں نثار اختر) کے بعد آنے والوں کو سنئے :۔

منیر نیازی

سمجھو تو عنایت ہے نہ سمجھو تو عنایت — جو چیز ہے جیسی ہے سجا کچھ نہیں رکھا
رکھنے میں نہ رکھنے میں نہ تھا فرق کچھ ایسا — اس نے یہ جسے معلوم ہوا کچھ نہیں رکھا
یہ خواب بھی کیا کم ہے کہ سب خواب ہے جیسے — تعبیر نے پہلے سے بتا کچھ نہیں رکھا

احمد فراز

وہ سامنے ہے گر تشنگی نہیں جاتی — یہ کیا ستم ہے کہ دریا سراب جیسا ہے
کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم — تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لئے آ
اب تو ہمیں بھی ترکِ مراسم کا غم نہیں — پر جی یہ چاہتا ہے کہ آغاز تو کرے
اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں — جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں
تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا — دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں
آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر — کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

شکیب جلالی

آکے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے — جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پسِ دیوار گرے
مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں میں گروں — جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

کیا ہوا ہاتھ میں تلوار لیے پھرتی تھی — کیوں مجھے ڈھال بنانے کو یہ چھتنار گرے

وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے — کس گھڑی سر پہ یہ لٹکی ہوئی تلوار گرے

کیا کہوں دیدۂ تر یہ تو مرا چہرہ ہے — سنگ کٹ جاتے ہیں بارش کی جہاں دھار گرے

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے — مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے

نہ اتنی تیز چلے سر پھری ہوا سے کہو — شجر پہ ایک ہی پتّا دکھائی دیتا ہے

برا نہ مانیے لوگوں کی عیب جوئی کا — انہیں تو دن کا بھی سایا دکھائی دیتا ہے

یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے — تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے

وہیں پہنچ کے گرائیں گے بادباں اپنے — وہ دور کوئی جزیرہ دکھائی دیتا ہے

وہ الوداع کا منظر وہ بھیگتی پلکیں — پسِ غبار بھی کیا کیا دکھائی دیتا ہے

مری نگاہ سے چھپ کر کہاں رہے گا کوئی — کہ اب تو سنگ بھی شیشا دکھائی دیتا ہے

سمٹ کے رہ گئے آخر پہاڑ سے قد بھی — زمیں سے ہر کوئی اونچا دکھائی دیتا ہے

سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح — دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں

عالم میں جس کی دھوم تھی اس شاہکار پر — دیمک نے جو لکھے کبھی وہ تبصرے بھی دیکھ

اتر کے ناؤ سے بھی کب سفر تمام ہوا — زمیں پہ پاؤں دھرا تو زمین چلنے لگی

ٹھوکر سے میرا پاؤں تو زخمی ہوا ضرور — رستے میں جو کھڑا تھا وہ کہسار ہٹ گیا

آ کر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر — تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

کیوں رو رہے ہو راہ کے اندھے چراغ کو — کیا بجھ گیا ہوا سے لہو کا شرار بھی

شہزاد احمد

ملتی نہیں کسی سے بھی قربت کی منزلیں — گر کھو گیا ہو تو تجھے ڈھونڈ لائیں ہم

تنہائیوں میں کوئی در آیا تو کیا ہوا — مدتوں سے دل کا دریچہ کھلا ہوا

خود ہی مل بیٹھے ہو یہ کیسی شناسائی ہوئی — دشت میں پہنچے نہ گھر چھوڑا نہ رسوائی ہوئی

تھی طلب کس کو مگر ابر کہاں جا برسا — تپتے صحراؤں پہ گرجا سرِ دریا برسا

آخر کار ہوئے تیری رضا کے پابند ہم کہ ہر بات پہ اصرار کیا کرتے تھے
اب تو انسان کی عظمت بھی کوئی چیز نہیں لوگ پتھر کو خدا مان لیا کرتے تھے
اب تو شہزاد ستاروں پہ لگی ہیں آنکھیں کبھی ہم لوگ بھی مٹی پہ جیا کرتے تھے
کل تھی یہ فکر اسے حال سنائیں کیوں کر آج یہ سوچتے ہیں اس کو سنا کیوں آئے
جس کو جانا ہی نہیں، اس کو خدا کیوں مانیں اور جسے جان چکے ہیں وہ خدا کیسے ہو

خلیل الرحمٰن اعظمی

ہجر تو ہجر تھا اب دیکھیے کیا بیتے گی اس کی قربت میں کئی درد نئے اور بھی ہیں
رات تو خیر کسی طرح سے کٹ جائیگی رات کے بعد کئی کوس کڑے اور بھی ہیں
سوتے سوتے چونک پڑے ہم خواب میں ہم نے کیا دیکھا جو خود ہم کو ڈھونڈ رہا ہو ایسا اک رستا دیکھا
سونا لینے جب نکلے تو ہر ہر ڈھیر میں مٹی تھی جب مٹی کی کھوج میں نکلے سونا ہی سونا دیکھا
آج ہمیں خود اپنے اشکوں کی قیمت معلوم ہوئی اپنی چتا میں اپنے آپ کو ہم نے جب جلتا دیکھا
چاندی کے سے جن کے بدن تھے سورج کے سے مکھڑے تھے کچھ اندھی گلیوں میں ہم نے ان کا بھی سایا دیکھا
تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے
ہر شمع سے لپٹی ہوئی زنجیر دھوئیں کی اس دور میں ہر پیچ ہر اک راہگزر ہے
بارہا سوچا کہ اے کاش نہ آنکھیں ہوتیں بارہا سامنے آنکھوں کے وہ منظر آیا

شاذ تمکنت

اس کا ہونا بھی بھری بزم میں ہے وجہِ سکون کچھ نہ بولے بھی تو وہ میرا طرفدار لگے
کسی خوبی کا تصور ہی نہیں تیرے بغیر حسن جس جا نظر آیا ترا کردار لگے

ظفر اقبال

اپنے سوئے ہوئے سورج کی خبر لے جا کر اس کمیں گاہ میں کرنوں کو پکڑتا کیا ہے
میں بکھر جاؤں گا زنجیر کی کڑیوں کی طرح اور رہ جائے گی اس دشت میں جھنکار مری
یہاں کسی کو بھی کچھ حسب آرزو نہ ملا کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تو نہ ملا

محبوب خزاں

سادہ کاری کئی پرت کئی رنگ ___ سادگی اک ادائے سادہ نہیں

ایک محبت کافی ہے ___ باقی عمر اضافی ہے

سلیم احمد

گونگی ہے ازل سے جو حقیقت ___ میں اس کو زبان دے رہا ہوں

جو فصل ابھی کٹی نہیں ہے ___ میں اس کا لگان دے رہا ہوں

یہ چاہا تھا کہ پتھر بن کے جی لوں ___ سو اندر سے پگھلتا جا رہا ہوں

اتنی کاوش بھی نہ کر میری اسیری کیلئے ___ تو کہیں میرا گرفتار نہ سمجھا جائے

سلیمان اریب

ایک حمام میں تبدیل ہوئی ہے دنیا ___ سب ہی ننگے ہیں کسے دیکھ کے شرماؤں میں

ایک بار کی شہرت ساری عمر چلتی ہے ___ میں پیوں جو پانی بھی لوگ رم سمجھتے ہیں

شاہد صدیقی

ہم ہی خالقِ نغمہ، لاؤ ساز ہم کو دو ___ گیت چھیڑ بیٹھے ہو، اور گا نہیں سکتے

خورشید احمد جامی

آہٹ ہے نہ غم ہے نہ کوئی چیخ ہے جامی ___ اس واسطے اس رات کو مصلوب کیا ہے

قبروں پہ لگائے ہوئے کتبے تو نہیں ہیں ___ ہر شخص پہ کیوں ایک سی تحریر لکھی ہے

جلتا ہے ایک ذہن مہکتا ہے ایک پھول ___ روزِ ازل سے ہے یہی تخلیق کا اصول

وحید اختر

ہے فکر کے شعلوں میں جہنم کی عقوبت ___ دنیا میں بھی جنت ہے اگر سر میں خلا ہے

حسن نعیم

آئے کتنے نئے لوگ مکانِ جاں میں ___ بام و در پر ہے مگر نام اسی کا لکھا

موجِ اشک سے بھیگی نہ کبھی نوکِ قلم ___ وہ انا تھی کہ کبھی درد نہ جی کا لکھا

کوئی جدت تو کوئی حسنِ تغزل سمجھا ___ مرثیہ جب بھی کوئی اپنی صدی کا لکھا

بات شیریں سی لگی فن کے طرفداروں کو قصۂ ہر چند حسن کوہ کنی کا تلخ تھا

میں اس درخت سے کمتر ہوں مرتبے میں حسن جو دھوپ سہ کے مسافر کو پیار دیتا ہے

بام خورشید سے اترے کرنا ترے کوئی صبح خیمۂ شب میں بہت دیر سے کہرام تو ہے

یہ کشتیاں، یہ ہوائیں، یہ بادبانیں، یہ سیج افق کے پار کوئی اژدر ہی آتا ہے گا

وہ لوٹ آئے تو اس کی بھی کچھ انا رکھیو فصیل قلب کا دروازہ تم کھلا رکھیو

ہائے ہائے کر رہے ہیں زر کی خاطر صوفیا خانقہ کی اس فضا میں باہو ممکن نہیں

سر پہ رکھ دیتا وہ اک تاج تو مانے جاتے کم نہیں اس کا کرم کاسہ یہ سر جس نے دیا

مدت ہوئی غزلوں سے گیا شور گلستاں اب حرف غزل نوک سناں موجۂ خوں ہے

کیسی کالی رات بیتی کیسا کالا دن چڑھا جو بگولوں سے لڑا تھا وہ صبا سے ڈر گیا

کھڑا ہوا ہوں مثال گیاہ طوفاں میں کوئی درخت نہیں ہوں جو وہ گرا دے گا

ایک کوہ سربلند پہ تنہا کھلا جو پھول سورج سے وہ نہ آنکھ ملائے تو کیا کرے

ساقی فاروقی

مٹ جائے گا سحر تمہاری آنکھوں کا اپنے پاس بلالے گی دنیا اک دن

ایک چہرہ تھا کہ اب یاد نہیں آتا ہے ایک لمحہ تھا کہ وہ جان کا بیری نکلا

وہ دکھ جو سوئے ہوئے ہیں انہیں جگا دوں گا میں آنسوؤں سے ہمیشہ ترا پتا دوں گا

ہوا ہے تیز مگر اپنا دل نہ میلا کر میں اس ہوا میں تجھے دور تک صدا دوں گا

مری صدا پہ نہ برسیں اگر تری آنکھیں تو حرف و صوت کے سارے دیے بجھا دوں گا

جو اہل ہجر میں ہوتی ہے ایک دید کی رسم تری تلاش میں وہ رسم بھی اٹھا دوں گا

وہ ایک لمحہ جسے کھو دیا محبت میں اسے تلاش کروں گا تجھے بھلا دوں گا

وہ لفظ ہاتھ نے لکھے ہیں جو نہ لکھنے تھے میں اس خطا پہ اسے عمر بھر سزا دوں گا

اب گھر نہیں گھر کی تمنا بھی نہیں ہے مدت ہوئی سوچا تھا کہ گھر جائیں گے اک دن

جینے کا حوصلہ ہو تو زنداں کی ساری عمر مقتل کی ایک رات پہ قربان کیجیے

ایک مدت سے چراغوں کی طرح جلتی ہیں ان ترستی ہوئی آنکھوں کو بجھا دو کوئی

سارے موتی جھوٹے نکلے سارے جادو ٹوٹے ___ میری خالی آنکھو! بولو اب کیا خواب دکھاؤں

اطہر نفیس

مثلِ بادِ صبا تیرے کوچے میں لے جان جاں آئے ہیں ___ چند ساعت رہیں گے چلے جائیں گے سرگراں آئے ہیں
دروازہ کھلا ہے کہ کوئی لوٹ نہ جائے ___ اور اس کے لیے جو کبھی آیا نہ گیا ہو
ایک سفر ہے وادیٔ جاں میں تیرے دردِ ہجر کے ساتھ ___ تیرا دردِ ہجر جو بڑھ کر لذتِ کیفِ وصال ہوا
عشق فسانہ تھا جب تک اپنے بھی بہت افسانے تھے ___ عشق صداقت ہوتے ہوتے کتنا کم احوال ہوا
پھر مرے سر سے ٹلتا مہرباں سورج کی دھوپ ___ پھر تری یادوں کا مجھ پر دور تک سایہ ہوا
عشق کرنا جو سیکھا، تو دنیا پرستی کا فن آ گیا ___ کاروبارِ جنوں آ گیا ہے تو کارِ جہاں آئے ہیں
بے نیازانہ ہر اک راہ سے گزرا بھی کرو ___ شوقِ نظارہ جو ٹھہرائے تو ٹھہرا بھی کرو
اتنے شائستۂ آدابِ محبت نہ بنو ___ شکوہ آتا ہے اگر لب پہ تو شکوہ بھی کرو
وہ نظر آج بھی کم معنی نہ ہیگا نہ سہی ___ اس کو سمجھا بھی کرو اس پہ بھروسا بھی کرو
جسم و جاں تک یہ آگ آ پہنچی ___ دلِ سوزاں کو اب سنبھالو کچھ
راکھ ہونے میں کیا ملے گا ہمیں ___ ہاں اسی آگ سے بنا لو کچھ
خود اپنی رفتاروں پر بھی اغراض کے پرتو ___ پرچھائیں کی صورت سہی آتے تو رہے ہیں
وہ دور قریب آ رہا ہے ___ جب دادِ ہنر نہ مل سکے گی
اس شب کا نزول ہو رہا ہے ___ جس شب کی سحر نہ مل سکے گی
آساں بھی نہ ہوگا گھر میں رہنا ___ توفیقِ سفر نہ مل سکے گی
خنجر سی زباں کا زخم کھا کر ___ مرہم سی نظر نہ مل سکے گی

سجاد باقر

تو کون تھا کیا تھا کہ برس گزرے پر اب بھی ___ محسوس یہ ہوتا ہے رگِ جاں کی طرح تھا
سوئے تو ہم آغوش رہے ہم ترے غم سے ___ جاگے تو حریفِ غمِ دنیا نظر آئے
نکہت تھی ڈھلی نور میں کیا اس کا بیاں ہو ___ پوچھوں تو خدا ہاتھ لگاؤں تو صنم ہے

جون ایلیا

وفا، اخلاص، قربانی، محبت — اب ان لفظوں کا پیچھا کیوں کریں ہم
ہیں باشندے اسی بستی کے ہم بھی — سو خود پر اب بھروسہ کیوں کریں ہم
کیا تھا عہد جب لمحوں میں ہم نے — تو ساری عمر ایفا کیوں کریں ہم
زلیخائے عزیزاں بات یہ ہے — بھلا گھاٹے کا سودا کیوں کریں ہم
نہیں دنیا کو جب پروا ہماری — تو پھر دنیا کی پروا کیوں کریں ہم
کوئی سکھ ہم سے کیوں پہنچے کسی کو — کسی کا نام اونچا کیوں کریں ہم
جو اس نسل فرومایہ کو پہنچے — وہ سرمایہ اکٹھا کیوں کریں ہم
کسی کو ہم نہ دے سکتے ہیں جب زہر — تو پھر اس کا مداوا کیوں کریں ہم
برہنہ ہیں سر بازار تو کیا — بھلا اندھوں سے پردا کیوں کریں ہم

ہے بس اب عادتوں کی خانہ پری — روح شامل نہیں شکایت میں
کون سمجھے کہ بے غرض جذبے — کتنے اوچھے ہیں اپنی فطرت میں

جانے کہاں گیا وہ، وہ جو ابھی یہاں تھا؟ — وہ جو ابھی یہاں تھا، وہ کون تھا، کہاں تھا؟
اب جس کی دید کا ہے سودا ہمارے سر میں — وہ اپنی ہی نظر میں اپنا ہی اک سماں تھا
عمریں گزر گئی تھیں ہم کو یقیں سے بچھڑے — اور لمحہ اک گماں کا صدیوں میں بے اماں تھا

انہی باتوں کا دل خوگر ہے اب بھی — کبھی روٹھا کرو تم بے سبب بھی
دم گفتار ہم سے انجمن میں — کہا ہوتا کچھ اس نے زیر لب بھی
بنا اس کے ہی گزاری عمر ساری — کبھی تو مجھ کو ہوتا ہے عجب بھی

احمد مشتاق

کون بتلائے گا کتنی دستکیں باقی ہیں اور — تیرا دروازہ کھلے گا کتنے دروازوں کے بعد
جانے کس کس سے ملیں ہم تجھ سے ملنے کے لیے — پھر تری آواز آئے کتنی آوازوں کے بعد

جیسے ہر شے ہو کسی خواب فراموش میں گم — چاند چمکا نہ تری یاد نے بدلا پہلو
جھلملاتے رہے وہ خواب جو پورے نہ ہوئے — درد بیدار ٹپکتا رہا آنسو آنسو

دونوں ہی تو سچے تھے الزام کسے دیتے ___ کانوں نے کہا صحرا آنکھوں نے سنا پانی

جب شام اترتی ہے کیا دل پہ گزرتی ہے ___ ساحل نے بہت پوچھا خاموش رہا پانی

تمھارے بعد بہت آندھیاں چلیں پھر بھی ___ بجھا نہیں مری آنکھوں کے آس پاس کا رنگ

جدا ہوئے تو کئی رنگ تھے خیالوں میں ___ ملے تو ایک تھا پانی کا رنگ، پیاس کا رنگ

خیر بدنام تو پہلے بھی بہت تھے لیکن ___ تجھ سے ملنا تھا کہ پر لگ گئے رسوائی کو

خلیل رامپوری

آئینہ جھکائے رکھ سب کچھ نظر آ جائیگا ___ جسکی چاہت ہو اسے خود سے جدا سمجھا نہ کر

بولتے چہروں کی صحبت چاہیئے مجھ کو خلیل ___ جی کہاں سادہ لفافوں سے بہلتا ہے مرا

بادل، پربت، دریا، چشمے، جنگل، صحرا ___ کیوں بھلتے ہیں، میں ان سب کا کیا لگتا ہوں

بھلا ہوا کہ کوئی اور مل گیا تم سا ___ وگرنہ ہم بھی کسی دن تمہیں بھلا دیتے

کشور ناھید

وہ اجنبی تھا پھر بھی لگا آشنا مجھے ___ کس سمت سے چلا ہے نیا حادثہ مجھے

میں گھر کی روشنی ہوں مجھے محفلوں سے کیا ___ چہروں کے میک اپ میں نہ دینا صدا مجھے

ہماری عمر تو ہے بیل عشق پیچاں کی ___ ڈھلک پڑے گی اگر کوئی آسرا نہ ملا

کنوئیں بھی ختم ہوئے پنگھٹوں کا دور گیا ___ یہی سبب ہے کوئی تہ میں جھانکتا نہ ملا

رواروی میں ہے ہر ایک صحبت یاراں ___ ملیں سکوں سے تو قصے ترے سنائیں گے

چھپا کے رکھ دیا پھر آگہی کے شیشے کو ___ اس آئینے میں تو چہرے بگڑتے جاتے ہیں

انور شعور

کوئی وطن ہو وطن کے نوا گروں کے خلاف ___ قلم بدستوں کے قتل نامے ایک لکھتے ہیں

کیا ہے چیز ایک لمحۂ موجود ___ سو تجھی پر نثار ہوتا ہے

ایسا دیکھا ہے کہ دیکھا ہی نہ ہو ___ جیسے مجھ کو تری پروا ہی نہ ہو

کہاں کا قصۂ دوزخ کہ اک عمر ___ میں انسانوں کے نرغے میں رہا ہوں

مجھ کو ایسا بنا گیا کوئی ___ جیسے مجھ میں سما گیا کوئی

اے انا کی عمارت رنگیں ___ تیرے مینار ڈھا گیا کوئی

دل سے آوارہ گرد کو آخر ___ راستے پر لگا گیا کوئی

سبط علی صبا

دیوار کیا گری مرے کچے مکان کی ___ یاروں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے

سلمان اختر

سیکھی نئی زبان وطن سے جدا ہوئے ___ جینے کی دوڑ دھوپ میں ہم کیا سے کیا ہوئے

فٹپاتھ پر پڑے تھے تو ٹکراتے تھے ٹھوکریں ___ مندر میں جا کے بیٹھ گئے اور خدا ہوئے

مرتضیٰ برلاس

وقت شبخوں کے لیے لیس ہے ہتھیاروں سے ___ شہر کا شہر ہی سویا ہے جگائیں کس کو

ظفر زیدی

اک شجر ایسا محبت کا لگایا جائے ___ جس کا ہمسائے کے آنگن میں بھی سایہ جائے

ساچ ناتھ

تیرے آنے کا انتظار رہا ___ عمر بھر موسم بہار رہا

خالد احمد

اے دوست ترا شہر بھی ہے شہر طلسمات ___ جھو کر جسے دیکھا وہی پتھر نظر آیا

ہر شخص حقائق کی کڑی دھوپ کے ڈر سے ___ تانے ہوئے اوہام کی چادر نظر آیا

یونس فروغ

عشق وہ کار مسلسل ہے کہ ہم اپنے لیے ___ ایک لمحہ بھی پس انداز نہیں کر سکتے

گفتگو ان سے جو کرنا ہے وہ سب از بر ہے ___ بات بس یہ ہے کہ آغاز نہیں کر سکتے

حسن کو حسن بنانے میں مرا ہاتھ بھی ہے ___ آپ مجھ کو نظر انداز نہیں کر سکتے

چراغوں کا آغاز و انجام ہی کیا ___ جلیں بھی ہوا سے بجھیں بھی ہوا سے

دوپہر میں وہ کڑی دھوپ پڑے گی کہ فروغ ___ جس کے چہرے پہ جو غازہ ہے اتر جائے گا

ناخدا بیچ میں آئے اصل میں جنگ تھی مجھ سے تھی ___ جبتک میرے باغ نہ ڈوبے زور نہ ٹوٹا طوفاں کا

افتخار عارف

اس بار بھی دنیا نے ہدف ہم کو بنایا — اس بار تو ہم شہر کے مصاحب بھی نہیں تھے

بیچ آئے سرِ قریۂ زر جوہرِ پندار — جو دام ملے ایسے مناسب بھی نہیں تھے

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے — وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

جلوۂ شب ہو تو اجالے بھی ترے شہر سے آئیں — خواب دیکھوں تو حوالے بھی ترے شہر سے آئیں

تیرے ہی شہر میں سر تن سے جدا ہو جائے — خوں بہا مانگنے والے بھی ترے شہر سے آئیں

بات تو جب ہے کہ اے گریۂ کن حرمتِ حرف — مدح قاتل میں مقالے بھی ترے شہر سے آئیں

پتھر پہ سر رکھ کے سونے والے نہ دیکھے — ہاتھوں میں پتھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے — میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

میں اپنے خواب سے کٹ کر جیوں تو میرا خدا — اجاڑ دے مری مٹی کو دربدر کر دے

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے — مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے

صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن — راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے — نوکِ سناں پہ سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

پروین شاکر

کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی — میں اپنے ہاتھ سے اسکی دلہن سجاؤں گی

میں سچ کہوں گی، مگر پھر بھی ہار جاؤں گی — وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کردیگا

بس یہ ہوا کہ اس نے تکلف سے بات کی — اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لیے

چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو — ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا

ایسی خالی نسل کے خواب ہی کیا ہوں گے — جس کی نیند کا سرچشمہ تک چرس میں ہے

صدف میں اتروں تو پھر میں گہر بھی بن جاؤں — صدف سے پہلے مگر حلقۂ نہنگ میں ہوں

برس سکے تو برس جائے اس گھڑی ورنہ — بکھیر ڈالے گی بادل کے سارے خواب ہوا

پورے انسانوں میں گھس آئے ہیں — سر کٹے، جسم کٹے، ذات کٹے

کتنے پیارے سے ملے ہیں کچھ لوگ — چمکیلے بدن میں بھی سمٹے

ذرا سی کرگسوں کو آب و دانہ کی جو شہ ملی ــــــ عقاب سے خطاب کی ادا ہی اور ہو گئی

ٹکڑوں میں بٹ کر بھی اس کا عکس رہی ــــــ میں آئینہ تھی بکھرنے پہ اعتماد بھی تھا

چراغ مانگتے رہنے کا کچھ سبب بھی نہیں
اندھیرا کیسے بتائیں کہ اب تو شب بھی نہیں

میں اپنے زعم میں اک بازیافت پر خوش ہوں
یہ واقعہ ہے کہ مجھ کو ملا وہ اب بھی نہیں

جو میرے شعر میں مجھ سے زیادہ بولتا ہے
میں اس کی بزم میں اک حرف زیر لب بھی نہیں

یہ دکھ نہیں کہ اندھیروں سے صلح کی میں نے ــــــ ملال یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

ردا کے ساتھ لٹیرے کو زادِ رہ بھی دیا ــــــ تری فراخ دلی میرے دیر ایسی تھی

اب کیسی پردہ داری، خبر عام ہو چکی
ماں کی ردا تو، دن ہوئے نیلام ہو چکی

سورج بھی اس کو ڈھونڈھ کے واپس چلا گیا
اب ہم بھی گھر کو لوٹ چلیں شام ہو چکی

شملے سنبھالتے ہی رہے مصلحت پسند
ہونا تھا جس کو پیار میں بدنام ہو چکی

آنکھیں ہیں اور صبح تلک تیرا انتظار ــــــ مشعل بدست شام ترے نام ہو چکی

میں اتنے سانپوں کو رستے میں دیکھ آئی تھی
کہ تیرے شہر میں پہنچی تو کوئی ڈر ہی نہ تھا

لطف کی بات یہ ہے ــــــ اور یہ اس سے پہلے غالب کے عہد میں بھی، پھر اقبال کے عہد میں بھی ہوتا ہے کہ متوازی دھارے بہتے رہتے ہیں: ایک اپنے زمانے کے ساتھ (یا بعضوں کے بقول "اپنے زمانے سے آگے!") پچھلے زمانے میں ہنوز گم! ــــــ کہ ندیم ہی کے عہد میں، ایک طرف ندیم اور ان کا قبیلہ تھا، اور اس کے متوازی، ہم رنگ سی شعری روایت کو قائم رکھے ہوئے فراق، روش اور ریگش کی ذہین غزل (روایت کے اندر رہ کر بھی چل رہی تھی، اور، عدم (اور پھر سیف الدین سیف) کی مستانہ غزل بھی (رندان باصفا کی نمازیں نہ پوچھئے + ہے ہیں مست مست دعائیں بھی مست) ـ حتیٰ کہ ندیم کے جونیئر ساتھیوں احمد فراز اور شہزاد احمد کے عہد ابن انشاء یا مثلاً ناصر کاظمی) اپنی حسن کاری سے روایتی غزل کو نکھارتے رہے۔

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا تیرا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرہ تیرا

ہم بھی وہیں موجود تھے ہم سے بھی سب پوچھا کیے
ہم ہنس دیئے، ہم چپ رہے، منظور تھا پردہ تیرا

عصریت کی پرچھائیں تک نہ پڑی تھی ـ اس کے باوجود نئے زمانے کی نئی حسیت' فضا میں موجود تفکر توہم آمیز ہو کے، خالص تغزل میں بھی نئے رنگ کا رچاؤ لے کے سامنے آئی تھی ـ اس میں حیا بھی

ٹھنک کے سوچنے کے پلاٹ ملتے تھے' اور بے لطف، بے رنگ (بلکہ بے زمینی بھی!) کہیں نہ تھی۔

روایتی عشقیہ شاعری کا نئے زمانے سے ہم آہنگ نیا روپ آپ نے نئی شاعرہ پروین شاکر کے یہاں دیکھا۔ ایک تجدیدی رنگ ساطع سے اوپر کے استاد شاعروں فراق، روش اور میکش کے یہاں بھی روایتی غزل کو حیاتِ نو بخشتا رہا، خصوصاً میکش کے یہاں (کہ فراق و روش کے برخلاف میکش ۴۷ء کے بعد والے عہد سے زیادہ متعلق ہیں) پروین کے بعد میکش کو پڑھیں، کسی کو ایک دوسرے سے کمتر نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

یہ کائنات زمان و مکاں سفر ہی سفر ___ نہ عاشقی مری منزل نہ حسن تیرا مقام

آنکھوں میں نمی دلوں میں یادیں ___ ہیں صبح کو داستانِ شب ہم

کچھ سمجھا کسی نے کچھ کسی نے ___ ہیں کس کا پیام زیرِ لب ہم

رات کو ان کی خلوت میں خود انکے سوا کوئی بھی نہ تھا ___ صبح ہوئی تو سب کے لبوں پر میرے ہی افسانے تھے

مرے غم کے لیے اس بزم میں فرصت کہاں پیدا ___ یہاں تو ہو رہی ہے داستاں سے داستاں پیدا

مری عمرِ رواں سمٹ آئی ہیں انکے ایک لمحے میں ___ بڑی مدت میں ہوتی ہے یہ عمرِ جاوداں پیدا

وہی ہے ایک مستی سی دہاں نظروں میں یاں دل میں ___ وہی ہے ایک شورش سی وہاں پنہاں یہاں پیدا

یہ اپنا اپنا مسلک ہے' یہ اپنی اپنی فطرت ہے ___ جلاؤ آشیاں تم ہم کریں گے آشیاں پیدا

ہماری سخت جانی سے ہوا تنگ ہاتھ قاتل کا ___ سرِ مقتل ہی ہم نے کر لیا دار الاماں پیدا

اب اندھیرا ہی اندھیرا ہے زمانے بھر میں ___ کیا ہوا یہ تری محفل میں چراغاں ہو کر

یہ حال کیا ہے کہ آغوش میں تجھے لیکر ___ تمام عمر ترا انتظار میں نے کیا

اب نہ تو سازی کا یاں دماغ ہے کس کو ___ ورنہ چاک پیراہن بارہا سیا بھی ہے

ایک رنگ آتا ہے ایک رنگ جاتا ہے ___ جیسے ان کی خلوت میں کوئی دوسرا بھی ہے

جستجو ہے تو مگر یاد نہیں کس کی ہے ___ ذوقِ رہگیری نے منزل کو کہاں چھوڑ دیا

ڈھائے ہیں تحمل سے محل ظلم کے ہم نے ___ گردن سے سرِ تیغ کو ہم نے ہم سفر کیا ہے

میں نہ دیکھوں تو ترے حسن کی قیمت کیا ہے ___ میں نہ تڑپوں تو یہ اندازِ جفا کچھ بھی نہیں

جس کو تم خود بھی نہ سمجھو وہ زباں ہے مانا ___ سب سمجھتے ہوں جسے وہ بھی زباں ہے کہ نہیں

ایمان ہے مرا تری جنت ہے اے خدا ___ لیکن یہ میرے خونِ جگر کا صلہ نہیں

اتنے فاصلے سے تو موج بھی ہے دریا بھی   ڈوب کر کوئی دیکھے موج ہے نہ دریا ہے

وہ ابھی ہیں خلوت میں اور محو ہے محفل   انتظار جلوہ بھی جیسے کوئی جلوہ ہے

میرا معبود ہے تو تیرا انکسار بھی مگر   نہ خدا تجھ کو دکھائے کبھی الفت کا غرور

گرمیٔ سوز محبت کے سوا کچھ بھی نہیں   بند کر دوں جو میں آنکھیں تو تجلی ہے نہ طور

منفعت نہ ہوگی، تاہم، کیا چیز ہو گئے تم   ہر شخص سے تواضع، ہر بات پر تبسم

ترا حجاب اٹھانا ہے صرف میرا کام   اگرچہ ہے مری ہستی ترے حجاب کا نام

کبھی سب کچھ تھا لیکن اب تو اتنا ہوش ہے کس کو   یہ دل ہے یا ترا جلوہ، یہ سر ہے یا ترا سودا

بدل دیا تری غفلت نے آرزو کا نظام   یقیں تو کب تھا مگر اب تو شک بھی گئی

تجھ کو غیرت خوش ہیں تباہ کر کے ہمیں   اور ایک ہم ہیں کہ یہ بات تجھ سے کہہ نہ سکے

بتکدے والوں کو تھی ہم سے شکایت کیا کیا   اب پڑی سر پہ جا بنے تو خدا یاد آیا

جہاں میں ہوں وہاں تو بھی ہے اے دوست   جہاں تو ہے وہاں کوئی نہیں ہے

ہے میر کارواں ہر اک یہاں پر   کہ میر کارواں کوئی نہیں ہے

نہیں ہے نظم جہاں کا سنوارنا مشکل   ستم یہ ہے کہ دلوں کا نظام برہم ہے

لگا کے دل کسی کافر سے دیکھ لے زاہد   یقین کر کہ محبت ہی اسم اعظم ہے

مری نگاہ نے ہستی کو دی ہے ضو ورنہ   میں دیکھ لوں تو یہ موتی ہے ورنہ شبنم ہے

جنگ میں بھی ہیں اس صلح کے پہلو، صلح میں بھی ہیں جنگ کی شانیں   اس جیسے معصوم کو یارب کس نے سکھائی ہیں یہ گھاتیں

ان کی آنکھیں ہائے اس کی آنکھیں کیسی ہیں اب کیا کہیے   اچھا ٹھہریے سوچنے دیجے، اس کی آنکھیں! اس کی آنکھیں!!

نفرت جو آدمی سے سکھائے وہ کفر ہے   دین اور زبان کی ہو کہ قوم و وطن کی بات

اک نظر ایک تبسم ہے مسافر کو بہت   چھاؤں کی یاد میں بھی راہ، گزر جائے گی

یہ جہاں ایک نظر اور نظر کچھ بھی نہیں   وہ جہاں صرف خبر اور خبر کچھ بھی نہیں

ان کی خوشبو سے مہکتی مری سانسوں کی ہوا   اور اس باغ میں اے باد سحر کچھ بھی نہیں

رات شبنم کی طرح ہو گئی پھولوں میں بسر   اب کیا غم ہے اگر وقت سحر کچھ بھی نہیں

نقش پا بھی تو چھوڑتے نہیں راہی کی طرح   منزل عشق بجز راہ گزر کچھ بھی نہیں

یہ جہاں تجھ کو فقط وہم و گماں لگتا ہے — مجھ کو ہر ذرّہ یہاں ایک جہاں لگتا ہے
پیچ و خم راہ کا رکھتا ہے پریشان تجھے — مجھ کو یہ بھی خمِ گیسوئے بتاں لگتا ہے
راہ کا سنگ ہے اک سنگِ گراں تیرے لیے — مجھ کو یہ سنگ بھی منزل کا نشاں لگتا ہے
میری نظروں میں ہے یہ ابرِ بہاری کا سفیر — تجھ کو چھایا ہوا گلشن پہ دھواں لگتا ہے
روز آ جاتی ہے شب وعدۂ فردا لے کر — کتنا اچھا یہ جہانِ گزراں لگتا ہے
چال سے ان کی چمک اٹھتا ہے راہوں کا غبار — مجھ کو ہر رستہ یہاں کاہکشاں لگتا ہے
اور کچھ دم مری آغوش میں اے عکسِ شفق — تو مجھے نامہ برِ لالہ رخاں لگتا ہے
ایک ہلکا سا تبسم مری راتوں کا چراغ — وہ بھی تیرے لبِ نازک کو گراں لگتا ہے
بھر گئی کان میں اس طرح وہ شیریں سخنی — اب کسی بات میں دل اپنا کہاں لگتا ہے
دل کی کچھ بات کریں تجھ سے یہاں آ میکش — تو مجھے واقفِ اسرارِ جہاں لگتا ہے

معتقد ہوں کہ ناقد، حضرتِ واعظ ہوں یا ناصح — نہ سمجھیں خود، مگر اوروں کو تو سمجھا ہی جاتے ہیں
خوشی سے بھی دلوں کا خون ہو جاتا ہے اے سرکش — یہ پھولوں کی طرح کھلتے ہیں تو مرجھا ہی جاتے ہیں

ہے یہ انساں ہی وہ قبلۂ برحق کہ جسے — سجدہ کرنے کے لیے دیر و حرم آتے ہیں

خزاں کی تیغ پہ ہے خونِ نسترن باقی — ابھی ہے رنگِ چمن، نکہتِ چمن باقی
بدل گیا ہے چمن میں مزاجِ لالہ و گل — ہے اک مجھی میں تری بوئے پیرہن باقی
ہوا زمانہ کہ رستے ہیں عشق کے ویراں — نہ راہرو ہی کوئی ہے نہ راہزن باقی
نہ بتکدے میں برہمن نہ شیخ کعبے میں — مگر ہے معرکۂ شیخ و برہمن باقی

ایک اور متوازی دھارا مجروح، سردار، تاباں (قیدِ زندگی سے قبل)، مخدوم، کیفی، ساحر (اور تازہ تر حبیب جالب) کا تھا، ایک تیسرا دھارا جذبی — اور ایک اور اکیلی آواز اختر انصاری (دہلوی):

○

لیکن جیسا کہ آپ نے دیکھا ان میں، کوئی آواز اثر انداز یا رجحان ساز آواز نہیں بن پائی۔ فکر یا جذبہ کا اکہرا پن انھیں سب کو ایک جزیرہ بناتا رہا جہاں سے ملک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہو، شعار و چل نکلا! اکہری شاعری کا زمانہ تیزی سے بیت رہا تھا!!

○

تاہم یہ کیسی عجیب اور دلچسپ بات ہے کہ اکہرے شاعر اپنی پہچان جس سہولت سے کراتے رہے، راستے سے ہٹ کے چلنے والوں کو اردو قاری نے ابھی تک اس طرح ماننے نہیں دیا ہے۔ شاد عارفی ایک واضح مثال ہیں۔ خود یگانہ کی دریافت ان کے انتقال کے برسوں بعد، اب کہیں جا کے شروع ہوئی ہے۔ احمد ندیم کا احترام سب کرتے ہیں مگر شعر محفلوں میں فیض کے پڑھے جاتے ہیں اور شعری یا افسانوی مجموعوں کے ناموں کے لیے فیض کی تراکیب استعمال ہوتی ہیں۔ قبولیت کی سند اطہر نفیس کو نہیں اطہر نفیس کی ان غزلوں کو ملی جو گائی جا سکیں (یعنی ابن انشا کی سطح سے اوپر نہ ہوں)۔ شکیب جلالی کو نہیں احمد فراز (ندیم + فیض + عدم) کو اور ان کے بعد افتخار عارف (ندیم + فیض) کو ملی، پروین شاکر (ندیم کے لہجہ میں محدود عشقیہ شاعری) کو ملی تو تسلیم شدہ غزل گویوں کی لکیر ابھی تک اپنے معمول سے ہٹی نہیں ہے۔ اقبال، فیض، احمد فراز —— اور اب افتخار عارف و پروین شاکر۔

○

جاں نثار اختر ختم ہو رہے جو احمد ندیم کے ساتھ ساتھ چل کے اردو غزل کو نئی سمتیں دینے لگے تھے۔ شکیب جلالی، اطہر نفیس، رئیس فروغ ختم ہوئے، جدید غزل کو ان سے بڑی امیدیں تھیں۔ میکش مدت سے بستر علالت پر ہیں۔ (ان کے ہم سخن، روش رخصت ہی ہو لیے)، خورشید الاسلام اور شہزاد احمد کچھ تھک سے گئے ہیں۔ ظفر اقبال اپنے فن سے کھلواڑ کرنے لگے (سلیم احمد مرحوم بھی کچھ اسی روش کے اثر آئے تھے)، احمد سرفراز احتجاجی شاعری کی نذر ہوئے، افتخار عارف کربلائی شاعری میں لگے ہیں، بابے گھر کے ماتم میں حسن نعیم اپنی انا کے شکار ہوئے، پروین شاکر محدود عشقیہ شاعری پر قناعت کر بیٹھی ہیں۔ یہ چاروں اپنے اپنے خول سے نکل آئیں گے، ان کی توانا شاعری سے اس کی پوری توقع کی جا سکتی ہے کہ غزل کو دس بیس سے بڑھ کے ہزار بارہ سو شعر تو دیے جا سکیں۔ ایک احمد ندیم (شجر پر ایک ہی پتا دکھائی دیتا ہے!) اکیلا کہاں تک چلے گا،

زندگی کی کتنی اداؤں کو سہار سکے گا! بالآخر ہر عہد کے کچھ نہ کچھ بالکل نئے تقاضے ہوتے ہیں، جنھیں لاکھ چاہے مگر پچھلے عہد کا زائیدہ اس خوبصورتی سے نہیں پورا کر پاتا، نہیں سمجھ پاتا جیسے خود اُس عہد کا آدمی!
——— اور عہد کا عالم یہ ہے کہ وہ جو تیس سال میں بدلتا تھا، اس صدی کے نصف آخر میں اوّل اوّل دس دس سال میں بدلنے لگا، اور ۱۹۷۰ء کے بعد تو پانچ پانچ سال بھی پورے کرنے مشکل ہونے لگے۔ ایسے چالے مصحفی نے صرف کہنے کے لیے کہا تھا — حادثے ہوتے تھے زمانے میں + اس قدر انقلاب کس دن تھا! آج ہوتا تو زبان گنگ ہو جاتی!

○

صدی کے نکلے ہوئے آخری پندرہ برسوں کا آغاز ہو چکا ہے ۔ اور آگے کے سارے امکانات بظاہر شاعری کے اسی سلسلۂ نسب سے جڑے نظر آتے ہیں جو شاد عارفی، یگانہ اور احمد ندیم سے چلتا ہے۔ فکری انداز سخن کو سنجیدگی سے اپنانے والے برصغیر میں صدی کے نصف آخر کے آغاز سے اس وقت تک ابھی اور بڑی خلق کر رہے ہیں لیکن ندیم کی شاعری کی طرح ان کی غزل پر بھی کوئی چھاپ نہیں ہے۔ وہ عام آدمی کی خاص باتیں ہیں۔ (خاص آدمی کی عام باتیں بھی ہوتیں تو توجہ طلب ہوتیں!) مگر کیا کیجیے، عام آدمی بھی خاص بات کہتا ہے، اور ایک دو بار نہیں، مسلسل، تو اپنی طرف توجہ کھینچ ہی لیتا ہے۔ اور گویا ایسا ہی ہے کہ اب یہ ایک شخص کے بجائے ایک عہد کی شاعری کا زمانہ آ چکا ہے۔ اب ایک تسلیم شدہ شاعر کے اشعار کی طرف توجہ ضرور ہو گی، لیکن بس ایک بار! اور پھر ایک لمحے کے لیے قاری اپنے کو اپنے زمانے میں رکھ کے ذرا سوچنے لگ گیا تو، وہ پلٹے گا تو ان بے نام شاعروں کی طرف جن میں سے ہر ایک نے دو چار، دس بیس شعر ہی سہی مگر کہے ہیں۔ اپنے قاری کی فہم و فراست پر اعتماد کر سکے، اپنے عہد کی علم و دانش کی Frequency کو سامنے رکھ کر اپنے زمانے کا ریزہ ریزہ درد سمیٹ سکے!

مختصر سی تعداد میں ان اشعار کے کہنے والے بڑے شاعر نہیں کہلائیں گے مگر ان کے شعر بڑے شعر کہلائیں گے؛ اور یہ سب بڑے شعر مل کے اس عہد کی غزل کو وہ مجموعی عظمت عطا کریں گے جسے نظر انداز کرنا آساں نہ ہو گا۔

●●

مراسلات:

کتابخانہ خدا بخش میں کشمیریات

(۱) — اسماعیل بینش کشمیری کا دیوان غزلیات میں نے ابھی تک کہیں نہیں دیکھا۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں اگرچہ اس کی فارسی مثنویوں کا مجموعہ موجود ہے لیکن غزلیات کا دیوان صرف خدا بخش کتابخانے میں موجود ہے۔ اور یہ دیوان اگرچہ اوّل و آخر نہیں رکھتا لیکن پھر بھی نادرالوجود ہونے کی بنا پر بڑی توجہ اور حفاظت کا طالب ہے۔ اس شاعر پختہ کار پر ابھی کام ہونا باقی ہے جو مجھے امید ہے شعبۂ فارسی کشمیر یونیورسٹی اور اس منظم کتابخانے کے باہمی تعاون سے انجام پا سکتا ہے۔

اسماعیل بینش کشمیری کا ایک تازہ تر دیوان بھی شمارہ H.L.547 موجود ہے جو آج سے اکیاسی [۸۱] سال پہلے نقل ہوا ہے۔ یہ بھی بہرحال تقابلی مطالعہ کے سلسلے میں مفید ہوگا۔

(۲) — دیوان غنی شمارہ H.L.594 کہنا چاہیئے کہ بینش کشمیری کے دیوان کی طرح اس موقر کتابخانے کا قابلِ افتخار گراں پایہ نادرالوجود اثاثہ میں سے ایک ہے۔ یہ دیوان مکمل ہے، انتہائی خوش خط ہے اور زمانے کی دستبرد سے محفوظ بھی رہا ہے۔ غنی کشمیری کی وفات کے اکیاسی [۸۱] سال بعد لکھا گیا ہے۔ سالار جنگ میوزیم میں میں نے دیوان غنی دیکھا ہے جو ۹۰ سال بعد (غنی کی وفات کے بعد) لکھا گیا ہے گویا دونوں تقریباً ہم سن ہیں اور اس لحاظ سے نادر اور قدیم ترین دیوان ہیں تمام ہندوستان میں۔ لیننگراڈ کے کتابخانے میں میں نے دیوان غنی کو دیکھا ہے جو غنی کی وفات کے ۴۲ سال بعد لکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے پوری دنیا میں غنی کے فقط تین قدیم ترین دیوان ہیں جن میں سے ایک اس مشہور عالم کتابخانے کی زینت بن چکا ہے۔ تنقیدی زاویے سے ابھی غنی کشمیری کے فن پر اور ایک مطلق صحیح متن والے دیوان کو منظرِ عام پر لانے کا کام باقی ہے جو مجھے امید ہے اس عظیم المرتبت کتابخانے کے تعاون سے پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔

بعض اور نسخے بھی ہیں جو اگرچہ نادرالوجود نہیں ہیں لیکن کشمیر کی فارسی زبان و ادب کی اہمیت کے پیش نظر تحقیقی و ادبی کام میں خاصے ممد و معاون ہوں گے۔

ڈاکٹر شمس الدین احمد
پروفیسر و صدر شعبۂ فارسی
کشمیر یونیورسٹی۔ سری نگر
۶ر فروری ۱۹۸۵ء

مطبوعاتِ جدیدہ:

تحائفِ موصولہ

● "تراثنا" یعنی ہماری میراث (سہ ماہی جرنل، شمارہ ۳) ناشر: مؤسسہ اہل بیت، قم، ایران۔

اہم مشتملات: نئی تحقیق پر ایک طائرانہ نگاہ (مولوی اسد) چوتھی دور پانچویں صدی ہجری میں شیعوں کے نزدیک فقہ کا تصور (شیخ جعفر سبحانی) عربی کتابوں میں اہل بیت کا ذکر (سید عبدالعزیز طباطبائی) الحاج ہدایتی قم (ایران) کے کتبخانہ میں محفوظ مخطوطات (سید احمد الحسینی) "اسند عنہ" کی عام اصطلاح (سید محمد رضا الحسینی)

● تاریخ پیشرفت اسلام: از ڈاکٹر شہین دخت کامران مقدم (صفیاری) مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ص ۱۵۶، ۱۹۸۵

مشتملات: پیغمبر اسلام حضرت محمد بن عبداللہ، اسلام کس طرح پھیلا؟ جزیرۃ العرب میں اسلام کی تبلیغ، ایران میں اسلام، ہند و پاک میں اسلام، چین میں اسلام، افریقہ میں اسلام، روس میں اسلام آخر میں پہلی صدی ہجری سے چودھویں صدی ہجری تک "تاریخ پیشرفت اسلام" کا ایک جائزہ۔ ہر صدی ہجری کے اسلامی ممالک کے جغرافیائی نقشہ کے ساتھ۔

● از حرف تا بہ حرف: از محمد عصام عظیم آبادی، شمیم پبلیکیشنز اے/۸، بلاک نمبر ۳، گلشن اقبال کراچی، ۱۹۸۴ء، ص ۲۸۸۔

مشتملات: سرمایہ بابیادآں، حرف اول (رئیس امروہوی)، آہنگ فارسی، عصام اور ہمارا کلچر (پیر علی محمد راشدی)، نغمات عصام (حکیم نثار احمد علوی)، عصام کی فارسی شاعری میں جدت کا ہنر (شاعر لکھنوی)، عصام کی فارسی شاعری (حکیم مشارق احمد خان)، سن طباعت "از حرف تا بہ حرف" (حکیم نثار احمد علوی)، پاکستان میں فارسی: جائزہ و دلائل (محمد عصام عظیم آبادی) فارسی در پاکستان بحوالہ برصغیر پاک و ہند (محمد عصام عظیم آبادی) حمد، نعت، منقبت، غزلیات، تضمین، نظم و قطعات۔

● قلمرو: از محمد ذاکر علی خان، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن ایم آر کیانی روڈ کراچی، پاکستان، ۱۹۸۴ء، ص ۳۲۴: صاحبِ طرز انشائیہ نگار ذاکر علی خان کے خوبصورت انشائیوں کا مجموعہ۔

● خلائی تحقیقات کے فائدے: انتخاب وتدوین سباستیان استریڈ، مترجمہ از رئیس بانو زیدی، ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی، ۱۹۸۴ء، ص ۹۷۔

● انسان کیلیے خلاء کا چیلنج: ترجمہ از رئیس بانو زیدی، ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی، پاکستان، ۱۹۸ء، ص ۱۰۱۔

● مہر دو نیم (مجموعہ کلام) افتخار عارف، مکتبہ دانیال وکٹوریہ چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی، پاکستان، ۱۹۸۴ء (اشاعت دوم)، ص ۱۸۴۔

مشمولات: پیش نامہ از فیض احمد فیض، نئی تنہائیوں کا ورد مند شاعر (گوپی چند نارنگ) نظمیں، غزلیں۔

● چہار بہار: ملفوظات شیخ الاسلام حضرت نوشہ گنج بخش قادری (م ۱۰۶۴ھ) ترجمہ دو از سید شرافت نوشاہی، بہ اہتمام سید عارف نوشاہی، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، ادارہ معارف نوشاہیہ۔ ساہن پال شریف، تحصیل پھالیہ گجرات پاکستان، ۱۹۸۴ء، ص ۱۷۷۔

● رخت سفر (مجموعہ کلام)، محمد ذاکر علی خان، علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن آف پاکستان ایم۔ آر۔ کیانی روڈ، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۳۶

● چند بزرگ: اختر حامد خاں، بزم ارباب سخن، پاکستان، دولت ہاؤس وی ڈی ۲۶ رنگی کراچی پاکستان، ۱۹۸۴ء، ص ۲۰۰

مشمولات: پروفیسر کرار حسین، بھائی صاحب، علامہ مشرقی، مولانا مودودی، علی میاں، حامد اللہ، عزیز احمد، میجر راجہ نواز، سید مظفر حسین، نعیم بھائی۔

● چند خاکے: اختر حامد خاں، بزم ارباب سخن پاکستان، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص ۳۲۸

● خالی آسمان (مجموعہ کلام)، شہزاد احمد، مطبوعات، مکان ۲۵، گلی ۱۲۷، نسبت روڈ، لاہور، پاکستان، ۱۹۸۶ء، ص ۲۰۳

● گنگا جمنی میدان: اختر حامد خاں، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۲۵۶

▲▲

تبصرہ:

کتاب شناسی

(پہلا شمارہ ۱۹۸۶ء)

مرتبین: اختر راہی، سید عارف نوشاہی، مکتبہ علمیہ لاہور (رابطہ کے لیے: مکان نمبر ۲۵، گلی ۲۷ الف ۲/۶ اسلام آباد پاکستان)، ص: ۲۴۰، قیمت: ۵۰ روپے

شیخ محمد طاہر محدث پٹنی کی نو دریافت تالیف: الولایۃ و نصیحۃ التوصیلۃ والزملاۃ جو خیر پور پبلک لائبریری کے ذخیرے سے ڈاکٹر سلیم اختر نے ڈھونڈ نکالی ہے اخلاق و آداب سلطنت پر مختصر لیکن اہم فارسی مخطوطہ ہے جسے تمام و کمال پیش کر دیا گیا ہے

برہان قاطع پر ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کا مستقل مضمون ہے۔ ڈاکٹر مظہر شیرانی نے اپنے دادا پر لکھا ہے "حافظ محمود شیرانی، بحیثیت کتاب شناس" محمد حسین تسبیحی کے فارسی مضمون "کشف المحجوب ہجویری کے مخطوطات: مطبوعہ نسخوں اور تراجم کا کتابیاتی جائزہ" کا ترجمہ ڈاکٹر عارف نوشاہی نے پیش کیا ہے۔ مشہد (ایران) کے مشہور نوجوان محقق نجیب مایل ہروی نے کتاب شناسی و نسخہ شناسی آثار علاؤ الدولہ سمنانی پر قلم اٹھایا ہے۔ ہرات کے فن تجلید پر "چند آرا" اوکتے اسلانا پا کا مضمون اختر راہی نے ترجمہ کیا ہے اور گجرات کے جلد سازوں پر ڈاکٹر احمد حسین قلعہ داری نے لکھا ہے۔ جناب اشرف علی نے دستاویزات اور مخطوطات کی حفاظت، پر مختصر لیکن جامع مضمون لکھا ہے۔ ڈاکٹر اختر راہی کا "کتابوں پر تبصرہ" ایسا ہی معیاری ہے جیسے پرچے میں شامل دوسرے مضامین۔ آخر میں خدا بخش سیمینار کے بارے میں ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کی رپورٹ ہے بعنوان "ہندوستان میں تصوف کے مخطوطات پر سیمینار" —— اور پھر ادارہ معارف نوشاہی کی مطبوعات کی مکمل فہرست درج ہے۔ خوبصورت ٹائپ میں نفیس کاغذ پر یہ مجلہ برصغیر کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے اور ایک خلا کو بطریق احسن پورا کرتا نظر آتا ہے۔ ہر حیثیت سے اوّل درجہ کے اس شاندار پرچے کے لیے مرتبین قابل مبارکباد ہیں۔

▲▲

بیان ملکیت سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل اور دیگر تفصیلات

مطابق فارم نمبر ۴، قاعدہ نمبر ۸

۱- مقام اشاعت : خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

۲- وقفہ اشاعت : سہ ماہی

۳-۴- پرنٹر و پبلشر کا نام : محبوب حسین

قومیت : ہندستانی

پتا : رمنا روڈ، پٹنہ-۴

۵- ایڈیٹر کا نام : عابد رضا بیدار

قومیت : ہندستانی

پتا : ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری [illegible]

۶- ملکیت : خدا بخش لائبریری، پٹنہ

میں محبوب حسین اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں ۔

دستخط پبلشر: محبوب حسین

۲۳ فروری ۱۹۸۶ء

URDU CANADA

URDU CANADA:A Tri-annual Journal of Studies in Urdu Literature. Editor: Wali Alam Shaheen. Publisher: Roushan Shaheen, Urdu Canada Publications, Post Box 2276, Station D, Ottawa, Ontario, Canada. K1P 5W4

Urdu is the national language of Pakistan and one of the major languages of India where, in Bihar, West Bengal, Andhra Pradesh, and Himachal Pradesh, it is the second official language and, in Jammu and Kashmir, it is the sole official language. It is also spoken by a number of communities living in many other countries including Britain, Norway, Canada, U.S.A., Saudi Arabia, Kuwait, Dubai, etc. Urdu conferences and mushairas (poets' gatherings) are frequently held in far flung areas of the globe. It is the language of the majority of movies made in the subcontinent, despite, in the case of India, their being certified otherwise. Recently, in Canada, a Chair in Urdu Language and Culture has been established at McGill University, Montreal.

Urdu Canada aims at generating an interest in Urdu literature and sharing its richness in an environment where it is little known beyond academic curiosities. Also, there are some well known and aspiring writers in Canada who write in their own mother tongue Urdu.

Contents: Volume 1 Number 1 February, 1986

Progressive Movement and Urdu Poetry (Ali Sardar Jafri) Faiz and His Symbolism (Abdul Qavi Zia) Yatra to Pakistan (Joginder Paul) Ghalib. A Profile (Nuzrat Yar Khan) Faruq Hassan's Old and New Poems (Muzaffar Iqbal) New and Old Faruq Hassan (Sohail Ahmad) Eight Poems (Faruq Hassan tr. F. Hassan & S. Rajiva) Joginder Paul's new novel NADEED (Wazir Agha tr. Jai Ratan) KAF-E-BAHAR, a collection of poems by Irfana Aziz (Ahsan Ali Khan).

POETRY N.M. Rashed (tr. M.H.K. Qureshi) Majeed Amjad (tr. M.H.K. Qureshi) Saqui Faruqui (tr. M.H.K. Qureshi) Shaheen (tr. L. Lavigne & B. Bakht) Haider Ali Atish (tr. Carla R. Petievich).

SHORT STORIES:
Fatherhood Syed Moin Ashraf Coward Sa'adat Hassan Manto tr. Faruq Hassan

Ghalib, the great Urdu and Persian poet, died on February 15, 1869. Faiz Ahmad Faiz, an internationally acclaimed Urdu poet, now dead, was born on February 13, 1911. To commemorate the occasion, this February issue of *Urdu Canada* includes a profile on Ghalib and an article on Faiz and his symbolism.

Annual Subscription: $15.00 for individuals, $21.00 for institutions.
Single copies: $5.00 for individuals, $7.00 for institutions.

دوبارہ نکاح کرنا چاہتا ہے۔" اسے اپنی شادی کا خیال ذرا بھی نہ
رہا اور اپنے والدین سے صلح کرانیکا عزم کرلیا چنانچہ فوراً رعنا نے
ٹھان لیا کہ "اپنی ماں سے التجا کروں گی اور ہٹ کروں گی۔ اور اُن
کی رقت قلب سے مجھے کامل یقین ہے کہ وہ مان جائیں گی۔"

رمزی، رعنا کے خیالات کو سمجھ گیا، اور اُس نے رعنا پر ہزاروں
بوسۂ شفقت کی بھرمار کردی اور پھر رو رو کر کہنے لگا۔

"بیٹی اپنی ماں سے کہنا کہ میں بدقسمت ہوں میں ذلیل ہوں، رذیل ہوں،
مگر اب نادم ہوں، اور عفو کا طالب ہوں، معاف کرو بیٹی، تیرا باپ تیری
ماں کا آیندہ سے مطیع غلام ہو کے رہے گا۔ دیکھ میں رو رہا ہوں،
بتا! جس طرح تو نے مجھے معاف کیا وہ بھی مجھے معاف کردیگی؟ بتاؤ؟"

دو مہینے بعد رمزی مہربان کے سامنے اشک ندامت گرا رہا تھا،
اور رعنا شاداں و فرحاں اپنے دلدادہ خاوند کو خوشی کے گانوں سے
وجد میں لا رہی تھی، اور اس طرح زمانہ نے جو بچھڑوں کو ملا دیتا ہے
اُس اُجڑے اور ویران گھر کی بھی اُس لڑکی کے ہاتھ سے تعمیر
کرائی۔

تمام شد

نہیں ہے بلکہ جسے دل سے تعلق ہے یوں رد کر رہا ہے۔ ضعیف اور
دل ہی دل میں گھٹنے والی عورتیں بھی ناچار ہو جاتی ہیں تو اُن میں
ایک غیر معمولی جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ رعنا نے بھی ایسی
ہی جرأت سے مگر پھر بھی رو رو کر اور بھرائی آواز سے کہا "کیوں ؟"
اس سوال پر رمزی کی طبیعت میں اک سخت ہیجان سا پیدا ہوا
اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ رو دے گا۔ مگر اُس نے اپنے اعتدال
طبیعت اور اقتدار مزاج کو قایم رکھ کے جواب دیا "پوچھتی ہے
کیوں ؟ تو نہیں جانتی ! سُن تو شادی کر کے چلی جائے گی، اور تیری
ماں تنہا اور بے رفیق رہ جائے گی، وہ ترکیب نکال کہ تیری ماں
تنہا نہ رہے، اور میں اس طرح خراب وخستہ اور وہ اِس طرح مایوس
و پریشان نہ رہے، ایسی ترکیب نکال، اور پھر تو بھی شاد کام اور
کامیاب ہو، سمجھی ؟"
رعنا اس وقت خوشی سے اُچھل کے اور "ہا! جنم! بابا جنم! بابا
جان، بابا جان !" کہتی ہوئی رمزی سے لپٹ گئی اور یہ بڈھا شخص
اس وقت اپنی بھیانک آنکھوں سے استرحام اور ندامت کے
آنسو گرا کر اپنی بیٹی کے سنہری بالوں کو بھگو رہا تھا یہ وجد و استغراق
کا دل آویز سماں تھا ! دونوں خوشی کے ہیجان سے رو رہے تھے
اور اب رعنا اپنے باپ کے مطلب کو سمجھ گئی تھی " اب میرا باپ
میری ماں سے پھر اور اس مرتبہ آخری عمر کے لئے صلح کرنا اور

بہت خوف کھائی تھی' اور سوچتی تھی کہ میری زندگی کی گزار حرارت سے زلزلۂ قضا نے بیخ بنیاد سے ہلا ڈالا ہے گو کمزور ہے مگر پھر بھی اتنی کمزور نہیں کہ اپنی ناساز اور منحوس قسمت' وماشتا اس معصوم بچی کو نذر ہو جانے۔ مہربان اس خیال سے کانپ اُٹھتی تھی' مگر اپنا بچ اپنا وہم کس سے نہ کہتی تھی' اور چونکہ اس کی قوت معنویہ اس قدر پریشان ہو گئی تھی کہ وہ سوائے اذیت اور اضطراب کے اور کچھ اپنی قسمت میں برا ہی نہ سمجھتی تھی' اس لئے اُس کو خواہ مخواہ ایسا نظر آتا تھا کہ آخر مر میں بھی اسے چین نہ ہوگا اور وہ قبر میں بھی تڑپے گی۔

یہ سوچتے سوچتے اُس سگرٹ کے دھوئیں میں جو وہ پیتی ہوئی اسے ایک تصویر سی نظر آئی' کہ رعنا کے پتلے پتلے ہونٹ سوکھے ہوئے ہیں' اور وہ کانپ رہی ہے' اور جس طرح مہربان اپنی ماں کی گود میں آکر گرگئی تھی' اسی طرح رعنا بھی مہربان کی گود میں آگری ہے' اور فریاد کرکے کہہ رہی "اماں جان' اماں جان مجھے بچاؤ"' اور اُس کے پیچھے اُس لڑکی کا خاوند گھورتا سنانے ہوئے آرہا ہے' یہ تصویر دیکھکر مہربان بیہوش ہو جاتی اور اُس کا سر کرسی کی ٹیک پر بے اختیار گر پڑتا۔ مگر ہم پھر کہتے ہیں' اے عورت تجھے کیا خبر ہے!

باب دہم

رعنا جب اپنے باپ سے اجازت طلب کرنے کے لئے گئی' تو اُس کے بتانے سے سہم گئی' کیونکہ رعنا کے سوال کا اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ ایک دم اُسے چپ لگ گئی۔ پھر اُس نے اپنا سگرٹ جو بجھ گیا تھا جلایا اور خوب زور زور سے کش لینے شروع کئے' سگرٹ کا دھواں جو اُس کے سامنے جمع ہوتا تھا اُس پر نظر گاڑ دی اور استغراق کے عالم میں چلا گیا' اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک باطنی بحران اُسے تکلیف دے رہا ہے۔ رعنا لجائی اور شرمائی ہوئی اپنے باپ کے سامنے کھڑی تھی' اور اُس کے قطعی حکم سننے کی منتظر تھی۔ دل دھڑک رہا تھا اور آنکھیں قالین کے سرخ پھولوں پر گڑی ہوئی تھیں۔

پھر رمزی اُٹھ کھڑا ہوا' اور کمرے میں ٹہلنے لگا' کبھی مونچھوں کو دانتوں سے کاٹتا کبھی اپنی کھچڑی داڑھی کو ہاتھ کی کل انگلیوں سے چرکور بناتا' اور کبھی بیچ کے حصے کو انگلیوں سے مروڑتا۔ یکایک سیدھا لڑکی کے پاس آیا اور جھک کر اُس سے آہستہ سے پوچھا۔ "رعنا' یہ شخص جو انتخاب کیا گیا ہے' اسے تو چاہتی ہے"؟

بیچاری رعنا شرم اور گھبراہٹ کے مارے کوئی جواب نہ دے سکی'

رمزی پھر کہنے لگا' "بتاؤ اگر میں کہوں کہ یہ شخص تمہارا خاوند نہ ہوگا' تو تمہیں تکلیف ہوگی' بتاؤ' سچ سچ بتاؤ کیا تمہیں رنج ہوگا"؟

لڑکی ایسی ضیق اور تکلیف کی برداشت نہ کر سکی' اور اپنے باپ کی اس بیہودہ حرکت سے جس کی اُسے ہرگز اُمید نہ تھی اُس پر وہ اثر ہوا کہ وہ رو پڑی' اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے آنکھیں اب بھی نیچے ہی کو جھکی ہوئی تھیں' اور وہ اپنے باپ کو اپنے آنسو نہیں دکھانا چاہتی تھی اور ایک تسلیم اور سکون کے طرز سے سر جھکائے کھڑی تھی' اور اس وقت وہ سمجھ رہی تھی کہ میری ماں کو جو اس شخص سے نسانی نفرت ہے وہ بالکل درست اور حق بجانب ہے۔

اُسے روتا دیکھکر رمزی کہنے لگا "روتی ہے' تو بس رعنا معلوم ہو گیا کہ تو اُس شخص کو ضرور چاہتی ہے' یہ بات ہے تو سن کر یہ شادی نہ ہوگی' اور تو اُس شخص کی بیوی نہ بنے گی"۔

رعنا اب تک ایسے لاڈ پیار میں پلی تھی کہ اُس کی ذرا سی خواہش اور ذرا سی ہٹ بھی کبھی رد نہیں کی گئی تھی' مگر آج وہ دیکھ رہی تھی کہ یہ شخص جسے صرف ایک سال بھر سے اُس نے دیکھا ہے۔ اور چونکہ لوگوں نے کہا ہے کہ یہ تیرا باپ ہے تو اُسے باپ خیال کرتی ہے' غرضکہ ایسا شخص کس بیرحمی کے ساتھ گویا کبھی اُس نے شفقت کا نام ہی نہیں سنا' اُس کے سوال کو جو معمولی سوال

باب نہم

ایک دن مہربان کو اطلاع ملی کہ رمزی ہسپتول میں واپس آگیا ہے اور وہ یورپین بیوی اُس کے ساتھ نہیں ہے۔ بلکہ رمزی کے واپس آنے کا سبب وہی یورپین عورت ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ عورت بارہ سال تک اُس کی بیوی رہی۔ ایک دن ایک شخص کے ساتھ بھاگ گئی۔ اِس بے حرمتی کو رمزی برداشت نہ کرسکا اور اپنا عہدہ اور نوکری چھوڑ کر رمزی چلا آیا۔ یہ ایسی ضرب تھی کہ جس نے رمزی کو تباہ کردیا۔ اب اُس کی شکل ایسی تبدیل ہوگئی تھی کہ اُس کے دوست آشنا جو اُسے بازار میں ملتے اُسے نہ پہچان سکتے تھے۔ اِس صدمے نے ایک دم اُس کی عمر میں سالہا سال کا فرق کردیا۔ کمر جھک گئی۔ بال یکایک سفید ہوگئے۔ آنکھوں میں ایک وحشت سی پیدا ہوگئی۔ چہرہ مرجھا گیا۔ اور وہ رمزی جو پہلے اس قدر مستعد بے چین اور ہرجائی پُرہوس اور ہرائی تھا اب مغموم اور بت کی طرح ساکت رہتا تھا۔

استنبول میں واپس آکر رمزی نے اپنی بیٹی رعنا کو دیکھنا چاہا۔ اس طرح رعنا اپنے باپ کے ہاں آنے جانے لگی۔ رعنا کو اپنے باپ کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوتا تھا۔ اور اُس کا دل بہت کڑھتا تھا۔ لیکن اُس کو اتنی جرات نہ ہوتی تھی کہ اُس سے ماں باپ میں

جو تفرقہ پڑگیا تھا اُس کا سبب دریافت کرے۔ رمزی اپنی بیٹی کو جو اَب چودہ پندرہ برس کے بعد ملی تھی اپنی جان کے برابر سمجھنے لگا۔ اور اُس پر نوازش اور تحفوں کی بھرمار کردی۔

رمزی اکثر رعنا سے کہا کرتا کہ "رعنا تم اپنی ماں سے کس قدر مشابہ ہو۔ بالکل وہی صورت وہی شباہت ہے جو تمہاری ماں کی اُس وقت تھی جبکہ میں نے اُس سے شادی کی۔ سارے عادات ساری حرکات اُنہیں کے سے ہیں۔ بات کرنے میں لفظوں کے آخری حرفوں کو جلدی سے بالکل اُسی طرح چھوڑ جاتی ہو جیسی تمہاری ماں چھوڑ جاتی تھیں"۔

ناظرین کو خیال ہوگا کہ مہربان رعنا کی صورت وحرکات رمزی سے مشابہ پاتی تھی اصل بات یہ ہے کہ دونوں اپنی اپنی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور رعنا میں باپ اور ماں دونوں کی بعض بعض عادتیں بعض شباہتیں موجود تھیں۔

رعنائی سیاہ آنکھیں سنہرے بال گلابی چہرہ اور سب سے بڑھ کر جیرہ کا بھولا پن سب کی نظروں کو اپنی جانب مائل کرلیتا تھا اور اُس کے [illegible] کا چرچا بہت جلد استنبول کے گھرانوں میں ہونے لگا۔ [illegible] سی [illegible] سے مانگ آنے لگی۔ آخر ایک دن مہربان نے ایک [illegible] کو جس کا مہربان سے [illegible] پاس خاطر رکھا [illegible] اس کے لڑکے کے ساتھ [illegible]

شادی کرنے کا وعدہ کردیا اب تک جتنے گھرانوں سے درخواستیں آئی تھیں مہربان نے انہیں رد کردیا تھا کیونکہ اس خیال سے اُسے نہایت تکلیف ہوتی تھی کہ اب اس کی پیاری بیٹی اسے چھوڑ کے دوسرے کے گھر چلی جائے گی اور وہ مادرانہ عمیق محبت جو اُسے اس خود غرضی کی تحریک کرتی تھی کہ رعنا کو اپنے پاس سے جُدا نہ ہونے دے سینکڑوں بہانے اُس کی طبیعت میں پیدا کردیتی کبھی وہ خیال کرتی کہ ابھی لڑکی کی عمر کم ہے کبھی طلبگار گھرانے کو وہ نہ سمجھتی غرض کہ ایسی بنا پر ٹالے بالے بتا دیتی مگر آخری درخواست ایسی جگہ سے ہوئی اور ایسی اچھی تھی اور خود رعنا کی اپنی خواہش اس طرف معلوم ہوتی تھی کہ مہربان کو اس وقت اِس درخواست کو منظور کرنا ہی پڑا اگرچہ اُس نے بہت اضطراب کے ساتھ منظور کیا۔ اور پھر رعنا سے نہایت رنجیدہ مگر پھر بھی متین آواز سے کہا "بیٹی جاؤ اپنے باپ سے بھی اجازت لے آؤ"۔ جس وقت اُس نے یہ فقرہ کہا بحراضی کے اُفق سے خیال کی مانسون اُٹھی اور گھٹا اُس کے دل سے ٹکرائی اور آنکھوں سے پانی برسا گئی جس کے قطرات کو فوراً اُس نے اپنے باریک [illegible] رومال سے پونچھ لیا۔

مہربان [illegible] بیٹی [illegible] کے [illegible] اپنے تلخ [illegible] دل [illegible] واقعات [illegible] حالات سے [illegible] کرکے

جو اس بات سے پیدا ہوا تھا کہ رمزی اب کسی اور کی آغوش میں ہے
اور اُسے بھولے ہوئے ہے۔ تنہائی سے بیحد گھبرا اُٹھی تھی کیونکہ ہر وقت
اُسے وہی خیال ستائے رہتا تھا آخر کار ایک جمعہ کے روز دکان پر
نکاح کا اعتراف کیا۔

یہ نکاح کا ارادہ علاوہ اس وجہ کے جو بیان ہو چکی ہے زیادہ تر
اس وجہ سے بھی تھا کہ رمزی سے انتقام لیا جائے۔ مہربان کا مزاج
اور کیرکٹر ابھی اتنا صاف معلوم ہو گیا ہے کہ زیادہ توضیح کی ضرورت
نہیں وہ جو کام نہیں پسند کرتی وہ جوش اور غصے کی حالت میں انتقام
کے خیال سے کر گزرتی ہے اس وقت اُسے یہ خیال تسلی دے رہا
تھا کہ جب رمزی اس نکاح کی خبر سنے گا تو اُسے کیسا اضطراب ہوگا
عورتوں کو پھول سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ تشبیہ بالکل صحیح ہے مگر یہ
بھی ملحوظ خاطر رہے کہ مایوسی اور غصہ کے زمانہ میں وہ سراپا خار ہیں۔

مہربان جب کریم آفندی کے پاس پہنچی تو اُس نے اپنے پہلے خاوند
کا اور اس کا مقابلہ کیا اور اپنے دل میں سوچنے لگی "خدا کی شان ہے سراسر
زیادتی شرارت رمزی کی طرف سے ہوتی ہے پھر بھی خوش وہی رہتا ہے
نئی نویلی دُلہن کو آغوش میں لئے ہے اور رنگ رلیاں منا رہا ہے اور
میں بیچاری بے قصور اس بڈھے کی گود میں ہوں اب میں شکایت کی
آواز بھی نہیں نکال سکتی یہی بھلا ہے تو کیا کیا جاوے کہ وہ میرے ضعف
سے فائدہ اُٹھائے اور ...

کریم آفندی پچاس کے لگ بھگ ہو گا مگر اپنے تئیں جوان بنانے کی
کوشش کرتا تھا اور اپنی دولت کی شان سے اپنی عمر کو گھٹانا چاہتا تھا
مگر اس کی مسکراہٹ مہربان کے دل پر اثر نہ کرتی تھی اور سانولے چہرے
کی جھریاں اُس کی تاریخ پیدائش کی قدامت بتا رہی تھیں۔

مہربان کے لئے اب سوائے اپنی بیٹی کے کون تھا جس پر اپنا
محبت بھرا دل نثار کرتی رات دن اُسی کو چاہتی اور پیار کرتی اور پھر
بھی اُس کی محبت ترقی ہی کرتی جاتی تھی۔ کریم آفندی اس کو بھی شک
کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ بیٹی پر جو بے انتہا محبت کا اظہار
ہے یہ اُس پچھلے خاوند کی یاد کی وجہ سے ہے اور اس خیال سے
اُس کا خون جوش مارتا۔

پانچ سال تک مہربان نے کریم آفندی کے ہاں گزارے۔ یہ پانچ
سال عذاب جہنم سے کم نہ تھے کیونکہ وہ دیکھتی تھی کہ کریم آفندی کی آنکھ
میں مہربان کی بیٹی کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ مگر وہ مہربان اب ان تمام
تکلیفوں کو قناعت سے سہ رہی تھی کیونکہ ان مصیبتوں سے اُس نے
صبر سیکھ لیا تھا لیکن ایک شام کو اُس کی بیٹی روتی ہوئی مہربان کے
پاس آئی اور کہنے لگی "بابا نے بلا وجہ میری تحقیر کی اور مجھے طعنہ دیا
آخر کس کے صلب سے ہے تجھ سے تو یہ حرکتیں سرزد ہونی ہی تھیں"
یہ طعنہ کیسے برداشت کیا جا سکتا تھا خود تو برداشت بھی کر لیتی مگر بیٹی
رضا کو ذلیل کرنا برداشت نہ ہوگا۔ ہرگز برداشت نہ ہوگا ...

رضا کو لیکے رمزی کے سامنے نکلنے کی طرح خاموشی اور صبر کے ساتھ نہیں بلکہ
چیختی چلاتی اور غضبناک ہوتی ہوئی اس آدمی کے گھر سے نکلی اور پھر اپنی ماں
کے ہاں آگئی۔

یہاں پہنچ کر اُسے آرام ملا اور اپنی بیٹی کی تعلیم و تربیت اور اُس کی خوشی
کی جستجو کے سوا مہربان نے دنیا کی خواہش اور ہر امید ترک کر دی۔ لڑکی
جب بڑی ہوئی تو اپنے پہلے خاوند کا ابتدائی عشق اور اس زمانہ کی مسرت کا
نقشہ مہربان کی آنکھوں میں پھرنا شروع ہو گیا کیونکہ ہو بہو رضا کی ہر چیز
دن دن اپنے باپ کے مشابہ تھی حرکت میں بات چیت میں مشابہ ہوتی جاتی
اور لڑکی نے جب ہوش سنبھالا تو وہ اکثر اپنے باپ کا حال پوچھا کرتی ان سوالوں پر
سوائے اس کے کہ مہربان روتی تھی اور اپنی طبیعت کو روک نہ سکتی اگر ہچکیاں بندھ جاتیں
رضا کو اور کوئی جواب نہ ملتا۔ رضا نے جب دیکھا کہ ان سوالوں سے ماں کو تکلیف
ہوتی ہے تو آئندہ اُس نے بھول کر بھی اپنے باپ کا نام نہیں لیا۔

الغرض آج اُن خطوں کو پڑھ کر گذشتہ زمانہ کے کل حالات اس کے دماغ میں
پھر گئے اور اس نے خطوں کو تہ کر کے پھر صندوق میں رکھ دیا اور ایک ٹھنڈا
سانس بھر کے کہا "آہ! بے بس عورت کی ذات"۔

سات برس ہو گئے ہیں کہ اسی طرح بے اولاد بے نیاز اور وہ اس زندگی
بسر کر رہی ہے اور اپنی بیٹی کے آئندہ زمانہ کی خوشی کا ہر وقت خیال
پیش نظر رکھتی ہے۔

اور گزشتہ مصیبتوں کو بھول کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم خوش رہیں گے۔" آہ! اس عورت کے واسطے جواب بھی اپنے خاوند کی شیدا تھی، یہ وعدے کیسے خوش کن اور کیسے امیدیں دلانے والے تھے، باوجودیکہ ناظرین خیال کر سکتے ہیں کہ ان دونوں کی امیدیں کیسی بے بنیاد اور شرع کی لاعلمی پر مبنی تھیں، وہ اب کس طرح نکاح کر سکتے ہیں! بہرحال رمزی کے وہ خطوط جو وہ اپنے مقام ماموریت سے بھیجا کرتا تھا اس وقت مہربان کے ہاتھ میں ہیں، اور وہ اس جھوٹے اس دغاباز آدمی کے ان الفاظ کو غصہ مگر پھر بھی کچھ شرم کے ساتھ پڑھ رہی ہے: "آپ کی پریشانیوں سے میں تمہارا ہی خیال کر کے نجات پاتا ہوں راتوں کو پڑا ہوا اپنی پیاری مہربان کے تصور میں گزارتا ہوں، انشاء اللہ دو سال بعد استنبول آؤں گا، اور پھر ہم ایک جگہ ہوں گے اور پھر سب پچھلی باتیں فراموش کر دیا کریں گے، یہ دو سال بھاری معلوم ہوتے ہیں، تیرے تمہارے فوٹو ہی کو پیش نظر رکھ کر اپنی تسلی کرتا ہوں، ہاں جب آؤں گا تو اپنی بچی کو بھی تو دیکھوں گا، اپنی پیاری بچی کو گود میں لوں گا، اگر تم اس کی بھی تصویر بھیجو۔"

بیچاری بھولی عورت کے پاس جب یہ خطوط پہنچتے تھے، تو وہ رمزی کی سب بیوفائیوں اور جفاؤں کو بھول گئی اور اس نے اسے محبت آمیز جواب لکھے تھے لیکن آخری خط کا جب بہت دنوں تک جواب نہ آیا تو اسے خیال ہوا کہ شاید پہنچا نہیں، دوسرا خط لکھا، اس کا جواب

نہ ملا۔ دو برس اس طرح گزرے اگر مہربان کو خبر ملی تو یہ ملی کہ رمزی کی ماں کو اس تمام خط و کتابت کی اطلاع ہو گئی، اور اس نے نہایت شدت کے ساتھ رمزی سے اس معاملہ میں اپنی ناراضی ظاہر کی اور کہا کہ دیکھو اگر تم اس حرکت سے باز نہ آؤ گے تو یاد رکھو کہ میں تمہیں سخت سزا دے سکتی ہوں، میں تمہیں اپنی فرزندی سے خارج کر سکتی ہوں، مہربان کو ایسی دشمنی کی امید نہ تھی۔ اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں نے رمزی کی ماں کا ایسا کیا بگاڑا ہے جو وہ اس طرح پیچھے پڑی ہے۔

آخرکار ایک دن اس ضعیفہ اور چاہنے والے دل پر وہ آخری اور سب سے زیادہ سخت چوٹ آئی جس نے اسے پارہ پارہ کر دیا، اسے معلوم ہوا کہ رمزی نے وہیں کسی یورپین عورت کے ساتھ شادی کر لی۔ اف ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اور اس کا ضعیف وجود اس صدمہ کی برداشت نہ کر سکا، صاحب فراش ہو گئی، اور شدید بخار میں مبتلا ہو گئی کسی کو اس کی زندگی کی امید نہ رہی۔ اور خود وہ موت کی طالب تھی اور معلوم بھی یہی ہوتا تھا کہ موت ایک افعی کی طرح اس کے جسم سے لپٹ گئی ہے اور اس کے کل جسم میں قطرہ قطرہ زہر ڈال رہی ہے مگر موت مانگے سے نہیں آتی، بخار اتر گیا، اور مہربان بستر سے اٹھی، تاہم ہر وقت ناامیدی اور غم کی تصویر بنی رہتی تھی، مہربان کی ماں اسے تسلی دینے سے عاجز آگئی اور ہمیشہ اس کے خوش کرنے کی تدبیریں سوچتی تھی، ایک دن مہربان جو ہمیشہ تنہا کونے میں پڑی رہتی تھی۔ اپنی ماں سے کہنے لگی: "اماں،

میں تو اس تنہائی سے گھبرا گئی۔" بیشک! ماں بھی اسے اس تنہائی سے نکالنا چاہتی تھی۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ مہربان کی ماں نے سخت اصرار کیا۔ دھمکیں دیں، خوشامد کی، اپنے مادرانہ حقوق جتائے، اور سب اسواسطے کہ مہربان کریم آفندی کے ساتھ جس سے درخواست کرتے پورا سال ہو گیا تھا نکاح کرلے۔ کریم آفندی ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا جس کی بیوی مر چکی تھی اور وہ دوسری بی بی کی تلاش میں تھا، غرضکہ مہربان کی ماں اسکے ساتھ نکاح کرنے پر مصر تھی اور مہربان کے الفاظ دہرا دہرا کے اسے مجبور کرنا چاہتی تھی اور کہتی تھی کہ: "تم وہ تو تمہیں نے کہا کہ اماں میں تو اس تنہائی سے گھبرا گئی۔"

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ سعادت و اقبال جن سے بیوفائی کرتے ہیں، اور مصائب جن کی تاخوش رفیق ہوتی ہے۔ یہ بیچارے مصیبت کے مارے ایک اضطراب سے نکلتے ہیں، اور آہستہ آہستہ نہیں اس غم کے کہ کہاں جا رہے ہیں۔ دوسری رنج و الم کی دلدل میں جا کر پھنس جاتے ہیں، اقبال کی جانب انہیں ایک طبعی کشش ہے، رونا ان کی قسمت میں ہے ذرا ہنسے بولے کہ گھبرا اٹھے، اور خود شرما گئے کہ ہم نے کیا کیا، ایسے بازیچۂ قضا تشنہ جفا ستم دیدہ مخصوص کو ہم لوگ بدقسمت کے نام سے یاد کر کے اطمینان سے سمجھ جاتے ہیں اور ان کی حالت سمجھنے سے اپنی نظر پھیر لیتے ہیں۔

غرضیکہ رونے دھونے زاری کا وقت نہیں، مہربان اس عالم رقابت سے دور کر

ہوش آیا تو کہنے لگی "بہت خوب! بہت خوب! مجھے چھوڑ دو! میں اپنی ماں کے گھر جاؤں گی۔ مگر میری لڑکی مجھے دیدو.... اور بس! مجھ سے اُس کا ذکر مت کرو" کہتی ہوئی اور دل ہولی" ماں سے اپنی بچی کو گود میں لینے کو جلدی اُس کمرے سے باہر ہی نکل تھی کہ مہربان نے اپنی ساس کو دیکھا کہ دیوار سے لگی کھڑی ہے اور گویا سب حال جانتی ہے۔ پھر بھی مہربان کو دیکھ کر پوچھنے لگی: کیوں! کیوں کیا ہوا!"

رمزی مہربان کے پیچھے پیچھے آیا اور کہتا رہا "بہت اچھا جو تمہاری رائے ہو، وہ کرو، مگر میری پیاری مہربان! یہ وعدہ کرو کہ تم مجھے معاف کر دو گی۔" مگر مہربان اس کا جواب دینے کیلئے نہ ٹھری اور برابر دروازہ کی طرف چلتی رہی۔ رمزی نے مہربان کو پکڑ کر اور اسکے زرد ضعیف رخساروں کو چوما اور یہ کہنا شروع کیا "خبردار مجھ سے علیحدہ ہونیکی کوشش نہ کرنا۔ میں تمہاری حسرت میں زندہ نہ رہونگا اور ان تحیرو! اپنا رات کا کرتا مجھے دیجاؤ! میں اُسے بطور تمہاری یادگار کے رکھونگا اور اُسے چوما کرونگا۔ خدا کیواسطے مجھے چھوڑنا ایک ہفتہ اپنی ماں کے پاس جا رہو اور آرام کرو۔ میں پھر تمہیں جا کے لے آؤں گا۔"

مہربان اپنے تئیں چھوڑا کر اپنی لڑکی اور اُسکی دائی کو لیکر گاڑی میں جا

باب ہشتم

"اماں! اپنے آپ کیوں ہنس رہی ہو؟"

"کچھ نہیں بیٹی۔"

"وہ زرد زرد مستعمل کاغذ تمہارے ہاتھ میں کیا ہیں؟"

"یہ اُس قرض کی سندیں ہیں جو واپس نہیں ملا۔"

"میرے تو پرانے خط معلوم ہوتے ہیں۔"

"نہیں بیٹی۔"

بات یہ تھی کہ آج مہربان اپنی چودہ برس کی بیٹی کے سامنے حرفِ حقیقت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہاں وہ کاغذ بیشک ایک ایسے قرض یعنی عشق کی سندیں تھیں جو واپس نہیں ملا۔ وہ پرانے خطانے جو ایک اشعار کی کتاب میں رکھے ہوئے آج ملے تھے اور ایسے پھول کی پتیوں کی طرح معلوم ہوتے تھے جن کا رنگ دو کتاب میں رکھے رکھے غائب ہو چکا ہو۔ تاہم وہ ایک پُر لطف زمانے کی یاد دلاتے تھے، اور اس وجہ سے مہربان کے نزدیک اُن کی قدر و قیمت بہت زیادہ تھی۔

مہربان کی بیٹی رعنا نے اپنی ماں کے مبہم جوابات سے یہ خیال کرلیا کہ وہ کسی ایسے کام میں مشغول ہے جس کی خبر مجھے نہیں کرنا چاہتی اور

ہوتے ہیں اور اُسے اس حال میں جہاں تک ہوسکے رکھنا چاہتے۔ ایک بہانے سے باہر چلی گئی۔ اور جب مہربان کمرے میں اکیلی رہ گئی تو اُس نے پھر اُن خطوط کو پڑھنا شروع کیا۔

آہ! ان گذشتہ چودہ سالوں میں کیا کیا کچھ نہ ہو گیا! اس وقت اس عورت کے دماغ میں کل مصیبت خیز ماضی کا نقشہ پھر گیا۔ جب مہربان اپنے خاوند کے گھر سے چلی آئی تھی تو اُس کی ماں اور اُس کی ساس دونوں نے رمزی سے اصرار کیا کہ مہربان کو طلاق دیدے۔ مہربان کی ماں نے تو اس لئے کہ وہ اپنی بیٹی کو ایسے متلون مزاج، ناقابلِ اعتماد شخص کے ہاں نہ رکھنا چاہتی تھی اور اُس بے رحم ساس نے اس لئے کہ اُسے مہربان سے بغض ہو گیا تھا۔ اس دوطرفہ اصرار کو رمزی رد نہ کر سکا اور مہربان نے رمزی کے ساتھ نکاح کرنے سے انکار کر دیا اور تھوڑے دنوں کے لئے اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں دوسرے شہر میں چلی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس سے رمزی کو بیحد ناامیدی اور غصہ پیدا ہوا۔ اسی زمانہ میں اُسے کونسل کا عہدہ مل گیا اور وہ کوپن ہیگن میں شاہی کونسل مقرر ہو کر چلا گیا۔ اور وہاں کی بیوفائیوں اور کج ادائیوں پر اُسے جلانے کے لئے پھر مہربان سے عہدہ کر گیا اور اپنے عہدہ پر پہنچکر بھی انہیں وعدوں کی تکرار بذریعے خطوط کے کرتا ہے۔ میں اپنے والد کی ثروت کا محتاج نہیں رہا اور

باب ششم

چنانچہ بیچاری مہربان اپنے تمام رنج و شبہات اور تکلیف دہ خیالات کو صبر سے برداشت کر رہی تھی۔ ہر رات رمزی کسی نہ کسی بہانہ سے حمرا کا ذکر چھیڑ دیتا' اور اُس کی خوبصورتی' اُس کے حسن طبیعت' اُس کے دل آویز لباس' اور اُس کے اعلیٰ درجہ کے پیانو بجانے کی تعریف کرتا' اور پھر ہنس کے یہ کہتا: "مہربان اگر اجازت دو تو میں اُس کے ساتھ نکاح کر لوں' اور پھر وہ ہم سب کو پیانو بجا کے خوش کیا کرے گی"۔ اور جب رمزی یہ کہتا اُس کی مظلوم بی بی سوائے آنسو گرانے کے اور کسی طریقہ سے جواب نہ دیتی۔ آخر کار رمزی نے ایک دن حمرا کی محبت کا اعتراف کر ہی لیا اور کہنے لگا: "کیا کروں' مہربان! اُس عورت کی صورت میری آنکھوں سے نہیں نکلتی اور اُس نے میری کل متانت کو زایل کر دیا۔" اور یہ کہہ کے کئی مرتبہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ مارتا۔ مہربان کی حالت اُس ضعیف بیمار کی سی تھی جو سخت مرض میں مبتلا ہو اور یہ جانتا ہو کہ کچھ دن بعد مر ہی جائیگا' پھر بھی پہلے سے زیادہ زندگی کو چاہتا ہو اور ہر شخص سے زیادہ آیندہ کے متعلق اُمید یں کرتا ہو۔ مہربان اپنے خاوند کو اُس کی تمام بیوفائیوں پر بھی از حد چاہتی تھی اور نسوانی طبیعت کے موافق ذرا سا بہانہ تلاش کرتی تھی کہ رمزی کی خطاؤں کو بھول جائے اور اُسے معاف کر دے۔

تو زکی ایک چاندنی رات کو رمزی بڑی رات گئے گھر واپس آیا' اور اپنی بی بی کی مدد بغیر کپڑے اُتار کر پلنگ پر جا لیٹا اور صبح تک نیند میں "حمرا' حمرا" کہہ کہہ کے زور سے بڑاتا تھا۔ مہربان نے اپنے خاوند کی زبان سے بیہوشی کی فریادیں سنیں اور تمام رات چپکے چپکے روتا کی' روتا کی' بس روتا کی ....

صبح کو مہربان اپنے خاوند کو کپڑے پہنا رہی تھی کہ رمزی اُس کے پاؤں پر گر پڑا اور کہنے لگا: "مہربان میں ایک درخواست کرتا ہوں تم میری زندگی بچا سکتی ہو۔ ورنہ مر جاؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ میری درخواست سے تمہیں بہت تکلیف ہوگی' لیکن مجھ پر رحم کر' اس کے بعد میں ہمیشہ سے زیادہ تمہارا غلام رہوں گا۔ میری حالت پر دل دکھاؤ اور میری حمایت کرو۔"[1]

باب ہفتم

مہربان کانپنے لگی' اور اگرچہ اُس کا دل بتا رہا تھا کہ رمزی کیا کہنا چاہتا ہے' تاہم اُس کی ہیبت اور وحشت سے بھاگنے کی غرض سے پیچھے ہٹ گئی اور اُسے نہ سننے کے لئے اپنے زرد چہرہ کو اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ڈھک لیا۔ پھر بھی اُس کے خاوند نے آخری مرتبہ ہر ایک بات کا اعتراف کر لیا کہ حمرا کے ساتھ نکاح کریگا اور ایک دوسرے گھر میں اُسے رکھے گا۔ اور دو شب مہربان کے ہاں اور ایک رات اُس کے ہاں بسر کرے گا۔

اس کو سن کر مہربان روئی نہیں اور نہ چیخی' بلکہ بُت کی طرح ساکت رہ گئی' اور اُسے ایسا معلوم ہوا کہ گلے میں کوئی چیز اٹکی ہوئی ہے اور وہ سانس نہیں لے سکتی۔ آخر کار یہ کہا: "اُف رمزی چھوڑ چھوڑ"۔ رمزی نے رو رو کے کہنا شروع کیا: "پیاری مہربان تم نہیں جانتیں کہ میں نے تمہیں کبھی اتنا نہیں چاہا جتنا اس وقت چاہتا ہوں' اور ہمیشہ چاہوں گا' تم سے جدا نہیں ہو سکتا' مگر آہ وہ دل مجھے مار ڈالے گی۔ صرف تم بچا سکتی ہو' مجھے صرف اُس کے ہاتھ سے چھڑا دو' پیاری مہربان!"

بدبخت مہربان اس کی تاب نہ لا سکی اور بیہوش ہو گئی جب

[1] کمہ ز کی ... ...

غرض کہ مہربان اس قسم کے خیالات کا شکار ہوگئی اور اُس نے
[illegible] اُن راتوں کو جبکہ [illegible] کوئی تسلی دینے والا
اُس کے پاس تھا، یہ خیالات بڑھتے۔ اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے۔
"وہ بچا ہے تو بچا ہے" لیکن مہربان کو اپنے چھوانے کے لئے
ایک ترحمی نظر ایک خندہ زیرلب ہی کافی ہے اور جب وہ کسی
کی ہمتی ہوئی تو اس بات کا علم کہ رمزی سے انتقام لیا اُسے
کس قدر شادکام کرے گا۔ اور پھر وہ اپنے خاوند کے چہرے پر جس نے
اُس کے جذبے مادہ اُٹھایا کیسے اطمینان اور خوشی اور استہزاء
کی نظر ڈالے گی!

ازدواج کے دوسرے ہی برس میں اس عورت کے دل میں
بے ذرّشت اور قیمت ناشناس خاوند سے انتقام لینے کے لئے
یہ ہوس پیدا ہوئی کہ مردوں سے جیسی بیوفائی سیکھی ہے ویسی ہی
بلکہ اُس سے زیادہ وہ اُن کے ساتھ کی جائے۔"

چنانچہ اس عمل کی طرف اُس نے پہلا قدم ڈالا۔ پہلی مرتبہ اُس جوان
کی طرف مسکرا کر دیکھا، جوان کی طرف سے اُس کا جواب اسی طرح کر
ملا، اور اُس نے اپنی گردن اس طرح جھکائی گویا مہربان کی نوازش
اور مرحمت کا طلب گار ہے۔ مہربان نے نوجوان کے دل پر
اپنی ذرا سی ادا کے اثر کا تماشا دیکھا، اور پھر ادھر اُدھر رمزی
اپنے ذاموشگاں؟ غفلت شعار اور ہے، خاور مزی کے لئے یہ نظ

دہ رانی اس سے کہ اسے یہ ساں دکھانے اور [illegible] تو اس عورت
کے پاؤں پڑتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اُس لڑکی کو دیکھ کر ناخوش
نہ ہوں گی، نے تو بھی دیکھو اور ناخوش نہ ہو۔ یہ نوجوان گردن
جھکاتا ہے اور میرے پاؤں پر پڑا چاہتا ہے رمزی! تو اُس
عورت کو پیار کر، میں بھی اس سے ہنسی مذاق کروں گی، کیوں!
اس بات پر راضی نہیں، اس نظارے کو ٹھنڈے دل سے کیا
دیکھ سکتا! اس منظر کو دیکھتے ہی کیوں خون جوش مارنے لگتا ہے؟
گزرمری اس دردانگیز و مصیبت خیز نظارے سے ضرور ڈر
جاتا کیا معصوم عورتوں کے دل میں ایسے خیالات پیدا ہو جائیں
اور وہ اپنے آئندہ زمانے کو پامال کرنے کا ارادہ کرلیں تو اس
سبب پر جوان معصوموں کو اس حالت میں لایا ہو لعنت نہ
بھیجا - !

مہربان کے دماغ میں اس وقت ایک مرتبہ ضمحلال چلی
اور گھبرا کے کمرے سے نکلی کہ نئے میں دوسرے کمرے سے اُس
کی لڑکی کی آواز آئی "اماں جان! میں یہاں ہوں"

مہربان نے جھٹ لڑکی کو گود میں لے کر سینے سے لگالیا۔ اور اُس
کے خیالات نے اک دم پلٹا کھایا، اور اس لڑکی کی بھولی صورت
نے جو اُسے نیکی کے فرشتے کا کام دیتی تھی، مہربان کو اپنے اصلی
اور پاکیزہ ارادے سے پھر آگاہ کیا [illegible] میں ایسے دل

اور ذلیل انتقام اور ادنی مقابلے کی قابلیت نہیں رکھتی"۔

مہربان نے پھر ہمت باندھی کہ ہر خطرہ کا مقابلہ کروں گی، اور
اپنے خاوند کو راہ راست پر لاؤں گی۔ اور اُسے اس کی امید
تھی۔!

بجز ضعف کو دیکھ کر خود ہی رونے لگتی۔ عورتوں کی طبیعت کی
طرح اس کی بھی طبیعت تھی اور یہ خیال کہ اُس کی ملکیت اُس سے چھین
لی گئی اور اب وہ تن تنہا بغیر اپنے رفیق کے ہے، اُس کی زندگی تلخ
کر رہا تھا اور اُس کا اعتدال طبیعت غائب ہو جاتا تھا۔

رمزی آج کل رات دن لباس اور سنگار ہی کی فکر میں رہتا اور
ہمیشہ نئے نئے کپڑے بدلتا، اور مہربان اکثر اپنے خاوند کے منہ کو جب کہ
وہ آرائش میں محو ہوتا، دیکھتی اور اُس کی آنکھوں سے بے اختیار
آنسو رواں ہو جاتے۔ غرض کہ مہربان اپنے خاوند کی ہر حالت، ہر
حرکت، ہر بات پر تجسس اور رنج کی نظر ڈالتی، اور اُس کی زبان سے
ایک ایک لفظ کو غور سے سنتی، رمزی جو نادانستہ کوئی لفظ کہتا، وہ
اُسے تڑپا دینے کے لئے کافی ہوتا، وہ راتوں کو نہ سوتی اور اپنی تجسس
کو جاری رکھتی۔ کبھی رمزی کی جیب ٹٹولتی۔ کبھی اُس کی میز پر کے
کاغذ پڑھتی، کبھی خواہ مخواہ خیال کرتی کہ اس وقت وہ عمرا ہی کو خواب
میں دیکھ رہا ہے۔ اور اکثر وہ اپنی تحقیقات میں کامیاب بھی ہوتی۔
کیونکہ کبھی اچانک کوئی چھلا مل جاتا جو اُسے رُلا دیتا، کبھی کوئی پرزہ ملتا
اور کبھی رمزی کو خواب میں بڑبڑاتے سن لیتی جو گو صاف سمجھ میں نہ آتا
تاہم اتنا پتہ لگ جاتا کہ رمزی کس کا خواب دیکھ رہا ہے۔

مہربان کو یقین تھا کہ اُس کے خاوند نے مانیا اپنی والدہ سے اپنے
نئے عشق کا حال کہہ دیا ہے، اور بجائے اس کے کہ رمزی کو اس [illegible]
باز رکھے، مہربان کو نظر آتا تھا کہ وہ بے رحم عورت اُسے اور شوق دلاتی
ہے، اس آتش عذاب میں بُھن کر مہربان اعتدال اخلاق سے بھی بیٹھے
تھی، اُس نے ایک کتاب میں پڑھا تھا، جو جلاتے ہیں وہ خود جلتے
ہیں، اور جو بے وفا ہوتے ہیں اُن کی ساتھ بے وفائی کی جاتی ہے، وہ سوچتی
"اگر یہ بات سچ ہے تو سارا قصور رمزی ہی کا ہوگا، اگر میں اُسی کا طرز
عمل اختیار کروں کیونکہ مجھ میں بھی تو اُس کی طاقت ہے۔"

اس کے دل میں یہ وسوسہ ترقی کرتا جاتا تھا۔ "اس حالانکہ میں
اپنے خاوند کو چاہتی ہوں۔ مگر یہ بھی تو ضرور ہے کہ وہ مجھے چاہے، میں
اس وقت متروکہ بنی ہوئی ہوں، مگر کیوں؟ کیا میں معشوقہ نہیں ہو سکتی؟
..... زندگی ہمیشہ نہیں رہے گی، اور جوانی بھی چند روزہ ہی ہوتی ہے۔
آہ رمزی! تو نے مجھے دھوکہ دیا، میرے ساتھ بے وفائی کی، مگر سب سے
زیادہ غضب یہ کیا کہ زندگی کا تاریک راستہ بھی دکھا دیا۔ میں بھی
کیا تجھے فراموش کر کے۔ تجھے دھوکا دے کر ایک مسرور زندگی نہیں
گذار سکتی؟ آنسوؤں ہی سے سیراب کر کے سمی کر گیا میں ایک گلزار
خیال نہیں پیدا کر سکتی؟ مثلاً سامنے کے مکان میں جو سنہری مونچھ
والا جوان رہتا ہے اور ہر دم مجھ پر حسرت کی نگاہیں ڈالتا رہتا ہے کیا
صرف ایک نظر شوق سے اُسے تسخیر کر کے اُس کی پرستیدہ نگار نہیں
بن سکتی؟ اور پھر اس خیال سے کہ میں اُس کی معشوقہ ہوں لُطف اندوز ہو کر
کیا اپنے زخم جگر کا علاج کر وہ ضرور ہے ہی دونوں کا علاج ہو نہیں کر سکتی؟
اور اس طرح اپنے پوشیدہ مگر موثر انتقام کو حاصل نہیں کر سکتی؟ اپنی
زندگی میں نے اپنے خاوند کو کس لئے سونپی تھی؟ کیا اس لئے نہیں
کہ خوش گذرانی کے ساتھ زندہ رہوں، ایک خاندان پاؤں، اُسے
خوش رکھوں، چاہی جاؤں اور محبت کی ملکہ رہوں، مگر آج یہ تمام
رابطے بالکل منقطع ہو گئے۔ میرا خاوند اب کسی دوسری کی خوشی کو پورا
کر رہا ہے، دوسرے کو چاہ رہا ہے۔ دوسرے کو پیار کر رہا ہے۔ اب
میرے لئے کیا رہ گیا۔ انسان کی طبیعت میں چاہے جانے اور پسند
کئے جانے کی تمنا تو فطری ہے۔ یہی خیال مجھے مایوس کرنے کیلئے
کافی تھا کہ جب میں مر جاؤں گی تو مجھے بھول جائیگا۔ مگر زندگی ہی
میں بھولے جانے سے، نہ چاہے جانے سے، ترک کئے جانے سے،
کیا میں دیوانی نہ ہو جاؤں گی؟ میں سمجھتی ہوں کہ جتنی خودکشیاں
ہوتی ہیں۔ اُن کا باعث یہی ہوتا ہوگا کہ اپنے محبوب کی طرف سے
فراموش کاری اور بے وفائی دیکھی اور زندگی بھاری ہو گئی۔ بے رابط
بے فائدہ بے رفیق بے یار و مددگار زندگی اور ایسی زندگی کہ اپنے
بعد کوئی نشان نہ چھوڑے سب کے لئے اور خصوصاً حسین عورتوں
کے لئے تو وہ یاس انگیز عذاب ہے جو عقل گم کر دیتا ہے، ہاں اگر اب
مہربان مر جائے تو رمزی اور عمرا مزے سے کہیں گے: "ہوں" اوہ۔ اُس رقیب
سے نجات پائی، اب بس ہم ہیں اور تم، اب کوئی پریشان کرنے والا
نہیں ہے۔"

ہوگئے پر لاد کر، اور گردن بائیں جانب جھکا کے اپنی گرگرون وغیرہ کو عورت کی نگاہ سے دیکھا اور پھر خود ہی یہ باتیں شروع کیں
"نہیں مہربان! وقت ہیں تمہیں اپنا مقابل ہی نہیں سمجھتی ہو
قوت سے مگر آزادی نزدیں' تم مجھ سے بہت نیچے ہو۔ یہ میرے حسن
کی شان کے خلاف ہے کہ تم جیسی معمولی شکل کی عورت سے شرط
باندھوں کہ کون دلربائی میں زیادہ ہے۔ ہمرا کے مقابلے کے لئے
کوئی اور عورت ہونی چاہئے اگر کوئی عورت ملے ورنہ پری اور بیچارے
رمزی تو اپنی قسمت پر صبر کر۔ تم نے کیا ابھی میں نے کوئی مرد ایسا قابل
نہیں دیکھا جو اس وجود کے مالک ہونے کی تمنا کر سکے۔ تمہاری
آہ و زاری بے شک میرا دل دکھاتی ہے مگر کیا کیا جائے۔"
بیشک وہ آنسو جن کا محرک دل ہوتا ہے اور وہ آہیں جو دل سے
نکلتی ہیں کبھی بے اثر نہیں جاتیں۔ ایسے آنسوؤں کے قطرے چاہے
کیسے ہی شور و سنگلاخ زمین پر گریں ضرور وہاں ایک نہال شفقت
اُگیگا۔ ہمرا جیسی عورت پر بھی اس وقت رمزی کے آنسوؤں کا اثر ہوا
گو جتنی دیر میں وہ آنسو سوکھے اتنی ہی دیر میں اثر کے زائل ہو جانے
میں لگی۔ یہ اثر لحظہ بھر کے لئے تھا۔ ورنہ کہاں ہمرا اور کہاں یہ خیال!
ہمرا نے کپڑے اُتارے اور پلنگ پر جا کر سونگی خوشی سے لیٹ گئی۔ آج
کے واقعات سے اُس کی طبیعت نہایت خوش تھی اور اُس کے ہونٹوں
اور آنکھوں میں ایک ابتسام مسرت پایا جاتا تھا۔

باب پنجم

ایک خط پہلے ہاتھ پڑ چکا تھا اور یہ دوسرا خط تھا جو مہربان کو
اپنے خاوند کے کوٹ کی جیب میں ملا۔ کیسا خط؟ کہ جس کے پڑھتے
ہی مہربان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یوں کہئے کہ رمزی کا
کل دل ہمرا ہی کا ہو گیا۔ آہ اب زندگی بیفائدہ اور بیکار ہے میں کیسی
بدبخت ہوں! ایک وقت تھا کہ ہر شخص میری خوشی کا طالب تھا۔
اور اب سب حتی کہ خود رمزی اور ہمرا مجھے جلا رہے ہیں! اب عمر میرے
لئے ایک بار گراں ہے کیوں اس بوجھ کو اُتار کے نہ پھینک دوں!
رمزی جو کوئی بات بھی ٹھیک طور سے نہیں کر سکتا تھا اب اُس
کے لئے اشعار تصنیف کرتا ہے! رمزی جس کی زبان سے اب تک
کوئی موزوں مصرع نہیں سنا گیا تھا وہی رمزی اب اس عورت
کے عشق میں شاعر ہو گیا اور اُسے کس جوش سے لکھتا ہے۔

خندۂ گل روئے لطافت ہو تم	نور ہو تم روح محبت ہو تم
آئینۂ عرش ملاحت ہو تم	آفت ہنگام شباب ہو تم
تیرے ہی گو لطف نے زندہ کیا	خوف ہے دن رات گریہ لگا

جیتا نہ چھوڑے گا تو نے فتنہ زا
جان ہو فدا جس پہ وہ آفت ہو تم

مہربان جب اس مصرع کو پڑھتی: "تیرے ہی گو لطف نے زندہ کیا"
تو ہر مرتبہ مارے غصہ کے پیچ و تاب کھاتی اور کہتی "غضب خدا کا!
یہاں تک نوبت پہنچ گئی! اس کی میں تاب نہیں لا سکتی! اس بوجھ کے
تلے تو میرا دل پارہ پارہ ہو جائیگا! رمزی اُس کمبخت رقیبہ کو لکھتا ہے
'خندۂ گل روئے لطافت ہو تم' مگر یہاں تمام نوازشوں کا حق صحیح میرے
لئے صرف میرے ہی لئے نہیں ہے ہمرا اُس طریقہ سے کس بنا پر
اس حق کو غصب کر سکتی ہے؟"
اب مہربان کو یہ فکر تھی کہ کسی طرح سے رمزی اور ہمرا کے تعلقات
کی وسعت اور تفصیلی حالات معلوم کرے۔ گو اس کے لئے اُسے کیسی
کیسی کوششیں کرنی پڑیں گی اور کیا جھوٹ سچ بولنا پڑے گا!
مہربان اپنے خاوند کی دلدادہ تھی اس میں کوئی شبہ نہیں مگر
ان خطوط نے اُن نظروں نے جو اُس کے ہاتھ لگیں نہ صرف ان تکلیف دہ
شبہات کو بڑھایا جو اُس کے دل میں جاگزیں تھے اور اس طرح مہربان
کے عشق میں ایک قسم کا رخنہ ڈالا۔ بلکہ اُس کی عزت نفس کو بھی
پامال کیا۔
اُسے رہ رہ کے یہ خیال آتا کہ سب کچھ کرا دھرا ہمرا ہی کا ہے
جس نے میرے پیارے بھولے خاوند کو اپنے مصنوعی عشوہ و ادا
سے چلا لیا۔ یہ سوچتے ہی اُس کے صاف دل میں تاریک خیالات
جم جاتے اور پھر خدا نے وہ کیا خوفناک ارادے کرتی اور پھر اپنے

پھرتی ہو' ہر ایک روح اپنے جوڑے کی تلاش میں ہر جگہ بھٹکتی پھرتی ہے - عقل اور خیال اور حس ہر چیز کے ذریعے سے تلاش کرتی ہے اور اس قدر تلاش کرتی ہے کہ تھک جاتی ہے اور عاری آجاتی ہے اور پھر بھی اگر وہ نصف جس کی تلاش میں ہے نہیں ملتا تو زندگی سے بیزار ہو جاتی ہے اور اگر مل جاتا ہے تو میری طرح ہر قسم کے موانعات اور رکاوٹ پر غالب آکر- ایک قدرتی کشش کے ساتھ اُس سے پیوست ہونا چاہتی ہے - میں تمہارے' صرف تمہارے واسطے پیدا کیا گیا ہوں - میری زندگی کو تکمیل کو پہنچاؤ میں بغیر تمہارے زندہ نہیں رہ سکتا- وہ خوشبو جو تمہارے اس سرخ گون سے نکل رہی ہے میری جان ہے -تمہارے ہونٹوں (بالائی حصہ کا لباس) کی تہیں میری جان ہیں - یہ چھوٹے چھوٹے پاؤں میری جان ہیں -تمہاری ہنسی' تمہارا فکر' تمہاری شوخی - تمہاری متانت ' غرضکہ تمہاری کل چیز اور تم میری جان ہو- میں صرف تمہارے واسطے پیدا ہوا ہوں مجھے زندگی بخشو- بغیر تمہارے میں زندہ نہیں رہ سکتا"

حمرا "الله رے مسلسل تقریر- اور الله رے شاعرانہ خیالات - انہیں چھپوا کے شاعروں میں نام لکھوا لیجئے - آؤ بہن تم ایسے تو سرو ہی معلوم ہوتی ہے' اندر نہیں"

اس سرد اور دل شکن جواب پر رمزی کی حالت ہیجان کی سی

ہو گئی - اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا - مگر اب بھی اُس کا دل یہی چاہتا تھا کہ حمرا کے پاؤں پکڑ لے اور راز سر نو اُس سے التجا کرنا شروع کرے - مگر حمرا اور قمر اس عرصہ میں مکان میں داخل ہو چکی تھیں اور دروازہ بند کر لیا تھا - مکان میں پہنچتے ہی حمرا سیدھی اپنے کمرے میں گئی - اور سر کا رومال اور نقاب اُتار کے پھینک دیا اور ایک گھبراہٹ کا سانس لے کے کہنے لگی "الله یہ کیا عجیب وہم ہوا ہے' اُف کہیں مہربان سن لے تو ہنسی میں گل پھنسی ہو جائے لینے کے دینے پڑ جائیں - پھر کیا کیا گفتگو میں ہوں - اور دونوں میاں بی بی میں لڑائی کا باعث میں ہی ٹھیروں' اور پھر یہ ذکر آ کے نکلے استنبول تک پہنچے - سب رشتہ داروں اور دوست آشناؤں میں ہمارا ہی ذکر ہو- توبہ' توبہ' اور یہ صرف تھوڑے سے مذاق کا نتیجہ ہوا! تاہم اس میں شبہ نہیں کہ رمزی کا عشق بالکل سچا ہے' اور جو کچھ وہ کہتا ہے دل سے کہتا ہے - اگر میں اس وقت ذرا سا اشارہ کر دوں تو خدا نخواستہ وہ اپنی بی بی کو بھی طلاق دیدے گا - اس وقت بالکل بچہ بنا ہوا ہے - جو کہو وہ کرنے کو تیار ہے"

یہ کہہ کے حمرا اُٹھی - اور ایک ہفت گوشہ چھوٹی میز پر سے جس پر سیپیاں جڑی ہوئی تھیں - ایک سگرٹ کا بکس نکالا اور دیا سلائی جلا کر اپنے پتلے ہونٹوں میں سگرٹ رکھ کے جلدی جلدی دو کش

لے ترکی خاتونیں عموماً سگرٹ پیتی ہیں - ن - کہ ان کی عادت بالکل بیجا نہیں

لیکر سگرٹ روشن کیا - اور اُسی دیا سلائی سے ایک تین بتیوں والی شمع جو آئینہ کے قریب رکھی تھی روشن کی - اِس وقت کمرے کی وہ کیفیت تھی کہ بیان سے باہر ہے - اُس قد آدم آئینہ پر روشنی پڑنے سے جو چمک پیدا ہوتی تھی وہ پُر نور اُفق کی طرح معلوم ہوتی تھی' اور کمرے کا کا بچہ' گویا قوس قزح تھا - جس کے نیچے حمرا روشنی کی پری بنی کھڑی تھی +

لطف کے ساتھ سگرٹ کا کش لیتی ہوئی' حمرا آئینہ کے سامنے پہنچی' اور اپنے حسن و ادا کا خود تماشہ دیکھنے لگی' وہ بال جنہیں کس چیز سے تشبیہ دیجائے سونے سے؟ نہیں کیونکہ وہ بالکل سنہرے بھی نہ تھے - خزاں کے قرمزی پتوں سے جنہیں صبح کی ہوا پریشان طور پر بکھیرے پھرتی ہے؟ ہاں' مگر خزاں کے پتے مرجھائے ہوئے اور خشک ہوتے ہیں - اور یہ بال چکدار اور طراوت دار ہیں' اور وہ گلرنگ چہرہ' اور وہ عشوہ ساز آنکھیں جن میں سے نگاہ بھی اٹکھیلیاں کرتی نکلتی ہے' اور وہ قد موزوں جس کا دلکش تناسب صنعت قدرت کا اعلےٰ نمونہ تھا' غرضکہ ان سب چیزوں سے خود حمرا وجد میں آگئی' اور اپنے عکس کو آئینہ میں دیکھ کر اور آپ ہی "بہت خوب' بہت خوب" کہہ کر مسکرائی اور بالوں کا [illegible] کیا' اور [illegible] کے سر کا اشارہ کیا گویا اپنے عکس کو سلام کرتی ہے - اور پھر دو [illegible] اپنے زیر دندان اپنے گول [illegible] اپنی گوری گوری کلائیوں اور

کے باتیں کرنے والوں کو پسند نہیں کرتی۔ ان اور ذرا باتیں اور رونا ساتھ ساتھ نہ ہوں کہنے، کہنے، کہئے۔۔۔ بس وقت ختم ہو گیا میں واپس جاتی ہوں۔"

یہ کہہ کے حمرا اور قمرا اپنی گون کو ہاتھوں سے اُٹھا کے وہاں سے چلدیں، اور رمزی بھی ان دونوں نازک اداؤں کے پیچھے پیچھے ایسی بیتابی سے چلا گویا وہ ایک سوئی ہے جو مقناطیس کے پہاڑوں کی طاقت سوزکشش کا مقابلہ نہیں کر سکتی اُس کے عشق کا جھکڑ اُس وقت بہت زور شور سے چل رہا تھا اور باوجودیکہ اُس کے دل میں بہت سے مواضعات اور احتمالات کا گذر ہوتا تھا تاہم وہ غیر اختیاری اضطراب کے ساتھ اُن کے پیچھے چلتا رہا، اور کہتا رہا۔ "مجھ پر رحم کرو میری حالت قابلِ رحم ہے۔"

حمرا تھوڑی دور آگے گئی ہوگی کہ اُس نے کہا: "سنئے رمزی بیگ! آج شام مہربان خانم کی کیفیت سے معلوم ہو گیا کہ اُنہیں ہمارا اور آپ کا ملنا جلنا سخت ناگوار ہے، جب میں نے یہ ذکر چھیڑا کہ میری سمجھ میں یہ مطلق نہیں آتی کہ میں رشتہ داروں سے کیوں اجتناب کروں تو۔۔۔"

رمزی (بات کاٹ کر): "اس وقت تو مہربان کا ذکر ہی نہ کیجئے، آفندم۔"

اس گفتگو کے وقت اُن کا چلنا برابر جاری تھا، اب وہ ایک

روش پر پہنچ گئے تھے۔ جس کی دونوں جانب درخت تھے۔
حمرا نے جواب دیا "اگر کیوں ذکر نہ کروں، کیا وہ آپ کی بی بی نہیں ہیں، اور آپ اس وقت انہیں مکان میں تنہا چھوڑ کر یہاں کیا کہنے کے لئے آئے ہیں۔"

رمزی: "یہ عرض کرنے کے لئے کہ آپ کا عشق مجھ سے میری جان لے لے گا۔"

اس پر حمرا نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ قہقہہ لگایا اور کہنے لگی: "اوہو عشق، سودا، محبت، ہاہاہا! اللہ اللہ کیا باتیں کہہ رہی ہیں، اور خاص کر ان الفاظ کا تم جیسے آدمی کی زبان سے سننا۔"

رمزی: "واللہ میں تمہیں چاہتا ہوں اور اس درجہ چاہتا ہوں کہ دیوانہ ہو گیا ہوں۔"

حمرا: "اپنی بی بی کو کیوں نہیں چاہتے۔"

رمزی: "میں تمہاری پرستش کرتا ہوں۔"

حمرا: "لیکن یاد رہے کہ تم مہربان کے خاوند ہو۔"

رمزی: "مگر تمہارا غلام ہوں۔"

حمرا: "ممکن نہیں۔"

رمزی: "کیوں نہیں۔ مجھ سے نکاح کر لیجئے۔"

حمرا: "اوہو۔ مگر کہیں تمہاری ان باتوں کو وہ سن لے تو۔"

رمزی: "سن لے تو سن لے۔ میں ہر بات کے لئے تیار ہوں

میں پھر کہتا ہوں کہ اگر آپ میرے عشق کو۔ اس عشق کو جو مجھے تباہ کر رہا ہے رد کر دیں گی تو میں مر جاؤں گا۔ میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھ پر رحم کرو۔ یہ رمزی جو آپ کے حضور میں التجا کر رہا ہے، یہ سمجھ لیجئے کہ یہ اک بے جان وجود ہے اور اُس کی روح آپ کی ان گلرنگ ہتھیلیوں میں ہے۔"

حمرا: "مگر لوگ کہتے ہیں کہ تمہاری باتوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔"

رمزی: "میں سچ کہتا ہوں کہ میں تمہاری پرستش کرتا ہوں۔ مجھے رد مت کرو۔ اگر تم میرے عشق کی شدت سے واقف ہوتیں تو۔"

حمرا: "تمہیں یہ باتیں کرتے وقت اپنی بی بی کا خیال نہیں آتا۔"

رمزی: "میں اُس کا مالک ہونا نہیں چاہتا۔ مگر تمہارا مملوک! ہر روح کے دو حصے ہوتے ہیں۔ اس لئے اس روح کی تکمیل کے لئے دونوں حصوں کا ملنا ضروری ہے۔ ایک حصہ دوسرے حصے کو ہر جگہ تلاش کرتا پھرتا ہے۔ ہر روح اپنے باقی نصف کو ہر خوبصورت چیز میں ڈھونڈھتی ہے، وہ طلوعِ چاند میں تلاش کرتی ہے، ہر خرام موزوں میں تلاش کرتی ہے جامہ زیبوں کے کپڑوں کی لپیٹ میں، سنہرے بالوں کے پیچوں میں، دل خوش کن اور شیریں قہقہوں کی پُرپیچ دار نغمہ ساز آوازوں میں، دل آویز گرم و نرم اور ساکن گرمی میں ریشمی چھتریوں کے سایہ کے نیچے، پُراسرار نگاہوں میں۔ غرضکہ اُس قمری کی طرح جو اپنے جوڑے کی تلاش میں پھر پھراتی

عورتیں دنیا کی سب باتیں اور سب تعیبتیں ٹھنڈے دل سے برداشت کریں گی۔ مگر یہ کہ حسن کے معاملہ میں کوئی اُن سے بڑھ چڑھ کے رہنا چاہے۔ صرف وہ رقابت جو حسن کی کشمکش سے پیدا ہوتی ہے اور جس سے اُن کی عزت نفس پامال ہوتی ہے عورتوں کو سب سے زیادہ تکلیف دیتی ہے اور اکثر موقعوں پر عورتوں کی رنجیدگی۔ جس کا کوئی باعث نظر نہیں آتا اور جس کو دیکھ کر مرد حیران و پریشان ہوتے ہیں اسی پر مبنی ہوتی ہے۔

اب مہربان اکثر نہایت خوفناک خیالات میں غرق رہتی۔ اور اُس کی نظر کے سامنے یہ نقشہ کھنچ جاتا کہ مصیبت اک اک قدم بڑھاتے اُس کی طرف آرہی ہے اور وہ اس سے خوف زدہ ہو کر چلا اٹھتی۔ مگر اُس کی لڑکی کی آواز جو کونے میں بیٹھی ہوئی اپنی گڑیا سے کھیلتی اور اُسے "تم ہم' راماں جان" کہکر پکارتی' اور وہ نورِ مسرت جو اُس کی آنکھوں سے نکلتا۔ مہربان کے کُل خوف زائل کر دیتا۔ مہربان لڑکی کو گود میں اٹھالیتی۔ اور وہ پاکیزہ مسکراہٹ جو اس زندہ گڑیا کے پیارے پیارے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر ہوتی مہربان کو تمام ہجوم آلام سے سپر کا کام دیتی۔ اور اپنی بچی کی چمکدار آنکھوں میں وہ اُمید کی جھلک پاتی مگر عورت کیسے کیا خبر ہے!

باب چہارم

رمزی چیڑ کے درخت کی ایک شاخ ہاتھ میں پکڑے اور تنے سے جسم ٹیکے ہوئے کھڑا تھا۔ گرمی کی چاندنی رات تھی اور کوئی چھ بجنے سات بجے کا وقت۔ بارہ تاریخ کا چاند اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی ڈال رہا تھا اور رمل نیچر مسرت آمیز خاموشی کے ساتھ اس نسبت سے فائدہ اُٹھا رہی تھی۔ رمزی کی نظر حمرا کے مکان کے دروازہ پر گڑی ہوئی تھی۔ دروازہ کھلا رات کی خاموشی میں ریشمی لباس کی سرسراہٹ کیساتھ۔ دو عورتوں کے شیریں اور نرم قہقہوں کی آواز ملکر رمزی کے کان تک پہنچتے پہنچتے نہایت دھیمی ہو جاتی تھی۔ دونوں بہنیں اُدھر آرہی تھیں جہاں رمزی کھڑا تھا۔ جب دونوں بہنیں اُس درخت کے قریب پہنچیں تو رمزی کے چلنے کی گھڑ بڑاہٹ سے چونک کر حمرا کہنے لگی "ہی! بہن یہ کیا ہے" رمزی نے اپنے کوٹ کے کاج میں سے ایک بنفشہ کے پھولوں کا گلدستہ نکال کے حمرا کو پیش کیا اور کہا "کیا آپ اس گلدستہ کو سونگھنے کی عزت بخشیں گی"

حمرا نے ایک ہلکی چیخ مار کے کہا "لو یہ کون ہے! رات کا ازبونا ناز ہے"

رمزی "یہ وہ ناز ہے جو آپ پر سو جان سے فدا ہے" رمزی کی زبان سے یہ آواز اس طرح کانپتی ہوئی نکلتی تھی کہ اُس کا سمجھنا مشکل تھا۔ قمرا نے اپنی بہن سے کہا "اوں ہوں۔ بہن یہ تو رمزی بیگ ہیں"

حمرا (ذرا رُک کے) آپ یہاں کیا کرتے ہیں! بتائیے! یہاں آپ کا کیا کام ہے! کچھ جواب ہی نہیں ملتا۔ بولئے بولئے جلدی بولئے"

رمزی سخت مشکل میں پڑ گیا۔ حضرت کی سٹی گم ہو گئی۔ اور حضرت نے جو کہنے کے لئے فقرے رٹے تھے سب بھول گئے اور ہکے بکے ہو کر کہنے لگے "کچھ نہیں خانم آفندم۔ آج شام جب میں آپ کے مکان کے سامنے سے گذر رہا تھا تو میں نے آپ کو اپنی بہن سے کہتے سُنا کہ آج شب کو آپ اس درخت کے نیچے بیٹھ کے چاندنی کا لطف اٹھائیں گی۔ میں بھی اس غرض سے کہ آپ کی خدمت میں کچھ عرض کروں۔ کچھ... کچھ... درخواست... آپ کے پاؤں پر گر کر اور رو کر..."

یہ سنتے ہی حمرا کی آنکھوں سے ایک شرارت آمیز چمک نکلی اور اُس کے ہونٹوں پر ایک مسنحرانہ مسکراہٹ پیدا ہوئی اور وہ کہنے لگی "خیر تو ہے۔ یہ تو نہایت ہی عجیب بات ہے۔ آپ میرے پاؤں پر گر کر اُٹھیں گے۔ اللہ فضل کرے۔ یہ تو میں نئی نئی باتیں سنتی ہوں نیئے آپ جو کچھ کرنا چاہتے ہوں تو اُٹھ۔!! اللہ۔ اور جتنے آنسو گرانا ہوں ایک سکنڈ میں گرا دیجئے۔ میں ذرا رک کے ادھر چاہیا

سوسائٹی کا شوق ہے۔ جب ہمارے ہاں آتے ہیں تو سلاملک میں والد کے پاس شروع میں جاتے ہیں اور وہیں سے اُن کے قہقہوں کی آواز اس قدر زور شور سے آتی ہے کہ ہم بھی خود بخود ہنسنے لگتے ہیں باوجودیکہ ہمیں خبر نہیں ہوتی کہ وہ کس بات پر ہنس رہے ہیں۔ ایسے آدمی بہت لاپرواہ ہوتے ہیں' بہن میں ایک بات کہتی ہوں تمہیں اُن سے خبردار رہنا چاہیے"۔

مہربان اس آخری چوٹ کی برداشت نہ کر سکی۔ اور اُس نے تڑپ کے جواب دیا۔ "مجھے تو نہیں' مگر ہاں اُن کو جو رمزی کے پیچھے دیوانی ہو گئی ہیں ضرور خبردار رہنا چاہیے"۔ غرض کہ اس طرح ان دونوں رقیبوں کے درمیان صاف صاف اعلان جنگ ہو گیا۔

اسی عرصہ میں مہربان کی ساس کی گاڑی باغ کے دروازے کے سامنے آ رُکی' اور ساس نے مہربان کو آواز دی' مہربان نہایت سوکھے طور پر حمرا و قمرا سے رخصت ہونا چاہتی تھی' مگر وہ دونوں گاڑی تک ساتھ آئیں اور حمرا ہنس کے کہنے لگی "افندم آپ کی بہو تو آطہ کو بالکل ہی ناپسند کرتی ہیں۔ کسی طریقہ سے ان کی یہ نفرت دور کرائیے"۔

باب سوم

مہربان اپنے گھر لوٹتے ہی اُس کمرے میں گئی جہاں اُس کی لڑکی اپنی دایہ کی گود میں کھلونا ہاتھ میں لئے ہوئے کھیل رہی تھی' اپنی ننھی ننھی جیتی جاگتی گڑیا کی صورت دیکھتے ہی جس کی سیاہ پتلی بالکل رمزی کی پتلی سے مشابہ تھی مہربان کی آنکھوں سے وہ آنسو رواں ہو گئے جو اپنی معصوم اولاد کو دیکھ کر کبھی کبھی کسی خاص خیال سے ماؤں کی آنکھوں سے خاموشی کے ساتھ نکل پڑتے ہیں' ہم جیسا پہلے کہہ چکے ہیں مہربان کو یہ خوف تھا کہ میرا خاوند جو جوان اور ناتجربہ کار ہے کچھ تعجب نہیں جو حمرا جیسی الھڑ بچپن کھلاڑ شوخ و طرار عورت کو دیکھ کے اُس کی آرائش و نمایش اور چمکدار شوخ متجسس آنکھوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور اُسے اپنے دل پر قابو نہ رہے اور آخرکار ایک دن اپنی طمانیت روح و دل کھو کر مصیبت و فلاکت کے خوفناک اور تاریک اور عمیق گڑھے میں لڑکتا چلا جائے اور اپنے ساتھ اپنی اولاد اور اپنے ارکان سعادت کو بھی تباہ کرے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس خوفناک حالت کی تصویر کھنچ گئی۔ اور گو حمرا ناتجربہ کار مگر نیک خصال عورتوں کی طرح اُس نے عزم و ارادہ نسوانی کے ساتھ پھر یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ اس گڑھے کے کنارے رہے [illegible] ہمارے۔ [illegible]

اُس بکے بکے رمزی کو اپنے ضعیف ہاتھوں سے واپس کھینچ لاؤں گی اور اُس قعر ذلت میں جو مغربیت و مغرب و بلیات منہ اُٹھائے منتظر آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ان کے منہ پر تھوک دوں گی"۔

یہ تمام خوف و خطرات مہربان جیسی عورت پر اپنا اثر کرنے سے باز نہیں رہ سکتے تھے اور جس وقت اُس نے اپنے خاوند کو بچانے کا ارادہ کیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ ایک عظیم کام اپنے ذمے لے رہی ہے۔ تاہم کبھی کبھی اُس کے دل میں ایک جرأت پیدا ہوتی جو اُس کی مایوسی پر غالب آجاتی اور وہ ایسی ہمت محسوس کرتی جس سے اُس کا دل چاہتا تھا کہ ابھی میدان جنگ میں کود پڑوں اور حمرا کو للکار کے پکاروں۔ پھر کبھی ہنستی۔ کبھی روتی اور اپنے جگر پارے یعنی لڑکی کو سینے سے لگا کے کہتی "میرے پیارے، باپ کو لوگ تجھ سے چھیننا چاہتے ہیں۔ یہ نہیں ہوگا تو اُسے جانے نہ دیگی"۔ اور اُس وقت اُس کی آنکھوں سے وہ برق غضب نکلتی کہ اگر حمرا اُس کے سامنے ہوتی تو شاید وہیں بھسم ہو کر راکھ رہ جاتی۔

وہ غصہ جو رقابت عشق سے پیدا ہوتا ہے ہمیشہ پوشیدہ طور پر زندہ رہتا ہے اور رقابت کی آگ کو بھڑکاتا ہے وہ دل کے ایک کونے میں دل کی تاریکی سے صلح کر کے ملال کے ساتھ ترقی کرتا رہتا ہے حس اور روح اُس کی وہ آشنائے ہمراز ہیں اور دونوں اُس کے مددگار۔

سے وہ بیچاری مہربان کی صاف دلی سے فائدہ اُٹھا کر اُس کے نازک دل کو جس میں سوائے اپنے خاوند کے اور کسی کی محبت نہ تھی۔ ٹھیس لگا رہی تھیں ✦

حمرا نے جب دیکھا کہ مہربان کا اس وقت مزاج بگڑا ہوا ہے اور اسی لئے میری خوش طبعی جاری نہیں رہ سکتی۔ تو فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کہنے لگی "اِس خوشگوار ہوا میں مینخ کی طرح بیٹھ کر سو جانا کیا اصل بات ہے اور کچھ نہ سہی تو باغ ہی میں ٹہلیں۔ بھوک کھل جائے گی" اس پر دونوں بہنیں اُٹھ کے باغ میں ٹہلنے لگیں اور اس وقت مہربان کا خیال اُن دونوں کے لباس اور زینت کی طرف گیا حمرا بنگال کے گلابی ریشم کا ایک نہایت گھیردار گون پہنے ہوئے تھی جس میں سرتاپا چُنٹیں اور شکنیں تھیں۔ سر پر ایک نہایت عمدہ کام کیا ہوا رومال تھا اور ہاتھ میں ایک نازک سرخ ریشمی چھتری تھی۔ جسے اُس نے اِس وقت آفتاب کی آخری ضعیف شعاعوں سے بچنے کے لئے جھڑ درختوں میں سے چھن چھن کے آ رہی تھیں کھول لیا تھا ✦

سر کے ریشمی رومال کے نیچے سے نکلکر تھوڑے سے گھونگر والے سنہرے بال پیشانی اور رخساروں پر آ گرے تھے اور ہوا میں لہرا رہے تھے۔ حمرا کی بہن تزا کا سنگار بھی قریب اسی طرح کا تھا۔ مگر اُس کی گون زرد رنگ کی تھی ✦

مہربان نے اِن دونوں بہنوں کے لباس کی جو نک ورا ایش

دیکھ کے اپنے دل میں سوچنا شروع کیا کہ میرے خاوند پر ان کا کیا اثر ہوتا ہوگا۔ اُس نے خیال کیا کہ جب رمزی ان کے سنگار۔ ان کی تہ بہ تہ گون۔ ان کے لہراتے ہوئے سنہرے بالوں کو دیکھتا ہوگا تو ضرور یہی کہتا ہوگا "ایک سرخ اور ایک زرد تیز رنگ قسم (ایک قسم کا پھول) ہے"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حمرا اپنے حسن پر مغرور اور اپنی اداؤں کی قوت سے واقف تھی۔ تاہم حق یہ ہے کہ اُسے کبھی یہ خیال پیدا نہ ہوا تھا کہ مہربان کے خاوند کو اپنے دام میں لانا چاہئے ✦

عورت کو فتوحات حسن کا وہ شوق ہوتا ہے کہ کسے باشد اُسے اپنی اداؤں کی فوج اور حسن کی باڑھ سے اُس پر حملہ کرنا ضرور چاہئے۔ اُس کے نتائج کیسے ہی کچھ ہوں۔ مگر اُسے تو لوگوں کو چکا چوند میں ڈالنے سے کام ہے اور عورت کی ذات میں یہ شوق اس قدر عام اور اس درجے تک پہنچ گیا ہے کہ اب وہ اُسے بالارادہ عمل میں نہیں لاتی بلکہ از خود اُس سے سرزد ہوتا ہے۔ اسی طرح حمرا نے رمزی پر جو اثر ڈالا تھا۔ وہ نہ اس غرض سے تھا کہ اپنی بی بی کو چھوڑ دے اور نہ اس لئے کہ وہ رمزی کو چاہتی تھی۔ نہیں بلکہ محض چہل اور چلبلاہٹ اس کا باعث تھی۔ عورت کی چالوں کو عورت ہی خوب سمجھتی ہے۔ اور مہربان کی نظر نے فوراً تاڑ لیا کہ میرے خاوند کا آطہ[1]

[1] ... جہاں ... تھا

میں آنا اُس کے لئے مناسب نہیں۔ اُس نے ایک نظر میں دیکھ لیا کہ یہ "المڑ شریر پرکریاں" اپنے حسن فروشی کی دھن میں بلا سبب خود بھی بدنام ہوں گی اور میرے خاوند کو بھی بدنام کر دیں گی۔ پس اس نے ارادہ کر لیا کہ اپنے رفیق حیات یعنی رمزی کو اُن دشمنوں سے جو بظاہر چہیری بہنیں ہیں بچاؤں گی اور اُن کے ریشمی لباس کی سرسراہٹ کو جو رمزی کی زندگی کے امن کے لئے سانپ کی پھنکار سے کم نہیں اور اُن کے جانسوز چہروں کو ایک ناقابل بیان تحیر کی نظر سے کھل کر وہاں سے بھاگوں گی اور اپنے خاوند کو اُن کے ہاتھ سے چھڑا کر لے جاؤں گی ✦

یہ سب خیالات مہربان کے دل میں چار منٹ کے وقفہ میں گزر گئے جب وہ باغ میں ٹہل رہی تھی۔ حمرا نے پھر اس خاموشی کو توڑنے کی غرض سے کہا "دو ہفتے کے بعد تم آطہ میں آئی ہو یہ کیا بات ہے؟"

مہربان: "میں آطہ کو بالکل پسند نہیں کرتی"

حمرا: "مگر برخلاف اس کے رمزی بک تو آطہ کے عاشق ہیں۔ شاید تم سے نہ کہتے ہوں۔ ورنہ وہ یہاں ہر جمعہ اور اتوار کو آتے ہیں۔ کبھی ہم سے ملتے ہیں۔ کبھی والد کے ساتھ کشتی پر سوار ہو کر دریائی سیر کو چلے جاتے ہیں۔ غرض کہ آطہ میں اُن کے چار پانچ گھنٹے رہتے ہیں۔ تم جس قدر آدمیوں سے بھاگتی ہو اتنا ہی انہیں

نیچر کی صناعی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ مگر یہ پھول اس وقت بریم کانٹوں کی طرح مہربان کی روح کو تکلیف دے رہے ہیں۔ آخرکار گاڑی دریا سکھ کی سڑک پر پہنچ گئی۔ اس سڑک کے ایک کنارے پر ایک فرنچ وضع کا مکان بنا ہوا ہے۔ جب گاڑی اس مکان کے سامنے سے گذری تو مہربان کی ساس نے جو ابتک گاڑی میں مہربان کی طرح خاموش بیٹھی تھی ایک مستہزی نظر کے ساتھ اپنی سیاہ ابروئیں اُٹھا کر مہربان سے کہا "دیکھو دیکھو۔ قمرا اور حمرا تمہیں پکار رہی ہیں" اور یہ کہہ کے کوچوان کو گاڑی ٹھیرانے کا اشارہ کیا۔

فوراً ہی مکان میں سے دو لڑکیاں پائیں باغ کے آہنی پھاٹک کو کھول کر اس طرح اُچھلتی کودتی۔ چہچہاتی۔ پھڑ پھڑاتی ہوئی باہر آئیں۔ جیسے دو کنیری (ایک قسم کی چھوٹی چڑیا) اپنے پنجرے میں سے نکلیں اور گاڑی کے پاس پہنچ کے اس غرض سے کہ مہربان کی ساس مہربان کو ان کے پاس چھوڑ جائے۔ طرح طرح کے بہانے اور طرح طرح کے فقرے بنانے شروع کئے۔ جب کچھ نہ چلی تو قمرا ہنس کے کہنے لگی کہ "آج تو ہم ہو کو ساس کے پنجے سے چھٹا کر رہیں گے"۔ اور یہ کہہ کے زور سے مہربان کو گاڑی میں سے باہر کھینچ لیا اور ساس کو مخاطب کرکے کہا "آپ ایک دو گھنٹے کے لئے انہیں آپ ہمارے پاس چھوڑ جائیں گی تو کیا بُرا ہوگا۔ آپ جب سیر سے واپس آئیں تو انہیں لیتی جائیے گا" جب ساس نے مسکرا کے اجازت دی تو حمرا کہنے لگی "تسلیم اس اجازت کا

شکریہ قبول کیجئے ہمیں مہربان سے بہت باتیں کرنی ہیں" پھر دونوں مہربان کو لے کے پائیں باغ میں پہنچ گئیں۔

مہربان اپنے تئیں ان دونوں بہنوں یعنی حمرا اور قمرا کے درمیان پاسے سے کچھ خوش نہیں ہوئی بلکہ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ گویا ایک عذاب کی تکلیف میں مبتلا ہو گئی اور اُسے بات کرنے کی بھی تاب نہ رہی۔ مگر فوراً ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گئی اور اپنی طبیعت کو سنبھالا۔ حمرا نے مہربان کے سنگار اور زینت پر ایک پرکھنے والے کی تیز نگاہ ڈال کے کہا "بہن۔ یہ تنی گون ابھی سلوائی ہے؟ مگر یہ تو کہو کہ سُرخ رنگ کی گون تم کب سے پسند کرنے لگیں"۔

مہربان "یہ بکث کی پسند ہے' میری پسند نہیں"۔

قمرا و حمرا۔ دونوں نے قہقہہ لگایا اور حمرا کہنے لگی "آپ کے بکث کی حسن طبیعت کا کیا کہنا۔ ابھی ادھر سے گذرے تھے۔ سر پر اس سے بھی زیادہ سرخ ٹوپی تھی جو بانکی طور پر رکھی ہوئی تھی اور بھوؤں تک کو ڈھک لیا تھا"۔

اتنے میں رمزی بھی سیر سے واپس ہوتا ہوا اُدھر سے گذرا۔ اور چاہتا تھا کہ اپنی گاڑی ٹھیرائے۔ مگر جرأت نہ ہوئی اپنی بیوی کو حمرا اور اُس کی بہن کے ساتھ دیکھ کے اُسے خیال پیدا ہوا کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہیے اور وہاں چل کے باتیں کرنی چاہئیں۔ مگر پھر جھجک گیا۔ ادھر اُسے یہ تردد اور اضطراب تھا۔ اور اُدھر سے

قہقہوں پر قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ اُس نے یہ بھی سُنا "واللہ دیکھا آپ نے اس وقت تک ہمارے پاس آنا چاہتا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ مگر نہ معلوم کیوں بھاگ گیا"۔ تھوڑی دیر تک یہ تینوں یعنی مہربان حمرا و قمرا خاموش بیٹھی رہیں۔ آخرکار حمرا نے مہر خاموشی کو یہ کہہ کے توڑا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ رمزی کے ساتھ زیادہ باتیں کرنے سے مجھے کیوں روکتے ہیں رشتہ دار وہ دل سے بھاگتا کیا سے رکھتا ہے کیوں مہربان"۔

مہربان "بیشک"۔

بعض وہ جملے جنہیں زبان ادھورا ہی چھوڑ دیتی ہے آنکھیں اُن کی تکمیل اور ابرو اُن کی تفسیر کرتی ہیں' مہربان کے اس ناتمام اور مبہم جملے نے بھی اسی طرح اپنا کام کیا "بیشک" کہتے وقت مہربان کا ماتھا گون کی تہوں کو موڑ رہا تھا۔ مگر اُس کی آنکھوں سے ایسی داد خواہ اور الم انگیز نظر نکلی جس نے فوراً حمرا و قمرا کے مذاق کو بند اور اُن کی شوخی کو زائل کر دیا۔

اس نظر کی روشنی اُس شعلہ سے حاصل ہوئی تھی جو دل جیسے بنانے نے سعادت خیز میں جل رہی تھی' اور یہ نظر ایک چنگاری تھی جس نے مہربان کی ان دونوں چہیری بہنوں حمرا و قمرا ان دونوں رقیبوں کی شوخی و شرارت' ان دونوں کی تکلیف دہ طعنہ زنی اور استہزا کو جلا کے خاک کر دیا۔ اور اُس جرأت کی تخریب کر دی جس کے ذریعے

دیکھا ہی نہیں کہ مہربان پر کیا فوری اثر ہوا - وہ اپنے ہی خیال میں مگن تھا - اور کہنے لگا:

"نہیں - چلو چلو - اور ہاں چلتے وقت ذرا اکڑ کے چلا کرو - عمرا خانم کی چال کی نقل کیا کرو - دیکھو وہ تو مجسم عشوہ و ناز ہے - کبھی تم نے اس کی اداؤں کو غور سے دیکھا؟"

اف وہی عمرا! رہ رہ کے وہی عمرا! اپنے خاوند کی زبان سے ہر روز ہر رات کو یہ نام چنگاری کی طرح اڑ کر مہربان کو جلا کے خاک کر دیتا تھا۔

"لو گاڑی بھی تیار ہو کے آگئی - دروازہ پر کھڑی ہے - میں تو جاتا ہوں - باسفورس جاؤں گا - آج وہاں بہت رونق ہے۔"

باب دوم

مہربان خانم ایک بڑے امیر کی لڑکی تھی جو رہنے والا تو ولایات شاہانہ (ترکی) کے کسی گاؤں کا تھا - مگر جس نے نقل مکان کر کے قسطنطنیہ میں سکونت اختیار کر لی تھی - اس کے باپ نے قسطنطنیہ میں بڑی ٹیپ ٹاپ سے زندگی بسر کرنی شروع کی - اور شہر کے امراء سے مقابلہ کرنا شروع کیا - جب مہربان کی عمر شادی کے قابل ہوئی تو بہت سے امیر گھرانے اس کے طالب ہوئے - آخرکار بہت قیل و قال کے بعد رمزی کے ساتھ مہربان کی شادی ہو گئی - شادی کے دن کئی انگوٹ عورتوں سے بھر کر مہربان کے باپ کے گھر گئے - اور ان میں سے ہر عورت تفتیش حالات میں ایک دوسری سے بڑھ چڑھ کے رہنا چاہتی تھی - اس دن کے بعد سے ایک مہینے تک استنبول کے کل حرم سراؤں میں اس شادی کا چرچا رہا - سب کہتی تھیں کہ ثروت اور اصالت اس طرح کی بہت خوب ہوا - لیکن دلہن تو بالکل گڑیا معلوم ہوتی ہے - وہ لڑکی ابھی چھوٹی سی ہے - مہربان کے باپ نے استنبول میں آتے ہی لڑکی کو پوری پوری تربیت و تعلیم دینے کی غرض سے اپنے گھر کو جرمن گورنسوں - اور فرانسیسی سطر - اور اطالین موسیقی کی استانیوں کا جولانگاہ بنا دیا - مہربان نے بھی استانیوں کے اس تجربہ سے پورا فائدہ اٹھایا اور سترہ اٹھارہ برس ہی کی عمر تھی کہ زبان اور موسیقی وغیرہ میں پورا کمال حاصل کر لیا - اور قصباتی شرم و جھجک کو بالائے طاق رکھ کے شوخ و شاطر شہری لڑکی بن گئی - مگر پھر بھی اتنی نہیں جتنی کہ اس کے شوہر کی خواہش تھی۔

ان واقعات کے بعد جن کا ذکر ہم نے شروع ہی میں کیا ہے یعنی جبکہ رمزی اور مہربان میں مزے مزے کی باتیں ہونے کے بعد ایک قہوہ کا خیال کر کے اور پھر نام سن کر شکر رنجی ہو گئی تھی اور رمزی مہربان کو اکیلا چھوڑ کے چلا گیا تھا - مہربان کے دل میں کچھ خیال پیدا ہوا - اور اس نے اپنی ساس سے کہا:-

"اس وقت اکیلے طبیعت گھبراتی ہے آیئے کہیں سیر کر آئیں۔"

ساس بھی جانا چاہتی تھی - اس نے فوراً گاڑی تیار کرا کے دونوں روانہ ہو گئیں - مہربان کے لباس کی جھلک سے خیال ہو سکتا ہے کہ وہ اس وقت نہایت خوش ہے - مگر نہیں - نہایت عمیق و مایوسانہ خیالات اس کے دل میں موجزن ہیں جنہیں بیشک وہ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے - گاڑی ایک نہایت خوشنما سڑک پر جا رہی ہے جس پر دو طرفہ درختوں کی شاخوں کا سایہ پڑ رہا ہے - گاڑی کے قیمتی گھوڑے ایک غرور کے انداز کے ساتھ دُم اور سر اٹھا کر چل رہے ہیں - تھوڑی دیر بعد گاڑی ایک باغ میں پہنچی جہاں رنگا رنگ کے پھول

جو چاہو مجھے پہناؤ۔"

"آؤ آج تو آنکھوں میں سرمہ لگاؤ۔ پلکوں کو اس قدر سیاہ کر دو کہ ان میں تمہاری نظر بٹ تو نور محور کی طرح نکلے۔ اور یہ نظارہ سودائی دلوں کو پاگل بنا دے۔"

"اچھا اچھا تو تمہیں آؤ تمہیں میری آنکھوں میں سرمہ لگاؤ۔ کپڑے پہناؤ۔ لو میں آنکھیں بند کئے لیتی ہوں۔ جتنا چاہو سرمہ لگاؤ۔ جیسے چاہو کپڑے پہناؤ۔ لو میں تو گڑیا بنی جاتی ہوں آج تمہارے ذوق سلیم کو بھی دیکھنا ہے۔"

یہ کہہ کے مہربان نے آنکھیں بند کر لیں اور ہنس کے اس طرح کرسی پر بیٹھ گئی گویا اپنے تئیں اپنے خاوند کے سپرد کر دیا۔ اس کے خاوند رمزی نے آنکھوں میں سرمہ دانی لیکے۔ اور اس کی پلکوں کو کھول کے ان نیلی آنکھوں میں ایک خط سیاہ کھینچ دیا۔

"لو اب تو جیسا چاہتے تھے۔ ویسا سرمہ لگا دیا۔"

"ہاں ہاں۔ مگر ذرا یوں ہو بیٹھو۔ تمہاری آنکھوں میں اپنی نظر ڈالوں۔ اپنے ہاتھ میرے ہاتھوں میں دو۔ اس طرح۔ ہاں اس طرح۔ تمہاری آنکھوں کو اپنی آنکھوں سے چوموں۔"

رمزی یہ کہہ کہہ کے کہ مرد کی آغوش عورت کے لئے بس اسی طرح کھل جاتی ہے۔ جیسے پھول سورج کو دیکھ کے کھل جاتے ہیں۔ مہرباں کو گود میں لیتا تھا۔ اور اس کے سنہری بالوں کے نیچے اس کے

گرم گرم نشان چھوڑتا تھا اور اس کی سفید گوری گردن پر اپنے دانتوں کو اس طرح گاڑتا تھا گویا کوئی مخمور سیرو شکار رہا ہے۔ اور پھر بوسوں کا تار باندھ دیتا تھا۔ مہربان نے اس سے تنگ آکر کہا "ہٹو بھی۔ تم نے میرے بال بگاڑ دیئے۔ واہ" یہ کہہ کے جھٹ کرسی سے علیحدہ ہو گئی۔

رمزی نے کہا "اس وقت تو ستم ڈھا رہی ہو۔ اُف! کیا حسن کا عالم ہے۔"

"گویا اس وقت ہی میں حسین معلوم ہوتی ہوں ہر وقت نہیں۔"

"نہیں میں چاہتا ہوں کہ یہ چہل پہل چلبلاہٹ تم گھر سے باہر بھی تو دکھایا کرو۔ یہ خرام ناز۔ اس دلوں کو پامال کر دینے والی رفتار میں۔ جب تم باہر جاؤ جب بھی کی ناز کیا کرے۔ تم تو لوگوں کے سامنے سرنگوں ہو میں بالکل جھجک کے رہ جاتی ہو۔"

"جی نہیں۔ میں حسن فروشی نہیں کرنا چاہتی۔ مجھ میں جو کچھ دلربائی ہے۔ جو کچھ خوبصورتی ہے۔ وہ صرف تمہارے لئے ہے۔ اور تمہیں کو دکھانا چاہتی ہوں۔"

"نہیں نہیں میں اس قدر خود غرض نہیں ہوں کہ جب تم بازار میں سے نکلو میں لوگوں سے یہ سننا چاہتا ہوں کہ کیا حسین عورت ہے۔ رمزی کی بیوی ہے۔ واہ کیسا خوش نصیب آدمی ہے اور آپس میں سرگوشیاں کریں۔ اس موتی کا صدف۔ اس پھول کی کامیاب بلبل یہی رمزی ہے۔"

"تم چاہو میں تو نہیں چاہتی۔ لو ان سرگوشیوں سے انہیں محروم رکھنے کے لئے آج ہم باہر بھی نہیں جائیں گے۔ اور آج جو تم نے اپنے ہاتھ سے میرا سنگار کیا ہے۔ یہیں بیٹھ کے تمہیں دکھاؤں گی تم بھی مت جاؤ۔ میں تمہارا دل بہلاؤں گی۔ تمہیں میں کپڑے پہناؤں گی۔ تمہاری مونچھوں کو درست کروں گی۔ اور مزے مزے کی کہانیاں سناؤں گی۔"

"چلو بھی اس نال مٹول سے کیا فائدہ مجھے اس میں لطف آئیگا کہ لوگوں کی رائیں سنوں۔ لوگ تمہیں دیکھ کے کہیں۔ آہ کیا حسن ہے۔ بالکل پری معلوم ہوتی ہے۔ اور میں بھی یہ خیال کرکے کہ ایک پری کے پیچھے جا رہا ہوں۔ تمہارے پیچھے جاؤں۔ اور یہ سمجھوں کہ پری کا مجبور عاشق اس کی خوشامد کرتا جا رہا ہے۔ اور وہ نہیں سنتی آخر کار جب گھر آؤں تو پری میری ہو جائے۔"

"جانے کیا بک رہے ہو چپو بھی۔"

آہ اس "چپو" میں مہربان خانم کے نہ معلوم کیا کیا اندرونی نہاں تھے۔ اس مسرت کے وقت میں نہ معلوم کیا خیال آگیا تھا جو اس نے منہ بنا کے "چپو" کہا۔ اس کے دماغ میں فوراً بجلی کی طرح یہ خیال چمک گیا کہ رمزی اس قدر کیوں باہر جانے کا اصرار کر رہا ہے رمزی اس کمبخت رقیبہ سے ملنا چاہتا ہے اُف! اُف! یہ خیال کرتے ہی اس کا دل بیٹھ گیا۔ مگر رمزی اپنی ہی دھن میں تھا۔ اس نے

ثالث بالخیر

یا

لڑکی کی کارستانی

باب اوّل

"اپنے بالوں کو گھونگر والے بناؤ کہ نظر اُن میں جا کر پھنس جائے اور باہر نہ نکل سکے"۔

"کیوں کیا اب بُری معلوم ہوتی ہوں"۔

"سیاہ نقاب کے نیچے تم نے اپنے سنہرے بالوں کو قید کر رکھا ہے وہ بیچارے تڑپ رہے ہیں۔ دیکھو کوئی باریک نقاب پہنو"۔

"خاکستری رنگ کی نقاب پہن لوں"۔

"یہ گلرنگ چہرہ خاکستری نقاب کے نیچے! کیا غضب کرتی ہو۔ اپنے چہرے پر یہ ظلم!"

"وہ جو میں کہتی ہوں وہ سب تمہیں ناپسند ہے۔ تو اسے تو تمہیں

میری اس تمنا کو ناجرہ کے ترجمے نے پورا کیا، اگرباوجودیکہ وہ ایک ترکی خاتون کی تصنیف ہے، تاہم انگلستان کی پبلک کے لئے ہے اور اس لئے مجھے خیال ہوا کہ ممکن ہے کہ اس میں کوئی پہلو نہ دکھایا گیا ہو +

جناب حاجی محمد اسمعیل خاں صاحب رئیس دتاولی کے طفیل مجھے ترکی میں شد بد ہوگئی اور میں نے ترکوں کی زندگی کی جھلک ترکی زبان کے ناولوں کے ذریعے سے دیکھ لی۔ وہی جھلک پبلک کو دکھانے کیلئے ایک قصہ ترجمہ کر چکا ہوں مگر وہ بہت بُری حالت میں چھپا، اب اسے پیش کرتا ہوں، اگر پسند ہوا تو تیسرا بھی طیار ہے +

مغربی معاشرت کے دلدادہ تو اس قصے کو پڑھکر شاید خوش ہونگے مگر مخالفین تو یقیناً مکدر ہوں گے! انکی خدمت میں عرض ہے کہ کیا کیا جائے زمانہ یہی رنگ ہندوستان پر چڑھا رہا ہے +

ترجمہ اکھڑا اکھڑا اور انوکھا معلوم ہوگا! مگر ترکوں کا طرزِ ادا مجھے کچھ ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے اور مغربی اور ایشیائی طرزِ تحریر کا ایسا معقول میل ہے کہ میں نے لفظی ترجمے کی کوشش کی ہے گفتگو انوکھی تو ضرور ہے۔ لیکن سنئے تو (ع)

عزیب شہر سخنہائے گفتنی دارد

۱۴ر اگست سنہ ۱۹۰۲ء

سجاد حیدر

التماس مترجم

میں اس ترجمے کو بہت دھوم دھڑکے سے پیش نہیں کرنا چاہتا' اور نہ اس جرم کی معافی چاہتا ہوں کہ میں نے ناول کا ترجمہ کیا' اور اس طرح پبلک کے مذاق کو ایک مضر شے کی طرف راغب کیا میرے نزدیک بذات خود ناول کا لکھنا یا پڑھنا کوئی عیب نہیں - ہاں پاکیزہ قسم اور غلیظ قسم کے قصوں میں ضرور تمیز کرنی چاہیے' اور شاید یہ میرا خیال غلط ہو کہ یہ ناول برے قسم کا نہیں +

قصوں کے ترجمے آجکل اردو میں بہت ہو رہے ہیں مگر سب انگریزی سے'، اور اس کے عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ انگریزی سے بھی کس قسم کے ناولوں کے ترجمے ہو رہے ہیں +

میری تمنا تھی کہ کسی طرح ترکوں کے قصے ترجمہ ہوں'! اس سے نہ صرف ہمارے ناولوں کے لٹریچر میں ایک نئے قسم کا اضافہ ہوگا بلکہ ترکوں کی سوشل زندگی کا اصلی نقشہ بھی ہمیں نظر آئیگا ترکوں کے سوشل زندگی کی تصویر کی میں اردو میں اس لئے ضرورت سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرز معاشرت میں جو انقلاب پیش آرہا ہے وہ انہیں بھی پیش آچکا ہے' اس وجہ سے ہمیں اس نقشہ سے یہ معلوم ہو جائیگا کہ اس منزل سے کس طرح گذرے اور اب کہاں ہیں +

نذر

ندیم و زاہدی

و یادگارِ

جواں مرگ سلطان

ثالث بالخیر
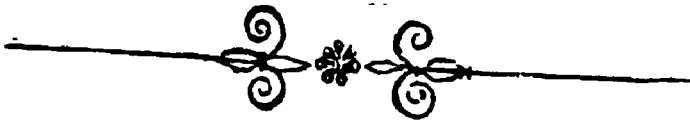
یا

لڑکی کی کارستانی

ترکوں کی موجودہ مغربی طرز زندگی کا ایک اعلیٰ ناول جو ایک نوجوان
اور مشہور ترک فسانہ نگار احمد حکمت کی ناول سے ترکی زبان سے ترجمہ کیا گیا

مترجمہ

سید سجاد حیدر بی۔ اے (علی گڈھ)

باہتمام منشی محمد عبدالرحیم صاحب سپرنٹنڈنٹ
کارخانہ بلالی سٹیم پریس ساڈھورہ (انبالہ) میں چھپا

Text of the First Edition
of
Yildirim's Salis bil khayr

Section 10

In this section we find no other special characteristics other than pointed out in the previous ones.

Conclusion :

The Urdu of "Lane-yi Munkasir" is neither a literal nor literary translation, but it is an adaptation of the original work. The theme of the original story is rather satirical in which the author wants to point out that the borrowed western culture will continue to cause confusion in the eastern society, unless dealt with logically and, to this end, the author uses ironical and sopihsticated language that has been changed by the translator into a more straightforward and plain one. Thus, the dynamism of a satirical style has been neutralised. The author being a nationalist Turk does not favour wantonness of westernisation which is the central point of the story and which the translator does not seem to grasp clearly.[24]

The irony is centred around these two main characters: Mihriban and Neriman. Mihriban inspite of getting western education, depends on her logic to encounter the unexpected circumstances, while Neriman loses his senses due to his great love for modernisation and destroys his prosperous house. Nevertheless, in the end, being repentant, he returns to his actual being. It is this ironical tone of the author that we come across throughout the story and which forms Ahmed Hikmet's style.

The translator's aim is different from the author's. He had two major purposes for translation in mind : 1. He wanted to throw light upon the changes caused by the revolution in Turkey and upon the stages the Turks wers passing[25]. 2. He tried to show the position of the Turkish women in the new-born society[26] Since Haydar's aim differs a great deal from the original, his style and language varies too. So, his one of the earliest translations from "Lane-yi Munkasir" unlike his other works is not a literal one but is an adaptation from the original and has been moulded into his own Indian culture.

23—Vide Hikmet Dizdaroglu, *Ahmed Hikmet*, Turk Dil Kurumu Yayinlarl, Ankara, 1964, p 31.

24—For Haydar says that this book will please those who adore the western way of life (see his preface Salis,)

25—See Haydar Yildirim's prefece, Salis, p. Be.

26—See Kurat ul-Ayn Haydar, *Kheyalistan*, edited by Dr. Muin al-Rahman, Taj Book Depot, Lahore, 1984 p. 257 (here Hamra and Kamra have been given as example)

Turkish text in order to increase readers' suspense. "In the morning, she was dressing her husband, when he fell to her feet (to plea) (see Salis, p. 54)" is the translation of "In the morning, Mihriban found her husband dressed (Lane, p. 65, last para)".

Section 8—9

8.2 In these sections also some details go astray from the original text, for example : "Yes those papers (the letters of Remzi) were the receipts of debts of love which were never refunded (Salis, p. 58, last para)" for "Yes those receipts belonged to the debts of prosperity which was never refunded (Lane, p. 67, last para)".

8.3. Suddenly. we find Mihriban's mother on the scene (see Salis, p. 60) who does not exist in the Turkish text. She is shown as a selfish woman like Neriman's mother. They both favour the divorce of the couple instead of advising them to come together.

8.4 "They (Mihriban and Remzi) wanted to remarry but the spectators (readers) know that their will is baseless and depends on their ignorance of the Islamic law (shara')[22](see Salis, p. 61)," is again an addition by the translator who has Islamic community of India in mind.

8.5. In some cases the language of the translator is rich in idioms and metaphors, but they do not agree to the original. For instance : *NAummIdi aur gham ki tasweer bani rahti thi* "She looked like the picture of hopelessness and grief (p. 64, Ist para)". (b) *Magar maut mAnge nahin Ati* "But death doesn't come when wanted (p. 64, line 7)". *MAdrAna huqUq jatAi* "Made her feel maternal rights (p. 68, line 5)". (d) *Uski Ankhon main kAnte ki tarah khatakti thi* "She felt like thorns in his (Kerim Effendi) eyes" (e) *Ummldon par pAni phir gaya* "Water washed away the hopes" *KhayAl ki mAnsoon uthi aur ghatA ban kar dil se takrAi aur Ankhon se pAni barsA gai* "The monsoon of ideas rose and turned into a hurricane and struck her heart and she shed water (tears) from her eyes".

All these idioms and expressions belong to the Indian culture and the Urdu literature and do not concern the Turkish text.

22—It is a reference to sura baqra, sentence No 230 where God says "So if a husband divorces his wife (irrevocably), he cannot, after that. remarry her until after she has married another husband and he has divorced him"

using different idioms or even slangs. Here are some more examples : (a) *To har martaba mAre ghussa ke piech-o-tAb khAti* "Every time she would writhe with anger." (b) *to merA dil pArA pArA ho jaigA* "So, my heart will fall into pieces" (c) *Ramzi us Kambakht raqiba ko kahtA hai* "Ramzi says to that wretched rival..." is the translation of these sentences : (a) "This disturbed the temper of Mihriban" (b) "Her heart won't bear it" (c) "Mihriban's husband said to her (Hamra)......" Neither this high tone nor the informal language exist in the Turkish text which is written in the modified Istanbulian dialect of the Ottoman Turkish.

5.3 Mihriban's feelings for her husband who has been charmed by the deceptive beauty of Hamra, is represented in such a way that, we find struggle between the pride of a Turkish woman and her true feelings, where pride seems to be predominant. This alien factor may not appeal to the Indian reader whose women are, generally, supposed to render their husbands utmost devotion. To support this point we take some sentences from paragraph I, p. 60 (of Lane) "She is looking for some facts that may throw light on the present relation between her and her husband. Presently, she is not feeling jealousy in the depths of her heart, but she wants to know how and why she has been duped by her husband". This has naturally been changed by the translator into "Now, she has to tell lies of various kinds and bear trouble to know details about the relation between her and her husband" (Salis, p. 43, para 2), thinking in his mind the position of an Indian lady.

5 4 Again some modern expressions such as "She wanted to be loved, to be kissed .." and "Now, he loves and kisses someone else..." (see Lane p. 62) have been totally deleted.

Section 6 - 7

6.I. In these sections, too, we find many differences of descriptions or distraction of some attributes, such as : *Aur yeh kahkar usne kai martaba apni Ankhon par hAth mArA* "...and saying that he smote his eyes many times with his hands" while Turkish is "He continued to confess with some reprimands (Lane, p 65, line 2)". "She heard the cries of her fainting husband 'Hamra, Hamra' (Salis, p 54)" is the Urdu of "She heard the murderous, wanton cries of her husband (Lane, p. 65, para 3)". The name Hamra is not mentioned in the

these changes: "Neriman walking after these two tender bodies and being attracted by them felt drunk(*SukrAn*)under the effect of the eddy of love-charm (*Gard bAd Sauda*) and became fevered and restless_" is changed in Urdu as "He felt like a needle that fails to resist the magnetic attraction of the mountains and felt inclined". Other differences are : (a) *Allah re ShAirana KhayAlAt unhain chhapua ke ShAironmen naam Likhwaiye* "O, my God, poetic ideas, get them published and enlist your name among great poets, come sister Kamra let's go I feel cold" (Salis, p. 35 para 2) for "Neriman has become excited and I am feeling cold now, let's go sister". (b) *NerimAn bar buhrAn mahmum yichandah maftur wa parishAn AhlAyur.* "Neriman, under the influence of the feverish crisis of low-spiritedness and upsetness, started to cry." (c) *Butun rAz darunani dookha-dookha yAlurmaq wa buwailah tark hayAt yitmak hiss at-yamilah madhosh yidi.* "He wanted to plea her and disclose his inner secrets while he felt bewildered by the painful feeling of giving up his life". (d) *Kushak qabusni narimAnak kur yAshlarinah qArshi qApA mushlardi bailah.* "They(Hamra and her sister) had already closed the door of their villa on tears of his (Neriman's) eyes". The expressions a, b, c and d are all missing from the translation.

4.2 Hamra's statement about her beauty and pride "I am no match of you, you are so below me. It will be below my dignity to compare my beauty with your ordinary beauty" has rather a harsher tone than the Turkish one "She smiled when she looked in the mirror and praised her beauty by saying, How nice, how nice" (Lane, p. 58)

Section 5

5.1. The only eight verses found on page 59 of Lane-i Munkasir have been translated into Urdu properly. The final couplet, however, varies to some extent :

Turkish : Alas...this love scares me to death,
Due to your killing beauty you are worth fearing

Urdu : O, thy incitant beauty will not leave me alive.
You are that charming beauty which is worth sacrificing my life for.

5.2 As observed in the previous examples, too, the translator elevates tone according to the demand of his mother language by

Similarly, a statement (see Lane, p. 51, para 2) about women's tendency towards the rivalry that injures their concept of beauty, and the feelings of which they have to conceal, has been dealt differently by the translator. The author says that women prefer to expose all their possessions, they have in the world, to the attacking eyes but they are, sometimes, obliged to conceal rivalry pertaining their beauty, which may crush their dignity, and which they still encounter with a smiling face This kind of women's behaviour may quite often, lead men to bewilderment (Lane, p. 51, para 2). Translator simplifies this statement as follows: "Women can tolerate any troubles cold-heartedly but the rivalry born due to the competition of beauty, which may also crush their dignity, gives them the most painful trouble" (Salis, p, 25, para 2)

Another philosophical symbolism on page 60 line 15 "Rivalry in blind love is like a child that poisons his mother (i. e. the love)" has no trace in the Urdu text.

Section—4

4. I. Some scenes of the original text have been changed by the translator. For example : "Neriman holding the thick branches of the pine trees, slipped downward on the small hill" (Lane p. 52, para I) is translated into Urdu as: "Remzi stood by resting himself on the trunk of the pine tree and he held a twig of the tree in his hand. ... It was a summer moonlit night" (Salis, p. 27 para I). In India the slippery ground under the pine trees is rare and has, therefore, been deduced from the scene. The simple Turkish statement "...I heard your sister saying that you will come to the pine grove from that door" (Lane p. 53, para 2) in Urdu becomes "I overheard your sister saying that you will enjoy moonlight of the month, Jeth[21], under this tree" (Salis, p.29 Ist para). To enjoy moonlight under a pine tree is not common in Turkey, specially during the month, Jeth, but it can be wonderful in India to be under a tropical tree during this month. "The arch of the room was like a rainbow under which Hamra stood like a fairy of light "(Salis, p. 37, para 2), is the Urdu of "The reflexing rays of the grand mirror had turned the room, furnished in pink, into a horizon which looked like the track of a cloud" (Lane, p. 57 para 2). In this section, as in others, we find many expressions either changed or deleted. For instance, on page 53 (last para), we come accross

21 Indian month between 15 May & 15 June, not so hot in Turkey

These variations do not seem to have a better reason other than the translator wants to create his own style, suitable for his Indian reader.

3.2. The climax of revenge which is dynamised with allusions and literary figures in the paragraph 2 on page 50 i.e "...and she wanted to come in the battle-field to 'suffocate with her slim fingers, and to burn with the lightening darted out from her eyes the sudden calamity (*Baliah-i-Falakat*) which intended to pierce her liver as well as the part of her liver (her daughter)". In order to increase suspense the objective noun 'Hamra' has, totally, been avoided. This climax has been moderated and expressed in an indirect speech, as follows: "From time to time, she felt courage (in her heart) which dominated over her disappointment, and she felt jumping into the battle-field and shouting at Hamra. Sometimes, she would laugh or cry and would embrace her daughter (the part of her liver), and would say to her daughter. People want to snatch your father. This will never happen, you will not let him go !' At this very moment an aweful lightening came out of her eyes, and if Hamra were there, she would be burnt into ashes" (Salis, p. 24, para 2). "She would laugh or cry" "You (the daughter) will not let her go" shows Mihriban more humble than the Turkish one.

3.3. Some philosophical ideas have either been deduced or have been changed. The philosophically rich last paragraph on page 50 of the Lane has undergone some changes. For instance : In the original text the subject of the sentence (third from the last) is "the bud (ghiz)[20] of amorous rivalry which grows and spreads out secretly in some dark place of the heart" but in the Urdu sentence the subject is "rage born due to the rivalry of love". However, the word *Ghiz* is easily misunderstood as *ghaiz*, the rage. The rest of the paragraph which further explains this philosophy, has been left out. In this part, it is disclosed that sometimes the most active rivalry in love fails to find a proper secret spot in the depths of heart and, therefore, it creates a weak character which, due to some improvidence, comes out in a mean disguise of jealousy and makes people laugh.

20. See F. Steingass, Persian-English Dictionary, Librairie Du Liban, Beirut p. 901

ironies (*Kokalni bawailah muazzab istihzA larlah chamdikalah Yin...*) into "...they hurt her tender heart[19]". Here "the tender heart" is an addition. These changes create an entirely different echo in the Urdu text.

2.4 The reason why Hamra wants to attract Mihriban's husband, differs from the original. The author gives a simple reason that Hamra and Mihriban had feminine antagonism right from the childhood which tempted Hamra to revenge Mihriban by beguiling her husband. Hamra uses sophisticated methods to do this. The translator holds that all women are satisfied to see the victory of their beauty ; and to this end, they attack others with the army of their coquetry (see Salis, p. 17-18). In order to support his view, the translator has used such idioms as : *'dAm me lAnA, 'adAon ki fauj', Nazar ne tAd liyA' 'chhal wa chulbulAhat', 'Sarzad honA', 'ChakA Chaund'* which have nothing to do with the Turkish text.

As at other places, Seyyid Haydar has omitted the whole paragraph about Mihriban's repentence concerning her arrival at Buyuk Ata (Lane, p. 48, para I).

Section-3

3. I. The transformation of the Turkish epithets regarding the characters of the story may, sometime, entirely vary in the Urdu text. We take Hamra as an example. The author characterises her as 'vigilant' and 'inconstant' (*harjAi*) and as a woman who has shining eyes full of curiosity which have much bias towards treachery. According to the translator's statement she is 'indifferent' (*alladh*), 'playful' (*khilAd*), 'pert' (*shokh*) and 'plunderer' (*tarrAr*) in the sense that she plunders hearts (see Salis. p 22, para I). "She wantd to save her husband from falling into a pit with a provoking feminine pride of a young lady" has been translated as "She wanted to save with a feminine pride her 'lovely', 'disappointed' (*Hasrat-zada : longing stuck*) and 'bewildered' husband like a 'young inexperienced pious' (*nek khisAl*) lady (Salis, p. 23, para I).

---

19. For Turkish see Lane, p. 46, para 2 and for Urdu, Salis, p. 15

walking proudly by lifting up their tails and heads. After some time, the carriage arrives at a garden which is full of colourful flowers that prove the creativeness of nature,but at this time these flowers are cruel, like thorns,because they are torturing Mihriban's soul."The difference between the original text and the translation is self explanatory.

By the above examples, it is clear that the translator's style is not only simple but also devoid of rich metaphors. In addition to this he has, in most of the cases, adapted some details to his Indian culture. In order to avoid lengthy discussions we shall, now, point out only some essential particularities ;

2.3. One of the outstanding characteristics of the Ottoman Turkish is the use of ornamental Arabic and Persian words that, generally, occur as a part of attributes, metaphors or similes. These words need an extraordinary care while thay are translated into another language. They are, sometimes, used on purpose to create harmonious tautology alien to most European readers, but they are normal for an Urdu scholar. Our translator, however, quite often avoids lengthy sequence of such literary values. For example : "Mihriban's hand was turning the folds of her gown. But her eyes cast the aching and complainant glance which put an end to Hamra and Kamra's jokes and obliterated their vexation." (Salis,p. 15 para 1) is Urdu for "While folding the creases of her coat (not gown), her complaining glances fell on its creases and this glance was enough to finish and complete her agitation with the utterance of the word 'Indeed'. This warned and threatened her rival cousins..." -The other expressions omitted by the translator in this paragraph are : *Nazare saree* (a quick glance), *muhtuzi itmAmah* (finishing of agitation), *Mabnai Sa'adat yaqmaq* (in order to demolish the source of her happiness), *Safwat-i-qalb* (clearness of heart), *zaujnak ishqnah burnamash* (her heart wrapped in the love of her husband), *SArSAn ZarbAt nahAnInak shudtandan InshiAl wa faurAn edan bar qiwailjam idi* (It was a blazing and burning spark born due to the violence of the last shaking blows). The last description has been, however, translated into Urdu as "The light of the glance was produced by the flame that burns in a heart—the building of prosperity (*is nazar ki raushni us sholay se hAsil hui thee jo dil jaisi bin Ai sa'Adat khez men jal rahA thA*) and the Turkish expression "The heart which was being pinched by the painful

simple language and style that mars the dynamism of the original. We come across such simple sentences "He (Mihriban's father) started living a rich (*Badi tIp tp*) life and he began to compete with the nobles of the city" and "On the wedding day, many ferry-boats were filled with the women who went to Mihriban's father's house and each of them wanted to stay as long as possible to kill their curiosity". The author continues to allude to the snobbery of Mihriban's father in the following sentence : "When her father decided to settle in Istanbul, he with the rashness of an inexprienced townsman, who adores pomp and show filled his villa with French teachers. Italian masters of music and German tutors, (Lane, p 43, Ist. para) which we don't find in the translation.

2.2. *Woh shokh wa shAtir ladki ban gaee magar phir bhi itni nahIn jitni keh uske shauhar ki khwAhish thee.*" She became lively and gay (girl), yet not to the extent her husband wanted her to be" the underlined statement is superfluous and does not meet the rich description of the author : "Under such confusion and anxiety Mihriban, by dint of her talents secured a distinguished position, at the age of fifteen, among her young noble lady friends (*NounehAlAn -i-asAlat*) and she became a lively and gay (girl) by throwing away the dull veil of reclusion (*Burqa-i-Kaseef wa munzawiyat*) that she had brought from the little town. It is at this age that she got married". (Lane, p. 43-44).

Similarly, other rich expressions found in the second paragraph on page 44 of Lane have been simplified and changed. For example, "While she tried to hide her deep feelings of indignation caused by the bitterness of despair (*Darin bar injil mayusak mirarat nahnilah*) and under the effect of the perpetual noise of the two great Hungarian trotting horses of the carriage that moved ownward among the pine trees of Buyuk Ata on the soft dusty surface of the roads, the cruel thorns of the blossomed roses, courtesy, comfort and gentleness were torturing her soul". The Urdu text has entirely a different way of conveying the same idea" It can be presumed that Mihriban is very happy because of her attractive dress, but she isn't. Deep despairing ideas are dwelling (waving) in her heart which she is doubtlessly trying to conceal. The carrirge is passing on a very good-looking road with shadows of the branches of trees on each side (very pleasant scene for the Indian climate). The precious horses of the carriage are

while your spirit should attempt to move or fly around your breast wantonly and hastily. Don't you notice that Hamra's gait is full of coquetry?" (Lane p. 42, para 2) This passage is translated as Mihriban Khanim's words 'Keep quiet' bore, God knows, how many secrets for she uttered 'Be quiet' ironically at this happy moment (when she was going out). Now, suddenly an idea flashed in her mind (like the electric lamp) that why Remzi was forcing her to go out. Perhaps, he intended to see that wretched beloved, and with this idea her heart pined. Remzi didn't notice any sudden change in Mihriban because he was busy with his own ideas He said "No, let's go and when you walk there, walk upright trying to copy Hamra Khanim's gait. Look, she is an example of tenderness and coquetry. Have you ever noticed her delicate manners colsely?" (Salis, p. 6 para 2).

Section—2

2. I. While introducing Mihriban's family, the translator again has deleted some essential details, for instance : "Mihriban the only daughter of a very rich family that had settled in Istanbul for ten years" (Lane, p. 43 para I) shows that Mihriban was brought up with a silver spoon in her mouth and deserves more sympathy of a reader. The same paragraph tells us the situation of her father who comes to live in Istanbul from a little town and succeeds in securing a place among the high society by dint of his money, although he has little education His child gets good education and becomes a part of the modern snobbish community. The author has used an ironical language for this situation which we find totally missing in the translation. "Her father's wealth in a short time had provoked grudge (*Ghibta*), and reprimand (*Sar Zanish*) in the high society of Istanbul One and a half year ago, the sudden marriage of Mihriban had caused much gossip among other suitors who had great hopes for marrying her. That day ferries going to Beylerbeyi were full of visiting women who wanted to collect some information about this great event and starting from that Thursday the most distingiushed families of Istanbul kept on talking about the grandeur and awe of the marriage. The talk spread around heaving and rolling with much exaggeration. Thus the mixture of wealth and nobility had led to the decision that the marriage was great." (Lane, p. 43, para I). The translator has deleted the underlined expressions and has chosen

interesting stories" is Urdu of "You, too, don't go out and I will dress you, tie your neck-tie with my own hand,twist your moustache and tell you sweet stories of doves." Here "twist your moustache" and" stories of dove" refer to the licentious act by which the author wants to show how the west has polluted the eastern mentality Neck-tie is an allusion to this point.

I.9 The last paragraph on page 41-42 is highly colourful and is rich in description: "I want to offend you and make you angry, when I find you walking at the 'Maden Yolu' by saying' Oh, what a beautiful lady, she looks like a fairy' and then I start chasing you fencing you in my mind; and with a devotion and torture of a blind lover, who has been deprived of love and who has feelings of kidnapping and snatching the beloved, I will not leave you. Then you become mine (once again) so that I may taste bitterness of seperation and sweetness of coming together and thus, feel that I really live". Semantically, the sets as the words lead to an acrid irony which is modified by the translator as "what is the use of beating about the bushes, let's go. I will enjoy the remarks of the people who will say 'O, what a beauty, she looks like a fairy,' and I also thinking that I am chasing a fairy, will follow you, as if a lover with great longing is trying to plea and he gets no response. When, finally, I get home the fairy becomes mine". "So that I may taste bitterness of separation and sweetness of coming together" is the statement that shows how Neriman wants Mihriban to look more modern and coquetish like Hamra, and these ironical touches about modernisation have totally been ignored by the translator.

I.10 "*JAnen kya bak rahe ho, chup bhi raho*" "I don't know what a non-sense you are speaking, be quiet" when compared with the Turkish "Yes I know, be quiet, I know" (Lane p. 42, para 2) sounds more abrupt, but may be is a normal tone of an Indian wife.

The paragraph No. 2 on page 6 of Salis bil-khayr, gives, simpler description and imagery. The original tries to draw more sympathy of readers for Mihriban who is subpressed by the inner secret feelings: "Mihriban with the words 'Keep quiet' shed only a few tears when she tried to explain her husband the whole calamity concealed under her fancy dress and lacework. She was trying to discover the reason for being taken out with the rosy cheeks turned pink by the kisses of her husband, and for being caressed and prodded into going out for a walk by her husband. Now, her husband's eyes sparked like thunder when he uttered "No, your breast should try to go ahead of your body,

trembling. His lips shivered and he said..."and" "He started to collect nerve-breaking, coiling, fainting and prolonging kisses from the back of her neck, which first tickle a sweet bright body and then begins to burn it from top to toe..." Since the lusty statements, as above, might have been awkward for the muslims of India, he has totally ignored them. The exclusion of such dynamic adjectives as : *"nerve-breaking, coiling, fainiting and continuing kisses"* has made the Urdu text rather insipid.

"At this moment, Mihriban being intoxicated (because of her husband's treatment) said, You have disturbed my hair and dispersed the powder of my make-up" (Lane, p. 41 para 1), has been translated as: "Being fed up of this, she said 'Get aside, you have disturbed my hair' and she immediately got away from the chair". Neither the bold expression "intoxicated Mihriban" nor the humorous statement "Dispersed my powder" has deen retained.

1.8 *"Is waqt tum sitam dhA rahi ho, uf kiya husn ka Alam hai"*. This time, the translator has expanded the simple Turkish sentence, "Oh, at this moment how beautiful you are" (Lane, p. 41, para 3) as "At this moment, you are being cruel and your beauty is at its full (or literally how wonderful is your beauty's aura). *Sitam DhAna* "to treat cruelly" and *Husn Ka Alan* "the wonderful state of the beauty" are purely Indian expressions which have popularity in the Urdu poetry.

"When your smart and attractive (*DilnawAz*) feet caress the pavements..."(Lane, p.41 para 5) has been translated as " Even when you go out with an elegant gait that tread hearts, there should be no change in your behaviour, but you feel hesitant at the public promenades". Underlined expressions are purely of Indian taste.

"I want to be beautiful just for you and just for your appreciation" Lane, p. 41 para 6) has been converted as "No, never I don't want o be beauty-seller, whatever attraction and charm I have, is just for ou and I want you only to see it." It represents sincere feelings of an astern lady and lacks sophistication implied by the Turkish author.

We further see the similar attitude of the translator in the ollowing line "You too, don't go out, I will please your heart" *Dil bahlaungi*" I will dress you and fix your moustache and tell you

I.4. "*WAh jo main Kahti hoon sab tumhe nA pasand hai to ai lo tumhin jo chAho mujhe pahnao*" Alas. whatever I say you dislike, so, here you are, dress me as you like. The Turkish is "Today you dress me" only."You dislike" and "Dress me as you like" show more submission on the part of a woman, which suits an Indian lady.

I.5 The original idea : "Your eyes darkened with collyrium should be so dark that the looks passing (flying) through them would resemble the dim light of the planets and in the presence of the magical intoxication of your looks, strong feelings of adoration should be provoked in the hearts" "(see Lane,p.39, last line) has been simplified by the translator as follows : "Make your eyelids so dark that when your looks come out of them like the dim light, it may make the love-sick mad (see Salis, p. 2, para 2)". The exclusion of the romantic and ironical expressions makes the language rather plain. Similarly, "Here, I become a doll" "*Lo main gudya bani jaati hun*" is the translation of "Decorate (paint) me like a picture" The Turkish expression has been Indianised.

I-6 "*Palkon ko khol ke un nilee Ankhon men aik khatt-i-SiyAh khinchdiya*" "Openning her eyelids he drew a black line in her blue eyes" while Turkish is : "He drew a halo (shadow) arround her greenish blue eyes". The difference is due to two styles of make up i.e. the eastern and the western. In the east, specially in India, ladies or even men stain their eyes with collyrium by running stylus in the eyes (opening the eyelids), but in west including Europe, eyes are shadowed by running the stylus at the edges of the eyelids or around the eyes. Mr. Haydar has the Indian style in mind. As the expression "greenish light blue" will lack semantic association for the Indian reader, it has been simplified as "blue eyes".

I.7 In the proceeding sections, translator has either deleted some paragraphs completely or has shortened them, for instance the excitement of Neriman (Remzi) towards his wife (see Lane, p. 40 para 4 and 5) has been skipped which rendered an attributively rich description as follows: "The heat and fit of burning breath due to excitement had caused fever in his head. His knees and hands started

To give his reader the impression that he is reading a story about the Turkish people, he has used some Turkish words as they stand, such as Bek (see Salis p. 13) = Mr or Sir, which is used in Urdu as "Beg". Nine cigim(p.26)i.e. grand mother and in Urdu it is "Nani Ji" here it is used for mother as a sign of love.Temmuz is the month of July,while our translator says "a Turkish Month". Babacigim, Babacigim (p.81) i.e. My dear father, my dear father. Baba is also used in Urdu. By using these words perhaps, the translator wanted to show how much Turkish is related to Urdu.

The Srudy of the Text : It will be convenient to compare the text section-wise as divided by the translator.

SECTON I

I1. Many sentences or accounts go astray from the original for instance : *'Nazar un mein jAkar phans jAye aur bAhar na nikle'* Some looks may stick in it (the hair) and "they may not be able to come out". The underlined phrase is superfluous and mars the beauty of the original tone. The whole Turkish sentence is "Make your hair curley in such a manner that some looks may stick in it" Perhaps it would have been better to say *'Nazar un mein phans kerah jAy'*

I-2 *SiyAh niqAb ke niche tum ne apne bAlon ko qayd kar rakha hai, woh bechAre tarap rahe hain.* The underlined expressions do not exist in the Turkish text: "Under the depairing colour of your black veil, your yellow hair will seem to cry : don't you have a thinner veil ?" The Urdu text has" You have imprisoned the hair, therefore,they are writhing" which makes the style more touchy and oriental in taste.

I.3 *KhAkastri rang ki niqAb pahan loon ?* "May I wear grey (ash like) veil ?" while Turkish is "May I wear the rosy scarf with my veil ?" and *'Yeh gulrang chehra khAkastri niqab ke niche Kiya ghazab ?'* "This rosy face under the grey veil, what a torture" the Turkish is Isn't it a pity that your veil will cover the rosy (crimson) colour of your face ?"

Since scarf is not common among the Indian ladies; and they wear either *Dopatta* a long scarf or *Burqa* a complete covering of the body that covers their faces totally. Haydar Yildirim prefers to exclude the word 'scarf'. The Turkish veils being transparent, hid only the colour of the face and were not torturing like the Indian ones.

---

17. In order to avoid further confusion and misunderstanding the English translation has been kept closer to the origional statement and tone

as Mr. Haydar says in his preface[14], but it is a lesson for those who cherish such ideas. Muftuoglu was a notionalist who had little sympathy for extreme westernism[15]. Therefore, his Lane-i Munkasir is full of ironical allusions towards madness for European way of life. Misery of Mihriban inspite of her father's wealth and snobbery, Neriman's love for the outer pomp and show of Hamra and his great repentance after his return from Europe are all elements of such irony. In the end, the husband and wife come together due to the sobriety of the child who lacks European craze.

The translator does not seem to comprehend this remote meaning of the theme which requires a good study of the Turkish literature of those days. It is probably because of this reason that we find many ironical expressions and even paragraphs missing in the translation. The plot of the story is, nevertheless, the same except some geographical names. For instance, Beyler Beyi (a region in Istanbul) has been deduced which could be confusing for the Indian readers. The other areas such as "Ata"[16] and "Diaskolos" have been retained.

The translator for facility purpose has divided the work into ten sections while the original work has no such division.

The Language : The language of the "Lane-i Munkasir" is Ottoman, written in the Arabic script. Urdu and Ottoman have many Persian and Arabic words in common. The difference is found mainly between the verbs and idioms. The sentence structure is also the same i.e. Subject+object+verb. This might have made the translator's job comparatively easy. Inspite of these similarities, we find that Haydar Yildirim avoids rich obselete words such as" *Rakhna dAr, SAkhta ishwah Mu'adhdhab Istihza,ImtizAj, Khud KAm,Infi'Al,MirArat, IzmiHlal, IhtiyAl Sitam--didah etc.* which can be considered as the part of a good translation, but the deducion of metaphorical expressions and ironical phraseology that are part and parcel of the author's style cannot be legitimate. As compared with the original, the sentences of the translation are loose, short and simple that make the style further insipid.

---

14 Salis bil-khayr, p. Jeem

15. For his nationalistic character see Dizdaroglu, ibid, p.13 and 16-18.

16. Atalar was an area in Istanbul where country houses of the rich were situated. It was composed of 9 zones, "Buyuk Ata" being the largest. It is this area which has been mentioned in the story, For other details see S. Sami, Kamns al-Alam, vol, I, P. 221, (Istanbul,. 1306 Hijri).

The Title : The actual title is **Lane-i Munkasir.** Lane (Per.)-"a nest, figuratively a house" and Munkasir (Ar.)-"broken, destroyed". Thus it means "A Destroyed House". This title could be understood by the Urdu readers but the translator has changed it into SAlis bil-khayr, [12] an Arabic title which means "The Best Third" and refers to the young daughter who brought her separated father and mother together. However, another Urdu title has also been suggested by the translator i.e, "*Ladki ki kAristAni*" The Feat of a Girl[13] which openly refers to Rana, the young daughter. Symbolically, Rana being a simple girl, unlike her father or mother, represents a normal Turkish citizen.

The Characters : The whole story has four major charactors : 1-Neriman (The Husband) 2-Mihriban (The wife) 3-Rana (The daughter) 4- Neriman's beloved Hamra. All the real names of the characters have been preserved in the translation, except Neriman. Neriman appears as Remzi. For this change we see no particular reason.

The Plot of the Story : The story is very simple. Neriman marries a rich lady of Istanbul called Mihriban. Mihriban's father is a rich snob who has come to Istanbul from a town. Neriman, after marrying Mihriban falls in love with his cousin Hamra, who is more sophisticated and fashionable girl than Mihriban and she represents a European character in the story. She draws Neriman's attention just to prove that she is more beautiful and attractive than his wife. when Neriman divorces Mihriban and wants to marry Hamra, she refuses. This makes him very angry and he goes to Europe to find peace of mind. After some years he comes back to Istanbul much repentant. The young daughter Rana, who has been brought up under her mother's good care like a normal citizen, tries her best to bring the old couple together and she succeeds in the end.

The Theme of the Story : The theme of the story is not so simple as the plot. It is not written to please the readers who adore civilistion,

12. It is not the translation of "Leyli veyahut Macnunun Intikami" as said by Prof. Akmel Ayyubi, see his article, p. 45.

13. See the front page of the "Salis bil-Khayr".

In the Indian subcontinent many hold the opinion that he was not a mere translator but a writer of the works translated[8]. This assumption makes it essential to render a comparative study of the original works, written in the Ottoman Turkish, and Urdu translations. To this end, one cannot undertake all his translations at a time, but can study each translation seperately. In this article his "Salis bil-Khayr (The Best Third) will be compared with the original "Lane-i Munkasir (The Broken or Destroyed House)" written by Ahmed Hikmet Muftuoglu.

Haydar Yildirim has neither mentioned anything about the writers he has chosen for his translations, nor he seems to have any definite scheme of the works he has selected for this purpose. However, some of them deal with the peculiar state of the eastern people who are confused by the novelties of the westernisation. Lane-i Munkasir is of this kind which was finished in 1902. Translator's remark "Those who have great love for the western way of living will, probably, be pleased to read this novel, but those who dislike such life will certainly be offended"[9] shows the reason for his selecting the novel. Before we enter into the comparison of the texts it will be advisable to introduce the author and the novel.

The Author : Ahmed Hikmet Muftuoglu was born in Istanbul in the year 1870 He spent his childhood and acquired his education in the same city. He travelled abroad as a Turkish Consul for some years. He passed away in 1927[10] .

As a fictionist he is not so renowned as his contemporaries. He, like Haydar Yildirim, started his literary activities with translations from French but, in his later life, he wrote some stories which appeared in the famous magazine "Servet-i Funun" His famous works are his collection of stories "Gulistan" (1900), "Kharistan" (1908) and "Caglayanlar" (The Cascades) which appeared various times. His "Lane-i Munkasir" was published in his collection "Kharistan [11]". It is from this Ottoman Turkish Text that the translator has adapted his "Salis bil-Khayr".

---

8. See Dr. Akmel Ayyubi, ibid, p. II
9. Sejjad Haydar, ibid p Jeem
10. For further details see Hikmet Dizdaroglu, ***Muftuoglu Ahmet Hikmet***, Turk Dil Kurumu, Ankara 1964.
11. Ahmed Hikmet Muftnoglu, ***Kharistan***, Kanaat Kutuphanesi, Istanbul 1324 Hijri, P 39-79 finished by the author on 27 April, 1899.

Sejjad Haydar Yildirim's Translations : A comparative Study

Seyyid Sejjad Haydar Yildirim (1880 - 1943) is a prominent igure of India and Pakistan as a novelist and fictionist. He got nterested in the Turkish language and literature when he was still a oung student[1]. Larger part of the fame, however, depends on the Turkish translations[2] he did from the writers of the Tanzimat (Orga- iisation Period 1860 - 1896) and the Servet-i Funun (period named ifter the magazine "A wealth of Sciences" betwen 1896-1901). These eriods saw much French influence after the year 1860[3] eradicating he worn-out literary Perso-Arabic impacts, and as a result of which merged "A Great Awakening"[4] .

Haydar Yildirim started his translations with the idea that the uropeanisation of Turkey would set an example for the readers of ndia who, themselves, were to pass the same stages of social life and evolution[5] . His translations from Turkish require a comparative udy to see whether they are simple conveyance of the original or ey have been adapted to meet the demand of a social Indian group. aydar Yildirim, nevertheless, neither claims perfection of his anslation "Salis bil-Khayr", nor he confesses the adaptation of the iginal work., but he believes that he has drawn a true picture of urkish social life[6] by doing literal translation[7] .

. Vide Durdane Kasmi, *Sejjad Haydar Yildirim* (a brochure), Utterpardesh Urdu Academy Lucknow, 1981 p. 2.

. See Dr ▬ Ayyubi's article "Urdu ke Turki Terjume" *Nava-i Adab* Bombay vol. 31, No. 2 p. 35 and Dr. Seyyid Muin al-Rahman, *Kavmi Zuban*, Karachi, Feb. 1968 p. 14 and 23.

. Vide Prof Dr Kenan kyuz, *Turkish Ansekleopedia*, Milli Egitim Basimevi Ankara 1982, vol. No. 257, p. 134 and Gibb, *History of the Ottoman Poetry*, vol. V. p. 3

. So named by Gibb, see ibid, p 2

. See Sejjad Haydar Yildirim, *Salis bil-Khayr*, Lucknow 1932 (Preface Be)

. Ibid, p. Be

Ibid, p. Jeem and Dr. ▬ Ayyubi, same article, p. 13.

Dr. Erkan Turkmen, Associate Professor of Oriental Languages, Seljuk University, Turkey - originally belonging to Peshawar - is a citizen of Turkey running in second generation. He is, therefore, at home in Urdu as well as in Turkish____a unique achievement these days. He was in India during 1984, and delivered a lecture on Yildirim in the Khuda Bakhsh Library. This paper is based on that very lecture.

Sejjad Haydar Yildirim's Translations
—A Comparative Study

by

Dr. Erkan Turkmen

CONTENTS

Printers : Liberty Art Press, New Delhi and Patna Litho Press, Patna
Publisher : Mahboob Husain for Khuda Bakhsh Library, Patna, Phone 50109
Editor : Dr. A. R. Bedar
Annual subscription : Rs. 60.00 (Inland), 12-00 Dollars (Asian countries), 24 Dollars (other countries) Rs. 15-00 per copy

KHUDA BAKHSH LIBRARY JOURNAL

36

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna

خدابخش لائبریری

جرنل

پٹنہ

۳۷ ۳۸ ۳۹

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر ۷۷/۳۳۳۱۲

سینتیسواں
اڑتیسواں } شمارہ [illegible]
انتالیسواں

قیمت ۴۵ روپے

قیمت: فی پرچہ ۱۵ روپے

سالانہ
: ۶۰ روپے (ہند)
: ۱۲ ڈالر (ایشیا)
: ۲۴ ڈالر (دیگر ممالک)

مجیب حسین نے اردو حصہ پٹنہ لیتھو پریس، رمنا لین، پٹنہ ۴ اور انگریزی حصہ لبرٹی آرٹ پریس، دہلی سے چھپوا کر
خدا بخش لائبریری سے شائع کیا

ایڈیٹر: عابد رضا بیدار

ہندستانی مسلمان

عصری دستاویزات کے آئینے میں

علی گڑھ تحریک

۱۸۰۰ — ۱۹۰۵ء

فہرست

دوسرا حصہ

حصۂ انگریزی:

پیشگفتار

عصری اسلام یا دوسرے لفظوں میں اپنے عہد کے اسلامیوں کی فکری دستاویزات کی پبلکیشن کے منصوبے کے تحت ہندی فکر کو اولین ترجیح دینے کا خیال اس لیے آیا کہ:

اسلامیانِ عالم کی فکر کا انعکاس عالمِ اسلام کی جن پانچ اہم زبانوں میں ہوتا رہا ہے ان میں عربی ایک حد تک فارسی میں جو کچھ چھپتا ہے وہ موجودہ عالمی افکار کا جزو بنتا جاتا ہے۔ لیکن انڈونیشی، ترکی اور اردو کو ذریعۂ اظہار بنانے والوں کی نمائندگی بیرونِ حلقہ بہت کم ہو پاتی ہے۔ حالانکہ یہ تینوں زبانیں فکری سطح پر ہی نہیں عددی اعتبار سے بھی عربی فارسی سے کسی طرح قدر میں دبتی ہوئی نہیں ——— اور تینوں میں اردو کا درجہ تو خصوصی امتیاز رکھتا ہے کہ وہ پورے برصغیر کے مسلمانوں کی فکری زبان ہے جن کی مجموعی تعداد کو نہ ترک پہنچتے ہیں نہ ایرانی، نہ تورانی، نہ انڈونیشی ——— اور نہ عرب۔

عہدِ جدید کے برصغیر میں اسلام کی دو فکری زبانیں رہی ہیں۔ اس لیے خصوصیت کے ساتھ ان دونوں زبانوں "انگریزی اور اردو" کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا: انگریزی فکر کو کم، کہ عالمی علمی حلقے تک اس کی پہنچ ہے، اردو فکر کو زیادہ کہ مرحوم عزیز احمد کے بعد اس کی طرف بھرپور توجہ دلانے والے کم ہی ہیں!

برصغیر کی اتھل پتھل کے "اس سیاست زدہ دنیا میں" تناسب سے زیادہ اہمیت اختیار کر جانے کے سبب، سینتالیس تک کے افکار کی نمائندگی تو خاصی ہوئی۔ لیکن:

آزاد ہوئے ہمیں چالیس سال ہونے کو آئے، اس عہد کو اس طور سے سمیٹنا، کہ اس فکر میں آئینے سے آنکھیں چار کرنے کی سکت بھی آسکے، اور آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر بھی دکھائی دینے لگے: یہ کام کسی "مستشرق" کے لیے چھوڑ دینے سے نوعیت ہی بالکل بدل جاتی ہے۔ وہ تو تاریخ کا گزرا ہوا ایک دور کے طور سے اپنی تقویم کا ایک باب بنا کے ہمیشہ کے لیے بھول جائے گا کہ کبھی فتراک میں اس کے کوئی نخچیر بھی تھا! لیکن ہندی مسلمان کے لیے تو یہ ایک زندہ، متحرک، لمحۂ موجود سے جڑی ہوئی حقیقت ہے ——— اس کا درد! اس کے خواب!!

تین

عصری ہندستانی اسلام یا زیادہ واضح الفاظ میں ہندستانی مسلمان کے بارے میں ابتک جو مغربی یا مشرقی
برپا ہوتی رہی اس کا رخ ان کی سیاسیات کی جانب رہا۔ اور اس لیے ان کی فکری نمایندگی جہاں کہیں
ی سارا زور سیاسی افکار —— بلکہ اعمال (بے روزگاری یا روزگار کے معاملے میں امتیازی برتاؤ، فرقہ وارانہ
ادات، اردو، علی گڑھ کا اقلیتی کردار —— اور مسلم پرسنل لا) پر رہا۔ ان میں سے کچھ مسائل تہذیبی ہوتے ہوئے بھی سیاسی
ئے جاتے رہے کہ انھیں الجھانے اور سلجھانے والوں دونوں کے خیال میں یہ سیاست سے جڑے ہوئے تھے۔

ہندستانی مسلمان کی مذہبی فکر، اس کی تہذیبی فکر، اس کی سماجی اور معاشی فکر، اس کی تعلیمی فکر یہ سامنے
کا اخباروں اور رسالوں میں، کتابوں میں، محفلوں میں، جلسوں میں تحریر و تقریر کی صورت میں سامنے آتے رہے
لن ان کی لے اتنی مدھم تھی کہ سیاست کے ڈھولوں پر جو شور مچتا رہا اس میں دب کر رہ گئی۔

اس کا ایک افسوسناک پہلو یہ رہا کہ جاندار افکار کا دھارا جس سے خود سیاست کو توانائی ملتی جس
ہ باعزت جینے کا حوصلہ ملتا جس سے فرد اور ملت کے، ملت اور قوم کے، اور پھر قوم اور بین الاقوام کے رشتوں کو
نئی بنیادیں ملتیں، جس سے نا کسی کے آگے دیکھنے کی نظر ملتی، وہ سب پس منظر میں چلا گیا۔ ایک نقصان یہ بھی
ا کہ ہم اپنے قدر کی بہ نسبت ہونے کا امیج پیش کرتے رہے اور اس کے نتیجے میں عوام میں احساس بے چارگی
ر ذہین طبقے میں احساس کمتری بڑھتا گیا —— اور نئی نسل میں جاندار فکر کا بہاؤ کم ہوتا گیا۔

سیاست کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن سیاست پوری زندگی تو نہیں۔ مذہب، تہذیب،
ریخ اور معاشرہ یہ سب بھی سوچتے ہوئے ذہن کے محور بن سکتے ہیں، بنتے ہیں۔ ان سے متعلق افکار کی نمائندگی
ہو پائے تو ادھوری تصویر اکثر گمراہ کن ہوا کرتی ہے۔ فکری دستاویزات کا یہ سلسلہ ہندستانی مسلمان کی
صویر کو اس کے صحیح چوکھٹے میں رکھ کے دیکھنے کی ایک مختصر کوشش ہے۔

سینتالیس سے پچاسی تک ہندی مسلمانوں کی فکری دستاویزات پیش کرتے وقت علیگڑھ
ولیت دینے کے لیے کسی اعتذار کی ضرورت نہیں ہے، کہ علی گڑھ فکری سطح پر ہمیشہ کی مانند آج بھی
مسلمانان ہند کے دل کی دھڑکن ہے، اور ضمیر کی آواز بھی۔

آزادی کے بعد علی گڑھ نے جو سفر طے کیا وہ واضح طور سے تین حصوں میں منقسم ہے: تشکیلی
ہد، جسے ذاکر صاحب کا عہد بھی کہہ سکتے ہیں، جس کا مومینٹم ان کے علی گڑھ چھوڑنے کے بعد بھی پانچ

سات سال تک چلتا رہا یعنی کرنل زیدی اور ان کے بعد طیب جی تک! اور پھر عبودی عہد ہے
علی یاور جنگ کے زمانے سے دورِ خسروی تک چلا۔ اور پھر پچھلے پانچ سال اور ان کا تسلسل سید حامد
اور سید ہاشم علی کا عہد۔

علی گڑھ کی فکری دستاویزات کا آغاز ہم نے اس کے آخری دور سے کیا ہے۔

سیّد احمد سے سیّد حامد تک ۱۸۷۵ سے ۱۹۸۵ تک، علی گڑھ تحریک
ڈوبتا اچھلتا دس اوپر سو برس پورے کر لیے۔ اچھے بُرے دونوں وقت آتے رہے اس پر۔ بُرے زیادہ
کہ ہر تحریک کی سرنوشت میں یہ اس کی تقدیر بن کے شامل رہا ہے شاید اس لیے کہ تحریک کی آبیاری کے
یہ ناگزیر ہے لیکن تحریک پر ایمان رکھنے والے صورتِ خورشید ادھر ڈوبے ہیں کہ اُدھر نکل آتے ہیں۔ ایقان
اور ایمان کے مقابلے کی طاقت سائنس بھی اب تک پیدا نہیں کر سکی ہے۔ آگ میں کود پڑنے والوں کو کون زیر کر
سکا ہے؟ سید اعظم نے اپنی زندگی میں اپنی تحریک کو پروان چڑھتے دیکھ لیا تھا۔ ان کے بعد انھیں جیسے مخلص سا
محسن الملک، وقار الملک، حالی، شبلی، چراغ علی، عزیز مرزا ادارہ اور تحریک دونوں شمعوں کو دونوں
ہاتھوں میں منور کیے رہے۔ پھر سیّد کی تربیت گاہ کے پروردہ آفتاب احمد خاں، مزمل اللہ خاں، ضیاء الدین
راس مسعود، اور دوسرے اپنے اپنے طور پر اس درسگاہ کی خدمت کرتے رہے تا آنکہ سنہ سینتالیس آ گیا: بڑا تو
کی گھڑی تھی جس ادارے نے بیک وقت پاکستان کے لیے، ہونے والا وزیر اعظم (لیاقت علی خاں) اور ہندوستان
کے لیے ہونے والا وزیر با تدبیر رفیع احمد قدوائی پیدا کیا ہو ——— ہونے والا صدرِ پاکستان (ایوب خاں)
ہونے والا صدر جمہوریۂ ہند (ذاکر حسین) بنایا ہو، اس ادارے کے لیے سخت گھڑی تھی یہ۔ بڑی تو بڑی
چھوٹی کڑی سے امتحان سے دوچار ہوتی ہیں اتنا ہی بڑا آدمی بھی ادھر لاتی ہیں: آزاد ہندوستان کا علی گڑھ جتنی
بڑی آزمائش سے دوچار تھا اس سے نمٹنے کیلیے اس نے اس بار اتنا ہی بڑا آدمی پیدا کر دیا: ذاکر صاحب علی گڑھ کو
محض ادارہ ہونے سے بچا لے گئے اور جاتے جاتے ایسا زبردست مومنٹم (Momentum) دے
گئے جو اتنی ہی مدت مزید چلتا گیا۔

مومنٹم (Momentum) ختم ہوا تو علی گڑھ کے ساتھ چلنے والے کم، زمانے کے ساتھ چلنے والے زیادہ آ
آنے لگے۔ سردارِ قافلہ، قافلہ کا مزاج متعین کرتا ہے: سو وہ کرتا رہا؛ نتیجہ میں ایک فرزندِ علی گڑھ کو دوبارہ
سے لکھنا پڑا:

پانچ

" اس ادارے نے حوصلہ پیدا کیا، روشنی بخشی، اس نے ایسے فرزندوں کو جنم دیا جو ملک و ملت کیلئے سرمایۂ افتخار بنے۔ جو کچھ روشنی ہم ہندوستانی مسلمانوں میں دیکھتے ہیں وہ بڑی حد تک اسی ادارے کی دین ہے۔

لیکن آگے چل کر۔۔۔۔

"۔۔۔ یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ کی تعداد، اس کی عمارتوں اور ساز و سامان، اس کے بجٹ میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔۔۔ لیکن اس دارالعلوم میں وہ روح پیش کرنا کہ جس نے اسے تعلیم و تربیت کی ایک بڑی تحریک بنا دیا تھا۔ اس کے فرزند اس اعتماد و حوصلہ سے محروم ہیں جو ان کی پہلی پیڑھی کا طرۂ امتیاز تھا۔ انھوں نے ریاضت سے دامن بچایا، مقابلہ سے آنکھ چرائی، مقدار کو معیار کا بدل سمجھا۔۔۔! انجام کار یونیورسٹی عام یونیورسٹیوں کی صف میں بیٹھ گئی۔۔۔ اور ایک جیتا جاگتا انسٹیٹیوشن، خوابوں اور زندگی سے بھرپور ادارہ ضابطہ پرستی، بے آہنگی اور معیار فراموشی کے شکنجے میں جکڑ گیا۔"

اسی نے، اسی ردیف و قافیہ میں، جلتے سلگتے ذہن کے ساتھ، علیگڑھ کے ایک درد مند کے قلم سے اتنا آنسوؤں کے ٹپک پڑے:۔

"شروع میں۔۔۔ معمولی درجے کی بھی سہولتیں بھی حاصل نہیں تھیں، عمارت پختہ نہیں تھی، اساتذہ کے لیے آرام دہ مکانات نہیں تھے، چمن بندی نہیں تھی۔۔۔ لیکن اس پورے ماحول میں کوئی بے چینی نہیں تھی۔ طلبا اور اساتذہ میں باپ بیٹوں کا سا تعلق تھا۔ سب ایک دوسرے کے ہمدرد و مونس و غمخوار تھے۔ کسی کو کسی سے شکایت نہیں تھی۔ لیکن اب صورتِ حال بہت بدل گئی ہے!

"اب: اپنے گھروں پر تنگی اور دشواریوں کی زندگی گزارنے والے بھی یہاں اس طرح آتے ہیں جیسے داماد سسرال میں ـــــ شریف داماد تو سسرال والوں کا معاون اور ہمدرد ہوتا ہے لیکن یہاں صرف مالیوں پر نظر رہتی ہے اور صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس طرح کی فضا پیدا کر کے اپنا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔۔۔ کیا یہ ان خوابوں کی صحیح تعبیر ہے جو اس کے بانیوں نے دیکھا تھا؟ کیا اسی طرز کے کردار کے لیے انھوں نے اپنی نیندیں حرام کی تھیں اور در در کی بھیک مانگی تھی۔۔۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہاں صرف وہ لوگ آئیں گے جن کے سامنے دنیوی وجاہت اور ترقی کے سوا کوئی اور مقصد ہی نہ ہوگا؟ انہیں صرف مراعات کی ضرورت ہوگی۔۔۔ یہ اساتذہ اور ملازمین اچھی تنخواہوں اور ہر قسم کی رہائشی اور دوسری سہولتوں کے

چھ

باوجود ہر دن کسی کا شکوہ کریں گے، اور ایسے فرزندانِ قوم آئیں گے جو ہر دن مراعات کا مطالبہ کریں گے:
امتحان کی چھوٹ، عمارتوں کا مطالبہ، کھانے کا مطالبہ، داخلوں کا مطالبہ، اساتذہ کے خلاف ہنگامہ آرائی، ماں
بہن کی گالیوں سے لیکر ہر قسم کے القاب سے خطاب، اساتذہ اور انتظامیہ کی تضحیک، بم، چھری، چاقو،
پستول کی دھونس: اس کام کے لیے ادارہ کی ضرورت نہیں تھی! اس کے لیے تو پڑھا لکھا ہونا بھی شرط نہیں!
اس کے لئے مسلمان ہونے کا بھی شرط نہیں!!!

"مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کی سب سے بڑی خوبی ان کا خلوص اور ادارہ اور طالب علموں کے ساتھ ان
کی وابستگی رہی ہے۔ اچھے طالب علموں کی تلاش، ان کی سرپرستی اور اکثر اپنی یافت کا بڑا حصہ ان پر لٹا
دینا، ان کے کردار کا وہ سب سے نمایاں اور روشن پہلو ہے جس نے اس ادارہ کی انفرادیت کو باقی رکھا
ان کا ایثار ان کی زندگی میں ایسا رچا بسا تھا جو بادِ سحر کے نم کی طرح نئی کلیوں میں جذب ہو جاتا اور انہیں
ہوئے پھولوں میں تبدیل کر دیتا! دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ ایسے لوگوں کا تناسب گھٹ رہا ہے
ان لوگوں کا تناسب بڑھ رہا ہے جو محض ملازمت اور اپنی آمدنی کی خاطر یہاں آ گئے ہیں اور ذرا انکو بہتر موقع
کے آثار کہیں نظر آئے اور انھوں نے طوطا چشمی کی۔ یہاں تو لوگ کشتیاں جلا کے آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے!
ادارہ تاریخ سے نہیں تحریک سے چلتا ہے!!"

۱۹۸۰ء میں ایک بار پھر ادارہ 'تحریک' میں تبدیل ہونے لگا۔ ادارہ کو جامد کرنے والی ذاتی
اور تحریک بند نظامی قوتوں میں گھمسان کا رن پڑا جو پورے پانچ سال چلتا رہا۔ اس بار تحریک کے احیا کا شرف
سید حامد کے حصے میں آیا۔ وہ ذاکر صاحب اور رشید صاحب کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے، خود اسی مادرِ درسگاہ
کے زائیدہ تھے، اعلیٰ انتظامی امور میں طویل تجربہ کے مالک تھے، دردمند دل اور کھلے دماغ کے ساتھ اپنے
پر ایقان تھا اور اپنے پیدا کرنے والا پر ایمان کہ اس نے جو مشن دیا ہے اُسے پورا کرنے کا حوصلہ بھی بخشے گا اور پار
بھی لگائے گا۔ دینے والے نے لینن اور ماؤ کی طرح سیف و قلم دونوں کی صلاحیتوں سے اپنا کام لینے کے لئے
پوری طرح نوازا تھا، صورت حال کے اس فرق کے ساتھ کہ یہاں رزم آرائی پرایوں سے نہیں اپنوں سے تھی —
اور یہ مرحلہ زیادہ کڑا ہوتا ہے!

سیّد احمد پر ایک بار یہ گزر چکی تھی: جنھوں نے ایک طرف ادارہ کو در و دیوار دیئے، اس میں نقش و نگار بھرے، تعلیم دی، تربیت کی ———— تو دوسری طرف زبان اور قلم سے ادارہ کو تحریک بنانے کا کام بھی انجام دیتے رہے: پچھلے پانچ سال میں یہ دو محاذی مورچہ، ان کی تربیت گاہ کے پروردہ یافتہ سیّد حامد نے اُسی خوش اسلوبی سے سر کیے جیسے سید اعظم اس وقت رہتے تو کرتے۔

سیّد احمد کی طرح سیّد حامد نے تحریک کو اس کا ایک آرگن بھی دیا۔ سید کے تہذیب الاخلاق کا احیا کر کے نئے عہد کی علی گڑھ تحریک کے سنبھالنے والوں نے اپنے پرچے کا نام تہذیب الاخلاق رکھ کے علی گڑھ کی کتاب ماضی کے آخری ورق سے اپنا رشتہ استوار کر لیا۔ اور جیسے کی طرح اب بھی سوچنے والوں کا ایک حلقہ ایک بار پھر تہذیب الاخلاق کے گرد جمع ہو تا گیا اور روشنی پھیلتی گئی۔ سیّد حامد اور ان کے "تہذیبی" حلقہ کے یہ افکار اس دستاویزی پیش کش کا جزو اعظم ہیں۔

یہ دستاویز پچھلے پانچ چھ سال میں لکھی گئی علی گڑھ کے نمائندہ، پروردہ، یا علی گڑھ سے وابستہ ان اہل قلم کی تحریروں کا مجموعہ ہے جو اپنے ذہن سے سوچتے ہیں، اور براہ راست یا گھوم پھر کے کسی نہ کسی طور جن کی فکر کا محور وہ مرکزی نقطہ رہتا ہے جسے ڈاکٹر عابد حسین نے ہندستانی مسلمان کی تقدیر (Destiny) سے تعبیر کیا ہے: ہندستانی مسلمان آئینۂ ایام میں!

پچھلے پانچ چھ سال میں لکھی گئی تحریروں کے ساتھ ساتھ، اسی عرصے میں علی گڑھ کے فکر کا ترجمان تہذیب الاخلاق میں سرسید اور سرسید کے نمائندہ (اگر ملیح آبادی کی زبانی مولانا اس راز کو خود فاش نہ کر دیتے تو راز راز ہی رہ جاتا) ابوالکلام آزاد کی جن تحریروں یا تقریروں کو خصوصی اہمیت کے ساتھ پیش کیا گیا انھیں بھی اس دستاویز میں اس لیے شامل رکھا گیا ہے کہ اندازہ ہو سکے کہ ۱۹۸۰ - ۱۹۸۵ء کے علی گڑھ کے ذہن نے ان دو بڑے مفکروں کو اپنا سرچشمۂ فیضان تسلیم کرتے ہوئے ان کی کس قسم کی تحریر یا تقریر پر زور دیا۔ نئی علی گڑھ تحریک نے اپنا رشتہ اپنے قدآور بانی سے جوڑے رکھا ہے جس نے مذہب، تہذیب، تاریخ، تعلیم اور ہندستان کے ملے جلے سیکولر سماج سب کے حقوق ادا کیے۔ سرسید کو پڑھتے ہیں تو لگتا ہے

۱۸۷۰ سے ۱۹۸۵ تک ۱۱۵ سال کا طویل سفر طے کر لینے کے باوجود اسلامیانِ ہند کے بنیادی مسائل کوئی قابلِ لحاظ تبدیلی نہیں آئی ہے۔ آج بھی اُن مسائل کے حل کی تلاش میں سید کے نقوش یا خاصی رہبر کو رکھنے
سید نے کہا تھا:

"غدر کے بعد خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں: نہیں، اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑی ہے اس کو دور کرنے کی ہمت باندھنی ہے۔"

"بہت سی باتیں خود ہماری طبیعتوں یا ہماری غلط فہمیوں نے پیدا کی ہیں جو در حقیقت مذہب اسلام میں نہیں ہیں؛ اور اسی سبب سے مسلمانوں کی عجیب حالت ہوگئی ہے اور یہی باعث ہے کہ غیر قومیں ہم اس حیثیتِ مجموعی پر خیال کر کر اس مجموعے کو مذہب اسلام قرار دیتی ہیں اور اس کی نسبت حقارت کی رائے رکھتی ہیں... لیکن اب کیا یہ غیرت کی بات نہیں ہے کہ ہم غیر قوموں سے ایسی حقارت کے الفاظ اپنی نسبت اپنے روشن اور سچے مذہب کی نسبت سنیں، اور اپنی تہذیب اور تربیت اور شائستگی کی طرف متوجہ نہ ہوں"

"انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں؛ اور کوئی برائی نہیں جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو ـــــ ہماری قوم کے جوان لڑکے انھیں تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات کہ از راہ ناانصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہیں اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں! اس لیے ایسی قسم کی کتابوں کا پیدا ہونا جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے۔"

"میری رائے میں ضروری ہے کہ ہندوستان میں ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن ایسے ہی ہوں جو لامذہب ہوں۔ جب مختلف قوم اور مختلف مذہب کے لوگ بستے ہوں تو مذہبی آدمی کا افسر تعلیم ہونا اکثر دفعہ بے تعصب تعلیم کا مانع ہو جاتا ہے۔"

ستاون کے بعد سینتالیس ایک اور جوئے خون تھی جو اس قوم کے سر سے گزر گئی مگر اس طرح گزر کر خاصا بے حال کر گئی۔ سرحدِ قبیلہ کی ذمہ داریاں اس بار ابوالکلام آزاد کے حصے میں آئی تھیں اور جو علیگڑھ

نہ ہوتے ہوئے بھی سیّد اعظم کا اپنا پہلا استاد مانتے تھے) پچھلے پانچ سال میں مولانا کی جو نمایندہ تقریریں
گڑھ کے آرگن کے ذریعہ تنقیدِ مکرر کے طور پر پیش کی گئیں وہ علی گڑھ تحریک کے مزاج کی پوری ترجمانی کرتی ہیں۔
ریہ مزاج کچھ وقتی جوش کا نتیجہ ہو جو اس ہیجان اور ہنگامہ کو دیکھ کر مسجد شاہجہانی کی اس تاریخی تقریر میں
پڑا ہو۔ ایسا نہیں ہے یہ مزاج تو آزادی سے برسوں قبل رام گڑھ کانگریس کے صدارتی خطبہ میں بھی
تیور کے ساتھ موجود تھا جب مولانا نے کہا تھا:

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے
ترکہ میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام
علوم و فنون، اسلام کی تہذیب، میری دولت و سرمایہ ہے؛ اور، میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت
ں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے، میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں ایک خاص ہستی رکھتا ہوں؛ اور میں برداشت
ں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن، ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی
کھتا ہوں، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے؛ میں فخر کے
تھ محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں
ں کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے، میں اس کی تکوین کا ایک ناگزیر عامل ہوں، اور میں
اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

"ہندوستان کے لیے قدرت کا فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں،
ختلف تہذیبوں، اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح نمودار نہیں ہوئی تھی
ن قافلوں کی آمد شروع ہو گئی۔ اور، پھر ایک کے بعد ایک یہ سلسلہ جاری رہا، اور اس کی وسیع سرزمین
ب کا استقبال کرتی رہی، اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ انہیں قافلوں میں آخری
فلہ پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا، اور ہمیشہ کے لیے
گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کا ملاپ تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے
ک دوسرے سے دور بہتے رہے لیکن، پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے، دونوں کو ایک سنگم پر
جانا پڑا! ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا، اسی دن سے
درت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع

کردیا اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے، اور یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی ؛ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کردی، اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے ۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی ؛ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیغام پہنچایا۔

"تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ کو گزر چکی ہیں ۔ اب اسلام بھی اسی سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے ۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے ۔ جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے ، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں ۔

"ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک ملی جلی تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ؛ ہماری زبانیں ، ہماری شاعری ، ہمارا ادب ، ہماری معاشرت ، ہمارا مذاق ، ہمارا لباس ، ہمارے رسم و رواج ، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں ، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ چکی ہو ۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے ، ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچا پیدا کر لیا ۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے ، مگر اب ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا ۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی نہیں شروع ہوئی تھی ۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں ۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب اور معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ وہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے ——

—— اب یہ سانچا ڈھل چکا ہے اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی ، ہم پسند کریں یا نہ کریں۔"

گیارہ

سرسید اور آزاد کے ساتھ ساتھ معاصر علی گڑھ کے لیے تیسرا فیضان اقبال ہیں۔ جب تہذیب الاخلاق (جدید) ۱۹۸۲ء میں علی گڑھ کا ترجمان بن کر نکلا تو سرسید اور آزاد کے علی الرغم اس کی تقریب رونمائی اقبال کی ایک غزل سے شروع ہوئی۔ نئے علی گڑھ کے اس نئے ترجمان کے مقاصد کے پیش نظر دیکھیے تو اس آغاز میں کیسی ڈرامائیت ہے اور کس طور پر برمحل انتخاب ہے:

میر سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف — آہ وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف
تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں — ڈھونڈ چکا میں موج موج، دیکھ چکا صدف صدف
عشق بتاں سے ہاتھ اٹھا، اپنی خودی میں ڈوب جا — نقش و نگار دیر میں خون جگر نہ کر تلف
کھول کے کیا بیاں کروں، سر مقام مرگ و عشق — عشق ہے مرگ باشرف، مرگ حیات بے شرف
صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش — لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف
مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی — اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لاتخف
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ — سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

اور آزادی کے بعد انسپریشن بنے ذاکر صاحب! نئی علی گڑھ تحریک کا تنہا انسپریشن!! ذاکر صاحب نے علیگڑھ آنے سے پہلے پوری قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ مقام اور موقع تھا کاشی ودیا پیٹھ بنارس کا کانووکیشن ایڈریس:-

"آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کردوں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے، اور مسلمان کسی حال میں بھی یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں۔ اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کا نقصان جو ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا:

گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما — گلستاں میرد اگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندستانی اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات اور اپنے

تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو خود اپنے لیے ہی بے بہا نہیں سمجھتے، بلکہ ہندستانی قومیت کے لیے نہایت بیش قیمت جانتے ہیں اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کیے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں بلکہ ہندستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے، وہ ہندستانی قوم کا جزو بننے پر فخر کرتے ہیں، مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں انکی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی، اور نہ کوئی مسلمان انھیں ہندی ہونے پر شرمائے، نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے"۔

پھر علی گڑھ آنے کے بعد انھوں نے اپنی اس فکر کا مرکز علی گڑھ کو بتاتے ہوئے اس کی تشریح کی:۔

"میرا تو یقین ہے کہ علی گڑھ کو قومی زندگی میں بڑا کام انجام دینا ہے، وہ کام ہندستانی مدبر اور ہندستانی تعلیم دونوں کا بنیادی کام ہے، یعنی ایک سیکولر جمہوری ریاست میں ایک متحدہ قوم کی تعمیر کا کام اور اس کی زندگی میں چار کروڑ مسلمان شہریوں کا حصہ اور مقام۔ کتنا بڑا کام ہے اور کیسا دلکش کام! مختلف تمدنی، تہذیبی عناصر کو باہم سمو کر ایک متوازن اور ہم آہنگ زندگی کی تعمیر کا کام جس میں ہر جزو دوسرے جزو کی رونق کو چمکائے اور ایک حسین و جمیل کل کی تشکیل میں مدد دے! ماضی کے سارے خزانوں کو چاہے کہیں سے آئے ہوں ہر ہندستانی کی مشترک میراث بنا دینا، کہ سب ہمارے ہی گمشدہ لعل ہیں، سب کو ایک مشترک ماضی سے مالامال کرنا، سب کو مستقبل میں ایک جد و جہد کا ولولہ بخشنا ——— اس عزیز وطن کے ہر مسلمان شہری کے ذہن میں یہ یقین رچا دینا کہ ان کا دین اور ہندستانی زندگی کو صالح بنانے میں ان کا مخصوص منصب، یہ ان پر ذمہ داری کا ایک اور بوجھ ڈالتے ہیں اور خدمت کا ایک نادر موقع پیش کرتے ہیں، یہ بے وفائی یا بے اعتنائی کا بہانا نہیں ہیں۔ کچھ چھوٹا کام ہے یہ؟

"علی گڑھ جس طرح کام کرے گا، علی گڑھ جس اسلوب پر سوچے گا، علی گڑھ ہندستانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے خدمت کی جو پیشکش دے سکے گا اس سے متعین ہوگا ہندستانی قومی زندگی میں علی گڑھ کا مقام! اور ہندستان جو سلوک علی گڑھ کے ساتھ کرے گا اس پر ہاں اس پر بڑی حد تک منحصر ہوگی وہ شکل جو ہماری قومی زندگی مستقبل میں اختیار کرے گی"۔

علی گڑھ تحریک ایک تعلیمی تحریک تھی، یہ اس کی محض ایک جہت ہے۔ ادبی، مذہبی اور تہذیبی فکر میں
ری تبدیلی لے آنے والی، اور زندگی کی طرف پورا اندازِ نظر ہی بدل دینے والی تحریک کو محض تعلیمی تحریک کہ کر
جانا اس کی پوری تاریخ کو نظر انداز کر جانا ہے۔

یہ تو بنیادی طور پر پوری زندگی کو ہدف بنائے ہوئے ایک منصوبہ بند تحریک ہے، تعلیم جس کا ایک
بڑی۔ اسی طرح اگر جنسی میں پہلے ہی یہ 'اعتماد کی بازیابی' کی تحریک رہی ہو، مگر اس کی منصوبہ بندی میں سماجی
یت، مذہبی روشن خیالی، معاشی خوش اطواری سب کچھ شامل رہا کیے ہیں۔
اس کا قد گھٹانے کے لیے علی گڑھ کی ایک تعریف (یا تنقیص) یہ بھی کی گئی کہ یہ پاکستان ساز تحریک تھی؛
اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ تحریکِ پاکستان کو سب سے بڑی کمک اور رسد علی گڑھ سے ملی: پاکستان کا
لا وزیرِ اعظم اور اہم ترین صدرِ مملکت علی گڑھ ہی کے نمائندہ تھے!
لیکن یہ محض ایک پہلو ہے: دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ ہندوستان کا وہ تنہا وزیر یا تدبیر جسے عوام آج تک
ارکے ساتھ یاد کرتے ہیں (رفیع احمد قدوائی) اور وہ صدرِ جمہوریہ حزبِ مخالف بھی جس کی عزت کرنے پر مجبور تھا
اکر حسین) علی گڑھ ہی کے فرزند تھے۔ اور وہ بھی علی گڑھ کے فرزند تھے (محمد علی شوکت علی) جنھوں نے
ندھی جی کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے 'سرکاری' درسگاہ کا بائیکاٹ کر کے جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالی تھی،
نیں پورے دیش کا بابو بنا دیا تھا، اور ان کی تحریک کو ایک ملک گیر تحریک! علی گڑھ اگر مسلم لیگ
قلعہ تھا تو کانگریس کا بھی اتنا ہی بڑا گڑھ تھا، یہاں بھی علی گڑھ نے اپنا وہ
خصوصی کردار دکھایا کہ دو الگ الگ بلکہ متضاد خیالات بھی ایک ادارہ میں ساتھ ساتھ
پل سکتے ہیں، ایسی خلوصِ فکر شرط ہے۔

سچ یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک ایک زاویۂ نظر ہے، اعتدال، شرافت، رواداری، روشن خیالی اور جرأت
مندی جس کے بنیادی عنصر ہیں۔ یہ انسانی سماج کو، اور اس لیے اس کے پانچویں حصّے کی نمائندگی کرنے والے
ہندوستانی سماج کو، ایک کُل کی حیثیت سے دیکھتی ہے مسلمان ہندوستانی جس کا ایک جز ہے۔ اس کی فکر کا
مرکزی نقطہ یہ ہے کہ کُل کمزور ہوتا جائیگا اگر کسی سبب کوئی ایک جز دوسرے اجزا کے شانہ بشانہ کل کی
پرداخت کے لیے اپنا استحقاقی رول ادا نہ کر پایا۔ سو جز کی ہمہ جہتی ترقی میں کل کی ترقی پوشیدہ ہے مسلمان
ہندوستانی ترقی کرے گا، آگے بڑھے گا تو ہندوستان ترقی کرے گا اور اگر وہ گرے گا تو اسی نسبت سے یہ بھی

کہا جائے گا کہ وہ اتنی بڑی اقلیت ہے۔ جسے یہ نام دینا بھی اس لفظ پر ظلم کرنا ہے کہ دراصل وہ تو اس کی "دوسری بڑی اکثریت" ہے جس کا اس ملک کی ہمہ گیر اور ہم آہنگ تہذیبی زندگی کی تشکیل کے لیے ــــــ اور "ایک منصفانہ، ترقی پذیر روشن خیال، باعزت، اور امن پسند معاشرہ کے استحکام" کے نا سطے بڑا رول ہے۔ اس رول کے لیے اسے اپنے کو داؤں پر لگا دینا ہے اس طرح کہ اقدار چاکری، بالآخر اسے خادم سے مخدوم بنا دے۔

اقدار کی چاکری کرنے والوں میں اختلاف تو ہوتا ہے لیکن یہ مخلص، نیکوکار، سماج کے خدمت باہمی اختلاف کا احترام کرتے ہوئے بھی کلمۃ سواء بیننا وبینکم پر اتفاق کر کے سماج کی تعمیر میں دوسرے کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ اختلاف جتنا بھی ہو، ہو، لیکن انسانیت اور شرافت کے جامے کے اندر علی گڑھ اور اس کی سربلندی اور نیک نامی اس کے ہر فرزند کے لیے اعلیٰ ترین قدر ہوگی جس محور کے گرد سارے اعمال گردش کریں گے؛ وہ عیار اور کسوٹی جس پر وہ اچھائی اور برائی کو کسے گا!

کوئی بھی نصب العین جس کے لیے جیا بھی جا سکے اور ضرورت پڑے تو مرا بھی جا سکے۔ سماجی خدمت کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی ایک بڑے کام کی درجہ رکھ سکتا ہے بشرطیکہ اس کا حق ادا کیا جائے، کہ کام نہ چھوٹا ہوتا ہے نہ بڑا، کام کو کرنے کا طریقہ یا سلیقہ اسے چھوٹا یا بڑا بناتا ہے۔ کام چھوٹا ہو یا بڑا اسے اس کے کام ہی جس نے ہمیں ان پر مامور کیا ہے؛ پھر تیغ کیا اور داریح کیا۔

اقدار کی چاکری آہستگی لیکن مضبوطی کے ساتھ اپنے چاکر کو اپنے سوا سب سے نا وابستہ کر دیتی ہے: شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق!

نا وابستگی علی گڑھ تحریک کا ایک امتیازی وصف ہے جس میں انگریزی اصطلاح مستعار لی جائے تو لبرل اور ماڈریٹ دونوں رول مل گئے ہیں۔ گہری مذہبیت ہوتے ہوئے بھی اس تحریک کی مذہبیت کٹر کے بجائے وہ سچی مذہبیت ہے جو خون میں بسی ہو، روح کو چھو لیتی ہے۔ ان کے نزدیک مذہب خدا اور بندہ کے درمیان سب سے پاکیزہ، سب سے محبوب رشتہ ہے۔ محبوب میں شرکت نہیں ہوا کرتی۔ وہ اسی رشتہ کو یہ تحریک سیاست کے ساتھ ملوث کرنا صحیح نہیں سمجھتی۔ صحیح اس کو سمجھتی ہے کہ آپ اپنے اپنے مذہب پر چلتے ہوئے ایک بہتر و برتر سماج کی، ہر روز روز گزشتہ سے حسین تر، تخلیق کرتے رہیں۔

اسی طرح کی ایک اور تحریر بھی اس مجموعہ میں شامل ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ:

"زر کسی معبود کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ مشرک ناصیہ لیکر اس کے حضور نہیں جا سکتے۔ زر جہاں ایک دروازہ سے داخل ہوا سادگی، معصومیت، پاکیزگی، خدا کا خوف، رسول کی محبت، انسان دوستی، دردمندی، اخوت، مساوات، غرض کہ ساری صالح قدریں دوسرے دروازے سے نکل گئیں ...

"زر سیال نے عرب کو ارب پتی بنا دیا، دنیا کے ترقی یافتہ ممالک عربوں کے دست نگر بن گئے، لیکن نتیجہ کیا نکلا ... عرب اپنی روحانی قوت لیکر اٹھے، دنیا پر چھا گئے، انسانیت کو سنوار گئے، مادی طاقت ہاتھوں میں آئی تو ایک چھوٹے سے ملک سے نبرد آزما اور عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ زر کے لیے تو خالی کرنا تھا، میراث کو ہاتھ سے گرا دیا۔"

(سامری پھر کوئی ...)

ہر قوم سے، ہر ملک سے، ہر شخص سے وہ سب کچھ سیکھنا چاہیے جو باعزت جینے کے بہتر مواقع فراہم کر سکے۔

جاپان کا ذکر ہو گیا تو محض تعارفاً یا تفنناً نہیں بلکہ اس لیے کہ آج دنیا میں پچھڑے ممالک کے لیے یورپ اور امریکا نہیں جاپان مشعلِ ہدایت ہوا ہے۔ ہندستان کے مسلمانوں کو جاپان کا طریقۂ کار اپنانا چاہیے تاکہ بیکاری سے نجات پا کر ہندستان کے مجموعی معاشرہ کو اونچا اٹھا سکیں۔ یہ ملک قرآن کے احکام پر بلا اعلان کیے عامل ہے۔ دوسری طرف عرب ممالک کے شیوخ ہیں جو اعلان کر کے بھی اس سے میلوں دور ہیں۔ کم از کم ہندستانی مسلمان اس سے کچھ سیکھیں۔ یہاں علی گڑھ تحریک کا یہ بنیادی پہلو پیش نظر ہے کہ علم جہاں بھی ملے حاصل کر لو کہ علم تو مومن کی کھوئی ہوئی پونجی ہے۔

بہترین راستہ بیچ بیچ، اعتدال کا، توازن کا راستہ ہوتا ہے، نہ اس سرے پر نہ اس سرے پر۔ کسی بھی مفید نظریہ یا انسان دوست تحریک کو گالی سے نہیں دلسوزی سے مفاہمت کی اسپرٹ کے ساتھ خوش آمدید کہنا چاہیے۔ سمجھنے سمجھانے کی فضا ہونی چاہیے۔

مارکسزم ہر طرح سرمایہ داری سے بازی لے گیا ہو، ایسا نہیں ہے، کچھ کھا چکے ہیں۔ تاہم مذہب

اور مارکسزم میں جو بیر پیدا کر دیا گیا ہے وہ غلط فہمی کی بنا پر ہے ـــــــ اور یہ کہ اگر کچھ برائیاں ہوں اور
اس کے ساتھ کچھ اچھائیاں بھی ہوں، تو کم سے کم ان اچھی باتوں سے اتفاق کر لیا جائے

"مارکسزم بہرحال انسانی دماغ کا نتیجہ ہے... اس کی اچھی باتوں سے اتفاق کرنا چاہیے اور غلطیوں کی
مخالفت... کسی زمانے میں مسلمانوں نے یونان کے فلسفے سے استفادہ کیا تھا؛ ہم نے مارکس سے کیوں نہ حاصل کیا تھا؟"
یہ اقتصادیات کے ایک ماہر علیگ کا بیان ہے اس لیے کچھ نہ کچھ غور کا تقاضا کرتا ہے۔

علی گڑھ تحریک نے خوردوں کی عزت کے ساتھ بزرگوں کا احترام سکھایا تھا کہ
ان کے تجربات کی روشنی اور ان کی شفقت سے گرمی حاصل کر کے ہم سماج میں زیادہ بہتر طور
پر حصہ لے سکتے ہیں ـــــــ اور انہیں نظرانداز کر کے نہ صرف اپنے بچوں کے
سامنے ایک غلط مثال قائم کر دیتے ہیں بلکہ اس بصیرت سے بھی محروم رہ جاتے
ہیں جو ایک عمر کا تجربہ ہمیں شفقت کے چند لمحوں میں مفت فراہم کر سکتا ہے۔

(سماج میں بزرگوں کی ضرورت)

کل عیسائیوں سے صلیبی جنگیں لڑتے گزری، پرسوں یہود پر لعنت بھیجئے؛ اور آج ہندو سے
نفرت کیجئے: بس اس لیے کہ وہ جو ہم سے نفرت کرتے رہے ہیں۔ نفرت صرف نفرت کو جنم
دے سکتی ہے۔ کیا دوسرا راستہ کبھی نہیں آزمایا جا سکتا۔ محبت نہ سہی دوستی
ہی سہی، دوستی بھی نہ سہی مفاہمت ہی سہی: وہ کون ہیں یہ بات اپنوں کو، اور ہم کون ہیں یہ
بات ان کو مشفقانہ، مخلصانہ اور ہمدردانہ انداز پر سمجھانا!

مسائل درپیش ہوں، اور چیخ چیخ کے اپنے عنوان بتاتے ہوں، تو ان سے
آنکھیں موند لینا سادہ لوحی بھی ہے، بزدلی بھی۔ علی گڑھ زندہ سوالوں کو حل
کرنے کے لیے ان سے آنکھیں چار کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

'بین مذہبی مناکحت' کے عنوان سے جو مسئلہ چھیڑا گیا ہے آج کے ملے جلے ہندستانی سماج میں یہ محض
ایک نظریاتی بحث نہیں، ایک زندہ سوال ہے۔ اکبر کے دور سے یہ سوال اٹھ چکا تھا جب راجپوتوں کے ساتھ
شادی بیاہ کا سلسلہ چھڑا تھا لیکن مدت تک علما نے اس سوال کو جواب دینے کے لیے درخور اعتنا نہیں سمجھا،
جیسے وہ جواب نہیں دیں گے تو سوال کا وجود ہی مٹ جائے گا۔ ڈیڑھ صدی بعد مظہر جانجاناں نے اس کا

اٹھارہ

جواب دیا کہ ہندو اہلِ کتاب ہیں۔ پھر ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ تا آنکہ اقبال نے "گائیتری" کا ترجمہ کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ "ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گردانا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا جب محمد بن قاسم نے انھیں اہلِ کتاب تسلیم کیا ہو، اورنگ زیب نے جزیہ لے کر انھیں اہلِ کتاب مانا ہو، مظہر جانجاناں نے ان کی کتابوں کو الہامی کتاب قرار دیا ہو، اور اب تک انھیں مشرک قرار دینے سے انکار کیا ہو تو ہم غور کیوں نہیں کر سکتے کہ ہندو شبہ اہلِ کتاب کے حکم میں داخل ہو سکتے ہیں۔

مسئلہ، اور اس کی صفائی اپنی جگہ پر، لیکن یہ امر بھی پوری صفائی کے ساتھ اظہار میں آنا ضروری ہے کہ آزادی کے بعد کی نصف صدی میں جو بڑا حصہ گزر گیا، اس کی روشنی میں اب چھوٹا حصہ گزرنا ہے، اور حقائق آنکھیں ملا کر گزارنا ہے۔ حقائق یہ ہیں کہ احیاء پسندوں نے سیکولر طاقتوں سے ہر محاذ پر شکست کھانے کے باوجود مسلمانوں کے خلاف فسادات کا جو ایک سلسلہ دراز کر رکھا ہے اور نفرت کی جو آگ بھڑکائی ہوئی ہے اس کی موجودگی میں اسلامیانِ ہند کا اپنے تشخص پر اصرار ناگزیر ہو جاتا ہے، اور اسی کے ساتھ پھر یہ بھی لازم آتا ہے کہ بین مذہبی مفاہمت، اہلِ کتاب اور شبہ اہلِ کتاب کے ساتھ درست ہونے کے باوجود بحالاتِ موجودہ مناسب یقیناً نہیں ہے کم سے کم اس صدی کے باقی ماندہ برسوں میں تو امید نہیں کہ حالات کوئی ایسی انقلابی کروٹ لے سکیں گے کہ احیاء پسند اپنا موقف چھوڑ کر انسانی زبان کو اپنا سکیں۔ اور جب تک فساد کا ماحول تبدیل نہیں ہوتا مسلمانوں کا احساسِ کمتری اتنی تیزی سے کم نہیں ہو سکتا جیسا کہ ہونا چاہیے، احساسِ کمتری کم بیشک ہو رہا ہے خاص کر بنگلہ دیش کی تشکیل کے بعد جو پاکستان کا المیہ بنا، حالانکہ واقعۃً وہ بھی سوچیں کہ ایسا نہیں؛ اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے نجات کی راہ کھول گیا؛ لیکن محبت کے راستے سے نہیں نفرت کا جواب نفرت سے دے کر: فسادیوں سے نبٹنے کیلیے زیادہ جو کسی ہو کر اینٹ کا جواب پتھر سے دیکر! اس ماحول کے ساتھ بین مذہبی مفاہمت کی کوئی بھی بات احساسِ زیاں کو بڑھا دیتی ہے سکتی ہے جس سے پوری قوم کا نقصان ہے! یہی صورت تیوہاروں کی ہے، جنھیں مل جل کے منانے کو جی چاہتا ہے، ہولی کی خوش رنگی اور دیوالی کی جھلمل روشنیوں میں نہا جانے کی کس کو خوشی نہیں ہوتی! بہن بھائی کے ہاتھ میں راکھی باندھتی تو کس بھائی کے دل میں محبت کا سمندر نہ ابلتا ———— لیکن ابھی کچھ نہیں ہو سکتا! کچھ نہیں ہو سکتا!! فسادیوں نے اور احیائیوں نے ہمارے ہاتھ قلم کر رکھے ہیں۔ ہولی کی خوش رنگ پچکاری کے اندر سے سیکولرزم کی الفت کا خون نکلتا ہے، دیوالی کے دیوں سے وہ آگ نکلتی ہے جو دکانوں اور مکانوں

کو بھسم کرتی جاتی ہے۔ راکھی باندھنے والی بہن کی دوسرے بھائی دن دہاڑے منہ بولے بھائیوں کے سامنے آبروریزی کر ڈالتے ہیں! نفرت کی اس آگ میں سب کچھ جل گیا ہے۔ معصوم کوششیں غضون ہیں۔ کوشش، مشترکہ تہوار سے پہلے اور بعض مذہبی مناقشت سے قبل۔ اس شرانگیز نفرت کے زہر کو دور کرنے کے لئے کرتے ہے جو ماؤں کے دودھ میں رل مل کر بچوں کی کتابوں میں گھل کر، سیاست کاروں کے اقوال و اعمال میں شامل ہو کے جسم و جان کا ایک اٹوٹ حصہ بنتی جاتی ہے، اور وطن عزیز کو پارہ پارہ کرنے کے درپے ہے۔

اختلاف اپنی جگہ، لیکن ______ ہمیں خوشی ہے کہ بین مناکحتی مسئلہ اور اس قسم کے دوسرے مسائل پر جو کچھ سوچا گیا ہے اسے اخلاص کے نتیجے میں پیدا ہونے والی جرأت مندی کے ساتھ سب کے سامنے پیش تو کر دیا گیا ہے (پچھلی صدی میں سر سید نے کچھ ایسی ہی صورت میں بھی اسی انداز پر سوچا تھا اور پوری ایمانداری کے ساتھ اپنی جرأت مندانہ فکر کو بالکل اسی بے لاگ انداز پر پیش کر دیا تھا) یہ جرأت مندانہ خلوص ہی علی گڑھ تحریک کا ایک امتیازی نشان رہا ہے۔ اور ہم اس کا تذکرہ یاد کے طور پر اس تحریر کو شامل کر رہے ہیں، اختلافی نوٹ کے ساتھ، کہ آنے کے جبر میں اس امر کے بارے میں علی گڑھ تحریک کا عملی زاویۂ نظر کیا ہوگا۔

تو مسائل کی طرف سے آنکھیں موند لینے سے مسائل حل نہیں ہو جاتے، آنکھیں موند لینے والوں کو خود حل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ علی گڑھ نے ذہن کی کھڑکیاں کھلی رکھنا سکھایا ہے۔ نتیجہ ہے پورا اطمینان حاصل کرتے ہوئے یہ تحریک لمحۂ موجود سے آنکھیں چار کرتی چلی ہے، اور اسی لیے یہ کبھی اپنے سچ حق کو لفظوں میں اسیر نہیں رکھ سکی ہے، مختلف نیا دور ہے اور نئی برق تجلی، نتیجہ میں مرحلہ شوق کبھی طے ہی نہیں ہو پاتا۔ یہ تو بہتے چشمے کو خود ستہ تبدیل کر کے نئی صورت حال سے نپٹنے کے لیے نئے توانا تر اصول وضع کرتی ہوئی اپنی توسیع کرتی چلی جاتی ہے، اس رسائیت سے جیسے توسیع کی ہر نئی جہت خود اس کے اندر ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔

علی گڑھ تحریک جو ہمیشہ اپنے زمانے کی سب سے بڑی ترقی پسند تحریک رہی ہے، ایک جاری تحریک ہے، اس زندہ احساس اور توانا شعور کے ساتھ کہ: حقیقت ابدی ہے مقام شبیری + بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی۔ ماضی کے پورے احترام کے ساتھ اس کی نظر ہمیشہ مستقبل پر رہی ہے۔

بلیہ:

قومی یکجہتی اس کے خمیر میں داخل رہی ہے لیکن یہ عزتِ نفس کے ساتھ کسی قیمت پر سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔ وطنِ عزیز کی سربلندی کے لیے اس نے ہمیشہ سر کی بازی لگائی ہے۔ اس لیے یہ صرف سر اٹھا کے اور آنکھ ملا کے بات کر سکتی ہے، آنکھ جھکا کے یا جھپکا کے بات کرنے کا سلیقہ اسے کبھی آیا ہی نہیں ——— اور یہ اس لیے کہ یہ: پنجسیلے کبھی کچھ نہیں مانگتی۔ یہ صرف فرائض کی بات کرتی ہے، تو کا لفظ بزدلی اور منافقت کے الفاظ کی مانند اس کی ڈکشنری میں سرے سے ہے ہی نہیں ——— یہ تو بس ایک حق مانگنا سیکھی ہے: خدمت کا حق!

کبیرا کھڑا بجار میں مانگے سب کی کھیر

اس تو نانکر کی جھلکیاں ان تحریروں میں بکھری مل جائیں اور اس جھلمل روشنی میں ملت، قوم، برصغیر اور بنی نوع کے حال کو بہتر سے بہتر مستقبل میں ڈھالنے کے چند ایک خواب بھی میسر آ جائیں، تو یہ دستاویزی پیشکش ناکام نہیں رہی!

——— عابد رضا بیدار

○

اس ترتیب میں دو تحریریں توجہ طلب ہیں اور توجہ طلب بھی:

اس پانچ چھ سال کے عرصے میں، اب جو علیگڑھ کا سب سے بڑا فرزند ہمارے درمیان بچا تھا دماللہ
پایا ہوا۔ ان کی یاد ضروری تھی کہ اپنے اکابروں کو دہرانا خود اپنی بازیافت کا وسیلہ ہے ان کی عظمت
محبت میں ڈوبے لائق باپ کے لائق بیٹے نے یہ کہانی ہمارے لیے تازہ کی ہے: نواب چھتاری کی
نواب زادہ ابن سعید خاں کی زبانی

گیانی ذیل سنگھ نے صدر جمہوریہ کی حیثیت سے علیگڑھ کی پہلی وزٹ کے موقع پر جو
تقریر کی اس کا بھی علیگڑھ سے ہمیشہ کے لیے ایک رشتہ جڑ گیا ہے۔ اس تقریر کو اس مجموعہ کا خوبصورت
پایہ سمجھا جا سکتا ہے۔

○

معذرت: یہ دو سال کی محنت و محبت کا حاصل ہے پھر بھی امید
اغلاط اتنے ہی ہوں گے جتنے اردو طباعت کی کسی بھی دوسری کتاب میں!
شخصیتوں کے ناموں میں بھی کسی کو عالی مقام کسی کا خالی نام، کچھ کے تعارف
میں ایک صفحہ کچھ کو ایک سطر بھی نہیں۔ تاہم اب زیادہ تاخیر کسی
طرح... لگ یہ معذرت ہی بہتر سمجھی جا رہی ہے۔

اس مجموعہ کی تشکیل سب جائی و قیمتی محفل میں شریک لکھنے والوں کے ہم شکر
ہیں۔ ان اداروں کا شکریہ بھی ہم پر واجب ہے جن کے رسالوں یا ٹیپ ریکا
سے یہ مواد اخذ کیا گیا ہے۔

یونیورسٹی گزٹ، خدابخش لائبریری ریکارڈ، اعظم گڑھ اور دوسری
کانفرنسوں کے ریکارڈ کے علاوہ مستقل بالذات کتابچوں سے خطبوں سے
تہذیب الاخلاق (جدید) سے سب سے زیادہ کہ یہ اس دور میں ادارہ
کا سب بڑا ترجمان رہا ہے ــــ جہاں جہاں بھی پچھلے پانچ برس
متعلقہ مواد ملتا گیا وہ ریزہ ریزہ جمع کیا جاتا رہا ـــــــ جن کا انت
پیش خدمت ہے۔

مشتملات میں ۱-۴، ۷-۱۰، ۱۱-۱۵-۱۷-۲۲، ۲۴، ۲۶، ۲۸ تہذ
الاخلاق (جدید) سے ۶، ۵ ندائے ملت سے ۱۰، ۲۵ کشمیر سیمنار ۱۹ اش
پریس ریلیز ۲۳ بوائے اسکاؤٹ میگزین ۲۵ جامعہ ۲۷ ہندوستان کدھر۔
۲۰، ۲۹ خدابخش لائبریری ریکارڈ سے لئے گئے اور ۳۱-۳۳ کتابچوں ـ
تہذیب الاخلاق سے، یونیورسٹی گزٹ اور رودادوں سے اخذ کئے گئے

ـــــ ادارہ

گیانی ذیل سنگھ

صدرِ جمہوریہ کی تقریر: علی گڑھ میں

پیارے بھائیو اور پیاری بہنو: آج مجھے اس کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے بڑی مسرت ہو رہی ہے۔ اس کانفرنس کے لئے جو موضوع آپ نے چُنا ہے اس کے لئے میں آپکو مبارکباد دیتا ہوں۔ جو مسلم اور دانش وَر اس میں شرکت کے لئے تشریف لائے ہیں، ان کا میں خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ کانفرنس مسلم یونیورسٹی میں ہو رہی ہے، اس بات کی اور بھی زیادہ اہمیت ہے۔ یہ یونیورسٹی ہمارے دیش کی تمام یونیورسٹیوں میں ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ سر سیّد احمد خاں نے یہ تعلیمی ادارہ قائم کر کے ایک بہت بڑی خدمت انجام دی۔ پھر ان کے جانشینوں نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ جنھوں نے یہاں تعلیم پائی، وہ زندگی کے ہر شعبے میں کامیاب ہوئے۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی اور تسلی ہوتی ہے۔

قرآن شریف پڑھ کر اس کانفرنس کا اُدگھاٹن کیا گیا ہے۔ قرآن شریف علم حاصل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جو لوگ تعلیم حاصل کرتے ہیں، خداوند کریم ان کی حفاظت کے لئے دو فرشتے مقرر فرما دیتا ہے۔ طالب علموں سے ہماری بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ یہ مستقبل کے معمار اور آنے والے بھارت کے معمار ہیں۔ طلبا کو سیاست داں گمراہ کرتے ہیں، ان کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ ضروری ہے کہ آپ طالب علم، دانش وروں سے رشتہ جوڑیں۔ سیاست دانوں کا تو یہ حال ہے کہ:

نہ پتہ ہے راستوں کا، نہ خبر ہے منزلوں کی
مگر اس پہ یہ گماں ہے کہ ہمیں رہنما تو ہم ہیں

یہ یونیورسٹی مسلمانوں نے قائم کی تھی۔ اب اس کا اقلیتی کردار بھی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہاں مسلمان ہی پڑھیں گے۔ اس کے بانی نے اس کے دروازے ہر ایک پر کھلے رکھے تھے۔ مسلمان، خدا کو رب العلمین مانتے ہیں۔ حضرت محمدؐ ساری دنیا کے لئے محبت و رحمت بن کر آئے تھے، تو ہمارے دلوں میں بھی ایک دوسرے کے لئے محبت ہونی چاہیئے۔ طالب علموں کو چاہیئے کہ سیاست دانوں سے دامن چھڑائیں اور اپنے استادوں کا دامن تھامیں، ان کا ادب و احترام کریں۔ اُستاد ان سے پیار کریں، انھیں اپنی اولاد جانیں۔ ہمارے بچے بہت غلطیاں کرتے ہیں، شرارتیں کرتے ہیں، مگر ہم انھیں گھر سے نکال نہیں دیتے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ لڑکے اس سے غلط فائدہ اٹھانے لگیں۔

اس یونیورسٹی میں اردو کی طرف خاص دھیان دیا جاتا ہے۔ یہ عمدہ بات ہے۔ اردو سب کے دلوں میں بسی ہوئی

ہے۔ جبھی تو یہ ہوا کہ راکیش شرما سے ہماری وزیر اعظم نے پوچھا کہ اتنی اونچائی سے ہندوستان کیسا لگتا ہے، تو اس کے منہ
فوراً نکلا " سارے جہاں سے اچھا"۔ اردو اور ہندی کی بات یہ ہے کہ اردو کو ہندی لپی میں اور ہندی کو اردو خط میں
جا سکتا ہے، اگر دلوں میں پیار تو ہو :

بجھ رہے ہیں چراغ دیر و حرم
دل جلاؤ کہ روشنی کم ہے

آخری بات یہ کہ خدا نے تو ہمیں انسان بنا کر بھیجا ہے، ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی نہیں بنایا، وہ ہم خود بنے۔ ہمیں
انسان رہنا چاہیے" :

تم کو خدا کہوں کہ خدا کو خدا کہوں
دونوں کی سمت ایک ہے، کس کو جدا کہوں

●

اس پرچہ میں صرف مضامینِ مفیدہ جو مسلمانوں سے متعلق ہیں چھاپے ہوتے ہیں۔ اور اس سبب سے اخبار امصار و دیار اس میں مندرج نہیں ہوتے۔ مقصود اس پرچہ کے اجرا سے یہ ہے کہ مسلمانوں کی حسنِ معاشرت اور تہذیب کی ترقی ہو اور جو غلط اوہام مذہبی اس ترقی کے مانع ہیں اور درحقیقت وہ مذہب اسلام کے برخلاف ہیں وہ بھی مٹائے جاویں۔

(سر سید) از تہذیب الاخلاق ۱۸۷۰ء

تمہید

("تہذیب الاخلاق" مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء مطابق ۱۲۸۷ھ)

اس پرچہ کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے، تاکہ جس حقارت سے سویلزڈ یعنی مہذب قومیں اُن کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلاویں۔

سویلیزیشن انگریزی لفظ ہے، جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے۔ مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں اس سے مراد ہیں انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت تمدن اور طریقۂ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکین اور وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔

یہ بات نہایت سچ ہے کہ کسی قوم کے مہذب ہونے میں اس قوم کے مذہب کو بھی بڑا دخل ہے۔ بیشک بعضے مذہب ایسے ہیں کہ وہ تہذیب قوم کے بڑے مانع ہیں، پس اب دیکھنا چاہیئے کہ کیا اسلامی مذہب بھی ایسا ہی ہے۔

اِس باب میں مختلف رائیں ہیں۔ ایک عیسائی متعصب مؤرخ نے ٹرکی یعنی روم کی سیر کے بعد اپنے سفرنامہ
یں لکھا ہے کہ ترک جب تک مذہب اسلام کو نہ چھوڑیں گے، مہذب نہ ہوں گے۔ کیونکہ مذہب اسلام انسان کی تہذیب
کا مانع قوی ہے۔

سلطان عبدالعزیز خاں سلطان روم کو جو بالفعل بادشاہ ہے، اسباب کی تحقیقات منظور ہوئی
ذ درحقیقت مذہب اسلام مانع تہذیب ہے یا نہیں؟ اور چند علما اور عقلا اور وزرا کی کونسل اس امر کی
سنبت رائے لکھنے کو مقرر کی جس کا افسر فواد پاشا تھا۔ اس کونسل نے جو رپورٹ لکھی اس کے دو فقروں کا ترجمہ
اس مقام پر لکھا جاتا ہے:

"اسلام میں وہ سچی باتیں ہیں جو کہ دنیا کی ترقی کو حاصل کرنے والی اور انسانیت اور تہذیب اور
رحمدلی کو کمال درجہ پر پہنچانے والی ہیں۔ گر ہم کو اپنی بہت سی رسوم و عادات کو جو اگلے زمانے میں مفید
تھیں مگر حال کے زمانے میں نہایت مضر ہوگئی ہیں چھوڑنا چاہیئے۔"

اب دونوں رایوں میں سے کسی ایک رائے کا سچ کر کر دکھا دنیا مسلمانوں کے اختیار میں ہے اگر
ہ اپنے عملی کاموں سے عقل اور دنیا کی مہذب قوموں کے اپنے تئیں بھی مہذب کر دکھاویں گے، تو فواد پاشا کی
ائے کی تصدیق کریں گے، ورنہ از خود اس پہلی رائے کی تصدیق ہوگی۔

ایک اور انگریزی مؤرخ ہندوستان کے مسلمانوں کی موجودہ حالت کی نسبت یہ لکھتا ہے کہ "ہندوستان
کے مسلمان ذلیل ترین امت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہیں اور قرآن کے مسئلوں اور ہندوستان کی بُت پرستی
ے مل ملا کر ان کا مذہب ایک عجیب مجموعہ ہو گیا ہے۔"

ہماری سمجھ میں فواد پاشا کی رائے اور اس پچھلے انگریزی مورخ کا بیان بالکل درست ہے۔ ہم
مسلمانوں میں بہت سے پُرانے فقہ، یہودیوں کے اور بہت سی باتیں اور خیالات اور اعتقادات رومن کیتھولک
کے جو ایک قدیم عیسائی فرقہ ہے اور جو مدت سے عرب میں بھی موجود تھا، اور بے انتہا رسمیں اور عادتیں ہندوؤں
کی مل گئی ہیں اور مزید برآں بہت سی باتیں خود ہماری طبیعتوں یا ہماری غلط فہمیوں نے پیدا کی ہیں جو درحقیقت
مذہب اسلام میں نہیں ہیں اور اسی سبب سے مسلمانوں کی عجیب حالت ہوگئی ہے۔ اور یہی باعث ہے کہ غیر قومیں ہماری
حالت مجموعی پر خیال کر کے اس مجموعہ کو مذہب اسلام قرار دیتی ہیں اور اس کی نسبت نہایت حقارت کی
رائے رکھتی ہیں۔ جیسا کہ انگریزی مؤرخ نے مفصلہ ذیل رائے لکھی ہے: — "عیسائیت اس بڑی سے بڑی

خوشی کے جو قادر مطلق نے انسان کو دی ہے صرف موافق اور مطابق ہی نہیں ہے، بلکہ اس کو ترقی دینے والا ہے، اور برخلاف اس کے اسلام اس کو خراب کرنیوالا اور ذلت میں ڈالنے والا ہے۔

پس اب کیا یہ غیرت کی بات نہیں ہے کہ ہم غیر قوموں سے ایسی حقارت کے الفاظ اپنی نسبت اور اپنے روش اور سچے مذہب کی نسبت سنیں اور اپنی تہذیب اور تربیت اور شائستگی کی طرف متوجہ نہ ہوں۔

یہ جب ہی ہو سکتا ہے جب کہ ہم فوادپاخشا کی رائے کو جو بڑے بڑے عقلا اور علما کے اتفاق سے لکھی گئی ہے اختیار کریں اور بخوبی ہوشیار ہو کر نیک دلی اور غور سے اپنی حالت پر خیال کریں اور جو رسوم و عادات اب ہم میں موجود ہیں اور جو مانع تہذیب ہیں ان کو دیکھیں کہ وہ کہاں سے آئیں اور کیونکر ہم میں مل گئیں اور یا کیونکر خود ہم میں پیدا ہو گئیں اور اُن میں سے جو جو ناقص اور خراب اور مانع تہذیب ہوں اُن کو ترک کریں اور جو قابل اصلاح ہوں ان کی اصلاح کریں اور ہر ایک بات کو اپنے مذہبی مسائل کے ساتھ مقابلہ کرتے جاویں کہ وہ ترک یا اصلاح موافق احکام شریعت بیضا کے ہے یا نہیں۔ تاکہ ہم اور ہمارا مذہب دونوں غیر قوموں کی حقارت اور ان کی نظروں کی ذلت سے بچیں کہ اس سے زیادہ ثواب کا کوئی کام اس زمانہ میں نہیں ہے۔

یہی ہمارا مطلب اپنے ہندوستان کے مسلمان بھائیوں سے ہے اور اسی مقصد کے لئے یہ پرچہ جاری کرتے ہیں تاکہ بذریعہ اس پرچہ کے جہاں تک ہم سے ہو سکے ان کے دین دنیا کی بھلائی میں کوشش کریں اور جو نقصان ہم میں ہیں گو ہم کو نہ دکھائی دیتے ہوں مگر غیر قومیں اُن کو بخوبی دیکھتی ہیں۔ ان سے ان کو مطلع کریں اور جو عمدہ باتیں اُن میں ہیں ان میں ترقی کرنے کی اُن کو رغبت دلاویں۔ واللہ ولی التوفیق۔

السعی منی والاتمام من اللہ اللھم آمین ثم آمین

راقم سید احمد

"آہ! اس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شیخی و افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام قوم اور انسان کی بھلائی کے لیے نیک نیتی سے کیے جائیں، ان کو بے عزتی کے کام سمجھیں۔ آہ اس قوم پر جو لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے مکر و پندار کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدس کے برقع کو اپنے منھ پر ڈالے ہوئے ہوں۔ مگر اپنی بدصورتی اور دل کی بُرائی کا کچھ علاج نہ سوچیں۔ آہ اس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے۔ اپنے گھر میں کھلے خزانے ایسے بے شرمی اور بےحیائی سے کام کرے جن سے بے شرمی اور بےحیائی بھی شرما جائے، لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم اور نفرت کا کام سمجھے۔" (سرسیّد)

(علی گڑھ نمائش میں تقریر)

"جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، جب کبھی کھیل کود، عیش و آرام کے جلسے دیکھے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا تو مجھے ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں۔ جہاں تک ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا، سب سے اوّل یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لئے قوم ہی کے ہاتھ ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے۔" (سرسیّد)

"مسلمانوں میں ہر قسم کی تعلیمی تنزل کا لحاظ کر کے اور اس خیال سے کہ ان کی ہر قسم کی تعلیم کی ترقی میں قومی اتفاق اور قومی امداد سے کوشش کی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر سال ان اُمور پر غور کرنے کے لیے مختلف اضلاع کے لوگوں کا ایک جلسہ ہوا کرے جو "محمڈن ایجوکیشنل کانگریس" کے نام سے موسوم ہو۔ یہ جلسہ کسی خاص مقام پر مخصوص نہ ہوگا۔ بلکہ ہر سال کسی ایسے مقام میں جہاں کے لوگ اس جلسہ کے منعقد ہونے کی خواہش کریں گے اور اس کا انتظام فرمادیں، منعقد ہوا کرے گا۔"

"جس جس ضلع میں لوکل اسٹینڈنگ کمیٹیاں قائم ہوتی جائیں، ان سے درخواست کی جائے کہ اپنے ضلع سے دس روپیہ ماہوار کا چندہ جس طرح ہو سکے ایک مسلمان طالب علم کی اسکالرشپ کے لیے جو کسی کالج کے کلاسوں میں پڑھتا ہو یا پڑھنا چاہے اور ذہین اور لائق اور قابلِ امداد ہو وصول کریں اور جس کالج میں وہ پڑھنا چاہے پڑھے اور لوکل اسٹینڈنگ کمیٹی اس بات پر غور کرتی رہے کہ وہ بہ محنت اور بہ کامیابی اپنی تعلیم میں مصروف ہے یا نہیں۔"

سرسید

○

"یاد رکھو کہ میں یہ پیشین گوئی کرتا ہوں کہ اگر اور چند روز تم اسی
طرح غافل رہے، تو ایک زمانہ ایسا آوے گا کہ تم چاہو گے
کہ اپنے بچوں کو تعلیم دو، ان کی تربیت کرو، مگر تم سے
کچھ نہ ہو سکے گا۔ مجھ کو کچھ کہو کافر، ملحد، نیچری، میں تم سے
خدا کے سامنے کچھ سفارش نہیں چاہتا۔ میں تم سے اپنی
شفاعت کے واسطے خواستگار نہ ہوں گا، میں جو کچھ کہتا
ہوں تمہارے بچوں کی بہتری کے لئے کہتا ہوں۔ تم انھیں
پر رحم کرو اور ایسا کچھ کرو کہ آئندہ کو پچھتانا نہ پڑے ...."

سرسیّد (لکچروں کا مجموعہ ص۱۵۹)

○

"سب (ترقی) کی جڑ یہی ہے کہ سب سے پہلے علم کے خزانوں کو
اپنے قابو میں کر لو۔"

سرسیّد (لکچروں کا مجموعہ ص۲۸)

" ایک اخبار خاص مسلمانوں کے فائدے کے لئے جاری کرنا میں نے تجویز کرلیا ہے ا
"تہذیب الاخلاق" اس کا نام فارسی اور انگریزی میں محمڈن سوشل ریفارمر رکھ لیا ہے۔ اس
سرنامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوا لیا ہے۔ کاغذ بھی ایک برس کے لائق یہاں خرید لیا ہے ا
یہ سب چیزیں یہاں سے بذریعہ جہاز بادبانی روانہ کردیں کہ میرے وہاں پہنچنے تک پہنچ جاویں
خرچ ماہواری اجرا سے اس اخبار کا سو روپیہ ہوگا۔ ہم بیس دوست پانچ پانچ روپیہ مہینہ کرکر
دیں گے اور اخبار مفت میں بانٹیں گے اور بقیت بھی بیچیں گے۔ اس اخبار میں بجز اس کے کر خا
مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی بھلائی کے آرٹیکل ہوں گے اور کچھ نہیں ہونے کا۔ اگر صلاح ہو گ
منشی ذکاء اللہ صاحب کو اور منشی نجم الدین صاحب ڈپٹی انسپکٹر کو بھی آرٹیکل لکھنے میں شر
کریں گے۔"

مکتوب سرسید
بنام سید مہدی علی (نواب محسن الملک)
(۲۷ مئی ۱۸۷۰ء۔ مکتوبات سرسید۔ مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی مطبوعہ لاہور)

میں روز و شب تحریر کتاب سیرِ مصطفوی صلعم میں معروف ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے۔ لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے۔ اِدھر فکرِ ترتیبِ مضامینِ کتاب، اُدھر فکرِ جوابِ اعتراضات۔ ادھر فکرِ تحقیق و تنقیحِ روایاتِ صحیح میں مبتلا رہتا ہوں اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے۔ اِدھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ الٰہی لکھا اور چھپوانا تو شروع کر دیا، روپیہ کہاں سے آوے گا۔ مسلمان البتہ آستین چڑھا کر اس باب میں تو لڑنے کو تیار ہوں گے کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا مت کھاؤ مگر جب کہو کہ مذہبی تائید میں کچھ روپے خرچ کرو تو جان بچائیں گے۔

دوسرا باب جس میں عرب کا جغرافیہ اور وہاں کی قوموں کا اور حضرت اسمٰعیلؑ کے وہاں آکر آباد ہونے کا ذکر ہے، چھپ رہا ہے۔ عرب میں ایک کتبہ نکلا ہے، جو یہاں کے برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ وہ کتبہ آنحضرتؐ سے بہت پہلے کا ہے اور اس سے حضرت ہودؑ کا عرب میں پیغمبر ہونا اور قوم عاد کے مکانات کا وجود بخوبی ثابت ہوتا ہے؛ چنانچہ وہ کتبہ بعینہٖ اسی خط میں مع ترجمہ میری کتاب میں مندرج ہوگا ———— میری دانست میں نہایت خیر خواہی اسلام کی اور سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ کتاب انگریزی زبان میں چھاپی جائے۔ اس لئے انگریزی چھاپنا شروع کر دیا اور اُردو ابھی ملتوی ہے۔ علاوہ اس کے انگریزی عبارت لکھنے والا عمدہ اور کم قیمت یہاں، بہ نسبت ہندوستان کے کم قیمت پر ملے ہیں؛ ہندوستان میں ممکن نہ تھا۔ جو شخص کہ میری کتاب انگریزی میں لکھتا ہے اس کی لیاقت کا کوئی نہیں ہے۔ پس ایسا شخص ہندوستان میں کہاں ملتا؟ اگر میری یہ کتاب تیار ہو گئی جس میں دس باب ہیں، تو میں لندن میں آنا دس لاکھ کے برابر اور باعث اپنی نجات کا سمجھوں گا۔ خدا قبول کرے۔ آمین۔

(خط بنام محسن الملک، از لندن)

●●

"انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں ہے، جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو۔ ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انھیں تاریخوں کو پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے۔ اور جو بات کہ از راہ ناانصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں۔ اس لیے ایسی قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا، جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو، نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے . . ."

(لندن سے محسن الملک کے نام ایک خط میں)

"اگرچہ بعض وجوہات سے مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے مذہب میں نہایت پختہ، یا متعصب ہیں؛ مگر متعصب ہونے کا خیال میرے دل میں مطلق نہیں ہوا کیونکہ میں ان کو نہایت مہذب اور با اخلاق آدمی خیال کرتا ہوں۔ ہر ایک کے اپنے مذہب میں پختہ ہونے کو نہایت عمدہ جانتا ہوں۔ مگر تعصب کو نہایت برا اور ایک بڑا نقص اخلاق انسانی میں بلکہ یعنی حکومت الٰہی کے برخلاف سمجھتا ہوں۔ تو ایسے اچھے آدمی میں جیسے کہ میجر ڈاڈ صاحب ہیں، میں ایسا نقص کیونکر خیال کرسکتا تھا۔ مگر ایک دن اتفاقیہ یہ ذکر آیا کہ فلاں شخص باوصف بڑی لیاقت کے ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن اس لیے نہیں ہوا وہ شاید لامذہب ہے اور کسی مذہب کے سچے ہونے کا یقین نہیں رکھتا۔ میں نے کہا کہ "میری رائے میں ضرور ہے کہ ہندوستان میں ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ایسے ہی ہوں جو لامذہب ہوں" ــــ کہنے لگے کیوں؟ میں نے کہا:

"جب ہندوستان میں مختلف قوم اور مختلف مذہب کے لوگ بستے ہوں، تو مذہبی آدمی کا افسر تعلیم ہونا اکثر دفعہ بے تعصب عام تعلیم کا مانع ہو جاتا ہے"

یہ بات سن کر متعجب سے ہو کر خاموش ہو رہے۔ درحقیقت میری رائے یہ ہے کہ جیسا خدا بے تعصب مشرک، بت پرست، خدا پرست، سب کو برابر پرورش کرتا ہے، اسی طرح گورنمنٹ اور افسر تعلیم کو بے تعصب ہونا چاہیے۔ گورنمنٹ ظل اللہ اور افسر تعلیم معلم صفت موصفات اللہ ہو سکتا ہے۔

(انتخاب از مسافران لندن)

[یوپی کے لفٹنٹ گورنر، سر ولیم میور نے یورپین مصنفین اور عیسائی پادریوں کی تقلید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات اور حضور علیہ السلام کے کارناموں پر ایک تنقیدی کتاب "لائف آف محمد" کے نام سے چار جلدوں میں، جس میں جگہ جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاک اور بے عیب زندگی پر ناواجب اور نامناسب الفاظ میں اعتراضات کیے جنھیں دیکھ کر سر سید کی دینی غیرت اور مذہبی حمیت سخت جوش میں آئی اور انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اس کتاب کا مکمل، مدلل اور تشفی بخش جواب دیا جائے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس کا جواب دینے کے لئے جن مستند کتابوں کی ضرورت تھی وہ ہندوستان میں ناپید تھیں اور صرف یورپ میں دستیاب ہو سکتی تھیں۔ یا انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں میں محفوظ تھیں۔ اس لئے ضروری ہوا کہ کتاب کا حوالہ لکھنے کے لئے انگلینڈ کا سفر کیا جائے اور وہاں بیٹھ کر ان کتابوں سے فائدہ حاصل کرنے کے بعد سر ولیم میور کی کتاب کا جواب تیار کیا جائے۔

سفر کی تقریب کس طرح پیدا ہوئی ؟ اس سفر کی تقریب اس طرح پیدا ہوئی کہ اتفاق سے ان ایام میں انگریزی حکومت نے ہندوستان کے ہونہار اور ہوشیار طلبا کو انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے چھ چھ ہزار کے ۹ وظیفے دینے منظور کیے۔ اس کے علاوہ ہر طالب علم کے لئے تین ہزار روپے اخراجات آمدورفت بھی منظور کیے۔ چنانچہ ہر صوبے کی گورنمنٹ نے اپنے ہاں کے لائق طلبا کو اس سرکاری عطیہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے انتخاب کیا۔ اس سلسلہ میں یوپی گورنمنٹ نے سر سید کے فرزند سید محمود کو اس وظیفے کے لئے موزوں سمجھا اور ان کو اس کی اطلاع دے دی۔

اس خلاف توقع امداد سے سر سید کے ارادے کو زبردست تقویت پہنچی اور یہی سرکاری عطیہ اس بات کا باعث بن گیا کہ وہ سید محمود کے ساتھ خود بھی عازم ولایت ہوں اور لندن پہنچ کر اپنی پرانی آرزو پوری کریں۔

مگر دقت یہ تھی کہ یہ روپیہ جو گورنمنٹ نے دیا تھا، خود سید محمود کی تعلیم کے لئے بھی کافی نہ تھا۔ سر سید کی بندی کس طرح پڑتی ؟ اس مشکل کا حل انھوں نے یہ سوچا کہ سخت ایثار سے کام لیتے ہوئے اپنے نایاب اور قیمتی کتبخانے کو کوڑیوں کے مول بیچ ڈالا، اپنے آبائی اور جدی مکان کو رہن رکھ دیا، اپنی تنخواہ وصول کی اور سب کچھ لے کر سفر پہ روانہ ہو گئے ———— (وہاں سے جو خط لکھے، دردِ دل کے کچھ ٹکڑے صفحہ ۹-۱۰ پر نقل کیے گئے)]

"محبت کے بے شمار درجے ہیں۔ ان میں سب سے اعلیٰ اور افضل درجہ یہ ہے کہ تمام موجوداتِ عالم کو ہم حقیقت کی آنکھ سے دیکھیں۔ یعنی اگر ہمیں نظر آئے کہ ایک گھانس کے تنکے کو ناحق توڑا گیا ہے تو ہمارے دل میں ایسا درد پیدا ہو کہ گویا ہمارے ہاتھ اور پاؤں کے ناخنوں میں سے ایک ناخن کاٹ ڈالا گیا ہے۔ مگر محبت کا یہ درجہ اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ خداوندِ عالم اپنی رحمت کا دروازہ کسی پر نہ کھولے۔"

سرسید

(۱۶ اکتوبر ۱۸۶۳ء بمقام کلکتہ)

"ایک مدت دراز سے ہماری قوم کی ترقی مثل ایک ایسی بند جھیل کے ہو گئی تھی جس کا نہ کوئی پانی بہتا ہوا نہ اس میں کوئی حرکت ہو اور نہ اس میں کسی اور طرف سے پانی آتا ہو تند ہوا کے جھونکوں اور آفتاب کی گرمی سے اس کا پانی روز بروز خشک ہو جاتا ہو۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ چند سال سے اس بند پانی میں کچھ حرکت آئی ہے۔ تمام ممالک کیا بنگالہ، کیا ہندوستان، کیا پنجاب، کیا دکن، سب کی زبان پر، سب کے قلم پر، یہ بات جاری ہے کہ مسلمانوں کی حالت خراب ہے۔ وہ روز بروز تنزل کرتے جاتے ہیں۔ ان کو کچھ کرنا چاہیئے۔ وہ لوگ صرف کہنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ کچھ کچھ کرتے بھی جاتے ہیں۔ جا بجا انجمنیں قائم ہوتی ہیں۔ اخباروں میں آرٹیکل پر آرٹیکل لکھے جاتے ہیں۔ مدرسہ اور اسکول بنتے ہیں۔ یہ نہایت عمدہ نشانیاں ہیں جس قوم کو یہ خیال ہوا کہ ہم تنزل کی حالت میں ہیں اور اس کے ساتھ ان میں کچھ تحریک بھی پیدا ہوئی تو پہلی سیڑھی ترقی کی ہے ایسی حالت میں یہ لمحہ بھی لازمی ہے کہ ترقی کرنے والوں کے خیالات مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی کچھ کرنے لگتا ہے، کوئی کچھ۔ اپنی قوتوں کو بغرض اس کے کہ ایک جگہ جمع کر دیں، پریشان کرتے ہیں۔ جو کام اصلی ہے، اس کو چھوڑ دیتے ہیں اور جو اس کی طرح ہے اس کو اختیار کرتے ہیں جس کے سبب سے کبھی کامیابی نہیں ہوتی۔ اس زمانہ میں یہی حال ہماری قوم کا ہے۔

مگر پانی کا خاصہ ہے کہ جب وہ بہتا ہے تو چاروں طرف پھیلتا ہے، پھر رفتہ رفتہ جو ٹھیک راستہ اس کا اختیار کر لیتا ہے۔ اس لئے ہم کو اپنی قوم سے امید ہے کہ رفتہ رفتہ وہ بھی ٹھیک راستہ قومی ترقی کا پائے گی اور تمام مختلف خیالات ایک اصلی مرکز کی طرف جمع ہوں گے۔"

(لیکچر بمقام لدھیانہ ۲۳ جنوری ۱۸۸۴ء)

○

"بایں ہمہ مجھ کو یقین ہے کہ میری زندگی میں عام مسلمانوں کی گالیوں اور نفرت سے مجھ کو نجات نہ ملے گی۔ عیسائی بھی میری تفسیر سے خوش نہیں ہو سکتے، کیونکہ جس طرح میں انجیل کی تعلیم صحیح اور درست سمجھتا ہوں اسی طرح تثلیث کے مسئلہ کا قائل نہیں ہوں، اس لئے کہ میں انجیل میں اس مسئلہ کی تائید یا وجود پاتا ہوں۔ مجھ کو یقین ہے کہ مذہب اسلام صحیح ہے اور اس کی صحت اور وجوہ دونوں انجیل سے ثابت ہیں۔ اس لئے مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ میں کسی گروہ کے لوگوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی خوش کروں۔ میں حق پر ہوں اور اس خدا کو خوش کرنا چاہتا ہوں جس کے روبرو سب کو ایک دن جانا ہے۔"

○

"اے حضرات! گو میں نے اس وقت قوم ہی کا گیت گایا ہے، مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت اور برادرانہ محبت نہیں ہے۔ ہماری قوم خراب حالت میں ہے اس لئے اس کا گیت گایا جاتا ہے، ورنہ اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسے اپنے عزیزوں سے۔"

●

○

"غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا، نہ مال و اسباب کے تلف کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا!. . . . جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے. . . . یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں، اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑی ہے اس کو دور کرنے میں ہمت باندھنی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔ میرے غمخوار مجھ کو اس کے مانع آئے تھے اور میرا دل اُن سے کہتا تھا:

حریفِ کاوشِ مژگاں خوں ریزم نئی ناصح
بدست آور رگِ جانی و نشتر را تماشا کن"

○

"میں تم سے سچی بات کہتا ہوں کہ قومی تعلیم اور قومی عزت ہم کو اُس وقت تک حاصل نہیں ہونے کی، جب تک ہم اپنی تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے۔ گورنمنٹ کی قدرت سے خارج ہے کہ وہ ہمارے تمام مقاصد کی تکمیل کر سکے۔"

○

"جو شخص سچے دل سے اور نیک نیتی سے کسی کام کو کرتا ہے اس کو بُرا کہنے والوں سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اس کو خدا سے غرض ہوتی ہے۔ اور جب خدا سے غرض ہے تو لوگوں کے بُرا کہنے سے اس کے دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا بلکہ اُن لوگوں کے ساتھ اس کی محبت بڑھتی جاتی ہے اور وہ زیادہ کوشش کرنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ان لوگوں کو فائدہ پہنچانے اور سمجھانے کے لئے زیادہ کوشش درکار ہے۔ اور جوں جوں مخالفت بڑھتی جاتی ہے، اس کی کوشش بھلائی کے واسطے ترقی کرتی جاتی ہے۔"

○

"میں مسلمانوں کا اس قدر مشکور نہیں ہوں جس قدر ہندوؤں کا ہوں جنھوں نے بطور خیرات کے اپنے بھائیوں کی مدد کی۔ مدرسہ کی عمارات کی دیواروں اور محرابوں پر بہت سے ہندوؤں کے نام کندہ ہیں جس سے ہمیشہ کو یہ یادگار قائم رہے گی کہ ہندوؤں نے اپنے درماندہ مسلمان بھائیوں کی کس فیاضی سے مدد کی تھی۔"

○

"مسلمانوں کی رائے اور اُن کے خیالات، ہر ایک میں تقلید کرتے کرتے اور رسومات کے پابند رہتے رہتے ایسے پست اور پامال ہو گئے ہیں، جن کے سبب کسی قسم کی ترقی کی تحریک ان میں نہیں ہوتی۔ جب تک کہ رائے کی آزادی ان میں پیدا نہ ہوگی، اُس وقت تک اُن میں تہذیب نہ آئے گی۔"

○

"... دوست ہمیشہ اپنے دوست کی نیکیوں کو بڑھاتا ہے اور دشمن عیبوں کو، اس لیے ہم کو اپنے دشمن کا زیادہ احسان مند ہونا چاہیے کہ وہ ہم کو ہمارے عیبوں سے مطلع کرتا ہے۔ اگر ہم نے اس کے طعنوں کے سبب اُن عیبوں کو چھوڑ دیا تو دشمن سے ہم کو وہی نتیجہ ملا جو ایک شفیق اُستاد سے ملنا چاہیے تھا۔"

●●

مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ

افسوس ہے کہ جناب ممدوح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا۔ زمانہ بہتوں کو رو چکا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا۔ لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آوے نہایت رنج و غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دلی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم و فضل اور تقویٰ اور ورع میں معروف و مشہور تھے ویسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بے مثل تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی اسحاق صاحب کے کوئی شخص ان کا مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے۔ مولوی محمد قاسم مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دین داری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کی مثل ایک اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ ہے۔

ابھی بہت سے لوگ زندہ ہیں جنھوں نے مولوی محمد قاسم کو نہایت کم عمری میں دلی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے۔ انھوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب سے تمام کتابیں پڑھی تھیں۔ ابتدا ہی سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے ان کے اوضاع و اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا:

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

زمانۂ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے۔ ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا اور حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت نے ان کو ایک عالی رتبہ کا ولی بنا دیا تھا۔ خود بھی پابند شریعت تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی پابند شریعت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ باایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا ان کو خیال تھا۔ ان

ہی کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا اور ایک نہایت عمد
مسجد بنائی گئی۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے اسلامی مدرسے قائم ہو
وہ کچھ خواہش پیر و مرشد بننے کی نہیں کرتے تھے۔ لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب
ہزار ہا آدمی ان کے معتقد تھے اور ان کو اپنا پیشوا و مقتدا جانتے تھے۔

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے۔ مگر جہاں تک
ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو، خواہ کسی سے خوشی کا ہو، ک
طرح ہوائے نفس یا ضد یا عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کہ تھے بلاش
للہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے، اس کی پیروی کرتے تھے۔
کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے واسطے تھا۔ کسی شخص کو مولوی محمد قاسم صاحب اپنے ذاتی تعلقات کے سب
اچھا یا برا نہیں جانتے تھے بلکہ حب للہ اور بغض للہ ظاہر ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں ف
کی سی خصلتیں تھیں۔ ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے۔ اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے
زندگی بسر کی ہو، بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔

اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے۔ ان کا پایہ
زمانہ میں شاید معلوماتی علم میں شاہ عبدالعزیزؒ کے کچھ کم ہو۔ الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی و ن
اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی اسحاق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا۔ وہ درحقیقت فرشتہ سیر
اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے اور ایسے آدمی کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لئے جو ان ک
زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے زبانی عقیدت اور ارادت بہ
زیادہ ظاہر کرتی ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چن
حسرت اور افسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں، یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صا
کر لیں، بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگار کو قائم رکھیں۔

دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگار ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مد
ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعہ سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جما رہے۔

ابوالکلام آزاد

دہلی کی مسجدِ شاہجہانی میں آزادی کے فوراً بعد پہلی تقریر: ۹۴۷

عزیزانِ گرامی!

آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی زنجیر ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لئے شاہجہاں کی اس یا
مسجد میں یہ اجتماع نیا نہیں ہے۔ میں نے اس زمانے میں بھی کہ اس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی
ہیں، تمہیں یہیں سے خطاب کیا تھا جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کے بجائے اطمینان اور تمہارے دلوں میں شـ
کی بجائے اعتماد تھا۔ آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں، تو مجھے بے اختیار پچھلے چ
سالوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔

تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں یہیں سے پکارا، اور تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم
میرے ہاتھ قلم کر دئے، میں نے چلنا چاہا، تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے، میں نے کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری
توڑ دی، حتیٰ کہ پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست، جو تمہیں داغِ جدائی دے گئی ہے، اس کے عہدِ شباب میں بھی
نے تمہیں خطرے کی ہر شاہراہ پر جھنجھوڑا، لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا، بلکہ غفلت و انکار کی
ساری سنتیں تازہ کر دیں، نتیجہ معلوم، کہ آج اُن ہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے، جن کا اندیشہ تمہیں صراطِ مستـ
سے دور لے گیا تھا۔

سچ پوچھئے تو اب میں ایک جمود ہوں، یا ایک دور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر غریب الوطنی کی زنـ
گزاری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لئے چُن لیا تھا، وہاں میرے بال و پر کاٹ لـ
ہیں، یا میرے آشیانے کے لئے جگہ نہیں رہی۔ بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں
گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور
اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوفِ زندگی نہیں اور کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آگیا؟ یہ خوف تم نے خود فراہم کیا
ہے۔ یہ تمہارے اپنے ہی اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا، جب میں نے کہا تھا کہ دو قوموں کی حیاتِ معنوی کے لئے مرض الموت کا در

رکھا ہے اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسا کیا ہوا ہے، نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ لیکن تم نے سُنی ان سُنی
برابر کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی رفتار تمہارے لئے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں۔
تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہارا بھروسا تھا وہ تمھیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے ہیں،
وہ تقدیر جو تمہارے دماغی لغت میں مشیت کی منشاء سے مختلف مفہوم رکھتی ہے۔ یعنی تمھارے نزدیک فقدانِ ہمت
کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمھاری خواہش کے برخلاف اُلٹ گئی اور رہنمائی کے وہ بُت جو تم نے وضع کیے تھے وہ
بھی دغا دے گئے۔ حالانکہ تُم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھائی گئی ہے اور ان ہی بُتوں کی پوجا میں
تمہاری زندگی ہے۔

میں تمھارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمھارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں۔ لیکن
اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ تو تمھارے لیے بہت سی گرہیں کھُل سکتی ہیں ــ

ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمھیں پکارا تھا اور کہا تھا:

"جو ہونے والا ہے، اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں
بھی سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر
گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلو تہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی
کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا مؤرخ لکھے گا کہ ؛ ـــ" تمھارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا
ایک غول تھا، ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا، جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی
قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔"

اور آج ہندوستان آزاد ہے اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ وہ سامنے لال قلعہ کی دیوار پر آزاد ہندوستان
کا جھنڈا اپنے پورے وقار سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اُڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر
کیا کرتے تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمھاری خواہشوں کے مطابق کروٹ نہیں لی بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی
حق کا احترام میں کروٹ بدلی ہے اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمھیں بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے۔ اور
تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شئے چھن گئی اور اس کی جگہ بری شئے آگئی ہے۔

ہاں تمہاری بے قراری اس لئے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شئے کے لئے تیار نہیں کیا تھا اور مٹی ہی کو ماویٰ و ملجا سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے، جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا سمجھ کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا جب تم کسی جنگ کے آغاز کی فکر میں تھے اور آج اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمہاری اس عجلت پر کیا کہوں کہ اِدھر ابھی سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور اُدھر گمراہی کا خطرہ بھی پیش ہے۔

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاسیات کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے اور کبھی اس پُرخار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لئے ہوئے ہوتی ہیں۔ لیکن آج مجھے جو کچھ کہنا ہے، میں اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔

مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بدقسمتی سے بعض مقامات پر ابھی تک دیکھ رہے ہیں۔

پچھلے سات برس کی روداد دہرانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو سیلاب آیا ہے، وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا بدیہی نتیجہ ہے۔ یہ سب کچھ مسلم لیگ کے لئے تو موجب حیرت ہو سکتا ہے لیکن میرے لئے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ میں پہلے دن ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔ اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے۔ اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے اندازِ فکر میں سوچ سکتے ہیں یا نہیں! اسی خیال سے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتے میں ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا ہے۔ دعوت نامے بھیج دیئے گئے ہیں۔ ہراس کا یہ موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔

میں نے تمہیں ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اٹھا لو اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سُنی ہیں۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے! اس پر بھی غور کرو، تمہیں محسوس ہو گا کہ یہ غلط ہے۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہارے فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو؟ اور کیوں جا رہے ہو؟ یہ دیکھو! مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمہارے

…ں نے دعویٰ کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمہارے خون
…سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرلو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش و خروش بیجا تھا
…طرح آج تمہارا یہ خوف و ہراس بھی بیجا ہے۔ مسلمان اور بزدلی، یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔
…مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے
…نہیں، انھوں نے تمھیں جانے ہی کے لئے اکٹھا کیا تھا۔ آج انھوں نے تمہارے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے
…عیب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو کہ تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمہارے
…میں تو ان کو اپنے اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے ۱۳ سو برس پہلے عرب کے ایک اُمّی کی معرفت فرمایا تھا:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ	"جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے، تو پھر اُن کے لئے نہ تو کسی کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم"

…ہوائیں آتیں اور گزر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی، لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں، ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا
…موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں۔ لیکن مجھے تمہاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار کہنا پڑتا ہے کہ
…اپنے گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ سیاسی ذہنیت اپنا
…سانچہ توڑ چکی اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمہارے دلوں کا معاملہ نہیں بدلا اور دماغوں
…ختم نہیں ہوئی تو پھر حالت دوسری ہے۔ لیکن واقعی تمہارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے
…اس طرح بدلو جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔

آج بھی کہ ہم ایک دورِ انقلاب کو پورا کر چکے ہیں، ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور
…ان صفحوں میں زیبِ عنوان بن سکتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لئے تیار بھی ہیں۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو، یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے۔ بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔
…ستارے ٹوٹ گئے، لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور اُن اندھیری راہوں میں بچھا
…اُجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تمھیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی

کی وہی زندگی اختیار کرو، جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں جو اُجلے نقش و نگار تمھیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں وہ تمہارا ہی قافلہ لایا تھا۔ انھیں بھلاؤ نہیں، انھیں چھوڑو نہیں، اُن کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لئے تیار نہیں تو پھر تمھیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔

آؤ عہد کریں کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم اس کے لئے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیروں سے کانپتے ہو، کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا وجود ایک اُجالا تھا۔ یہ بادلوں کی سیل کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائنچے چڑھا لئے ہیں۔ وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں تو اُن پر مسکرا دیئے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا، صرصر اٹھی تو رُخ پھیر دیا، آندھیاں آئیں تو اُن سے کہا کہ تمہارا راستہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جاں کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبان کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہ تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمہارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ چودہ سو برس پہلے کا پرانا نسخہ ہے۔ وہ نسخہ جو کائنات کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔ وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان : وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝

آج کی صحبت ختم ہو گئی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں اختصار کے ساتھ کہہ چکا۔ پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں اپنے حواس پر قابو رکھو۔ اپنے گرد و پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمھیں خرید کر لا دوں، یہ تو دل کی دکان ہی سے اعمالِ صالحہ کی نقدی پر دستیاب ہو سکتی ہے۔ والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ

زبان ز نطق فرو ماند و رازِ من باقی است
بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقی است

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں خطبۂ تقسیم اسناد: ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء

... موجودہ زمانے میں جب کہ مغربی علوم کی تعلیم ہندوستانی زندگی کی ایک عام حقیقت بن گئی اور ہم تعلیم کے لفظ کا اطلاق صرف اس تعلیم پر کرنے لگے ہیں، بہت کم لوگ اس جدّوجہد کی دشواریوں کا اندازہ کر سکیں گے، جو آج سے سو برس پہلے نئی تعلیم کے حامیوں کو پیش آئی تھیں۔ انھیں صرف ایک راستہ ہی نہیں دکھانا تھا، اس راستہ میں قدم قدم پر لڑنا تھا۔ ان کی راہ قدامت پرستی کی بیشمار قوتوں سے گھری ہوئی تھی جو ہمیشہ نئی تبدیلیوں کی راہ روکنا چاہتی ہیں۔

... دراصل یہ جنگ فکر انسانی کی تاریخ کا ایک عالمگیر خاصہ تھی۔ یورپ میں یہ کشاکش سترھویں اور اٹھارویں صدی میں ہوئی اور مشرقی ممالک کا اس سے سامنا انیسویں صدی میں ہوا۔ ہندوؤں میں یہ جنگ شروع ہوئی اور جلد ختم ہو گئی۔ مگر مسلمانوں میں اس نے بہت زیادہ وقت لیا۔ بالآخر وہی ہوا، جو ہمیشہ ہوا ہے۔ وقت کے تقاضے فتحمند ہوئے اور قدامت پرستی کو اپنی ہار مان لینی پڑی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے بلاخوف و تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس فیصلہ کُن جنگ کا مردِ میدان وہی شخص تھا جو اس یونیورسٹی کے ایک گوشے میں مدفون ہے۔ یہ جنگ اسی میدان میں لڑی گئی اور یہی علی گڑھ اس کی فتح مندی کا یادگاری منارہ ہے۔

زمانۂ حال کے بعض اہل قلم نے سرسیّدؒ مرحوم کو راجہ رام موہن رائے سے تشبیہ دی ہے اور یہ بہت حد تک صحیح ہے۔ راجہ رام موہن رائے نے جو کام بنگال میں کیا، وہی ان سے چالیس برس بعد سرسیّد نے شمالی ہند میں کیا اور خاص طور پر مسلمانوں میں کیا۔

... یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اگرچہ سرسیّد مرحوم نے ملک کی سیاسی تحریک کی مخالفت کی تھی لیکن ان کی مخالفت میں ہندو مسلم سوال کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی مخالفت کی سرگرمیوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو یکساں طور پر شریک کیا تھا۔ وہ مدت العمر ہندو مسلم یگانگت کے حامی رہے اور ہمیشہ ایسی باتوں کی مخالفت کرتے رہے جن سے دونوں جماعتوں کے باہمی نفاق و یکجہتی میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں بار بار یہ خوبصورت استعارہ دہرایا تھا کہ مادرِ ہند کی دو آنکھیں ہیں ایک ہندو، ایک مسلمان۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک آنکھ بھی بگڑ جائیگی تو اس کے چہرے کا سارا حسن بگڑ جائے گا۔

..... مرحوم سرسید اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی قائم نہیں کیا بلکہ وقت کی تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ اس حلقہ کی مرکز خود ان کا وجود تھا اور اس کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔ ہندوستان کے کسی موقت الشیوع نے شاید ہی ایسے گہرے اثرات وقت کی دماغی رفتار پر ڈالے ہوں گے جیسے کہ "تہذیب الاخلاق" نے۔ یہ رسالہ انھوں نے انگلستان کی سیاحت کے بعد نکالا تھا اور اس میں ان کے حلقہ کے رفیقوں کے مضامین نکلا کرتے تھے۔ فی الحقیقت جدید اردو علم و ادب کی بنیادیں اسی رسالہ نے استوار کیں اور اسے اس قابل کیا کہ آج ہر طرح کے علمی و ادبی مطالب ادا کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر اہلِ قلم ایسا ہوگا جو اس مرکزی حلقے کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ جدید ہندوستان کے مسلمان مصنف اسی حلقہ کے زیرِ اثر پیدا ہوئے اور یہیں سے نئے قسم کی اسلامی تحقیق و تصنیف کی راہیں پہلی کھولی گئیں۔

... انیسویں صدی کا آخری نصف حصہ اکثر مشرقی ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی ایک انتقالی دور تھا۔ اس دور میں ملک کی دماغی زندگی کے پرانے سانچے ٹوٹ رہے تھے اور نئے سانچے ڈھل رہے تھے۔ پرانے ہندوستان کی مٹی ایک نئے ہندوستان کا ڈھانچا تعمیر کر رہی تھی اور پرانے موسم کا خاتمہ ایک نئے موسم کی آمد کا اعلان تھا۔ جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے، کہا جاتا ہے کہ اس دور کا سب سے زیادہ موثر عمل یہیں انجام پایا۔

.... آپ کے اسٹریچی ہال کی دیواروں پر جو کتبے کندہ ہیں، ممکن ہے کہ وہ کسی وقت مٹ جائیں لیکن آپ کی درسگاہ نے زمانے کے لازوال صفحوں پر جو کتبے ثبت کر دیئے ہیں وہ کبھی مٹ نہیں سکتے وہ باقی رہیں گے اور ہندوستان کے آنے والے مورخ ان سے اپنی کہانیوں کے لیے مواد حاصل کریں گے۔

ایک ایسا تعلیمی ادارہ جو اپنی ماضی کی ایک ایسی شاندار داستان رکھتا ہو، قدرتی طور پر اس کا متمنی ہوگا کہ ایک شاندار مستقبل اپنے سامنے دیکھے۔ مجھے معلوم نہیں اس وقت آپ کے احساسات کیا ہیں۔ آپ اپنے مستقبل کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو وہ کس رنگ و روپ میں آپکے سامنے آتا ہے؟ آپ کو دروازوں کے بند ہونے کی آواز سے آ رہی ہے یا کھلنے کی؟ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی نگاہیں کیا دیکھ رہی ہیں لیکن میں آپ کو بتلا سکتا ہوں کہ میری نگاہیں کیا دیکھنے لگی ہیں۔ آپ شاید دیکھ رہے ہیں کہ بہت سے پرانے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت سے نئے دروازے کھل گئے ہیں۔

تفاوت ست میان شنیدن من و تو
تو بستن در و، من فتح باب می شنوم

قاضی معزالدین احمدؒ

جناب قاضی معزّ الدّین احمد (پ ۱۹۱۲ تقریباً) علیگڑھ کے گریجویٹ، آزادی کے بعد پہلے ادبی ناشر (آزاد کتاب گھر، دہلی)۔ مدّت تک روسی سفارت خانے کے شعبۂ اطّلاعات سے وابستہ رہے۔ علیگڑھ کنونشن والوں کا ساتھ ایک عرصے تک نبھایا۔ "تہذیب الاخلاق" کے احیاءِ نَو میں اور مدیر مسئول کے طور سے ستمبر ۸۳ء تک سیّد حامد صاحب کے شریکِ کار رہے سفارت خانے کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد علیگڑھ میں قیام ہے۔

••

(۱)

میلاد النبیؐ کی تقریب

میلاد النبیؐ کی تقریب نہ معلوم دنیا کے کسی
دوسرے ممالک میں منائی جاتی ہے یا نہیں۔ ہندوستان
دلچسپ صورت اختیار کرتی جا رہی ہے اور آہستہ آہستہ ہندوستان کے مزاج کے مطابق ہوتی جا
ہے۔ ایک زمانہ میں اس محفل میں ولادت نبویؐ کے بارے میں بہت سی روایات بیان کی جاتی تھیں۔ وہ
آموز خواہ نہ ہوں، عوام کے دلوں کو خوب گرماتی تھیں۔ الحمد للہ وہ دور ختم ہو گیا۔ لیکن اب قومی لیڈر،
یاسی رہنما، پارلیمنٹ کے ممبر، سوشل ورکر، شہر کے خوش پوش اور خوش باش معززین، مسلمان اور ہندو اور
الی سب ہی مدعو کیے جاتے ہیں۔ ان محفلوں میں شرکت کے بعد بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ محفل میں کوئی ایک آدھ
ہا ہوتا ہے، جو سیرت پر کچھ کہتا ہے۔ وہی بیچارہ سب سے زیادہ مظلوم ہوتا ہے اور اس کو بہت کم وقت
ہے۔ تمام وقت لیڈران تقاریر کرتے رہتے ہیں۔ سننے والا نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ
بارے میں کوئی رائے قائم کر سکتا ہے۔ نہ اسلام کے بارے میں۔

اب یوم النبیؐ کے سلسلہ میں جلوس نکلنا بھی شروع ہو گیا ہے۔ امسال غالباً رامپور کے ایسے ہی
س کی تصویر اخبار میں دیکھی۔ جلوس کیا نکلا، ایک صاحب عربی لباس پہن کر اونٹ پر بیٹھ کر نکلے، گویا دورِ نبویؐ
مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ سلسلہ جاری رہا تو وہ دن جلد آئے گا جب روضۂ اطہر کاغذ کا بنا کر
اس کو اونٹ پر رکھ کر نکالا جائے گا اور خدا پرست موحد اس کو بوسہ دیں گے۔ اس اونٹ کے پیچھے بیماروں
بچوں کو نکالا جائے گا، منتیں مانی جائیں گی اور وہ سب ہوگا جو ماہ محرم میں تعزیہ داری کے دوران ہوتا ہے۔

(۲)

فلم بینی

کچھ عرصہ ہوا اخبارات میں یہ خبر دیکھی تھی کہ مہاراشٹر کے کسی مقام پر
عورتوں نے سینما دیکھنا ترک کر دیا ہے۔ یہ تحریک تیزی سے پھیلی اور بہت
میاب ہوئی۔ پھر خواتین کے ایک حلقے میں یہ تحریک ان کی حق تلفی کے مترادف خیال کی گئی۔ اس حق کی بحالی کے
تعلیم یافتہ خواتین نے آواز اٹھائی اور احتجاج کیا۔ عورتیں پھر سینما دیکھنے لگیں اور حق تلفی کی شکایت کا تدارک
گیا۔ مسلم اخبارات نے اس تحریک کو مبارک خیال کیا اور اس کے خلاف آواز اٹھانے والے ترقی پسندوں کے جرم
اور آزاد خیال لوگوں کی بے راہ روی پر محمول خیال کیا۔

بہر حال خواتین کا سینما دیکھنے کے خلاف اقدام اور پھر اُن کی آزادی کا مطالبہ اور ان کی حق تلفی کے خلاف جد و جہد، سبھی باتیں دلچسپ ہیں اور آپ کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔

سینما خود بُری چیز نہیں ہے۔ یہ اصلاح اور ترقی کا ایک ذریعہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جب لوگ جلب منفعت کے لئے فلم بناتے ہیں تو ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمائیں، ظاہر ہے یہ مقصد اسی وقت پورا ہوتا ہے جب عوام میں فلم مقبول ہو۔ مقبولیت کے لئے آسان ذریعہ یہی ہے کہ فلم میں خوب مار دھاڑ ہو اور جنسی بے راہ روی کی نمائش ہو، نیم عریاں لباس میں عورتیں دکھائی جائیں۔ گویا فلم سازوں کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ فلم میں جنسی اور حیوانی جذبات کو اپیل کر کے عوام میں مقبول بنایا جائے اور نام فن کاری اور آرٹ کا لیا جائے۔

فلم عورتوں سے زیادہ مردوں کی بے راہ روی کا ذریعہ ہوتی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ مرد عورتوں کو تو فلم بینی سے روکیں اور خود فلم دیکھنے میں دلچسپی لیں۔ حال ہی میں مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ کا بیان "قومی آواز" ۲۸ فروری، ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ مدھیہ پردیش میں ہر آٹھ گھنٹے میں ایک عورت کی آبرو ریزی ہوتی ہے۔ ہر بارہ گھنٹے پر ایک عورت خودکشی کرتی ہے۔ ہر تیسرے دن ایک عورت کو قتل کیا جاتا ہے۔ وزیر اعلیٰ ارجن سنگھ نے ۱۹۸۱ء کے اعداد و شمار اس طرح پیش کئے ہیں۔ ۱۰۵۹ عورتوں کی آبرو ریزی کی گئی، ۳۹۷ عورتوں نے خودکشی کی، ۱۳۰ کو خاندانی جھگڑوں کی بنا پر اور ۹ کو آبرو ریزی کے بعد قتل کر دیا گیا۔ یہ داستان تو آپ کی ایک ریاست کی ہے، اگر یہی حال دوسری ریاستوں کا ہوا اور یقیناً ایسا ضرور ہوگا تو پھر سوچئے کہ پورے ملک کا کیا حال ہو رہا ہے اور ہم کدھر جا رہے ہیں۔

ہمارے ملک میں جو انتشار ہے اس سے کون واقف نہیں۔ جنسی بے راہ روی عام ہے اور روز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس طرح پر لوٹ مار کو فروغ حاصل ہے۔ رشوت سے کون بچا ہوا ہے۔ شاہ و گدا دونوں اس کے مجرم ہیں۔ پس ہم بربادی کے اس غار کی طرف تیزی سے دوڑ رہے ہیں جس میں گر کر اپنا حال و مستقبل دونوں تباہ کر دیں گے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ اور ہماری حکومت دونوں کا نہ کوئی مسلک ہے، نہ زندگی کا کوئی مقصد۔

کسی سماج میں رسم و رواج اور زندگی کے مشاغل داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کے خلاف آواز اٹھانا آسان ہو، ان کا ترک دشوار ہو جاتا ہے۔ ان سے بچنے اور اُن کو ترک کرنے کے دو ہی طریقے ہوتے ہیں

یہ کہ معاشرہ کے ذمہ دار خود قدم اٹھائیں اور اصلاح کے خواہش مند ہوں۔ ایسی صورت میں قانون کی مدد بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ دوسری صورت رائے عامہ کی تبدیلی ہے اور لوگوں کی توجہ ہٹانا ہے۔ اگر مسلمانوں میں اچھی کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو جائے تو سینما بینی کا شوق کم ہو جائے گا۔ دیکھیں گے بھی تو اس کے برے اثرات ان پر کم پڑیں گے۔ لیکن اگر فحش اور عریاں ناول اور افسانے قصے اور کہانیاں پڑھیں گے، تو سینما سے دلچسپی اور گہری ہوگی اور فلم لوگ جنسی تسکین کے لئے دیکھیں گے۔ جنسی خواہش، آپ ایک وقت دبا سکتے ہیں لیکن وہ کسی وقت بھی ابھر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل جنسی بے اعتدالی کے واقعات کثرت سے ہوتے ہیں۔ یہی صورت قتل کی وارداتوں، اغوا کے واقعات، چوری اور ڈکیتی کی ہے۔ آپ کے تحت الشعور میں جو باتیں محفوظ ہو جائیں گی وہ کسی وقت بھی رنگ لا سکتی ہے۔ اس لئے انسان کے لئے اچھا ماحول اچھی صحبت اور اچھے ادب کا مطالعہ شخصیت کی تعمیر کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اچھے ادب سے مراد یہ نہیں کہ آپ صرف مذہبی کتابیں پڑھیں، معیاری ناول اور افسانے، تاریخ، تہذیب، سیاسی کتب وغیرہ سب کا اچھے ادب میں شمار ہوتا ہے اور ان سب سے اچھے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور ان ہی سے شخصیت بنانے اور ترقی کرنے کا جذبہ پرورش پاتا ہے اور جیسا کہ ایک نوجوان اپنے بارے میں سوچتا ہے ویسی ہی اس کی زندگی بنتی جاتی ہے۔

(۳)

یہ ہماری زبان اُردو

ایک زمانہ تھا کہ اُردو تمام ملک کی زبان تھی۔ لکھی، پڑھی اور بولی جاتی تھی۔ پھر وہ فرقہ وارانہ اختلاف پیدا کرنے کا ذریعہ تجویز کی گئی، بقول پنڈت سندر لال "ایک قدیم متروک رسم الخط کو زندہ کیا گیا"، آزادی کے بعد ہندی قومی زبان قرار دیدی گئی۔ اُردو کو بھی ہندی کہا گیا اور یکایک اردو اپنے وطن میں اجنبی ہوگئی۔ اُردو میں درس و تدریس ترک کی گئی، اس کو دفاتر سے خارج کیا گیا، تو اُردو والوں نے آہ و بکا شروع کر دیا، شکوے اور شکایات ہونے لگی۔ بحث و تکرار ہوئی تو دل کی بھڑاس نکل گئی۔ اُردو کے بارے میں مطالبات شروع ہوئے لیکن اس کو زندہ رکھنے کے لئے کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ اُردو والے شیر قالین ہمیشہ سے رہے ہیں، بس ان کا گفتار کا کردار غالب رہا۔

ملک میں ہر سال اُردو کانفرنس ہوتی ہے، تجاویز پاس ہوتی ہیں۔ حکومت سے مطالبات کئے جا
ہیں، لیکن اُردو زبان کو زندہ رکھنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھتا۔ کچھ ہوتا ہے تو بہت محدود پیمانے پر۔ حیات
انصاری صاحب نے "دس دن میں اردو" کا قاعدہ مرتب کیا، بیگم حیات اللہ نے بہت سے لوگوں کو سکھلایا
کتنوں نے اُردو زبان و ادب میں دلچسپی لی ہوگی۔ یو، پی میں اردو کے مدرسوں کا تقرر بھی ہوا لیکن اردو زبا
انحطاط نہ رکا۔ اب جو اردو جاننے والے نوجوان ہیں، اُن میں بہت کم ایسے ہیں جو اُردو زبان میں اظہار خیال پر
رکھتے ہوں۔ جن اسکولوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے ان کے طلبا مشکل سے اُردو کے چند جملے صحیح لکھ سکتے ہیں
کے شاعر تو بہت ہیں۔ شعر فہمی بہت کم ہے۔ نثر نگار بھی مل جائیں گے۔ صاحب طرز ادیب شاید ہی کوئی نیا پیدا ہ

اُردو کی گزشتہ ۳۰ سال کی تاریخ پر نظر ڈالیے اُردو کے سب ناشر بدحال ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کتا
نے اُردو کی کتابیں فروخت کرنے کا کام ترک کر دیا ہے۔ بہت سے مشہور کاروبار بند ہو گئے ہیں۔ اُردو والوں
اور اُردو کے ادیبوں اور تحریک کے لیڈروں کو بھی اُردو کتاب خرید کر پڑھنے کی عادت نہیں۔ اگر ایک نے کتا
خریدی تو دس اُس کو مانگ کر پڑھتے ہیں اور اس دوران کتاب گم ہو جاتی ہے۔ ہندوستان بھر میں اردو کی نص
کتب دستیاب نہ ہوتی تھیں۔ اُردو تحریک کے لیڈر دس برس سرکار سے درخواست کرتے رہے کہ نصابی کتب شا
کرے۔ اُردو کے کسی ناشر نے یہ نہ کیا کہ ان نصابی کتب کی اشاعت کا اہتمام کرتا۔

اب بھی اُردو کی نصابی کتب ہر ریاست میں آسانی سے نہیں ملتیں۔ لیکن چھاپے کون اور نقصان کو
برداشت کرے۔ مسلم درسگاہوں کی حالت اور بُری ہے۔ دس دس سال سے نصابی کتابیں چل رہی ہیں۔ سنا
کہ بچے اب بھی یہی پڑھتے ہیں کہ "نہرو وزیر اعظم ہیں"۔

اب ذرا دیکھئے کہ اُردو کی کیسی کتابیں شائع ہوتی ہیں، کلام کے مجموعے، عام تنقیدی اور تحقیقی
اور عام ناول وغیرہ۔ کیا وہ زبان جس میں ایسی کتب شائع ہوں اس دور کے نوجوانوں کو وقت کے تقاضوں
آگاہ کر سکتی ہیں؟ اور اُن کے مستقبل کی طرف رہنمائی کر سکتی ہیں؟ کیا وہ کتب جو اس وقت اردو میں شائ
ہوتی ہیں، افیون کی حیثیت نہیں رکھتیں؟ سوچیے کہ اُردو والوں کا پھر کیا مستقبل ہوگا۔ کب زندگی کے میدا
کارزار میں سربکف اُترنے کا جذبہ پیدا ہوگا؟ کب اُردو، اُردو ہوگی اور ایک زندہ قوم کی زبان ہوگی۔

ضرورت ہے کہ اردو کے جتنے بھی سرکاری اور نیم سرکاری ادارے ہیں، اُن کے کارکن اور اُردو تحریک
لیڈر سر جوڑ بیٹھیں اور اُردو کے ترقی کے مسئلہ پر غور کریں۔ ایسی کتابیں اُردو میں شائع کریں (ترجمہ کر کے) جو اُن میں ن

ات سے واقفیت اور بیداری پیدا کریں' اور اردو دنیا سے اپیل کریں کہ لوگ کتابیں خرید کر پڑھیں۔
دو لیڈر ایک مہم چلائیں مسر یکف نکلیں' جلوس نکالیں' جلسے کریں' خود کتابیں خریدیں اور اداروں کو خریدنے پر آمادہ
یں۔ تب کہیں اردو زبان زندہ ہوگی اور زندہ رہے گی۔

مسلم کانفرنس

جب سے ہندوستان آزاد ہوا ہے' آل انڈیا مسلم اجتماعات تقریباً ہر سال ہوئے ہیں۔ ان میں تقاریر ہوتی ہیں اور تجاویز پیش
باتی ہیں اور متفقہ آرا سے وہ سب پاس ہوتی ہیں' لیکن پھر کچھ نہیں ہوتا۔ نہ کوئی تنظیم قائم ہوئی، نہ کسی تجویز
ل ہوا۔ خدا کرے بہرائچ کا اجتماع کامیاب ہو اور ملت کی مشکلات کا کچھ مداوا ہو سکے۔ مسلمانوں کا ایک گروہ
ت کار ہے۔ انگریزوں کی حکومت کے دور میں ملک کی دست کاری کو بہت نقصان پہنچا۔ بہت کم دست کار ایسے
ے جو کچھ پیدا کرتے ہوں اور خوش حال ہوں۔ لیکن آزاد ہندوستان میں صورت دوسری ہے۔ دست کاری کو بڑا
روغ ہوا ہے اور کاروبار کو بھی ترقی ہوئی ہے۔ مسلم دست کاروں اور کاروباری لوگوں کی حالت پہلے کے مقابلہ
بہت بہتر ہے اور یہ سب خوش حال ہیں اور باوجود اس کے کہ ان کی ترقی اور خوشحالی کچھ لوگوں کو پسند نہیں اور یہ
رقہ وارانہ فسادات کا شکار ہوتے رہتے ہیں' لیکن پھر بھی ان کی ہمت اور جرأت قابل داد ہے۔ یہ اجڑتے ہیں
ور بستے ہیں اور یہی ایک موحد کا کردار ہے۔

مسلمانوں کے مسائل چند بہت اہم ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ بے روزگاری کا شکار ہے اور اسی سبب سے
سلمانوں کی پستی اور افلاس کا نعرہ دیتا رہتا ہے۔ مسلمانوں میں سب سے بڑا گروہ ان عوام کا ہے' جو دیہات میں آباد ہیں۔
ن کا نہ کوئی والی ہے نہ وارث ہے۔ وہ سب سے زیادہ پامال بھی ہے۔ ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا ہے۔ اگر
سلمانوں کے مسائل کو حل کرنا ہے تو ان ہی دونوں گروہوں کے سوالات کو سامنے رکھنا ہوگا۔ تعلیم یافتہ طبقہ کے
فراد کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس نے تعلیم کبھی سنجیدگی سے حاصل نہیں کی۔ اس کی تعلیم محدود' صلاحیت
محدود، اس کی حالت یہ کہ وہ نہ کسی زبان سے واقف ہے نہ کسی علم سے۔ اس کی اصلاح کے لئے ضرورت ہے
اس میں مطالعہ کی عادت ہو' اپنا مطالعہ وسیع کرے اور محنت کے خوگر بنے۔

ایک زمانہ میں جدید تعلیم یافتہ گروہ انگریزی سے واقف ہوتا تھا۔ آج بد قسمتی سے وہ نہ انگریزی
جانتا ہے، نہ اردو اور نہ ہندی۔ پھر بھی اگر وہ خود کوشش کرے تو ایسی قابلیت اور صلاحیت پیدا کر سکتا

ہے کہ معاشرہ میں اپنی کوئی جگہ بنا سکے۔ رہا ہماری دیہاتی آبادی کا بڑا طبقہ، اس کا تو خدا ہی حافظ ہے
ہندوستان ترقی کرے اور دیہاتی لوگوں کا مستقبل روشن ہو تو پھر اُن کی بھی کوئی جگہ ملک میں ہو سکتی ہے
ہمارے شہری لیڈر ان کی اقتصادی ترقی کے سلسلے میں مشکل ہی سے کچھ کر سکیں گے، البتہ اگر مسلم نوجوانوں میں خ
خلق کا جذبہ پیدا ہو اور وہ دیہات کے لوگوں کی خدمت کریں، تو دیہاتی مسلمانوں کو کم از کم دینی تعلیم دے
سکتے ہیں اور اُن کو کسی دستکاری میں لگا سکتے ہیں۔ مسلم نوجوانوں کو دیہات میں سماجی کام کرنا چاہیئے اور دیہ
کی ہندو مسلم آبادی کی خدمت کرنی چاہیئے۔ یہ کام ہر اعتبار سے قومی اتحاد کے لئے مفید ہوگا۔

(۵)

بونڈیڈ لیبر

آپ نے اخبارات میں "بونڈیڈ لیبر" کی بپتا پڑھی ہوگی۔ نہ معلوم آپ نے یہ تکلیف گوارا کی ہوگی کہ یہ سوچیں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ ان کی بپتا کی نوعیت کیا ہے اور آپ کا کیا فرض ہے۔

بدقسمتی سے یہ وہ لوگ ہیں جن کو اپنے وطن اور اپنے گھروں سے اغوا کیا جاتا ہے، یا لالچ دیکر غریب د
کو فریب کے جال میں پھنسایا جاتا ہے اور کہیں لا کے ایک حلقہ میں قید رکھا جاتا ہے۔ ان کو دو وقت کا کھا
ہے اور وہ بھی ایسا کہ جس کو ایک مجرم قیدی بھی نہ کھائے۔ اُن سے روزانہ سولہ گھنٹے کام لیا جاتا ہے۔ اُن میں
کچھ جوانی ہی میں مر جاتے ہیں، جو بچ جاتے ہیں وہ جب تک زندہ رہتے ہیں اپنے آقا کی گرفت میں رہتے ہیں اور
وقت اُن کے کام کاج کے لئے تیار رہتے ہیں۔

حکومت اُن کو اسی وقت آزاد کر سکتی ہے جبکہ اُن کی روزی کا بندوبست کرے اور اُن کو اپنے
پہنچائے۔ سوچنا یہ ہے کہ اس سلسلے میں ایک مسلمان کا کیا فرض ہے۔ وہ نہ بونڈیڈ لیبر سے واقف ہے، نہ اس
سے آگاہ جو دین نے اس پر عائد کی ہے۔ ضرورت تو یہ ہے کہ جہاں جہاں اس قسم کے لوگ مقید ہوں، مسلمان اُن کا
چلائیں اور ان کی آزادی کے لئے حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبہ میں فرمایا تھا کہ "یہ غلام، یہ غلام، جو تم کھاؤ و
کو کھلاؤ۔ جو خود پہنو، وہ ان کو پہناؤ۔ ان کی خطاؤں سے درگزر کرو۔ آخرت میں ان کے بارے میں تم سے
ہوگا۔" انسان کے گناہوں کا کفارہ اسلام میں سب سے بڑا یہی لکھا ہے کہ وہ غلام آزاد کرے۔ کیا بونڈیڈ لیبر ا

ے اور کیا اُن کی حالت سے بے تعلق رہنا مسلمانوں کو زیب دیتا ہے ؟

بس صورت یہ ہے کہ مسلمان دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا سے ناواقف ہیں اور نہیں جانتے کہ اُن پر
ذمہ داریاں کیا ہیں اور ان پر پڑوسی کے کیا حقوق ہیں۔ دینی تعلیمات سے ہر آدمی واقف نہیں ہوتا، لیکن عقل
بھی کچھ مطالبات ہوتے ہیں، اسی کی روشنی میں ذمہ داریاں ادا کی جائیں تو معاشرہ کی اصلاح و ترقی کی راہیں کھل سکتی
ہیں اور سماج کا وقار بلند ہو سکتا ہے۔ ●●

(۶)

ہماری شہری ذمّہ داریاں

لندن کے کسی اسٹیشن پر ایک ہندوستانی ایک ملاقاتی ٹرین کے منتظر کھڑے تھے۔ ٹرین پانچ منٹ
لیٹ ہوئی۔ جب ٹرین پہنچی تو اسٹیشن ماسٹر نے مائک پر بہت عاجزانہ انداز میں مسافروں سے ٹرین کے لیٹ ہونے
کی معافی مانگی۔ ہندوستانی مسافر کو تعجب ہوا کہ یہ کون سا معافی مانگنے کا موقع تھا۔ دریافت کرنے پر اس کو بتایا
گیا کہ انگلستان میں گاڑیاں لیٹ نہیں چلتیں، اس لئے جب گاڑی لیٹ ہو جاتی ہے، تو ریلوے کے ذمہ دار
مسافروں سے اسی طرح معافی مانگتے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ جاپان کی راجدھانی ٹوکیو میں ہوا۔ ٹرین
دو منٹ لیٹ تھی۔ ہندوستانی بھائی جو پلیٹ فارم پر ٹرین کا انتظار کر رہے تھے انھوں نے دیکھا کہ اسٹیشن
ماسٹر پلیٹ فارم پر آکر کھڑا ہو گیا اور ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ ٹرین جب اسٹیشن پر پہنچی تو اسٹیشن ماسٹر اس
کے آگے کود پڑا اور خودکشی کر لی۔ ہندوستانی مسافروں کو بہت افسوس ہوا لیکن جاپانیوں نے اس حادثہ کی
طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ایک آدمی آیا۔ اس نے لاش اُٹھائی، جگہ صاف کی اور چلا گیا۔ ہندوستانی سے جاپانیوں
کی یہ بے حسی دیکھی نہ گئی۔ اُس نے اسٹیشن کے ملازمین سے سوال کیا۔ اس کا جواب ملا کہ گاڑی دو منٹ لیٹ تھی
اور اسٹیشن ماسٹر اس کا ذمہ دار تھا، اُس نے محسوس کیا چونکہ ٹرین دو منٹ لیٹ ہو گئی اور مسافروں کو دو منٹ انتظار
کرنا پڑا، ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے کسی کا کوئی نقصان بھی ہوا ہو، اس لئے اُس نے اپنے کو سزا دینے کے لئے
اپنی جان بادشاہ پر قربان کر دی اور اس طرح غلطی کا کفارہ ادا کیا۔ یہ تو ارتکاب جرم کا انتہائی اور سخت کفارہ
ہے جو ایک مجرم خود ادا کرتا ہے، لیکن یہ بھی دیکھئے کہ جب گاڑی آپ کے ملک میں لیٹ ہوتی ہے تو لوگوں کو کتنی پریشانی
کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا سبب اکثر یہ ہوتا ہے کہ لوگ زنجیر کھینچ کر گاڑی روک لیتے ہیں، اس طرح پر گاڑی لیٹ

ہوجاتی ہے اور مسافروں کی پریشانی کا سبب بنتی ہے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک ٹرین لیٹ ہوگئی اور برابر لیٹ ہوتی چلی گئی۔ ایک صاحب کو ..
سے باہر جانا تھا، ہوائی جہاز میں ان کی سیٹ بک ہو چکی تھی، وہ سخت پریشان تھے کہ کیا کریں اور کیسے وقت
پہنچیں، اب دیکھئے ان کا کتنا نقصان ہوا ہوگا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے مسافر ہوں گے جن میں سے کسی کا مالی نقصا
ہوگا، کوئی اپنے عزیز قریب سے ملنے سے رہ گیا ہوگا اور ایسی ہی بہت سی پریشانیوں میں لوگ گرفتار ہوئے ہوں گے۔

ذرا دیکھئے ایک آدمی اپنے آرام کے لئے دوسروں کو کتنی تکلیف پہنچاتا ہے۔ آپ اپنا احتساب کر
دیکھئے کہ کہیں آپ نے تو اپنے فائدے کے لئے کسی دوسرے کو پریشان تو نہیں کیا۔

(۷)

دارالمصنفین

۱۸ویں اور ۱۹ویں صدی عیسوی میں دنیا اور خصوصاً ہندوستان میں اہم
تبدیلیاں ہوئیں۔ اس زمانہ میں مغربی یورپ کا عروج شروع ہوا۔ اس کا بہت گہرا اثر مسلمانوں پر پڑا۔

مسلمانوں کی عہد وسطیٰ میں سیاسی اور تہذیبی اہمیت رہی ہے۔ لیکن ۱۸ویں صدی اور ۱
میں ان کا زوال ہوا اور وہ فکری علمی اور عملی اعتبار سے مغلوب ہو گئے، اور یورپ کی ترقیات سے ا..
ہوئے کہ اپنا ماضی خود ان کی نظر میں دورِ تاریکی ہوگیا۔ مسلمانوں کو اس ذہنی غلامی سے آزاد کرنے کے لیے
ہوئیں، ان میں دارالمصنفین کا حصہ بہت اہم اور بنیادی ہے۔

یہ اکادمی مولانا شبلی نعمانی نے قائم کی۔ شبلی جدید دور کے سیاسی اور تہذیبی تقاضوں سے واقف
انھوں نے مسلمانوں کو یورپ کی ذہنی غلامی سے آزاد کرنے اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش
کو یہ بتایا کہ ان کا ماضی کا دور، دورِ تاریکی نہیں بلکہ سیاسی اور علمی ترقیات کا ایک روشن مینار ہے ا..
جو علمی ترقیات کی ہیں، ان کا سرچشمہ وہ علوم ہی ہیں جو قرطبہ اور غرناطہ کی راہ یورپ پہنچے۔

خوش قسمتی سے شبلی کو سلیمان ندوی جیسے شاگرد بھی مل گئے۔ سید سلیمان ندوی نے شبلی کے مشن
بنایا اور اسلام اور مسلمانوں پر ایسے مضامین لکھے جن کی قدر مسلم ممالک کے اہل دانش نے بھی کی اور ان ک..
دوسری زبانوں میں بھی شائع ہوئے۔

آزادیٔ ہند اور تقسیم ہند کے بعد مولانا سید سلیمان ترک وطن کر گئے۔ دارالمصنفین سے ان کی علا..

ں سے اس اکادمی کو بہت نقصان پہنچا۔ دارالمصنفین کی مطبوعات کا وہ معیار تحقیق نہ رہا، جو
رمیں تھا۔ بہرحال پھر بھی یہ اکادمی علمی خدمات کرتی رہی اور تاریخ ہند اور تاریخ اسلام پر ان کی
کتب شائع ہوتی رہی ہیں۔

شبلی علیہ الرحمہ کے سامنے مسلمانوں کو مغرب کی غلامی سے آزاد کرانا تھا، آج اس کی ضرورت ہے کہ مسلمان
بل کی تعمیر کے سلسلے میں وقت کے تقاضوں سے آگاہ ہوں۔ ایک معاشرے کے لوگوں کے لیے جہاں
ہے کہ وہ اپنے اجداد کے کارناموں سے واقف ہو، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنا مستقبل بنانے
قت کے مطالبات کو پورا کرے۔ اس مقصد کا حصول اسی طرح ممکن ہے کہ مسلمان ان سماجی علوم و افکار
ت رکھتے ہوں جن کا تعلق سماج کی تبدیلیوں اور ترقی کے سوالات سے ہے۔ افسوس ہے کہ اردو
م اور جدید افکار کی کتب سے بالکل ہی تہی دامن ہے اور اردو کے اہل قلم کی تحریریات یہ ظاہر نہیں کرتیں کہ
غلامانہ بیگی مسائل کی نوعیت سے آگاہ ہیں۔ راقم کو اپنی کم مائگی کا احساس ہے اور ملت کے دانش وروں
ہیں لب کشائی کے اس انداز سے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن بعض موقعوں پر بے باکی سے اظہار خیال، بشرطیکہ
د تعمیری ہو، ضروری ہو جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ دارالمصنفین سماجی علوم خصوصاً سماجیات اور اقتصادیات
شائع کرے۔ ان کے لکھنے والے مترجم نہ ہوں بلکہ مرتب ہوں۔ تاکہ ان کا کتب کا مطالعہ بار گراں
ے اور اردو کی کتابیں پڑھنے والے آسانی سے ان کو پڑھیں بھی اور ان سے استفادہ بھی کریں۔

حال ہی میں دارالمصنفین میں ایک ملی بین الاقوامی اجتماع ہوا۔ ایسے اجتماعات بہت مبارک ہیں۔
لمی تحقیقات کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں وہاں ان اجتماعات سے وحدت فکر بھی پیدا ہوتی ہے۔
ی مسئلہ پر غور و فکر میں مدد کرتی ہے لیکن عام طور پر مسلم دانش ور جب بھی قلم اٹھاتے ہیں تو ان
ریا بحث دور ماضی کا کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف اور تالیفات دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے
ستقبل کے مسائل ان کا کم ہی موضوع ہوتے ہیں اور کم ہی حال مستقبل کے مسائل پر ان کی بحث تکرار ہوتی ہو۔

●●

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

آپ نے حال ہی میں ہندوستان ٹائمز میں ایک تصویر دیکھی ہوگی۔ اس میں دو پولیس کے سپاہی نوجوانوں کو اپنی حراست میں لیے جا رہے ہیں۔ نوجوان اپنے چہروں پر کپڑا ڈالے ہوئے ہیں۔ غالباً اپنے کیے پر پشیمان ہیں، یا گھر والوں کی بدنامی کے خیال سے منھ چھپایا ہے۔ تصویر سے متعلق جو خبر ہے اس میں لکھا ہے کہ نوجوان ڈاکو جنھوں نے دہلی کے ایک بینک میں ڈاکہ ڈالا تھا ایک دولت مند خاندان کے چشم و چراغ ہیں سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ سب ہی ڈاکو نوجوان ہیں، تعلیم یافتہ ہیں اور خوش حال ہیں، مفلوک الحال نہیں، نہیں، نادار نہیں کہ ڈکیتی پر مجبور ہو گئے ہوں۔

بینکوں میں ڈاکے اکثر پڑتے رہتے ہیں اور یہ ڈاکو عام طور پر کھاتے پیتے گھرانوں کے تعلیم یا نوجوان ہوتے ہیں۔ ایک بار تو ایک نواب صاحب کے نورِ نظر ڈاکوؤں کے سرغنہ تھے۔ اخبار میں لکھا تھا کہ نواب صا نے فرمایا کہ اگر اتنے روپے یہ لڑکا مجھ سے مانگتا تو میں انکار نہ کرتا۔ حال ہی میں دو ڈاکے ٹرین میں بھی پڑے۔ یہ ڈ بھی نوجوان تھے۔ ممکن ہے تعلیم یافتہ بھی ہوں۔ یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور روز بروز ایسے واقعات کیوں جا رہے ہیں۔ اُن کا سبب اگر غربت و افلاس ہوتا تو خیر بات سمجھ میں آتی۔ لیکن اگر یہ صرف خطر پسند طبیعتوں کا اظہار ہے تو پھر یہ بات سوچنے کی ہے اگر فرسٹریشن ہے تو پھر یہ نفسیاتی بیماری کیوں پھیل رہی ہے؟ ایک س یہ بتایا جاتا ہے کہ حکومت کا نظام درست نہیں ہے۔ نوجوانوں کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے اس لیے وہ انتشار کا شکار ہیں اور اپنے مستقبل کے بارے میں مایوس ہیں۔ یہ خوب دلیل ہے اور اس کا کیا خوب رد عمل ہے بھی تو ایک سبب ہو سکتا ہے کہ نوجوانوں میں جوش ہوتا ہے، ولولہ ہوتا ہے۔ ان کی خطر پسند طبیعت کو تسکین فرا ہے۔ ڈاکہ زنی، اغوا، ان کے جوش کی تسکین کا ذریعہ ہیں۔ لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ آخر مایوسی ہو یا جذبات کی تسکین مقصود ہو، اس کے لیے ڈاکہ زنی، قتل و غارت گری، اغوا، آبرو ریزی کیوں ہو؟ یہ سوالات ہمارے قو کے سوچنے کے لیے ہیں، ماہرینِ تعلیم کے غور و فکر کے ہیں، ملک کے دانش وروں کی بحث مباحثوں کے لیے ہیں قدر جلد یہ سب حلقے مل جل کر سوچیں اور ان نوجوانوں کی بے راہ روی کا علاج تلاش کریں، اسی قدر اچھا ہو رات کا چین اور دن کا سکون خطرے میں ہوگا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ سینما نے یہ سبق عام کیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا کہ سینما نے جرم کے ذوق کی پرورش کی ہے۔ لیکن یہ کہنا کافی نہ ہوگا۔ اگر واقعہ یہ ہے تو اس کا تدارک کا

ں نہیں؟ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے اور ان کا علاج تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک زمانہ میں کچھ اخلاقی قدریں تھیں ان کا احساس کسی نہ کسی قدر سب کو ہوتا تھا۔ لوگ ان کا احترام
تے تھے، ان کو توڑنے میں شرم محسوس کرتے تھے۔ اب وہ دور گیا۔ اخلاقی قدروں سے انکار ایک عام بات ہے۔
ان کی اہمیت سے عوام بھی منکر ہیں اور دانشور بھی۔ اخلاقی قدریں کچھ ہی ہوں ان کی اہمیت آپ تسلیم کریں یا نہ
یں لیکن یہ بات ہر شخص کو تسلیم کرنی پڑے گی کہ ایک شہری کو دوسرے شہری کا خیال ہونا چاہیئے۔ یہ اگر نہ ہوگا تو
معاشرے میں امن وسکون کیسے رہے گا۔ بالکل سیکولر نقطۂ نظر سے اس مسئلے کو دیکھیے۔ بھائی، بہن، عزیز، اقربا،
دوسی، راہ گیر کا ہر شخص اگر کچھ نہ کچھ خیال نہ رکھے تو معاشرے کی عمارت منہدم ہوجائے گی۔ سڑکوں پہ بے روک ٹوک
بلڑے ہوں گے، کسی کی جان کے تحفظ کا سوال ہی باقی نہ رہے گا۔ ہر شخص ایک دوسرے کی جیب کترے گا اور اپنی
مفاد برآری کے لئے ہر کام کرنے کے لئے تیار رہے گا۔

اسلام نے شہری حقوق کو خاص اہمیت دی ہے اور ان کا تحفظ ہر مسلمان پر لازم قرار دیا ہے۔ شہری
حقوق ایک جدید اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب ماں، باپ، بہن، بھائی، پڑوسی، راہ گیر سب ہی ہیں۔ ہماری حکومت
سیکولر ہے، گویا قومی معاملات میں کسی خاص مذہب کی پاسداری نہیں کرتی۔ حقوق کے مسئلے کو آپ بچوں کو سیکولر
نقطۂ نظر سے ذہن نشین کراسکتے ہیں۔ بنیادی بات یہی ہے کہ آپ اخلاقی قدروں کو اہمیت دیں۔ ان کا احترام
کریں۔ جس قدر ان اقدار کی اہمیت آپ کریں گے ملک میں جرائم کا ارتکاب کم ہوگا۔ لیکن اگر آپ اخلاقی قدروں
کو اہمیت نہیں دیتے تو کوئی اور راہ تجویز کیجیے، جس سے ملک میں جرائم کم ہوں اور ہندوستان کے شہری
پرسکون زندگی بسر کرسکیں۔

●●

(۹)

نشہ آور چیزوں کا استعمال

چند روز ہوئے ہندوستان ٹائمز میں امریکہ کے جو
دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند اور ترقی یافتہ
شمار کیا جاتا ہے، موٹر کے حادثوں میں مرنے والوں کے اعداد شمار شائع ہوئے تھے اور اس کی وضاحت
کی گئی تھی کہ یہ حادثے شراب کے نشے میں بدمستی کے عالم ہوتے ہیں۔ اس خبر کی تفصیلات دیکھ کر ہمیں یہ ڈر ہوا
کہ کہیں ہندوستان بھی چند سال میں امریکا کا ساتھی نہ ہوجائے اور اس کو مات دیکر اس سے آگے نہ بڑھ جائے۔
انسان شراب، سگریٹ اور نشہ آور چیزیں غالباً اس لیے استعمال کرتا ہے کہ وہ اس دنیا کی کشمکش کی زندگی کا
بوجھ برداشت نہیں کرسکتا۔ اور تکان اتارنے کے لئے وہ نشہ آور چیزیں خصوصاً شراب پیتا ہے اور چند

گھنٹے کے لیے دنیا کے کاروبار کے بوجھ کو بھلا کر تسکین حاصل کرتا ہے۔ مذہب نے دنیا کی ان الجھنوں اور بوجھ کو کم کے لیے عبادت کا تصور پیش کیا ہے اور عبادت کرنے کی تعلیم دی ہے۔

عبادت کا یہ ایک اہم فائدہ ہے کہ انسان جو دنیا کی بہت سی الجھنوں میں پھنس کر بہت سی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اس سے بچنے کے لیے ان علائق کو بھول جائے اور خدا کی طرف متوجہ جائے۔ خدا پرستی اور عبادت سے زندگی کی کشمکش بھلانا ممکن اس وقت ہوتا ہے جب عبادت خلوص اور سنجیدگی سے ہو، ورنہ یہ ایک بے لطف رسم ہو کر رہ جاتی ہے۔ البتہ اگر کوئی اس کو جاری رکھے تو زندگی ایک دَور میں سکون حاصل کر سکتا ہے۔ دوسری صورت میں زندگی کی کشمکش خودکشی تک انسان کو لیجا سکتی ہے زندگی میں نشہ آور کھانے پینے کی چیزوں کا عادی ہونا ایک متوسط طبقہ کے آدمی کو مالی مشکلات میں ڈال دیتا ہے جس سے زندگی کی تلخی اور بڑھ جاتی ہے اور سماجی زندگی میں انتشار اور پیدا ہو جاتا ہے خانگی زندگی کی خوشیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ میاں بیوی کے تعلقات خراب ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی الجھن سکون حاصل کرنے کا یہ طریقہ زندگی کو اور تلخ کر دیتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ آدمی عبادت کے ذریعہ زندگی کی تلخیوں کو بھلانے کی کوشش کرے۔

شراب نوشی مسلمانوں میں بھی خاصی مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کی اصلاح کی طرف مذہبی تنظیمیں بھی کم ہی متوجہ ہیں۔ واعظ اپنی شعلہ بیانی کی داد حاصل کرنے کا زیادہ خواہش مند ہوتا ہے عوام کی اصلاح کی طرف کم متوجہ ہوتا ہے۔ مذہبی تنظیمیں کتابیں لکھنے اور چھاپنے میں زیادہ دلچسپی لیتی ہیں اور یہ نہیں دیکھتیں کہ کتنے لوگ ان کو پڑھتے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ راقم کے خیال میں ہونا یہ چاہیے کہ چھوٹے چھوٹے رسالے نشہ آور چیزوں کے استعمال کے خلاف لکھے جائیں اور اُن میں دینی نقطۂ نظر سے بحث کے ساتھ سماجی اور طبی نقطۂ نظر سے بھی بحث ہو تاکہ جذبات، ایمان اور عقل سب کو اپیل کیا جائے۔ غیر مسلموں کے لیے بھی رسالے مرتب کیے جائیں۔ ان میں صرف طبی، سماجی اور اقتصادی پہلو سے بحث کی جائے۔ یہ کتابچے بطور ایک تحریک کے سب میں بانٹے جائیں اور تقریریں بھی کی جائیں اور پسماندہ لوگوں کی نشہ آور چیزوں کی عادت کے چھڑانے کی کوشش کی جائے اور ایسے ہی غیر مسلم جماعتوں کے ساتھ مل کر کام کیا جائے جو نشہ آور چیزوں استعمال کے خلاف کام کر رہی ہوں۔ یہاں سوال ہندو مسلمان کا نہیں، سوال ہندوستانی معاشرہ کا ہے۔

●●

۱۰

خطبۂ جمعہ

ایک مسلمان صحافی کا کسی غرض سے علی گڑھ آنا ہوا۔ اس روز جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز انھوں نے یونیورسٹی کی مسجد میں ادا کی تو دیکھا کہ امام مسجد نے خطبہ عربی میں پڑھا۔ ان کو خطبہ سُن کر تعجب ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اب تک مسلمانوں کی اِس عظیم دانش گاہ میں عربی خطبہ لوگوں کو ہر جمعہ کو سُنایا جاتا ہے، کس کی سمجھ میں کیا آتا ہوگا؟

سُنا ہے کچھ عرصہ ہوا حجاز سے عرب علماء کا ایک وفد ہندوستان آیا۔ جمعہ کے روز جامع مسجد میں امام کو عربی خطبہ پڑھتے سُنا تو اپنے ہندوستانی رفقاء سے تعجب سے پوچھا کہ یہ عربی کا خطبہ لوگوں کو کیوں سنایا جاتا ہے؟ ان کے رفقا کیا جواب دیتے۔ اُن سے یہی کہتے بنا کہ امام مسجد عام طور پر کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور ہر جمعہ کو اپنے مقتدیوں کو خطاب نہیں کر سکتے۔ حجازی وفد کے لوگ متعجب ہوئے۔ لیکن خاموش ہو گئے۔

عرصہ ہوا دینی حلقوں میں یہ سوال زیر بحث رہا تھا کہ جمعہ کا خطبہ 'اُردو' میں ہونا چاہیئے' عربی میں نہیں حسب دستور اس کے جواز اور عدم جواز پر بحث چھڑی اور بے نتیجہ رہی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ جو لوگ اُردو میں خطبہ دینے کے مؤید تھے انھوں نے جمعہ کے خطبے اردو میں طبع کرا کر تقسیم کیے اور یہ اپیل کی کہ جمعہ کے دن پہلا خطبہ ان خطبات میں سے پڑھ دیا جائے۔ ایک سلسلہ یہ بھی شروع ہوا کہ خطبہ کی اذان سے قبل پانچ دس منٹ پہلے ایک مختصر وعظ ہو جائے۔ مسئلہ کا یہ حل کچھ مقبول ہوا لیکن زیادہ نہیں۔ مسلمانوں میں کوئی دینی انجمن ایسی نہیں ہے۔ جو ان کے اصلاحی کاموں میں دلچسپی لے، اصلاحی اقدامات کرے اور وہ مسلمانوں کو قبول بھی ہوں۔ علما کی ایک تنظیم ضرور ہے لیکن وہ دینی خدمات سے زیادہ سیاسی اور سماجی کام کرتی ہے اور وہ بھی گاہے گاہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، جن کو مسلمان ابھی بھولے نہ ہوں گے، بڑے روشن خیال اور بڑے روشن ضمیر عالم دین تھے۔ انھوں نے اردو میں خطبہ کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ عیدین کی نماز کلکتہ کے مشہور میدان میں پڑھایا کرتے تھے اور خطبہ اردو میں دیتے تھے۔ یہ سلسلہ برسوں رہا۔ ۱۹۳۸-۳۹ء میں مولانا نے اپنے محلہ کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھانے اور خطبہ اردو میں دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا پہلا خطبہ اردو میں دیتے تھے۔ حمد و ثنا کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ خطبہ کا وقت کم ہوتا ہے۔ یہ فرما کر وہ ہمیشہ شب و روز کے معاملات میں سے کسی مسئلہ کا انتخاب کرتے اور بڑی خوبی سے اس کی وضاحت چند منٹ میں کر دیتے۔ وہ سیاسی لیڈر تھے

لیکن جمعہ کے خطبہ میں کبھی کوئی سیاسی مسئلہ نہ چھیڑتے، نہ کسی اختلافی پر بولتے۔ افسوس کہ یہ سلسلہ مولانا کی صحت کی خرابی اور سیاسی معروفیات کی بنا پر پابندی سے جاری نہ رہا۔

مولانا نے جس مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھانی شروع کی وہ ان کے مکان کے بہت قریب تھی اور علاقہ میں ایک ہی مسجد تھی۔ مسجد کے امام کا بیان ہے کہ ایک بار مولانا جمعہ کے روز نماز جمعہ کے لیے تشریف لا[ئے تو] مسجد کے امام نے اُن سے نماز پڑھانے کی درخواست کی تو یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔

جس روز مولانا نے پہلی بار وہاں نماز پڑھائی، مسجد میں بہت تھوڑی تعداد میں نمازی تھے لیکن خبر کہ مولانا نماز پڑھاتے اور خطبہ اردو میں دیتے ہیں مسلم محلوں میں پھیل گئی اور پھر نمازیوں کی تعداد بڑھنی شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ سڑک پر صف بندی کی نوبت آگئی۔ لیکن افسوس کہ یہ سلسلہ جلد منقطع ہو گیا۔

مسلم معاشرہ کی بنیاد گو ایک دین پر ہے، لیکن مسلمانوں کی زندگی پر — اثرات عہد وسطیٰ قوموں کی تہذیب کے ہیں۔ غالباً یہی سبب ہے کہ لوگ دین کی روح اور مقصد کو اہمیت کم دیتے ہیں اور اس جمود شکار رہتے ہیں، جو اس عہد کی خصوصیت ہے اور زندگی میں تبدیلی اور اصلاح آسانی سے قبول نہ دین زندگی کو بدلنا چاہتا ہے۔ تہذیب و معاشرت کی عادتیں جمود پیدا کرتی ہیں۔ مسلم میں یہ کشمکش صدیوں سے جاری ہے۔ عربوں میں اب تک قومی عصبیت ہے، دین کی تعلیم خواہ کچھ ہی ہو ہندوستان میں مائکروفون کا استعمال شروع ہوا۔ لیکن یہ آلہ مسجد میں برسوں داخل نہ ہوا۔ اب صرف اذان کے لیے مائک کا جواز ہے۔ نماز مائک پر ادا کرنا اب بھی ناجائز ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں نماز ادا کرنے کے دوران بھی مائک استعمال ہوتا ہے۔ نمازی امام کی آواز سنتے ہیں تو کچھ نہ کچھ استفادہ کرتے ہیں۔ خطبہ جمعہ عبادت کا جز ہے، اس کا مقصد نمازیوں کی اصلاح ہے۔ لیکن اس مقصد کی اہمیت احساس ہی نہیں۔ توجہ ایک رسم ادا کرنے کی طرف ہے، وہ ہوتی جاتی ہے: ؏ "خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات" اقبالؔ نے کس زندگی کو کہا ہے!!

مولانا محمد اسمٰعیل شہید کا ایک واقعہ

[ہندوستان میں آٹھ سو سال مختلف مسلم خاندانوں کی حکومت رہی ہے۔ شاہی دربار میں علما بھی ہوتے تھے ان کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے فتوے دیتے تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس وقت بڑے حق گو علما بھی ہوتے تھے وہ عام طور پر دربار سے دور رہتے تھے اور اگر دربار سے ان کا تعلق ہوتا تھا تو بھی حق گوئی سے وہ کبھی گریز نہ کرتے تھے۔ مغلیہ حکومت کے آخری دور میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے خاندان کی نمایاں حیثیت تھی۔ شاہ اسماعیل شہید کا اسی خاندان سے تعلق تھا۔ شاہ صاحب بالاکوٹ کی سرحد پر شہید ہوئے۔

(قاضی معز الدین احمد)]

حضرت مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ جامع مسجد دہلی میں مع اپنے عقیدت مندوں و شاگردوں کے وضو کے حوض کے پاس تشریف رکھتے تھے کہ لاتے میں "اکبر شاہ ثانی" کی زیارت کے لیے جامع مسجد کے ایک گوشہ سے جو چیزیں تبرکات کے نام پر برآمد کی گئیں۔ ان غیر مستند تبرکات کو مجاورین ایک مقدس نمائش کی شکل سے لال قلعہ بغرض زیارت کے لیے لے جایا کرتے تھے چونکہ ان تبرکات کی کوئی حقیقت حدیث سے ثابت نہ تھی اس لیے باوجود سب لوگ سروقد باادب کھڑے ہوئے مگر حضرت مولانا مع اپنے حلقہ ارادت کے اسی حوض پر بدستور بیٹھے رہے۔

مجاورین ان رسمی تبرکات کو لے کر اکبر شاہ ثانی کے حضور میں پہنچے۔ شاہ اور دربار کے وزرا و امرا نے سروقد باادب ہو کر تعظیم کی اور زیارت سے مشرف ہوئے۔ اسی اثنا میں مجاورین نے شاہ کی عقیدت مندی کے پیش نظر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا۔ بادشاہ نے جب دریافت کیا کہ آپ لوگ کیوں روتے ہیں، کیا معاملہ پیش آیا، تو اور بھی بناوٹ کے ساتھ رونا شروع کیا۔ آخرش بادشاہ کے دوبارہ سہ بارہ سوال پر بتلایا کہ حضور ظل سبحانی عالم پناہ سلامت! ان تبرکات کی تو از حد توہین ہو گئی۔ پوچھا کہ وہ کیسے؟ مجاورین نے کہا کہ جب تبرکات آپ کے حضور میں لائے جا رہے تھے تو ساری خدائی نے تعظیم دی مگر شاہ عبدالعزیز کے خاندان میں ایک شخص مولوی محمد اسماعیل نامی ہیں نہ انھوں نے تعظیم دی نہ اُن کے ساتھ بیٹھے ہوئے ان کے شاگردوں نے تعظیم دی۔ بادشاہ نے مجاورین کو تسلی دی کہ اس معاملہ کو سمجھ کر اس کا تدارک کیا جائے گا۔ چنانچہ بادشاہ نے شاہی ہرکارہ کے ذریعہ

خط بھیج کر مولانا کو طلب کیا۔ جس وقت دربار میں سے طلبی کا خط چوبدار کی معرفت آیا تو خاندان و
باہم مشورہ کیا کہ اس کی اطلاع انگریزی ریزیڈنٹ کو کر دی جائے تاکہ بادشاہ کوئی گزند پہنچا سکے
زمانہ میں اس کی سلطنت برائے نام تھی اور انگریزی کمپنی کے ریزیڈنٹ عملاً حاکم تھے۔ بنا بریں بادش
قتل کرنے یا پھانسی دینے یا کسی کو جاگیر وظیفہ دینے کے اہم معاملے میں تنہا مختار نہ تھا۔ مولانا نے اس
میں فرمایا کہ اس کی اطلاع کی کوئی ضرورت نہیں اور یہ آیت کریمہ تلاوت کی: قُل لن یصیبنٓا
کتبَ اللہ لنا وھو مولانا وعلیہ فلیتوکل المومنون ٥ (توبہ) یعنی جس ق
تکلیف مقدر ہے وہ چیز پہنچ کر رہے گی۔ وہ ہم سب کا آقا ہے اور اس پر ایمان والوں کو بھروسا
چاہیئے۔ چنانچہ مولانا نے بلا کسی اطلاع کے شاہی دربار کی حاضری کو منظور فرما کر شاہی چوبدار کو
دیا۔ اس میں یہ بھی لکھا کہ شاہی آداب وقیود کی پابندیوں سے معافی چاہتا ہوں۔ صرف اسلامی طر
مسنون پر اکتفا کروں گا۔ یہ خط روانہ کر کے مولانا تھوڑی دیر بعد لال قلعہ میں تشریف لے گئے۔ بادشا
دربار برخاست کر چکے تھے۔ اندر آپ نے اپنی آمد کی اطلاع کرائی۔ بادشاہ نے وہیں خلوت خا
فرمایا۔ مولانا نے اسلامی طریقہ پر السّلام علیکم فرمایا۔ اس کے بعد ہی بادشاہ کے پاس ایک صوفے پر
ہو گئے۔ بادشاہ نے اوّل تو تشریف آوری پر اظہار خوشی فرمایا۔ اس کے بعد کہا کہ میں جناب کی ز
سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل ومناقب سُننا چاہتا ہوں۔ آپ نے حکم شاہی کی تعمیل ک
سوز جگر اور گداز قلب کے ساتھ وعظ فرمایا کہ اکبر شاہ ثانی بہت متاثر ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ و
فضائل اور عملی مجاہدات پر بے اختیار رونے لگا۔ ہر چند چاہتا تھا کہ نہ روئے اور رونے کی آواز پ
لیکن یارائے ضبط باقی نہ رہا۔ جب بادشاہ رو دھو کر خاموش ہوا تو اس نے کہا کہ مولانا جب حضرت ر
فضائل ومحاسن آپ کے قلب مبارک میں اس قدر ہیں کہ آپ خود بھی ان کے اثر سے روتے ہیں او
کو بھی رُلاتے ہیں تو پھر آپ نے حضورؐ کے تبرکات کی تعظیم کیوں نہیں کی؟ فرمایا وہ چیزیں سرے
ہی نہیں ہیں۔ بادشاہ اس پر بہت چکرایا اور کہنے لگا کہ یہ کس طرح؟ فرمایا بخاری شریف اور قرآن
منگوا لیجیے۔ جب دونوں چیزیں بادشاہ کے حضور میں لا کر رکھ دی گئیں، تو مولانا نے فرمایا غور فرما
تبرکات یعنی نعلین مبارک یا موئے مبارک وغیرہ کے نام سے جو چیزیں آپ کے سامنے ملاحظہ کے لیے آئ
وہ حضورؐ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اوّل تو ان کے متعلق یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی کہ وہ واقع

ملی ہی چیزیں تھیں، یا محض رسمی طور پر کمانے کھانے والوں نے حضورؐ کی طرف منسوب کر کے ظاہر کیے تو ان
ر اٹھایا جاتا ہے۔ دوسرے اگر آپ خود بھی دراصل ان کو تبرکات سمجھتے ہو اور زیارت کے قابل گردانتے
دہ کر زیارت کرتے۔ یہ چیزیں آپ کی زیارت کے لیے جامع مسجد سے اٹھا کر نہ لائی جاتیں۔ پیاسا کنوئیں کے پاس
ہے، کنواں پیاسے کے پاس نہیں آتا۔ تو اگر زیارت کی پیاس اور حقیقی اشتیاق تھا تو آپ جامع مسجد جا کر خود
کر لیتے۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہ بخاری شریف رسول اکرمؐ کی قولی و فعلی
ری احادیث کا صحیح ترین مجموعہ ہے۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان فرمودات کی نسبت حقیقتاً
۔ وغیرہ درست ہے اور اسی طرح کلام پاک واقعتہً حق تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس میں ایک ذرہ برابر شک نہیں۔
آپ نے بخاری شریف اور قرآن کریم کی آمد پر کوئی تعظیم نہیں کی۔ نہ سرو قد کھڑے ہوئے اور نہ اس کی زیارت
یہ کوئی آداب بجا لائے۔ پس حقیقی اور واقعی چیزوں کی تعظیم آپ نے نہیں کی۔ لیکن جو چیزیں بال و
۔ منا وغیرہ ایسی ہیں کہ ان کا حضورؐ سے واقعی تعلق ہونا ثابت نہیں کیا جا سکتا، ایسی جعلی و رسمی چیزوں کی
آپ نے تعظیم کی۔

بادشاہ نے ان باتوں کو غور و توجہ سے سنا اور بڑا متاثر ہوا۔ آخر میں مولانا نے بادشاہ کو ایک اور منکر امر کی طرف توجہ دلائی
آپ نے کنگن اپنے ہاتھ میں کیوں پہن رکھے ہیں؟ حالانکہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اظہار بیزاری فرمایا ہے اور مردوں
کے لیے اس کا استعمال کرنا حرام ٹھہرایا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ حضرت مولانا! میرے دربار میں بہت سے علما ہیں مگر آج تک کسی نے یہ فرمان
مجھ کو نہیں سنایا۔ اچھا ہوا تھا۔ اب میں اس کو نکالتا ہوں اور نکالنے میں آپ بھی میری مدد کریں۔ دونوں کنگنوں کو بادشاہ نے نکال
کر زمین پر رکھ دیا۔ جب کنگن علیحدہ ہو چکے تو بادشاہ نے فرمایا کہ ان کنگنوں کو اپنے ہمراہ لیتے جائیے اور غریبوں میں تقسیم کر دیجیے۔ حضرت
مولانا نے فرمایا کہ آپ کے دربار کے علما اس پر کہیں گے کہ اسماعیل آیا تھا اور شاہی کنگنوں کو اینٹھ لے گیا۔ آپ خود جن کو مناسب
سمجھیں انہیں تقسیم کرا دیجیے۔ چنانچہ مولانا ایک پر وقار حالت میں لال قلعہ سے نکلے اور شاہی سواری پر سوار ہو کر مکان پہنچے۔ اس کے
بعد بادشاہ نے ایک پر تکلف خوان اور کپڑوں وغیرہ کے تحائف کو چوبداروں کے ذریعہ سے حضرت مولانا کے مکان پر بھیجا۔

مولانا شہید اپنے اوصاف کی روشنی میں مولانا سے زیادہ ایک سپاہی، ایک مجاہد معلوم ہوتے ہیں۔ ہمہ وقت قرآن
اور تلوار گلے میں حمائل رکھتے تھے۔ آپ کے ایمان افروز بدعت شکن مواعظ سے دہلی اور اطراف دہلی میں ایک غلغلہ گونج رہا تھا۔
انہوں نے کتاب و سنت اور توحید و رسالت کی صحیح عظمت و محبت سے سب کو آشنا کیا۔ آپ کے دلکش بیانات اور مستانہ
نعروں سے فضائے ہند کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا۔ آپ نے توحید و رسالت کی صحیح عظمت و محبت سے سب کو آشنا
کیا۔ آپ کی دلکش تعلیمات کا ایک مجموعہ "تقویۃ الایمان" موجود ہے جس نے نذر و نیاز اور قبر پرستی وغیرہ سے سب کو روک
کر توحید و رسالت" کے عقائد صحیحہ کی طرف پوری دنیا کی رہنمائی کا فرض انجام دیا ہے۔

روزگار اور مسلم نوجوان

مسلم نوجوان کی بیروزگاری کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ مسلمانوں کی توجہ حل کرنے کی طرف کم اور اس کو اُچھالنے کی طرف زیادہ ہے۔

ہندوستان میں بیروزگاری کی شکایت عام ہے۔ مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہندو نوجوان بے روزگار ہیں۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ مسلم نوجوان اپنے بیروزگاری کے مسئلہ حل کرنے کی طرف متوجہ نہیں، ہندو نو متوجہ ہیں اور محنت کرکے اس کو حل کرنا چاہتے ہیں۔

یہ تو حقیقت ہے کہ سرکاری دفاتر میں، پرائیوٹ کاروبار میں، بینکوں میں مسلمان بہت کم لیے جا ہیں اور قابل مسلمان مل جائیں تو بھی ان کو نہیں لیا جاتا اور چونکہ بہت کم لیے جاتے ہیں اس لیے وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ مسلمان محنت کریں اور حصول معاش کے لیے جد کریں۔ مایوس نہ ہوں اور شکایت کرنے کی عادت نہ ڈالیں۔ اسی طرح ایک نوجوان نفسیاتی الجھنوں سے آ رہ سکتا ہے اور اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ حال ہی میں انگریزی کے اخبارات میں عرب ممالک م ملازمتوں کا اشتہار نظر سے گزرا۔ اس میں ٹائپسٹ اور مختصر نویس کی ملازمت سے لگا کر معمولی مستری کی ملاز تک متعدد جگہوں کے لیے درخواستیں طلب کی گئی تھیں۔ لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ ان جگہوں کے لیے مسلمان د کنندگان بہت کم تھے۔ بیشتر غیر مسلم ہی تھے۔ ٹائپسٹ اور مختصر نویس کی ہر دفتر میں ضرورت ہوتی ہے اور جیسا ہندوستان میں اور عرب ممالک میں ان کی بہت ضرورت رہے گی۔ لیکن مسلمان نوجوان اس کام کو بہت کم سیکھتے حالانکہ تھوڑے عرصہ میں یہ کام سیکھا جا سکتا ہے اور معقول آمدنی کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح بجلی کے مختل قسم کے کاموں سے واقفیت رکھنے والوں کی ضرورت ہر جگہ ہے۔ مسلمانوں کی اس میدان میں بھی بہت کمی ہے۔ مسلما کی مالی حالت اتنی خراب نہیں جتنی کہ خیال کی جاتی ہے۔ مسلمان دستکار ہیں اور دسیوں قسم کے کام کرتے ہیں ا بہت پیسہ پیدا کر لیتے ہیں۔ دہلی میں مسلمان کاریگر ٹی وی سیٹ بناتے ہیں اور دسیوں ٹرانزسٹر بناتے ہیں۔ بجل پنکھے بناتے ہیں اور دسیوں چھوٹی موٹی چیزیں بنا کر پیسہ پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح علی گڑھ میں کاریگر مسلمان

اری مالکان کارخانہ، بڑے بڑے تاجر بھی بہت سے مسلمان ہیں۔ البتہ مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ایسا ہے کو بیروزگاری کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور وہ پریشان حال رہتا ہے۔ اس گروہ کے نوجوانوں کو ملازمت کی جگہ دستکاری کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

ایک دوست نے اپنا ایک قصہ سنایا وہ آپ کی دلچسپی کے لیے یہاں لکھتا ہوں۔ یہ صاحب مسلم یونیورسٹی میں ہیں اور معقول تنخواہ پاتے ہیں۔ ان کا ایک قریبی عزیز دستکار ہے اور کاروبار کرتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ایکبار عزیز نے ان سے پوچھا کہ ان کی ماہانہ آمدنی کیا ہے؟ انھوں نے اس کو اپنی تنخواہ بتائی تو وہ ہنسا اور بولا، اتنی تو ایک دن میں پیدا کر لیتا ہوں۔

دراصل ہمارا نظام تعلیم اصلاح طلب ہے۔ ہر شخص کو اعلیٰ تعلیم کی طرف رخ نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ ثانوی کے بعد روزگار کے لیے کوئی کام سیکھنا چاہیے۔ پھر اگر کالج کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کر لی ہو تو بھی دستکاری اور کاروبار کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ ملازمت سے ایک نوجوان کو جو آمدنی ہوگی اس سے کہیں زیادہ کاروبار سے ہو جائیگی۔

مسلمانوں کے پسماندہ طبقوں میں دستکاری عام تھی۔ پھر آزادیٔ ہند کے بعد ایسے گھرانوں کے نوجوانوں نے تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم تک پہنچ گئے۔ بی اے کیا۔ ایم اے بھی کیا اور پھر گھر کے کاروبار میں لگ گئے۔ اب ان میں بہت سے لکھ پتی ہیں ملازمت پیشہ "بابو" صاحبان کو خاطر میں نہیں لاتے۔ دہلی میں ایک نہیں دسیوں لوگ ایسے ہیں جو یوپی یا بہار کے کسی مقام سے آئے۔ پہلے کسی دوکاندار کے ہاں ملازمت کر لی۔ پھر خود کاروبار کرنے لگے اور خوشحال ہو گئے اور دہلی ہی نہیں ایسے نوجوان ہر جگہ ہیں۔

مسلم نوجوانوں کو مایوس نہ ہونا چاہیے۔ ملازمت کی طرف رخ نہ کرنا چاہیے۔ ملازمت کرنا ہو تو پھر مقابلہ کے امتحان میں لازماً شریک ہونا چاہیے۔ بہتر یہ ہے کہ کاروبار اور دستکاری کی طرف رجوع کیا جائے۔

مسلمانوں میں اپنی کم مائیگی اور پسماندگی کا بڑا احساس ہے۔ لیکن اس کے علاج کی طرف توجہ نہیں۔ لیڈر صاحبان جو ایم پی یا ایم۔ ایل۔ اے ہیں وہ بھی تعمیری کاموں میں اپنا وقت صرف نہیں کرتے چھوٹے موٹے کاموں میں الجھے رہتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ ہر ریاست میں کم از کم ایک صنعتی انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے جن میں دسویں درجوں تک پڑھے لکھے نوجوانوں کو صنعتی تربیت دی جائے۔ اگر ایسے دو چار انسٹی ٹیوٹ بھی قائم ہو گئے، تو بہت سے مسلمان نوجوانوں کا بے روزگاری کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

●●

شیخ صاحب کی یادیں

شیخ محمد عبداللہ نے ۸ ستمبر کو داعی اجل کو لبیک کہا اور اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اللہ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ شیخ صاحب کے انتقال سے ملک میں ایک خلا پیدا ہو گیا جس کو مدتوں میں بہت محسوس کیا جائے گا اور ہر مشکل کے موقع پر وہ یاد آئیں گے۔ اب کوئی باوقار اور جرأت مند رہنما نہ رہا جو ان کے معاملات پر بے خوف اظہار خیال کرے اور جس کی آواز میں طاقت ہو اور جس کو دنیا سننے کے لیے تیار بھی ہو اور مجبور بھی۔

ہمارے دل میں ترکمان دروازہ دہلی کی یاد ابھی تازہ ہے۔ اس علاقہ کے مظلوموں کی آہیں ابھی فضا میں گونج رہی ہیں۔ شیخ عبداللہ ہی تھے جن کی للکار نے بلڈوزر کا رخ پھیر دیا تھا اور دہلی والوں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ شیخ صاحب مرحوم کی تمام زندگی ملک، مسلمانوں اور جموں و کشمیر کے عوام کی خدمت کرنے میں گزری۔ وہ اپنے وطن کے عوام کے حقوق کے تحفظ کے لیے انگریزوں کی حکومت کے دور میں ریاست مہاراجہ کی سرکار سے لڑتے رہے اور آزاد ہندوستان میں جموں و کشمیر کے عوام کی ترقی اور ریاست کی تعمیر میں مصروف رہے اور ہزاروں تکلیفیں برداشت کیں اور ایک غلط فہمی کی بنا پر جیل کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔

گو شیخ عبداللہ کی زندگی جموں و کشمیر کے لوگوں کی خدمت کے لیے وقف رہی، لیکن مسلمانوں کا جب بھی کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا تھا، اس کو حل کرنے میں شیخ صاحب مدد کرتے تھے۔ شیخ صاحب ایک خوش عقیدہ دین دار آدمی تھے، لیکن سیاسی مسائل پر سیکولر نقطۂ نظر رکھتے تھے۔

شیخ عبداللہ کے رگ و ریشہ میں کشمیری خون دوڑتا تھا۔ وہ یہ نہ بھولے تھے کہ ماضی میں جموں و کشمیر کے عوام کے ساتھ کتنا ظالمانہ سلوک روا رکھا گیا تھا اور ان غریبوں نے برسہا برس کس غربت و افلاس میں زندگی گزاری تھی اور اب بھی گزار رہے ہیں اور ان کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ کشمیر کا مستقبل اسی وقت روشن رہے گا جب وہ ہندوستان جیسے اور طاقت ور ملک کا جزو رہے گا۔

آزاد ہندوستان میں اس کے امکانات بہت تھے کہ ملک کے تاجر اور سرمایہ دار ریاست جموں کشمیر کی طرف متوجہ ہوں، وہاں کارخانے قائم کریں اور تجارت کریں۔ ایسا ہوتا تو ملک کے سرمایہ دار تو اور دولت مند ہو جاتے، غریب اور پسماندہ جموں اور کشمیر سے غربت و افلاس کا دور ختم نہ ہوتا۔ اسی بنا پر شیخ صاحب نے تمام اقدامات کیے جو ریاست کی ترقی میں معاون ہوں اور ان تجاویز کی مخالفت کی جو جموں و کشمیر کے لوگوں کی فلاح و بہبود کی رفتار میں رکاوٹ پیدا کریں۔ جموں و کشمیر کی ہندوستان میں ایک مخصوص حیثیت، ریاست میں سیاسی تنظیم نیشنل کانفرنس کو باقی رکھنے پر اصرار اور بہت سی پابندیاں جو جموں اور کشمیر کی حکومت نے لگائیں، اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ جموں اور کشمیر کے لوگ خود اس قابل ہو جائیں کہ اپنے کارخانے چلائیں، خود تجارت کریں اور ریاست کی قدرتی و معدنی دولت سے خود استفادہ کرنے کے قابل ہو جائیں اور جب یہ غیر ذمہ دارانہ فضا نہ رہے، تب کہیں وقت آئے گا کہ ہندوستان میں وہ اپنی مخصوص حیثیت ترک کریں، اس سے پہلے نہیں۔

شیخ صاحب رہائی پا کر دہلی میں ایوانِ غالب کے قریب مقیم ہیں۔ اس دور میں انھوں نے مسلم رہنماؤں سے گفتگو کی اور مسلمانانِ ہند کی فلاح و بہبود کے مسئلہ پر ان سے تبادلۂ خیال کیا۔ یوسف صدیقی صاحب مرحوم جو انگریزی کے "ریڈینس" ہفت روزہ کے ڈائرکٹر، اڈیٹر اور بڑے سرگرم ملی کارکن تھے، انھوں نے مسلم مجلس مشاورت کا جلسہ بلانے کے لیے دہلی کے کارکنوں کو شیخ صاحب کی کوٹھی پر مدعو کیا۔ شیخ صاحب نے حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ بڑے افسوس اور شرم کی بات ہے کہ ملک میں مسلمان خاصی بڑی تعداد میں یہاں ان کا ایک شاندار ماضی رہا ہے، ان کی عظیم تہذیب رہی ہے، ان کی کافی بڑی تعداد اس ملک میں آباد ہے، ہر اعتبار سے وہ ملک میں ایک حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا کوئی ایسا مرکز نہیں، جہاں سے ان کے مسائل کے بارے میں، ان کی تاریخ کے بارے میں اور تہذیب و تمدن کے بارے میں اگر کوئی معلومات حاصل کرنا چاہے، تو حاصل کر سکے۔ اس مرکز کی ایک وسیع عمارت ہو، وہاں ایک لائبریری ہو۔ مہمانوں کے لیے ایک مہمان خانہ ہو۔ طلبا کے لیے ایک ہوسٹل ہو۔ وسیع ہال جلسوں کے لیے ہو۔ اور ایک دفتر ہو جہاں سے مسلمانوں کے بارے میں ہر قسم کی معلومات حاصل ہو سکے۔ شیخ صاحب مرحوم نے مختصر تقریر میں اس اسلامی مرکز کی تفصیلات پر روشنی ڈالی۔ شیخ صاحب کی تقریر نے سب کو متاثر کیا۔ شیخ صاحب نے حاضرین کو اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا: شیخ صاحب! یہ اسکیم تو بہت اچھی ہے،

لیکن اس کو عملی جامہ کون پہنائے گا؟ آپ خود اس کام کو ہاتھ میں لیجیے۔ دہلی میں قیام کیجیے اور مسلمانو
کی رہنمائی کیجیے۔

شیخ صاحب نے فرمایا کہ "جو کام میرے ذمہ ڈالا جائے گا، وہ ضرور کروں گا، لیکن اس کام کو عم
شکل آپ لوگ دیجیے۔" شیخ صاحب نے مسلمانوں کی تعلیم اور مالی پسماندگی پر بھی اظہار خیال کیا اور چند
اس سلسلہ میں بھی لیے گئے۔ چند روز بعد مسلم مجلس مشاورت کا اجتماع شیخ صاحب مرحوم کی صدارت میں
کے گھر میں ہوا۔ تقاریر ہوئیں، تجاویز پاس ہوئیں، کمیٹیاں بنیں اور وہی ہوا، جو مسلمانوں کی دوسری تحریکا
کے سلسلہ میں ہوتا رہا ہے۔ شیخ صاحب مرحوم کشمیر چلے گئے، اور وہاں کشمیر کے مسائل میں منہمک ہو گئے۔ ا
نے چند بار کوشش ضرور کی کہ کمیٹیاں اپنا کام شروع کریں اور اسلامی مرکز کے قیام کے لیے فضا پید
کی جائے، لیکن وہاں کون سر کھپاتا تھا کہ جو اسلامی مرکز کے قیام کے خواب کو عملی جامہ پہناتا!

یہ فسادات آخر کب تک؟

فرقہ وارانہ فسادات نے ایک بھیانک شکل اختیار کر لی ہے۔ جواہر لال نہرو کا خیال تھا کہ ایک آزاد ملک میں فسادات کیسے برداشت کئے جا سکتے ہیں؟ آزاد ہندوستان کی حکومت میں فسادات نہ ہوں گے، حکومت ان کا تدارک کریگی۔ لیکن آزاد ہندوستان میں فسادات اور بڑھ گئے، اور اب تو فسادات نے بہت ہی خطرناک شکل اختیار کر لی ہے۔ تصور کیجیے کہ ایک شخص کسی ضرورت کے تحت کہیں جا رہا ہے، وہاں فرقہ وارانہ فسادات کا ہنگامہ ہے، مفسد اس مسافر پر ناگاہ حملہ آور ہوتے ہیں اور وہ مارا جاتا ہے۔ کسی کو کیا معلوم کہ اس کے کیا حالات تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ماں کا اکلوتا بیٹا ہو اور پورے گھر کا واحد سہارا ہو۔ اس کے بچے کم عمر ہوں، جوان بیوی ہو۔ ایک دو روز کے لئے وہ گھر سے نکلا ہو اور وہ واپس نہ پہنچے۔ اس کا گھر پر انتظار ہو۔ اس کے گھر والوں پر کیا گزرے گی جب وہ گھر واپس نہ پہنچے گا۔ اس کا انتظار دو چار روز ہوگا، پھر گھر والے پریشان ہوں گے، چند روز تک یہ پریشانی مایوسی تک پہنچ جائے گی۔ بیوی، بچے اور بیوہ ماں روتے روتے بدحال ہو جائے گی۔

یہ ایک خیالی بات نہیں ہے۔ ایسا ہوتا رہتا ہے اور ہر فساد کا شکار اجنبی بھی ہوتے ہیں اور ان کے گھر برباد ہوتے ہیں۔

ہم تو بڑے انسان دوست ہیں۔ ظلم و ستم کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پھر آخر یہ فسادات کیوں ہوتے ہیں؟ انسان کے خون کی پیاس ہم کو کیوں بے قابو رکھتی ہے؟ ہم تو عظیم تہذیبوں کے وارث ہیں۔ ہم کو تو یہ دعوٰی ہے کہ ہمارے سائے میں شیر اور بکری ایک گھاٹ میں پانی پیتے ہیں، پھر یہ کیا ہے کہ مختلف خیالات اور عقائد کے لوگ ایک ساتھ ہمارے سائے تلے نہیں رہ سکتے اور مخالف کو نیست و نابود کرنے کا جذبہ ہماری رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ یہ زمانہ جمہوریت کا ہے۔ دنیا انصاف اور امن کی طالب ہے۔ دنیا میں کہیں لڑائی ہوتی ہے تو ہم طرفین کو مطعون کرتے ہیں۔ پھر آخر یہ کیا ہے کہ اپنے ملک میں اپنے ہمسایہ کو برداشت نہیں کر سکتے۔

حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر شہری کی جان و مال کی حفاظت کرے۔ آخر یہ فسادات کب تک جا
رہیں گے۔ یہ سلسلہ اب اس منزل میں ہے کہ اگر بند نہ ہوا تو یہ دنیا بھول جائے گی کہ اس ملک میں
گاندھی اور بڑے بڑے صوفیا اور رشی پیدا ہوئے تھے۔

فرقہ وارانہ فسادات نے شدت اختیار کی تو ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ پارلیمنٹ کے تمام ممبران سر
کر بیٹھتے اور فسادات کے ہر پہلو پر غور کرتے اور ملک میں خوشگوار فضا پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کر
لیکن ہوا یہ کہ صرف مسلمان ممبران پارلیمنٹ نے احتجاج کیا اور سب خاموش رہے۔ پارلیمنٹ کے ممبر
تو مصلحت بیں ہوتے ہیں۔ تعجب صحافیوں پر ہے جو آزاد خیال اور آزاد منش ہوتے ہیں، وہ بھی غیر جانب
اب تو ضرورت اس کی ہے کہ ہر انصاف پسند ہندوستانی، صحافی، ادیب و شاعر او
سب ان فسادات کے خلاف آواز اٹھائیں اور ہر فرقہ کے لیڈر بالکل صفائی کے ساتھ اپنے اپنے تاثر
بیان کریں۔ اگر ہندوؤں کو مسلمانوں سے شکایات ہوں، تو وہ صاف طور پر بیان کی جائیں۔ اور مسلم
سے ہندو رہنما تبادلہ خیال کریں، اور اسی طرح مسلمان بھی ہندوؤں کے خلاف اپنی شکایات پیش کریں
اور دونوں فرقوں کے لیڈر ایک دوسرے کا بیان سن کر آپس کے اختلافات ختم کریں، تاکہ اس برصغیر میں
امن و سکون قائم ہو، اور لوگ چین کی زندگی گزار سکیں۔

یہ تو معلوم ہی ہے کہ ہندو مسلم اختلافات کی بنیاد ہندوستان کی ماضی کی تاریخ ہے جو
واقعات کو انگریزوں نے مسخ کر کے لکھا ہے اور تاریخ کی کتابیں اسکول کے نصاب میں داخل کر کے
ہندو مسلمان بچوں کے دلوں میں نفرت کا بیج بو دیا ہے۔ لیکن آخر یہ احساس کیوں نہیں ہے کہ دنیا کی
تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو، جہاں وہی لوگ آج بھی آباد ہوں، جو روز اوّل سے وہاں بستے تھے
یا ہزاروں سال بعد وہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ ہر آبادی کے حکمراں ہوس کا شکار رہے ہیں۔ یہ
پڑوس کی آبادی پر، اگر وہ کمزور ہوتی، تو حملہ کر کے قابض ہو جاتے تھے۔ بادشاہوں، راجاؤں، حاکموں
یہ دستور ہزاروں برس رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اب بھی دنیا میں ایسی قومیں ہیں جن کے منہ کو انسانی خون
لگا ہوا ہے۔ وہ اپنے کمزور پڑوسی کو ہی نہیں، ہزاروں میل دور بسنے والی مخلوق کو بھی غلام بنا لیتی ہیں
ان کی دولت پر ان قوموں کی نظر ہوتی ہے۔ عہد وسطیٰ میں تو جمہوری حکومت نہیں، شخصی حکومت ہوتی تھی
حاکم وقت سیاہ و سفید کا مالک ہوتا تھا، جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ مجرموں کو ہی نہیں اپنے مخالفوں کو سخت سے

نت سزا دیتا تھا۔ کس حاکم وقت نے مخالفوں پر ظلم نہیں کیا؟ ان کی سرکوبی نہیں کی؟ مسلم حاکم وقت نے
اپنے مسلمان مخالف کو کب بخشا تھا جو کسی اور کو بخش دیتا۔ پھر حاکم وقت جہاں مخالف کی سرکوبی کرتا تھا وہاں
وش ہونے پر انعام واکرام کی بارش بھی کرتا تھا۔ مسلمان حکمرانوں نے ہندو مسلم مخالفوں کی سرکوبی بھی کی ہے
اور انعام واکرام کی بارش بھی ان پر کی ہے۔ اب گزرے زمانے کے زخموں کو کرید نے سے کیا فائدہ؟ وہ
زمانہ پھر واپس نہ آئے گا۔ لیکن اگر زخموں کو کرید نے میں ہی مزہ آتا ہے، تو پھر عطر محبت کی ان شمیم انگیز لپٹوں
کو بھی تو یاد رکھئے جن کے سبب آٹھ سو سال ایسے بادشاہوں نے حکومت کی ہے جن کا دین اسلام تھا۔
ظلم وستم قومیں زیادہ عرصہ برداشت نہیں کرتیں۔ انگریز جیسی ترقی یافتہ قوم کو ہندوستان نے
دو سو برداشت نہیں کیا۔ پھر آٹھ سو سال مسلمان یہاں کیسے حکومت کرتے رہے؟ اور یہ دونوں فرقے کیوں شیر و شکر
رہے؟ کیا ظلم کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔
زمانہ جمہوریت کا ہے، عدل وانصاف کا ہے، مساوات کا ہے۔ اس دور کی خصوصیات کی
عادت ڈالئے اور جمہوری صنعتی دور کی عینک سے دنیا کو دیکھئے۔ پھر دل کی سب کدورت دھل جائے گی۔
اور پھر ہم سب ایک خوشگوار دور میں داخل ہو جائیں گے۔
کسی قوم وملک کی ترقی کے لئے تعمیری فکر، بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار کی ضرورت ہوتی ہے۔
تخریب پسند فکر کسی قوم اور ملک کی ترقی کا ذریعہ نہیں ہو سکتی۔ گزشتہ ۲۵ سال کی تاریخ سامنے
رکھئے، دیکھ لیجیے ہمارے ملک کی کیا حالت ہے! دوسری قوموں کی ترقی کے اسباب کا مطالعہ کیجیے۔
آپ پر حقیقت اور واضح ہو جائے گی۔
آیئے ہم سب مل کر نیا ہندوستان بنائیں، جس میں سب کی توجہ تعمیر کی طرف ہو، تخریب کی
طرف نہیں۔ اتحاد کی طرف ہو، انتشار کی طرف نہیں۔

شکتی بھی، شانتی بھی، بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی، پریت میں ہے

●●

تہذیب الاخلاق کے بارے میں

کوشش یہ کی جائے گی کہ رسالہ میں ایسے علمی مضامین کا اضافہ ہو جو ہمارے فکر اور عمل کی اصلاح کا ذریعہ ہوں اور زندگی کے مسائل کو جذبات کے تحت نہیں، علم کی روشنی میں ہم دیکھنے کے عادی ہو جائیں۔ سرسید نے سائینٹفک سوسائٹی قائم کی تھی، وہ جدید علوم کو اُردو کے ذریعہ ہندوستانیوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ لیکن انگریز اس تحریک کے مخالف تھے اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستانی جدید افکار سے آگاہ ہوں۔ وہ اس سوسائٹی کی ترقی میں رکاوٹ بنے۔ اب ملک آزاد ہے۔ جدید علوم کی تعلیم ہر یونیورسٹی میں ہوتی ہے۔ اب یہ پڑھنے اور پڑھانے والوں کا کام ہے کہ وہ اس دَور کے علوم سے کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ علم کی روشنی میں ہم اپنے فکر و عمل کی اصلاح کریں۔ اس دَور میں سائینٹفک سوسائٹی کا راقم کے خیال میں یہ مقصد ہونا چاہیے کہ ہمارے سوچنے کا ڈھنگ اور کام کرنے کا طریقہ بدلے اور ہم جذبات سے کم اور عقل سے زیادہ کام لینے کی عادت ڈالیں۔

ہندوستان ایک بہت وسیع ملک ہے۔ اب بھی اس ملک میں ایسی آبادیاں ہیں جہاں ہزاروں برس پرانی تہذیب کے خط و خال ہی نہیں دیکھے جاسکتے بلکہ اس دور کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اور ہزاروں سال پرانی تہذیب اور معاشرت کا آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔ ہماری عام زندگی اور تہذیب و معاشرت پر عہد وسطیٰ کی چھاپ صاف نظر آجاتی ہے اور شہروں میں بھی ہماری زندگی میں اس دَور کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس قدیم میں جدید کی روح پھونکنے کی ضرورت ہے۔ اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہم جدید تہذیب کی نقالی کریں اور اس نقالی کو ایک مقصد بنالیں۔ ہمیں نقالی کی عادت ترک کرکے جدید افکار سے استفادہ کرنا چاہیے تاکہ وہ ہمارے معاشرہ کی اصلاح و ترقی کا ذریعہ ہو۔ گزشتہ سو سال میں ہم نے جدید تعلیم صرف حصولِ معاش کے لئے حاصل کی، جدید علوم سے استفادہ حاصل کرنے کے لئے نہیں۔ اسی بنا پر ہم میں ذہنی غلامی بدستور ہے اور اس بھنور سے نکلنا ہمارے لئے دشوار ہوگیا ہے۔ یہی ہماری ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس مرض کے علاج کی طرف آج ہم قدم اٹھا رہے ہیں۔ آیئے ہم سب مل کر اس کوشش کو کامیاب بنائیں اور ترقی کی اس راہ پر چلنا سیکھیں جس سے ہم دنیا میں باعزت زندگی بسر کرسکیں۔

••

ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی

علی گڑھ کے مشہور اولڈ بوائے اور لکھنؤ کے
ہر دلعزیز ڈاکٹر، علی گڑھ کنونشن کے روحِ رواں

مسلم یونیورسٹی، دیوبند اور جامعہ ملیہ میں انتشار

اتنی بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ یہ تینوں ادارے مخصوص حالات میں انتہائی مخلص لوگوں نے
کئے تھے۔ ان کے ارادے اور عزائم بہت واضح تھے۔ انھوں نے ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی اور ملی تشخ
کو برقرار رکھنے کے لیے ان عظیم اداروں کو بنایا اور سنوارا تھا۔ شروع میں جو اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے لوگ
ان اداروں سے نکلے ان کو معمولی درجہ کی سہولتیں بھی حاصل نہیں تھیں۔ عمارت پختہ نہیں تھی۔ روشنی
انتظام نہیں تھا۔ کھانے کے لیے ڈائننگ ہال نہیں تھا۔ اساتذہ کے لیے آرام دہ مکانات نہیں تھے۔
نہیں تھی۔ غرض کہ راحت و آرام و آسائش کی وہ تمام چیزیں جو آج فراوانی سے مہیا ہیں اس وقت ا
کا تصور بھی مشکل تھا۔ لیکن اس پورے ماحول میں کوئی بے چینی نہیں تھی۔ طلباء اور اساتذہ میں باپ بیٹے
کا سا تعلق تھا۔ سب ایک دوسرے کے رفیق، ہمدرد و مونس و غمخوار تھے۔ کسی کو کسی سے شکایت نہ
تھی۔ لیکن اب صورت حال بہت بدل گئی ہے۔

دوسری یونیورسٹیوں اور کالجوں کی دیکھا دیکھی ان اداروں میں بھی مطالبات کی کثرت
خامیوں کی نشاندہی اور بات بات پر الجھنے کا مزاج بن گیا ہے۔ بلکہ عملی طور پر اس کا رواج ہو گیا
یہ احساس ہی رخصت ہو گیا ہے کہ اس کا کوئی اخلاقی جواز بھی ہے۔ مطالبوں کے بھی حدود ہیں اور مطا
کو پیش کرنے کا بھی ایک معیار ہے۔

اپنے گھروں پر تنگی اور دشواریوں کی زندگی گزارنے والے بھی یہاں اس طرح آتے ہیں جیسے داماد سسرا
میں۔ شریف داماد تو سسرال والوں کا معاون اور ہمدرد ہوتا ہے۔ لیکن یہاں صرف خامیوں پر نظر رہتی ہے او
صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس طرح ٹکراؤ کی فضا پیدا کر کے اپنا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

کیا ان اداروں میں طلبہ کی یہ روش حقیقت پسندانہ ہے؟ کیا یہ ان خوابوں کی صحیح تعبیر ہے، جو اس کے
بانیوں نے دیکھا تھا۔ کیا اسی طرز کے کردار کے لیے انھوں نے اپنی نیندیں حرام کی تھیں، اور در در کی بھیک مانگ

یا اسی لیے انھوں نے انتہائی تقویٰ اور عسرت کی زندگی گزاری تھی؟

وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہاں صرف وہ لوگ آئیں گے جن کے سامنے دنیاوی وجاہت اور ترقی کے سوا کوئی اور مسئلہ ہی نہ ہوگا، انھیں صرف مراعات کی ضرورت ہوگی۔

ان اداروں کی تعمیر میں حصہ لینے والوں نے تو ایسی مثالیں قائم کیں جن کا اس وقت تصور بھی مشکل ہے۔ اگر بیوی نے موٹر استعمال کی ہے تو پٹرول کا حساب لگا کر وہ رقم ادارہ کے حساب میں داخل کرا دی۔ تندور کی آنچ سے سالن گرم کر کے کھا لیا تو بعد میں اس کے پیسے بھی داخل کر دیئے۔ ذاتی کام کے لیے الگ قلم اور کاغذ اور ادارہ کے کام کے لیے قلم اور کاغذ علیحدہ۔ مہینوں چولھا نہیں جلا، چنوں پر گزر کرلی۔ اگر گھنٹہ نہیں دیا تو حساب لگا کر تنخواہ کٹوا دی۔"

اس احتیاط سے کام کرنے والے کبھی سوچ سکتے تھے کہ یہاں ایک ایسا دور آئے گا جب اساتذہ اور ملازمین اچھی تنخواہوں، رہائشی اور دوسری سہولتوں کے باوجود ہر وقت کمی کا شکوہ کریں گے اور ایسے لائق فرزندانِ قوم آئیں گے، جو مراعات کا مطالبہ کریں گے۔ امتحان کی چھوٹ، حاضری کی چھوٹ، عمارتوں کا مطالبہ، کھانے کا مطالبہ، داخلوں کا مطالبہ، ...کے خلاف ہنگامہ آرائی، ماں بہن کی گالی سے لیکر ہر قسم کے القاب سے خطاب، اساتذہ اور انتظامیہ کی تضحیک، ...حدیث کے طلبا کا بسوں میں بیٹھ کر سرکاری افسران کے سامنے مظاہرہ، بلم، چھری، چاقو، پستول کی دھونس! ...کام کے لیے ادارہ کی ضرورت نہیں تھی! اس کے لیے تو پڑھا لکھا ہونا بھی شرط نہیں!! اس کے لئے مسلمان ...ہونا بھی شرط نہیں!!!

بہرحال یہ واقعہ پیش آ رہا ہے اور بہت سے لوگ مختلف طریقوں سے اس کی حمایت بھی کر رہے ہیں۔ لیکن ...صورت حال ان اداروں کو باقی رہنے دیگی؟ کیا اس کے نتائج انتہائی سنگین اور بھیانک نہیں ہوں گے؟ کسی ...کی ضمانت نہ اس کا بجٹ ہے، نہ عمارتیں، نہ طلبا، نہ اساتذہ کی تعداد۔ کوئی چیز اگر واقعی ضمانت ہو ...ہے تو وہاں کے اندر کا ماحول، طلبا اور اساتذہ کا تعلق اور بڑے مقصد کے لیے پوری ہم آہنگی، اس کے ...ایثار، قربانی اور ہر قسم کی تکلیف اٹھانے کا جذبہ!

اگر یہ نہیں ہے تو مطالبوں کی فہرست طویل ہوتی جائے گی اور جو قدم اٹھے گا وہ تباہی و بربادی کی طرف بڑھے گا اور ایک دن ایسا آئے گا جب یہ چمن فتنوں کی آگ میں جل کر راکھ ہو جائے گا۔

●●

ادارہ تاریخ سے نہیں تحریک سے چلتا ہے

ہر اولڈ بوائے اپنے پرانے دَور کو موجودہ دَور سے بہتر سمجھتا ہے۔ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ شجرِ سایہ دار زوال پذیر ہے۔ اپنی وسعت اور ہر قسم کی ترقی کے باوجود کوئی ایسی چیز ضرور ہے، جس نے اس کی قوتِ نمو کو متاثر کر رکھا ہے۔

جن اساتذہ اور کارکنوں سے یہ دانش گاہ عبارت ہے کیا وہ حقیقت پسندی سے اس صورت حال کا جائزہ لے سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے اور وہ خود اس ضرورت کو کس حد تک پورا کر رہے ہیں اور کس حد تک اس مشن کی تکمیل میں جا سکتے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کی سب سے بڑی خوبی ان کا خلوص اور ادارہ اور طالب علموں کے ساتھ ان کی وابستگی رہی ہے۔ اچھے طالب علموں کی تلاش، ان کی سرپرستی اور اکثر اپنی یافت کا بڑا حصہ ان پر لگا دینا، ان کے کردار کا وہ سب سے نمایاں اور روشن پہلو ہے جس نے اس ادارہ کی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ ان کا ایثار ان کی زندگی میں ایسا رچا بسا ہوا تھا جو بادِ سحر کے نم کی طرح نئی کلیوں میں جذب ہو جاتا اور انھیں کھلے ہوئے پھولوں میں تبدیل کر دیتا۔ دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ ایسے لوگوں کا تناسب گھٹ رہا ہے اور ان لوگوں کا تناسب بڑھ رہا ہے جو محض ملازمت اور اپنی آمدنی کی خاطر یہاں آگئے ہیں اور ذرا اُن کو اس سے بہتر مواقع کے آثار کہیں نظر آئے اور انھوں نے طوطا چشمی کی۔ یہاں تو لوگ اپنی کشتیاں جلا کر آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے!

ادارہ تاریخ سے نہیں تحریک سے چلتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعہ پورے ملک سے وابستہ تھی۔ ہندوستان کے اہم مقامات پر اس کے اجلاس ہوتے تھے۔ اس کے نتیجے میں پورے ملک میں ایک ساکھ قائم تھی۔ لیکن مسلم ایجوکیشنل تحریک کے ختم ہونے کے نتیجہ میں زبردست خلا ہو گیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم یونیورسٹی پر ہاتھ ڈال دیا گیا اور ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ کب تک یہ دست درازی جاری رہے گی۔ سرسید کے تعلیمی مشن کو پورا کرنے کے لئے داخلی طور پر مسلم یونیورسٹی کے ماحول اور اس کے نصاب کو از سرِ نو ترتیب دینے کی اور پورے ملک کی سطح پر رابطہ قائم کرنے کے لئے مسلم ایجوکیشنل تحریک کو نئے سرے سے متحرک کرنے کی ضرورت ہے۔

یونس قاضی

ب محمد یونس قاضی : پ یکم جولائی ۱۹۱۴ء
ہ مسلم یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے ۱۹۳۹ء تا
ا شعبۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں بحیثیت لکچ
ر رہے۔ ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۷ء حکومت ہند کے پلاننگ کمیشن
ا کے ڈائریکٹر رہے۔ ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۲ء ایکاک کمیشن برائے
پ اقوام متحدہ، جنیوا سے منسلک رہے۔ ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۶ء
متحدہ کی جانب سے کابل میں حکومت افغانستان کے مشیر
پلاننگ اور ۱۹۶۶ء تا ۱۹۶۷ء حکومت ہند کی جانب
ہند جاپان کمیٹی (پلاننگ کمیشن) کے سکریٹری کے عہدے
فائز رہے۔ آپ کا میدان معاشیات بالخصوص پلاننگ
منصوبہ بندی) رہا ہے۔ ●●

مارکسزم پر ایک منصفانہ نظر

انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم اس مضمون کا آغاز مارکس کے اس مقولے سے کریں جس کے ا
سرمایہ دارانہ نظام میں غیر جانبداری اور انصاف (کم از کم جہاں تک مزدور طبقہ کے مفاد کا تعلق ہے
ہیں۔ پورا کا پورا نظام خواہ وہ عدلیہ ہو یا مذہبی، ڈنڈی مارنے اور محنت کشوں کے خلاف جھوٹی
دینے کے لیے تُلا رہتا ہے۔ مارکس کی یہ شکایت بجا نہیں ہے۔ ہر دولت پرست اور اخلاق سے مبرا
جہاں "اے ایمان والو انصاف کی گواہی دینے کے لیے اللہ کے واسطے تیار ہو جایا کرو، کسی قوم کی دشمن
پر انصاف کو نہ چھوڑو، بلکہ انصاف سے (ہر حال میں) کام لو" کی تعلیم پر عمل نہیں ہوتا، کمزور کو ا
مشکل سے ملے گا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان محض مادی ماحول کا نتیجہ ہے (جیسا کہ مارکس کا ن
یہی بات کہ مارکس نے اپنے زمانہ کے برطانوی فیکٹری انسپکٹروں کی غیر جانبداری کا اعتراف کیا ہے، مارک
کے خلاف جاتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ برطانوی عمال حقیقت کو چھپاتے، حکمراں طبقہ کی خوشنودی حاصل

میرا اپنا تأثر یہ ہے کہ مارکس مفکر کم تھے اور وکیل زیادہ۔ ایک حساس اور خدا ترس! جی
ترس (اپنے غیر محتاط لمحات میں مارکس نے "The Truth" (حق) "The consciecnce" (ز
"free scieutific enquary" کا ذکر کیا ہے) فرد کی حیثیت سے انھیں اپنے زمانہ کے مظلو
محنت کش طبقہ سے دلی ہمدردی تھی اور ان پر ظلم کرنے والوں سے سخت نفرت۔ انھوں نے حالات کا مطا
مزدور طبقہ کی طرف سے ایک ایسا استغاثہ تیار کیا جس نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا اور انسانی طرز فکر پ
ڈالا۔ "اپنا کیس" (case) مضبوط کرنے کے لئے انھوں نے اپنے دشمنوں ہی کے ہتھیار یعنی کاروبا
(Economicman) کے تخیل کا استعمال کیا اور نہایت کامیابی سے کیا مگر جو ماڈل model
استغاثہ انھوں نے تیار کیا وہ بظاہر جتنا مضبوط تھا اتنا ہی وہ کمزور بھی تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ تمام تر ۹
کے حالات پر مبنی تھا۔ مزدور طبقہ کی حالت اس وقت واقعی ناگفتہ بہ تھی۔ دوسرے یہ کہ اپنے عہد

پکنے والوں کی طرح انھیں یہ بھی شوق اور عزم تھا کہ وہ ایسے سوشل قوانین کا پتہ چلائیں جو طبعی قوانین
ہوں اور افراد کی مرضی اور خوشی و ناخوشی کے محتاج نہ ہوں۔ یہ امر ان کے لیے اس لیے اور بھی ضروری
مزدور طبقے کے حقوق کو آئندہ کوئی جھٹلا نہ سکے اور سرمایہ دار طبقہ کی ناانصافی پر پردہ نہ ڈال سکے!

مارکس اور ہم سب کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ ان کی اپنی زندگی میں کسی ملک میں بھی سوشلسٹ نظام
اور اس طرح وہ اپنے نظریات کو تجربہ کی روشنی میں پرکھنے اور ان پر نظر ثانی کرنے سے قاصر رہے
ان کا پورے کا پورا ماڈل غیر آزمودہ اور ایک معنی میں خیالی (Utopian) ہے۔ آج جب ہم ان
نظریات کو ان کی اپنی ہی بتائی کسوٹی (یعنی زندگی) سے جانچتے ہیں، تو ان کی کئی اہم تعلیمات کے
"کا احساس ہوتا ہے اور ان کا سائنٹفک سوشلزم" کچھ کچھ غیر سائنٹفک جوتش" معلوم ہونے
آج کے جوتشی یہاں تک کہنے لگے ہیں کہ ان کا علم رجحانات کا پتا دیتا ہے اور خطرہ کی نشان
ہے۔ ایسا خطرہ جس سے بچا جا سکتا ہے۔ مغربی ممالک کے سرمایہ دار کو اب عقل آگئی ہے۔
ایشیائی ممالک میں اب بھی ذہنیت نہیں بدلی) ایک اور بدمذاقی تاریخ کی طرف سے یہ ہوئی کہ انقلاب
جیسے ملک میں آیا۔ خود روسی کمیونسٹ (سوائے ٹراٹسکی کے) اس کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ
ان کی توقعات پوری ہوا انقلاب سے آگے دیکھیں۔ روسی انقلاب نہ عوام کی مرضی اور نہ ہی مادی
کا بنا پر کیا۔ بہت سی زیادتیاں اور گناہ جو روس میں موجود ہیں، وہ مارکسزم کے کھاتے
ڈال دیئے گئے۔

اینگلز (Engels) کو اپنے رفیق کے فلسفۂ تاریخ کے غلو کا پورا پورا احساس تھا جس کے
تمام تاریخ صرف طبقاتی جنگ ہے اور معاشی حالات کی پیدا کردہ اور ٹھیک اس طرح جیسے بچوں کی
مٹھائی بڑھیا کا کاتا قند اور رنگ سے بنتی ہے، تاریخ مادی حالات کا نتیجہ ہے۔ ایک خط میں انہوں
کھلے طور پر کہا ہے کہ معاشی حالات ہرگز ہرگز تاریخ کا واحد محرک اور سبب نہیں ہیں۔ تاریخ
بنانے والے شخص کا حصہ ہے اور اس کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے فرد کے رول کی چھاپ رہتی ہے اور
(Masses) کے کارناموں میں مدغم نہیں ہو جاتا۔ اینگلز نے یہ بھی کہا ہے کہ ہمیں نہ بھولنا چاہیئے کہ
حالات میں لڑ رہے تھے اور یہ کہ ان کی جنگ ایسے لوگوں سے تھی جو معاشی اسباب کو کوئی مقام دینے
تیار نہ تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے ان نوآموز مارکسٹوں کو ڈانٹا ہے جو بغیر پورے طور پر سوچے

سجھے نظریات کو روز مرّہ کی زندگی پر چسپاں کرتے رہتے ہیں اور بنا بلدی کے گرٹنے کے لینے کو بنیادی
کرنے لگے ہیں ۔

مارکسزم کا شہرہ اس قدر ہے کہ لوگوں کو اس کا مطالعہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں
دوست دشمن سب ہی کے لیے دروازہ کھلا ہے کہ جو چاہے مارکس اور اینگلز سے منسوب کردے
روسی عمّال نے "مزدور طبقہ کی آمریت" کے تصور کو استبداد میں تبدیل کر ڈالا ۔ حالانکہ مارکس کے نز
پرولتاری ڈکٹیٹر شپ وہ نظام تھا جو سولہ آنے جمہوری تھا ۔ مارکس کے ذہن میں پیرس کیمون نظام
(commune) کا نمونہ تھا جس میں ہر بالغ کو ووٹ کا حق تھا ۔ ایڈمنسٹریشن کا اساس بلدیہ تھا ۔ پولس
بھی اور بلدیہ کے ماتحت ۔ افسرانِ بلدیہ کا انتخاب (ELECTION) ہوتا تھا ، تقرر نہیں ۔ ان کی تنخواہ
عام مزدور کی تنخواہ کے برابر تھی وغیرہ وغیرہ ۔ مارکس کو ریاست (National State) سے نفرت تھی
تھی ۔ وہ تو "سوسائٹی" (Society) کے قائل تھے جس کا ہر فرد فیصلوں میں حصّہ لے سکتا ہے ۔ فیکٹر
میں "مزدور" بلدیہ میں تمام شہری وغیرہ وغیرہ ۔ موجودہ کمیونسٹ ملک کے نظام کو انھوں نے کبھی نہیں
تھا ۔ مارکس کے مخالفین نے ان کے متعلق یہ غلط فہمی پیدا کی کہ وہ ذاتی ملکیت کے خلاف ہیں ۔ حالانکہ
صرف ذرائع پیداوار میں ذاتی ملکیت کے خلاف تھے ۔ ان کا دعویٰ تو یہ تھا کہ ذاتی ملکیت کا قلع قمع
نے کیا ، جب سرمایہ دار نے کسان سے اس کی زمین اور کاریگر سے اس کے اوزار لے کر محنت فروش
فاقہ زدہ میں تبدیل کر دیا ۔ جو حقیقت بھی ہے !! (علی گڑھ شہر کے وہ بسکٹ بنانے والے آج کہاں

اب ہم مارکسزم کے بنیادی نظریات پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے ۔

لینن نے (Lenin) نے مارکسزم کے تین عنصر بتائے ہیں :

(۱) مادیّت : جیسا کہ اوپر کی سطور میں ذکر ہو چکا ہے ، مارکس ایک نہایت کامیاب و
تھے ۔ اور اس لیے اپنے مؤکل کو جتانے کے لیے ڈنڈی مارنے سے احتراز نہیں کرتے تھے ۔ چونکہ آگے
انہیں انسان کو مادّی حالات کا مطیع ثابت کرنا تھا ، اس لیے انھوں نے انسان کو اشرف المخلوقا
نہیں کہا ۔ ان کے نزدیک انسان اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ وہ اپنی روزی کے ذرائع کو دہراتا اور

ے) انھوں نے جان بوجھ کر نہ پوچھا کہ حیوان کے مقابلہ میں یہ برتری کہاں سے حاصل ہوئی؟ جو جواب ملتا
اس کے پورے گھروندے کو مسمار کر دیتا۔ وہ تو عدالت کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ انسانی فہم کی
کی آزادانہ حیثیت نہیں ہے۔ فریق مخالف کا منھ بند کرنے کے لیے انھوں نے یہ پیش بندی کی کہ مادہ
(Matter) کو فکر (Thinking Matter) کی قوت عطا کر دی۔ اگر یہ الف لیلہ نہیں تو اور کیا ہے۔

(۲) **معاشیات:-** مارکسسٹ معاشیات کی جان اس کا اپنا (Surplus value)
ہے جس کے بموجب مزدور کی اجرت اس دولت سے بہت کم ہے جو وہ اپنے زور بازو سے
کرتا ہے۔ دونوں یعنی مزدور کی اجرت اور پیدا شدہ دولت میں جو فرق ہے وہ مالک کے قبضہ
میں جاتی ہے اور مالک اس دولت کو پھر سے بزنس میں لگا دیتا ہے اور اس طرح دولت کی افزونی
(بت کی بہتات) کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے جو اسی وقت ٹوٹتا ہے کہ جب فاقہ زدہ محنت کش
ذرائع پیداوار کو اپنے تصرف میں لے لیں اور سرمایہ داری کو ختم کر دیں۔

اس میں ذرا شک نہیں کہ اس نظریہ میں بڑی جان ہے اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں شاید
ہی معاشرہ ہو جو پکار پکار کر اس کی شہادت نہ دے رہا ہو۔ دور کیوں جائیے، لکھنؤ کی چکن کی صنعت
یا لوکے تالے کے کارخانے کی سیر کر لیجیے اور جب بارہ[۱۲] برس کے رکشا چلانے والے کو دیکھیں، جو جان بیچ کر
اپنی بیوہ ماں اور یتیم بہن بھائیوں کا پیٹ بھرتا ہے، تو مارکس کے اس نظریہ کو یاد رکھیے۔ جہاں جہاں
محنت کش طبقہ اپنے حقوق کے لیے نہیں لڑ رہا ہے، جہاں جہاں اس کی اپنی یونین نہیں ہے، مزدور کو صرف
یہ ملتا ہے کہ وہ اور اس کا خاندان کم از کم فی الحال نہ مرے۔ مگر مغربی ممالک پر یہ چسپاں نہیں ہوتا۔
عام طور سے نہ صرف ٹریڈ یونین ہیں، مزدوروں کی حکومتیں بھی بنتی ہیں۔ مارکس کے زمانہ کی حالت
نہیں ہے۔

آج ایک ایسا مسئلہ درپیش ہے جسے مارکس نے نہیں سوچا تھا۔ ان ممالک میں بھی جہاں ذرائع
پیداوار انفرادی ملکیت میں ہیں۔ مزدور کو اس کی پیدا کردہ دولت کا پورا حصہ نہیں مل رہا۔ قومی پیداوار کی
تقسیم میں اس کا اپنا ہاتھ نہیں ہے۔ کچھ اوپر کے لوگ اس کے نام پر فیصلہ کر دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ
سوشلزم" اور "کمیونسٹ ریاست" ایک چیز نہیں۔ اور مارکس کے یہاں "سوسائٹی" (ملت) سے
سلطنت" نہیں۔ مگر اس جواب سے تشفی نہیں ہوتی۔ بالآخر فیصلہ چند ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا اور

اگر وہ "ضمیر" سے مبرّا ہیں اور خوفِ خدا سے آزاد تو ہم کس طرح توقع کریں کہ وہ انصاف کریں گے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران فاتح فوج کو برلن میں داخل ہونے سے پہلے اعلان کرنا چاہیئے تھا کہ "جو شخص ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے یا اپنے گھر کے دروازے بند کرلے یا مسجد حرام میں چلا جائے وہ مامون ہے"۔ (محمد)

(۳) طبقاتی جنگ :۔ چونکہ حکمراں سرمایہ دار طبقہ خود سے مزدور کے ساتھ انصاف نہیں کرے گا۔ اس لیے لازم ہے کہ اس کے خلاف مستقل جہاد کیا جائے اور اس سے تمام طاقت لے لی جائے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال کہ اصلاح کے ذریعہ بھی وہی مقصد حاصل ہو سکتا ہے، سراسر خود فریبی ہے۔ یہ ہے طبقاتی جنگ کے جواز کا لب لباب۔ ۔ اگر ہم ۱۹ویں اور ۲۰ویں صدی کے آغاز تک کے حالات لیں تو اس نظریہ میں صداقت نظر آئے گی۔ مگر پہلی جنگ عظیم کے بعد حالات بدلنا شروع ہو گئے اور سرمایہ دار طبقہ کو عقل آگئی۔ دوسرے یہ کہ یورپ میں مزدوروں کو سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا اور بغیر "طبقاتی جنگ" کے انھیں مفت علاج تعلیم، سالانہ تعطیلات، پانچ دن کام کا ہفتہ وغیرہ ۔۔۔ (جو مارکس کے زمانہ میں ممکنات نہ تھے) مل گئے۔ آج سرمایہ دار کے مزدور کا معیارِ زندگی اشتراکی نظام والے مزدور کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔

البتہ ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے اور وہاں برابر مزدور طبقہ کی لڑائی جاری ہے اور قرائن بتا رہے ہیں کہ اشتراکی ممالک میں بھی مزدور خوش نہیں ہیں اور کہیں کھلے طور پر اور کہیں خفیہ طور پر حکومتِ وقت سے برسرِ پیکار ہیں۔

تجربہ نے یہ بھی بتایا کہ سوشلسٹ نظام میں بھی طبقات قائم رہتے ہیں، گو ان کے نام بدل جاتے ہیں اور مالک کی جگہ "پارٹی" لے لیتی ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ سوشلسٹ نظام میں بھی ہاتھ کے کام کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ ساتھ کے ساتھ مزدوروں کو حقوق کے لیے لڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ مارکس کا یہ خیال کہ سوشلزم میں مزدور سر اونچا کر کے چلے گا غلط ثابت ہوا۔ آج تو سرمایہ پرست مغرب میں مزدور سر اونچا کر کے چلنے کا عادی ہے۔

اس مضمون کے دو مقاصد تھے۔ مارکسزم سے کچھ واقفیت پیدا کرانا اور جو بیکار کی چپقلش مذہب اور مارکسزم کے درمیان پیدا کر دی یا کرا دی گئی ہے۔ اس میں کمی۔ اہل مذہب کی مخالفت خوف اور لاعلمی پر ہے اور انھوں نے میدان کمیونسٹ جہلا کے لیے چھوڑ دیا ہے

شمن "اسی وقت زیادہ خوفناک معلوم ہوتا ہے جب تک اسے قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں
ا۔ مارکسزم بہرحال انسانی دماغ کا نتیجہ ہے اور حالات نے اس کی کمزوریاں اظہر من الشمس
ردی ہیں ۔ اس کی اچھی باتوں سے اتفاق کرنا چاہیے اور غلطیوں کی مخالفت ۔ میدان کسی
الات میں بھی کمیونسٹ ملاؤں کو نہیں سونپا جانا چاہیے ۔ کسی زمانے میں مسلمانوں نے یونان کے
لسفہ سے استفادہ کیا تھا ۔ وہی فائدہ مارکس سے کیوں نہ حاصل کیا جائے ؟

●●

دو عظیم ہستیوں کی یادیں

تقسیمِ ہند کے بعد شملہ مشرقی پنجاب کی صوبائی راجدھانی بن گیا اور وہاں اب ایسے لوگوں
سخت ناخوشگوار ہو گیا تھا جو بربریت کو بربریت ہی کہیں خواہ وہ اپنوں کی ہو یا پرایوں کی۔ ایک غیر مسلم
نے جو میرے حالات سے باخبر تھے مشورہ دیا کہ تبادلہ کرا لوں اور اس کے لیے دہلی جا کر قدوائی صاحب (رفیع
قدوائی اس زمانہ کے مرکزی وزیر مراسلات) سے ملوں۔ میں ایک تو ہمیشہ کا گھر گھسنا اور بڑے لوگوں سے
آداب سے قطعاً ناواقف۔ اُوپر سے یہ ڈر کہ کہیں اس سودے میں بقول شخصے "عزتِ سادات" بھی
سے نہ چلی جائے۔

کوئی ایک سال کے پس و پیش کے بعد ایک دن دہلی پہنچ ہی گیا۔ اتنی تو ہمت نہیں تھی کہ ایکا
قدوائی صاحب کی کوٹھی میں داخل ہو جاؤں اس لیے قریب کے ٹریفک کے گول چبوترے پر جا کر بیٹھ گیا، تھوڑا
سینے اور جرأت پیدا کرنے کے لیے کچھ دیر بعد جب پانچ آدمیوں کا گروپ آیا اور بغیر کسی توقف و تردد کے
میں داخل ہو گیا۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ کوٹھی کیا وہ تو بہت بڑا تھا اور اسے طے کرنے میں کافی
لگا۔ جوں ہی ہال میں داخل ہوا جہاں ملاقاتی بٹھائے جا رہے تھے، میری تمام ذہنی پریشانیاں کافور
ملاقاتیوں میں مجھ سے کم درجے کے لوگ بھی تھے۔ پہاڑی علاقے کے ہرکارے مع اپنے بلّم (گھنگرو دار)
باوردی ڈاکیے وغیرہ وغیرہ۔ یقین آ گیا کہ نکالے نہیں جائیں گے۔ جب پیشی ہوئی تو میں نے عرض مدعا

"تبادلہ چاہتے ہیں کہ کچھ اور بھی؟"

"صرف تبادلہ"

"کہاں کا"

"ہو سکے تو دہلی کا"

"اپنا بایوڈیٹا (Biodata) میرے پرائیویٹ سکریٹری کو دیتے جائیے۔ اس
بھی بڑھا دیجیے کہ کن دفتروں میں آپ کی کھپت ہو سکتی ہے؟"

گفتگو کے دوران قدوائی صاحب نے صرف ایک مرتبہ نظر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس لیے میں کچھ اندازہ
ان کا رویہ ہمدردانہ ہے کہ نہیں اور آیا کام ہو جائے گا یا نہیں۔ پہلے سے مجھے کوئی واقفیت تھی
صرف یہ سنا تھا کہ نہایت لائق ایڈمنسٹریٹر ہیں۔

فردی کارروائی کے بعد یکایک بھوک کی شدت کا احساس ہوا اور میں نہایت تیزی سے
پس کے ارادہ سے باہر نکلا۔ صدر دروازہ پر پہنچا ہی چاہتا تھا کہ چپراسی دوڑتا ہوا آیا اور درخواست کی کہ
صاحب کہہ رہے ہیں کہ کھانا کھا کر جائیے۔" میں قتل وغارت اور بہیمیت کا عادی ہو چکا تھا یقین نہ آیا۔

"کسی اور کو بلایا ہوگا۔ وہ مجھ سے واقف تک نہیں ہیں۔"

"ارے صاحب، آپ ہی کو بلایا ہے۔ آپ شملہ سے آئے ہیں نا؟"

"اس ملک سے انسانیت ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور میں بُری طرح
۔ وہ آنسو میرے نہ تھے، اس بدنصیب "ہاتو" (قلی) کے تھے جسے میں نے ذبح ہوتے دیکھا تھا۔ اس
بش گرینڈ ہوٹل میں کام کرنے والے کے تھے جو شملہ میں پیدا ہوا تھا اور جس نے شملہ سے باہر کبھی قدم نہیں
اس لیے یہ بتانے سے قاصر تھا کہ لاہور جانا چاہیے گا یا کراچی۔ سونی پت کے اس ضعیف بنیے کے
کی کو اغوا کر لیا گیا تھا اور وہ اس کی بازیابی کے لیے کوشاں تھا، اسپیشل ٹرین کے چلے جانے سے پہلے۔

کھانے میں سالن، دال، چاول اور روٹی تھی۔ میرے اٹھنے سے پہلے قدوائی صاحب نے مجھے
یا اور اپنے سکریٹری کو بلوا کر کہا: "قاضی صاحب کو وہ والا لفافہ دے دو۔" اور جب وہ لفافہ
مجھے ہدایت دی کہ شملہ جا کر اسے پوسٹ کر دوں، مگر تاریخ اور وقت پوسٹنگ بالکل صحیح درج کیجیے گا۔
م کرنا چاہتا ہوں کہ شملہ سے دہلی خط کتنے وقت میں پہنچتا ہے۔" اس وقت تو میں نے دیکھا نہیں،
پہنچ کر لفافہ پر نظر ڈالی تو کسی غیر معروف انسان کا نام اور پرانی دہلی کی کسی گلی کا پتہ نکلا۔ قدوائی
کسی نے جو ہارون الرشید کا لقب دیا تھا، وہ یوں ہی نہ تھا۔

قدوائی صاحب کے انتقال کے کئی سال بعد ایک سرکاری کام سے بنگلور جانا ہوا۔ وہاں ریاست
انجینئر کے گھر پر ایک صحبت میں کسی نے قدوائی صاحب کا ذکر چھیڑ دیا۔ میزبان نے اپنے ایک عزیز
بابو کسی زمانہ میں کانگریس کے دفتر میں کلرک کی حیثیت سے کام کر چکا تھا اور آزادی سے بہت
بتلا ہو گیا تھا۔ آزادی کے بعد قدوائی صاحب کا بنگلور آنا ہوا۔ انھوں نے اس شخص کا نام لیا اور کہا کہ

وہ اس سے ملنا چاہتے گئے۔ چیف منسٹر نے اس کا سراغ لگوایا۔ قدوائی صاحب اس کے گھر گئے' اور اس کی
دیکھ کر کہا: "تم نے یہ کبھی نہیں لکھا کہ اس حالت میں ہو۔" ان کے دہلی جانے کے بعد ہر ماہ اس شخص کو پانچسو
کا منی آرڈر آنے لگا۔ ہمارے میزبان کو زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ قدوائی صاحب نے ایسے شخص کی مدد کی
کے کسی کام نہیں آ سکتا تھا جب کہ سیاسی لوگ صرف اس کا خیال کرتے ہیں جو الیکشن میں اُن کے کام آسکے
قدوائی صاحب کی سوجھ بوجھ اور انتظامی صلاحیتوں کے واقعات ہزاروں ہیں۔ میں صرف
ذکر کروں گا جو میرے علم میں ہیں۔ انھوں نے (All-up Air Mail scheme) نکالی' تاکہ ہندوستان
پانچ بڑے شہروں کے درمیان ڈاک اگلے دن پہنچ جایا کرے۔ ٹاٹا ایرویز نے سخت مخالفت کی اور
کو ناقابلِ عمل قرار دیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ اس کی رائے میں ہوائی کمپنیوں کو جو ڈاک لے جانے کا معا
دیا جا رہا تھا وہ کم تھا۔ معاملہ کابینہ کی ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ مگر معاملہ بغیر میٹنگ کے ہی طے
ایک ڈیڑھ صفحے کا نوٹ وزارت مراسلات کی طرف سے آیا' جس میں ٹاٹا ایرویز کا کچا چٹھا تھا اور سفا
کی گئی تھی کہ جتنی رعایت حکومت کی طرف سے آئے ملتی ہے اس سے کم پر حکومت خود اپنی ایک کمپنی چلا
وزارت سے ٹاٹا والوں نے معافی مانگی اور اس کا باقاعدہ اخبارات میں اعلان کیا۔
بحیثیت وزیر غذا قدوائی صاحب کنٹرول کے خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کنٹرول خود قلت
کا باعث بن جائے گا۔ کابینہ کو ان کی رائے سے اتفاق نہ تھا۔ کنٹرول ہٹانے کے لیے معاملہ کمیشن کے سپرد
گیا۔ مگر کسی کی ہمت نہ تھی کہ قدوائی صاحب سے ٹکر لے۔ دہلی کے ایک پروفیسر کو جو بیباکی اور زبان
میں ثانی نہ رکھتے تھے۔ پس پردہ تیار کیا گیا۔ جب میٹنگ ہوئی تو پروفیسر صاحب نے دھواں دھار تقریر کی
کنٹرول ہٹا لینے کے خطرات سے آگاہ کیا۔ قدوائی صاحب نے صرف دو باتیں کیں "پلاننگ کمیشن صرف دو
آدمی ایسے دیدے جو کنٹرول کو ایمانداری سے چلا سکیں۔ رہا غریب آدمی کے مفاد کا سوال' اس کا انتظا
کر لیا گیا ہے' اسے بھوک سے مرنے نہ دیا جائے گا۔" اس شام کو خبر آئی کہ مدراس کے چیف منسٹر نے شہر مدراس
کنٹرول ہٹا لیا ہے۔ قدوائی صاحب نے پس پردہ تمام انتظامات مکمل کر لیے تھے' لہٰذا حالات قابو میں ر
قدوائی صاحب کی کامیابی کے وجوہات مختلف لوگوں نے مختلف بیان کیے ہیں۔ میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ ا
عوام کے بہت قریب تھے۔ اس لیے انھیں حقیقت کا پتا رہتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ گورنمنٹ کی مشین
قیدی نہ تھے' بلکہ اس پر حاوی تھے۔ فائلوں سے انھیں چڑ تھی اور وہ زبانی حکم صادر کرتے تھے' او

ے کام کی رپورٹ سینیر افسران سے زبانی ہی سُنتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ انہیں غلط رپورٹ دے۔

دہلی آجانے کے بعد مجھے اجمل خاں صاحب کی ہمسائیگی کا فخر حاصل ہوا۔ وہ مولانا آزاد کے پرائیویٹ سکریٹری تھے اور برسوں سے ان کے معاون۔ مولانا کے وہ بہت قریب تھے اور ان کی بے لوث خدمت کرتے تھے۔ مولانا کے یہاں سے ان کے اور ان کے بچوں کے لیے اکثر تحفے تحائف آیا کرتے۔ مگر ایک بات میرے لیے اچنبھے کی تھی۔ وہ دفتر پیدل ہی آتے جاتے۔ حالانکہ وہ دیر سے کام سے واپس آتے اور کبھی کبھار تو بارہ بجے۔ یہ صحیح ہے کہ آزادی کے اس ابتدائی دور میں سرکاری گاڑی کا استعمال اتنا عام نہ تھا جتنا اب ہے۔ اگر وزراء کے پرسنل اسٹاف کو اجازت تھی اسٹاف کار سے آنے جانے کی۔

ایک دن اجمل خاں صاحب نے بتایا کہ مولانا نے مجھے یاد فرمایا ہے۔ مجھے خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی۔ مولانا طبعاً تنہائی پسند تھے اور اپنی مقبولیت کی کوئی تمنا نہ تھی جو عام طور سے تمام سیاسی لیڈروں کی ہوتی ہے۔ لیڈروں میں بھی ان کے تعلقات صرف مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، سی۔ آر داس، آصف علی اور بھولا بھائی ڈیسائی تک تھے۔ چند علمی لوگوں سے (مثلاً حبیب الرحمٰن خاں شروانی) سے بھی ان کے قریبی مراسم تھے۔ میں نے اجمل خاں سے بار بار کرید کر پوچھا کہ کس سلسلہ میں میری طلبی ہوئی ہے۔ مگر انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور صرف اتنا کہا کہ ایک بار کسی موقع پر میرا تذکرہ ہوا تھا۔

میرے بچا، بزرگ اور میرے دو بھائی مولانا کے بہت قائل تھے اور اُن سے میں نے مولانا کے علم و فضل اور کردار کے واقعات سُنے تھے۔ انھیں کے طفیل میں میں نے الہلال کی پُرانی کاپیاں دیکھی تھیں اور مولانا کی مشہور تصنیف 'ترجمان القرآن'۔ اس لیے مجھے بھی مولانا سے بڑی عقیدت تھی اور میں ان کے سیاسی موقف کو سولہ آنے صحیح سمجھتا تھا۔ میرے نزدیک یہ مسلمانوں کی بڑی بدقسمتی تھی کہ جذبات میں آکر انھوں نے غلط لوگوں کی قیادت قبول کر لی۔

مقررہ تاریخ اور وقت پر میں مولانا کے دولت خانہ پر حاضر ہو گیا۔ اجمل خاں صاحب نے مشایعت کی۔ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہی تھے کہ مولانا تشریف لے آئے۔ بیٹھتے ہی وہ خاں صاحب سے مخاطب ہوئے اور کہا: خاں صاحب آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ششدر رہ گیا۔ خاں صاحب سے ان کے دیرینہ تعلقات۔ پھر یہ کہ ان ہی کے ذریعہ تو میرے وجود کا علم ہوا۔ پھر یہ کہ پرائیوٹ سکریٹری سے کوئی بات راز نہیں رکھی جاتی۔ میں حکومت میں کام کرتا تھا اور مجھے خوب معلوم تھا کہ وزیر کا پرسنل اسٹاف

بہت منہ چڑھا ہوتا ہے۔

خان صاحب کو رخصت کر کے مولانا میری طرف متوجہ ہوئے۔

"آپ کابینہ کے دفتر میں کام کرتے ہیں؟"

"جی ہاں"

"ذرا یہ بتایئے کہ آپ کے دفتروں کے کاغذات کس طرح ٹائپ اور اسٹینسل (stencil)
ہوتے ہیں اور فائل کیسے گھومتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہماری راز کی باتیں اخبارات میں آجاتی ہیں۔"

میں نے مولانا کے تمام سوالات کے مناسب جوابات دیئے۔ دوران گفتگو میں چائے آئی۔ ملازم تربیت یافتہ تھا۔ اس کے آنے کی کوئی آہٹ نہیں ہوئی اور اس کی موجودگی کا علم مجھے اس وقت ہوا جب چائے کی ٹرے مولانا کے سامنے رکھی۔ چائے پہلے سے تیار نہ تھی۔ مولانا نے چائے کی پتی کیتلی میں ڈالی خود ہی پیالی چائے انڈیلی۔ ملازم ٹرے رکھ کر چلا گیا تھا اور فرائض میزبانی خود مولانا نے انجام دیے۔

جب گفتگو ختم ہوگئی، تو مولانا اٹھنے لگے۔ مجھے یکایک یہ احساس ہوا کہ یہ موقع دوبارہ نہ
اس سے کچھ فائدہ اٹھاؤ۔

"مجھے یہ شرف دوبارہ تو حاصل نہ ہو۔ میرے ذہن میں کچھ سوالات تھے اجازت ہو تو ..."

کوئی چوتھائی سکنڈ کے لیے مولانا کچھ ٹھٹکے۔ پھر نہایت شفقت سے بولے "پوچھیے"

"جب بھی کسی انقلاب کے بعد ایک نئی حکومت آتی ہے تو نوکر شاہی کو برخاست کر دیتی ہے اور ا
مطلب کی سول سروس ٹرین کر لیتی ہے۔ انگریزوں کا چھوڑا ہوا نظام اسی طرح قائم ہے۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ مولانا تجاہل عارفانہ سے کام لیں گے اور چلتا ہوا سا جواب دیں گے۔ مگر جو جواب انھو
دیا وہ میری توقعات سے اس قدر بلند اور صادق تھا کہ دل ہی دل میں میں نے کہا ستری آواز کے اور مدینے جو

بھائی میرے چاہے یہ سمجھو کہ ہم بڈھے ہو گئے، چاہے یہ سمجھو کہ ہمیں اپنے اوپر اعتماد نہیں رہا
وقت کانگریس ہائی کمانڈ یہ محسوس کرتی ہے کہ اگر ایک اینٹ ہٹائی تو پوری عمارت نیچے آن گرے گی۔

دوسرا سوال یہ تھا: "آپ کی رائے میں تقسیم محض مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے صحیح ہوئی یا غلط
"بھائی میرے، ۳ جون ۱۹۴۷ء کو مسلمانوں کی جو ساکھ اس برصغیر میں تھی وہ ختم ہوگئی اور نج
نے یہ بتایا کہ ساکھ ہی ساکھ تھی اور کچھ نہ تھا۔ میں نے چاہا کہ وہاں تو ایک نقشہ بن ہی گیا، یہاں کا بھی بنا لے

جناح اور لیاقت علی خاں کو پیغامات بھجوائے، سب مسلم ملازمین کو مت لے جاؤ۔ مگر مجھ سے کہا گیا منہ سے روکیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کم از کم فوج اور پولیس تقسیم نہ ہو مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اب پاکستان بن گیا اور اس کی مخالفت کرنا بے سود ہے۔ اگر پاکستان کے لوگوں میں عقل ہے، تو چاہیے کہ ایک مضبوط معاشی بنیاد ڈالیں، اسی میں بقا ہے۔"

مولانا کا ہر لفظ میرے دل و دماغ پر کندہ ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے، تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ جو کچھ انھوں نے کہا وہ بالکل صحیح تھا۔ آئندہ نسلوں کے سامنے یہ سوال بار بار اُٹھے گا کہ تقسیم کے بُرے اثرات کا ازالہ کیا ہو؟ جب "منطق" پر تقسیم ہوئی اس کو خود مسٹر جناح نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء والی تقریر میں جو انھوں نے گورنر جنرل پاکستان کی حیثیت سے کی ان الفاظ میں رد کر دیا: "آج سے نہ مسلمان مسلمان ہے نہ ہندو ہندو۔۔۔ ہم سب پاکستانی ہیں۔" بالفاظ دیگر الفاظ انھوں نے مولانا آزاد کے موقف کی تصدیق کر دی کہ آزادی کے بعد سیاست اور سیاسی پارٹیاں مذہب پر مبنی نہیں، بلکہ اقتصادیات پر مبنی ہوں گی۔"

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ اپنے آخری ایام میں مولانا کو اپنے سیاسی رفقاء کار سے شدید اختلاف ہو چلے تھے۔ تمام معاملات میں ان کا نقطۂ نظر اور ووٹ ہوتا تھا۔ انتقال بھی ناخوش گواری کی حالت میں ہوا۔ مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ ایسے شخص کو عہدہ دیا جائے جس کی دیانت کے متعلق عام پبلک میں شبہات ہو چلے ہوں؟ مولانا اکیلے ایک طرف تھے اور ان کے ساتھی دوسری طرف۔ رات کے بارہ ایک بجے تک بحث چلتی رہی اور بالآخر بادل ناخواستہ اکثریت نے ان کی رائے مان لی۔ میٹنگ سے واپسی پر مولانا کو دورہ پڑا اور مختصر علالت کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ دوران علالت ایک بار انھیں ہوش آیا اور جب انھوں نے وہ تمام آلات دیکھے جو اُن کی بازیابی صحت کے لیے استعمال کیے جا رہے تھے تو صرف اتنا کہا: "اللہ پر چھوڑ دو۔"

ختم کرنے سے پہلے مولانا کے تدبر کا ایک واقعہ بیان کرنا ضروری ہے۔ مولانا پنجاب کی سیاست دیکھا کرتے تھے۔ ان کے پاس شکایت ہوئی کہ مولانا ماسٹر تارا سنگھ اور ان کے ایجی ٹیشن سے نرمی کا برتاؤ کر رہے ہیں۔ جب یہ خبر مولانا کو ملی تو انھوں نے وزیر اعظم سے درخواست کی کہ اب پنجاب کے معاملات کوئی اور دیکھے۔ ایک ہی ہفتہ میں یہ حالت ہو گئی کہ یا تو حکومت ہتھیار ڈال دے یا پھر مارشل لا نافذ کرے۔ نہرو پنجاب کا فائل مولانا کو واپس کرنے آئے۔ فائل کو دیکھ کر مولانا نے مسکرا کر کہا کہ ان کو جانا چاہتا ہے۔ نہرو خاموش رہے۔ چلتے وقت پوچھا: مولانا آپ کیا کیجیے گا۔ مولانا کا جواب یہ تھا: "بھائی اس فائل پر باسی پانی کا ایک چھینٹا ماروں گا اور اس میں جان آ جائے گی۔"

اگلی صبح تمام اخبارات نے جلی الفاظ میں یہ خبر شائع کی کہ ماسٹر تارا سنگھ نے ایجی ٹیشن واپس لے لیا۔ مولانا نے انھیں اظہارات کی خاموشی میں بلوایا، انھیں قائل معقول کر دیا۔ فائل میں پھر سے واقعی میں جان آ گئی۔

●●

جاپان کے کچھ تأثرات

بچپن میں پڑھا تھا: دنیا کی طرح جو چلتا ہے، چلتا ہی وہ رہتا ہے؛ کوہساروں کو، میدانوں
خاطر میں کب لاتا ہے۔ مگر اس کے معنی برسوں بعد سمجھ میں آئے جب جاپان کی جیتی جاگتی مثال سامنے آئی۔

درس و تدریس کا سلسلہ ٹوکیو پہنچتے ہی شروع ہو گیا۔ دیکھا کہ ہوٹل کے سامنے والی سڑک بجلی کی
روشنی سے جگمگ ہے اور آدمیوں اور مشینوں کی مدد سے قدِ آدم کھودی جا رہی ہے۔ صبح جب چہل قدمی کے لیے
نکلا تو سڑک تیار ہو چکی تھی اور اس پر سے ٹریفک گزر رہی تھی۔ ملبہ تو کیا گرد تک کا نشان نہ تھا۔ خدایا
کیا ان لوگوں کے پاس علاؤالدین کا چراغ ہے؟

ایک بار کھانا کھانے ایسے وقت پہنچا جب بڑے ڈائننگ ہال کے اوقات ختم ہو چکے تھے۔ ہال
میں کوئی نہ تھا صرف خزانچی (cashier) کاونٹر پر بیٹھی روپیہ گن رہی تھی۔ میں تذبذب میں تھا کہ کیا کروں
اتنے میں خاتون کی نظر مجھ پر پڑی، مجھے اشارہ کیا اور پنیٹری میں گئیں اور وہاں سے ویٹرس کا سفید براق جھاڑن
(apron) لگائے آرڈر لینے آ گئیں۔ آناً فاناً میز سجا دی اور کھانا لے آئیں اور پھر اپنے کام میں جا مشغول
ہوئیں۔ کچھ وقفے کے بعد پھر آئیں اور گلاس میں دوبارہ پانی بھرا اور پوچھ کر کہ کچھ اور تو نہیں چاہیے اپنی
جگہ جا کر اپنے کام میں مشغول ہو گئیں۔ جوں ہی میں نے کھانا ختم کیا، بل لے آئیں۔ شاید مجھے یہ سبق دینا
مقصود تھا کہ جاپان میں کام مقدس فریضہ ہے۔ میں ایسے ملک سے آیا تھا جہاں 'پنچ' تمام 'پنچ' ہی لوگ
کرتے ہیں۔ اور اگر گرمی کی شدت سے کوئی خاتون بمبئی کے کسٹم ہاؤس میں بے ہوش ہو جائے تو ہر شخص پانی
کی صدا لگاتا رہے گا مگر پانی اسی وقت آئے گا جب چپراسی آ جائے۔ مشہور مصنف نائی پال (Naipaul)
نے اس واقعہ کو اپنی کتاب میں نہایت غصہ سے درج کیا ہے۔

اگر یہ جاننا ہو کہ تاریخی عمارات کی کیسے دیکھ بھال کرنی چاہیے تو جاپان جائیے۔ ایک ہزار سال سے
زیادہ عمر کی عمارات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بنی ہیں۔ بدھ مذہب کے ایک قدیم عبادت خانے کے کمپاؤنڈ
میں دریا سے نکلے چھوٹے چھوٹے خوبصورت پتھروں کا ایک 'باغ' ہے۔ پتھروں کو کسی راہب نے ایسا سجایا ہے کہ

بہ غور سے دیکھیے نئے ڈیزائن بنتے چلے جاتے ہیں۔ گزشتہ دو سو سال میں کروڑوں بچوں اور بڑوں نے اس
باغ کو دیکھا ہوگا مگر وہ جوں کا توں اپنی اصلی شکل میں قائم ہے۔ ہر عمارت پر بڑے بڑے الفاظ میں لکھا ہے
"ہمارے بزرگوں نے ہمیں یہ عطا کیا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کی دیکھ بھال کریں" کہاں جاپان اور کہاں
ہم۔ لائبریری کی کتابوں کے صفحے کے صفحے غائب کرنے سے نہیں چوکتے۔

قرآن کریم میں حکم ہے کہ باہمی مشورہ سے کام کرو۔ ہمارا عمل اس کے بالکل برخلاف ہے۔ مگر جاپان میں
اس قرآنی حکم کی پوری تعمیل ہوتی ہے۔ فیصلے رائے شماری سے نہیں اتفاق رائے سے طے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے
کا نقطہ نظر سمجھنے کی کوشش ہوتی ہے اور اگر اختلاف بہت شدید ہو جائے تو کسی بزرگ کو بیچ میں ڈالا جاتا ہے۔
وہ مختلف نقطہ ہائے نظر میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور لوگوں کو ایک متفقہ فیصلے پر پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔
وہ اپنا فیصلہ دوسروں کے سر نہیں تھوپتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طرز حکومت کچھ ہی ہو حکومت کسی بھی پارٹی یا
دھڑے کی ہو، جاپان میں فیصلے باہمی مشورہ سے ہوں گے اور یہ کہنا مشکل ہوگا کہ وہاں آمریت ہے کہ جمہوریت۔

پس پردہ حکمران پارٹی میں خوب زوروں کی چلتی ہے اور ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنے میں کوئی تکلف
نہیں برتا جاتا۔ مگر کچھ کرسیاں ایسی ہیں کہ ان کے لیے نہیں لڑا جاتا۔ مثلاً ایک ہی شخص ہے جو کابینہ کی اقتصادی
سب کمیٹی کا چیئرمین ۴۵ء سے چلا آرہا ہے۔ ایک ہی شخص ہے جو ۴۵ء سے وزیر اعظم کا مشیر چلا آرہا ہے۔
دونوں میں سے کوئی نہ پارلیامنٹ کا ممبر ہے اور نہ سیاست داں۔ اس تسلسل کا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں حضرات
تجربات کا خزانہ ہیں جو بڑھتا رہتا ہے۔ وہ اپنے عہدے سے اسی وقت ہی ریٹائر ہوں گے جب وہ کہیں
"اب ہم کام کرنے کے قابل نہیں ہیں ہمیں رخصت کیجیے"۔ پھر بھی انھیں مکمل طور پر جانے نہیں دیا جائے گا ہفتہ
عشرہ میں ایک بار وہ خود اپنے دفتر مشورہ کے لیے آئیں گے یا لوگ ان کے پاس اسی غرض سے جائیں گے۔

جاپان میں تن آسانی حرام ہے اور "براہ راست بروا اگرچہ دوراست" پر عمل ہوتا ہے۔ ۸۸۰ء
میں مالی بحران آیا اور کابینہ میں شدید اختلاف رائے ہو گیا کہ آیا بیرونی قرضہ لیا جائے، جیسا کہ ایک
یورپ کا مرض ہے۔ معاملہ بادشاہ کے سامنے رکھا گیا: "آج کی مشکلات ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔
ہمیں چاہیے کہ مستقبل کے نصب العین کی بھی سوچیں اور اس کے حصول کے لیے پوری جدوجہد کریں۔۔۔
۔۔۔ میری مرضی تو یہی ہے کہ آپ محنت شاقہ کے رستے اقتصادی حل تلاش کریں۔"
بادشاہ کے اس فیصلے کے بعد نہ صرف مزید قرض نہیں لیے گئے پرانے قرضوں کی بھی ادائیگی کر دی گئی۔

جاپان کی اس خود اعتمادی ہی نے اسے بچا لیا۔ عین اس زمانہ میں جب ایشیائی ممالک یکے بعد دیگرے طاقتوں کے غلام ہو رہے تھے، جاپان اپنی آزادی قائم رکھ سکا۔ دوسرے جنگ عظیم کے بعد بھی وہ اپنے زور کو کام میں لایا۔ بجائے بکی بکائی روٹی (Turnkey project) کے جس کو دیگر ایشیائی ممالک ترجیح رہے تھے، جاپان نے نہایت سستے داموں سکنڈ گریڈ کی ٹیکنالوجی خریدی اور اس کو بہتر سے بہتر بنا تھوڑے ہی دن میں اوّل گریڈ کی ٹیکنالوجی کے چشمے ابلنے لگے اور یورپ اور امریکہ سب پیچھے رہ گئے۔ آج ف المونیم بھاری کیمیات (Heavy chemicals) کے دنیا کے عظیم ترین کارخانے جاپان میں ہیں، یورپ اور میں نہیں اور بجلی کے سامان (Electronics) اور ٹیکنالوجی میں جاپان سب سے آگے ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ چوٹی پر پہنچ جانا آسان ہے مگر وہاں ٹکے رہنا مشکل ہے۔ جاپان کو اس کا شد سے احساس ہے۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کے پاس نہ قدرتی وسائل (معدنیات ہیں اور نہ امریکہ جیسا اندرونی مارکٹ۔ ہر خام مال باہر سے آتا ہے اور صنعتی پیداوار کا بیشتر حصہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں یہ مسئلہ سامنے آیا۔ ۱۹۷۰ء میں دانشور اس نتیجہ پر پہنچے کہ آئندہ سب سے بڑی صنعت "اطلاعات کی صنعت" ہو گی، جس کا کام دوسروں کی رہبری کرنا ہو گا۔ ان صنعتوں سے دست بردار ہو جانا چاہیئے جن کا انحصار بیرونی خام مال پر ہے۔ اس مشورہ پر عمل ش ہو گیا ہے اور آہستہ آہستہ جاپان متعلقہ کارخانے باہر کے ملکوں کو بھیج رہا ہے۔ وہ دن دور نہیں ہندوستان میں بھی ٹیوٹا Toyota کا ڑیاں امریکہ اور یورپ میں چل رہی ہوں گی۔

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ مروجہ نظریات کے بالکل برعکس جاپان میں جدید صنعت اور صنعتی انقلاب لانے والے سرمایہ دار نہیں، جاگیردارانہ نظام کے جنگجو خاندان (Samoray جب ایڈمرل پیری (Admiral Perry) نے جاپان کے دروازے کھٹکھٹائے تو ملک میں تہلکہ گیا۔ سمورائے نے چیلنج قبول کیا اور جدید صنعت قائم کی اور معاشرہ میں وہ سب تبدیلیاں کیں صنعتی انقلاب کے لیے لازمی تھیں (کاش کہ آج کے عرب ممالک کے شیوخ اور حکمران اس نصیحت پکڑیں!) فرسودہ نظام جاگیرداری کے ادارے ختم کر دیئے گئے اور ضروری سماجی اور انتظ اصلاحات نافذ کی گئیں۔ آج کے سب سے بڑے بڑے جاپانی بین الاقوامی فرم (firm) مثلاً مت Mitsui، متسوبشی (Mitsu-bishi) سمورائے خاندانوں کے نام ہیں جنہوں نے ا

ا کیا۔ یہ سب ۱۹ویں صدی میں ہوا ۔ ۲۰ویں صدی میں بھی اسی حقیقت پرستی سے کام لیا گیا۔
بری جنگ عظیم میں ہارنے کے بعد سب سے اہم اور فوری مسئلہ غذا کا تھا طے پایا کہ غلہ کی تجارت
نیصد حکومت کے ہاتھ میں ہوگی اور زمین کاشتکار کی ہوگی ۔ تھوڑے ہی دن میں ملک نہ صرف خود
ل ہوگیا بلکہ زائد غلہ رکھنے کی جگہ نہ رہی ۔ کسی نے اعتراض نہ کیا کہ " اشتراکیت " لائی جا رہی ہے۔
ب الوطنی اور اجتماعی شعور (ہمارے مارکسٹ اور غیر مارکسٹ اصحاب نوٹ فرمالیں) ذہنی تعصبات اور
ی منفعت پر غالب آگئے' ! اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج جاپان ترقی یافتہ ممالک میں سرفہرست ہے۔
بی جنگ سے متاثر ہونے کے باوجود اس نے جدید ٹیکنالوجی حاصل کی اور اس میں مزید ترقی حاصل کی ۔
ایک شکست خوردہ قوم کی طرح اپنے مستقبل کو تباہ نہیں کیا ، بلکہ مستقبل کی تعمیر میں تن من دھن
بازی لگادی ۔

آج دنیا کے تمام پچھڑے ممالک کے لیے یورپ اور امریکہ نہیں جاپان مشعل ہدایت ہے ۔ ہم ہندستان
مسلمانوں کو جاپان کے طریقہ کار کو اپنانا چاہیئے تاکہ ہم بیکاری سے نجات پاسکیں۔

●●

روزگار کا مسئلہ

خدا کا شکر ہے کہ علی گڑھ میں اب تعمیری کام کے لیے فضا پیدا ہو چلی ہے۔ سب
اہم اور پریشان کن سوال روزگار کا ہے۔ اب تک ہماری توجہ سرکاری ملازمت اور مقابلے کے امت
پر رہی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم دیگر مواقع کی بھی سوچیں۔ مقابلہ کے امتحانات میں چند ہی لوگ کا
ہوسکتے ہیں اور ملازمتوں میں بھی ہر نوجوان کی کھپت نہیں ہوسکتی۔

اس وقت ہندوستان صنعتی دور سے گزر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ قدرت نے جو عظیم معد
اور زرعی وسائل اسے عطا کیے ہیں انھیں کام میں لائے اور جلد از جلد خودکفیل ہوجائے۔ گزشتہ ۳۰ بر
میں نت نئی صنعتیں قائم ہوئی ہیں اور بازار میں شاید ہی کوئی ایسی چیز ملے جو باہر کی بنی ہوئی ہو۔ صنعت سا
کے لیے حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ کم سرمایہ کے لوگوں کو بھی موقع دیا جائے اور ایسے شعبوں کا خاص خیال رکھ
جن میں انسانی محنت کی نسبتاً زیادہ کھپت ہو۔ انھیں دو اصولوں کے مدنظر کچھ شعبوں میں بڑے کارخا
کی اجازت نہیں ہے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ صنعت سازی وبا کی طرح پھیلتی ہے۔ جب بھی کہیں کوئی کارخانہ قائم ہوتا
تھوڑے ہی دن میں اس کے معاون کارخانے اور کاروبار وجود میں آجاتے ہیں۔ اگر شکر کی فیکٹری ہے تو اس
شیرے کو کام میں لانے کے لیے کئی اور کارخانے کھل جائیں گے۔ کوئی اس سے الکوہل بنائے گا، کوئی موٹا کاغذ
کوئی کچھ اور۔ ہر نئے کارخانے کے لیے تربیت یافتہ انسانوں کی ضرورت ہے۔ علاوہ کارخانے کے اند
کام کرنے والوں کے، ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو مرمت اور متعلقہ کاموں سے واقف ہوں۔

صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ زراعت کو بھی بہت فروغ ہوا ہے۔ زراعت میں مشین کا استعمال
روزافزوں ہے۔ ساتھ کے ساتھ قصبات اور دیہات میں بھی بجلی آجانے کی وجہ سے بہت سی گھریلو صنعتیں
قائم ہوگئی ہیں اور ہوتی جارہی ہیں۔ اب دیہات میں انجینئروں، مستریوں وغیرہ کی خاصی مانگ ہوگئی ہے۔ خو
کی وجہ سے دیہات میں ایک ایسا متمول طبقہ وجود میں آگیا ہے جن کا معیار زندگی شہری معیار زندگی کے برا

وں کی ضرورت ہے اور اچھے گھریلو برتنوں، فرنیچر، ریڈیو وغیرہ کی بھی۔ بدیگر الفاظ جہاں تک اشیا
کا سوال ہے، دیہات اب اچھا خاصا مارکیٹ ہے۔

جب ہم روزگار کے مسئلہ کو اپنی معاشی ترقی کے پس منظر میں دیکھتے ہیں تو ہمیں ان مواقع کا کچھ اندازہ
ہو اس وقت موجود ہیں۔ ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک تو ہنر اور دوسرے جرأتِ رندانہ
ت ہے۔ اگر کوئی ملازمت کے لیے نکلے گا تو دروازہ بند پائے گا۔ ہاں اگر وہ مخلوق کی خدمت کی
رکھتا ہے تو شہروں کے بجائے قصبات اور دیہات کا رخ کرے، پیسہ اس پر برسے گا اور ساتھ
عوام کی محبت اور ان کا احترام بھی اسے حاصل ہو گا۔ کم و بیش یہی بات انجینیر پر بھی صادق آتی ہے۔

اس وقت ملک میں نوجوانوں کو خودکار بنانے کی سیکڑوں اسکیمیں ہیں جن پر ہر سال کروڑہا روپیہ
ہے۔ مرکزی حکومت کا بجٹ علیحدہ ہے، صوبائی حکومتوں کا علیحدہ۔ مجھے نہیں معلوم کہ علی گڑھ کے طلبا
نے کہاں تک فائدہ اٹھایا ہے۔ ظاہر ہے کہ رہبری کی ضرورت ہے۔ علاوہ معلومات فراہم کرنے کے کچھ اور
ہے وہ کیا ہو؟ اس کا جواب سنجیدہ مطالعہ اور غور و خوض کے بعد دیا جا سکتا ہے۔ سردست یہ کہا جا
کہ ہمیں نصاب میں ان مضامین کو جگہ دینی ہو گی جن سے نوجوانوں کو خودکار بننے کی ترغیب ہو۔
کے لیے شعور پیدا ہو۔ انجینیرنگ، سائنس، معاشیات، کامرس، بزنس ایڈمنسٹریشن کے مضامین
کے علاوہ ہر طالب علم کے لیے (Business enterprise) کا پرچہ لازمی ہونا چاہیے اور
اہمیت وہی ہونا چاہیے جو مثلاً انگریزی زبان کی ہے۔

انجینرنگ اور سائنس کے طلبا کے لیے اپنے اپنے میدان میں ایک ہنر سیکھنا لازم ہونا چاہیے۔ اس کے لیے
ہو گا کہ ہمارے انجینیرنگ کالج اور پولی ٹکنیک کی توسیع کر کے انھیں (Industrial Estate)
بنا دیا جائے، جہاں طلبا مختلف چیزیں بنائیں/مرمت کریں۔ کوئی وجہ نہیں کہ یونیورسٹی کے چلائے ہوئے
چھوٹے کارخانے یونیورسٹی اور علی گڑھ شہر کے لیے عام ضروریات کی چیزیں نہ بنا سکیں۔ اسی طرح
مشینوں کی مرمت کے لیے گریجویٹ اور غیر گریجویٹ طلبا کی ٹیمیں تیار کر سکتی ہے اگر ان کا کام عام
مقابلے بہتر اور سستا ہو گا تو بازار میں ان کی مانگ یقینی ہے۔

طلبا کو چھوٹے چھوٹے بزنس چلانے کی ترغیب نہایت مؤثر اور عملی طریقہ پر دی جا سکتی ہے۔
اگر جاندار اور معتبر طلبا کو رستوران، لباس، پرچونیہ وغیرہ کی دکانیں کھولنے کی دعوت

دیا جائے؟ ترغیب کے لیے کچھ سالوں کے لیے زمین/دوکان کا کرایہ معاف۔ یونیورسٹی میں جو اسا[illegible]
ان کے ذریعہ آسے وغیرہ وغیرہ۔ ہر ہوسٹل میں چائے خانہ سابق گریجویٹ طلباء کو کھولنے کی اجازت
دے دی جائے۔ شروع میں ان شعبوں کو لیا جائے جن میں کم سرمایہ لگے اور مانگ کافی اور وا[illegible]
جن حضرات کو ایک ہی طریق پر سوچنے اور چلنے کی عادت ہے تو وہ مندرجہ بالا تج[illegible]
کی مخالفت نہیں تو مذاق ضرور اڑائیں گے۔ ایسے لوگوں سے بحث مباحثہ بیکار ہے، ان کو دعو[illegible]
دی جائے کہ وہ کوئی بہتر اور زیادہ موثر کام شروع کر دیں۔ مگر جو حضرات مخالفت یا تضح[illegible]
محض اپنے نکمے پن کی وجہ سے کریں، انھیں پنشن دے کر باعزت طور پر رخصت کر دیا جائے

توکل کا غلط مفہوم :

کچھ لوگ محنت ومشقت اور کام کاج سے بچنے کے حدیث کا سہارا لیتے ہیں جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

"اگر تم خدا پر بھروسہ کرو، تو پرندوں کی طرح وہ تمھیں روزی عطا کرے گا، تم پرندوں کو دیکھتے ہو کہ صبح خالی پیٹ گھونسلوں سے نکلتے ہیں، لیکن شام کو آسودہ ہو کر واپس آتے ہیں"

ان لوگوں کی دانست میں حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا پر توکل کیا جائے تو روزی خود آ[illegible]
جاتی ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ یہی حدیث خود ان کے مفروضے کو غلط ثابت کرتی ہے اور حصولِ رزق
جد وجہد کرنے کی صاف طور پر دعوت دیتی ہے۔ اس لیے کہ یہ حدیث بتاتی ہے کہ پرندوں کا شکم سیر واپس
وقت ممکن ہوتا ہے کہ جب رزق کی تلاش میں وہ نکل کھڑے ہوتے ہیں اور دن بھر اسی فکر میں سرگرد[illegible]
رہینگے یا پرندوں کی دوا دوش ان کے لیے حصولِ رزق کا سبب ہے۔ (یوسف القرضاوی)

محمد مجتبیٰ صدیقی

جناب محمد مجتبیٰ صدیقی : (پیدائش   تقریباً)
۱۹۲۴ء میں آئی اے ایس (انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس)
کا عہدہ سنبھالا۔ الہ آباد بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہوئے۔
۱۹۵۹ء میں ریٹائر ہو گئے۔ اس کے بعد تین سال تک
ریاست جموں و کشمیر میں فنانشیل کمشنر رہے۔ ۱۹۶۴ء تا
۱۹۶۵ء علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے۔
ڈاکٹر عبد الجلیل مرحوم کے روزنامہ "قائد" (لکھنؤ)، انگریزی
روزنامہ نیشنل ہیرالڈ اور اسلام اینڈ موڈرن ایج میں
آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ فی الحال علیگڑھ
میں مقیم ہیں۔

●●

بین مذہبی مناکحت

ایک مشترک سول کوڈ کے اجرا کے لئے ملک میں آزادی کے بعد سے اکثر آواز اٹھائی جارہی
ظاہر ہے کہ ایسا کوڈ قوانین شریعت کا پابند نہیں ہوگا۔ اس طرح کا ایک قانون یعنی اسپشل میرج ایکٹ ۵۴ء
میں بن چکا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اس قانون کے تحت رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتا ہے، تو نکاح کے تمام ا
و شرائط جو شریعت نے عائد کر رکھے ہیں نظر انداز ہو جاتے ہیں اور مہر، طلاق، وراثت، اولاد وغیرہ کے مسائل
قوانین شریعت کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔ تبنیت، جس کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں ہے کے متعلق بھی ایک ایسے
کا اجرا زیر غور ہے۔ گو اسپشل میرج ایکٹ کا نفاذ لازمی طور پر مسلمانوں پر نہیں ہوتا اور نہ غالباً تبنیت کے ق
قانون میں کوئی ایسی قرارداد ہوگی لیکن حق اختیار کے حاصل ہونے سے مسلمانوں کے لئے ان احکام شریعت
جن پر چودہ سو سال سے عمل ہو رہا ہے، انحراف کا راستہ کھل جائے گا۔

اسپشل میرج ایکٹ کو مسلمانوں نے ابھی اتنا نہیں اپنایا ہے کہ اس کے پس پشت جو خطرہ ہے وہ
سامنے آجائے لیکن کچھ تعجب نہیں کہ مستقبل قریب میں یہ ایک وبا کی صورت اختیار کرلے۔ مسلمانوں کے ایسے
جو خاندان کے باہر تک رشتۂ مناکحت استوار کرنا معیوب سمجھتے تھے (گو یہ کوئی قابل تعریف بات نہ تھی) اب ا
آگے بڑھ گئے ہیں کہ عواقب کا لحاظ کئے بغیر ان کے نونہال ایکٹ میں دی ہوئی رخصت کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ا
کے افراد ان کی روک تھام تو درکنار، خود ان کی اس "خوشی" میں شریک ہوتے ہیں اور مذہبی غیرت و حمیت یا
عصبیت کوئی بھی ان کا راستہ نہیں روکتی۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ شریعت کی رو سے مسلمان مرد کا نکاح صرف مسلمان عورت سے ا
مسلمان عورت کا نکاح صرف مسلمان مرد سے جائز ہے۔ کتاب اللہ میں مشرک سے نکاح کی ممانعت ان الفاظ میں وارد
"تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی شرک
کرنے والی سے بہتر ہے۔ اگرچہ وہ تمھیں بہت پسند ہو۔ اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا جب
تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن غلام شرک کرنے والے سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمھیں بہت پسند ہو۔ یہ
لوگ تمھیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے......" (۲-۲۲۱

اس آیت میں مسلمان مرد اور مسلمان عورت دونوں کے لئے مشرک سے نکاح کی صریحاً ممانعت ہے۔ بلکہ تیرے
تیل میں یہ اشارہ کہ "یہ لوگ تمھیں آگ کی طرف بلاتے ہیں" ایک طرح سے وعید بھی ہے۔

اس ممانعت کا ایک نفسیاتی پہلو ہے۔ ازدواجی رشتہ ایک ایسا گہرا قلبی تعلق ہے جو اسی وقت پایۂ تکمیل
کو پہنچ سکتا ہے جب اس کے ساتھ روحانی تعلق بھی شامل ہو۔ اگر دونوں فریقوں یا اُن میں سے کسی ایک کو مذہب
سے کچھ بھی لگاؤ ہے تو ایسے اہم مسئلہ میں اختلاف ہونا دونوں کی زندگیوں کے لئے اس سے زیادہ مضرت رساں
ہو سکتا ہے جتنا کہ پیدائش، نسل، زبان یا دنیاوی حیثیت کا فرق۔ اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ دونوں فریقوں کا
اعتقادی نظریہ ایک ہونا چاہیئے۔ اگر دو شخص ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں، تو دنیا کے اہم ترین مسائل میں اُن
کے خیالات میں ایک حد تک ہم آہنگی ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو ان کے انفرادی اور اجتماعی مسائل دونوں میں آئندہ
چل کر دشواریاں پیش آئیں گی۔

مسلمان مرد کو عورت کے مقابلہ میں ایک رخصت بھی دی گئی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"آج تمھارے لئے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اہل کتاب کا کھانا تمھارے لئے، اور تمھارا
کھانا ان کے لئے اور محصنات (پاکدامن عورتیں) بھی تمھارے لئے حلال ہیں، خواہ وہ اہل ایمان کے
گروہ میں ہوں یا اُن قوموں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی ...." (۵-۶)

یہ سوال علیحدہ ہے کہ کن قوموں کا شمار اہل کتاب میں ہے۔ یہود و نصاریٰ کا ذکر بحیثیت اہل کتاب قرآن
کریم میں ہے اور عام طور سے یہی لوگ اہل کتاب مانے جاتے ہیں۔ لیکن کتاب اللہ میں کئی مقامات پر یہ بھی ارشاد ہوا
ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر امت کے لئے رسول بھیجے ہیں:

"ہر امت کے لئے ایک رسول ہے ....." (۱۰-۴۷)

"ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا ......" (۱۶-۳۶)

بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت کاملہ اسی کی مقتضی بھی تھی کہ اس کا پیغام لانے والے صرف جزیرۃ العرب
ہی کے لئے مخصوص ہو کر نہ رہ جائیں، بلکہ دنیا کی اور قومیں بھی ان سے فیضیاب ہوں۔ البتہ ان رسولوں کو کتابیں
بھی دی گئیں تھیں یا نہیں اس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ لیکن اغلب ہے کہ جیسا اللہ تعالیٰ کا دستور جزیرۃ العرب کے لئے
تھا، ویسا ہی کرۂ ارض کے اور خطوں کے متعلق بھی رہا ہو اور کتابیں دی گئی ہوں، مگر غالباً وہ ضائع ہو گئیں۔
انجیل مقدس ہی کو لیجئے۔ حضرت عیسیٰؑ کے فوراً ہی بعد وہ ضائع ہو گئی اور اس کی جگہ اُن کے حواریوں کی تصنیف کردہ

کتابوں نے لے لی جن کو انجیل کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ــ

ہندوستان کے ایک بہت بڑے صوفی بزرگ حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ کا خیال ہے کہ یسلک بھی اس برکا محروم نہیں رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے رگ وید کی ایک مشہور دعا "گایتری" کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ تو بہتوں نا 'بانگ درا' میں پڑھا ہوگا۔ مگر علامہ نے اس پر جو شذرہ لکھا ہے اس کے ساتھ اگر نظم پڑھی جائے تو اس کا مطلا ہو جاتا ہے۔ یہ شذرہ چونکہ 'بانگ درا' کے عام ایڈیشنوں میں نہیں ملتا اس لئے ہم اس کا ایک ٹکڑا یہاں نقل کرتے ہ

"ذیل کے اشعار 'رگ وید' کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں۔ جس کو 'گایتری' کہتے ہیں۔

یہ دعا اعتراف عبودیت کی صورت میں گویا ان تاثرات کا اظہار ہے جنھوں نے نظامِ عالم کے حیرت ناک مظاہرہ کے مشاہدہ سے اوّل اوّل انسان ضعیف البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا ۔ ۔ ۔ یہی وہ دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک پائی جاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حق یہ ہے کہ زبان سنسکرت کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنۂ حال میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اصل سنسکرت میں لفظ "سوتر" استعمال کیا گیا ہے، جس کے لئے اُردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ "آفتاب" رکھا ہے۔ لیکن اس لفظ سے مراد اس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے مادی آفتاب کسب ضیا کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے اور نیز صوفیائے نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے " اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ "۔ اور شیخ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں کہ

" اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں، لیکن وہ خود نظر نہیں آتا ۔ ۔ ۔ ۔ "

شذرہ کا اتنا ٹکڑا لکھنے کے بعد طوالت کے خوف سے گو نظر انداز کرکے نظم بھی ہم یہاں نقل کئے دیتے ہیں

آفتاب

اے آفتاب روح روانِ جہاں ہے تو ۔۔۔ شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا ۔۔۔ ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے ۔۔۔ ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے ۔۔۔ دل ہے، خرد ہے، روح رواں ہے، شعور ہے
اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے ۔۔۔ چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو ۔۔۔ یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو

تراکمال ہستیٔ ہر جاندار میں — تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو — زائیدگان نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا تری نہ کوئی انتہا تری — آزاد قید اوّل و آخر ضیا تری

آپ دیکھیں گے کہ نظم کے ہر شعر سے وحدانیت پر ایمان کا اظہار ہوتا ہے، کہیں کوئی شائبہ شرک نہیں ہے۔

شذرہ کے آخر میں علامہ تحریر فرماتے ہیں : "پس ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گرداننا میرے نزدیک ہی نہیں معلوم ہوتا"۔ بیشک نظم کے پڑھنے کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ علامہ کا خیال صحیح ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل ہندو مذہب کے [illegible] سے بہت مختلف ہو گئے ہیں۔

یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ جو رخصت مرد کو کتابیہ سے نکاح کرنے کی دی گئی ہے، وہ عورت کے لئے لازم کیوں ہے۔ میرے خیال میں اس میں ایک حکمت مضمر ہے۔ عورت کو مرد کے برابر درجہ دینے کی زمانۂ حال میں بڑی کوششیں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں اور خالص نظری اعتبار سے برابری کا یہ دعویٰ تسلیم بھی کر لیا گیا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اور میدان عمل میں مرد کا تفوق بدستور قائم ہے۔ قرآن کریم اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :

"... عورت کے لئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مردوں کے حقوق اُن پر ہیں۔ البتہ مردوں کو اُن پر ایک درجہ حاصل ہے ....." (۲ + ۲۲۸)

کوئی بھی ادارہ ہو، اس کو کامیابی سے چلانے کے لئے کسی ایک شخص کی سربراہی ضروری تسلیم کی گئی ہے۔ ہر شخص کو برابری کا درجہ دیدیا جائے تو جتنے منہ ہوں گے، اتنی باتیں، اور نتیجہ سوائے انتشار کے اور کچھ نہ ہوگا۔ اسی طرح انسانی معیشت کو کامیابی سے چلانے کے لئے چھوٹی سے چھوٹی اکائی جو قائم کی گئی ہے، وہ خاندان ہے اور اس کا بھی ایک سربراہ ہونا چاہیئے۔ مرد ہی سربراہ ہے۔ ظاہر ہے کہ خاندان میں جس کو تفوق حاصل ہوگا اسی کے مذہب کو بالادستی بھی حاصل ہوگی۔ اس کے عقائد، عادات اور اطوار کا اثر اہلِ خاندان اور خاص کر اس کی اولاد اور زوج پر پڑے گا۔ اس لئے اگر شوہر غیر مسلم ہے اور بیوی مسلمان تو شوہر کے عقائد کا اثر اولاد اور بیوی پر پڑنا ضروری ہے۔ ملکی قانون اب یہ ہے کہ اولاد کا وہی مذہب ہوگا جو شوہر کا ہے۔ اسلامی شریعت اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ جس ماحول میں کفر و شرک کا دور دورہ ہو۔ اس میں ایک مسلمان عورت نکاح کر کے مجبوری کی زندگی

بسر کرے اور اس کی اولاد دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے۔

لیکن اگر کوئی مسلمان ان واضح احکام کے ہوتے ہوئے ان کی خلاف ورزی کرے تو کیا صورت ہوگی؟ حنبلی فقہ میں تو ایسے نکاح باطل مانے جاتے ہیں۔ یعنی سرے سے ان کا انعقاد ہی نہیں ہوتا۔ اور یہی حکم مالکی، شافعی اور حنبلی فقہ میں ہے۔ بہ الفاظ دیگر مرد اور عورت دونوں زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لیکن حنفی فقہ میں ایسے نکاح باطل نہیں بلکہ فاسد سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی نکاح منعقد ہو جاتا ہے اور اس نکاح فاسد سے اگر اولاد ہوگئی تو اس کا نسب باپ سے ثابت مانا جاتا ہے۔ لیکن صاحبین (امام یوسف و امام محمد) کو اس سے اختلاف ہے اور دوسری فقہوں کی طرح ایسے نکاح کو باطل کہتے ہیں۔ غالباً امام ابوحنیفہؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شریعت کی سخت ممانعت کے باوجود بھی اگر ایسے نکاح واقعتاً وقوع پذیر ہوتے ہیں تو ان کو باطل قرار دینے میں یہی نہیں کہ سماج میں ایک انتشار پیدا ہوگا، بلکہ والدین کے گناہ کی سزا اُن کی بے گناہ اولاد کو بھگتنا پڑے گی۔

لیکن اس اصابت کے باوجود فقہ حنفی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ فاسد نکاح قائم رہے۔ بلکہ قاضی کے لئے تاکید ہے کہ فریقین کو اپنے سامنے طلب کرے اور جس فرد سے نکاح ناجائز ہو اس کو اسلام لانے کی ترغیب دے۔ اگر وہ قبول نہ کرے تو فریقین میں علیحدگی کرا دے۔

یہاں تک تو اس مسئلہ پر مذہبی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی۔ اب اس کے سماجی پہلو کو دیکھئے! اہم کی بات ہے کہ مسلمان اس شخص سے رشتۂ ازدواج قائم کرنے میں احتراز کرتا تھا جس سے نکاح شرعاً ممنوع ہو۔ ایک مثال محمد علی جناح کی لے لیجئے۔ ان کو بھی مذہب کی پاسداری اس درجہ منظور تھی کہ انھوں نے ایک پارسی خاتون سے نکاح کیا تو ان کے اسلام لانے کے بعد۔ گو اس وقت اسپیشل میرج ایکٹ کا نفاذ نہیں ہوا تھا مگر ایک اور قانون موجود تھا جس کے تحت ایسے نکاح ہو سکتے تھے، مگر جناح نے مذہب ترک کرنا منظور نہیں کیا۔ لیکن اب یہ حالت ہے کہ مرد اور عورتیں دونوں یا تو مذہب سے برگشتہ ہوتے جاتے ہیں یا مذہب پر صرف برائے نام قائم رہ کر اس کے احکام کی کھلے بندوں خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری مذہب سے ناواقفیت ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے متوسط طبقہ پر اکثریت کے مقابلے میں اس کی ذہنی مرعوبیت طاری ہوگئی ہے۔ عوام اس بات میں پڑھے لکھوں سے بہتر ہیں۔ اُن میں نہ دینی غیرت کی کمی ہے اور نہ اُن پر کسی کی مرعوبیت طاری ہے۔ پڑھے لکھے لوگ اپنے مذہبی شعائر پر کاربند ہونے میں شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا ذہنی ارتداد ہے جس کا ہمارا متوسط طبقہ شکار ہو رہا ہے۔ ناجائز نکاح اس ارتداد کی طرف دوسرا قدم ہے۔ مسلمان عورت کے لئے

لم معاشرے میں اپنے مذہب پر قائم رہ جانا ایک بہت مشکل کام ہے۔ مرد مسلمان ہو تو وہ بھی اپنی مشرک شریک حیات
لات سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ممکن ہے ایسے نکاح اوّل اوّل کامیاب نظر آئیں مگر اس کی بڑی وجہ غالباً
ی کہ کچھ عرصہ کے لئے جنسی تسکین حاصل کرنے کا ایک مشغلہ ہاتھ آجاتا ہے اور انسان ایک نئی دنیا میں پہنچ کر سب
ول جاتا ہے۔ لیکن بعد میں جب یہ جذبہ سرد پڑ جاتا ہے تو عواقب سامنے آنا شروع ہوتے ہیں۔ بیگم صالحہ عابد حسین
نے ایک مضمون میں جو انھوں نے اس موضوع پر اخبار 'قومی آواز' میں کچھ دن ہوئے لکھا تھا، اس مسئلہ کا جائزہ
ن سماجی نقطۂ نظر سے لیا ہے۔ انھوں نے واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ایسے نکاح عام طور سے کامیاب
ا ہوتے۔ تعجب کی بات ہے کہ جس بات کی شریعت سختی سے مخالفت کرتی ہے اور جس کا عملی تجربہ سماجی نقطۂ نظر
بھی کامیاب ثابت نہیں ہوا، ہم اس کو اپناتے جا رہے ہیں۔ ایک طرف تو ہم قرآن کریم کو خدا کا کلام مانتے ہیں
دوسری طرف ہم اس کے احکام سے صرف لاپرواہی نہیں برتتے بلکہ عمداً ان کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں شریعت سے اس انحراف کی سب سے بڑی وجہ ہماری مذہب سے ناواقفیت ہے۔
کا سب سے اوّل درجہ کا مدرسہ ماں کی گود ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ لڑکیاں شریعت کے احکام سے آشنا کی
۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دینی تعلیم ضروری ہے کیوں کہ اُردو نہ صرف ہماری مادری زبان ہے بلکہ
سارا مذہبی لٹریچر اسی میں ہے۔

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ مذہبی تعلیم جس طرح ہم لڑکیوں کے لئے ضروری سمجھتے ہیں، ویسے ہی لڑکوں
ئے بھی ضروری ہے۔ مذہبی لٹریچر کو ہندی میں تبدیل کیا جا رہا ہے، یہ امر ضرور قابل ستائش ہے مگر اس میں اتنا
لگ جائے گا کہ ہماری نئی نسل مذہب سے بالکل بیگانہ ہو چکے گی۔ عربی خط سے اس قدر تو ہر مسلمان کو آشنا ہونا
گا کہ کتاب اللہ کو اس کی اصلی زبان میں پڑھ سکے۔ عربی زبان کو بھی جہاں تک ہمارے محدود ذرائع
ت دیں سیکھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ جسٹس محمود عربی کے فاضل تھے، وہ قرآنی لٹریچر سے براہ راست استفادہ
لتے تھے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ان کے فیصلے آج تک نظیر مانے جاتے ہیں۔ ایک جج کی اُن کے متعلق رائے
ا اگر کسی خاص مذہبی حکم کی انھوں نے کسی خاص طریقے سے تشریح کی ہے، تو ہمارے لئے اُس کو مان لینے کے
اور کوئی چارہ نہیں ہے"۔ ان کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ ہندو شاستروں کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے
انھوں نے سنسکرت پر عبور حاصل کیا اور اس کے بعد شاستروں کی مروجہ تفاسیر کے اغلاط پر اُن کے ماخذ کی
بنا پر سیر حاصل بحث کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طلبا کو دینیات کی اعلیٰ تعلیم پی، ایچ، ڈی کی ڈگری

بک دی جاتی ہے یعنی اس کے بعد ان کا شمار دین کے فضلا میں کیا جانا چاہیئے، مگر تعجب ہے کہ ان او نچے در
کے طلبا کے لئے عربی جاننا لازمی نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ اساتذہ کے لئے بھی عربی جاننے کی قید نہیں ہے۔ دی
کی ادھوری تعلیم سے دینی ذوق تو خیر کیا پیدا ہوگا، البتہ اس سے یہ خطرہ لاحق ہو سکتا ہے کہ کہیں دین کے خلا
طلبا میں استہزا کے جذبات نہ پیدا ہو جائیں۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ ہمارے علما اور دوسرے دیندار حضرات کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر
فریضہ کی ادائیگی کی طرف خاص طور سے توجہ کرنا چاہیئے۔ سختی سے نہیں نرمی سے، سمجھا کر۔ چور کو چور کہئے
گو آپ ایک حقیقت بیان کرتے ہیں مگر چور اپنی اس تعریف سے کبھی خوش نہ ہوگا اور نہ چوری سے توبہ کرے گا
معاشرے کی بہت سی برائیاں محض اس لئے فروغ پاتی ہیں کہ ان سے کوئی منع کرنے والا نہیں ہ
اگر کوئی منع بھی کرتا ہے تو وہ دوزخ کے عذاب کی دھمکی دے کر۔ دوزخ کا عذاب حق ہے۔ مگر ایسے نا م
"لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ" کا ارشاد ربانی نہیں بھولنا چاہیئے۔

تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ ایسے ملکی قوانین کے خلاف جن کی زد براہ راست یا ضمنی طور پر قوانین ش
پر پڑتی ہو، ہم کو مسلم معاشرے کو باخبر کرنا چاہیئے۔ اسپیشل میرج ایکٹ ہی کو لیجئے، ہمارے لئے کوئی ا
اس آواز کے اٹھانے سے مانع نہیں ہے کہ ہم اس کی بخشی ہوئی آزادی سے محروم کر دیئے جائیں۔ اس کے
اگر دستور میں ترمیم کی ضرورت ہو تو وہ بھی کرائی جائے۔

ایک سچی کہانی

بات کچھ سو برس سے اوپر کی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کا جوشِ انتقام
ٹھنڈا پڑا تو ان میں سے چند کو جن کا ضمیر بالکل مُردہ نہیں ہو گیا تھا، یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ ان مظالم کی جو بے گناہ
مسلمانوں پر توڑے گئے تھے، کسی طرح تلافی کی جائے۔ ایک صاحب نے مسلمانوں کی پس ماندگی دور کرنے کے خیال
سے ایک مدرسہ قائم کرنا چاہا اور مدرسہ کے لیے اچھے اساتذہ کی تلاش میں وہ مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی میں پہنچے۔
یہاں ایک مولوی صاحب کی لیاقت کی تعریف سُن کر اُن کے مدرسہ میں گئے۔ مولوی صاحب اس وقت طلبا کو
درس دے رہے تھے۔ ان سے اجازت لے کر یہ بھی وہاں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک درس میں شرکت کے بعد (اس
وقت اکثر انگریز اُردو اور فارسی زبان سے واقف ہوا کرتے تھے)، انھوں نے اندازہ کیا کہ مولوی صاحب ان کے
مدرسہ کے لیے بہت موزوں ہوں گے۔ چنانچہ درس ختم ہونے کے بعد انھوں نے سلسلۂ کلام یوں شروع کیا۔

انگریز: مولوی صاحب! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو کیا مشاہرہ ملتا ہے۔

مولوی صاحب: جی مجھ کو دس روپیہ ماہوار ملتے ہیں۔

انگریز: میں قریب کے ایک شہر میں ایک مدرسہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ وہاں چل کر
تعلیم دینا پسند کریں گے۔ میں ۲۰ روپیہ ماہوار آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔

مولوی صاحب: (کچھ پس و پیش کے بعد) آنجناب کا شکریہ۔ مگر یہاں مدرسہ میں بیر کا ایک
بڑا درخت ہے جس کے پھل مجھے کھانے کو ملتے ہیں، دوسری جگہ وہ کہاں دستیاب ہوں گے۔

انگریز: میں اس کا بندوبست کر دوں گا کہ پھل آپ کے پاس پہنچ جایا کریں۔

مولوی صاحب: ان بچوں کا جو یہاں زیرِ تعلیم ہیں، کیا حشر ہو گا؟

انگریز: میں ان بچوں کو بھی لے چلوں گا اور ان کے تمام اخراجات کا کفیل ہوں گا۔

مولوی صاحب: مگر بچوں کے ماں باپ ان کو غیر جگہ بھیجنے پر کس طرح رضامند ہوں گے۔

انگریز: اگر آپ اس معاوضہ کو جو میں نے پیش کیا ہے، ناکافی سمجھتے ہوں تو میں

۵۰ روپے تک نذر کر سکتا ہوں، مجھے افسوس ہے کہ اس سے زیادہ معاوضہ دینے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔

مولوی صاحب: (آنکھوں میں آنسو بھر کر) یہ آپ کا کرم ہے۔ مگر جب آخرت میں اللہ تعالیٰ مجھ سے سوال کریں گے کہ ہم نے تمھارے لیے دس روپے ماہوار کا انتظام کر دیا تھا جو تمھاری ضرورت کے لیے کافی تھا، لیکن تم نے ہم پر بھروسہ نہیں کیا، بلکہ لالچ میں پڑ کر دوسری جگہ چلے گئے، اور اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی برتی، تو بتایئے کہ میں اس کا کیا جواب دوں گا۔" اس کا جواب انگریز کے پاس نہیں تھا۔

اساتذہ میں فرض شناسی اور توکل کا یہ نمونہ پہلے وقتوں میں شاذ نہیں، بلکہ اکثر ملتا تھا۔ مگر اب شاذ ہی نظر آتا ہے۔ اس وقت توکل کی جگہ شاد خوری نے لے لی ہے۔ ضروریاتِ زندگی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ دولت مند طبقہ کے افراد کی بات تو الگ ہی، اب متوسط طبقہ والوں کے پاس بھی ریڈیو ہونا چاہیے، ٹیلی ویژن ہونا چاہیئے، ریفریجریٹر ہونا چاہیے، اور اس طرح کی اور کتنی چیزیں ہونا چاہئیں، جو آج ضروریاتِ زندگی میں شمار ہوتی ہیں مگر کل تک ان کے بغیر آرام سے زندگی بسر کی جاتی تھی۔ اس شاد خوری کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے اور ہر شخص کے پاس اس کی فراوانی نہیں۔ مجبوراً آمدنی بڑھانے کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں۔ پھر قیمتیں چونکہ آسمان تک پہنچ کر اور اوپر جانے کی کوشش کر رہی ہیں اس لیے اس تمام سامانِ تعیش کی فراہمی کے لیے اگر آج ہم کو ہزار روپے کی ضرورت ہے تو کل ڈیڑھ ہزار میں بھی کام نہیں چلے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ بد دیانتی کو اور بھی فروغ ہوگا۔
ایسے ماحول میں توکل کا گزر کہاں ہو سکتا ہے۔

یہ اسی شاد خوری کا عطیہ ہے کہ ہندوستان میں سیکڑوں بیگناہ لڑکیاں کافی جہیز نہ لانے کی پاداش میں اگنی دیوتا پر بھینٹ چڑھا دی جاتی ہیں۔ ماں باپ لڑکی کا "دان" تو کر دیتے ہیں مگر منھ مانگے جہیز کا دان ان کے بس کا نہیں ہوتا۔ جہیز پر روک لگانے کے لیے سخت سے سخت قانون بنائے جا رہے ہیں، مگر سماجی برائی کے آگے قانون بے بس ہو جاتا ہے۔ قانون ایک طرف بنتا ہے تو دوسری طرف اس سے بچنے کے لیے سامان تیار کر لیے جاتے ہیں۔ ضرورت سماج میں تبدیلی لانے اور اپنی رہائش کے معیار کو کم کرنے کی ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف جَو کی روٹی اور پانی پر گزارہ کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے آرام و آسائش کے لیے جو بھی وسائل پیدا کیے ہیں ان سب سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ مگر چادر کو دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے۔ توکل تو خیر بڑی چیز ہے اور ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ لیکن اگر انسان اتنا ہی کر سکے کہ

جو کچھ اپنے دست و بازو سے پیدا کیا ہے اس پر قناعت کرے اور قدرت نے اس کے پڑوسی کو جو کچھ دیا ہے اس پہ دندان آز تیز نہ کرے، تو یہی بہت بڑی بات ہوگی۔

فرض شناسی ایک جوا ہے جو کندھوں پر رکھا ہوا ہے کہ انسان کو صحیح راستہ پہ چلائے۔ طلبا نے اس جوے کو اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا ہے۔ اس لیے بے راہ روی کا شکار ہو رہے ہیں۔ وہ زمانہ گیا جب طلبا کھاتے پیتے گھروں سے آتے تھے اور ان کی تعلیم کا بار ماں باپ پر کچھ ایسا زیادہ نہیں پڑتا تھا۔ اب تو ماں باپ اپنا پیٹ کاٹ کر بچوں کو تعلیم کے لیے بھیجتے ہیں، لیکن بچے یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ ان کے بھی کچھ فرائض ہیں۔ ان کا کام اب صرف ہنگامہ آرائی رہ گیا ہے۔ آج کسی استاد کے خلاف احتجاج ہو رہا ہے، تو کل شیخ الجامعہ کی خبر لی جا رہی ہے۔ آج ان کے خیال میں اگر پرچہ مشکل آیا تو اسٹرائک ہو گئی۔ کل امتحان گاہ میں نگراں نے نقل کرنے سے روکا، تو غریب پٹتے پٹتے رہ گیا۔ علامہ اقبالؒ کے کلام کا آج کل ہر شخص شیدائی نظر آتا ہے۔ کاش ان کی عملی زندگی سے بھی کچھ سبق لیا جاتا۔ اپنے استاد میر سید حسن کا علامہؒ اس قدر ادب کرتے تھے کہ ان کے سامنے اپنے اشعار نہیں پڑھتے تھے کیونکہ اس سے ایک گونہ استاد برتری کا اظہار ہوتا تھا۔ پنجاب کے گورنر نے جب ان کو "سر" کے خطاب کی پیش کش کی، تو انھوں نے خطاب صرف اس شرط پر قبول کرنا منظور کیا کہ ان کے استاد نے عربی اور فارسی ادب کی جو خدمت کی ہے اس کا بھی اعتراف کیا جائے۔ گورنر نے جب دریافت کیا کہ ان کی کچھ تصنیفات ہیں تو علامہؒ نے جواب دیا وہ خود ان کی سب سے بڑی تصنیف ہیں۔ چنانچہ جب ان کو "سر" کا خطاب عطا ہوا، تو ساتھ ہی ساتھ میر سید حسن کو بھی "شمس العلما" کے خطاب سے نوازا گیا۔ اب نہ ایسے استاد ہیں، نہ ایسے شاگرد۔ صرف انکی یاد باقی رہ گئی ہے؎

ای ہمنفسان محفل ما رفتید؛ و لے نہ از دل ما

طلبا میں درس سے غیر حاضری اب ایک وبا کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ پہلے تو بدشوق طلبا ہی درس سے غیر حاضر ہوتے تھے۔ مگر اب بہت کم طالب علم اس کو عیب سمجھتے ہیں۔ کاروباری دنیا میں تو بالادست سے اپنا جائز حق لینے کے لیے کام سے غیر حاضر ہو جانا شاید ایک طرح سے جائز کہا جا سکے مگر علم و ادب کے سرچشمہ میں، جہاں ہر مسئلہ کو افہام و تفہیم کے ذریعہ سے حل کرنا چاہیے، اس حربے کے استعمال کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ کارخانہ سے مزدور اگر غیر حاضر ہو جائیں تو پیداوار میں کمی آ جاتی ہے اور کارخانے کے مالک کا نقصان ہوتا ہے۔ مگر طلبا درجہ سے غیر حاضر ہو کر صرف اپنا نقصان کرتے ہیں۔ سال کے ۳۶۵ دنوں میں درس کے لیے

شاید نصف سے بھی کم دن مقرر ہیں۔ لیکن عملاً طلبا اس نصف کا بھی نصف کر دیتے ہیں۔ بدشوقی کا
حال ہو تو اچھے ادیب، ماہر سائنس داں، حاذق طبیب اور ہونہار انجنیر کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں
سستی ڈگریاں ضرور مل جاتی ہیں۔ البتہ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہم بھی زندگی کی دوڑ میں آگے ہیں
طوطے کی طرح رٹے ہوئے چند نام گنا دیئے جاتے ہیں کہ علی گڑھ نے شوکت علی، محمد علی، حسرت
موہانی، ضیاء الدین، ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، پیدا کئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس فہرست میں آپ
دو ایک نام کا اور اضافہ کر دیں، لیکن یہ سب گزرے ہوئے زمانے کے لوگ ہیں۔ آخر اب اور
سے ایسے مایہ ناز فرزند کیوں نہیں پیدا ہوتے۔ صرف وجہ ایک ہی ہے کہ اب ہمارا مسلک محنت کوشی
نہیں بلکہ تن آسانی ہے، جو ہماری رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔ زندگی کی مہم تن آسانی سے سر
نہیں ہوتی۔ زندگی نام ہے چٹانوں سے ٹکرانے کا، چاہے اس کا انجام پاش پاش ہو جانا ہو۔
بہرحال لڑکے پھر بھی لڑکے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ اب اساتذہ نے بھی اپنے معاملات منظور
کرانے کے لیے اس غیر معقول حربہ کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ تنازعہ تو ان کا کسی دوسرے سے ہوتا ہے
مگر اسٹرائک کرکے وہ طلبا کے حقوق کو پامال کرتے ہیں۔ دہلی میں اساتذہ کی اسٹرائک قریب دو مہینے
جاری ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ طلباء کی تعلیم کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ خیریت ہے کہ علی گڑھ ابھی اس
سے محفوظ ہے مگر اس کی داغ بیل یہاں بھی پڑ گئی ہے۔ چند سال ہوئے ایک استاد نے شیخ الجامعہ
کے گھر پہ دھرنا دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دھرنا طلبا کے جواب میں تھا۔ گویا طلبا اگر اپنے منہ پر سیاہی
پھیر لیں تو استاد کے لیے بھی ایسا کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلّا   کارِ طفلاں تمام خواہد شد

ابھی حال میں ضلع کی انتظامیہ نے ایک استاد کا رہائشی مکان ناجائز طریقے سے خالی کرایا
تھا۔ اس کے خلاف اساتذہ کی طرف سے احتجاج کیا گیا جو بیشک مناسب تھا۔ مگر جس طریقہ سے احتجاج کیا
وہ مناسب نہیں تھا۔ تمام اساتذہ نے ایک دن کے لیے اسٹرائک کر دی اور ایک جم غفیر کی شکل میں
حاکم ضلع کے مکان پر جا دار دہوئے۔ ایسا کرنا اساتذہ کے وقار کے منافی تھا۔ آخر کارخانہ کے مزدور
اور دانش گاہ کے دانشوروں میں کچھ تو فرق ہونا چاہیئے۔ کہا جاتا ہے کہ حاکم ضلع نے ان کے ساتھ وہ اخلاق
بھی نہیں برتا جس کی ان سے امید کی جا سکتی تھی۔ لیکن جس کی نظر میں خود اپنی ذات قابل احترام نہ ہو، ا

ے سے کیوں امید رکھے کہ وہ اس کی عزت کرے گا۔

اساتذہ کی ایک دوسری اسٹرائیک اس کے فوراً بعد ہی ہوئی۔ یہ اسٹرائک ایک مرکزی قانون کیخلاف

ہا جاتا ہے کہ اس قانون سے یونیورسٹی کی حیثیتِ خود اختیاری مجروح ہوتی ہے۔ ہم بحث کے لیے اس اعتراض

ہم کر لیتے ہیں مگر اس سے اسٹرائک کا جواز کسی طرح پیدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، اس شکایت کو بھی

و تفہیم ہی سے طے ہونا چاہیے تھا۔ ان دونوں اسٹرائکوں کی وجہ سے طلبہ دو دن کے لیے درس سے محروم رہے۔ اس

ی کس طرح سے ہوگی؟ یہ سننے میں نہیں آیا کہ اساتذہ نے یہ پیش کش کی ہو کہ وہ تعطیل کے دو دنوں میں درس دے کر

لافی کر دیں گے۔ اور اگر وہ کرتے بھی تو طلبا اس کو کب ماننے کے لیے تیار ہوتے۔

اساتذہ میں ہر مکتب خیال کے لوگ شامل ہیں۔ کمیونسٹ بھی ہیں اور جماعت اسلامی اور تبلیغی

ت کے ہمدرد بھی، اور ایسے مسلم اساتذہ بھی جو کسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتے۔ کمیونسٹ فلسفہ میں

ید اس طرح اپنے کارِ منصبی سے غیر حاضر ہو جانا جائز سمجھا جاتا ہو مگر کیا ان اساتذہ کی نظروں میں جو اپنے کو

اقدار کا پیرو کہتے ہیں ایسی غیر حاضری جائز ہو سکتی ہے؟ ہماری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ اگر ان

دن کا مشاہرہ وہ یونیورسٹی سے لیں گے تو ان کے لیے اکلِ حلال کی تعریف میں نہیں آسکتا۔ اگر کچھ

تذہ، چاہے وہ دو چار ہی کیوں نہ ہوں، ہمارے خیال سے متفق ہوں تو ہم ان سے امید رکھیں گے کہ

ان دو دنوں کا مشاہرہ یونیورسٹی کو واپس کر دیں۔ ایسا کر کے وہ دیانتداری کی ایک اعلیٰ مثال

قائم کریں گے۔

اکلِ حلال کے متعلق علامہ اقبالؒ کے والد شیخ نور محمد کا ایک مثالی واقعہ ہمارے سامنے ہے۔

شیخ صاحب ایک بڑے زمیندار کے یہاں ایک معمولی سے کام پر تعینات تھے۔ کچھ دنوں آرام کرنے کے

بعد ان کو اس بات کا احساس ہوا کہ کام کی نوعیت دیکھتے ہوئے ان کو مشاہرہ زیادہ ملتا ہے۔ ایک

ن خاموشی سے انھوں نے اپنا استعفا پیش کر دیا۔ زمیں دار کو تعجب ہوا کہ وہ ایسا کر رہے ہیں۔ جب

اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے صحیح صورتِ حال گزارش کر دی کہ جو معمولی سا کام ان کے سپرد ہے اس

کے لیے جو مشاہرہ ان کو دیا جاتا ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ اس کا لینا ناجائز سمجھتے ہیں۔

مولوی صاحب یا شیخ صاحب کے معیار کو اس وقت کون پہنچ سکتا ہے؟ ایک نے پانچ گنا

مشاہرہ بھی اس لیے ٹھکرا دیا کہ جن بچوں کو وہ تعلیم دیتے تھے ان کا نقصان ہوگا اور دوسرے نے کف

ایک اچھی ملازمت سے اس لیے کنارہ کشی اختیار کرلی کہ کام کو دیکھتے ہوئے ان کو معاوضہ
جس کو لینا وہ ناجائز سمجھتے تھے۔ لیکن ہم اپنے اساتذہ سے اتنی امید تو رکھ سکتے ہیں کہ
نہرو نے جو نعرہ ملک کو دیا تھا کہ "آرام حرام ہے" اس پر سو فیصدی عمل نہ کرتے ہوئے
کو "کام" سے نہ بدل دیں گے۔ ہم کو اس میں شبہ نہیں ہے کہ اساتذہ کی غالب اکثریت ا
کو خوش اسلوبی سے ادا کرتی ہے۔ لیکن کیا کچھ اور کوشش کرکے "حالات" بہتر سے "بہتر
بنا سکتے؟ مولوی صاحب کی کہانی میں ہمارے لیے فرض شناسی اور استغنا کا ایک سبق
بشرطیکہ ہم اس کو سیکھنے کے لیے تیار ہوں۔

پروفیسر مسعود حسین خاں

پروفیسر مسعود حسین خاں (پ ۱۹۱۸ء) پیرس سے ڈی لٹ،
علی گڑھ کے طالب علم رہے اور پھر وہیں لکچرر اور ریڈر ہوئے! پھر
اردو زبان کے پروفیسر ہو کر عثمانیہ چلے گئے جس کے بعد جامعہ کے وائس
چانسلر ہوئے۔ علی گڑھ سے لسانیات کے پروفیسر کی حیثیت
سے ریٹائر ہو کر کشمیر کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں وزٹنگ پروفیسر
رہے۔ فی الحال ترقی اردو بورڈ لغت پروجیکٹ کے ڈائرکٹر ہیں۔

تالیفات: (۱) رقعات رشید احمد صدیقی، (۲) اردو کا المیہ،
(۳) مقدمہ کلام اردو (تین جلدوں میں)، (۴) شعر و زبان، (۵) قصہ مہر افروز
و دلبر از عیسوی خان بہادر (۶) مقدمہ تاریخ زبان اردو، (۷) دکنی
اردو کی لغت، (۸) دو نیم (کلام کا مجموعہ) (۹) کوئی مسعود کا گیت
(ہندی میں کلام کا مجموعہ)، (۱۰) اردو کی لسانیاتی تاریخ:
انگریزی لکچر (زیر طبع)۔

فکر اقبال

اور

آزاد ہندوستان کے مسلمان

اقبال کی اجتماعی فکر کا ہندی مسلمانوں کے لئے سب سے زندہ حصّہ اجتہاد سے تعلق رکھتا ہے، میں اسکی فقہی باریکیوں میں پڑے بغیر یہ کہوں گا کہ اقبال کی فکر اس بارے میں جدید ہے اور غیر اسلامی ممالک کے مسلمانوں کے لئے اس پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبال نے ترکی جمہوریہ کے رویے کو سراہتے ہوئے "اجتہاد کا حل" قانون ساز مجالس کے سپرد کر دیا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں علما کی جانب سے سوءِ ظن سے کام لیتے ہوئے ان کی کسی علاحدہ اور با اختیار مجالس مشورت کی تشکیل کی مخالفت کی ہے، بلکہ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ چونکہ مجالس سلطنت میں عام طور پر ایسے حضرات منتخب ہو جاتے ہیں جنھیں فقہ اسلامی سے بالکل مس نہیں ہوتا ہے، اس لئے علما کو بھی منتخب کیا جائے (لیکن اس کی ذمہ داری کون لے سکتا ہے) اور سب سے اہم یہ کہ ہمارے مدارس میں "قانون کی تعلیم کی از سر نو تنظیم کی جائے جہاں اسلامی فقہ کے ساتھ مغربی قانون اور اس کے ارتقا پر درس دیے جائیں" تاکہ اس بارے میں ذہن جدید ہو سکیں۔

ہندوستان کے موجودہ اسلامی سماج میں ہر قسم کے مسلمان پائے جاتے ہیں۔ پابند صوم و صلوٰۃ، غالب کی طرح سہل انگار ــــ "پر طبیعت ادھر نہیں جاتی"، لبرل قوم پرست، دیوبندی، جماعت اسلامی کے پیرو، اشتراکی اور اشتراکی مسلمان (میں ایسے اشتراکیوں کو جانتا ہوں جو پنج وقت نماز پڑھتے ہیں) ان سب میں قدر مشترک مسلم تشخص کی تلاش اور تحفظ ہے جو کبھی مخصوص تہذیبی عوامل سے ترکیب پاتا ہے، کبھی اردو زبان کے وسیلے سے اور کبھی مشترک تہذیبی روایات سے۔ یہ مجموعی طور پر اکثریت کے دائیں بازو کی جماعتوں کی زد کو محسوس کرتے ہیں اور خوف و خطر کے دائرے میں سمٹ کر ایک ہی ربے میں آ جاتے ہیں۔

اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز وطنیت سے کیا تھا۔ اس عہد کے تمام وطنی موضوعات کا عکس ان کی شاعری کے ابتدائی دور میں ملتا ہے۔ وطن کے مناظر فطرت سے دلچسپی (ہمالہ) اشخاص و اکابر قوم پر فخر (رام، نانک، سرسید، غالب)، فرقہ پرستی کے خلاف انتباہ اور اس پر افسوس اور خاک وطن کے ہر ذرّے کو دیوتا سمجھنا۔ لیکن ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپسی کے بعد اور یورپ میں قومیت کے نام پر مغربی اقوام کی استیلا اور استحصال کی پالیسی کو دیکھ کر وہ وطنیت کے بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے مخالف ہو گئے۔ انھوں نے "قومیتِ اسلام" اور "قومیتِ مسلم" کی ترکیبیں وضع کیں اور : ع "اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے" کا نعرہ بلند کیا۔ قومیت اسلام کا یہ تصور اقبال کے سیاسی عقاید کا آخر وقت تک اہم رکن رہا۔ ۱۹۳۸ء میں انتقال سے چند مہینے قبل جب وہ مولانا حسین احمد مدنی سے ملت اور وطن کی بحث میں الجھ گئے، اس وقت بھی انھوں نے یہی دہرایا : ع "بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست"

مولانا حسین احمد مدنی نے اپنے خیالات کی توجیہہ، ملت کو قومیت کا مترادف نہ مان کر کی۔ اقبال نے جواباً تحریر کیا کہ : "حال کی عربی فارسی میں بہ کثرت سندات موجود ہیں کہ ملت، قوم کے معنوں میں مستعمل ہے۔"

قومیت کے سلسلہ میں اقبال اور مولانا کے درمیان یہ علمی معرکہ موجود ہندی مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ پوری بحث سے ظاہر ہوتا ہے، اقبال قومیت اور "ملت" کے سلسلے میں اس وقت تک واضح تصورات نہیں رکھتے تھے اور اگر رکھتے تھے تو وہ ابھی تک ان خطوط میں محفوظ تھے جو انھوں نے ۱۹۳۷ء میں قائد اعظم محمد علی جناح کو بصیغۂ راز لکھے تھے۔ ان کے خیال میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں، بلکہ وطن ایک سیاسی تصور کی حیثیت رکھتا ہے، جو اسلام سے متاثر ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ مولانا حسین مدنی نے اپنے اس بیان کی کہ یہ "خبر ہے منشا نہیں" مسئلے کو اپنے لئے اور موجودہ ہندی مسلمانوں کے لئے اسی قدر پیچیدہ بنا لیا، جس قدر اقبال نے "قومیت" کی بحث میں پڑ کر اپنے لئے بنا لیا تھا۔ قومیت کے بارے میں اقبال کی سیاسی فکر

سے آج ہندی مسلمانوں کو کسی قسم کی رہبری نہیں مل سکتی، اس لئے کہ فوق اسلامی قومیت ہندوستان کے سیاق و سباق میں ایک سراب اور خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔

موجودہ ہندوستانی قومیت ابھی تک عالم تشکیل میں ہے۔ اور تخلیق کے سارے کرب و ضرب سے دوچار ہے۔ جواہر لال نہرو کی قیادت میں دستور ہند میں اس کی بنیادیں نہایت کشادہ اور گہری رکھ دی گئی ہیں۔ لیکن تاریخ کے کاکل بہت الجھے ہوئے ہیں۔ ایک طرف ہندوازم کا گہرا ساگر ہے۔ ہزاروں سال کی قدیم روایات، توہمات اور معتقدات ہیں۔ ان معتقدات میں ایک قسم کی ہمہ گیریت ہے جس نے کسی مذہب کو نہیں، بلکہ ہندو زاویۂ نگاہ اور طرز حیات کو جنم دیا ہے۔ دوسری طرف اسلام کے نسبتاً جدید افکار اور عقاید ہیں۔ اوامر و نواہی کا سلسلہ ہے۔ مذہبی فکر کی قطعیت ہے۔ تیسری جانب مغربی تمدن کی مادی و ثقافتی فتوحات کا سلسلہ ہے، جو ساری دنیا کو زیر و زبر کیے ہوئے ہے، اور جس کے وسط میں ہم مکمل طور پر آچکے ہیں۔ ہندوستانی قومیت کا ان تینوں دھاروں میں کیا توازن کیا ہوگا، یہ ابھی سطح ایام میں ہے۔ دیکھنا ہے کہ ہندو ہندوستان کی متحدہ قومیت کے لئے کیا تیاگ سکتا ہے، مسلمان اس کے لئے کیا ترک کر سکتا ہے اور مغربی تفکر کا اس کی تعمیر میں کیا حصہ ہوگا؟ یہ مسلم کہ اس تاریخی لین دین میں ہم میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دینا ہوگا، کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا ہوگا۔ مثلاً ہندوازم میں غیر عقلی توہمات اور اساطیری عناصر کی کمی کرنا لازمی امر ہے۔ سماجی اونچ نیچ اور چھوت چھات کو قوم کے جسد سے فاسد قسم کی مانند خارج کرنا ضروری ہے۔ مسلمانوں کے عہد کی تاریخ پر زیادہ ہمدردانہ اور مثبت نظر ڈالنی ضروری ہے۔ دوسری جانب ہندی مسلمانوں کو اپنے غیر ضروری مذہبی اور تمدنی تفاخر کو کم کرنا ہوگا۔ غیر اسلامی مذاہب کو ان کی عوامی سطح پر نہیں بلکہ فکری اور تاریخی سطح پر سمجھنا ہوگا تاکہ ان کے اندر جو توانائی اور صلابت ہے، اس تک نظر جا سکے۔ اس لئے بھی کہ وحدت ادیان کا تصور عین اسلامی شعائر میں سے ہے۔

دستور ہند کی اساس جن تین بنیادوں پر قائم کی گئی ہے، ان میں جمہوریت خشت اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں جمہوریت کی جانب جو رویہ ملتا ہے، اس سے ان کے عقیدت مندوں میں خاصی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اقبال جمہوریت

کے ناقد ہی نہیں بلکہ مخالف تھے۔ لیکن اگر تشبیہ و استعارے کے پردوں کو ہٹا کر سیاق و سباق کی روشنی میں دیکھا جائے تو اقبال غلط تصوف کی طرح اس غلط قسم کی جمہوریت کے خلاف تھے جو استعماریت کے مترادف رہی ہے اور جو بیسویں صدی کے پہلے دہے میں مغربی ممالک میں عام ہو رہی تھی۔ اس وقت جمہوریت کا پیکر خالص سیاسی تھا، جو فرد کی زندگی کے دیگر پہلوؤں کی خبر گیری کرنا فرض نہیں سمجھتی تھی۔ اب جمہوریت ایک طرز فکر اور طرز حیات بن چکی ہے۔ یہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے اور انسانی رشتوں کے پیچ در پیچ عمل میں انفرادی آزادی کی نگرانی رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جمہوریت کا معاشی اور اصلاحی پروگرام سست گامی کے ساتھ انجام پاتا ہے۔ ہندوستان نے پچھلے ۳۰، ۳۵ سال میں اس کی بڑی قیمت ادا کی ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے ہماری قومی زندگی میں استحکام آیا ہے۔ اقلیتوں میں ساجھے داری کا اعتماد پیدا ہوا ہے اور ہندی مسلمان کو اسلامی نہیں، ایک سیکولر جمہوریت میں جینے کے آداب سیکھنے پڑے ہیں۔

آپ ورنگ شاعری سے قطع نظر، اقبال نے جمہوریت کے مسئلے پر جب بھی سوچا ہے اسے اسلام سے ہم آہنگ پایا ہے۔ ۱۹۰۹ء میں "ہندوستان ریویو" میں اسلام کے اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "جمہوریت اسلام کا بحیثیت ایک سیاسی نصب العین کے، اہم ترین پہلو ہے۔"

آج ہندی مسلمان کے لئے یہ نصب العین صرف سیاسی ہی نہیں رہا، ثقافتی اور قومی بھی بن گیا ہے۔ تفاوتِ رہ یہ ہے کہ ہندوستانی سیکولر جمہوریت کے علی الرغم نو زائیدہ اسلامی جمہوریتیں چند سال سے زیادہ نہ چل سکیں۔

سیکولرزم ہمارے دستور کا دوسرا بنیادی اصول ہے۔ جس ملک میں ایک سے زاید مذاہب رائج ہوں، اس کی بقا کے لئے یہ اصول ضروری ہے۔ لیکن سیکولرزم نہ تو لامذہبیت ہے نہ عبادت اور روحانی اقدار سے بے بہرہ ہونے سے۔ متحدہ ہندوستان میں اقبال کا انداز فکر کم و بیش یہی رہا ہے۔ انھوں نے دوسرے مذاہب اور ان کے اکابرین کا احترام کیا ہے۔ جاوید نامے میں عارف ہندی کو "جہاں دوست" کا پیکر عطا کیا۔ اپنی برہمن زادگی پر وہ فخر کیا ہے کہ بعض اوقات گمان ہوتا ہے کہ اصل اقبال کہاں سے بول رہا ہے۔ لیکن جوں جوں ان کی سیاسی فکر "آزاد اسلامی مملکت"

کے سانچے میں ڈھلتی گئی، وہ اسلامی جمہوریت کی اصطلاح میں سوچنے لگے۔ اسلام نے اپنی اقلیتوں کا حل "ذمّی" کے تصور میں نکال لیا ہے، لیکن تاریخ میں مسلمانوں کو خود اقلیت بننے کا بڑے پیمانے پر پہلا تجربہ ہندوستان ہی میں ہوا تھا۔ ہندوستان کی سیکولر جمہوریت انھیں "ذمّی" کا درجہ دینے کی بجائے ساجھے دار کا حصہ دیتی ہے۔ آخر آخر میں اقبال کے ذہن کا تقسیم کے بعد باقی ماندہ مسلمانوں کی جانب جو رویہ رہا، وہ اس خط سے بخوبی ظاہر ہے جو انھوں نے قائدِاعظم محمد علی جناح کو جون ۳۷ء میں لکھا تھا:

" ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ اس وقت شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو مسلم اقلیتی صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ یہی وہ بہترین راستہ ہے جو مسلم اکثریتی اور مسلم اقلیتی دونوں قسم کے صوبوں کے مفاد میں ہے"۔

ہم ہندی مسلمان اسی نظر انداز کردہ فاضلات میں سے ہیں اور ترانۂ ہندی والے اقبال کے الفاظ میں آج ان سے یوں شکوہ سنج ہیں: ع " معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا "

اقبال کی سیاسی فکر اپنا کام کر گئی۔ جو لے بھاگنا تھا وہ لے بھاگے؛ جسے چھوڑنا تھا، اسے چھوڑ دیا؛ ہمیں جادہ پائی کے لیے اپنے کارواں کو ازسرِ نو ترتیب دینا ہے۔ ایک سیکولر جمہوریت میں ایک باوقار اقلیت کے طور پر زندگی بسر کرنے کے آداب سیکھنے ہیں اور کینٹول اسمتھ کی اس پیشین گوئی کو پیشِ نظر رکھنا ہے کہ ایک اجنبی اور غیر اسلامی ماحول میں ہندی مسلمان زیادہ توانا، روشن خیال اور ترقی یافتہ بن جائے گا۔

ہندوستانی قومیت کے اجزائے ترکیبی کا تیسرا اہم جزو "سوشلزم" ہے۔ سوشلزم اب ایک کثیر المعنی لفظ بن چکا ہے۔ پچھلی صدی کے نصف اول تک اس سے مراد ایک ایسا نظامِ معیشت لیا جاتا تھا جس میں تمام وسائلِ پیداوار کی ملکیت پر اختیار، فرد کے بجائے جماعت کا ہو۔ مارکس اور اینگلز کی سائنٹفک سوشلزم یا کمیونزم کے نقطۂ نظر سے سوشلزم کی مذکورہ بالا شکل صرف عبوری قرار دی گئی۔ جمہوریت کو ایک بورژوائی تصور قرار دیا گیا اور انقلابی اندازِ کار اور پرولتاری قیادت کو منزلِ مقصود تک پہنچنے کا اصل وسیلہ ٹھہرایا گیا۔ رفتہ رفتہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد وسائلِ پیداوار کو مکمل طور پر قومی تحویل میں لینے کا خیال ترک کیا جانے لگا۔ جمہوریت کو ایک لائحۂ عمل اور منتہا و مقصود مان کر منصوبہ بندی اور قومی نگرانی کے

طریقے کو اقتصادی ترقی اور آمدنی کی منصفانہ تقسیم کا ذریعہ بنایا گیا۔ اس طرح قومی اور نجی مساعی پر مبنی ملی جلی معیشت وجود میں آئی۔ ہندوستان نے اسی طریق کار کو اپنایا اور مخلوط معیشت اور جمہوری نظام حکومت کے ذریعے قومی فلاح و بہبودی کی ڈگر پر پنجسالہ منصوبہ بندیوں کی شکل میں قدم آگے بڑھایا۔

اقبال نے ابتدا سے اپنی معاشرتی فکر میں نظام معیشت کے اس توازن کو پالیا تھا۔ ۲۳ جون ۱۹۲۳ء کو، جب خضر راہ اور پیام مشرق کی بعض نظموں کو پڑھ کر ایک دل جلے نے اقبال پر کمیونزم کے داعی ہونے کا الزام لگایا تو انھوں نے اخبار میں یہ تردیدی بیان شائع کیا:

"بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے ۔ ۔ ۔ میں مسلمان ہوں، میرا عقیدہ ہے ۔ ۔ ۔ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لئے ایک قسم کی لعنت ہے۔ لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریقہ یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے، جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لئے قانون میراث اور زکوٰۃ وغیرہ کا انتظام کیا ہے اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابل عمل بھی ہے ـــ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشویزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔"

اقبال کی اسی تعریف میں انفرادی ملکیت اور ملی جلی معیشت دونوں تصورات کی تہ نشینی ہے۔ ۱۹۳۷ء تک اقبال اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ "میں اسلام کو ایک قسم کی اشتراکیت ہی سمجھتا ہوں" اور "اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے" لیکن یہ تشبیہ موکد ہے، یعنی ادات تشبیہ میں سے ایک "قسم" موجود ہے اور اسی قسم میں اسلامی سوشلزم کا تصور مکمل طور پر موجود ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے پاکستانی مورخ ۔ اے، کے بروہی کے ایک مضمون کے حوالے سے "اسلامی سوشلزم" کو "دو الفاظ کا غیر منطقی اختلاط" اور "دو غلط لفظ" کہہ کر جن شبہات کا اظہار کیا ہے، وہ صحیح نہیں۔ دونوں کا خیال ہے

کہ لفظ "اسلام" یا اسلام جیسا کہ اقبال سمجھتے تھے، کہنا اس کے لئے کافی ہے۔ لیکن یہ معنیاتی ہیر پھیر کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اقبال اپنے تصورِ سوشلزم کی تعبیر آخر وقت تک کرتے رہے۔ مئی ۱۹۳۷ء کے ایک خط میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کو لکھتے ہیں :۔ "یہ غیر اغلب ہے کہ مسلمان جواہر لال کی منکرِ خدا سوشلزم پر لبیک کہ سکیں۔" اتفاق سے جواہر لال کی قیادت میں مرتب کردہ ہندوستانی دستور میں اس "الحادی سوشلزم" کے لئے کوئی گنجائش نہیں نکالی گئی اور اسے صرف معاشی فلاح و بہبود کے پروگرام تک محدود رکھا گیا۔

سوشلزم کے فلسفے کو اختیار کرنے کے لئے ہندی مسلمان کے پاس فکرِ اقبال کی ایک مضبوط اساس موجود ہے۔ کمیونزم کی طرح سوشلزم کی بھی کئی شکلیں ہو گئی ہیں، جن میں قومی چھاپیں لگ گئی ہیں۔ ہندوستانی سوشلزم بھی اپنی تنظیم و ترتیب کے لحاظ سے دیگر ممالک کے سوشلزم سے مختلف ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اسلامی سوشلزم کے بارے میں جو اشارے فکرِ اقبال میں ملتے ہیں، یا دیگر اسلامی مفکرین نے جو اس کی تفصیلات دینے کی کوششیں کی ہیں، وہ من و عن ہندی مسلمانوں کے لئے سازگار ہوں۔ ہماری جہاں ایک اسلامی مملکت نہیں جہاں ہم اسلامی قوانین کا نفاذ کر سکیں۔ ہم نے پارلیانی جمہوری نظام کو اپنے لئے پسند کیا ہے۔ اس لئے اکثریت کے فیصلے، خاص طور پر معاش اور معیشت کے میدان میں ہماری روایت سے مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔ شریعت کے دائروں میں لاکر ان پر اڑنا بے معنی اور مضر، دونوں ثابت ہو سکتا ہے۔ اس بارے میں تاویلاتِ اقبال ہماری تشفی کے لئے کافی ہیں۔

ہندوستان کی جمہوری، سیکولر، سوشلسٹ ریاست میں ہندی مسلمان کے تشخص اور تحفظ کا مسئلہ پھر بھی باقی رہ جاتا ہے۔ یہ تشخص ہندوستانی قومیت کی رنگا رنگی کے لئے ضروری ہے۔ قومیت سازی کے اس نئے تجربے میں اکثریت کے ہمدردانہ رویّے کی بھی ضرورت ہے۔ کشاکش جاری ہے لیکن تاریخ ایک کشمیری ہنرمند کی مانند اپنی کشیدہ کاری میں مصروف ہے اور ہندوستانی قومیت کا ڈیزائن بنتا جا رہا ہے۔

●●

پروفیسر ایم۔ وائی انصاری

مسلمانوں کے علمی کارہائے نمایاں

مسلمانوں کے علمی کارہائے نمایاں اس قدر وسیع اور جامع ہیں کہ وہ نہ صرف علوم ہی ہیں، بلکہ وہ تعلیم و تربیت، تہذیب اور عام معلومات سب کو اپنے دائرے میں لئے ہوئے ہیں۔ انھیں علوم کی پروردہ عظیم الشان ثقافت و تہذیب کو مسلمانوں کا "زریں دَور" تصور کیا جاتا ہے۔

اسی تعلیم اور تربیت نے سائنس، فنون لطیفہ، تہذیب و تمدّن، فن تعمیر اور دیگر علوم عقلیہ کو جنم دیا اور ان کی پرورش کی۔ یہی تعلیم و تربیت دنیا کے لئے سرمایۂ ناز بنی۔ تعلیم کی بدولت عرب کی ایک بدو اور ناخواندہ قوم نے جو مفکرین، فلسفی، مؤرخ، کیمیاداں، اطبائے حاذق، علماء طبیعیات اور مہندسین پیدا کئے ان میں البیرونی، ابن خلدون، ابن سینا، خوارزمی، جابر بن حیان ثابت بن قرہ امام غزالی شیخ سعدی وغیرہ چند نام ہیں۔ ان میں ابن رُشد و دیگر حضرات کی حوادثات زمانہ سے بچی کچی چند تصانیف حال کی صدی تک یورپ کی مشہور علمی درس گاہوں کے نصاب میں داخل تھیں۔

ایک فنِ تعمیر ہی کے میدان میں عربوں نے نہ صرف ایک اچھوتے طرز تعمیر کی بنیاد ڈالی اور نئی اشیائے تعمیر دریافت اور استعمال کیں بلکہ نئے اصول تعمیر بھی وضع کیے۔ گو کہ عظیم عمارات کے بارے میں فنون لطیفہ کے نقطۂ نظر سے وافر اور معقول تحریری مواد ذخیرہ کی حد تک موجود ہے لیکن افسوس ہے کہ بدقسمتی سے ابھی تک فنِ تعمیر و ساخت کو ذہن میں رکھتے ہوئے مسلمانوں کے ان تعمیری شاہکاروں کے طرز تعمیر، اصول تعمیر اور اسلوب تعمیر کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ محققین اسلامی فنِ ساخت اور اصولِ تعمیر کے اہم لیکن نظر انداز شدہ پہلوؤں کی طرف اپنی گراں قدر توجہ مبذول کریں۔ بلاشبہ ان کے کارہائے نمایاں کا راز اسلام اور مسلمانوں کے علمی ذوق، تجسس اور غیر متزلزل قوتِ عمل ہی میں مضمر ہے۔ قرآن حکیم نے صریح و واضح الفاظ میں مسلمانوں کو مکمل ضابطۂ حیات عطا فرمایا۔ اور بلاتفریق مذہب، رنگ و ملت اور فاصلوں و دشواریوں سے بے نیاز ہو کر حصولِ علم کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک اور متعدد احادیث نبوی، علم، حصولِ علم اور فضیلت علم کے سلسلہ میں

قلمبند کی جاسکتی ہیں۔ امام غزالی نے قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک مفصل بابِ علم کی تعریف ومفہوم، حصولِ علم، اساتذہ وطلاب کے فرائض پر مرتب کیا جو آج بھی ہماری رہنمائی اچھے طریقے پر کرسکتا ہے۔

علم کا مفہوم :- علم برائے علم نہ کہ برائے حصول دولت، عزت، شہرت اور شان و شوکت؛ مسلمانوں کا مطمح نظر رہا۔ مسلمانوں نے علم کو کبھی تحصیل دولت کے لئے نہیں حاصل کیا، نہ علماء ہی کسی دور میں بہت دولت مند یا صاحبِ جاہ ومنصب تھے۔

ابتدائے اسلام ہی سے قرآن اور پیشوائے اسلام کے احکام کے مطابق علم دوستی اور علم پروری مسلمانوں کا شیوہ اور تفریحی مشغلہ رہا ہے۔ چنانچہ علما کا ایک اہم فرض علمی اور مذہبی حوصلہ مندی ہے۔ اس حوصلہ مندی کے زیر اثر محدثین نے ایک ایک حدیث کے لئے ہزاروں میلوں کا سفر کیا اور ہر قسم کی تکالیف سے دوچار ہوئے۔ اس حوصلہ مندی کا اثر تھا کہ اندلس کے طلبا ہندوستان میں حصول علم کے لئے آتے تھے۔ ابن بیطار نے نباتات کی تحقیق کے لئے اندلس سے چل کر یونان اور بحر روم کے جزائر کی خاک چھانی۔ جغرافیہ کی تحقیق کے لئے علامہ بشاری نے ۲۸ برس دنیا کے سفر میں صرف کئے۔ علم کی خاطر ابوالفرج اصفہانی نے ۵۰ برس صرف کرکے اپنی کتاب "الاغانی" تصنیف کی اور علم ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔

نویں صدی عیسوی میں ابن حایک ہمدانی نے عرب کا ایک ایسا جغرافیہ تیار کیا جو زمانہ حال کی تحقیقات کے مطابق ہے۔ اس میں عرب کے ایک ایک گاؤں اس کی پیداوار، عمارات، معدنیات، نباتات، حیوانات تجارت وغیرہ کے حالات تفصیل سے درج ہیں۔ یہ نسخہ ۱۸۸۴ء میں ایڈن سے شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بھی علوم اسلامی پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھیں۔ یورپ میں جو اسلامی سائنس اور دیگر علوم کی کتابیں شائع ہوئی ہیں اور ان کے کتب خانوں کا یہ نادر سرمایہ ہیں، دیکھ کر مسلمانوں کے علمی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر حال کی تصانیف میں جو کسی تعارف کی محتاج نہیں، سرسید کی "آثار الصنادید" ہے۔ ضرورت ہے اس بات کی ہے کہ اس کتاب کو سامنے رکھ کر ان عمارات، جن کا اس میں ذکر ہے نقشے (PLANS) تیار کئے جائیں اور اس کتاب میں شامل ہوں تاکہ یہ کتاب تاریخ کے علاوہ انجینئرنگ کے نقطہ نظر سے مکمل ہوجائے۔ یہ کام محققین، تاریخ اور سول انجینئرنگ مل کر انجام دے سکتے ہیں۔

قرآن وحدیث کے پیش نظر علما اور مفکرین نے حصولِ علم کے لئے مندرجہ ذیل پہلوؤں پر زور دیا ہے:

(۱) اعمال خیر، (۲) تہذیب الاخلاق اور، (۳) نشر العلوم،

چنانچہ اس نظریہ کے تحت بلا کسی قید و مذہب و ملت مسلمان طلبا کے علاوہ یہودی اور نصرانی یورپ اور ایشیا سے جوق در جوق حصول علم کے لئے جامعہ قرطبہ کی طرف رجوع ہوئے۔

مسلمانوں کے ابتدائی دور میں تین اقسام کے علمی ادارے قائم ہوئے:۔

(۱) مکاتب برائے ابتدائی تعلیم۔

(۲) مدارس برائے تعلیم ثانوی۔ ان کی نوعیت موجودہ دور کے اسکول اور کالجوں کی طرح تھی۔

(۳) دارالعلوم برائے اعلیٰ تعلیم و تحقیق۔ ان کی نوعیت موجودہ دور کی یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیمی و تحقیقی مرکزوں کی طرح تھی۔

نصاب عام طور پر دینیات، صرف و نحو، منطق، زبان، علم لسانیات، فلکیات، علم ہیئت اور علم الہندسہ وغیرہ پر مشتمل تھا۔

عربوں کا ذوق:۔ ریگستان اور صحرا کے رہنے والے بدّوؤں کو ملک سے باہر نکل کر پانی سے زیادہ علوم کی تشنگی ہوئی۔ مسٹر ووگنگٹن اپنی کتاب "تاریخ طب" میں عربوں کی ابتدائی فتوحات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی علمی طلب و علمی ذوق کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"۔۔۔۔۔۔ ایک بزنطینی بادشاہ کو حیرت ہوئی کہ عرب کی بدو اور فاتح قوم نے علاوہ اور شرائط صلح کے ایک شرط یہ بھی رکھی کہ ان کو یونانی کتابوں کی خرید اور جمع کرنے کا مجاز ہو۔۔۔ بادشاہ کو حیرت تھی کہ DIOSCORIDOS کی کتاب مع تشریح نقشا وہ عرب کے سردار کے لئے سب سے اعلیٰ بیش بہا اور قابل قبول تحفہ ہو سکتی ہے۔ قسطنطنیہ کے فلسفی مسلمان مصنفین کو دیکھ کر متحیر رہ گئے۔ یہ وہی عرب تھے جن کو انھوں نے نہایت بد دلی سے تعریف کرتے ہوئے ان کو عالم و فاضل مگر غیر متمدن کا لقب دیا تھا۔۔۔۔"

یہی وہ بدّو تھے جنھوں نے یونانی طب و علوم کی بجھتی ہوئی شمع کو گل ہونے سے بچایا۔۔۔ پانچسو سال کے بعد انھیں عربوں نے اس شمع کو پہلے سے بھی زیادہ روشن و درخشاں کر کے یورپ کے حوالے کیا۔

مسلمانوں کی علوم پروری اور علما نوازی کی بنا پر عرب بیشتر یونانی علوم و فنون سے مستفید ہوئے ان کی تحقیقی جستجو اس درجہ بڑھ گئی کہ جب ان کو یونانی کتابوں کے عربی تراجم سے تشفی نہ ہوئی تو انھوں نے اصل یونانی کتب سے رجوع کیا۔

دوسری قوموں کے علوم حاصل کرنے کے لئے عربوں نے مختلف زبانیں سیکھیں اور ان زبانوں کے لغات وشرح مرتب کیں۔ چنانچہ آج بھی مختلف زبانوں کے لغات دنیا کے عجائب خانوں کا سرمایہ ہیں۔

علمی ذوق اور بڑھا تو عربوں نے انسائیکلوپیڈیا تالیف کیے۔ عربی کا پہلا قاموس "کتاب عیون الاخبار" ابن قتیبہ (۸۲۸ء تا ۸۸۹ء) نے تیار کیا۔ اس کے عنوان طاقت، جنگ، شرافت، سیرت، علم، فصاحت، زہد، دوستی، عبادت، غذا، عذا اور صنف نازک تھے۔ قرطبہ کے ابن عبدربہ نے "عقد الفرید" شائع کی۔ یہ کتاب عیون الاخبار سے زیادہ جامع اور عنوان بھی زیادہ تھے۔ ۹۷۵ء اور ۹۹۷ء کے درمیان خوارزمی نے "مفتاح العلوم" شائع کی۔ یہ قاموس علم قانون، فلسفہ، تصوف، صرف ونحو، دفتری کام، شاعری، موسیقی، تاریخ، طب، ریاضی، علم ہندسہ، علم ہیئت وغیرہ پر مشتمل ہے۔ دسویں صدی عیسوی میں پانچ مصنفوں نے مل کر رسالہ "اخوان الصفا" تالیف کیا۔ یہ ۵۲ رسالوں پر مشتمل تھا۔ اس میں ریاضی، جغرافیہ، موسیقی، منطق، اخلاقیات، علوم سائنس وغیرہ پر بحث کی۔ ان تمام رسائل کا ایک مکمل ایڈیشن ۸۹-۱۸۸۷ء میں شائع ہوا ہے۔ مصری مورخ نویری نے ۱۲۷۲ء اور ۱۳۳۲ء میں "نہایت العرب فی فنون الادب" شائع کیا۔ یہ ۹۰۰۰ صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کے عنوان جغرافیہ، ہیئت، موسمیات، علم تاریخ، ارضیات، حیوانیات اور نباتات تھے۔ اس کا مکمل ایڈیشن ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ ان کے علاوہ بھی مختلف قاموس ہر صدی میں تالیف ہوتے رہے۔

اسی علمی ذوق اور تجسس علوم کی چند مثالیں ذیل میں درج ہیں۔ مثالوں کی نشاندہی کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ اقوام مذاہب اور ملکوں کے عروج و زوال میں علم کو کس درجہ دخل ہے:

علم کے متعلق ڈاکٹر اسپرنگر نے لکھا ہے: — "مسلمانوں کے اسماء الرجال میں پانچ لاکھ مشہور عالموں کا حال مل سکتا ہے۔ اب اگر یہ قیاس کیا جائے کہ تعلیم یافتہ گروہ کس نسبت سے ایک صاحب کمال پیدا کرتا ہے تو عام تعلیم کا ایک معقول اندازہ ہوسکتا ہے۔"

نظام الملک طوسی نے ۱۰۶۷ء میں نظامیہ بغداد کی تعمیر کی۔ مشہور مغربی مؤرخ گبن نظامیہ بغداد کے متعلق لکھتا ہے: "ایک سلطان کے وزیر نے بغداد میں مدرسہ قائم کرنے کے لئے دو لاکھ دینار وقف کیے۔ اور ۱۵ ہزار دینار سالانہ اس کے صرفہ کے لئے مقرر کیے۔ اس ادارہ سے چھ ہزار ہر درجہ کے طلبہ مختلف وقتوں بہرہ اندوز ہوئے ....." (دینار تقریب پانچ روپیہ کا تھا)۔

اس مدرسے کے تعلیمی معیار، عظمت اور وسعت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ شیخ سعدیؒ

اور امام غزالیؒ مدرسہ نظامیہ بغداد کے آخری زمانہ کے طالب علم تھے۔

.. صاحب ابن عباد کو جب نوح بن منصور نے وزارت کے لئے طلب کیا، تو اس نے عذر لکھ بھیجا:

"مجھ کو ضروری ساز و سامان کو ساتھ لانے میں بڑی زحمت ہو گی اور صرف کتابوں کے لادنے کے لئے چار سو اونٹ درکار ہوں گے۔"

صاحب عباد نے علم کو وزارت پر ترجیح دی۔

. ابوجعفر بن عباس نے جو کتب خانہ قائم کیا، اس میں ۴ لاکھ مجلد کتابیں تھیں۔ اس سے کتب خانہ کی وسعت اور علم دوستی کا اندازہ ہوتا ہے۔

۔ امام ابن جوزی نے اپنے ہاتھ سے دو ہزار جلدیں لکھیں۔ احادیث لکھتے وقت قلموں کا تراشہ جمع کرتے رہتے تھے۔ مرتے وقت وصیت کی کہ غسل میت کا پانی اسی تراشے سے گرم کیا جائے۔ کہتے ہیں کہ گرم کرنے کے بعد کافی تراشہ بچ رہا۔ اندازاً تراشہ کا کل وزن ساٹھ ستر کیلو گرام رہا ہو گا۔ اس وزن سے بھی ان کی تصانیف اور تحریروں کا اندازہ لگانا زیادہ قرین قیاس ہے۔

. زمانۂ حال میں حضرت تھانوی رح کی یومیہ تصانیف کا اوسط ۴ صفحات بتایا جاتا ہے۔ یقین بمشکل ہوتا ہے حالانکہ یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے۔

خود بانیٔ درسگاہ سرسید مرحوم کی تصانیف اس قدر کثیر ہیں کہ یقین نہیں ہوتا۔ مگر حقیقت پر مبنی ہے۔

مدارس:۔ دارِ ارقم۔ مسلمانوں کا سب سے اوّل مدرسہ دارِ ارقم ہے۔ اس مدرسہ کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں:

معلّم: حضور سرورِ کائنات۔ تعداد متعلم: ۴۰ افراد۔ حیثیت: مدرسہ اور دار الاقامہ

یہ مدرسہ صرف ایک ماہ رہا۔ مدرسہ کے علاوہ یہ اوّل دور کے مسلمانوں کے لئے پناہ گاہ بھی تھی۔ اس کے بعد ہی مسلمان کھلم کھلا اسلام کی نشر و اشاعت کرنے لگے۔

جامعہ صفہ: ہجرت کے بعد مسجد نبوی کی تعمیر کے ساتھ مدینہ منورہ میں مسجد سے ملحق ایک چبوترہ قائم ہوا۔ اس میں حضور سرورِ کائنات بنفس نفیس خود قرآن کا درس دیتے تھے۔ یہ بھی ایک طرح کا مدرسہ اور دار الاقامہ تھا۔ جامعہ صفہ کے فارغ التحصیل حضرات نے اسلام کی نشر و اشاعت میں بہت اہم فرائض انجام دیے۔ ان میں سے چند جلیل القدر اشخاص کے نام حسب ذیل ہیں:۔ حضرت اسماء بن حارثہؓ،

حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت بلال بن رباحؓ، حضرت طلحہ بن عمرؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ ــــ حضرت ابوہریرہؓ کے ذمہ متعلمین کے طعام کا انتظام تھا۔

دارالحکمہ: خلیفہ ہارون رشید نے ۸۳۰ء میں بغداد میں یہ ادارہ قائم کیا۔ یہ ایک کتبخانہ اور دارالترجمہ تھا۔ کتب خانہ میں عربی، سنسکرت، فارسی اور یونانی وغیرہ زبانوں کی کتابیں تھیں۔ ایک حصہ میں رصدخانہ تھا۔ ۸۵۰ء میں خلیفہ المامون نے مشہور حساب داں خوارزمی کو دارالحکمۃ کا ناظم مقرر کردیا۔

۱۲۵۸ء میں بغداد کے ساتھ دارالحکمہ بھی برباد ہوا۔ کتابیں نذر آتش اور غرق آب کردی گئی تھیں۔ مسلمانوں کا علمی سرمایہ نیست و نابود کیا۔ کچھ بچی کھچی مگر کثیر تعداد میں کتابیں آج بھی یورپ میں پائی جاتی ہیں۔ ان نایاب نسخوں میں چمڑے پر حضورؐ کے دادا عبدالمطلب کے ہاتھ کا لکھا ہوا، ایک گراں قدر نسخہ بھی تھا جو ضائع ہوا۔

جامعہ نظامیہ بغداد: ۱۰۶۷ء میں نظام الملک طوسی نے بغداد میں قائم کیا۔ یہ ایک یونیورسٹی تھی۔ نیشاپور، ہرات، موصل، اور اصفہان وغیرہ میں جامعہ نظامیہ کے الحاقی مدارس تھے۔ خود نیشاپور میں قریب ۲۵ حنفی اور شافعی مدارس اور قریب ۱۲ کتب خانے تھے۔ سلیمان صفوی کے دور میں صرف اصفہان ہی میں ۴۸ مدارس تھے۔ شیخ سعدیؒ اور امام غزالیؒ اسی جامعہ نظامیہ کے فارغ التحصیل تھے۔

مستنصریہ بغداد: ۱۲۳۴ء میں خلیفہ مستنصر نے بغداد میں قائم کیا۔ چھ سال کے وقفہ میں مدرسہ مکمل ہوا۔ مدرسہ کی عمارت نہایت شاندار اور اس زمانہ کے فن تعمیر کا بہترین نمونہ تھی۔ طلباء کا قیام و طعام، کتب وغیرہ سب مفت تھا۔ طلبا کو طعام کے ساتھ شیرینی و فواکہ دیے جاتے تھے اس کے علاوہ ایک گنی ماہانہ جیب خرچ دیا جاتا تھا۔ پینے کے پانی کو ٹھنڈا کرنے کا خاص اہتمام تھا۔ مستنصریہ کے قیام کے فوراً ہی بعد قریب ۲۴۸ طلبا اقامت گاہ میں رہتے تھے۔

خلیفہ نے اپنے کتب خانہ سے ۱۶۰ اونٹوں پر لاد کر کتابیں مستنصریہ کو عطا کیں۔ اگر ایک اونٹ پر ۲۰۰ کتابیں فرض کریں، تو کل کتابوں کی تعداد ۳۲ ہزار ہوتی ہے۔ ان مدارس کے علاوہ نورالدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیشمار مکاتب اور مدارس قائم کیے۔ ترکوں کے عہد میں بھی مکاتب و مدارس مسلسل قائم ہوئے۔

اسپین: خلفائے اسپین نے بھی دل کھول کر علوم کو نوازا اور علماء کی بڑی قدر و منزلت کی۔ بڑے بڑے جامعہ، مدارس اور کتبخانے قائم کیے۔ ان کی علم دوستی سے یورپ کے لوگ مستفید ہوئے

اندلس کی اسلامی درس گاہوں میں فارغ التحصیل ہوئے۔ اپنے ملک واپس جاکر علم و حکمت کو فروغ دیا۔ اگر اہل یورپ کو اندلس کی درس گاہوں سے علم کی روشنی نہ ملی ہوتی، تو قیاس یہ ہے کہ وہ آج بھی دنیا کی جاہل ترین قوموں میں شمار کیے جاتے۔

بارھواں صدی عیسوی سے تیرھویں صدی عیسوی تک عرب کی تقریباً تین سو کتابوں کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا۔ ان میں زکریا رازی، ابوالقاسم زہراوی، ابن رشد، بوعلی سینا وغیرہ کی تصنیفات کا ترجمہ شامل ہے۔ ارسطو، بقراط، جالینوس اور اقلیدس کی کتابوں کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوا آج ان عالموں کی تصانیف عربی ہی کی بدولت محفوظ ہیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں پیرس، برلن، لندن، آکسفورڈ، اٹلی اور اسکوریال (اسپین) وغیرہ کتب خانوں میں عربی زبان کی ڈھائی لاکھ سے زائد مطبوعہ اور مخطوطہ کتابیں موجود تھیں۔

ملر نے اپنی تصنیف "تاریخ فلسفہ" میں اسپین کی اسلامی درس گاہوں کے تذکرہ میں لکھا ہے:۔ "مغربی علوم کے اصلی ماخذ عربوں کے وہ مدارس ہیں جو ہسپانیہ میں قائم ہوئے۔ یورپ کے ہر ملک کے طلبا ان مدرسوں کی طرف دوڑتے تھے اور ان میں جاکر علوم طبعیہ، علوم ریاضیہ اور علوم ماورا ء الطبعیہ حاصل کرتے تھے۔ اسی طرح جب عربوں نے اٹلی پر قبضہ کیا، تو وہ بھی یورپ میں اسلامی علوم کے داخلہ کا سبب بنا"

کتب خانے: مکاتیب، مدارس، اور دارالعلوم کے کتب خانوں کے علاوہ بہت سے اور کتب خانے دنیائے اسلام میں تھے۔ ان میں سے صرف چند کی فہرست دینی مقصود ہے۔

(۱) خالد بن یزید بن معاویہ کا کتب خانہ۔ اسلامی دنیا میں سب سے پہلے کتب خانے کی بنیاد ڈالی۔ (۲) دارالحکمہ کا کتب خانہ (۳) علامہ واقدی کا کتب خانہ۔ (۴) اسپین میں حاکم ثانی کا کتب خانہ۔ (۵) سلطان بخارا نوح بن منصور کا کتب خانہ (۶) شیراز میں عضدالدولہ کا کتب خانہ (۷) سیف الدولہ کا کتب خانہ (۸) دور فاطمی میں مصر کا کتب خانہ۔ (۹) عراق، شام اور فارس کے کتب خانے وغیرہ۔

استنباط: (۱) مسلمانوں کے علم کا مفہوم اور حصولِ علم کا نظریہ عین قرآن اور احادیث کے مطابق تھا۔ اس مفہوم کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے علم برائے علم نہ کہ علم برائے حصولِ دولت،

ثروت، و شان و شوکت مسلمانوں کا مطمح نظر رہا۔

(۲) ضرورت ہے کہ محققین اسلامی فن ساخت اور اصول تعمیر کے اہم لیکن نظرانداز شدہ پہلوؤں کی طرف اپنی گراں قدر توجہ مبذول کریں۔

(۳) جو کتابیں مغرب میں شائع ہو چکی ہیں ان کا ترجمہ انگریزی، اردو، فارسی اور دنیا کی دیگر زبانوں میں شائع کرنے کا بندوبست ہو۔ ان قلمی نسخوں اور کتابوں کو کتب خانہ سے نکال کر تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے عام کیا جائے

(۴) نایاب قلمی نسخوں کے MICRO FILMS بنوا کر دنیا میں مختلف جگہوں پر محفوظ کریں تاکہ حوادث زمانہ ATOMIC WARFARE سے کہیں تو محفوظ رہ سکیں اور انسانیت کا یہ سرمایہ بچ سکے۔ یہ کام زیادہ زرطلب بھی نہیں ہے۔

(۵) چند کتابوں کا اقتباس کتابچوں کی شکل میں عام انسانوں خاص کر طلباء تک پہنچ جائے۔ مثلاً لی بان کی کتاب "تمدن عرب" کا کتابچہ تیار ہو اور اس کو ہمارے نصاب میں شامل کرنے پر غور کریں اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ہمارے نوجوان اپنے ماضی سے واقف ہوں گے۔ مگر اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہو کہ "پدرم سلطان بود"

(۶) سرسید کی کتاب "آثار الصنادید" میں نقشے شامل کرکے اس کو پایۂ تکمیل کو پہنچانے کی کوئی اسکیم بنانا چاہیئے۔

●●

ڈاکٹر وارث کرمانی

جرس فریاد می دارد....

تقسیم ملک سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علموں کی بڑی تعداد مسلمان امرا و رؤسا کے گھرانوں سے تعلق رکھتی تھی اور ان کی تعلیم کا مقصد مہذب و شائستہ بننے کے علاوہ اعلیٰ سرکاری ملازمت حاصل کر کے خاندانی اعزاز میں اضافہ کرنا ہوتا تھا۔ اب نہ وہ رئیس و تعلقہ دار باقی رہ گئے ہیں، نہ آئی۔سی۔ایس کا وہ جاہ و باقی ہے۔ موجودہ علی گڑھ کے طالب علم زیادہ تر یو۔پی کے ایسے مسلمان گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں جو ابھی تک سابق زمینداریوں کی بچی کھچی املاک سے اپنے آبائی قصبات میں گزر بسر کر رہے ہیں۔ یا پھر شہروں میں نکل کر آباد ہو گئے ہیں اور وہاں کسی نہ کسی ملازمت یا تجارت سے بسر اوقات کر رہے ہیں۔ قصبوں میں رہنے والوں کی جائداد زیادہ تر کاشتکاری کے فارموں، مختلف کھیتوں اور پھلوں کے باغات کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ بعض جگہوں پر کاشتکاری کے علاوہ یا اس کے ساتھ دوسرے ذرائع آمدنی بھی ہوتے ہیں جیسے ٹیوب ویل، بجلی یا انجن سے چلنے والی چکیاں، آرا مشین، ٹرانسپورٹ کا دھندا، یا کولڈ اسٹوریج کا کاروبار وغیرہ۔

یہ سب کاروبار ان طالب علموں کے گارجین چلاتے ہیں یا پھر گھر کے ایسے افراد جو اعلیٰ تعلیم نہ پانے کی وجہ سے دیہاتی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن گھر کے وہ افراد جو یونیورسٹی میں تعلیم پا رہے ہیں ان سب کا نصب العین وہی سرکاری ملازمت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ نصب العین آج بوسیدہ و از کار رفتہ ہو گیا ہے۔ اوّل تو سرکاری ملازمت اب اس پایہ کی نہیں رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ آج کا ڈپٹی کلکٹر سائیکل دبائے ہوئے گاؤں گاؤں مارا مارا پھرتا ہے اور اس سے نیچے درجے کے ملازموں کا حال ناگفتہ بہ ہے۔ ان ملازموں کی تنخواہیں اتنی کم ہوتی ہیں کہ صاف اور صحت مند زندگی کی کفالت نہیں کر سکتیں۔ مجبوراً ملازمت کرنے والا دوسرے ناجائز ذرائع آمدنی سے پیسہ کمانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے باوجود اسے شہر کے تنگ مکانوں میں ملاوٹ کی ہوئی غذا اور صنعتی ماحول کی زہریلی ہوا پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ اس رجحان کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ہمارے گاؤں اور قصبے جو ابھی تھوڑی مدت پہلے ہماری تہذیب کا مرکز تھے اور جنھیں شاہجہاں اپنی سلطنت کا شیرازہ کہا کرتا تھا، آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ لکھوری اینٹ کی بنی ہوئی بلند حویلیاں جہاں عجمی تہذیب کی بہار

نظر آتی تھی۔ آج ویران ہو کر لڑکھڑانے لگی ہیں اور ان کے شکستہ کنگورے آزاد بلگرامی، ریاض خیرآبادی، محسن کاکوروی، جوش ملیح آبادی اور مجاز ردولوی کا نوحہ پڑھ رہے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ ختم ہو چکے ہیں، بلکہ اس لیے کہ آج ان کی جائے پیدائش پر ان کے پڑھنے اور سمجھنے والے باقی نہیں رہے ہیں اور ان کے نونہال ترک وطن کر کے کسی گنجان شہر کی مشین کا پرزہ بن چکے ہیں۔

اس مضمون کے ذریعہ ہم اپنے طالب علموں کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرنا چاہتے ہیں کہ وہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر شہری مشین کا پرزہ بننے سے پہلے ایک بار اپنے آبائی وطن اور اپنے گھروں کی جانب بھی دیکھ لیا کریں اور وہاں کی آزاد زندگی اور آزادانہ ذریعہ معاش کو بھی پیش نظر رکھ کر اپنے مستقبل کے پروگرام کا فیصلہ کریں۔ آج کل زیادہ تر نوجوان دیہات کی آرام دہ زندگی پر شہر کی محبوس اور تکلیف دہ زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس رویے کے پیچھے کئی غلط مفروضات کار فرما ہیں۔ جو ماضی میں کسی وقت شاید صحیح رہے ہوں، لیکن آج قطعی بے بنیاد ہو گئے ہیں۔ عام طور سے قصبوں کی زندگی کو شہر کی زندگی کے مقابلہ پر غیر محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ صورت حال اب اس کے برعکس ہے۔ شہروں میں کہیں زیادہ ڈکیتیاں اور فسادات ہوتے رہتے ہیں اور نہ پولیس موقع پر پہنچتی ہے، نہ پڑوسی گھر سے نکلتا ہے۔ جبکہ دیہات میں اگر اتفاق سے اگر ایسا حادثہ ہو بھی جاتا ہے تو پولیس سے پہلے سارے گاؤں والے جمع ہو کر مدد کو پہنچ جاتے ہیں۔ ایک دوسرا اعتراض جو دیہاتی زندگی پر کیا جاتا ہے۔ وہ تعلیمی اور طبی سہولتوں کا نہ ہونا ہے۔ یہ بات بھی اب زیادہ صحیح نہیں رہی ہے۔ تعلیمی اور طبی سہولتیں اب اطراف میں پھیل چکی ہیں اور سند یافتہ ڈاکٹر چھوٹے چھوٹے قصبوں میں موجود ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے اسکول ہر جگہ کھل چکے ہیں۔ بجلی تقریباً ہر جگہ پہنچ چکی ہے۔ اور ٹرانسپورٹ کی سہولتوں نے قصبوں کو بڑے شہروں سے قریب تر کر دیا ہے۔ کھانے پینے اور ضروریات زندگی کی بیشتر چیزیں وہاں دوکانوں پر موجود رہتی ہیں۔ یہ ہے موجودہ دیہات اور قصبات کا نقشہ جس سے گریز کر کے نوجوان شہروں کی گنجان، غیر صحت مند اور فتنہ پرور زندگی کی طرف بھاگتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں اگر ہمارے طالب علم تعلیم یافتہ ہونے کے بعد شہروں میں معمولی نوکری کرنے کے بجائے اپنے گھروں میں رہ کر پیسہ کمانے کی کوشش کریں تو وہ زیادہ خوش حال اور مطمئن زندگی بسر کر سکتے ہیں، جن کے گھروں میں کاشتکاری یا آم کے باغات ہیں وہ زراعت کے جدید طریقوں سے انھیں ترقی دے سکتے ہیں۔ اس کے لیے حکومت کی طرف سے ہر ممکن سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ مثلاً اچھے بیج کی فراہمی،

کیڑے مار دواؤں کا انتظام اور صنعتی کھاد وغیرہ۔ اس کے علاوہ کھیتوں اور باغوں کی آمدنی پر حکومت کوئی انکم ٹیکس بھی نہیں لیتی جو مزید عزت افزائی کا سبب ہے۔ اگر یہ طالب علم انجینئر یا ڈاکٹر بن کر نکلے ہیں تو بھی اپنے وطن میں ذاتی کاروبار کر سکتے ہیں جسے انگریزی میں Self employment کہا گیا ہے۔ ڈاکٹر اپنا دواخانہ کھول کر اور انجینئر اپنی دوکان قائم کر کے ملازمت سے کہیں زیادہ مالی منفعت حاصل کر سکتے ہیں اور ان سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ آزادانہ زندگی بسر کریں گے جس کی بنا پر وہ اپنے علاقہ کے دیہاتوں سے خوشگوار تعلقات قائم کر سکتے ہیں اور سیاسی و سماجی مسائل میں دلچسپی لے کر اپنے ہموطنوں کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ اس سے ان کی ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوگا اور انھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ صرف مسلمان فرقے کے ایک فرد نہیں ہیں بلکہ ہندوستان میں کثیر التعداد ہندوؤں کے لیے بھی جزو زندگی ہیں اور ان کے دکھ درد میں شریک ہیں۔ ہمارے مشرقی یو۔ پی میں بسنے والے غیر تعلیم یافتہ معصوم ہندوؤں کی اکثریت نہایت ایمان دار، محنتی اور وفاشعار ہے۔ ان سے ربط ضبط پیدا کرنے سے اپنے دائرۂ عمل میں ایک عجیب بالیدگی اور وسعت کا احساس ہوتا ہے جو تجربہ ہی سے سمجھ میں آتا ہے۔ یہ تمام پروگرام اپنے آبائی مستقر یا خاندانی وطن ہی میں رہ کر پورا کیا جا سکتا ہے۔ جس کے ذریعہ جاگیردارانہ دور کا کھویا ہوا وقار دوبارہ ہمارے قصبات میں واپس آجائے گا۔

علی گڑھ میں ہمارے طالب علم ایک عرصے سے اس طرح زندگی بسر کرنے کے عادی ہو گئے ہیں جیسے کسی جزیرے پر سکونت اختیار کیے ہوں۔ اطراف و جوانب سے ہمارا کوئی خاص تعلق نہیں جس کی بنا پر ایک قسم کی کشیدگی اور مخاصمت کا احساس دلوں پر طاری رہتا ہے جو اکثر فرقہ وارانہ رنگ بھی اختیار کر لیتا ہے۔ اس مقامی فضا کو غلطی سے ملک کی عام فضا سمجھ کر زیادہ تر طالب علم یونیورسٹی کے اندر ہی ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا پھر بڑے شہروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ رویہ گمراہ کن اور حقیقت کے خلاف ہے اور ہمارے طالب علموں کو ملک کے مرکزی دھارے Main stream سے دور رکھتا ہے۔ اگر ہمارے نوجوان اپنے آبائی ٹھکانوں سے جو تمام یو۔ پی کے دیہات میں پھیلے ہوئے ہیں، واپس جا کر اپنا کیریر بنانا شروع کریں تو انھیں علی گڑھ کی محدود زندگی سے نکل کر پورے ملک کے سماجی ارتعاش میں شامل ہونے کا موقع ملے گا اور وہ تسخیر و تعمیر کے بیشمار موقعوں پر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں گے۔ اس کا ایک بالواسطہ فائدہ یہ ہوگا کہ وہ قصبات و دیہات جو صدہا سال سے ان کا وطن تھا اور ان کے آبا و اجداد کے تصرف میں تھے غیر آباد و ویران ہونے سے

پہنچ جائیں گے اور وہاں نئے سرے سے ان کا اثر و رسوخ قائم ہو جائے گا اور وہ بالادستی جو جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے انھیں حاصل تھی اب علم و ہنر کے ذریعہ عوامی ہر دلعزیزی کی شکل میں پیدا ہو جائے گی۔ مرزا غالب نے اپنی ایک مسلسل غزل میں اس مضمون کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ آپ اگر ان شعروں پر غور کریں تو اُن میں آپ کے مستقبل کی زندہ و تابندہ بشارتیں نظر آئیں گی۔ غالب کہتے ہیں:

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند　　　شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

ان اندھیری راتوں میں مجھے صبح کی خوشخبری دی ہے، شمع کو بجھا دیا اور سورج کا پتا دیا ہے

گہر از رایت شاہان عجم برچیدند　　　بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

عجم کے بادشاہوں کے پرچم سے موتی توڑ لیے لیکن اس کے معاوضہ میں مجھے خزانہ برسانے والا قلم عنایت کیا

افسر از تارک ترکان پشنگی بردند　　　بسخن ناصیۂ فرِ کیانم دادند

پشنگ کی نسل کے ترکوں کے سر سے تاج لے لیا اور (اس کی جگہ) میری شاعری کی پیشانی کو کیانی شان عطا کی

گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند　　　ہر چہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

تاج سے موتی توڑ کر علم سے باندھ دیا۔ گویا ظاہر میں جو چیز چھین لی، پوشیدہ طور سے مجھے دے دی

غالب اپنا سلسلۂ نسب تورانی بادشاہ پشنگ اور افراسیاب سے جوڑا کرتے تھے۔ اپنے بزرگوں کی حکومت اور ان کا جاہ و جلال یاد کر کے خود کو تسلی دے رہے ہیں کہ خدا نے ہم سے تخت و تاج لے کر علم و ہنر کی دولت عطا کی جو شاہی میراث سے کہیں بہتر ہے۔ وہ اگر شمع کی مانند تھی تو علم و ہنر سورج کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ ظاہر میں جو چیز لے لی وہ پوشیدہ طور سے ہمیں دوسرے انداز میں عطا کر دی۔

غالب کی طرح ہمارے طالب علموں کو بھی اپنے ماضی کی شان و شوکت کا بدل اپنی محنت اور اپنے علم و ہنر کو سمجھنا چاہیئے۔ ہمارے نوجوان خاص طور سے اس عظیم الشان یونیورسٹی کے طالب علم، پوری قوم کی امیدوں کا مرکز اور اس کے مستقبل کی ضمانت ہیں۔ ان کی یہ محدود زندگی جو یونیورسٹی سے نکل کر شہری ملازمت میں کھو جاتی ہے، کسی طرح ان کے شایان شان نہیں۔ انھیں پورے ملک کو اپنی جولان گاہ سمجھنا چاہیے اور اس کے سطح کے ہر گوشہ و قریہ کو اپنی تسخیر و تعمیر کا نشانہ بنانا چاہیے، نہ یہ کہ خود اپنے ہی آبائی مکانوں کو ویران کر کے دور افتادہ شہروں میں گوشۂ عافیت تلاش کریں۔ ان کی ترقی اپنے آبائی مرکز ہی میں قدم جمانے کے بعد ممکن ہو سکے گی اور اسے مضبوطی سے پکڑنے کے بعد ہی دور تر اور بلند تر مقاصد پر کمند ڈال سکتے ہیں۔ اس

کا ذریعہ اور آلۂ کار علم کی روشنی، محنت کی عرق ریزی، وطن کی خدمت، اہلِ وطن سے محبت اور تعاون ہی ہو سکتا ہے۔ میرے کہنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ ہمارے طالب علم اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کو نہ حاصل کریں یا شہروں میں بود و باش نہ اختیار کریں۔ میرا کہنا صرف اس قدر ہے کہ اسے اپنا مستقل گھر نہ بنائیں۔ بقول فراقؔ،

ع وہ کوچہ رو کش جنت ہو، گھر ہے گھر پھر بھی

ہمارے طالب علموں کو اعلیٰ ملازمت سے جو فیض اور منفعت حاصل ہو، اسے اپنا آبائی گھر کے سجانے اور بڑھانے میں استعمال کریں اور زندگی کی شام اور کیریر کا خاتمہ ہونے پر وہیں مراجعت کریں۔ اس طرح اپنے ماضی اور اپنی روایت سے جڑے رہیں گے، اپنے کنبے، اپنے معاشرے اور اپنے خاندان کو ۲۱ ویں صدی کی آنے والی اندھا دھند زندگی میں منتشر نہ ہونے دیں گے۔ ان کے گھر اور ان کے وطن میں نئی رونق اور جگمگاہٹ پیدا ہو جائے گی اور وہ معاشرہ اور محفلیں پھر سے ظہور میں آئیں گی جو ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی میں ہمارے بزرگوں کا طرۂ امتیاز تھیں! اور وہ علم و ادب کے مرکز پھر جاگ اٹھیں گے جن پر شاہان تیموریہ فخر کرتے تھے!!

●●

اشتیاق محمد خاں

تلخ، ترش، شیریں

میری رائے اس نوجوان نسل کے متعلق بالخصوص مسلم طلبا کو پیش نظر رکھتے ہوئے زیادہ اچھی نہیں ہے، لیکن اس کے مستقبل سے بہت پُرامید ہوں۔

ہماری موجودہ نسل جو ۱۹۴۷ء کے بعد آئی، اس، خود رو پودے کی مانند ہے جس کی صحیح نگہداشت اور تربیت گھر سے لے کر اسکول کالج تک نہیں ہو سکی۔ اس نئی نسل کے جوانوں کے پاس کوئی نصب العین نہیں ہے یا بہت سی کمیوں یا COMPLEXES کا شکار ہیں جیسے خود اعتمادی، احساس ذمہ داری، روزمرہ کی زندگی میں برتے جانے والے آداب، وقت و وعدہ کی پابندی، اخلاقی جرأت، سنجیدہ مطالعہ اور ہمہ جوئی کی اسپرٹ جیسی خصوصیات ان میں خال خال نظر آتی ہیں۔ آزاد ملک کے شہری ہونے کے ناطے آزادانہ اور بے باکانہ اظہار خیال سے جھجکتے ہیں۔

اصل ذمہ داری ان سیاسی اور معاشی عوامل اور اس سماجی نظام کی ہے جس نے رشوت، بیکاری، فرقہ پرستی، کالا بازاری، دوغلے اور بے ایمان لیڈروں کو جنم دیا ہے، اسی نظام معیشت نے ان کو احساس کمتری اور بزدلی کا شکار بنا دیا ہے۔ ان کی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ اس نسل کے لیے "کس طرح جئیں اور کیسے گزارا کریں" کا مسئلہ سب سے بڑا اور بھیانک مسئلہ ہے جو ہر وقت بھوت بن کر ان کے سروں پر منڈلاتا رہتا ہے۔ جس کے نتیجے میں یہ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش سے زیادہ تعلیم کے بعد ملازمت حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔

حالات کی سنگینی نے اُن کو اب یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کوئی رشتہ دار، دوست اب کام نہیں آتا؛ جو کچھ حاصل کرتا ہے، اپنے ہی بل بوتے پر کرنا ہے۔ گویا کہ زندگی کو بنانے میں ذاتی محنت و عمل کا رجحان ان میں بڑا ہی خوش آیند ہے۔

نوجوانوں کی کردار سازی اور ان کی صحیح رہنمائی کا کام صرف ہوسٹل یا دارالاقامہ ہی انجام دے سکتے ہیں بشرطیکہ ہوسٹل کے منتظمین بالخصوص نگراں (وارڈن) شعوری طور پر جذبۂ خلوص و ایثار کے ساتھ اس کام کو اپنا مشن بنا لیں۔ سرسید احمد خاں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو روز اوّل ہی سے اقامتی رکھا۔

جس کے مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ ایک عرصۂ دراز تک علی گڑھ کے طلبا اپنے رہن سہن، ڈسپلن، بیباکانہ اور مہذبانہ طرزِ گفتگو اور بھائی چارگی میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے اور یہ سب کچھ اقامتی زندگی کی دین تھا۔

میں کسی جماعت کا ممبر نہیں۔ ہاں اپنا ایک نظریہ ہے جو سیاسی کم، معاشی زیادہ ہے جس کی وضاحت علامہ اقبالؒ نے اپنے اس شعر میں کی ہے:

جو حرف 'قل العفو' میں پوشیدہ ہے اب تک ٭ اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

(تمہاری ضرورتوں سے زیادہ جو تمہارے پاس ہو، اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو)

علامہ اقبالؒ نے یہ شعر اب سے ۵۰، ۶۰ سال پہلے کہا تھا؛ اگر اس وقت وہ زندہ ہوتے تو لفظ 'شاید' 'یقیناً' میں ضرور بدل جاتا۔

بمبئی کی تیز رفتار اور کٹھور زندگی نے وقت کی پلاننگ کو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کا گُر سکھا دیا ہے اور یہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کا اپنا کوئی نصب العین ہو، یا جس نے اپنے لئے زندگی میں کوئی اعلیٰ مقصد کا تعین کیا ہو۔

بے انتظامی معاملات تو اسکول و کالج سے لے کر ہوسٹل اور حکومت تک سب ایک ہی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ڈسپلن برقرار رکھنے کے لیے چند بنیادی باتوں اور اصولوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ کسی بھی عہدیدار، افسر یا حاکم کا مخلص ہونا ضروری ہے، ساتھ ساتھ سخت گیر بھی۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر تنبیہ کر کے ان کو درگزر کرنا چاہیے۔ ہر مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے انسانی پہلو کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ تنبیہ اور وارننگ کے بعد بھی اگر کوئی غلطی یا جرم کا مرتکب ہو، تو سزا دینا ضروری ہے۔ طلبا کے ساتھ بالخصوص ہمدردانہ رویہ اور دوستانہ رویہ رکھنا چاہیے۔ لیکن شرارتی عناصر کے ساتھ سختی سے پیش آنا ضروری ہے۔ کسی بھی معاملہ میں جانبدارانہ رویہ ڈسپلن کو ختم کر دیتا ہے۔ ان ہی چند اصولوں کو اپنا کر اور اُن پر عمل پیرا ہو کر اس ہوسٹل میں ڈسپلن پچھلے ۲۰ سال سے برقرار ہے۔

میری رائے میں نوجوان مذہب سے بیزار تو نہیں۔ البتہ مذہبی معلومات کی کمی ضرور ہے اور اس کی وجہ سیاسی ماحول اور معاشی بحران ہے۔ جس نے کٹر مذہبی لوگوں تک کو "مادہ پرست" بنا دیا ہے۔

مذہبی تعلیم جو دراصل گھر سے شروع ہونا چاہیئے، آج نچلے اور متوسط طبقے کے گھرانوں میں ممکن نہیں ہے۔ آمدنی کم، اخراجات زیادہ، گزارا ہو تو کیسے؟ یہی فکر والدین کو دامن گیر رہتی ہے اُن کے

پاس اتنا وقت نہیں کہ بچے کی اسکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کی نگرانی یا انتظام کرسکیں۔
اس کے علاوہ ہمارے دینی رہنما اور مذہبی شخصیات نوجوان نسل کو متاثر کرنے سے قاصر ہیں۔
علما میں گفتار کے غازی تو شہر در شہر مل جائیں گے، لیکن کردار کے غازی خال خال ہی کہیں ملیں گے۔
میری رائے میں اس وقت نام نہاد لیڈروں سے کہیں زیادہ مخلص نوجوان منتظمین کی ضرورت ہے جو ملک کے گوشہ گوشہ میں بہترین طلبا، سائنس داں، آرٹسٹ یا فن کار، بہترین کھلاڑیوں اور دستکاروں کو منظم کرسکیں۔ یہی تنظیم بیروزگاروں کو روزگار مہیا کرنے کی کوشش کرے اور معلومات بہم پہنچائے۔ قومی بینکوں کی طرف سے بہت ساری اسکیمیں نکالی گئی ہیں جن سے چھوٹے موٹے دھندے شروع کیے جاسکتے ہیں، لیکن ان اسکیموں کا علم بہت سے نوجوانوں کو نہیں ہے۔
یہ تنظیم بلا امتیاز مذہب و فرقہ غریب ترین بچوں کی تعلیم کے اخراجات بھی برداشت کرے۔
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پچھلے سالوں میں جو کچھ بھی ہوا، واقعی افسوسناک ہے۔ یہ ایک الگ موضوع بحث ہے، جو تفصیل اور وقت طلب ہے، پھر بھی اس سلسلے میں گفتگو ہوگی۔ لیکن ایک بات بہت یقین کے ساتھ کہوں گا، اور وہ یہ کہ ہاتھی لٹا تب بھی سوا سو من کا رہتا ہے۔
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں بگڑے ہوئے حالات میں بھی بہت بہتر ہیں۔
"اچھی چیز جہاں ملے، اپنا کھویا ہوا سرمایہ سمجھ کر اپنالو"
"کمزور اور پسماندہ طبقوں کی حتی المقدور اس طرح مدد کرو کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوجائیں اور تمہارے دوست بن جائیں۔ سیر و سیاحت ضرور کرو، تاریخی عمارتیں، قدرتی مناظر کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ مختلف ملکوں، شہروں اور گاؤں کے عوام کی اسٹڈی کرو۔ شکوہ شکایت کا دور ختم ہوا، احساس کمتری کے لباس کو اتار پھینکو۔ پریشانیوں اور تکلیفوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ کسی کی سفارش اور سہارے کے بغیر اپنی محنت کے بل بوتے پر اپنی شخصیت کی تعمیر کرو۔ ایک خوددار، غیور اور آزاد شہری کی حیثیت سے سمندروں، پہاڑوں اور میدانوں کی فضاؤں میں مانند شاہین مہم جوئی کا اس طرح آغاز کرو کہ "دوست کیا، دشمن بھی جینے کی دعا دینے لگیں"۔ تمہارا یقین ہو تو ایسا ہو:
وطن کی ریت مجھے ایڑیاں رگڑنے دے ✤ مجھے یقین ہے پانی یہیں سے نکلے گا
طلبا عزم بلند شاہین صفت ہو!
برہنہ سر ہے تو عزم بلند پیدا کر ✤ یہاں فقط سر شاہیں کے واسطے ہے کلاہ!!
●●

عبدالعلیم قدوائی

چھوٹی صنعتیں اور مسلمان

ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی و اقتصادی پس ماندگی اور بدحالی پوری ملت کے لیے ایک سنگین اور اہم معاملہ ہے، جس کے دور کرنے کی تدابیر پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک ہماری معاشی حالت مضبوط اور مستحکم نہیں ہوجاتی، ہمارے معاشرہ کی حالت سدھر نہیں سکتی اور نہ ہم اطمینان سے آزادانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ دورِ انگریزی میں ملازمتوں اور زمینداری کے سہارے ہمارا بھرم ایک حد تک بنا رہا۔ مگر آزادی کے بعد زمینداری کا خاتمہ ہوا اور کشش ہوبا اضافہ آبادی نے ملازمتوں کا دائرہ محدود سے محدودتر کر دیا۔ تجارت کے لیے اچھے خاصے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ بہرحال اس مسئلہ کو سلجھانے کی ایک مؤثر ترکیب یہ ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ چھوٹی اور گھریلو صنعتیں قائم کریں اور اپنی کارکردگی سے قومی زندگی میں ایک اہم جگہ بنا لیں۔ اس سلسلے میں بڑی ہمت افزا بات یہ ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں مسلمان کاریگروں کی بہتات ہے جو اپنے اپنے فن میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ صحیح معلومات نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی ان صلاحیتوں سے پورا فائدہ ہی نہیں اٹھا سکتے۔ اور اب بھی ان کی حیثیت معمولی کاریگر اور مزدور کی ہے جبکہ انھیں یہ پورا موقع حاصل ہے کہ وہ اپنی صنعتیں خود قائم کرکے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کر سکتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار فراہم کر سکتے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ چھوٹی اور گھریلو صنعتیں ہندوستان جیسے ملک کے لیے جہاں آبادی بہت بڑی ہے اور زیادہ تر دیہی علاقوں میں رہتی ہے، نہایت موزوں ہیں۔ ان صنعتوں کو ترقی دینے اور پھیلانے کا کام سرکاری سطح پر ۱۹۵۲ء میں شروع کیا گیا اور گزشتہ ۲۵-۲۶ برس کے تجربے نے ظاہر کیا کہ اس پروگرام سے ملک کو بےانتہا فائدہ پہنچا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج ہمارے ملک کی کل صنعتی پیداوار کا ۴۹٪ حصہ ان ہی صنعتوں کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور یہ صنعتیں ملک بھر کے صنعتی مزدوروں کے پچاس فی صد یعنی نصف حصہ کو کام فراہم کر رہی ہیں۔ ہندوستان جو پہلے پسماندہ ملک کہا جاتا تھا، آج ترقی پذیر ملکوں کے سربراہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں کی چھوٹی صنعتیں دنیا میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں اور

ہندوستانی مصنوعات ایشیا، افریقہ اور یورپ کی منڈیوں میں خاصی مقبول ہو چکی ہیں۔ تکنیکی اعتبار سے بھی یہ صنعتیں اب بہت ترقی کر چکی ہیں۔ ہمارے ملک کی صنعتوں کو تین شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) بڑے پیمانہ کی اور بھاری صنعتیں جو سرکاری اور نجی دونوں دائروں میں چل رہی ہیں اور جن کے لیے وافر سرمایہ، بڑی بڑی مشینیں، اعلیٰ تکنیکی صلاحیت، بجلی اور مزدوروں کی بڑی تعداد وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کارخانے نہ ہر جگہ کھولے جا سکتے ہیں اور نہ ہر ایک ان کو قائم کر سکتا ہے۔ پبلک دائرہ میں وہ صنعتیں رکھی گئی ہیں جو اپنی افادیت اور ملک کے دفاع و استحکام کے لیے نہایت ضروری ہوں۔ مثلاً فوجی ساز و سامان بنانے کے کارخانے، ٹیلی فون، فولاد، ریلوے انجن اور ڈبّے، جان بچانے والی دوائیں، کھاد، معیاری مشینیں اور کل پرزے، ڈبل روٹی، سمندری اور ہوائی جہاز بنانے کے کارخانے وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ شکر، کپڑا، انجینرنگ، کیمیکل، بجلی کا سامان، چمڑا اور دیگر صنعتوں کے بڑے کارخانے ملک کے مختلف حصوں میں نجی سرمایہ داروں کے زیر انتظام چل رہے ہیں اِس طرح کی صنعتیں اور کارخانے چلانے کے لیے حکومت ہند کی وزارتِ صنعت سے لائسنس لینا ہوتا ہے اور مختلف قسم کے سرکاری ضوابط اور قواعد کی پابندی کرنی ہوتی ہے۔

(۲) چھوٹے پیمانہ کی اور گھریلو صنعتیں اِس شعبہ میں ایسے تمام کارخانے آجاتے ہیں جن میں مشینوں پر سرمایہ ۲۰ لاکھ روپے سے زیادہ نہ لگا ہو۔ بعض مخصوص حالتوں میں یہ حد ۲۵ لاکھ روپیہ تک ہو سکتی ہے۔ اب یہ شعبہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اس میں مختلف قسم کی چھوٹی صنعتیں مثلاً انجینرنگ کیمیکل، چمڑا، شیشہ، مٹی، لکڑی، بجلی اور گاؤں کی ضرورتوں کو پورا کرنے والی، مثلاً آٹا چکی، دھان صاف کرنے کی چکی، تیل گھانی، بڑھئی گیری، لوہار گیری، کمہاری، وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اِس شعبہ میں کسی بھی کام شروع کرنے کے لیے نہ تو کسی لائسنس کی ضرورت ہے اور نہ لمبے چوڑے ضابطوں کی خانہ پُری کرنی پڑتی ہے۔

(۳) ہتھ کرگھے، بجلی سے چلنے والے کرگھے، دستکاریاں وغیرہ، اس شعبہ میں زیادہ تر پشتینی کاریگر ہیں، جو ملک کے مختلف حصّوں میں آباد ہیں اور عرصۂ دراز سے اپنے پیشوں میں لگے ہوئے ہیں۔

زیر نظر مضمون میں (۲) اور (۳) کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی جا رہی ہے۔ کیوں کہ ان ہی کے ذریعہ زیادہ لوگوں کو روزگار مل سکتا ہے اور ملّت کو اجتماعی اور انفرادی دونوں طریقوں سے نفع پہنچ سکتا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ان صنعتوں کو شروع کرنے کے لیے کسی قسم کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ کوئی کام شروع کرنے سے پہلے حسب ذیل باتوں پر اچھی طرح غور کر لینا چاہیے:

(۱) آپ کون سی صنعت شروع کرنا چاہتے ہیں؟ اس کام کے شروع کرنے میں آپ کو کون کون سی سہولتیں حاصل ہیں اور کس قسم کی دشواریاں۔ یہ صنعت کاری کا سب سے پہلا مرحلہ ہے اور بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی پر آپ کی کامیابی منحصر ہے۔

بنیادی چیز یہ دیکھنا چاہیئے کہ کس چیز میں آپ کو دلچسپی یا تجربہ ہے۔ اس کو بنانے کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے اور آپ اپنے ذرائع سے کہاں تک مہیا کر سکتے ہیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ یہ کام کہاں شروع کرنا چاہتے ہیں۔ اصل چیز آپ کی سہولت ہے۔ مگر ساتھ میں یہ بھی سوچنا ضروری ہے کہ بجلی، خام مال، سرکاری مدد، مصنوعات کے بیچنے میں کہاں سہولت مل سکتی ہے۔ صنعت کا انتخاب واقعی دشوار کام ہے لیکن اس کے لیے اب آپ کو خاص سہولتیں بھی دستیاب ہیں۔ کچھ سرکاری اور نیم سرکاری ادارے اس کام میں آپ کو مدد دے سکتے ہیں مگر بہتر یہی ہوگا کہ آپ کسی سرکاری ادارے سے مدد لیں۔

(۱) ہر ضلع میں ایک ضلع صنعتی مرکز قائم ہے (DISTRICT INDUSTRIES CENTRE) یہ صوبہ کی حکومت کا دفتر ہے اور ہر قسم کی صنعتوں کے قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ آپ وہاں جا کر یا خط کے ذریعہ جنرل منیجر سے بات چیت کر کے اپنی صنعت کا انتخاب کر سکتے ہیں اور ضروری لٹریچر سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔

(۲) اگر آپ کسی صوبہ کے صدر مقام یا دہلی میں رہتے ہیں تو آپ اسمال انڈسٹریز سروسز انسٹی ٹیوٹ حکومتِ ہند کی وزارتِ صنعت کے دفتر سے رجوع کر سکتے ہیں۔ دہلی میں یہ انسٹی ٹیوٹ اوکھلا انڈسٹریل اسٹیٹ میں واقع ہے۔ ان دفتروں کو آپ بھی خط لکھ سکتے ہیں اور ان سے ان صنعتوں کی فہرست حاصل کر سکتے ہیں جن کی ہمت افزائی آج کل حکومت اور مالی اداروں کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ دہلی میں نرمان بھون میں وزارت صنعت کا بڑا دفتر ڈیولپمنٹ کمشنر اسمال انڈسٹریز کا ہے، وہاں سے بھی آپ کو ہر قسم کی ضروری معلومات اور اطلاعات مل سکتی ہیں، خواہ آپ خود تشریف لے جائیں یا ان کو خط لکھ کر دریافت کریں۔

(۳) حکومتِ ہند نے اپنی نئی صنعتی پالیسی کے بموجب ۸۰۷ چیزوں کی فہرست مرتب کی ہے،

جن کو چھوٹے پیمانہ ہی پر شروع کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ان چیزوں کو بنانے کے لیے حکومت کسی بڑے کارخانے یا صنعت کو لائسنس نہیں دے گی۔ اس طرح اگر آپ ان چیزوں میں سے کسی چیز کے تیار کرنے کا کارخانہ لگائیں گے تو آپ کو بڑے کارخانوں سے مقابلہ نہ کرنا پڑے گا۔

اس طرح کی ایک اور فہرست ۲۴۱ اشیاء کی مرتب کی گئی ہے جن کو حکومتِ ہند اور اس کے متعلقہ دفتر چھوٹے صنعت کاروں ہی سے خریدیں گے بشرطیکہ مصنوعات معیاری ہوں۔

یہ دونوں فہرستیں آپ کو صنعت کے انتخاب میں بہت مدد دیں گی۔ اس کے علاوہ ہر ضلع میں صنعتی مرکزوں نے صنعتی جائزہ لے کر ایک فہرست مرتب کی ہے جو اس ضلع کے وسائل، مانگ، اور صلاحیتوں پر مبنی ہیں۔ یہ فہرست آپ کو متعلقہ ضلع مرکز سے مل سکتی ہے اور آپ کو صنعت کے انتخاب میں خاص مدد دے سکتی ہے۔ کیونکہ آپ کو اس سے پتہ چل جائے گا کہ کسی خاص ضلع یا مقام پر کس قسم کا خام مال اور کاریگر دستیاب ہیں، اور وہاں کن چیزوں کی مانگ ہے۔

صنعت کے انتخاب کے ساتھ ساتھ یہ طے کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کو کس جگہ قائم کیا جائے۔ ظاہر ہے اپنی سہولت سب سے مقدم ہوتی ہے۔ مگر ساتھ میں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اس جگہ بجلی اور ذرائع آمد و رفت کی سہولتیں کس حد تک دستیاب ہیں۔ پھر آج کل حکومتِ ہند نے پسماندہ علاقوں کی صنعتی ترقی کے لیے خاص مراعات اور سہولتیں دینے کا اعلان کیا ہے۔ یعنی ان جگہوں پر اگر آپ صنعت قائم کریں گے تو کل سرمایہ کا ۱۵٪ حکومت بطور مدد آپ کو دیگی۔ اس طرح انکم ٹیکس، سیلس ٹیکس میں چھوٹ، آسان قسطوں پر مشینیں اور کم شرح سود پر قرض مہیا کیا جاتا ہے۔ ملک میں ۲۴۷ پسماندہ اضلاع منتخب کئے گئے ہیں۔ کچھ اضلاع کے متعین علاقے پسماندہ قرار دیئے گئے ہیں۔ شمالی مشرقی منطقہ اور پہاڑی علاقوں میں اور زیادہ سہولتیں دی گئی ہیں۔

اپنے فیصلہ سے قبل ان مراعات اور سہولتوں پر بھی نظر ڈال لینا چاہیئے۔ یہ چھوٹے کارخانے افراد، ساجھے داری کی فرمیں، کوآپریٹو سوسائٹی، پرائیویٹ لمیٹیڈ کمپنیوں کے زیر اہتمام کھولے جا سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے فلاحی ادارے اور تعلیمی و تہذیبی مراکز مثلاً مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ وغیرہ اس سلسلہ میں رہنمائی اور ابتدائی امداد کے فرائض آسانی سے انجام دے سکتے ہیں۔ صنعتوں کو فروغ دینے اور پھیلانے کی اصل ضرورت تعلیم یافتہ نوجوانوں، کاریگروں، دستکاروں اور تجارت پیشہ لوگوں میں

ہے۔ اس سلسلہ میں مسلم یونیورسٹی اہم کردار حسب ذیل طریقوں سے ادا کر سکتی ہے :

۱۔ یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک صنعتی معلوماتی مرکز قائم کیا جائے جو چھوٹی صنعتوں کے بارے میں ضروری لٹریچر اور معلومات فراہم کرے جس سے نئے صنعت کار اور پہلے سے صنعتیں لگائے ہوئے افراد مستفید ہو سکیں۔ یہ مرکز چھوٹے چھوٹے کتابچے اور رسالے شائع کر کے بڑی اچھی خدمت انجام دے سکتا ہے۔

۲۔ یونیورسٹی کے M.B.A کورس میں ایک پرچہ چھوٹی صنعتوں کو فروغ دینے اور صنعت کاری کی فضا قائم کرنے کے متعلق رکھا جائے تاکہ طلبا کو اس ضمن میں عملی معلومات ہو سکیں اور کورس پورا کرنے کے بعد وہ صنعت کے میدان میں داخل ہو سکیں۔

۳۔ مرکزی نیز صوبائی حکومت کے اشتراک سے یونیورسٹی ایک انڈسٹریل اسٹیٹ یونیورسٹی کیمپس میں قائم کرے، جہاں خواہش مند طلبا تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنی اپنی صنعتیں لگا سکیں۔ یونیورسٹی انجینئرنگ کالج کی ورکشاپ اس سلسلہ میں بڑی کارآمد ہو سکتی ہے۔

●●

احمد رشید شیروانی

علیگ بھائیوں سے پھر التجا

مسلم یونیورسٹی کورٹ میں پورے ۲۵ نمایندے مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو منتخب کرتے ہیں۔ نئے ایکٹ کے تحت کورٹ کی پہلی میٹنگ طلب کرلی گئی۔ لیکن ابھی تک اولڈ بوائز ایسوسی ایشن اپنے نمائندے نہیں چن سکی۔ کیوں نہیں چن سکی؟ پوچھیے ایسوسی ایشن کے ذمّہ داروں سے۔

اور ذمّہ داران سے کون پوچھے؟ حالت یہ ہے کہ سارے ملک میں کم و بیش ایک لاکھ اولڈ بوائز (یعنی علیگ بھائیوں) میں سے صرف ایک ہزار کے قریب اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر ہیں۔ اس ایسوسی ایشن کے ذمّہ داروں کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ دہلی کے دسیوں پھیرے لگائیں۔ وفود لے کر ارکان حکومت کے دروازوں پر دستک دیں کہ اقلیتی کردار بحال کیجیے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کو اتنی فرصت نہ تھی کہ اس ایسوسی ایشن کی ممبر سازی کرکے اسے درحقیقت علیگ بھائیوں کی نمایندہ تنظیم بنائیں اور اس سے بہترین ۲۵ علیگ نمایندے چن کر مسلم یونیورسٹی کورٹ میں بھیجیں۔

صرف ایسوسی ایشن کے ذمّہ داران کو الزام دینے سے کیا حاصل؟ سوال یہ ہے کہ اس وقت ایک لاکھ علیگ بھائیوں میں سے صرف ایک ہزار ایسوسی ایشن کے ممبر کیوں ہیں؟ باقی ۹۹ ہزار علیگ بھائیوں کو یہ توفیق کیوں نہ ہوئی کہ وہ اس ایسوسی ایشن کے ممبر بنیں؟ مسلم یونیورسٹی پر تنقید سب کریں گے، مسلم یونیورسٹی میں یہ سب کیوں ہوتا ہے، اور جناب مسلم یونیورسٹی میں وہ کیوں نہیں ہوتا، اور صاحب، مسلم یونیورسٹی میں ہرگز یہ نہ ہونا چاہیے! اور قبلہ مسلم یونیورسٹی میں وہ ضرور بالضرور ہونا چاہیے۔ اجی کسی علیگ بھائی کو دیکھیے ہر مسئلہ پر اپنی رائے عالی سے سرفراز فرمائیں گے۔ لیکن مسلم یونیورسٹی کے تئیں ان کا جو پہلا فرض ہے یعنی سارے ہندوستان کے علیگ بھائیوں میں سے ۲۵ سب سے اچھے، سب سے مفید اور کارگر علیگ بھائیوں کو منتخب کرکے مسلم یونیورسٹی کورٹ میں بھیجیں۔ بس اس فرض کی ادائیگی کی طرف ۹۹ ہزار (۹۹ فی صد) علیگ بھائیوں کی کوئی توجہ نہیں۔ یعنی یہ حضرات مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر ہی نہیں ہیں۔

کیوں نہیں؟ فرماتے ہیں "ارے ہمیں کسی نے ممبر بنایا ہی نہیں" کمال ہے۔ یعنی ۹۹ فی صد علیگ بھائی یہ توقع کرتے ہیں کہ کوئی ان کے دولت کدہ پہ فارم لے کر آئے۔ ان سے بھروائے، ان سے ۱۲ روپے لے کر، جاکر فارم اور ۱۲ روپے ایسوسی ایشن کے دفتر میں داخل کرے اور ان کو ممبر بنوائے۔ کس کو فرصت ہے؟ کون فالتو ہے؟

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ علیگ بھائی خود تعلیم یافتہ ہیں، کامیاب ہیں، اہم ہیں، صاحبِ حیثیت ہیں۔ ان میں سے ۹۹ فی صد اتنے بے حس اور لاپرواہ کیوں ہیں کہ وہ ابھی تک مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر بھی نہیں بنے؟

پھر جب ایسوسی ایشن کے ۲۵ نمائندے منتخب ہوں گے تو کہا جائے گا: ارے یہ تو نالائق ہے بالکل نکھٹو ہے، یہ ایک دم ناکارہ ہے، یہ جیسا ہے، یہ ایسا ہے، یہ ویسا ہے۔ ظاہر ہے جب نناوے فی صد علیگ بھائی لاتعلق و اعتنا ہیں کہ وہ اس ایسوسی ایشن کے ممبر ہی نہیں بنے تو پھر ملک بھر کے سب علیگ بھائیوں میں سے بہترین منتخب ہو کر مسلم یونیورسٹی کورٹ میں کیسے پہنچ جائیں گے؟

علیگ بھائیوں کو مسلمانانِ ہند کی کریم کہنا غلط نہیں۔ لیکن جب "کریم" میں ۹۹ فی صد خود الگ ہو کر بیٹھ جائیں گے تو وہ از خود مسلم یونیورسٹی کو مسلمانانِ ہند کی کریم کے بہترین ٹیلنٹ کے ۹۹ فی صد سے محروم کر دیں گے۔ اور مجبوراً صرف ایک فی صد علیگ بھائیوں میں سے ۲۵ نمائندوں کا انتخاب ہوگا۔ پھر ترقی پسند علیگ بھائی بیٹھ کر چیخیں گے کہ ارے مسلم یونیورسٹی پر رجعت پرستوں کا قبضہ ہو گیا۔ بھلے آدمیو! جب تم ترقی پسند نیک معاش ایسوسی ایشن کے ممبر ہی نہیں ہو گے تو رجعت پرست بدمعاشوں کا قبضہ کیسے نہ ہوگا؟ اور "اسلام پسند" علیگ بھائی بیٹھ کر روئیں گے کہ ارے مسلم یونیورسٹی پر کفر پسند شیطان غالب آ گئے۔ نیک بختو! جب تم اسلام پسند فرشتے ایسوسی ایشن کے ممبر ہی نہیں ہو گے تو پھر کفر پسند شیطان غالب کیسے نہ آئیں گے؟ مدراسی علیگ بھائی چلّائیں گے کہ سب یو پی والے بھر گئے۔ جب آپ مدراس والے ممبر ہی نہیں بنیں گے تو اور کیا ہوگا؟

چنانچہ دست بستہ التماس سب علیگ بھائیوں سے ہے کہ خدا کے واسطے جلد از جلد مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر بنیں۔ اگر ایک لاکھ علیگ بھائی ممبر بن جائیں اور ان میں ۲۵ بہترین نمائندے مسلم یونیورسٹی کورٹ میں پہنچ جائیں تو یہ ۲۵ ایسے ہوں گے کہ دنیا دیکھ کے دنگ رہ جائے گی۔ علیگ بھائیوں میں ایک سے ایک لائق و فائق، ایک سے ایک زوردار، ایک سے ایک دھاکڑ موجود ہے۔ علیگ بھائی نہ صرف فخر

مسلمانانِ ہند بلکہ فخر مسلمانانِ عالم ہیں۔ ہر ایک علیگ بھائی اپنی مسلم یونیورسٹی، اپنی مادرِ درسگاہ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ کسی اور یونیورسٹی کا اولڈ بوائے اس کی آدھی چوتھائی ایک بٹا دس بھی اپنی یونیورسٹی سے نہیں کرسکتا۔ ہر ایک علیگ مسلم یونیورسٹی پر جان چھڑکتا ہے، تو کیا بارہ روپے دیکر اپنی مسلم یونیورسٹی کا اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا ممبر بننا مشکل ہے۔

صرف ممبر بننا ہی کافی نہیں۔ میں تو کہوں گا کہ ہر جگہ علیگ بھائی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی "شاخ" قائم کریں۔ ہر جگہ کے علیگ بھائی اپنے علاقے سے چند ہونہار مسلم طلباء کو وظائف دیکر مسلم یونیورسٹی میں پڑھنے بھیجیں تاکہ مسلم یونیورسٹی میں ملک کے ہر حصے سے لائق اور ہونہار ترین مسلم طلبا آکر داخل ہوں جو مسلم یونیورسٹی میں چار چاند لگائیں۔

ہر علاقے، ہر صوبے، ہر شہر کے علیگ بھائی مسلم یونیورسٹی کے ساتھ رابطہ قائم رکھیں۔ اس کے حالات میں دلچسپی لیں۔ مسلم یونیورسٹی کے لیے جو کچھ کرسکتے ہیں، کریں۔ لیکن یہ سب کرنے سے پہلے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر تو بنیں۔ میں ہر ایک علیگ بھائی سے عرض کروں گا کہ کوئی نہیں آئے گا، آپکے پاس فارم لے کر آپ سے بھروانے۔ اگر آپ کو دلچسپی ہے تو آپ خود خط لکھ کر فارم منگا لیجئے، اسے بھر کر بھیجیے، اور منی آرڈر سے اپنا چندہ بھیج کر رسید حاصل کیجئے۔

میں پہلے بھی التجا کرچکا ہوں اور اب پھر کرتا ہوں کہ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار محفوظ رکھنے سے زیادہ اہم ہے کہ اس کا "عقلیتی کردار" بھی محفوظ رہے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ملک کے تمام ذی ہوش، باشعور، ذہین اور لائق مسلمان مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں تعمیری اور مثبت دلچسپی لیں اور ظاہر ہے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ سب علیگ بھائی مسلم یونیورسٹی میں دلچسپی لیں اور یہ دلچسپی صرف علی گڑھ کے قصے اور لطیفے سنانے اور علی گڑھ کے دنوں کے بارے میں گپیں لڑانے تک محدود نہ رہے، بلکہ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر بن کر مسلم یونیورسٹی کے معاملات پر اچھا اثر ڈالیں۔ ●●

بدرالدّین طیب جی

سر سیّد علی گڑھ اور میں

۱۸ برس پہلے کی بات ہے کہ میں نے اس یونیورسٹی میں وائس چانسلر کی حیثیت سے قدم رکھا۔ اس وقت تک میں علیگڑھ کے ماحول سے اجنبیت محسوس کرتا تھا۔ یونیورسٹی عمارات پر جابجا سر سید کی تصویریں آویزاں تھیں۔ میں جہاں جاتا محسوس ہوتا کہ سر سید کی پُر وقار اور مرعوب کن شخصیت ایک خاص بلندی سے مجھ پر نظریں جمائے ہوئے ہے، لیکن اجنبیت کا احساس زائل نہ ہو سکا۔

ایسا نہیں کہ سر سید میرے لئے بالکل اجنبی تھے۔ میں ان کے بارے میں تھوڑا بہت ضرور جانتا تھا۔ لیکن جو کچھ جانتا تھا اس سے میرے ذہن میں کسی عظیم شخصیت کی تصویر نہیں اُبھرتی تھی۔ غالباً اس کا کبھی کو علم ہوگا کہ سر سید کی طرح میرے دادا بھی ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور ان کی ترقی کے خواہاں تھے۔ لیکن دونوں کے سوچنے کا انداز مختلف تھا۔ ایک نے بمبئی میں انجمنِ اسلام قائم کی اور دوسرے نے علیگڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج۔

بہر حال قسمت کو یہ منظور تھا کہ سر سید کے قایم کیے ہوئے اس عظیم الشان ادارے کا بوجھ ایک دن میرے کندھوں پر رکھا جائے۔ اب یہ ضروری معلوم ہوا کہ میں سر سید کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کروں اور ان کے سلسلے میں جو لٹریچر دستیاب ہو، اس کا گہری نظر سے مطالعہ کروں۔ میں ان کے بارے میں جتنا زیادہ پڑھتا گیا، اتنا ہی زیادہ ان کا مدّاح اور ان کی فہم و فراست کا قائل ہوتا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جن مذہبی معتقدات کے سبب وہ ساری زندگی ہدفِ ملامت بنے رہے، مجھے انہی نے زیادہ متأثر کیا۔

سر سید کی فکر کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا تو خیر کسی طرح ممکن نہیں اور نہ میں ان کے افکار پر کوئی طویل مضمون لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہاں موقع کی مناسبت سے ان کی صرف ایک رائے اور ان کی شخصیت کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں اور یہ ہے مخالف رائے دینے کا انداز، اختلاف کرنے کا طریقہ اور مخالفوں کو جواب دینے کا ڈھنگ۔

اس سے کون واقف نہیں کہ سر سید اختلافِ رائے کو علم کے فروغ کا ذریعہ بتاتے تھے لیکن اختلاف

کے بھی آداب ہوتے ہیں۔ اور اس موضوع پر سر سید نے تفصیل سے لکھا ہے۔ مخالفتوں سے سر سید کو ساری زندگی واسطہ رہا، لیکن انھوں نے کبھی شائستگی کا دامن نہ چھوڑا۔ میرے دادا بدرالدین طیب جی سے انھیں سخت اختلاف تھا اور انھوں نے شدت سے مخالفت کی، لیکن متانت کے ساتھ۔ یہی رویہ میرے دادا نے اختیار کیا۔ انھوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو چندہ بھی دیا اور سر سید کی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی حمایت بھی کی مختصر یہ کہ دونوں کا انداز پُر وقار رہا۔ ان کے باہمی اختلافات سے بھی ایک شان ٹپکتی تھی۔

علیگڑھ میں اختلاف کل بھی تھے اور آج بھی ہیں، ہمیشہ رہیں گے اور رہنے چاہئیں۔ لیکن کیا میرا یہ خیال درست نہیں کہ کل سر سید اور بدرالدین طیب جی کے درمیان جن مسائل پر اختلافات تھے، ان کی اہمیت آج کے مسائل سے کہیں زیادہ تھی۔ ان کے سامنے ایسے مسائل تھے جن کی بنیاد پر آگے چل کر قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ آج ہم جن مسائل پر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں وہ اکثر کم اہم، بعض اوقات غیر اہم اور کبھی کبھی تو بالکل نجی اور معمولی ہوتے ہیں۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ کیا ہم باہمی اختلافات کے معاملے میں سر سید کی زندگی اور ان کے خیالات سے رہنمائی حاصل نہیں کر سکتے۔

یہ سب میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ میرے دل میں علیگڑھ کا درد ہے۔ کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ کاش میں علیگڑھ نہ گیا ہوتا۔ کاش یہ ممکن ہوتا کہ وہاں جو ہو رہا ہے اس پر ملامت کر کے میں چُپ ہو جاؤں۔ لیکن یہ میرے بس کی بات نہیں۔ یہ میں کر نہیں سکتا۔ یوں کہ علیگڑھ میری رگ رگ میں اُتر گیا ہے۔ مجھے اس سے جو دلی تعلق ہے اسے کسی مصلحت پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ علیگڑھ کبھی میرے دل سے محو نہیں ہو سکتا۔ وہاں کی سڑکیں، وہاں کے سبزہ زار، وہاں کے حسین درخت، عالیشان کتب خانے، وہاں کے گھوڑے اور شکار کی پارٹیاں بھلائی جا سکنے والی چیزیں نہیں ہیں۔

ہم اس پر فخر کرتے ہیں کہ علیگڑھ یونیورسٹی ایک مسلم یونیورسٹی ہے۔ آج ملک میں ایک ایسی یونیورسٹی کی ضرورت اس دن سے بھی زیادہ ہے جب سر سید نے محمڈن کالج کی بنیاد ڈالی تھی۔ ہندوستانی مسلمان تعلیم کے میدان میں اپنے دوسرے ہموطنوں سے آج بھی اتنے ہی پیچھے ہیں، جتنے سر سید کے زمانے میں تھے۔ زمینداری اور جاگیرداری کبھی کی ختم ہو چکیں۔ ان کے خاتمے سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت اور بھی خراب و خستہ ہو گئی۔ چنانچہ اب مسلم یونیورسٹی کو مالی امداد کے لئے حکومت کی طرف دیکھنا پڑتا ہے (ممکن ہے سر سید اسے بے غیرتی خیال کرتے) لیکن ذاتی طور پر مجھے اس تبدیلی حال کا ذرا بھی ملال نہیں۔ حکومت جیسے ادارے سے امداد قبول کرنے میں ہمیں کیوں تامل ہو۔ کیا حکومت ہمارے تعاون سے نہیں چلتی اور اس میں مالی تعاون بھی شامل نہیں؟ یہی امداد افراد سے حاصل ہو تو

ہم انھیں اس امداد کے عوض کیا دیں۔ شکر گزاری کے چند الفاظ، چھوٹی خوشامد اور عمارتوں پر ان کے ناموں کی تختیاں لگا کر ان کی فیاضی کا اعتراف ؟

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ صرف مسلم یونیورسٹی نام رکھ دینے سے کام پورا نہیں ہوتا۔ اسے صحیح معنی میں مسلم یونیورسٹی ہونا چاہیئے اور یہ کہ نہ اسے صرف مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتیں پوری کرنی چاہئیں۔ بلکہ زندگی کے چند شعبوں میں مسلمانوں کی رہبری کرنی چاہیئے۔ ان کے تمام مسائل پر غور یہیں ہوگا۔ ان کا حل یہیں سے نکلے گا۔ اسے وہ تدابیر کرنی ہوں گی جن سے مسلمان تعلیم، سیاست، اقتصادیات جملہ شعبوں میں آگے بڑھیں اور سربلند ہو کر جئیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک اہم تعلیمی امانت ہے۔ ایک عظیم ادارہ ہے اور ہماری قوم کی تہذیبی امانت ہے۔ علیگڑھ صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے جب وہ ایسا ہو کہ ہم سب اس پر فخر کر سکیں ہمیں غیر ضروری کاموں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ان عظیم مقاصد کو اپنانا ہوگا، جو سر سید اور ان کے ساتھیوں کے پیش نظر تھے۔

●●

ڈاکٹر محمد شریف خاں

اقلیت کے ثقافتی اور تعلیمی حقوق کی حقیقت

ہمارے ملک کا دستور جب تیار ہو رہا تھا، تو دستور ساز اسمبلی کی ایک مشاورتی کمیٹی نے ۲۷ جولائی ۱۹۴۷ء کو مندرجہ ذیل سفارشات کیں۔

۱۔ اقلیتوں کے لئے پارلیمنٹ اور اسمبلی میں آبادی کی بنیاد پر نمائندگی کے اصول کو منظور کیا جائے۔

۲۔ اقلیتوں کو آبادی کی بنیاد پر سرکاری نوکریوں میں نشستیں دی جائیں۔

۳۔ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے خصوصی افسران کا تقرر کیا جائے۔

مشاورتی کمیٹی کی ان سفارشات سے اقلیتوں کو بہت تسلی ہوئی اور ان کو یہ اطمینان ہوا کہ دوران جنگ آزادی ملکی سیاست میں جو فرقہ پرستی کا عنصر شامل ہو گیا تھا، وہ اب ختم ہو جائے گا۔

ان سفارشات کو دستور ساز اسمبلی نے اگست ۱۹۴۷ء میں بغیر کسی ترمیم و تنسیخ منظور کر لیا۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں دستور ہند کا جو مسودہ تیار ہوا، اس میں مذکورہ بالا سفارشات کو دفعات کی شکل میں شامل کر لیا گیا۔ فروری ۱۹۴۸ء میں دستور کی ڈرافٹنگ کمیٹی نے اقلیتوں سے متعلق ان دس دفعات کو دستور کے باب چودہ میں "اقلیتوں سے متعلق خصوصی انتظامات" کی سرخی کے تحت دفعات ۲۹۲، لغایت ۳۰۱ کے نمبر پر تحریر کیا۔ فروری ۱۹۴۸ء میں دستور ساز اسمبلی کی مشاورتی کمیٹی نے سکھوں کے لئے بھی ان جگہوں کے تحفظ کی سفارش کی۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں کچھ ممبران نے یہ تجاویز رکھنی چاہیں کہ اقلیت کو دیے جانے والے تحفظ کو ختم کیا جائے، مگر اس پر غور کرنا ملتوی کر دیا گیا۔

۱۱ مئی ۱۹۴۹ء کو مشاورتی کمیٹی کے اجلاس میں بہت سے ممبران نے تقسیم ہند کے بعد مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کی دفعات کو ختم کرنے کی تجویز رکھی اور ۲۵ مئی ۱۹۴۹ء کے دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں سردار پٹیل نے اس تجویز کی زبردست حمایت کی، تو مذہبی بنیاد پر اقلیت کو دیے گئے تحفظ کو ختم کر دیا گیا۔ اگرچہ یہ دستور کے مسودہ میں شامل ہو چکا تھا۔

ان تحفظ کی دفعات کو نکال دینے کے بعد یہ ضروری سمجھا گیا کہ ان کی جگہ اقلیتوں کو ثقافتی اور تعلیمی حقوق دیے جائیں، تو دستورِ ہند کی دفعات ۲۹ اور ۳۰ کے تحت مندرجہ ذیل الفاظ میں ان کو مرتب کیا گیا۔

" دفعہ ۲۹ (۱) بھارت کے علاقہ میں یا اس کے کسی حصہ میں رہنے والے شہریوں کے کسی طبقہ کو جس کی اپنی الگ جداگانہ زبان، رسم الخط یا ثقافت ہو، اس کو محفوظ رکھنے کا حق ہوگا۔

(۲) کسی شہری کو ایسے تعلیمی ادارے میں جس کو مملکت چلاتی ہو، یا جس کو مملکتی فنڈ سے امداد ملتی ہو، داخلہ دینے سے محض مذہب، نسل، ذات، زبان یا ان میں سے کسی کی بنا پر انکار نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ ۳۰۔ (۱) تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہب کی بنا پر ہوں، یا زبان کی اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کے انتظام کرنے کا حق ہوگا۔

(۲) مملکت تعلیمی اداروں کو امداد عطا کرنے میں کسی تعلیمی ادارے کے خلاف اس بنا پر امتیاز نہ برتے گی کہ وہ کسی اقلیت کے زیرِ انتظام ہے۔ خواہ وہ اقلیت مذہب کی بنا پر ہو، یا زبان کی۔

اس مضمون کا مقصد یہ جائزہ لینا ہے کہ دفعات ۲۹ اور ۳۰ اقلیتوں کے لئے کہاں تک مفید ثابت ہوئی ہیں اور وہ مقصد حاصل کر سکی ہیں جن کے لئے ان کو دستور میں سیاسی حقوق کا نعم البدل سمجھ کر رکھا گیا تھا؟ دستور کے نفاذ سے لے کر اب تک جو قانونی پیچیدگیاں اور دشواریاں اقلیت کے سامنے ان دفعات کی وجہ سے آئیں، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) اقلیت میں کس کو شامل کیا جائے گا؟ دستورِ ہند اس کی وضاحت نہیں کرتا۔ سپریم کورٹ کے ایک مشورہ کے مطابق اس فرقہ کو اقلیت مانا جائے جس کی آبادی، کل آبادی کا ۵۰ فیصد سے کم ہو۔ مگر کل آبادی کس کی شمار کی جائے، ملک کی، ریاست کی، کمشنری کی، ضلع کی، یا دیہات کی؟

اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ ۵۰ فی صد اتنے حصہ کی آبادی کا شمار کیا جائے جتنے حصے پر ان دفعات کی سہولت فراہم کرنا ہے، تو کیا ممکن نہیں ہے کہ اتنے حصہ میں کسی بھی ایک زبان یا مذہب کے لوگ ۵۰ فی صد سے زائد نہ ہوں، تو کیا اس حصہ میں تمام مذاہب اور زبان والوں کو اقلیت قرار دیا جائے گا؟ اگر ۵۰ فی صد کی حد ریاست کی آبادی کو تسلیم کیا جائے، تو کشمیر میں مسلمانوں، ناگالینڈ میں عیسائیوں اور پنجاب میں سکھوں کو وہ ثقافتی اور تعلیمی حقوق حاصل نہ ہوں گے جو ان کے ہم مذہبوں کو دیگر ریاستوں میں حاصل ہوں گے۔ کیونکہ ان ریاستوں میں ان کی ۵۰ فیصد سے زاید آبادی ہے۔ کیا یہ مضحکہ خیز بات نہیں ہوگی؟ اس کے علاوہ کوئی اقلیت مختلف ریاستوں میں اپنے

تعلیمی ادارے قائم کرنا چاہے، تو کچھ ریاستوں میں تو اداروں کو دفعہ ۳۰ کا تحفظ حاصل ہوگا اور کچھ ریاستوں میں وہ اس سے محروم ہوگی؟

مذہبی اقلیت میں کن مذاہب کو شامل کیا جائے، ہمارے دستور نے اس کی بھی وضاحت نہیں کی ہے۔

(۲) لسانی اقلیت میں کن لوگوں کو شامل کیا جائے؟ کیا پنجاب میں آریہ سماجی اس لئے لسانی اقلیت تصور کیے جائیں کیونکہ ان کا رسم الخط دیوناگری ہے، جب کہ وہاں کی اکثریت سکھوں کا رسم الخط گورمکھی ہے کیا یو۔پی کے لوگ بنگال میں لسانی اقلیت تصور کیے جائیں گے؟

(۳) کسی تعلیمی ادارے کو اقلیتی تعلیمی ادارہ تسلیم کرنے سے قبل کیا ثبوت طلب کرنے چاہئیں۔ کیا صرف اس کا دعوٰی ہی کافی ہے؟ کیا دعوٰی کے ساتھ حلفیہ بیان بھی طلب کیا جائے؟ کیا ادارہ کی تاریخ سابقہ دیکھ کر بھی اقلیتی ادارہ تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

(۴) کیا دفعات ۲۹ اور ۳۰ کے تحفظ سے کسی تعلیمی ادارے کو اس لئے محروم کیا جا سکتا ہے کیونکہ ابتدائی درخواست تمام شہریوں کی تعلیم کے لئے تھی، نہ کہ صرف اقلیت کی تعلیم کے لئے یا ادارہ کا نام کسی فرد کے نام پر تھا، نہ کہ اقلیت کے نام یا ادارہ کی مجلس منتظمہ میں غیر اقلیتی فرقہ کے لوگ بھی شامل ہیں یا ماضی میں رہے ہیں؟

(۵) دفعات ۲۹ اور ۳۰ ثقافتی اور تعلیمی حقوق کے تحفظ کے لئے ہیں۔ دفعہ ۲۹ کو "اقلیتوں کے مفادات کا تحفظ" کی سرخی کے تحت رکھا گیا ہے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ پوری دفعہ ۲۹ میں اقلیت کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اس دفعہ کے پہلے حصہ میں "شہریوں کے کسی طبقہ" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جو کسی صورت میں اقلیت تک محدود نہیں کیے جا سکتے۔ اس دفعہ کے دوسرے حصہ میں تو "شہری" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اقلیت کا استعمال ہی نہیں کیا گیا۔ اس لئے دفعہ ۲۹ کے تحت زبان، رسم الخط اور ثقافت کا تحفظ اقلیتوں تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ شہری کے لئے ہے جو اس روح کے منافی ہے۔ جس کی بنیاد پر دفعات ۲۹ اور ۳۰ دستور ہند میں شامل کی گئی تھیں۔

(۶) دفعہ ۳۰ کے تحت اقلیتوں کو اپنی پسند کے ادارے قائم کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ مگر ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیاں کسی کالج کا الحاق کرنے سے قبل شرائط لگاتی ہیں۔ ان سے اقلیتی کالجوں کو مستثنیٰ رکھا جاتا ہے اور اگر اقلیتی تعلیمی اداروں کو بھی ان تمام شرائط کو پورا کرنا ضروری ہے

اکثریتی تعلیمی اداروں کو پوری کرنی پڑتی ہیں، تو پھر دفعہ ۳۰ کے تحت اقلیتی حقوق کی کیا خصوصیت رہ جاتی ہے؟ کیا کوئی عدالت کسی یونیورسٹی کو یہ مجبور کر سکتی ہے کہ کسی اقلیتی ادارہ کا الحاق دفعہ ۳۰ کے تحت کرے؟ اور اگر عدالت ایسا کرنے کی مجاز نہیں ہے تو پھر اقلیت کا تحفظ بے معنی ہو جاتا ہے۔

کیا کوئی اقلیت اپنی یونیورسٹی دفعہ ۳۰ کے تحت قائم کرنا چاہے، تو بغیر اسمبلی یا پارلیمنٹ کی منظوری کر سکتی ہے؟ اور اگر اسمبلی یا پارلیمنٹ اس کو منظوری دیدے، تو وہ یونیورسٹی اقلیتی ادارے کی فہرست سے اس لئے خارج ہو جائے کیونکہ اس کا قیام پارلیامنٹ یا اسمبلی کی منظوری سے ہوا ہے؟ تو پھر اقلیت کون سی صورت رہ جاتی ہے جس کے ذریعہ وہ دفعہ ۳۰ کے تحفظ کے تحت اعلیٰ تعلیم کے لئے کوئی کالج یا کوئی یونیورسٹی قائم کر سکے؟ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے ایکٹ میں جو آخری ترمیم ہوئی ہے اس کے تحت بھی یونیورسٹی کو دفعہ ۳۰ کے تحت اقلیتی تعلیمی ادارہ کا تحفظ حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ پورے ایکٹ میں کسی جگہ بھی دفعہ ۳۰ کا ذکر نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ترمیمی بل کے ساتھ جو اغراض و مقاصد پارلیمنٹ کے سامنے تحریری شکل میں لائے گئے، ان میں بھی دفعہ ۳۰ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

(۷) بھارت کی تمام یونیورسیٹیوں اور کالجوں نے ذریعہ تعلیم کچھ زبانوں تک محدود کر رکھا ہے ایسی صورت میں اقلیتیں دفعہ ۳۰ کے تحت اپنی زبان کو ذریعہ تعلیم کس طرح بنا سکتی ہیں؟ مثال کے لئے یوپی کی کوئی ریاستی یونیورسٹی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کے کسی کالج میں اردو ذریعہ تعلیم ہو۔ اسی طرح کوئی بھی ریاستی یونیورسٹی اردو میں پرچہ کے جوابات لکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ پھر دفعہ ۳۰ کے تحفظ کا اقلیت کو کیا فائدہ ہے؟

تو پھر کیا ایسے حالات میں یہ سوچنے پر مجبور ہوجائے کہ دفعہ ۳۰ صرف پرائمری اور ثانوی تعلیم کے اداروں کے تحفظ کی ذمہ داری لیتی ہے اور اعلیٰ تعلیم کے لئے ایسا کوئی تحفظ عطا نہیں کرتی؟

(۸) اگر ثانوی درجات پر بھی اس کا جائزہ لیا جائے، تو یوپی بورڈ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کا تسلیم شدہ کوئی تعلیمی ادارہ اردو ذریعۂ تعلیم اختیار کرے! تو کیا اس کو دفعہ ۳۰ کی خلاف ورزی نہیں مانا جائے گا؟

(۹) دفعہ ۳۰ کے تحت اقلیت کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کو انتظام کرنے کا حق ہے۔ کیا وہ ادارہ اپنی اقلیت کے طلباء کے داخلہ کے لئے کچھ نشستیں محفوظ کر سکتا ہے؟

یا اکثریت اور دیگر اقلیتوں کے طلبا کا داخلہ بند کر سکتا ہے؟ اگر وہ ایسا کر سکتا ہے، تو کیا وہ دفعہ دستور ہند کی دفعہ ۱۵ کی خلاف ورزی تصور نہیں کی جائے گی؟ اور اگر ایسا ہے تو پھر دفعہ ۳۰ کے تحت اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے کے تحفظ کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ یاد رہے کہ دفعہ ۱۵ میں درج ہے: ”مملکت محض ذات، جنس، یا مقام یا پیدائش یا ان میں سے کسی کی بنا پر کسی شہری کے خلاف امتیاز نہیں برتے گی۔“

(۱۰) کسی بھی ادارے کو چلانے کے لئے ایک مجلس منتظمہ ہوتی ہے۔ کیا کسی اقلیتی تعلیمی ادارے پر یہ شرط لگائی جاسکتی ہے کہ اس کو منظوری اسی وقت دیجائے گی جب وہ بورڈ یا یونیورسٹی کے نامزد ممبران کو، یا پرنسپل کو یا اساتذہ کے نمایندوں کو، یا ان میں سے ایک سے زیادہ کو اپنی مجلس منتظمہ میں شامل کرےگا اور کوئی بورڈ یا یونیورسٹی ایسی شرط لگاتی ہے تو وہ دفعہ ۳۰ کی خلاف ورزی ہے یا نہیں؟ اگر وہ ادارہ ان شرائط کو اس لئے مان لیتا ہے، تاکہ اس کو منظوری حاصل ہو جائے، تو کیا یہ شرائط اس تعلیمی ادارہ کو اس بات کے لئے مجبور نہ کریں گی کہ وہ اپنے اسٹاف پر صرف اقلیت کے لوگوں کا ہی تقرر کرے تاکہ پرنسپل ہو کر یا اساتذہ کا نمایندہ ہو کر غیر اقلیتی فرقہ کا شخص مجلس منتظمہ میں شامل نہ ہو جائے؟ کیا اس مجبوری کا یہ خراب نتیجہ نہ ہوگا کہ وہ اقلیتی تعلیمی ادارہ اچھے غیر اقلیتی اساتذہ کے استفادے سے محروم ہو جائے گا؟

(۱۱) کیا کوئی یونیورسٹی ایسا قانون بنا سکتی ہے کہ اس کی منظوری کے بغیر کسی ملحق کالج میں کسی اسٹاف ممبر کی تقرری نہیں ہو سکتی؟ اور کیا ایسی کوئی پابندی دفعہ ۳۰ کے تحت اقلیتی تعلیمی ادارہ اپنی پسند سے چلانے میں دخل انداز نہیں ہوگی؟ کیا یونیورسٹی اساتذہ کی تعلیمی لیاقت، تجربہ اور عمر وغیرہ کے سلسلہ میں ایسا قانون بنا سکتی ہے، جو اقلیتی تعلیمی اداروں اور غیر اقلیتی تعلیمی اداروں پر یکساں طریقہ سے نافذ ہوں؟ اگر ایسا ہے تو دفعہ ۳۰ کیا تحفظ عطا کرتی ہے؟

ان تمام قانونی پیچیدگیوں اور دشواریوں کے پس منظر میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دفعہ ۲۹ اور دفعہ ۳۰ جو سیاسی حقوق کے محروم ہونے کے معاوضہ کے طور پر دستور ہند میں رکھی گئی تھیں وہ کم اثر ثابت ہوئیں اور دستور ساز اسمبلی کے ممبران کی خواہشات کو پورا کرنے میں ناکام رہیں۔

●●

اصغر عباس۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں:
ہندوستانی مسلمان: ان کی تعلیم اور روزگار کے مسائل
پر دو روزہ سیمنار۔ (ایک رپورٹ)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک دو روزہ سیمنار ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل ان کی تعلیم اور روزگار کے موضوع پر ہوا۔ یہ سیمنار، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بزنس اینڈ امپلائمنٹ بیورو نئی دہلی کے تعاون سے منعقد کیا۔

اس سیمنار میں پروفیسر اخلاق الرحمٰن قدوائی، گورنر بہار، مرکزی وزیر سیاحت جناب خورشید عالم خاں اور اقلیتی کمیشن کے چیرمین جسٹس محمد حمید اللہ بیگ، جناب این۔ سی۔ سکسینہ جوائنٹ سکریٹری اقلیتی کمیشن اور جناب حکیم عبد الحمید صاحب دہلوی، متولی ہمدرد، ملک کے آئے ہوئے دانشوروں کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد، کُل آبادی کا ۱۱ فیصد ہے لیکن جب ہم ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کے تناسب میں اس کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں مسلمانوں کی معاشی اور تعلیمی پسماندگی کی تشویشناک کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کے تیزی سے ترقی نہ کرنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ یہاں مسلمان اپنی تعلیمی پسماندگی کی بنا پر ملک کی ترقی میں وہ حصہ نہیں لے پا رہے ہیں جو انھیں لینا چاہیے۔ مسلمانوں کے مسائل پر یہ دوسرا سیمنار تھا جو علیگڑھ میں منعقد ہوا۔ اس طرح کے اجلاس ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ہوں گے اور ان کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کا اندازہ لگانا اور ان مسائل کو حل کرنے کی راہیں تلاش کرنا ہے۔

سیمنار کا آغاز ۵ اگست ۱۹۸۳ء کو یونیورسٹی کے کنیڈی ہال میں تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ حاضرین کی تعداد تقریباً دو ہزار سے زیادہ تھی۔ افتتاحی اجلاس کی کارروائی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب کے صدارتی خطبہ سے شروع ہوئی۔ انھوں نے سیمنار کے مقاصد کا ذکر کیا اور فرمایا کہ سیمنار میں جو دانشور شریک ہوئے ہیں۔ ان کی تحقیقات سے ہماری حکومت اور ملک کے دوسرے فرقوں کا ضمیر جاگے گا اور وہ مسلمانوں کی بے دلی کے اسباب پر غور کریں گے۔ اس سیمنار کے نتائج مسلمانوں میں ملک کی ترقی کے لئے ایک جوش اور لگن پیدا کریں۔ مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پسماندگی کے عوامل کا ذکر کرتے ہوئے وائس چانسلر نے کہا کہ مسلمانوں کی تعلیم کی طرف عدم توجہی، طرز کہن پر اڑنا، پڑھے لکھے مسلمانوں کے درمیان ذہنی اور نفسیاتی فاصلہ اور عدم تعاون کی شدید

فقدان اور مسلمانوں میں غیر محفوظ ہونے کا احساس' یہ وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں میں مایوسی اور بے اعتمادی کا رجحان پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ حد سے بڑھا ہوا جذبۂ انفرادیت اور مختلف مراحل پر مسلمانوں کے مسائل کے ساتھ امتیازی سلوک' یہ وہ مسائل ہیں جو فوری توجہ کے طالب ہیں۔ جناب سید حامد نے مسلمانوں کو صلاح دی کہ وہ اپنی اخلاقی اور اصلاحی مہم میں پورے خلوص کے ساتھ حصہ لیں' اسلام کی تعلیم سے فیضان اور بصیرت حاصل کریں اور ملک کے دوسرے فرقوں سے مل جل کر ہندوستان کی ترقی میں دل وجان سے لگ جائیں۔

اپنے افتتاحی خطبہ میں ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی نے موجودہ تعلیمی نظام میں تبدیلی لانے اور جدید سائنسی نقطۂ نظر اپنانے پر زور دیا۔ ان کی رائے میں انڈر گریجویٹ سطح پر پیشہ وارانہ کورس کھولنے سے ہندوستانیوں کی پسماندگی عام طور پر اور مسلمانوں کی خصوصی طور پر دور ہوگی۔ اس کے علاوہ تعلیمی اداروں میں تعلیمی ماحول پیدا کرنے اور مقابلے کے امتحانات میں شرکت کی طرف مسلمانوں کی توجہ مبذول کرنے سے مسلمانوں میں بیروزگاری کا مسئلہ کم پیدا ہوگا۔

اس سیمینار کے مہمان خصوصی جسٹس محمد حمید اللہ بیگ نے کہا کہ اگر مسلمان کڑی محنت کریں' تو روزگار کی دنیا میں ان کی اہمیت تسلیم کی جائے گی۔

سیمینار کی کنوینر پروفیسر مسز کشور شیر خاں نے حاضرین کو بتایا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سماجی علوم کا ایک بین العلومی تحقیقاتی مرکز قائم کیا گیا ہے۔ اس مرکز کا بنیادی کام ان مسائل کی تحقیق ہے جن کے حل سے سماجی انصاف اور معاشی استحکام حاصل ہوگا۔ یہ مرکز عملی اور نظریاتی طور پر ان مسائل پر خصوصی توجہ دیگا جن کا تعلق ہمارے ملک کی موجودہ ترقی سے ہے۔

اقلیتی کمیشن کے جوائنٹ سکریٹری جناب این۔ سی۔ سکسینہ نے اپنے تحقیقی مقالے میں کہا کہ مختلف ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ یہاں تک کہ اقلیتی تعلیمی اداروں میں بھی مسلمان غیر مسلموں سے پیچھے ہیں۔ جناب سکسینہ کی رائے میں اس کا بنیادی سبب مسلمانوں میں تعلیم کی کمی ہے۔ لیکن ساتھ ہی امتیازی برتاؤ کی شکایات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں زور دیا کہ بڑی تعداد میں تعلیمی اور پیشہ ورانہ ادارے کھولنے کی ضرورت ہے' خاص طور سے ان جگہوں پر جہاں مسلمانوں کی بڑی آبادی ہو۔ جناب سکسینہ نے کہا کہ اقلیتی اداروں کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں عملی مشکلات کو دور کیا جائے اور مسلمانوں کی تعلیم اور روزگار کے سلسلے میں مستند اعداد وشمار اکٹھے کئے جائیں۔ ایسا کرنے سے مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کی شکایات کا جواب دیا جاسکے گا۔

ایسے تربیتی اداروں کو کشادہ دلی سے امداد دینی چاہیئے جو اعلیٰ ملازمتوں کے لیے مسلمان طلبا کو تیار کرتے ہیں۔ مسٹر سکسینہ نے مزید کہا کہ سرکاری اداروں اور پبلک سیکٹر میں تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ ملازمین کے لئے معروضی قسم کے تحریری امتحانات ہونے چاہئیں۔ ریاستی حکومتوں، مرکزی حکومت اور دوسرے متعلقہ اداروں کو چاہیے کہ وہ اقلیتی کمیشن کو ایسے اعداد و شمار بھیجیں جن سے یہ پتہ چل سکے کہ ان کے یہاں اقلیتی فرقوں کی نمائندگی کا تناسب کیا ہے۔ مئی ۱۹۸۳ء میں وزیر اعظم مسز گاندھی نے اقلیتی فرقوں کی ترقی کے لئے جو ہدایتیں بھیجی ہیں ان پر وزارت داخلہ کو لازمی طور پر عمل کرنا چاہیے۔

اس سیمنار میں تقریباً تیس مقالے پیش کیے گئے۔ سیمنار کا بنیادی مقصد ان معاشی اور تعلیمی مسائل کی نشاندہی تھا جو اکثریتی فرقے کے مقابلے میں مسلمانوں کو پسماندہ بنائے ہوئے ہیں۔ اس بات پر اتفاق رائے تھا کہ صحیح اعداد و شمار ہی سے اقلیتی فرقے کے نقصان اور خسارہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور ان کے مسائل کے حل کے لئے مناسب لائحہ عمل تیار کیا جا سکتا ہے۔ سیمنار کے دوسرے مقالات میں مسلمانوں کی ذہنی، معاشی، تعلیمی اور سماجی پسماندگی کے محرکات کا جائزہ اعداد و شمار کے ذریعہ لیا گیا۔ اس امر پر تمام مقالہ نگار متفق تھے کہ آبادی کے تناسب سے مسلمان تعلیم اور روزگار کے میدان میں پیچھے ہیں اور روزگار اور ملازمتوں میں ان کا حصہ دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو بیدار کرنے کا ذمہ رضاکارانہ تنظیموں کو لینا چاہیے۔ مقالہ نگاروں نے علیگڑھ، کاشی پور، رام پور، بڑودہ، بجنور، پونے، کیرالا اور آندھرا پردیش کے مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پسماندگی کے متعلق اہم اعداد و شمار پیش کیے جو آئندہ اس سلسلے کی تحقیقات کے لئے بہت مفید ہوں گے۔

مرکزی وزیر سیاحت جناب خورشید عالم خاں نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا کہ ہمارے دستور میں اقلیتی فرقوں کو سماجی انصاف، مذہبی آزادی اور تعلیمی اور ثقافتی تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔ لیکن یہ ضمانت اسی وقت کارگر ہو سکتی ہے جبکہ اقلیت مستقل ہوشیار رہے۔ اکثریت کے ساتھ اس کا رشتہ دوستانہ ہو اور حکومت یہ تہیہ کیے ہوئے ہو کہ جو وعدے آئین میں کیے گئے ہیں وہ بہر صورت ایفا ہوں گے۔ وزیر موصوف نے کہا کہ ہندوستان کی اقلیتوں کو ملک کی دفاعی افواج، پولس اور دوسری فورسز میں مناسب نمائندگی ملنی چاہیئے۔ مذہب کی بنیاد پر جو غیر مساوی سلوک روا رکھا جاتا ہے اس کا سدباب حکومت کو کرنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو خود آگے بڑھ کر ملک کی تعمیر میں جوش، لگن اور خوش دلی سے حصہ لینا چاہیئے۔

سیمنار کی تین نشستیں ہوئیں۔ آخری اجلاس میں یہ تجویزیں منظور ہوئیں:

- سرکاری اور غیر سرکاری سائنسی اور تکنیکی اداروں میں مسلمانوں کی تعلیم کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی جائے۔

• علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں پیرا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے قیام کی تجویز پر فوری عمل کی ضرورت ہے۔ • ابتدائی سطح پر ہی نوجوانوں کے لئے ملازمتوں کے سلسلے میں گائڈنس سروسز کا انتظام ہونا چاہیئے۔ • اقلیتی کمیشن کو ایسے اعداد و شمار جمع کرنے چاہئیں جن سے ارباب حکومت کو اقلیتی فرقہ کے مستقبل کو بہتر بنانے کی تدبیروں میں مدد ملے اور رائے عامہ بھی اقلیتی فرقوں کے حق میں ہموار ہو سکے۔

اس سیمنار میں یہ سفارش بھی کی گئی کہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اور بزنس اینڈ امپلائمنٹ بیورو کے تعاون سے ایک ایسا یونٹ علیگڑھ میں قائم کیا جائے جس کا مقصد صحیح اعداد و شمار اکٹھا کرنا ہو، تاکہ ان سے مسلمانوں کی ذہنی اور معاشی پسماندگی دور کرنے کے پروگرام میں مدد ملے۔

●●

ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

سرسید بڑے دور اندیش اور دور بین انسان تھے۔ قوم کا درد' ان کی رگ رگ میں بسا ہوا تھا' ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ مسلم قوم کی اصلاح اور اس کی ترقی کی فکر میں صرف ہوا۔ ان کی زندگی سعی پیہم' جہد مسلسل اور یقین محکم کی عملی تصویر تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے بہت سے کام کیے۔ یہ بات تو اب مسلّم ہو چکی ہے کہ موجودہ طرز تعلیم کو وہ مسلمانوں کی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسی لئے انھوں نے مسلمانوں میں مغربی طرز تعلیم کے نظام کو عام کیا۔ اپنی اس اسکیم کو مقبول عام بنانے کے لئے انھوں نے مختلف ذرائع اختیار کیے۔ ان میں سب سے اہم اور بنیادی کام تو مدرستہ العلوم مسلمانان کے قیام کا تھا' جو ترقی کی منازل طے کرکے آج ہمارے سامنے "مسلم یونیورسٹی" کی شکل میں موجود ہے۔ اور ملک و بیرون ملک کے تشنگان علم کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں سرسید کو جس شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا' وہ بھی اظہر من الشمس ہے۔ لیکن سرسید پختہ عزم اور کوہ ہمالہ کی طرح بلند حوصلہ انسان تھے۔ حالات کے سامنے سپر انداز ہو جانا' یا ہمت ہار بیٹھنا انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ وہ عوام کی رائے ہموار کرنے اور اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایسے ذرائع اختیار کرتے کہ ان کے مخالف بھی ان کی صداقت اور خلوص اور ان کے منصوبوں کی افادیت کے قائل ہو جاتے۔ چنانچہ جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی مغربی تعلیم کی اسکیم کی مخالفت کی جارہی ہے' تو انھوں نے اس تحریک کو مقبول بنانے کے لیے کئی ترکیبیں اپنائیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو ۱۸۶۳ء میں انھوں نے "سائنٹفک سوسائٹی" قائم کی جس کا بنیادی مقصد مغربی زبانوں کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ شائع کرنا تھا۔ اسی سلسلہ میں ۱۸۶۶ء میں انھوں نے "اخبار سائینٹفک سوسائٹی" جاری کیا۔ پھر ۱۸۷۰ء میں اپنا مشہور زمانہ رسالہ "تہذیب الاخلاق" نکالا' جس میں تاریخی' معاشرتی اور ادبی مضامین شائع ہوتے۔ اس کو غیر معمولی قبول عام نصیب ہوا' اور سرسید کے مشن کو غیر معمولی تقویت حاصل ہوئی۔ لیکن سرسید نے نے اسی پر اکتفا نہیں کی' بلکہ انھوں نے ایک ایسے پلیٹ فارم کی ضرورت کو بھی محسوس کیا جس میں ملک کے

دانش ور، عالم، ماہرین تعلیم اور درد مند افرادِ قوم یکجا ہو کر مسلمانوں کی تعلیمی حالات کا جائزہ لیں اور ان میں تعلیم عام کرنے کے ذرائع تجویز کریں۔ اس کے لئے انھوں نے ۱۸۸۶ء میں "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" قائم کی۔ مختلف اوقات میں اس کے نام میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ شروع میں اس کا نام "محمڈن ایجوکیشنل کانگرس" رکھا گیا۔ ۱۸۹۰ء میں اس کا نام "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کر دیا گیا۔ پانچ سال بعد ۱۸۹۵ء میں ایک بار پھر نام میں تبدیلی کی گئی۔ اب اس کا نام "محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس" کر دیا گیا۔ بعد ازآں ۳۶ ویں سالانہ اجلاس (۱۹۲۲ء) میں صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی تحریک پر لفظ محمڈن کو "مسلم" سے بدل دیا گیا اور اس طرح اس کا نام "مسلم اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس" ہو گیا۔ آج کل یہ "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے نام سے معروف ہے۔

کانفرنس کے قیام پر روشنی ڈالتے ہوئے "حیات جاوید" میں مولانا حالی رقمطراز ہیں:۔

"محمڈن کالج کی حالت جب کسی قدر اطمینان کے قابل ہو گئی، تو سرسید کو یہ خیال ہوا کہ اگر بالفرض یہ کالج ہر طرح مکمل ہو گیا، تو بھی اس سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور ایک کالج چھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیم کی کفالت نہیں کر سکتا۔ اس کے سوا مسلمانوں کی قوم جو ہندوستان کے دور دراز حصوں میں پھیلی ہوئی ہے، وہ سب ایک دوسرے کی حالت سے محض بے خبر ہیں اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں کہ مختلف صوبوں اور مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں، اپنے اپنے خیالات، قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ایک دوسرے پر ظاہر کریں۔ ہر حصۂ ملک کے مسلمانوں کی ترقی یا تنزل کا حال تمام قوم کو معلوم ہو، اور مسلمان جو باوجود ایک قوم ہونے کے بمنزلہ مختلف قوموں کے ہو رہے ہیں، ان میں قومی یگانگت اور ہمدردی پیدا ہو۔ اس بنا پر جیسا کہ سرسید نے پہلے اجلاس میں بیان کیا تھا، یہ کانفرنس قائم کی گئی اور اس کا پہلا اجلاس ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو بمقام علی گڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج منعقد ہوا۔"

اس طرح آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا وجود عمل میں آیا۔ اس کانفرنس نے مختلف مراحل پر قوم کی بھرپور خدمت کی اور ترقی کی راہ پر گامزن ہونے میں اس کی مدد کی۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی کارکردگی میں وسعت پیدا ہوتی گئی اور اس کے اغراض و مقاصد میں تنوع آتا گیا، لیکن ابتدا میں جو اساسی

طے پائے تھے، وہ حسب ذیل تھے:

۱ - "مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے میں کوشش کرنا -

۲ - مسلمانوں کی تعلیم کے لئے جو انگریزی مدارس مسلمانوں کی طرف سے جاری ہیں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تابمقدور عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا -

۳ - علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علمائے اسلام جا بجا طور پر خود دیتے ہیں، اس کو تقویت دینا اور اس کو بدستور قائم و جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا -

۴ - جو تعلیم قدیم طرز پر دیسی مکتبوں میں جاری ہے، اس کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں جو تنزل پیدا ہو گیا ہے، اس کی ترقی اور توسیع کی تدبیریں اختیار کرنا -

۵ - قرآن خوانی اور حفظ قرآن کے لئے جو مکتب جاری ہیں اور جن کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے، ان کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان کے قائم رکھنے اور استحکام دینے کی تدبیریں عمل میں لانا"

ان مقاصد کی تکمیل ہمیشہ اس کانفرنس کے پیش نظر رہی - یہ مقاصد چوں کہ نیک اور خلوص نیت پر مبنی تھے، اس لئے جلد ہی کانفرنس کو مقبولیت حاصل ہو گئی اور مختصر سی مدت میں اس نے ملک گیر تحریک کی شکل اختیار کر لی - البتہ اتنا ضرور ہوا کہ ابتداء میں اس کے خلاف آوازیں اٹھیں - دراصل مخالفت سرسید کا مقدر بن چکی تھی - ان کا مغربی تعلیم کا تصور پہلے ہی شدید مخالفت کا موضوع بن چکا تھا - اس لئے ہر وہ عمل اور ہر وہ اسکیم جس کا مقصد اس طرز تعلیم کو فروغ دینا ہو، اس کی مخالفت فطری اور بدیہی تھی - چنانچہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی مخالفت ہوئی اور اسی زور و شور سے ہوئی جس سے کالج کو ہدف مخالفت بنایا جا رہا تھا - اس کا بڑا مدلل، واضح اور پُر زور جواب نواب محسن الملک نے ۱۸۹۳ء میں کانفرنس کے آٹھویں اجلاس منعقدہ علی گڑھ میں ان الفاظ میں دیا :

"مانا ہم نے مغربی علم کا شوق دلا کر مسلمانوں کو خراب کیا - مانا کہ ہم نے انگریزی تعلیم و تربیت کے جاری کرنے سے الحاد پھیلایا، مانا کہ ہم نے کانفرنس قائم کر کے مسلمانوں کو بہکایا - مگر ہم پر طعنہ کرنے والے خدا کے لئے یہ بتا دیں کہ انھوں نے اپنی قوم کے لئے کون سی کوشش کی ؟ اور اس ڈوبتی ہوئی کشتی کے بچانے میں کون سی کوشش کی ؟ اگر ہم نے مسلمانوں کے لئے وہ کشت بنایا گو ہیتا لیکن لگا بنایا ہوا بیت المقدس ہمارا ہے، جہاں جا کر ہم سجدہ کریں ؟ اگر ہم نے اپنے بھائیوں کے واسطے ایک قومی کانفرنس قائم کی، ہم

قبول کرتے ہیں کہ ایک بے سود کام کیا۔ مگر ہمارے دوست براہِ مہربانی یہ فرمادیں کہ اُنھوں نے قوم کے حال پر مرثیہ پڑھنے، قوم کی مصیبت پر ماتم کرنے کے لئے کون سی مجلس بنائی ہے کہ ہم وہیں جاکر نوحہ کریں اور سر پیٹیں؟ ہم اگر مضر یا بیسود کام کرنے کے گنہگار ہیں، تو قوم کو مرتے دیکھنے اور کچھ نہ کرنے کا ذمّہ دار کون ہے؟"

اس تحریک کو مقبول اور کامیاب بنانے کے لئے سرسیّد اور اُن کے رفقا نے بہت سے اقدامات کئے، جو بڑے کارگر ثابت ہوئے۔ اُن سے کانفرنس کی ہردلعزیزی میں اضافہ ہوا اور اس کی افادیت مسلّم ہوئی۔ ان میں ایک تدبیر تو یہ اختیار کی گئی کہ اگرچہ کہ اس کا صدر دفتر علیگڑھ میں تھا اس کے سالانہ جلسے ملک کے مختلف مقامات پر بھی کیے جاتے اور اس طرح دُور دراز کے علاقوں تک اس کی آواز پہنچائی جاتی۔ ہر سال نئے شہر کا انتخاب کیا جاتا اور وہاں جلسہ ہوتا۔ چنانچہ علیگڑھ کے علاوہ رنگون، ڈھاکہ، پشاور، لاہور، امرتسر، سورت، بمبئی، کلکتہ، مدراس، پونا، جبل پور، ناگپور، پٹنہ، اجمیر، الہ آباد، آگرہ، دہلی، میرٹھ، شاہجہاں پور وغیرہ جیسے دُور دراز شہروں میں اس کے اجلاس منعقد کیے گئے جس سے ملک کے کونے کونے میں اس کی بازگشت سنائی دینے لگی۔

دوسری اہم اور کارگر ترکیب یہ اختیار کی جاتی کہ ان اجلاسوں کی صدارت کے لئے ملک و قوم کی نامور اور بااثر شخصیات کا انتخاب کیا جاتا جس سے کانفرنس کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوتا اور اس کے وقار میں چار چاند لگ جاتے۔ چنانچہ جن حضرات نے منصبِ صدارت کو اعزاز بخشا، اُن میں مولوی سمیع اللہ، نواب اسحاق خاں، محسن الملک، عماد الملک، جسٹس شاہ دین ہمایوں، سر آغا خاں، بدرالدین طیب جی، سر تھیوڈر مارسین، مولانا حالی، مہاراجہ محمود آباد، عبداللہ یوسف علی، میاں محمد شفیع، ابراہیم رحمت اللہ، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، سر عبدالقادر، سر راس مسعود، ڈاکٹر سر ضیاءالدین، نواب زادہ لیاقت علی خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ جیسی نادر روزگار شخصیات کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ کسی بھی تحریک سے ان حضرات کی وابستگی اُس کی کامیابی کی ضمانت ہوسکتی ہے۔ ان اجلاسوں کا اہتمام بڑے پیمانے پر کیا جاتا۔ خود سرسیّد کا یہ عالم تھا کہ جس شہر میں اجلاس منعقد ہوتا، وہ کافی پہلے سے وہاں پہنچ جاتے اور تمام انتظامات کی نگرانی خود کرتے۔

کانفرنس میں جو صدارتی خطبے پڑھے جاتے، وہ بھی کئی حیثیتوں سے اہم ہوتے۔ ان میں صاحبِ خطبہ

کی مکمل شخصیت اُبھر کر سامنے آتی - ۱۵۹ اس کے خیالات، نظریات اور جذبات کا آئینہ دار ہوتا - یہ خیالات قوم کے کاموں میں اس کی زندگی بھر کے تجربات کا نچوڑ ہوتے جن سے قوم کی صحیح سمت رہنمائی ہوتی۔
ان کے علاوہ دیگر عمائد ملک بھی ان اجلاسوں میں شرکت کرتے، کارروائیوں میں حصہ لیتے، مقالے پیش کرتے، نظمیں پڑھتے اور اس طرح اپنے خیالات سے دوسروں کو مستفید کرتے - ان کی معرفت تعلیمی، ثقافتی اور تاریخی اہمیت کے علاوہ ان اجلاسوں کی ادبی حیثیت بھی مسلّم ہوگئی۔ ان کی افادیت واضح کرتے ہوئے نجم الہند سردار محمد حیات خاں نے پانچویں اجلاس (۱۸۹۰ء) منعقدہ الہ آباد میں اپنے صدارتی خطبہ میں فرمایا:

"صاحبان! ہم آپ کو اس تعلیمی کانفرنس سے جن برکتوں کی توقع ہے، اور جو مفاد ہم کو حاصل ہوتے ہیں، ان میں سے یہ فائدہ کچھ کم قابلِ قدر نہیں، جو ہر سال ہماری قوم کے علماء اور فضلا کے قیمتی لکچروں اور قومی مضامین کی تحریروں سے حاصل ہوتا ہے، جو اس میٹنگ میں پڑھے جاتے ہیں - پچھلے سالوں میں ہمارے لائق پروفیسر مولوی محمد شبلی صاحب اور مولوی نذیر احمد صاحب اور مولوی الطاف حسین حالی کی بیش بہا تحریروں سے قوم متمتع ہوئی ہے اور اس سال کے اجلاس میں جو بات نہایت خوشی اور بے انتہا مسرت بخشنے والی ہے وہ ہمارے جلیل القدر اور فاضل بے بدل نواب محسن الملک، محسن الدولہ منیر نواز جنگ بہادر مولوی سید مہدی علی صاحب کی شمولیت ہے (جو ہر ایک مسلمان کا فخر ہے) اور اپنے بے نظیر علم و فضل سے قوم کو فائدہ بخشنے کے لئے تیار ہیں - نواب صاحب کی کوئی تحریر یا تقریر سننے کے لئے قوم کے اشتیاق کی کوئی حد باقی نہیں رہی تھی۔"

ابتدا میں کانفرنس کا دائرہ عمل محدود تھا - اس کے اجلاسوں کا واحد موضوع مسلمانوں میں جدید تعلیم کی تبلیغ کرنا ہوتا تھا - چنانچہ ان میں جو مقالے پیش کیے جاتے، یا تقریریں کی جاتیں ان کا مقصد مسلمانوں میں جدید تعلیم کو واضح کرنا اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہوتا - لیکن جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا اور حالات بدلتے گئے، اسی کے ساتھ مسلم قوم کے مسائل بھی مختلف النوع ہوتے گئے - اسی کے لحاظ سے کانفرنس کا دائرہ عمل بھی وسیع تر ہوتا چلا گیا - چنانچہ ۱۹۳۷ء میں کانفرنس کی ۵۰ سالہ جوبلی کے موقع پر جو چار روزہ اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا تھا، اس کو بارہ مختلف شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر شعبہ کا صدر اور سکریٹری علیحدہ مقرر ہوا تھا - اس کی تفصیل اس طرح ہے :

۱۔ شعبۂ ابتدائی تعلیم و مدارس اُردو : صدر : سید آل علی نقوی انسپکٹر مدارس اسلامی صوبجات متحدہ۔ سکریٹری : سید اسد اللہ، اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز۔

۲۔ شعبۂ ثانوی تعلیم : صدر : ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ سکریٹری : خواجہ غلام السیدین

۳۔ شعبۂ اعلیٰ تعلیم : صدر : عبداللہ یوسف علی۔ سکریٹری : پروفیسر محمد حبیب

۴۔ شعبۂ تعلیم نسواں : صدر : شیخ عبداللہ (بانی ویمنس کالج علی گڑھ) سکریٹری : سید ہادی حسن

۵۔ شعبۂ مدارس اسلامی : صدر : مولانا حسین احمد مدنی۔ سکریٹری : ابوبکر محمد شیث

۶۔ شعبۂ تدریسی و تعلیم بالغان : صدر : طفیل احمد منگوری۔ سکریٹری : تجمل حسین

۷۔ شعبۂ معاشیات و اصلاح معاشرہ : صدر : محمد الیاس برنی۔ سکریٹری : شیخ عطاء اللہ

۸۔ شعبۂ اُردو یا اُردو کانفرنس : صدر : مولوی عبدالحق۔ سکریٹری : رشید احمد صدیقی

۹۔ شعبۂ پریس کانفرنس : صدر : (۱) مولوی بشیر الدین (ایڈیٹر البشیر۔ اٹاوہ) (۲) منشی دیا نرائن نگم (ایڈیٹر زمانہ۔ کانپور) سکریٹری : (۱) محمد اکرام خاں ندوی (۲) نظام الدین نظامی (اڈیٹر ذوالقرنین بدایوں)

۱۰۔ شعبۂ ٹیکنیکل تعلیم : صدر : ڈاکٹر اے۔ جی۔ خاں (ڈپٹی ڈائرکٹر اسٹورز۔ دہلی)۔ سکریٹری : (۱) ڈاکٹر رفیق احمد (۲) عبید اللہ درّانی۔

۱۱۔ شعبۂ اسلامی علوم و فنون : صدر : سید سلیمان ندوی۔ سکریٹری : امیر حسن صدیقی

۱۲۔ شعبۂ تعلیمی نمائش : صدر : کرنل آر۔ ایس ویر (ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم صوبجات متحدہ) سکریٹری : ڈاکٹر عباد الرحمٰن۔

اس طرح کانفرنس نے محض تعلیمی مسائل سے گزر کر زندگی کے تمام شعبوں میں مسلمانانِ ہند کی قیادت کا بار سنبھالا خصوصاً اصلاح معاشرہ اور اُردو زبان کے تحفظ کے سلسلے میں اس کی سرگرمیاں وسیع پیمانے پر ہونے لگیں۔ اس کے علاوہ مسلم ثقافت کی بازیافت اور اس کی بہترین روایات کی تجدید بھی اکابر کانفرنس کی توجہ کے مرکز بنے ہیں۔ اردو زبان و ادب کی خدمات کے سلسلہ میں اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ انجمن ترقی اُردو، جس نے اُردو کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی ہندوستان اور پاکستان میں سرگرم اور فعّال ہے، اسی کانفرنس کے بطن سے پیدا ہوئی۔

اگرچہ آج کل یہ کانفرنس اتنی فعال اور سرگرم نہیں ہے، جتنی ۱۹۴۷ء سے قبل تھی۔ تاہم اس
کی اہمیت کو آج بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آزادی سے قبل ملک و قوم کے لئے اس کی خدمات ناقابل
فراموش ہیں۔ اس کا سب سے بڑا اور اہم کام سرسید کی تعلیمی تحریک کو آگے بڑھانا تھا۔ اس میں بڑی حد تک
اس کو کامیابی نصیب ہوئی۔ اس نے مسلمانوں پر جدید تعلیم کی اہمیت کو واضح کیا اور ان کے دلوں سے تمام
شکوک و شبہات کو نہ صرف رفع کیا بلکہ ان کے دلوں میں جدید تعلیم حاصل کرنے کا شوق بھی پیدا کیا۔ اسی کے
ساتھ اس نے قدیم اور جدید دونوں مکاتبِ فکر کے اکابر و عمائد کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا، چنانچہ اس کے
پلیٹ فارم پر جہاں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، علامہ سلیمان ندوی، سحبان الہند مولانا
احمد سعید دہلوی، مولانا ابوبکر شیث اور مولانا ابوالحسن ندوی جیسے علما و مشائخ نظر آتے ہیں، وہیں سرسید
اور ان کے رفقا کے علاوہ سر آغا خاں، بدرالدین طیب جی، مہاراجہ محمود آباد، میاں محمد شفیع، صاحبزادہ
آفتاب احمد خاں، سر راس مسعود، سر عبدالقادر، ڈاکٹر سر ضیاء الدین اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے رہنمایانِ قوم
بھی نظر آتے ہیں۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ کانفرنس کو غیر معمولی کامیابی اس لئے نصیب ہوئی
کہ اس کو دونوں مکاتبِ فکر کے اکابر کا تعاون حاصل رہا۔ یہ اجتماعِ ضدین حقیقت میں قرآن السعدین
ثابت ہوا جو دلچسپ بھی تھا اور فال نیک بھی۔

کانفرنس نے بہت سے ٹھوس اور عملی اقدام کیے، جس سے نونہالانِ وطن کو بہت فائدہ ہوا۔
اس نے بہت سے نادار اور ضرورت مند طلبا کو وظیفے دیئے۔ اس مد میں اس نے لاکھوں روپے صرف
کیے اور ہزاروں طلبا کی مالی اعانت کر کے ان کی مشکلات دور کیں۔ وظائف کے علاوہ زیادہ مستحق طلبا
کو درسی کتب بھی فراہم کیں۔ لیکن اس نے صرف طلبا کی امداد پر ہی اکتفا نہیں کی، بلکہ مدارس اور مکاتب
تک اپنے دائرۂ عمل کو وسیع کیا اور ایسے بہت سے مدرسوں کی خدمت کی، جو معاشی مشکلات سے
دوچار ہو رہے تھے۔ کانفرنس نے پیشہ وارانہ تعلیم پر بھی توجہ دی اور طلبہ کو ایسی تعلیم کی طرف رغبت
دلائی جس کو حاصل کر کے وہ اپنی روزی کا انتظام خود کر سکیں، محض ملازمت پر ہی انحصار نہ کریں، بلکہ
اپنا بھی کام کرنے کے قابل ہو جائیں۔ اس طرح اس نے بڑی خوش اسلوبی سے اس تنقید کا
جواب دیا کہ مسلم یونیورسٹی کا کام صرف دفتری کلرک پیدا کرنا ہے۔

کانفرنس نے ہر مرحلہ پر مذہبی اقدار کو برقرار رکھنے اور اخلاقیات کو قائم رکھنے پر زور دیا اور

اس ہی قسم کی تعلیم کی تبلیغ کی جس کو حاصل کر کے طلبہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے روشناس ہوں۔ یہی وہ راہِ عمل تھی جس کو کانفرنس نے روزِ اوّل سے ہی اختیار کر لیا تھا اور جس کی وضاحت نواب محسن الملک نے اس کے دسویں اجلاس (۱۸۹۵ء) منعقدہ شاہجہاں پور میں اپنے مخصوص پُر زور اور پُر اثر انداز میں اس طرح کی تھی ——— "صاحبو! ہمارا ہرگز یہ مقصود نہیں ہے کہ ہم انگریزوں کی کورانہ تقلید کریں، اپنے بچوں کو صرف وہ تعلیم دلائیں جو فقط دنیا کے لئے مفید ہو اور جس سے وہ صرف گورنمنٹ کی ملازمت کے لائق ہو جائیں۔ بلکہ ہمارا مقصد اس سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ ہم اس قسم کی تعلیم کو ہرگز تعلیم بھی نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے نزدیک تعلیم کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ اس سے چند پیشوں کے کام کرنے کی لیاقت حاصل ہو، بلکہ تعلیم کا مقصود یہ ہے کہ تمام قوتیں جو خدا نے انسان میں رکھی ہیں وہ نمو پائیں اور نہ صرف انھیں قوتوں کو نمو دیا جائے جو ہماری جسمانی آسایش کے کام آئیں، بلکہ روحانی قوتوں کا کام میں لانا، اور دماغ کو غذا پہنچانا تعلیم کا اصلی مقصود ہے۔ بلاشبہ اس قسم کی تعلیم جس سے ہم معاش پیدا کرنے کے لائق ہوں ضروری ہے اور ہماری دنیاوی لذّت دور ہونے کے لئے اس کا سیکھنا بھی لازم ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ہم وہ تعلیم بھی چاہتے ہیں کہ جس سے ان کے دل و دماغ روشن ہوں اور علم کو علم کے لئے حاصل کریں اور علاوہ جسمانی آسایش کے، جو فنا ہونیوالی ہے، ان چیزوں کو بھی حاصل کریں جو ان کی روحانی راحت کیلئے، جو کہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، کام آئیں۔ ان میں سچی ہمدردی اور کامل انسانیت پیدا ہو۔ انکی زندگی کا مقصد زیادہ اعلیٰ اور زیادہ پاک ہو اور جس طرح ہمارے بزرگوں نے علم کو علم کے لئے حاصل کیا اور ہمارے لئے وہ اپنے دل و دماغ کو ترکہ چھوڑ گئے، اسی طرح ہم بھی علم کو علم کے لئے حاصل کریں اور اپنے بزرگوں کے ترکہ میں کچھ بڑھا کر آئندہ آنیوالی نسلوں کے لئے چھوڑ جائیں۔ اس کے لئے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے دینی علوم بھی سیکھیں اور عقلی علوم کی بھی تحصیل کریں۔"

کانفرنس کی ہمہ جہتی خدمات کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کی طرف بھی خصوصی توجہ دی اور مختلف موضوعات پر متعدد مفید کتابیں شائع کیں۔ ان میں سوانح، معاشیات، اسلامیات، سماجیات اور تاریخ و ادب جیسے اہم موضوعات پر کتابیں شامل ہیں۔ ان مطبوعات کی فہرست کافی طویل ہے۔ جن میں چند اہم درج ذیل کی جاتی ہیں:-

(۱) یادِ ایام - از حکیم سید عبدالحی (۱۹۱۹ء)۔ (۲) وقارِ حیات - اکرام اللہ ندوی (۱۹۲۵ء) ۳- گنجِ سلیمانی - از مظفر حسین خاں سلیمانی (۱۹۲۷ء) ۴- ذکرِ مبارک - از بیگم بھوپال (۱۹۲۷ء) ۵- خطباتِ عالیہ (۳ حصے) مرتبہ انوار احمد زبیری (۲۶-۱۹۲۷ء) (۶) صولتِ شیرشاہی از سید احمد مرتضیٰ نظر قطبی (۱۹۳۴ء) ۷- حیاتِ محسن - از محمد امین زبیری (۱۹۳۴ء) ۸- تاریخ کانفرنس از انوار احمد زبیری (۱۹۳۵ء) ۹- ہمایوں نامہ، ترجمہ عثمان حیدر مرزا و حیدر مرزا (۱۹۳۵ء) ۱۰- خطباتِ صدارت پنجاہ سالہ جوبلی (۱۹۳۸ء) ۱۱- اللغۃ والامثال، مؤلفہ محمد فضل قدیر ظفر ندوی (۱۹۴۰ء) ۱۲- التربیت التعلیم (عربی متن مع اردو ترجمہ) از علامہ رشید رضا (ب ت) ۱۳- اسلامی عقائد - از مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۱۹۶۱ء)--

● ●

• ڈاکٹر اطہر پرویز (پ ۱۹۲۸ء تقریباً) اپنی عملی زندگی کا آغاز کمیونسٹ پارٹی کے کارکن کی حیثیت سے کیا تھا۔ پارٹی سے کنارہ کرکے جامعہ ملیہ منسلک ہوئے۔ یہاں ذاکر صاحب کی رفاقت میسر آئی جو بچوں کے لئے ایک لافانی ذخیرہ چھوڑنے کا سبب بنی۔ علی گڑھ آنے کے بعد معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ تصنیفی کاموں سے انھیں ایسی دلچسپی تھی کہ لوگ ان کا اصل نام بھول گئے، صرف قلمی نام یاد رہ گیا اور آخری دم تک علیگڑھ کی خدمت کرتے رہے۔ ایک عرصے سے دل کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ بالآخر اپریل ۸۴ء میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

••

(۱)

یونیورسٹی کا معیارِ تعلیم بہتر بنانے کے سلسلہ میں چند تجاویز

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اب باقاعدہ ایک اقلیتی ادارہ ہو گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اب ہم سنجیدگی سے مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر غور کریں۔ یہ ادارہ اب ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی سرگرمیوں میں نمایاں طور پر حصہ لے سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں میری چند تجاویز ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

۱- اس یونیورسٹی کو علیگڑھ اور اس کے گرد و نواح کے نوجوانوں تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ اس کا کل ہند کردار قوم کے سامنے آنا چاہیے۔ ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں جو نوجوان اپنی ریاستوں میں ہائی اسکول، انٹرمیڈیٹ یا پری یونیورسٹی کے امتحانات اعزازات سے پاس کریں، انھیں یہاں پڑھنے کی دعوت دی جائے۔ ایک زمانہ کی بات ہے جب مولانا حسرت موہانی نے ہائی اسکول کا امتحان اعزاز سے پاس کیا تھا تو ان کو یہاں آنے اور پڑھنے کی دعوت دی گئی تھی۔

۲- فی الحال ہر ریاست کے امیدواروں کا کم سے کم کوٹہ مقرر کر دیا جائے تاکہ ہم یہ دعویٰ کر سکیں کہ ہماری یونیورسٹی میں ہندوستان کے ہر علاقے کے نوجوان تعلیم پا رہے ہیں۔

۳- جن طالب علموں کو ہم یہاں اعلیٰ تعلیم کے لئے دعوت دیں ان کی تعلیم مفت ہونا چاہیئے تاکہ وہ اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں دلچسپی سے حصہ لیں۔

۴- جو طالب علم دوسری ریاستوں سے یہاں آئیں ان کے لئے ہوسٹل کی سہولت فراہم کی جائے۔ یہ نہ ہو کہ ہم ان کے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔

۵- جو طالب علم یونیورسٹی کے امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کریں ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کاموں کی باقاعدہ تشہیر کی جائے تاکہ ان کو یونیورسٹی میں عزت ملے۔

۶- یونیورسٹی میں ڈبیٹس کا معیار خاصا گر گیا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ نوجوانوں کو ڈبیٹس کے لئے تیار کریں اور انھیں دوسرے اداروں میں شرکت کے لئے بھیجیں۔

۷- کھیلوں کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ کی ضرورت ہے۔ اچھے کھلاڑیوں کو جو کسی اچھے تعلیمی ادارے سے وابستہ ہیں یہاں آنے کی دعوت دی جائے۔ انھیں یونیورسٹی کی ٹیم میں جگہ دی جائے اور ان کی پڑھائی کا بھی خیال رکھا جائے۔ مختلف صنعتی اداروں اور دیگر ہندوستانی اداروں سے ربط قائم کیا جائے اور جو کھلاڑی ہمارے یہاں سے فارغ التحصیل ہوں ان کی ملازمت کے لئے کوشش کی جائے۔

●●

۲

سماج میں بوڑھوں کی ضرورت

جارج برناڈشا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کسی نے ان سے کہا کہ نئی نسل' آپ کی نسل کے مقابلے میں زیادہ قد آور ہے" تو برناڈشا نے برجستہ جواب دیا " کیوں نہیں ـــــ ظاہر ہے کہ قد آور تو دکھائی دیں گے ہی' کیوں کہ وہ ہمارے کندھوں پر کھڑے ہوئے ہیں "

اس بیان میں بڑی صداقت ہے۔ تہذیبوں کی عظمت اور توانائی کا انحصار درختوں کی طرح ان کی جڑوں پر ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح کی جھنڈی والی دوڑ ہے کہ ایک دوڑنے والا' اپنی منزل پر پہنچ کر وہ جھنڈی اگلے کے سپرد کرتا ہے' جو اس کو لے کر دوڑتا ہے اور وہ جھنڈی پھر اگلی منزل پر کسی دوسرے کو دیدیتا ہے' اور اس طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ اسی لئے جب آگے والا آگے نکلتا ہے تو ہم جانتے ہیں کہ اس کے آگے نکلنے میں پہلے والے کا بھی ہاتھ ہے۔ اور اسی لئے جب نئی نسل کوئی بڑا کام کرتی ہے' تو اس میں پچھلی نسل کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔ دنیا راکٹ کی منزل میں پہنچ گئی ہے لیکن جس آدمی نے پہیہ ایجاد کیا تھا ' اس کی حکمت بھی اس میں شامل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی معاشرے میں بوڑھوں کی بڑائی کو ہمیشہ تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ تجربے اور دانائی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

مغرب میں بوڑھوں کو سماج سے علیحدہ کرنے کی کوشش نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ہمارا سماج مغرب سے بہت مختلف ہے۔ مغرب میں جہاں فرد کی آزادی کا بڑا ڈھول پیٹا جاتا ہے۔ وہاں بوڑھے کو اس انفرادی آزادی سے گویا محروم کرنے کا عمل کارفرما ہے۔ جیسے ہی انسان بڑھاپے کی منزل میں رکھتا ہے وہ معاشرے سے بھی الگ ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں سے ان کا خون کا رشتہ ہے' وہ اس سے اپنا ناتا توڑ لینا چاہتے ہیں۔ اب وہ چلتا پھرتا ہے تو صرف اس لئے کہ وہ زندہ ہے۔ اس کی انفرادی آزادی محض اس حد تک رہ جاتی ہے کہ وہ چل پھر سکتا ہے۔ لیکن معاشرے میں جینے کے معنی محض چلنا پھرنا نہیں ہوتا بلکہ معاشرتی زندگی کے مختلف شعبوں میں حصہ لینا ہوتا ہے۔

ہندوستانی معاشرے میں بوڑھے کو ایک اہم سماجی حیثیت حاصل ہے مشترکہ خاندان میں اس کی حیثیت ایک سربراہ کی ہوتی ہے۔ وہ اپنے بال بچوں کی زندگی کی سمت مقرر کرنے میں ایک نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ وہ اس

چھوٹے سے خاندان کا مشیر بھی ہوتا ہے اور ان کا ذمہ دار بھی۔

جب میں بوڑھے کا لفظ استعمال کر رہا ہوں، تو اس سے مراد محض مرد نہیں، بلکہ عورتیں بھی ہیں۔ اسی لئے کہ بوڑھی عورتیں گھر میں ایک مثبت کردار ادا کرتی ہیں۔ وہ خاندانی روایات کی پاسبان ہوتی ہیں۔ وہ بے لکھے خاندانی قانونوں کو عمل درآمد کرانے میں مددگار ہوتی ہیں۔ وہ رشتوں کے اعتبار سے ہر ایک کے حقوق و فرائض سے نہ صرف واقف ہوتی ہیں، بلکہ ان کی رہنمائی میں ان حقوق و فرائض پر عمل ہوتا ہے۔ معاشرتی قوانین اپنی جگہ پر ---- لیکن ہمارے معاشرے میں روایات اور رسومات کو ان سے کم حیثیت حاصل نہیں ہے اور ان روایات اور رسومات نے ہندوستانی معاشرے کو بکھرنے سے بچا رکھا ہے۔

بڑے بوڑھے نہ صرف یہ کہ ان کی پاسبانی کرتے ہیں۔ ان پر عمل کرواتے ہیں، وہ گھر کے اندر اور کبھی کبھی باہر بھی "عدالت" کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ گھر کے لڑائی جھگڑے، ان کے تصفیوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ اور گھر کا ہر فرد ان کے فیصلوں کا پابند ہوتا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ وہ اپنے خاندان کا ڈکٹیٹر ہوتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کوئی ڈکٹیٹرشپ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ ہندوستانی معاشی تکلیف برداشت کر لیتا ہے، موسموں سے لڑ جھگڑ لیتا ہے اور ان کے سامنے ہتھیار بھی ڈال دیتا ہے۔ چھوٹی موٹی زیادتی برداشت کر لیتا ہے، لیکن وہ اپنی انفرادی آزادی کو کبھی کسی دوسرے کے سپرد نہیں کر سکتا۔ یہ انفرادی آزادی اُسے جان سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ اپنی زباں بندی گوارا نہیں کرتا کہ اس کے بغیر اُسے روحانی تسکین حاصل نہیں ہو سکتی۔

بوڑھے کی یہ حیثیت نہ صرف اپنے گھر میں ہوتی ہے، باہر بھی اس کو عزت سے دیکھا جاتا ہے۔ اسے پنچ کے بیچ پر بٹھایا جاتا ہے۔ سب لوگ اس کے سامنے اپنی شکایتیں اور اپنے جھگڑے رکھتے ہیں۔ اس وقت اس کی حیثیت پنچ پرمیشور کی ہوتی ہے۔ وہ حق و انصاف کی روشنی میں اپنے فیصلے کرتا ہے۔ وہ اس وقت انصاف کے ترازو کو ہاتھ میں لینے کے بعد اپنے پرائے میں تمیز نہیں کرتا۔ یہاں اس کی عمر کے تجربے اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ایک بڑی اور بامصرف زندگی گزار دینے کے بعد وہ خود غرضی کی سطح سے اپنے آپ کو بلند کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارا گاؤں اس کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔

ہندوستانی بوڑھا، علم و عقل اور تجربے کا دوسرا نام ہے۔ وہ ایک بڑی روایت کا حامل ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ آنے والی نسل کو اپنا سب کچھ دے جو اس نے برسوں کی محنت، مشقت اور ریاضت کے بعد حاصل کیا ہے۔ اور وہ ایسا کرتا بھی ہے۔ لیکن کیا یہ عجیب نہیں کہ ہم اس کے علمی ورثے کو بلا جھجک قبول کر لیں لیکن اس کے تہذیبی ورثے

اپنے آپ کو بے نیاز سمجھیں؟ کیا یہ خواہش بہت زیادہ نہیں کہ ہم از سر نو اپنے تجربے سے ہی سب کچھ حاصل کریں؟ کیا یہ میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا "تھو تھو" نہیں ہے؟ حالانکہ جس کو کڑوا سمجھ کے تھوکا جا رہا ہے، وہ اتنا کڑوا بھی نہیں ہے۔

شاید ہندوستانی معاشرے نے یہ بات روز اوّل سے ہی سمجھ لی ہے کہ بوڑھے بھی سماج کا اٹوٹ انگ ہوتے ہیں ان کو اگر توڑ دیا جائے، تو ہمارا معاشرہ لولا اور لنگڑا ہو جائے گا۔ اس لئے سماج میں ان کا کردار مثبت حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ سرکاری ملازمت سے وہ ایک خاص عمر میں پہنچ کر سبکدوش ہوتے ہیں۔ لیکن معاشرے سے سبکدوش نہیں ہوتے۔ یہ بوڑھا، جسے لوگ غلطی سے از کار رفتہ بھی سمجھ لیتے ہیں، اس کا ذہن ایک شاندار کمپیوٹر ہوتا ہے جس میں زندگی کے تجربے، انسانی رشتوں کی نزاکتیں، علم و عمل کی سرگرمیاں، سب محفوظ ہو جاتے ہیں۔ رات میں بچہ اچانک رونے لگتا ہے۔ نوجوان ماں اور باپ پریشان ہو جاتے ہیں کہ ان کے بھلے چنگے بیٹے کو کیا ہوا۔ ماں تو اپنے ہوش و حواس کھونے لگتی ہے اس وقت گھر کا یہ بزرگ آگے بڑھ کر ان کو تسلّی دیتا ہے۔ ان میں اعتماد پیدا کرتا ہے اور پھر غور سے بچے کو دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔ "بہو ذرا بستر تو دیکھو۔ یہ کیا ہے۔ چیونٹیاں کاٹ رہی ہیں۔ بغلوں اور جانگوں میں چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔" ماں کے بہلانے سے بچہ کیسے چپ ہو جاتا۔ وہ اپنی تکلیف کو بیان نہیں کر سکتا۔ اور بوڑھی دادی نے بروقت اپنے تجربے سے مدد کی۔ یہ ضروری نہیں کہ بچے کے چیونٹی ہی کاٹ رہی ہو۔ اس کے کان میں درد بھی ہو سکتا ہے وہ اپنی تکلیف بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن بوڑھی دادی غور سے دیکھنے کے بعد یہ دریافت کر لیتی ہے کہ اس کے کان میں درد ہے وہ سب کو مطمئن کر دیتی ہے اور طاق پر سے کوئی تیل نکال کر ایک آدھ قطرہ کان میں ٹپکا دیتی ہے اور تھوڑی دیر میں بچہ خاموش ہو کر سو جاتا ہے۔ گویا یہ بوڑھے اپنے چٹکلوں سے اس چھوٹے سے گھر کے بروقت معالج بھی بن جاتے ہیں۔

بوڑھوں کی ہمہ جہتی حیثیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جدید سوسائٹی بوڑھوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ خیال خام ہے، بلکہ میں تو اور آگے بڑھ کر یہ کہوں گا کہ ان کی جتنی ضرورت ہے اتنی شاید اس سے پہلے نہیں تھی۔ اب جبکہ نوجوان میاں بیوی دونوں گھر سے باہر بھی کام کرتے ہیں ان کو کم از کم آٹھ گھنٹے تو ضرور اپنے منصبی فرائض کی وجہ سے باہر رہنا پڑتا ہے تو اس وقت ان کے ننھے منّے بچے ان بوڑھوں کے ہاتھوں میں محفوظ ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ملازم ان کی دیکھ بھال کر لیتے ہوں۔ لیکن ان کو وہ محبت تو نہیں مل سکتی جو ان کو دادی اور دادا دے سکتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے بچوں کی پرورش کرنے ہی میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں، بلکہ ان بچوں کی ابتدائی تربیت میں بھی بڑا نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔

یہ کہنا کہ حکومت چونکہ ایک خاص عمر پر بلا وجہ تھوڑا ہی اپنے کارکنوں کو سبکدوش کر دیتی ہے، یہ سچ ہے لیکن کلّی حقیقت نہیں۔ وہ بوڑھوں کو اس لئے سبکدوش کرتی ہے کہ نوجوانوں کو موقع فراہم کرے۔ لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے اور عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ دوسرے لوگ ان کی خدمات حاصل کر لیتے ہیں اور ان کے علم اور تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سیاست کے میدان میں بڑے اہم فرائض انجام دیتے ہیں۔ کاروبار کی دنیا میں وہ اپنی کامیابی کے سکے گاڑتے ہیں۔ ان کے مشورے سے قومیں سرفراز ہوتی ہیں۔

●●

۳

صنعتی ترقی اور گرانی

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان نے صنعتی اور زراعتی میدانوں میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ جہاں تک صنعت کا تعلق ہے اب دنیا کے ملکوں میں ہندوستان کا نمبر ۹ واں ہے۔ زراعت میں بھی ہماری پیداوار اتنی بڑھ گئی ہے کہ اجناس کے معاملے میں ہم بڑی حد تک خود کفیل ہو گئے ہیں اور یہ معمولی بات نہیں۔

لیکن اس کا ایک منفی پہلو بھی ہے کہ ہماری اشیاء کی قیمتوں میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے جس نے ہمارے امیر طبقہ کو امیر تر اور غریب طبقہ کو غریب تر کر دیا ہے۔ چونکہ امیروں کی تعداد محدود ہے اور غریبوں کی تعداد لامحدود اس لئے خوش حالی کم اور افلاس زیادہ نظر آتا ہے۔ قیمتوں کے بڑھنے کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں گیہوں کی قیمت ایک روپیہ میں ۸ سیر تھی اور اب دو روپیہ میں ایک کیلو ملتا ہے۔ گویا یہ قیمت ۱۶ گنا ہے کیا اس زمانے میں جس آدمی کی آمدنی سو روپے تھی اب ۱۶ سو روپے ہو گئی ہے؟

یہ رہی غلے کی بات ـــــ اور اشیا کا حال اس سے بھی زیادہ خراب ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اچھے سے اچھا اونی کپڑا تین روپیہ گز ملتا تھا، آج اس کی قیمت ۲۰۰ روپیہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے قیمتوں کا تعین پیداواری قیمت کے لحاظ سے ہوتا تھا اور اب ہمارے صنعت کار آنکھ بند کر کے جو دام مناسب سمجھتے ہیں رکھ دیتے ہیں۔ چونکہ ہندوستان میں جب کوئی چیز کارخانوں میں بننے لگتی ہے تو اس کا فوری تحفظ صنعت کار اس طرح سے کر لیتا ہے کہ وہ حکومت سے اس کی درآمد پر پابندی لگواتا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ اس کی فروخت پر 'کیو' لگ جاتے ہیں۔ وہ پیداوار کو کم کر کے اس کی مانگ کو بڑھا دیتا ہے اور جو کالا بازار جنم لیتا ہے اس کے ساتھ ساتھ برابر اس کی "کوالٹی" تو خراب تر ہوتی رہتی ہے، پھر عام آدمی غیر ملکی چیزوں کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔

جب گرانی کی بات کہی جاتی ہے تو مفاد پرست فوراً غیر ملکی بازار کا حوالہ دیتے ہیں کہ یہی قیمت تو وہاں بھی ہے لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسرے ملکوں میں مزدوروں کی اجرت ہمارے یہاں سے کئی گنا زیادہ ہے۔ [اس کے علاوہ وہاں کے لوگوں کی آمدنی بھی ہم سے بہت زیادہ ہے] مثال کے طور پر بریف کیس کو لیجیے۔ کیا اس چھوٹے سے بریف کیس پر اتنا خرچ آتا ہے کہ اس کی قیمت ڈھائی سو اور تین سو روپیہ ہو؟ اس کے غیر معمولی

منافع کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ یہ فرمیں کرکٹ ٹیسٹ کے دوران لاکھوں روپے کے انعامات کا اعلان کرتی ہیں
دوران کے اشتہارات پر لاتناہی خرچ ہوتا ہے، ایسا کیوں ہے۔ دراصل وہ اپنے منافع پر غیر معمولی انکم ٹیکس کی بچت
کرتے ہیں۔ ابھی حکومت یہ اعلان کر دے کہ ان پر انکم ٹیکس کی رعایت نہ دی جائے گی۔ پھر دیکھیے ان میں کتنے کھیل
اور کھلاڑیوں سے دلچسپی لیتے ہیں۔ دراصل یہ عام لوگوں کی جیبوں سے بڑی رقم نکال کر ان میں سے بہت
معمولی رقم خرچ کرتے ہیں۔

افسوس ہے کہ حکومت بھی اس طرف توجہ نہیں دے رہی ہے کہ وہ قیمتوں کے تعین پر نظر رکھے۔ مجھے
یقین ہے کہ جو ٹیلی ویژن انگلستان میں چار ہزار میں فروخت ہوتا ہے وہ ہندوستان میں زیادہ سے ڈھائی ہزار میں مل سکتا
ہے کیونکہ ہماری مزدوری سستی اور کوالٹی ان کے مقابلے میں پست ہوتی ہے۔

گرانی کا بوجھ خوش حال طبقہ بہر حال برداشت کر لیتا ہے۔ لیکن یہ عام آدمی کی کمر توڑنے کے لیے کافی ہے۔
اگر ہمارے یہاں قیمتوں پر قابو پا لیا جائے، تو سارا ملک خوش حالی کے راستے پر چل سکتا ہے۔

●●

عنایت علی (اورنگ آباد)

یونیورسٹی امتحانات اور مسلم طلبا

موجودہ دور ایک جد جدا ور مقابلہ کا دور ہے۔ اقوام عالم کی ترقی کا اگر جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آج وہی قومیں ترقی کی دوڑ میں آگے ہیں، جن کے افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہمارے ملک میں بھی تعلیم کے میدان میں کافی ترقی ہوئی۔ نئے نئے کالجیں اور یونیورسیٹیاں قائم ہوئیں۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے بھی اس سلسلے میں بہت سا کام کیا، جس کے نتیجے میں آج ملک میں تعلیم کا تناسب کافی حد تک بڑھا ہے، جس سے انکار ممکن نہیں ہے۔

مسلمان ہندوستان کی ایک بڑی اقلیت ہیں، لیکن اعلیٰ تعلیم کے حصول میں وہ ہنوز اپنے دوسرے ہموطنوں کے مقابلے میں کافی پیچھے ہیں۔ اس تعلیمی پسماندگی کا اندازہ ہمیں ہر سال ملک کی مختلف یونیورسٹیوں کے امتحانات میں شریک ہونیوالے طلبا اور طالبات کی تعداد سے بخوبی ہوتا ہے۔ ملک کی ریاستوں میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۱۰ سے ۲۰ فیصد تک ہے۔ لیکن کالجوں اور جامعات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے مسلم طلبا کی تعداد آبادی کے اس تناسب سے بیحد کم ہے۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے جس کی طرف مسلمان متوجہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان تیزی سے ایک اَن پڑھ اور پسماندہ طبقہ میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی (حیدرآباد) نہ صرف ریاست آندھرا پردیش، بلکہ ملک کی ایک ممتاز یونیورسٹی تسلیم کی جاتی ہے۔ ماضی میں اس یونیورسٹی نے کئی ذہین اور نامور طلبا قوم کو دیئے ہیں، جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں ملک کا نام اونچا کیا ہے۔ ملک کی دوسری تمام یونیورسٹیوں کی طرح عثمانیہ یونیورسٹی بھی ہر سال انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کورسس کے امتحانوں میں، مختلف مضامین میں سب سے زائد نشانات حاصل کرنے والے ذہین طالبعلموں کو گولڈ میڈلس اور انعامات عطا کرتی ہے۔ یونیورسٹی کے امتحانات میں گولڈ میڈل کا حصول طالب علم کی زندگی کا ایک روشن پہلو ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس پر نہ صرف طالب علم بلکہ اس کے والدین، استاد، نیز سماج کا وہ طبقہ جس سے طالب علم کا تعلق ہے، بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

ہم نے ۸۱-۱۹۸۰ء / ۸۲-۱۹۸۱ء کے تعلیمی سال کے لئے عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کورسس کے امتحانوں میں عطا کیے جانیوالے گولڈ میڈل کا ایک جائزہ لیا اور اس بات کی کوشش کی کہ ان مسلم طلبا اور

طالبات کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکے جنھوں نے یہ اعزاز حاصل کیا ہے۔ لیکن مسلم طلبا کے تعلق سے جو نتائج سامنے آئے ہیں، وہ کافی مایوس کن ہیں۔

۸۱-۱۹۸۰ء میں انڈر گریجویٹ کورسیس کے لئے کل ۶۲ گولڈ میڈل دیے گئے۔ ان میڈل کے حاصل کرنے والوں میں مسلم طلبا کی تعداد صرف ۵ ہے۔ ان پانچ گولڈ میڈل میں چار میڈل فیکلٹی آف آرٹس اور ایک فیکلٹی آف میڈیسن میں ملے ہیں۔ فیکلٹی آف آرٹس کے میڈلوں میں جو میڈل مسلم طالبات نے حاصل کیے ہیں وہ اُردو، فارسی، عربی اور اسلامیات کے مضامین سے متعلق ہیں۔

۸۲-۱۹۸۱ء میں کل ۶۶ گولڈ میڈل دیے گئے۔ انھیں حاصل کرنے والوں میں مسلم طلبا کی تعداد صرف ۱۴ ہے۔ ان میڈلوں میں فیکلٹی آف آرٹس میں ۷، فیکلٹی آف میڈیسن میں ۵ اور فیکلٹی آف انجینیرنگ میں ۲ میڈل شامل ہیں۔ حسب روایت فیکلٹی آف آرٹس میں سب گولڈ میڈل طالبات نے حاصل کیے ہیں جو اُردو، عربی، فارسی، اسلامیات، سوشیالوجی اور پی لے (جنرل) کے امتحانات میں سب سے زیادہ نشانات حاصل کرنے پر ملے ہیں۔ ایک قابل ذکر چیز یہ ہے کہ فیکلٹی آف میڈیسن میں ۵ میڈل تنہا ایک مسلم طالب علم (وقارالدین مسعود) نے حاصل کیے ہیں جبکہ فیکلٹی آف انجینیرنگ میں ۲ میڈل ایک مسلم طالب علم (محمد عبدالقدوس) کو ملے ہیں۔

۸۱-۱۹۸۰ء اور ۸۲-۱۹۸۱ء میں پوسٹ گریجویٹ کورس کے لئے کل ۵۵ گولڈ میڈل دیے گئے ہیں۔ جنھیں حاصل کرنے والے خوش نصیب طلبا میں مسلم طلبا کی تعداد بالترتیب ۷ اور ۶ ہے۔

۸۱-۱۹۸۰ء میں حاصل کیے گئے ۷ میڈل میں ۵ فیکلٹی آف آرٹس اور ۲ فیکلٹی آف میڈیسن میں ملے ہیں۔ فیکلٹی آف آرٹس کے تحت ۵ گولڈ میڈل میں ۲ اُردو ۲ اسلامیات اور ایک فارسی کے مضمون سے متعلق ہے۔ میڈل حاصل کرنے والوں میں لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد بالترتیب ۴ اور ۳ ہے۔

۸۲-۱۹۸۱ء میں مسلم طلبا کے حاصل کیے ہوئے سب ہی ۶ میڈل فیکلٹی آف آرٹس کے مضامین یعنی اُردو، فارسی، اسلامیات اور پبلک ایڈمنسٹریشن سے متعلق ہیں، ان میں طالبات کی تعداد ۳ ہے۔

مندرجہ بالا نتائج کا ایک تعجب خیز پہلو یہ ہے کہ سوائے فیکلٹی آف آرٹس کو چھوڑ کر تمام دوسری فیکلٹیوں میں یعنی فیکلٹی آف سائنس، ٹکنالوجی، کامرس، سوشل سائنس، ایجوکیشن اور لا میں ایک بھی مسلم طالب علم گولڈ میڈل حاصل نہیں کر پایا ہے۔ فیکلٹی آف آرٹس میں بھی مسلم طلبا اور طالبات صرف اُردو، فارسی، عربی اور اسلامیات کے مضامین میں گولڈ میڈل حاصل کر پائے ہیں۔ جبکہ دوسرے مضامین مثلاً معاشیات، پولیٹکل سائنس، جغرافیہ، انگریزی، ہندی وغیرہ

میں مسلم طالب علموں کی کارکردگی صفر رہی ہے۔ ان نتائج کو دیکھ کر یہ خدشہ اُبھرتا ہے کہ کہیں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ذہین اور محنتی مسلم بچوں کا فقدان تو نہیں ہوگیا ہے؟ یا یہ کہ مسلم طبقہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا رجحان تو ختم نہیں ہو رہا ہے؟

ریاست اندھرا پردیش میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی سے دلچسپی رکھنے والے افراد کی کمی نہیں ہے۔ کئی ادارے ہیں جو اس کے لئے کوشاں ہیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلم طلبا اور طالبات کے یونیورسٹی ایجوکیشن کے تعلق سے کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔ میری اس ضمن میں تمام مسلم برادران سے درخواست ہے کہ وہ اس طرف توجہ دیں۔ ایک بات جس کا ہم سب کو اعتراف کرنا چاہیئے وہ یہ کہ ہر ریاست کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مسلم طلبا اور طالبات کے داخلہ کی تعداد بحد کم ہے۔ اکثر مسلم اداروں کا وجود خود خطرے میں آرہا ہے۔ اس کا بڑا سبب مسلمانوں کی معاشی بدحالی اور اپنی اولاد کی تعلیم سے ان کی عدم دلچسپی ہے۔ آج کے دور میں تعلیم پہلے کی بہ نسبت سستی اور آسان ہے۔ حکومت نے بہت سی سہولتیں دے رکھی ہیں جس سے فائدہ اٹھانا عوام کا کام ہے۔ مثال کے طور پر مہاراشٹر میں جون ۱۹۸۳ء سے لڑکیوں کے لئے ایس ایس سی تک کی تعلیم پوری ریاست میں مفت کردی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا انقلابی اقدام ہے جس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ لیکن میں نے ایسے بھی مسلمان دیکھے ہیں جنھوں نے حکومت کے اس اقدام کو سراہنے کے بجائے اسے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا ہے۔

ہندوستان کا تہذیبی اور معاشرتی ڈھانچہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ آئندہ چند برسوں میں سماج کا وہی طبقہ بے مثال ترقی یافتہ اور طاقتور ہوگا جس کے افراد بشمول خواتین زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں گے۔ مسلمانوں کی معاشی، تہذیبی اور سیاسی بقا کے لئے اعلیٰ تعلیم کا حصول آج کی اوّلین ضرورت ہے اور اس کے لئے ہر مسلمان کو انفرادی اور اجتماعی طور پر کوشش کرنا ہے اور مسلم والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم پر ضروری توجہ دیں اور روایتی مضامین کے بجائے انھیں سائنس، کامرس، میڈیسن، ٹکنالوجی، انجینئرنگ اور ایسے دوسرے مضامین جن کی آج زیادہ مانگ ہے، پڑھنے پر راغب کریں۔

اجتماعی طور پر اس بات کی کوشش ضروری ہے کہ ہر تعلیمی سال کے آغاز میں زیادہ سے زیادہ مسلم بچے اور بچیوں کو پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول میں شریک کیا جائے، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مسلم طلبا اور طالبات کے داخلہ کا تناسب بڑھایا جائے، ایس ایس سی بورڈ اور مقابلے کے امتحانات کے لئے ہر بڑے شہر میں خاص کوچنگ کا انتظام کیا جائے۔

آج ملک میں مسلمانوں کی کئی مذہبی، سماجی اور سیاسی جماعتیں ہیں۔ کانگریسی اور غیر کانگریسی مسلمان

ہیں۔ ان میں ہر ایک کے اپنے اپنے علاقے ہیں۔ جہاں ان کا کافی اثر ہے۔ میری ان سب لیڈروں سے درخواست ہے۔ کہ وہ بھی اس طرف توجہ دیں اور مسلم سماج میں تعلیمی پسماندگی کو دُور کرنے میں عملی جدوجہد کریں۔ یہ ملک کی اور خود ان کی اپنی جماعت کے لئے ایک بڑی کامیابی ہوگی۔

آخر میں، میں ان تمام مسلم افراد اور مسلم اداروں سے جنھیں مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کے کاز سے دلچسپی ہے اور جو مسلم معاشرہ کو ایک تعلیم یافتہ معاشرہ دیکھنا چاہتے ہیں، ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ کل ہند سطح پر ہمیں ایک ایسے ادارے کی سخت ضرورت ہے جو ملک کی مختلف ریاستوں کے ایس ایس سی بورڈ اور یونیورسٹیوں کے امتحانات میں داخلہ لینے والے مسلم طلبا اور طالبات کی تعداد کا جائزہ لیتا ہے اور ہر سال اس میں جو کمی بیشی ہو رہی ہے، اس کا اندازہ لے اور اس کے تعلق سے اعداد و شمار اخبارات میں شائع کرے۔ ابھی تک صرف چند اشخاص ہی نے اس طرف توجہ دی ہے اور اپنی انفرادی کوششوں کی بنا پر بعض اسکولوں اور کالجوں کے نتائج کا جائزہ لیا ہے۔ اگر مسلم پرسنل لا بورڈ، مرکزی مسلم مجلس مشاورت، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی وغیرہ اس کام کو اپنے پروگراموں میں شامل کرلیں، تو یہ ملک و ملت کی ایک بڑی خدمت ہوگی۔

●●

نواب زادہ ابن سعید خاں
راحت منزل، میرس روڈ، علیگڑھ

نواب چھتاری : میرے باپو

کیا لکھوں، کیسے لکھوں، کس پر مضمون لکھوں۔ قلم اٹھاتا ہوں، دماغ ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ دماغ پر زور دیتا ہوں، ہاتھ کی انگلیاں قلم اٹھانے سے انکار کر دیتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک بیٹا اپنے باپ پر کیا مضمون لکھے۔

نواب صاحب کی ذات کا جہاں تک تعلق ہے میں کلر بلائنڈ (colour Blind) ہوں۔ مجھے ایک ہی رنگ نظر آتا ہے۔ میں ایک ہی رنگ دیکھتا ہوں اس میں کسی قسم کی کمی یا جھول نہیں پاتا۔ ان کے محاسن و اخلاق ان کا سیاسی کردار، ان کی سوشل زندگی اس پر قلم فرسائی کرنا یہ میرا میدان نہیں۔ یہ میرے لیے مناسب بھی نہیں۔ اس پر تنقید و تبصرہ ہوگا۔ مضامین لکھے جارہے ہیں، لکھے جاتے رہیں گے۔ ہاں میں ان کی خانگی زندگی کے متعلق اپنے تاثرات پیش کرتا ہوں۔

دنیا نواب حافظ سر احمد سعید خاں کو نواب چھتاری کے نام سے جانتی تھی اور ہمیشہ اسی نام سے جانتی رہے گی۔ پارلیمنٹ میں ان کے انتقال پر جو تعزیتی پیغام پڑھا گیا وہ ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے:

"نواب احمد سعید خاں جو نواب چھتاری کے نام سے معروف تھے، جنوری ۱۸۸۹ء میں باقچرہ (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ موصوف نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔"

لیکن ان کے بچے انھیں باپو کہا کرتے تھے۔ وہ میرے باپ تھے، وہ میرے باپو تھے۔ باپو نے اپنی سوانح حیات "یادِ ایام" لکھی ہے۔ میں بھی آج اپنے ماضی کو یاد کر رہا ہوں:

اے آنسو نہ کہ یہ یادِ ایامِ گزشتہ ہے ⁂ مری عمرِ رواں کو عمرِ رفتہ کا سلام آیا

۱۹ جنوری کی صبح مجھے کیا معلوم تھا کہ آج سورج شام ہونے سے پہلے ہی غروب ہو جائے گا۔ آج کا دن چھتاری کے گھر کے لیے ایک عظیم المیہ ثابت ہوگا۔ ایک ایسا عظیم انقلاب آنے والا ہے کہ ایک صدی پلٹ کر رکھ دے گا۔ چھتاری کے گھر کی نمود و شہرت، مال و دولت، عزت و خوشی و مسرت سب ایک شخص کی ذات کے

ساتھ ختم ہو جائے گی اور یہی ہوا۔ ۹۳ سال اختتام کو پہنچے اور ۹۴ سال شروع ہوا چاہتا تھا کہ چھتاری کی
تاریخ کے اوراق یک لخت پلٹ گئے اور اس طرح ایک صدی کا باب ختم ہوا۔ فسبحٰن الذی بیدہٖ
ملکوت کل شیء و الیہ ترجعون - (پاک ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں ہر ایک شئے کی سلطنت ہے
اور سب شئے اسی کی طرف واپس ہونگی) میری زندگی کے ۵۹ برس باپو کے ساتھ گزرے۔ میری والدہ
کا انتقال سنہ ۲۳ء میں ہوا جب میں صرف ایک ماہ کا تھا۔ میں نے باپو میں ماں اور باپ کی شفقت اور محبت
کو پایا۔ ان میں ماں جیسی تڑپ، محبت، ایثار قربانی اور اس کے ساتھ باپ کا ڈسپلن،
کبھی سختی کبھی نرمی، اصلاح و مشورہ، نظم و نسق موجود تھا۔ سارے گھر کے معاملے میں امر بالمعروف و نہی
عن المنکر پر پورا عمل فرماتے تھے۔ باپو کو اپنے سب بچوں سے انتہائی محبت تھی اور حقیقت میں کوئی
یہ نہیں کہہ سکتا کہ باپو اور اپنے بہن بھائیوں کے مقابلے میں اس سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کے
بچوں کے ساتھ اسی طرح محبت و شفقت فرماتے تھے جس سے ان کے پوتے اور پوتیوں کو یہ گمان ہو چلا تھا کہ
باپو اپنے بچوں سے زیادہ اپنے بچوں کے بچوں سے محبت کرتے ہیں۔ جب کبھی سفر سے تشریف لاتے چھوٹے بچوں
کے لیے مٹھائی یا کھلونے ضرور لاتے اور سب سے پہلے جو سب سے زیادہ چھوٹا ہوتا اس کی طرف توجہ دیتے۔ باپو
مجھ سے فرمایا کرتے تھے "چھوٹے بچوں کی طرف سب سے پہلے توجہ دینی چاہیئے کہ بڑے حساس ہوتے ہیں اگر ان
کی طرف توجہ نہ دی جائے، تو ان میں حسد اور نفرت کی حس پیدا ہو جاتی ہے، جو آئندہ زندگی میں ان کے کردار
پر اثر ڈالتی ہے۔

میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اپنے بہن بھائیوں میں باپو کے ساتھ سب سے زیادہ میں قریب رہا۔ سب سے زیادہ
ان کی خدمت کرنے کے مواقع مجھے نصیب ہوئے اور ظاہر ہے کہ ان کی محبت اور دعائیں مجھے نصیب ہوئیں۔

باپو نے میری ابتدائی تعلیم و تربیت کی۔ اس کے نشیب و فراز سمجھائے، صلاح و مشورہ دیا، میری
غلطیوں کی اصلاح فرمایا کرتے تھے اور خطا پر ڈانٹ دیتے تھے۔ اگر کوئی اچھی بات ہوتی اس کی تعریف بھی اتنی
ہی فرماتے اور اب آخیر زمانے میں مجھ سے اکثر فرمایا کرتے کہ "ابن میاں میں تمہاری آنکھوں سے دیکھتا ہوں
تمہارے کانوں سے سنتا ہوں۔ تمہارے سہارے چلتا ہوں تم میرے لئے 'عصائے پیری' ہو"۔

سنہ ۲۳ء میں میری والدہ کے مرجانے کے بعد ہم تینوں بھائی باپو کے کمرے میں سویا کرتے تھے۔ مجھے نینی تال
میں بروک ہل میں رہنا آج بھی یاد ہے جو اس وقت ہم عمر کی قیام گاہ ہوا کرتی تھی۔ رات میں کبھی اٹھ کر بھی

رضائی لحاف اڑھاتے ۔ دیکھتے کہ موسم کے لحاظ سے ہم گرم کپڑے پہنے ہوئے ہیں یا نہیں۔ اگر ہم بیمار پڑ جاتے، رات بھر جاگ کر دیکھ بھال کرتے تھے۔ تھرمامیٹر لگا کر خود بخار دیکھتے، نبض گنتے" اور یہ سب کچھ اس وقت ہوتا تھا جب کہ وہ برٹش گورنمنٹ کے زمانے میں "ہوم ممبر" تھے۔ دن بھر حکومت کے فرائض انجام دیتے اور فرصت ملنے پر گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کرتے۔

میری ماں کے انتقال کے بعد باپو کی شادی میری خالہ سے ہوئی جن کا انتقال سنہ ۷۱ء میں ہوا۔ بڑی ناحق شناسی ہوگی، اگر میں یہ اعتراف نہ کروں کہ میری پرورش میری خالہ اور جو ماں بھی تھیں ان کے ہاتھوں ہوئی۔

مجھے یاد ہے کہ ۳۷ء میں جبکہ باپو چیف منسٹر تھے (یوپی کے سب سے پہلے چیف منسٹر وہی تھے) میں بیمار تھا مجھے اس زمانہ میں بخار رہنے لگا تھا۔ میرے پاؤں میں چوٹ آئی۔ غالباً سیپٹک ہوگئی تھی۔ وہ علی گڑھ سے لکھنؤ تشریف لے جا رہے تھے۔ کان پور کے اسٹیشن پر ریل بدلنی تھی میں چوٹ کی وجہ سے چلنے سے معذور تھا۔ باپو نے مجھے اپنی گود میں لے لیا۔ اس وقت میری عمر ۱۳ برس تھی اور اس طرح ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پر لے کر چلے۔ اسٹیشن ماسٹر کو اطلاع پہنچی کہ یوپی کا چیف منسٹر ایک بچے کو گود میں لے کر پل کراس کر رہا ہے۔ وہ کرسی لے کر پہنچا اور باپو سے کہا کہ وہ تکلیف نہ کریں اور بچے کو اس پر بٹھا دیں۔ مجھے یاد ہے کہ باپو نے کہا کہ "میں اپنے بچے کو گود میں لیے جا رہا ہوں اس سے چیف منسٹری کے عہدے پر کیا اثر پڑتا ہے۔"

سنہ ۵۵ء میں باپو پارلیمنٹ کے وفد کو لے کر فن لینڈ کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ کانفرنس کے بعد وفد تو ہوائی جہاز سے ہندوستان واپس ہوا لیکن باپو میری وجہ سے ڈیڑھ ماہ ٹھہرے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں یورپ اچھی طرح دیکھ لوں شاید مستقبل میں میرے نصیب میں نہ ہو۔ ہم نے سوئیڈن، ڈنمارک، جرمنی، ہالینڈ، فرانس، انگلستان، مصر، عدن اور کراچی دیکھا۔ سفر کی نوعیت اس طرح رہی کہ ہوائی جہاز سے سفر، پانی کا سفر اور بس کے ذریعہ سفر۔ اور یہ سب کچھ باپو نے اس لیے کیا کہ میں کسی چیز کے تجربے اور لطف سے محروم نہ رہوں۔ پورٹ سعید سے قاہرہ گئے۔ قاہرہ کی تمام مشہور چیزیں دیکھیں۔ اہرام دیکھنے گئے۔ باپو نے مجھے اہرام کے اندر جانے نہیں دیا فرمانے لگے کہ ان کے اندر کی ہوا زہریلی ہوتی ہے۔ ہم سیر و تفریح کے لیے آئے ہیں یا موت کو گلے لگانے۔ ہمارے ہمسفر ایک پاکستانی تھے۔ انہوں نے مجھے ترغیب دی کہ نائٹ

کلب چلنا چاہیئے۔ باپو نے جب تنہا مجھ سے علیحدہ بُلا کر کہا "تم ہرگز مت جانا۔ یہ جگہ تہذیب و اخلاق پر بُرا اثر ڈالتی ہے۔" میں نے اپنے دوستوں سے معافی مانگ لی۔

جب ہمارا قیام سوئزر لینڈ میں ہوا، ایک شب میری طبیعت خراب ہوگئی۔ میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ کسی کے قدموں کی آواز راہگذر میں سُنی اور وہ آواز میرے دروازہ پر آکر رُکی اور کچھ ہی دیر بعد میں نے وہ قدم واپس جاتے سُنے۔ اس وقت شب کا ڈیڑھ بجا تھا۔ صبح جب دروازہ میں نے کھولا تو باپو کا رکھا ہوا 'جگ' ملا۔

باپو کا یہ طرز صرف میرے ہی ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ ان کا یہ رویہ اپنے سب بچوں کے ساتھ تھا۔ جاوید، ہمایوں، فرخ ان کے پوتے ان کے کمرے میں سویا کرتے تھے۔ شب میں جب کسی بچے کا پلنگ خالی پاتے، بچوں کے پڑھنے کے کمرے میں انھیں دیکھ آتے اور یہ عمل ان کا اس وقت تھا جبکہ وہ نوّے برس کی عمر سے گزر رہے تھے۔

سنہ ۴۵ء میں، میں نے بی۔ اے پاس کیا۔ میں نے باپو سے خواہش کی کہ وہ مجھے ملازمت دلوادیں، وہ اس وقت وزیر اعظم حیدرآباد تھے۔ ان کے بعض خطوں کے تراشے پیش کر رہا ہوں:-

"تمہارا محبت نامہ مورخہ ۱۲ فروری باعث مسرت ہوا۔ تمہارے خط سے مجھے خوشی اور رنج دونوں ہوئے۔ میرا ذہن تو مسرور ہوا لیکن میرے دل کو تکلیف پہنچی۔ مجھے خوشی اس پر ہوئی کہ تمہیں اپنے مستقبل کی فکر ہے اور تمہیں اس کا اندازہ ہے کہ تمہارا مستقبل تمہارے ماضی کی طرح محفوظ اور بے فکری کا نہ ہوگا۔ لیکن والدین کے دل میں جو یہ فطری جذبہ ہوتا ہے کہ ان کی اولاد کو کسی طرح کی کوئی فکر نہ ہو، اسی جذبہ کے تحت مجھے یہ معلوم ہو کر تکلیف ہوئی کہ تم اپنے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہو۔

"میرے عزیز فرزند! مندرجہ ذیل اسباب کی بناء پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہارا مستقبل تابناک ہے:

"تمہیں اپنے مستقبل کی فکر ہے، یہ احساس ہی اس کی ضمانت ہے کہ تمہارا مستقبل تابناک ہوگا۔ جو لوگ مستقبل سے لاپرواہی برتتے ہیں انھیں آگے چل کر طرح طرح کے مصائب برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن جو لوگ مستقبل کا خیال رکھتے ہیں، پروردگار ان کے لیے سیکڑوں راہیں کھول

دیتا ہے۔ عزم کا وجود کامیابی کی راہ تلاش کر لیتا ہے۔"

" محض ملازمت ہی ذریعۂ معاش نہیں ہے۔ اگر تم میری رائے جاننے کے خواہش مند ہو تو میں بے تکلف یہ کہوں گا کہ ملازمت زیادہ سے زیادہ ایک معمولی ذریعۂ معاش ہے۔ اس کے بجز اور کچھ نہیں۔ ایسے دوسرے متعدد ذرائع معاش ہیں، جو اس سے کہیں زیادہ نفع بخش اور پُر لطف ہیں۔ لہٰذا تم اس بارے میں زیادہ فکرمند نہ ہو۔ مجھے یقین کامل ہے کہ سب بحسن و خوبی طے ہو جائے گا۔ یاد رکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ مستقبل سے لاپرواہی مت برتو اور اپنے اخراجات کو اپنی آمدنی سے زیادہ مت بڑھنے دو۔ تمہاری آمدنی جو کچھ بھی ہو اس کا کم از کم دس فی صدی ضرور پس انداز کرو۔ مثلاً تمہاری آمدنی ۱۰۰ روپے ہو تو اپنے اخراجات کو ۹۰ روپے سے زیادہ نہ ہونے دو۔ انسان کو اپنی آمدنی کا کم از کم دس فیصد حصہ ضرور پس انداز کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی اس پر عمل پیرا نہیں ہوتا تو معاشی مشکلات اس کا مقدر بن جاتی ہیں۔"

اس خط میں باپو نے مجھے آمدنی اور اخراجات میں میانہ روی کی نصیحت کی ہے۔ یہ خود ان کا مزاج تھا۔ اخراجاتِ بیجا سے پرہیز اور ضرورت پر فراخدلی سے صرف۔ غلام محمد صاحب مرحوم جو بعد میں گورنر جنرل پاکستان ہوئے، اس وقت حیدرآباد میں نواب صاحب کی کیبنٹ میں وزیر مالیات تھے۔ ایک بار مالیات کے مسئلے پر نواب صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے غلام محمد صاحب نے کہا کہ نواب صاحب مالیات میں آپ کی پالیسی یہ ہے کہ پتلون پر بیلٹ باندھو اور Braces لگاؤ تاکہ پتلون کسی حالت میں گرنے نہ پائے۔ نواب صاحب بہت ہنسے اور کہنے لگے "غلام محمد صاحب آپ نے بالکل صحیح سمجھا۔ میں ہمیشہ اسی پر عمل کرتا آیا ہوں۔ لیکن آپ کی پالیسی مالیات میں یہ ہے کہ ایک منہ زور گھوڑے پر آپ سوار ہیں۔ گھوڑا نالے گڑھے کودرہا ہے۔ سامنے خندق ہے ہو سکتا ہے کہ کود جائے، یا پھر اس کی ٹانگ ہی ٹوٹ جائے۔"

اس وقت مجھے ایک پُر لطف واقعہ یاد آگیا۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں یورپ کے سفر میں میں اور باپو لیغ لبس سے سوئیڈن سے روانہ ہوئے تاکہ مختلف ممالک بس کے سفر سے دیکھیں۔ ہمسفر ایک یورپین تھے۔ میں نے دیکھا وہ واقعی پتلون پر بیلٹ بھی لگائے ہوئے تھے Braces بھی لگائے ہوئے تھے۔ میں نے باپو کو

اس طرف متوجہ کیا اور کہا کہ یہ شخص آپ کے مالیات کے اُصول پر پورا عمل کرتا ہے، پتلون کسی طرح گرنے نہ پائے۔ باپو بہت ہنسے اور فرمانے لگے "دیکھا میاں، یہ ہے ایک شخص"

سنہ ۱۹۴۴ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کرکے میں بی ایل اے میں آیا۔ یونیورسٹی کے پراکشیل امتحان میں حاضر ہونا چاہتا تھا۔ میں نے باپو کو لکھا اُن کا مشورہ اور اجازت طلب کی۔ ان کے جواب سے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو کس طرز پر دنیا میں چلانا پسند فرماتے تھے۔

"تمہارے خیالات اور ردِ عمل سے واقفیت میرے لیے ہمیشہ باعث مسرت ہوتی ہے۔ میں تم سے ہرگز ناراض نہیں۔ لیکن جو امر میری ناپسندیدگی کا موجب ہوا وہ یہ تھا کہ تمہارا نصب العین زیادہ سے زیادہ خدمتِ خلق ہونا چاہیئے۔ میں تم کو تنبیہ کرتا ہوں کہ تم یونیورسٹی کا ایسا کوئی عہدہ قبول نہ کرو جس سے عہدہ پر ہونے کے لئے تمہیں طاقت کا استعمال کرنا پڑے) کارروائی کرنا پڑے اور دوسروں کی شکایات کرنا پڑے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اگر تمہارے پاس مقصد خدمتِ خلق ہے تو تمہارے دوستوں اور مخلصین کا دائرہ وسیع تر ہوتا جائے گا۔ برخلاف اس کے اگر تمہاری ذمہ داری محض دوسروں کے خلاف تعزیری کارروائی کرنا ہے، تو تمہارے نئے نئے دشمن پیدا ہوں گے۔ مجھے یہ ہرگز پسند نہیں کہ تمہارے دشمنوں کی تعداد میں حتی الامکان کسی طرح کا بھی اضافہ ہو آج کے دور میں دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنا بڑا مشکل ہے"

باپو نے طے کر ہی لیا تھا کہ میرا مستقبل ان کی خدمت کرنا ہوگا اور اسٹیٹ کے کاموں کو سرانجام دینا۔ اور پھر یہی ہوا۔ میں نے اپنی زندگی ان کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ اس سلسلے میں باپو کے خط کی نقل پیش ہے:۔

"مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ انتظام جائداد اور پڑھائی کے بار کے باعث تم جسمانی طور پر بہت کمزور ہو گئے ہو۔

مجھے اس بارے میں سخت تشویش ہے۔ تمہیں خود بھی اس کا اندازہ ہوگا کہ جسمانی کمزوری سے بڑھ کر کوئی اور چیز تمہارے لئے خطرناک نہیں ہے۔ لہٰذا میں تم سے اصرار کے ساتھ کہتا ہوں کہ تم بہت زیادہ وقت پڑھائی کی نذر نہ کرو۔ ستمبر امتحان میں ضرور شریک ہو اور معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔ اگر تم کامیاب ہو گئے، تو ظاہر

مجھے مسرت ہوگی، لیکن اگر تم ناکام بھی ہوئے تو مجھے اس کا قطعاً ملال نہ ہوگا۔ جب یہ طے ہو گیا ہے کہ تم امور جائداد کی نگرانی کرو گے تو تمہارا بی۔اے میں کامیاب یا ناکامیاب ہونا اس ضمن میں بالکل غیر متعلق ہے۔ اس کے علاوہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ان ڈگریوں کی فی نفسہٖ کوئی اہمیت ہے۔ اگر تمہارا یہ نظریہ ہے تو تم غلطی پر ہو۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے تو پھر اپنے والد کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے جو ڈگریوں سے ہمیشہ اس طرح دور رہا جیسے کوئی شخص زہریلے سانپ سے دور رہتا ہے۔

"پیارے ابن[1]! جو امر واقعی اہم ہے، وہ ہے تربیت یافتہ اور مہذب ذہن، افراد، اشیاء اور کرداروں سے بخوبی واقفیت ہے۔"

1- I am sorry to learn from your letter that you have been weak an account of your studies and the work of your estate. I take a very serious view of this. you Know there can be nothing more injurious for you than to become weak. Therefore, I urge upon you not to give too much. time to your studies. you may sit for the Examination and leave it to God. If you Pass it, it is well and good; if you do not, I will not be sorry at all, we have decided that you are to work with me and the Estate. Then it does not matter at all whether you have passed your B.A. or not, as it will be of no use in your Esatate work. Besides this, do you really think that these degrees have any intrinsic value?, if you do so, you are very badly mistaken, and if you do so what do you think of your father who avoided degrees as if one should avoid a poisonous snake. Dear Ibban, what really matters is a cultured mind and real Knowledge of men, things and characters."

(Letter dated 20th March, 1945 - Hyderabad)

ایک دفعہ مجھے نصیحت فرماتے ہوئے اپنے خط میں لکھا۔

"ضروری ہے تم پر کہ ان معاملات میں تم نے خود اپنی رائے کا استعمال کیا۔ حالانکہ یہ معاملات کچھ زیادہ اہم نہ تھے، لیکن قوت فیصلہ کا استعمال دوسروں کی نگاہ میں تمہاری قدر و منزلت بڑھا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے انسان کے اندرون کا اندازہ ہوتا ہے۔ تمہاری خاندان کی امتیازی خصوصیات ہیں دریادلی اور خوش خلقی۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ تم نے اپنی خاندانی روایات کی پاسداری کی۔ خدا تمھیں درازی عمر عطا فرمائے اور تم اپنے والدین اور اپنے خاندان کے لئے ہمیشہ باعث فخر و مسرت بنے رہو۔"

سنہ ۱۹ اکتوبر ۷۰ء کے خط میں باپو نے مجھے اس طرح نصیحت فرمائی کہ:

"اس زمانے میں ہر شخص مختلف قسم کی پریشانیوں میں مبتلا ہے اگر ان پریشانیوں سے نجات دلانے کے لئے حسب مقدرت کسی کی کچھ امداد ہو سکے تو اچھا ہے۔ وقت گزرتا جاتا ہے لیکن بات باقی رہتی ہے۔"

باپو حیدرآباد سے نومبر ۴۸ء میں واپس ہوئے اور پھر اُن کا علی گڑھ میں زیادہ قیام رہنے لگا۔ مسلم یونیورسٹی کے پرو چانسلر اور پھر چانسلر مقرر ہوئے۔ باپو کو یونیورسٹی سے والہانہ عشق تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں یونیورسٹی کے معاملے میں colour blind ہوں۔ مجھے ایک ہی رنگ نظر آتا ہے اور وہ اچھائی کا۔ ۶۵ء میں میں خود یونیورسٹی کورٹ کا ممبر تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب نواب علی یاور جنگ وائس چانسلر تھے۔ نواب صاحب کا انتخاب چانسلر کی حیثیت سے ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ نواب صاحب نے بحیثیت چانسلر پہلی تقریر جو مسلم یونیورسٹی کورٹ میں کی وہ یہ تھی کہ: آپ نے مجھے چانسلر منتخب کرکے میری بڑی عزت افزائی فرمائی ہے۔ یوں تو میں جب گورنر تھا تو یوپی کی یونیورسٹیوں کا چانسلر تھا، حیدرآباد میں وزیر اعظم کی حیثیت سے عثمانیہ یونیورسٹی کا چانسلر تھا لیکن وہ سب اپنے عہدہ کی رعایت سے تھا لیکن اس ادارہ کا جس کا کہ میں خود طالب علم رہا ہوں چانسلر منتخب ہونا میرے لئے باعث عزت و افتخار ہے۔ چانسلر شپ تو بہت بڑی چیز ہے۔ آپ نے اگر اس یونیورسٹی کی جامع مسجد کی جاروب کشی بھی دی ہوتی تو میں اس کو خوشی کے ساتھ قبول کر لیتا۔"

باپو یونیورسٹی کے ہر فنکشن میں بڑی پابندی سے شرکت فرماتے اور دوسرے پروگرام کو پس پشت ڈال دیتے۔ وائس چانسلر کا ادب بہت ملحوظ رکھتے تھے، وہ فرمایا کرتے تھے "وائس چانسلر سید کا جانشین ہوتا ہے"۔

اب تین چار برس سے ان کی آواز گر گئی تھی۔ تقریر کرنے سے گریز فرمایا کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی سہارے سے آہستہ آہستہ چل کر صدارت اور شرکت فرمایا کرتے تھے۔ انھیں خیال ہو چلا تھا کہ ان کی زندگی کے اختتام کے دن قریب آتے جا رہے ہیں۔ آخری فنکشن ۲ اکتوبر سنہ ۸۰ء گاندھی جینتی میں شرکت فرمائی۔ پروگرام میں ان کی تقریر نہ تھی پروفیسر صاحب وائس چانسلر کے عہدہ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ نواب صاحب نے کہا کہ وہ تقریر فرمائیں گے۔ بابو نے شروع کے الفاظ یاد ہیں " شاید یہ میری آخری تقریر ہے۔ شاید آخری بار آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ زندگی کا کیا بھروسا۔ پھر یہ شعر بے ساختہ پڑھا :

چمن سے رخصت فانی قریب ہے شاید ؛ کہ اب کے بوئے کفن دامن بہار میں ہے

اور ہوا بھی یہی۔ پھر بابو یونیورسٹی کے کسی فنکشن میں شریک نہ ہو سکے۔ کوئی نہ کوئی علالت پیش آتی رہی۔

بابو کو اسکاؤٹنگ سے ہمیشہ لگاؤ تھا۔ تقسیم ملک سے پہلے وہ چیف کمشنر آف انڈیا تھے۔ ۱۹۳۷ء میں اس کی کانفرنس دہلی میں ہوئی تھی۔ اگرچہ میں بہت نو عمر تھا۔ مگر مجھے اس میں شریک ہونا یاد ہے۔ یونیورسٹی کے اسکول میں اسکاؤٹنگ کا رواج تھا۔ میں خود بھی اسکاؤٹ رہا ہوں۔ مجھے کئی دفعہ وکٹوریہ گیٹ کے سامنے ڈنڈے ہاتھ میں لئے یونیورسٹی کے مہمانوں کا خیر مقدم کرنا یاد ہے۔ اس آل انڈیا جمبوری میں بانی (اسکاؤٹ) تحریک لارڈ بیڈن پاول اور چیف اسکاؤٹ آف انڈیا لارڈ لنلتھگو (وائسرائے ہند) کی تشریف آوری یاد ہے۔ بابو خاکی رنگ کا صافہ باندھے اور اسکاؤٹ ڈریس پہنے تھے۔ بابو کو اسکاؤٹنگ کا سب سے بڑا میڈل سلور وولف (SILVER WOLF) اور ہاتھی (ELEPHANT) ملا۔ ملک کی آزادی کے بعد اسکاؤٹ تحریک دھیمی پڑ گئی اس لئے کہ بہت سی اس طرح کی تحریکیں شروع ہو گئی تھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ اس کے روح رواں تھے انھوں نے انتھک کوشش شروع کر دی۔ بابو جی حسن علی جعفری صاحب چیف جسٹس و یاس دیو مصرا صاحب اور مصر افضلی نے اس تحریک میں تازہ روح ڈال دی۔

بابو چیف اسکاؤٹ آف انڈیا (chief scout of India) ہو گئے۔ صدر جمہوریہ اس کے (PATRON) ہوئے اور اس اسکاؤٹ تحریک نے پھر اُبھر کر اپنا مقام حاصل کر لیا۔

بابو کی دیرینہ خدمات کو زندگی دینے کے لئے جعفری صاحب اور چیف جسٹس مصرا صاحب نے ایک عمارت اوکھلا میں تعمیر کرائی جس کا نام "چھتاری ہٹ" رکھا۔ اس کا سنگ بنیاد ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

صدر جمہوریہ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھا۔ چھتاری ہٹ کے افتتاح کی رسم مسز گاندھی، وزیراعظم نے فرمائی۔ اس چھتاری ہٹ نے نواب صاحب چھتاری کے نام کو اسکاؤٹنگ میں زندہ جاوید بنا دیا۔ غالباً اس کا ذکر کرنا لطف سے خالی نہ ہوگا کہ چھتاری ہٹ کمیٹی کے چیرمین کرنل بشیر حسین زیدی صاحب ہیں۔

ایک بار کرنل زیدی صاحب باپو سے "چھتاری ہٹ" کی تعمیر کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "نواب صاحب آپ نے اب تک تین ہٹ سنی ہوں گی۔ راج ہٹ، بالک ہٹ، تریا ہٹ۔ یہ چوتھی چھتاری ہٹ قائم ہوئی ہے" زیدی صاحب کے الفاظ اگرچہ مذاق اور لطیف پیرائے میں تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت بن گئے۔ سنگ بنیاد صدر جمہوریہ نے رکھا۔ راج ہٹ شامل ہوگئی۔ اس کی افتتاح کی رسم وزیر اعظم مسز گاندھی کے دست مبارک سے ہوئی۔ تریا ہٹ شامل ہوگئی۔ اسکاؤٹ تو بالک ہیں۔ بالک ہٹ موجود ہے۔ جب یہ تینوں ہٹ شامل ہوگئیں تو انشاء اللہ چھتاری ہٹ قائم ہوگئی۔

۵۶ء میں باپو بحیثیت پرو چانسلر یونیورسٹی کا وفد لے کر سعودی عرب گئے۔ شاہ سعود نے دس لاکھ روپیہ میڈیکل کالج کے لئے عطا فرمایا۔

میں باپو کی خدمت میں ساتھ تھا۔ مکہ مکرمہ میں باپو کے دادا (نواب محمود علی خاں صاحب) کا خرید کیا ہوا ایک مکان تھا، جو توسیع حرم میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کا معاوضہ ڈھائی لاکھ ریال ملا جو مکہ یونیورسٹی کی تعمیر میں نذر کئے۔ یہ رقم پنڈت جواہر لال نہرو آنجہانی وزیر اعظم کے خط کے ساتھ شاہ سعود کی خدمت میں بھیجی گئی۔ باپو نے مجھ سے کہا کہ "ذاتی اخراجات کم کرو اور پبلک میں داد و دہش بڑھاؤ، خدمت خلق بہتر ہے اس سے کہ اپنی ذات پر صرف کرو اور خود غرض اور بخیل کہلاؤ۔"

۵۷ء میں باپو حج کے فریضہ سے سبکدوش ہوئے۔ سفر میں، میں تو خدمت میں تھا ہی لیکن میری والدہ میری چھوٹی بہن اور میرا چھوٹا بھائی بھی ساتھ گئے تھے۔

میں ہمیشہ باپو کے ساتھ سفر میں رہا ہوں۔ تنہائی ہوتی تھی کتنی باتیں وہ مجھ سے کرتے تھے کتنے نشیب فراز سمجھاتے تھے۔ گھر کی باتیں سیاست کے طور و طریق سوشل لائف، اخلاقیات، مذہب، غرض کوئی مضمون ایسا نہ تھا جس پر انہوں نے گفتگو نہ کی ہو اگر میں باپو پر مضمون لکھنے بیٹھوں تو ایک کتاب تیار کر سکتا ہوں۔

اکثر باپو فرمایا کرتے تھے کہ جب تم کسی دعوت میں جاؤ کسی فنکشن میں پہنچو تو وقت کی پابندی کرو مقررہ وقت سے دو منٹ پہلے پہنچنے کی کوشش کرو، یاد رکھو اگر تم مہمان خصوصی ہو اور دیر میں پہنچو گے تو اس سے میزبان

اور مہمانوں کو انتظار کی تکلیف ہوتی رہے گی۔ اگر تم مہمانوں میں شریک ہوا اور دیر سے پہنچے تو جو لوگ پہلے سے پہنچے ہیں وہ اگلی نشستوں پر بیٹھ چکے ہوں گے اور تمھیں سب سے پیچھے جگہ ملے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو نگاہیں تمھیں آگے دیکھنے کی عادی ہیں وہ تمھیں پیچھے دیکھنے کی عادی ہو جائیں گی۔" باپو نے ایک دفعہ فرمایا کہ "جب تم ترقی کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوگے تو تم بہت سے لوگوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے چڑھوگے لیکن جب تم اترو گے تو پھر ایک بار ان ہی لوگوں سے ہاتھ ملانا ہوگا۔ لہٰذا ایسا طرز رکھو کہ تمھیں واپسی پر شرمندگی نہ ہو" فرمانے لگے "بیٹا میں نے کبھی حکومت کا بیجا استعمال نہیں کیا۔ جب ہوم ممبر تھا جب یو پی کا چیف منسٹر تھا جب گورنر ہوا اور پھر وزیر اعظم حیدرآباد ہوا؟ اس کا ہمیشہ خیال رکھا کہ جب کسی کا معاملہ میرے سامنے آیا، میں نے خلاف فیصلہ کرتے ہوئے بھی جتنی ممکن رعایت اس کے ساتھ برت سکتا تھا بغیر سفارش کردی اور کبھی کسی کے ساتھ ذاتی عناد نہیں برتا۔ یاد رکھو آج کرسی پر ہو، کل کرسی پر نہیں بھی ہوگے۔"

یہاں مجھے ایک واقعہ حیدرآباد کا یاد آگیا۔ باپو جب صدر اعظم حکومت آصفیہ کے عہدے پر فائز تھے اور دہلی میں برٹش گورنمنٹ سے حیدرآباد کے مستقبل کے متعلق معاملات طے کر رہے تھے اعلیٰ حضرت نظام کا تار کوڈ میں آیا، جس کا جواب کوڈ میں دیدیا گیا۔ یہ تار نواب صاحب کے پی اے کرم اللہ صاحب کی تحویل میں تھا۔ وہ تار کسی طرح غائب ہوگیا اور بعد بسیار تلاش بھی نہ مل سکا۔ معاملہ سی آئی ڈی کے سپرد کر دیا گیا۔ سی آئی ڈی کی رپورٹ سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ تار کرم اللہ صاحب کی سیف سے ان کی لاپرواہی سے نکل گیا۔ نواب صاحب نے وہ رپورٹ کرم اللہ کو دکھائی اور کہا کہ اس لاپرواہی کی سزا حیدرآباد کی ملازمت سے برخواستگی ہے۔ کرم اللہ گردن جھکائے بیٹھے رہے۔ نواب صاحب نے کہنا شروع کیا "کرم اللہ میں تمہارے ساتھ یہ رعایت کرسکتا ہوں کہ تم مجھے خود درخواست دو کہ تمہارا تبادلہ صدر اعظم کے اسٹاف سے کسی اور شعبہ میں کرا دیا جائے۔ تم جہاں جانا چاہو گے وہیں پہنچا دوں گا" اور پھر نواب صاحب نے ان کے ساتھ یہی برتاؤ کیا۔ باپو نے اپنے منصب سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ اپنے بچوں کو کبھی اپنے عہدہ میں دخل دینے دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ اورنگ آباد کے دورہ سے واپس ہوئے اعلیٰ حضرت کا فرمان مبارک صدر اعظم کے نام موصول ہوا جو مثل حکم کے ہوتا تھا۔ اس میں تحریر تھا کہ چونکہ آپ مملکت کے کاموں پر اکثر دہلی اور دورہ پر رہتے ہیں اس لئے آپ کے ذاتی کاموں کی دیکھ بھال کے لئے آپ کے بیٹے (یعنی راقم) کو اپنا معتمد راز مقرر کرتا ہوں۔ باپو نے وہ فرمان مجھے دکھایا اور فرمایا کہ دیکھا خدا کس طرح عطا فرماتا ہے۔ لیکن میری لڑائی میں جب تک میں حیدرآباد میں بحیثیت صدر اعظم ہوں اس وقت تک کسی

میرے بیٹے کو یہاں ملازم نہیں ہونا چاہیئے۔ باپو نے عرضداشت حضور کے سامنے پیش کی کہ "اعلیٰ حضرت کی ذرہ نوازی اور بندہ پروری ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لقمہ حیدرآباد کا حق ہے۔ اس کے علاوہ میں جب تک حیدرآباد کی خدمت پر معمور ہوں اس وقت تک میرے کسی بچے کو یہاں ملازمت نہ دی جائے (میرے جانے کے بعد غلام زادوں کا جو نمکخوار رہے ہیں اوّلین فرض ہوگا، خاندان آصفیہ کی خدمت بجالائیں)"۔

باپو مجھ سے فرمایا کرتے تھے "کہ میں کبھی غصّہ نہیں کرتا۔ تم کبھی غصّہ نہ کرنا۔ غصّہ بُری چیز ہے۔ اگر کبھی کسی بات پر ناگواری ہو اور غصّہ کا اظہار کرنا ہو تو غصّہ کو لانا، غصّہ کو خود مت آنے دینا۔ اس کا فرق یہ ہے کہ جب تم غصّہ کو لاتے ہو، تمہارا کنٹرول غصّہ پر رہتا ہے اور جب غصّہ خود آتا ہے تو پھر اس کا کنٹرول تمہارے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ ہر بات جو نہ کہنے کی ہو اور ہر حرکت جو نہ کرنے کی ہو، آدمی کر گذرتا ہے (یہ سچ ہے مجھے اکثر غصّہ آجاتا تھا۔ شاید اس لئے اُنہوں نے میری توجہ اس طرف دلائی اور اب ان کے جانے کے بعد خاموش ہو جاتا ہوں، صبر کر لیتا ہوں) یہ حقیقت ہے کہ میں نے باپو کو کبھی غصّہ کرتے نہیں دیکھا۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ناگواری کے وقت اچھے الفاظ ادا کرو، جو لوگ گالیاں بکنے لگتے ہیں اس سے دوسرا شخص چڑھ جاتا ہے، چڑچڑا ہو جاتا ہے، اور پھر الزام تمہاری بدمزاجی کے سر آجاتا ہے"۔

ایک صاحب کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خط ۳۰ فروری سنہ ۴۲ء میں مجھے نصیحت فرمائی کہ "ابھی آپ نے دنیا کو برتنا شروع کیا ہے۔ یہ تو ابتدا ہے۔ جوں جوں آپ کو ان سے ملنے کے مواقع حاصل ہوتے جائیں گے اسی نسبت سے آپ پر ان کی فطرت کے عجیب عجیب پہلو روشن ہوتے جائیں گے۔ فطرتِ انسانی کا مطالعہ بہرحال دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ دل سے غور کر کے نتائج اخذ کریں تاکہ قوتِ فیصلہ متاثر نہ ہو"۔

باپو کو جب کسی بات پر ناگواری ہوتی اس کا اظہار کچھ اس طرح فرماتے کہ اس کے سمجھنے کے لئے بھی عقل کی ضرورت ہوتی۔ نواب صاحب باغپت جمشید علی خاں صاحب مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ بھائی جی (نواب صاحب چھتاری) کی خفگی اور ناگواری کو سمجھنے کے لئے صلاحیت اور عقل کی ضرورت ہے۔ یہ ذکر غالباً سنہ ۴۴ء کا ہے کہ ایک فلم ایکٹر علی گڑھ آیا۔ مسلم یونیورسٹی کی کلچرل سوسائٹی نے استقبالیہ دیا۔ شب کا کھانا "راحت منزل" پر ہوا۔ دعوت کے بعد میں حیدرآباد چلا گیا، وہاں جو اخبارات دہلی سے پہنچے اس میں یہ خبر اس طرح شائع ہوئی کہ "ایک فلمی اداکار کی ضیافت نواب چھتاری کی

رہائش گاہ پر کی گئی۔"

باپو اس وقت صدر اعظم سلطنت حیدر آباد تھے۔ ظاہر ہے اس خبر سے باپو کو کوئی خوشی نہیں ہوئی ہوگی۔ میں نے اس خبر کا ان سے تذکرہ کیا اور معافی مانگی۔ فرمانے لگے "کوئی بات نہیں، تم نے دعوت کی تھی کوئی عداوت تو نہیں۔ ایک وقت تھا کہ اخباروں میں اس طرح خبر شائع ہوا کرتی تھی کہ "ہز ایکسلنسی گورنر کی دعوت نواب صاحب چھتاری کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ ہز ہائی نس بھوپال، ہز ہائی نس آغاخاں کی دعوت نواب صاحب چھتاری کی رہائش گاہ پر ہوئی"، اور آج اس طرح خبر شائع ہوئی کہ "ایک فلمی اداکار کی ضیافت نواب چھتاری کی رہائش گاہ پر کی گئی"۔ بہرحال ترقی نہ سہی تنزلی ہی سہی، کچھ تو ہے۔ مجھ پر کیا گذری یہ میں جانتا ہوں۔ لیکن ان الفاظ سے ان کی ناگواری کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

میں نے باپو کو کبھی مذاق کرتے نہیں دیکھا۔ میری عادت فقرہ اڑانے اور مذاق کرنے کی بہت تھی۔ اکثر باپو کی ڈانٹ پڑ جایا کرتی تھی۔ باپو فرمایا کرتے تھے کہ "مذاق کرتے وقت یہ مت دیکھو کہ تم نے مذاق کیسا کیا۔ بلکہ یہ دیکھو کہ مذاق کس پر کیا اور اس کا اثر اس نے کیسا قبول کیا۔ جس شخص کے ساتھ مذاق کیا گیا ہے اگر اسے ناگواری ہوئی ہے تو وہ مذاق نہیں دل آزاری ہوگی۔ دشمنی بڑی سستی خریدلی۔"

باپو اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "جب کسی آنریری جگہ پر تمہارا تقرر ہو تو ایک میعاد (Term) کے بعد چھوڑ دو، اگر تم سے لوگ اس میعاد (Term) میں خوش رہے ہیں اور ان کا انتہائی اصرار ہو تو دوسری میعاد (Term) منظور کرلو، ورنہ دوسروں کے لئے جگہ خالی کرو، اس سے قبل کہ لوگوں کے دلوں میں تمہیں ہٹانے کی آرزو پیدا ہو اور تم نے اپنے عہد میں ادارہ کی جو خدمت کی ہے اس کی تعریف و تحسین بھی جاتی رہے سبکدوش ہوجانا بہتر ہے۔ باپو طویل تقریر کے بہت خلاف تھے۔ فرمایا کرتے تھے جو کچھ کہنا ہو اختصار سے کہدو تاکہ اہم بات لوگوں کے دلوں میں اتر جائے۔ بات کرتے وقت سننے والے کے چہرہ کو دیکھو، اگر وہ دلچسپی لے رہا ہے بات جاری رکھو، ورنہ موضوع بدل دو، ہوسکتا ہے کہ تمہیں اس بات میں دلچسپی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ سننے والے کو بھی دلچسپی ہو۔ دلچسپ گفتگو اس وقت ہوسکتی ہے کہ جس سے تم بات کر رہے ہو اس کی دلچسپی کا مضمون بھی اپنی گفتگو میں شامل رکھو۔"

باپو قرض لینے کے بہت خلاف تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے "قرض مت لینا، اس سے عزت جاتی

رہتی ہے۔ مجھ پر اکثر over draft ہو جایا کرتا تھا اسے ناپسند فرماتے تھے۔ ان کا فقرہ یہ ہوا کرتا تھا "میں قرض سے All aegos ہوں"۔ باپو نے تمام جائیداد اپنے بچوں میں سنہ ۴۷ء میں تقسیم کردی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ زمینداری کے خاتمہ سے وہ بھی ختم ہوگئی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو ایک اینٹ بھی ان کے نام نہیں تھی۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "روپے سے مجھے کبھی محبت نہیں ہوئی۔ دولت کمانے کے لئے ہے لیکن محبت کرنے کے لئے نہیں۔ دولت تمہاری خدمت کے لئے ہے نہ کہ عبادت کے لئے اپنے ذاتی اخراجات اعتدال میں رکھو، لیکن پبلک کے کاموں میں اور داد و دہش میں فراخ دلی سے صرف کرو"۔

روپیہ جمع کرنے کے سلسلے میں فرمایا کرتے تھے کہ کچھ لوگ منیجر کی حیثیت سے پیدا ہوتے ہیں، ان کا کام صرف روپیہ جمع کرنا ہوتا ہے۔ منیجر وہ ہیں جو روپیہ جمع کرتے ہیں سا اپنے اوپر صرف نہ کریں نہ دوسروں پر۔ اور مالک جب آتا ہے تو وہ جمع شدہ مال بیدردی سے اڑا دیتا ہے۔

باپو آخری زمانے میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اس ۹۰ سال کی عمر میں تمہاری فیملی کا میں earning member ہوں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ حیدرآباد سے پنشن اور نظام فیملی ٹرسٹ سے تنخواہ سالانہ ملتی تھی جو ہمارے لئے ان کی زندگی کے ساتھ ختم ہوگئی۔ نظام ٹرسٹ کی میٹنگ جب بھی ہوتی تو وہ حیدرآباد جاتے۔ جب سے انھیں قلب کی شکایت ہوئی تھی ان کا معالج اور ہم گھر والے انھیں حیدرآباد کے سفر سے روک دیا کرتے تھے اور یہ رُکنا انھیں بار گزرتا تھا۔ باپو فرمایا کرتے تھے، جب تنخواہ لو تو کام باقاعدہ کرو ورنہ استعفیٰ دیدو۔ اپنی معذوری سے دوسرے کا نقصان نہ کرو اور دوسرے کی شرافت سے بیجا فائدہ نہ اٹھاؤ۔ لہٰذا باپو نے کئی بار استعفیٰ نظام ٹرسٹ کو بھیجا۔ لیکن ٹرسٹ نے اسے قبول نہیں کیا۔ اس کی وجہ ان کا دیرینہ تعلق خاندان آصفیہ سے اور وہ خدمات تھیں جو حیدرآباد کی بحیثیت وزیر اعظم انھوں نے انجام دی تھیں۔

باپو کی زندگی بہت سادی تھی کسی چیز کے عادی نہیں، کسی چیز میں fussy نہیں۔ صبح پانچ بجے اٹھ جانا، نماز اور وظائف سے فارغ ہونا، ناشتہ میں ایک انڈا، توس، اکثر کچے ٹماٹر یا گاجر، کیلا یا سنترہ، شہد بالالتزام استعمال فرمایا کرتے تھے۔ کھانا جو بھی ہوتا کھا لیا کرتے تھے۔ خوراک بہت کم تھی۔ آخری عمر میں ان کی خوراک نصف چپاتی رہ گئی تھی۔ فرمایا کرتے تھے عمر جیسے جیسے بڑھے، خوراک کم کرتے رہنا چاہیئے، صحت اور طوالت عمر کا امکان ہو جاتا ہے۔ ظہر کی نماز کے بعد تلاوت کلام پاک فرماتے۔

شام کی چائے میں نیبو ڈال کر پیا کرتے۔ حافظ تھے ورد کلام پاک مغرب کے بعد بھی کیا کرتے اور خدا کے فضل سے ۱۷ محرابیں سنائیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اپنے اللہ کی طرف رجوع ہونے میں بڑا سکون ملتا ہے۔ اس آخری علالت میں اکثر یہ شعر پڑھتے اور مجھے سناتے : ؎

خرم آن روز کزین وادیٔ ویران بروم　　راحت جان طلبم و زپئے جانان بروم

باپو کو شکار کا شوق تھا، بندوق بہت اچھی چلاتے تھے۔ ۸۵ برس کی عمر میں اسنپ اور تیتر مار لیا کرتے تھے۔ سنہ ۴۰ء تک گھوڑ سواری کیا کرتے تھے۔ ان کا اپنا گھوڑا عربی النسل تھا۔

شب میں ساڑھے دس بجے پلنگ پر لیٹ جاتے۔ ۱۱ بجے تک کتاب بینی اور پھر سو جاتے۔ میں نے باپو کو زیادہ رات تک جاگتے نہیں دیکھا۔ یہ عادت ان کی عمر بھر کی عادت تھی۔ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ زندگی بھر میں صرف ایکبار صبح ۴ بجے تک جاگ کر سوئے۔ یہ جب کی بات ہے کہ باپو یوپی کے گورنر تھے اور ہز ایکسیلنسی وائسرائے لارڈ ولنگڈن مہمان کی حیثیت سے نینی تال تشریف لائے تھے۔ جب تک وائسرائے محفل میں بیٹھے رہے، باپو کو انتظار کرنا پڑا۔

قدامت پسند بھی تھے اور بہت ماڈرن بھی۔ ہم چاروں بھائی اور ہماری بیویاں ایک ساتھ کبھی ان کے سامنے نہیں آئے۔ یہ ہمارے گھر کی قدامت پسندی کا رواج تھا۔ لیکن باپو اس قدامت پسندی کو اپنے پوتے اور پوتیوں اور نواسے اور نواسیوں کے ساتھ روا نہ رکھتے تھے۔

ریاست چھتاری کے انتظامی امور میں مجھے حیدرآباد سے صلاح و مشورہ دیتے رہتے تھے۔ ملک کے سیاسی حالات ان کے پیش نظر رہتے تھے۔ نواب صاحب مزاجاً جمہوریت کے ماننے والے تھے۔ ریاست کے معاملات ہی میں نہیں، بلکہ گھر کے معاملات میں بھی بچوں کو جمہوری آزادی تھی۔ اکثر گھر کے معاملات گفتگو اور آپس کے مشورے سے طے ہوتے تھے۔ حیدرآباد سے یکم جون ۴۶ء کے خط میں مجھے لکھا کہ :

"آپ کے یہاں جو دیہات میں جو پنچایتیں قائم ہیں وہ بجائے نامزدگی کے بذریعہ انتخاب تشکیل پا جائیں تو اچھا ہے۔ اس کے متعلق ہم نے آپ کو لکھا تھا کہ آپ منیجر صاحب سے کہکر جلد اس کا سلسلہ شروع کرادیں۔ باضابطہ انتخاب کے ذریعہ ہر فرد کی رائے شماری فوراً تو ممکن نہیں لیکن آپ دیہات کے لوگوں سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہر قوم اور ہر برادری میں سے اپنے جن نمایندوں کو خود چُن کر اپنی مرضی سے جن آدمیوں کی فہرست ریاست کو دیں گے ان ہی لوگوں کا اعلان کردیا جائے گا۔"

میں سنہ ۵۲ء جون میں چھتاری کی تحصیل وصولی کا انتظام کر رہا تھا۔ زمینداری یکم جولائی سنہ ۵۲ء کو ختم ہو رہی تھی۔ حکومت کی طرف سے اس کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ باپو کا قیام اس وقت علی گڑھ میں تھا میرے پاس خط اس مضمون کا پہنچا: "۳۰ جون کی شام تک جو روپیہ وصول ہو جائے وہ ٹھیک ہے۔ آپ اپنے کارندوں کو حکم دیدیں کہ یکم جولائی سے وصولیابی بند کر دیں۔ اگرچہ قانون میں اس کی رعایت دی گئی کہ زمیندار بقایا لگان وصول کر سکتا ہے۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ سو برس سے جو تعلقات ریاست کے کاشتکاروں سے رہے ہیں ان کا خاتمہ مقدمہ بازی پر ہو۔" تقریباً ساٹھ ستر ہزار روپے کی رقم تھی جو کبھی وصول نہیں ہوئی۔

باپو کو چھتاری سے والہانہ تعلق تھا۔ چھتاری نے انھیں نواب چھتاری کا لقب دیا اور نواب صاحب کی ذات نے چھتاری کو دنیا کے ہر گوشے میں مشہور کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ دونوں لازم و ملزوم تھے۔

باپو نے اپنے خط میں میرے بڑے بھائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"میں فرحت سلمہٗ کی آئی سی ایس میں کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔ لیکن خواہ کامیابی ہو یا ناکامی چھتاری خاندان کے ہر فرزند کا اوّلین فریضہ چھتاری کے عوام کی خدمت ہونا چاہیئے اور انہیں اس باب میں ہر ذمہ داری کو پورا کرنا چاہیئے۔ ہمارا دنیا میں دانش وروں سے بڑھ کر ضرورت ایسے لوگوں کی ہے جو عام سوجھ بوجھ رکھتے ہوں اور معتدل مزاج ہوں۔ اگر دنیا میں محض دانشور ہی ہوں تو دنیا رہنے کے قابل نہیں۔"[1]

1– "I am Praying and Praying hard that Farhat may succeed in his I.C.S. Examination. But success or failure every child of mine must realize, that he owes a duty to the People of chhatari and the People in chhatari Estate, and should be Prepared to fullfil that responsibility whenever he is called upon todo so by Providence. Let me tell you one thing, in this world what we need are level headed men with strong common sense and not geniuses. If the world were full of geniuses it would not have been worthliving" (Letter dated 28th April, 1943- Hyderabad)

۱۵ دسمبر ۱۹۴۳ء کے خط میں مجھے لکھا ہے کہ:

"تمہارے اس احساس ذمہ داری سے مجھے بہت خوشی ہوئی کہ کسی معتمد کے آنے سے قبل تم چھتاری سے روانہ نہیں ہوئے یہ محض اللہ کی رحمت ہے کہ امور جائداد کے بارے میں تم اس درجہ فرض شناس ہو۔ میرے عزیز فرزند! تمہیں یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ ہمارے مستقبل کا دارومدار چھتاری پر ہے اور اس کے معاملات کو ہمیں کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے"

باپو کو چھتاری سے عشق تھا۔ بات بات پر وہ چھتاری کا ذکر ہم سے اس طرح فرماتے کہ اس کی اہمیت ان کے بچوں کے دماغوں میں راسخ ہو جائے۔ فرمایا کرتے کہ حکومت یوپی کے دفاتر موسم گرما میں نینی تال منتقل ہو جاتے تھے۔ نینی تال کا پانی میری صحت کے ساتھ سازگار نہ تھا۔ میں چھتاری کے کوئیں کا پانی مخصوص انتظام سے اپنے پینے کے لیے نینی تال منگوایا کرتا تھا۔ باپو نے کبھی چھتاری کے قلعہ کے رہن سہن میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ ۱۹۶۱ء میں جو پردے ٹنگے ہوئے تھے وہ آج بھی ہیں۔ ایک صوفہ سیٹ جو ان کے دادا کے زمانے کا ہے وہ آج بھی ہے، اگرچہ خستہ حالت میں ہے۔ چھتاری کا قلعہ تقریباً دو سو برس پرانا ہے۔ عمارت اپنی عمر ختم کر چکی ہے۔ اینٹ مٹی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ریاست کے زمانے میں اس کی مرمت کا انتظام تھا۔ باپو کے لئے قلعہ کی مرمت کا مسئلہ مستقبل میں فکر و تشویش کا باعث تھا، ان کا خیال تھا کہ ان کے بچے ان کے بعد اس کا بوجھ نہ اٹھا سکیں گے۔ لہٰذا زراعتی فارم کے لئے وصیت لکھ دی کہ اس کی آمدنی قلعہ کی مرمت اور دیکھ بھال میں صرف ہوتی رہے۔ باپو اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے کہ یاد رکھو تم چھتاری کے کہلانے کے اس وقت تک مستحق ہو جب تک یہ تمہارا گھر قائم ہے جس دن قلعہ ختم ہوا تمہاری چھتاری سے نسبت اور وجود جاتا رہے گا۔

پچیس تیس برس پہلے سے باپو نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ انھیں چھتاری میں دفن کیا جائے۔ مجھے کئی دفعہ جگہ کی نشان دہی کی یہ جگہ میری ماں کی قبر سے ملی ہوئی ہے۔ سن ۱۹۱۲ء میں میری ماں کی شادی ہوئی تھی۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ۱۱ برس دونوں ساتھ رہے۔ ۵۹ برس انتظار میں گذر گئے۔ باپو کی خواہش اور وصیت کے مطابق انھیں میری ماں (والدہ) کے برابر دفن کر دیا، آخر وہ دن آپہنچا جس کے لئے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيهَا

نعیدکم و منہا نخرجکم تارۃً اُخریٰ ہ (اسی زمین سے ہم نے تمہیں بنایا، اسی زمین میں تم کو پھر ڈالتے ہیں اور اسی زمین سے پھر نکالیں گے ایک بار")

۔ جنوری کی شام میں چھتاری کی مٹی، چھتاری میں ضم ہو گئی۔ اِنّا للّٰہ و اِنّا الیہ راجعون ہ

جب کبھی کرمفرما دوست باپو کی تعریف کیا کرتے، یہ کہہ دیا کرتا تھا کہ فی زمانہ یہ کریڈٹ نہیں کہ کسی کی تعریف کی جائے، اگر اسے بُرا نہ کہا جائے تو میں اسے بہت بڑا کریڈٹ سمجھتا ہوں۔ لیکن مجھے اپنے خیال سے زیادہ اس بات کا اندازہ اس وقت ہوا جبکہ باپو کے انتقال کی خبر آگ کی طرح علی گڑھ میں پھیل گئی۔ ہر طبقہ، ہر فرقہ کے لوگ بھاگے چلے آئے۔ یونیورسٹی کے حضرات، حکامانِ ضلع، دوست واحباب سب ہی جمع ہو گئے۔ آل انڈیا ریڈیو پر انتقال کی خبر نشر ہوئی۔ حکومت نے انھیں اسٹیٹ فیونرل دیا، صدر جمہوریہ کی طرف سے پھول (Wreath) رکھی گئی۔ اور وزیر اعظم مسز گاندھی کی طرف سے پھول بھیجے گئے اور وزیر اعظم کا اخبار میں بیان نکلا جس سے باپو کی ذاتی شخصیت اُجاگر ہو گئی۔

علیگڑھ اور چھتاری میں مجمع کی انتہا نہ تھی۔ اعزہ اداروں کا ہجوم، تار اور خطوں کی بے تحاشا آمد، مجھے باپو کے ایک خط کے الفاظ یاد آ رہے ہیں:

" ہاں تمہارا یہ خیال بالکل درست ہے کہ ہم کو اپنے فرائض اس طور پر انجام دینا چاہیے کہ رخصت ہونے پر لوگ ہماری کمی محسوس کریں اور ہمیں یاد کریں۔ ایسی زندگی سے کوئی فائدہ نہیں کہ موت کے بعد لوگ یہ سمجھیں کہ انہیں کسی لعنت سے نجات مل گئی "[1]

1- yes you are right in thinking that one should live in Such a manner that when one leaves, People may miss him and feel sorry for him. It is of no use living a life that may leave an impression behind that a great curse that had been fallen has been removevd."
(Letter dated 30th. October 1942 – Hyderabad.)

اس دنیا میں آج بابو نہیں ہیں۔ لیکن میں خدا کے فضل سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان کی زندگی کا گراف بنایا جائے تو نیچے سے اوپر ایک ہی سمت کو لائن چلی گئی ہے۔ ان کی زندگی، سیاسی زندگی، نریری مجسٹریٹ سے شروع ہوئی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین، ہوم منسٹر، چیف منسٹر صوبہ یوپی کے گورنر السرائے کونسل کے ممبر، وزیر اعظم مملکت آصفیہ اور پھر ملک کی آزادی کے بعد راجیہ سبھا کے ممبر۔ بابو نے زندگی میں فراز ہی فراز دیکھا، نشیب دیکھنے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔

مجھے بابو سے بہت مشابہت تھی۔ اکثر اپنے بہن بھائیوں سے کہا کرتا تھا کہ مجھے چھوٹے بابو کہا کرو۔ میرے اور بابو کے دستخطوں کا طرز ایک تھا۔ میں نے بڑی محنت سے ان کا طرز بنایا تھا۔ میری سوچ اور فکر ان کی تعلیم کی مرہون ہے۔ اکثر میرے گھر والے اور دوست احباب بابو سے کسی معاملہ کو رجوع کرنے سے پہلے مجھ سے ذکر کیا کرتے۔ مجھے بابو کے مزاج کا اندازہ تھا، پسند و ناپسند کو جانتا تھا۔ میرا تاثر اکثر معاملات میں وہی ہوتا، بابو جس کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ مجھ سے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میرے بعد کچھ عرصہ تک تم پر وقت سخت گزرے گا، لیکن خدا کی مدد تمہارے ساتھ شامل رہے گی، تم پھر سنبھل جاؤ گے۔

مجھے ایسے واقعات یاد ہیں جب لوگوں کو مشابہت کی وجہ سے دھوکا ہوا ہو۔ ایک بار میں اور بابو پٹنہ گئے۔ یہ سنہ ۷۵ء کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم اس وقت گورنر بہار تھے۔ گورنر نے بابو کے اعزاز میں ڈنر دیا۔ گورنر کے سکریٹری مسٹر بھٹناگر نے میرا مہمانوں سے تعارف کرایا۔ انھوں نے نواب زادہ کے لفظ کو کچھ اس طرح ادا کیا کہ بعض حضرات نے اخیر کے لفظ پر توجہ نہ دی۔ پٹنہ سٹی کے ایک پروفیسر نے مجھ سے کہا کہ میں غلطی کر رہا ہوں اُردو کانفرنس میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ حضور والا اس کی صدارت فرما رہے تھے۔ میں نے جی کا لفظ ہی ادا کیا تھا کہ وہ بابو سامنے سے آتے نظر آئے۔ میں نے کہا کہ وہ نواب صاحب آ رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے مجھے دیکھا پھر انہیں دیکھا اور ایسی خاموشی اختیار کی کہ پھر بات ہی نہیں کی۔ اصلیت نمودار ہوئی تو سراب کی حقیقت سمجھ میں آ گئی۔ بابو نے اس حقیقت کا اظہار اپنے خط مورخہ یکم جون ۱۹۶۳ء حیدر آباد میں اس طرح فرمایا:

"راجہ صاحب جہانگیر آباد نے صرف ظاہری حالت کا اندازہ کر کے اپنا خیال ظاہر کیا تھا لیکن انھیں شاید یہ معلوم نہیں کہ تم صورتاً ہی نہیں بلکہ طبیعتاً اور عادتاً بھی ہم سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے ہو۔

اب بتاؤ تو تمہاری اس کے متعلق کیا رائے ہے؟"

بابو اس دنیا میں نہیں، میں کسی کو کیا بتاؤں میری اب کیا رائے ہے۔

تمہارے نام سے سب لوگ مجھ کو جان جاتے ہیں
میں وہ کھوئی ہوئی اک چیز ہوں جس کا پتا تم ہو

کیا کہوں کہ بابو کے جانے سے کیا کیا کھویا چھتاری کے گھر کی عزت، مال و دولت، نمود و شہرت، خوشی و مسرت غرض سب ہی کچھ ان کی زندگی کے ساتھ ختم ہو گیا اور جہاں تک میری اپنی ذات کا تعلق ہے ان سب چیزوں کے ساتھ وہ سب کچھ بھی لٹ گیا جس سے میری زندگی عبارت تھی۔ میں نے اپنے باپ کی خدمت عبادت کا ایک حصہ سمجھ کر ادا کی اور اس حقیقت کا اندازہ ان ہی کے الفاظ میں سنئے،

" یہ جان کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تمھیں میرا خط وصول ہونے سے اتنی ہی خوشی ہوئی جیسے کسی گناہ گار کو توبہ و استغفار کے بعد۔ لیکن تمھیں گناہ گاروں کے بارے میں کیا واقفیت ہے؟"

کیا بتاؤں مجھ پر کیا گزر رہی ہے! ۵۹ برس ہنستا رہا ہوں اور اب تقدیر میں رونا ہے۔ اب اس دنیا میں اپنی ذات کو یتیم اور تنہا محسوس کرتا ہوں۔ اندھیرے میں ہوں، روشنی کی تلاش ہے:

فانی کو یا جنوں ہے، یا تیری آرزو
کل نام لے کر تیرا دیوانہ وار رویا

●●

نسیم انصاری

• ڈاکٹر محمد نسیم انصاری (پ ۱۹۳۵ء) فرنگی محل لکھنؤ،
ابتدائی تعلیم انٹرمیڈیٹ تک مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ، کلکتہ میڈیکل
کالج کلکتہ سے ۱۹۵۵ میں ایم بی۔ بی ایس۔ ۱۹۶۳ء میں لندن
سے ایف، آر، سی، ایس۔ ۱۹۶۴ء سے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی
کی خدمت کرتے رہے ہیں اور میڈیکل کالج میں شعبہ سرجری کے سربراہ
ہیں۔ پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل ایجوکیشن
چنڈی گڑھ اور بیرونِ ہند کی یونیورسٹیوں میں الفتح یونیورسٹی
طرابلس اور عرب میڈیکل یونیورسٹی بن غازی کے وزیٹنگ پروفیسر
بھی رہ چکے ہیں۔ حکومتِ ہند نے میڈیکل کاؤنسل آف انڈیا
اور اس کی پوسٹ گریجویٹ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا ہے۔

اردو زبان و ادب سے گہری دلچسپی ہے —— اس
دلچسپی اور شغف کی بدولت آپ اردو ترقی بورڈ کے میڈیکل
پینل کے بھی ممبر ہیں اور مسلم یونیورسٹی کے 'فکر و نظر' اور
"تہذیب الاخلاق" کی ادارتی مجلسوں کے بھی۔

••

زادِ راہ

آج مجھے علی گڑھ کی اُن روایات کا ذکر کرنا ہے، جو سَو سال سے بنتی اور مٹتی آ رہی ہیں اور جن سے یونیورسٹی کی عمارتوں میں اس روح کا رقص جاری ہے جسے لوگ اس کا تاریخی کردار کہتے ہیں۔ گزشتہ ۴۰ برس سے میں اس رقص کا تماشائی ہوں اور نہ معلوم کتنی دفعہ دل ایسا تڑپا ہے کہ خود اس رقص میں شامل ہو گیا ہوں۔ آئیے آج اس محفلِ رنگ و بُو کی کچھ جھلکیاں آپ کو بھی دکھاؤں۔

۱۸۵۷ء کے بعد کے ہندوستان کا تصوّر کیجئے! غور کیجئے غدر کے ہنگامے کو اٹھارہ[۱۸] برس گزر چکے ہیں۔ ہندوستانی قوم پوری طرح انگریزوں کے قابو میں ہے۔ اس قوم کے سامنے اندھیرے کا ایک بھیانک دریا ہے کہ اس کے پار روشنی کی ایک کرن بھی نظر نہیں آتی۔ مسلمانوں کی حالت تو اور بھی خراب تھی۔ دِلّی میں اُن کے مکان اجڑ چکے تھے۔ ان کے پیاروں کو سرِ راہ سولی پر چڑھایا گیا تھا۔ حکمراں قوم کی کوشش یہ تھی کہ ان کو یقین دلایا جائے کہ تم غیر مہذّب ہو، اور اس لئے اس قابل ہو کر سر جھکا کر رہو۔ بڑی بھیانک رات تھی!! اس اندھیرے میں سرسیّد نے علی گڑھ میں ایک شمع جلائی۔ اس کو بجھانے کے لئے جو آندھیاں چلیں ان میں سب سے خطرناک وہ آندھی تھی جو خود اسی قوم کے نادانوں نے اٹھائی۔ وہ آندھی جہالت اور تعصّب کی آندھی تھی۔ یہ نادان کہتے تھے کہ مسلمانوں کو کسی نئی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے، اُن کی پُرانی کتابوں میں سب علم موجود ہے، انگریزی زبان کافروں کی زبان ہے اور اس کا پڑھنا حرام ہے۔ سرسیّد اور ان کے ساتھیوں نے مردانہ وار ان حملوں کا مقابلہ کیا اور مسلمانوں کو بتایا کہ پانچ چھ سو سال سے علم سے ان کا رشتہ کمزور ہوتا جا رہا تھا اور اب تو تقریباً ٹوٹ ہی گیا تھا۔ اُنھوں نے قوم کو وہ دن یاد دلائے جب اُن کے بزرگ فلسفہ، منطق، ریاضی، طب، جغرافیہ، سرجری، تاریخ، ہیئت اور عمرانیات ساری دنیا کو سکھاتے تھے اور اُن کی کتابیں صدیوں تک یورپ، ایشیا اور افریقہ میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اور ۱۸۷۵ء میں ان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ پڑھے لکھے لوگ تک ابن سینا، زہراوی، ادریسی، ابن خلدون،

ابن رشد کے ناموں تک سے ناواقف تھے۔ انھوں نے بتایا کہ علم کسی ایک قوم کی ملکیت نہ رہا ہے اور نہ رہے گی۔ جس نے اس دریا سے فیض اٹھایا وہ سرسبز و شاداب رہا اور جس نے اس سے منھ پھیرا وہ ذلیل و خوار ہوا۔ سرسیّد نے اپنی قوم کو اس ذلّت اور خواری سے بچانے کا بیڑا اٹھایا تھا اور زندگی بھر وہ اس مقصد کے لئے لڑتے رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری سب سے قیمتی روایت سرسیّد کی یہی لگن ہے کہ حالات چاہے کتنے ہی سخت کیوں نہ ہوں، لوگ چاہے کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کریں، سچّی بات پر ڈٹے رہنا ہی بہادروں کی شان ہے۔

سرسیّد کے شاگردوں میں ایک دیوانہ اور پیدا ہوا، نام شیخ عبداللہ تھا۔ اس زمانہ میں جاہل لوگ اپنی لڑکیوں کو اس ڈر سے لکھنا پڑھنا نہیں سکھاتے تھے کہ کہیں وہ بڑی ہو کر خط نہ لکھنے لگیں۔ شیخ عبداللہ نے جہالت کی اس کالی چادر کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔ آج اس شاندار کالج میں بیٹھ کر ذرا اُس زمانہ کا تصوّر کیجئے جب لڑکیاں ڈولیوں پر پردہ ڈال کر اسکول بھیجی جاتی تھیں اور اگر ڈولی کے پردے سے ان کے دوپٹّے کا ایک کونہ بھی باہر آجاتا تھا تو شہر والے آفت مچا دیتے تھے۔ کیا کیا باتیں نہیں سننا پڑیں شیخ عبداللہ کو! اُس ہمّت والے نے سب کچھ سُنا، سب کچھ برداشت کیا لیکن اپنے پیروں میں لغزش نہ آنے دی۔ آج اس کے مدرسہ کی پڑھی ہوئی لڑکیاں وکیل ہیں، ڈاکٹر ہیں، سرجن ہیں، انجینئر ہیں، یونیورسٹیوں میں پروفیسر ہیں اور حکومت میں وزیر ہیں۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ شیخ عبداللہ نے حالات کے سامنے سپر نہیں ڈالی۔ بلکہ یہ کہا کہ انسان اشرف المخلوقات اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے گردوپیش کے حالات کو بدلنے کی سکت بھی رکھتا ہے اور اس کا کمال یہی ہے کہ وہ اندھیرے کو روشنی میں بدل دے اور پھر فطرت کو للکارے "تو شب آفریدی چراغ آفریدم"۔

میرا تعلق علی گڑھ سے اس وقت ہوا جب یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں اسکول کے انفنٹ کلاس میں جسے آج کل کی زبان میں نرسری کہتے ہیں میرا داخلہ ہوا تھا۔ ہم لوگوں کا اسکول ظہور وارڈ میں تھا جہاں آج کل اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ ہے۔ یہاں انفنٹ کلاس سے لے کر چوتھے درجے تک پڑھائی ہوتی تھی۔ مس قمر جہاں جعفر علی اس اسکول کی نگراں تھیں۔ لڑکے لڑکیاں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ لڑکوں کے رہنے کے لئے اسکول ہی کے ایک حصّہ میں ہوسٹل بھی تھا۔ صبح پڑھائی شروع ہونے سے پہلے سب بچّے صفیں باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور دو تین بچّے اقبال کی مشہور نظم "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری" گا کر پڑھتے تھے، اور ہم سب اسے دُہراتے تھے۔ میں کیا بتاؤں کہ اس دعا کا کیا اثر ہوا۔ آج تک کانوں میں صدا آتی ہے:

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو!

یہ گویا کہ پہلا نقش تھا، جو علی گڑھ نے دل پر بٹھایا، اے کاش یہ کبھی نہ مٹے۔

انفنٹ کلاس میں کھلونے بہت تھے اور ہم کو پتہ بھی نہ چلا، لیکن کھیل کود ہی میں A, B, C, D اور الف، ب، ت، ث سکھادی گئی۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو ایک انگریز خاتون مس ڈنکن نے انگریزی پڑھائی۔ چوتھے درجے میں جب پہنچا تو اسکول کے بچوں کی انجمن کا صدر بنایا گیا۔ یہ گویا کہ پہلی ذمہ داری تھی جو مجھے سونپی گئی۔ اس وقت نو برس کا تھا۔ اسی انجمن میں مجھے تقریر کرنا آیا۔ اس کے بعد پانچویں درجہ سے منٹو سرکل میں پڑھائی شروع ہوئی۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ایک انگریز جی، سی، ووڈ تھے۔ پڑھانے والے اساتذہ ایک سے ایک قابل اور محبت کرنے والے۔ یہاں تیراکی، گھوڑے کی سواری اور اسکیٹنگ سیکھی۔

پانچویں درجہ میں جب رائڈنگ کلب میں میرا نام لکھوایا گیا تو میرا قد اتنا چھوٹا تھا کہ رکاب تک پاؤں نہیں پہنچتے تھے اور خود سے گھوڑے پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ سائیس گود میں اُٹھا کر سوار کراتا تھا۔ محمود بٹ صاحب جو آج کل یو پی گورنمنٹ کے چیف سکریٹری ہیں، رائڈنگ کلب کے کیپٹن تھے۔ لیکن میری کم عمری کے باوجود میرے استاد جمعدار عبدالشکور صاحب نے بڑی محنت سے مجھے شہسواری سکھائی اور تھوڑے ہی دنوں میں مجھے اس قابل بنادیا کہ میں گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر کھڑا ہو کر گھوڑا سرپٹ دوڑانے لگا۔

اس زمانہ کا ایک واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ یونیورسٹی کے ایک بہت ہی بہادر اور ماہر سوار امان اللہ خاں صوبۂ سرحد کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ایک گھوڑے کو ایسی تربیت دی تھی کہ جب وہ اس پر سوار ہو کر ایڑ لگاتے تھے، تو وہ اپنے پچھلے دونوں پیروں پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ تم بہت کرتب دکھاتے ہو؛ دیکھیں میری طرح اس گھوڑے کو اپنی پچھلی دونوں ٹانگوں پر کھڑا تو کردو؟ میں نے فوراً چیلنج قبول کر لیا اور گھوڑے پر بیٹھ کر ایڑ لگائی۔ گھوڑا اپنی پچھلی دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ لیکن اسی وقت میرا بیلنس بگڑا اور میں نے سہارے کے لئے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوا گھوڑا اُلٹ پڑا۔ اتفاق کی بات کہ میں اس کے گرنے سے پہلے خود ہی گر پڑا۔ ورنہ آج میرے بجائے کوئی دوسرا آپ کو یہ کہانی سناتا ہوتا۔

اسپورٹس کے علاوہ اسکول میں تعلیم وتربیت کے اور بھی بہت سامان تھے۔ اسکاوٗٹس کلب تھا جہاں ڈرل کرنا سکھائی جاتی اور جھنڈیوں کے ذریعہ سگنل کے طریقے بتائے جاتے تھے۔ سرجری کا سے میرا پہلا واسطہ اسکول ہی میں پڑا! جب فرسٹ ایڈ کی تربیت دی گئی۔ مضمون لکھنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ ہر سال اسکول سے میگزین نکلتا تھا۔ آدھا اردو میں آدھا انگریزی میں۔ تقریر کرنا سکھانے کے لئے ڈبیٹنگ سوسائٹی تھی۔ مشغلوں یعنی HOBBIES کی ہمت افزائی کے لئے ایک سائنٹفک سوسائٹی بھی تھی، یہاں میں نے بیٹری سے کام کرنے والا ٹیلیفون بنانا اور بجلی یا بیٹری کی مدد کے بغیر چلنے والا ریڈیو بنانا بھی سیکھا۔ غرض اسکول کی تعلیم وتربیت ایسی تھی کہ طالب علموں کی شخصیت کے ہر اچھے پہلو کو ابھرنے کا موقع ملتا تھا۔ میرے ساتھ جو احسانات اس اسکول نے کیے ان کو میں گنوا بھی نہیں سکتا۔

۱۹۴۵ء میں جب میں نے اسکول چھوڑا، تو اس وقت ایک انگریز مسٹر جونس ہیڈ ماسٹر تھے۔ میرے اساتذہ میں سے مولوی عبدالقیوم صاحب اب تک اس اسکول میں پڑھاتے ہیں اور ماسٹر عبدالاحد صاحب اور حنیف صاحب قبلہ ماشاءاللہ بقید حیات ہیں اور ان کی موجودگی اس شہر کے لئے باعثِ برکت ہے۔ مرنے والوں میں سید محمد صاحب ٹونکی، عالم بخش صاحب، احسن صاحب اور ماسٹر زین العابدین صاحب نے جو نقوش دل پر بٹھائے وہ ہمیشہ سینے سے لگے رہیں گے۔

یونیورسٹی میں میرا داخلہ ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہوا۔ آفتاب ہوسٹل میں رہنے کو جگہ ملی۔ یہ سنہ وہ تھا جب آزادی کا ڈنکا بج رہا تھا، جیسے جیسے آزادی قریب آرہی تھی یہ سوال بار بار اٹھ رہا تھا کہ نئے ہندوستان کا کیا نقشہ ہوگا۔ اس سوال پر ہندوستانیوں میں آپس میں بڑی کشمکش تھی۔ اس کا مظاہرہ علی گڑھ میں بھی تھا: یہاں مسلم لیگ، کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی کے لوگ بڑے جوش وخروش سے کام کر رہے تھے۔ مسلم لیگ کا پلہ بہت بھاری تھا۔ لیکن تمام اختلافات کے باوجود آپس میں بھائی چارہ اور محبت بھی بہت مضبوط تھی۔ پروفیسر حبیب بہت سخت کانگریسی تھے، سید محمد ٹونکی اور محمود صاحب کمیونسٹ گروپ کے رہنما تھے اور مسلم لیگ کے حامی تو زیادہ تر لوگ تھے۔ لیکن پروفیسر حبیب، محمود صاحب اور ٹونکی صاحب کی جو عزت یونیورسٹی میں تھی اس کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ جب مسلم لیگ کے دو گروپوں میں آپس میں یونین کے الیکشن کے معاملہ پر اختلاف ہوا تو سب نے یہ کہا کہ فیصلہ حبیب صاحب کریں گے: وہ حبیب صاحب جو مسلم لیگ کے خلاف اسمبلی کا الیکشن لڑ رہے تھے!

یہ رواداری علی گڑھ والوں کو ورثے میں ملی تھی۔ بہت دن پہلے اس درس گاہ میں دو طالب علم پڑھتے تھے، چودھری خلیق الزماں اور رفیع احمد قدوائی۔ علی گڑھ چھوڑنے کے بعد یہ دونوں سیاسی میدان میں آئے۔ ایک دفعہ یو پی اسمبلی کے الیکشن میں چودھری صاحب مسلم لیگ کی طرف سے اور رفیع احمد صاحب کانگریس کی طرف سے اپنی اپنی جماعت کی رہنمائی کر رہے تھے۔ چودھری صاحب کے امیدوار کو ایک جگہ الیکشن کے دورے پر جانا تھا، لیکن موٹر نہیں تھی۔ امیدوار نے رفیع صاحب کے یہاں سے موٹر منگوائی جو بغیر کسی چوں چرا کے بھیج دی گئی!

خود علی گڑھ میں دو بہت سینئر اساتذہ میں سخت اختلاف تھا۔ بول چال بند تھی۔ اسی زمانے میں ان میں سے ایک کی بیگم کی طبیعت خراب ہوئی اور اس کی ضرورت ہوئی کہ انھیں آگرہ لے جا کر کسی ڈاکٹر کو دکھایا جائے۔ ان کی موٹر خراب تھی اس لئے روانگی میں دیر ہو رہی تھی۔ ان کے مخالف کو جب یہ معلوم ہوا تو فوراً ان کے گھر پہنچے اور ان کے بیٹے کو بلوا کر سخت ڈانٹا کہ تمھاری ماں کی طبیعت خراب ہے اور تمھیں اس کی توفیق نہیں ہوئی کہ میری موٹر لے جاتے؟ یہ لو میری موٹر اور ابھی اسی وقت انھیں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔

جب میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو یہاں ایک اور دیوانہ وائس چانسلر تھا۔ نام تھا ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد۔ اس کے دل میں لگن تھی کہ یہاں انجینئرنگ کالج، میڈیکل کالج اور ایگریکلچر کالج کھل جائیں۔ انجینئرنگ کالج تو اس طرح شروع ہوا کہ ایک جگہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی اور اس کے دونوں طرف کچھ دکانیں تھیں۔ ہم لوگ اسے "یونیورسٹی مارکٹ" کہتے تھے اور یہاں سے چاکلیٹ وغیرہ خریدتے تھے۔ سر ضیاء الدین نے دکانیں خالی کروائیں اور کہا کہ یہیں انجینئرنگ کالج بنے گا۔ لوگوں نے کہا پاگل ہو گئے ہو۔ بغیر مشینوں کے ان دکانوں میں بٹھا کر لڑکوں کو انجینئرنگ پڑھاؤ گے؟ جواب دیا کہ مشین موجود ہے۔ لوگوں نے کہا، کہاں؟ جواب دیا کہ وہ جو میری پرانی موٹر ہے۔ اس کی مشین سے سب کچھ سیکھ لیں گے۔ چنانچہ انجینئرنگ کالج قائم ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے کالج میں پڑھنے کے لئے کون تیار ہوتا۔ اس کی ترکیب یہ نکالی گئی کہ جن لڑکوں کے خلاف شکایتیں تھیں کہ وہ سب شرارتیں کرتے ہیں۔ ان کو حکم دیا گیا کہ وہ یونیورسٹی کو چھوڑ دیں۔ یہ لوگ بھاگے ہوئے وائس چانسلر کے پاس گئے اور فریاد کی، حکم ملا کہ یونیورسٹی میں ان کے لئے جگہ صرف انجینئرنگ کالج میں ہے۔ بہت واویلا ہوا کہ ہم لوگ اچھے خاصے شریف ہیں، ہمیں انجینئرنگ کالج میں کیوں ٹھونسا جا رہا ہے۔ جواب ملا کہ بس تمھاری یہی سزا ہے! یہ وہی انجینئرنگ کالج ہے جس میں داخلہ کے لئے آج سخت مقابلہ ہوتا ہے اور جس کے پڑھے ہوئے لڑکے دنیا میں اپنا نام پیدا کر رہے ہیں۔

سر ضیاء الدین نے انجینئرنگ کالج تو بنا لیا، لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ میڈیکل کالج نہ دیکھ سکے۔

حالانکہ سارے ملک کا چکر لگاکر اور اپنے نامور ساتھیوں اور طلباء کو بھیج کر اس کے لئے روپیہ جمع کر لیا تھا۔ میڈیکل کالج ان کے مرنے کے بارہ برس بعد کھلا اور اسی شان سے جیسے انجینئرنگ کالج بنا تھا، ایک پرانی عمارت میں کلاسوں اور لیباریٹری کا انتظام ہوا۔ جب دو برس بعد اس کا وقت آیا کہ لڑکے اور لڑکیاں اسپتال پر کام سیکھیں تو پڑھنے اور پڑھانے والے رکشے اور سائیکلوں پر سوار ہو کر شہر کے اسپتال میں جہاں مریض ملک بولتے تھے۔ اس کے قریب ایک کمرہ مجھے دکھایا گیا کہ یہاں آپ پڑھائیے، وہاں ایک پرانی زنگ آلود میز رکھی تھی جس پر کسی زمانے میں مریض کو لٹا کر اس کی مرہم پٹی کی جاتی تھی، لیکن جو اب بالکل خستہ حالت میں تھی۔ ایک پرانا اسٹول بھی پڑا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ میں نے پوچھا کہ مریض کہاں ہے کہا گیا کہ سرجری کا مریض کوئی نہیں ہے۔ برآمدہ میں ایک بوڑھی عورت زمین پر بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تکلیف ہے کہا کہ پیٹ میں درد ہے۔ میں اس کو لے آیا، اپنے اسٹوڈنٹس کی مدد سے اس کو میز پر لٹایا اور اس کے بعد پڑھانا شروع کیا کہ مریض کا معائنہ کیسے کرتے ہیں۔ اس طرح میڈیکل کالج میں سرجری کی پڑھائی شروع ہوئی۔

تھوڑے دنوں کے بعد طبیہ کالج کے اسپتال میں اس کا انتظام کیا گیا کہ وہاں میڈیکل کالج کے مریض رہ سکیں اور ان کے آپریشن کیے جا سکیں۔ جب میں نے پہلا آپریشن کیا تو بے ہوشی دینے کے لئے آگرہ سے ایک ڈاکٹر بلائے گئے، ایک حکیم صاحب کو اس پر تیار کیا کہ آپریشن میں وہ مجھے اوزار دیتے رہیں اور گاندھی آئی ہاسپٹل سے ایک نرس کو بلایا کہ وہ آپریشن کا سامان تیار کرے۔ لیکن اس بے سروسامانی میں بھی ہماری ہمت نہیں ٹوٹی۔ ہمارے کانوں میں سرسید، شیخ عبداللہ، ڈاکٹر ضیاءالدین اور ان کے بہت سے جاں نثاروں کی آوازیں آئیں:

رہ رو تشنہ لب نہ گھبرانا ⁂ اب لیا چشمۂ بقا تو نے

تو یہ ہیں وہ روایات جن پر ہماری درس گاہ قائم ہے اور یہی "زادِ راہ" ہے اس سفر کا جس پر ہم نے کمر باندھ رکھی ہے۔

●●

ریاض الرحمٰن شیروانی

• عبید الرحمٰن خاں شیروانی کے فرزند اور صدر یار جنگ
نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے پوتے ڈاکٹر ریاض الرحمٰن
خاں شیروانی علی گڑھ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد شعبہ عربی میں
۲۵ - ۳۰ سال استاد رہے - آج کل کشمیر یونیورسٹی
میں عربی و اسلامیات کے شعبہ کے صدر اور پروفیسر ہیں -

••

علی گڑھ اور جامعہ ملیہ

علی گڑھ نے حصول آزادی سے قبل کی اپنی ۷۲ سالہ زندگی میں کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ مسلمانوں میں مغربی تعلیم کی طرف رجحان اور ذہنی بیداری سب سے زیادہ اسی نے پیدا کی تھی۔ اس کے فرزندوں نے ہندستان کی سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی زندگی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور تاریخ کے صفحات میں اپنی جگہ محفوظ کرلی تھی۔ اس کے ارباب اقتدار کا جو بھی سیاسی مسلک رہا ہو، ہندستان کی تحریک آزادی میں اس کے فرزندوں کا حصہ کسی سے کم نہیں تھا، لیکن حصول آزادی سے قبل کی دس سالہ زندگی کی سیاسی کشمکش کے نتیجے میں اس پر ہر طرف سے طرح طرح کے حملے ہو رہے تھے اور اس کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس وقت ہندستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو، اور وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد تھے جنھیں سیاسی اختلاف رائے کے باوجود علی گڑھ کی اہمیت اور افادیت کا پورا پورا احساس تھا اور مولانا آزاد نے ۱۹۴۹ء میں مسلم یونیورسٹی میں جو کانووکیشن ایڈریس دیا اس میں اس کے طالب علموں کو یہ نوید دی کہ وہ ان کے لیے آزاد ہندوستان میں روشن مستقبل کے سارے امکانات دیکھ رہے تھے۔ ان ہی دونوں کی تحریک پر ۱۹۴۸ء کے اواخر میں ڈاکٹر ذاکر حسین جامعہ ملیہ کو چھوڑ کر علی گڑھ آگئے، اور مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی ذمہ داری سنبھالی۔ گویا مولانا محمد علی نے علی گڑھ کا قلعہ فتح کرنے کا جو خواب دیکھا تھا وہ اس طرح پورا ہوا۔ ذاکر صاحب کے آنے سے علی گڑھ کے لیل و نہار آہستہ آہستہ بدلنے لگے اور افسردگی و مایوسی کی جگہ نشاط و کامرانی کی فضا چھانے لگی۔ ذاکر صاحب کا آٹھ سالہ دور وائس چانسلری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا عہد زرّیں ہے۔ اس دور میں وہاں علمی کام کو بڑھاوا ملا، حرّیت فکر کو فروغ حاصل ہوا، اور نظم و ضبط بحال ہوا۔ سید احمد خاں علمی میدان میں آزادانہ تحقیق کے حامی تھے۔ ذاکر صاحب نے بھی اسی پر اصرار کیا ــــ کیسا عجیب اتفاق تھا، علی گڑھ تحریک کے ایک باغی کے ہاتھوں اس تحریک کے صالح عناصر کی بازیافت ہوئی! کوئی تحریک اس وقت تک اپنا مقصد پورا نہیں کرتی جب تک اس

تحریک کے بانی کی حقیقی منشا کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے۔ ذاکر صاحب اس نکتے سے واقف تھے، اس لئے انھوں
سید احمد خاں کے افکار پر عمل پیرا ہونے کی بڑی حد تک کوشش کی۔ لیکن زمانے کی اس ستم ظریفی کو کیا کہیے
کہ جن سید احمد خاں کے خلاف ان کی زندگی میں ان کی روشن خیالی کے باعث کفر کے فتوے صادر کیے گئے
تھے، اب بعض لوگ ان ہی کا نام لے کر تنگ نظری کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ذاکر صاحب نے اس کی ذرہ برابر بھی پروا
نہیں کی اور اپنے کام میں لگے رہے۔ ان کے ذہن میں علی گڑھ کا تصور یہ تھا کہ ہندوستانی قومیت کا مستقبل اس
بات پر منحصر ہوگا کہ علی گڑھ کیا سوچتا ہے اور علی گڑھ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ کام بہت بڑا تھا اور
اسے پورا کرنے کے لئے آٹھ سال کی مدت بالکل ناکافی تھی۔ تاہم جتنا ہوا وہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ ذاکر صاحب
۱۹۵۶ء میں علی گڑھ سے چلے گئے۔ ۱۹۶۵ء تک مسلم یونیورسٹی کم و بیش ان ہی خطوط پر چلتی رہی جو ذاکر
صاحب نے وضع کیے تھے۔ لیکن اس سال اس کی زندگی میں ایک حادثہ پیش آیا جس نے گھڑی کی سوئیاں پیچھے
کی طرف موڑ دیں۔ نواب علی یاور جنگ پر، جو اس وقت مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، بعض شر پسندوں
نے بعض غلط فہمیوں کی بنا پر حملہ کر کے انھیں بری طرح مجروح کر دیا۔ اب مرکزی حکومت میں نہ پنڈت جواہر لال نہرو
تھے اور نہ مولانا ابو الکلام آزاد، جو وسعتِ قلب کا ثبوت دے کر بگڑی کو بنا لیتے۔ علی گڑھ جس تباہی سے ۱۹۴۷ء
میں بچ گیا تھا اسے اب اس کا سامنا کرنا پڑا۔ جس ایکٹ کے تحت یونیورسٹی چل رہی تھی وہ منسوخ کیا گیا اور اس
کی جگہ ایک آرڈیننس جاری کر دیا گیا جس نے اس کی اندرونی خود مختاری ختم کر دی۔ اس کے خلاف مسلمانوں
کے ایک بڑے طبقے نے ملک گیر مہم چلائی۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آتے رہے ان کا تفصیلی ذکر مقصود نہیں،
غرض یہ کرنا ہے کہ ان حالات و واقعات نے مسلم یونیورسٹی میں ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ اسے آزاد ہندوستان میں
مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا جو اہم فریضہ انجام دینا تھا اور جس کی بنیاد ذاکر صاحب اپنے دورِ وائس چانسلری میں ڈال
گئے تھے وہ ادھورا رہ گیا، اور لوگوں کا دھیان دوسرے نسبتاً کم اہم اور وقتی کاموں کی طرف لگ گیا۔ دوسری طرف
احتجاج اور ہنگاموں نے ان عناصر کو ابھرنے کا موقع فراہم کر دیا جو ذہنی طور پر سید احمد خاں کے مشن اور مقاصد
سے ہم آہنگ نہیں تھے اگرچہ نام ان ہی کا لیتے تھے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے حصولِ آزادی سے کئی برس قبل
ایک موقع پر جامعہ کے طالب علموں کو مخاطب کرتے ہوئے مستقبل کے بارے میں فرمایا تھا:

"اس جامعہ کو بھی تحفیں میں سے بعض چلاتے ہوں گے۔ اس وقت روپے کی کمی نہ ہوگی، کرایہ

کی عمارتیں نہ ہوں گی، تعلیمی سامان کی کمی نہ ہو گی، کتب خانے میں نہ جانے کتنی کتابیں ہوں گی، تعلیم تمہارے ہاتھ میں ہو گی، سیاست تمہارے اشارے پر چلے گی، رائے عامہ پر تمہارا اثر ہو گا۔ آج ہم کمزور ہیں، اس وقت تم مضبوط ہو گے ان شاء اللہ۔ ہاں اس وقت بھول نہ جانا کہ تم نے اور تمہارے اگلوں نے بے غرض خدمت کو اپنا شعار بنایا، جو ٹھیک سمجھا وہ دل لگا کر کیا اور نتیجے کو خدا پر چھوڑ دیا۔"

ذاکر صاحب نے ایک دوسرے موقع پر جامعہ ملیہ کی حیثیت اور اس کے مقصد کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا تھا:

"میرے نزدیک جامعہ ایک اسلامی ادارہ ہے جس کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم ہے۔ اس تعلیم کی بنیاد دین اسلام اور تمدن اسلام ہے . . . اس بڑے مقصد میں چند اور مقاصد بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ ہیں: آزادی کی خواہش . . . اردو کی خدمت۔ خلاصہ یہ کہ جامعہ کے کام کی بنیاد اسلامی تعلیمات، آزادی کی خواہش اور اردو کی خدمت ہے۔"

بیشک حصول آزادی کے بعد جامعہ ملیہ میں روپے کی کمی نہیں رہی، کرایہ کی عمارتیں نہیں رہیں، تعلیمی سامان وافر مقدار میں مہیا ہو گیا۔ کتب خانہ کتابوں سے پُر ہو گیا۔ لیکن کیا ایثار اور قربانی کی وہ دولت اسی طرح باقی رہی جو اُس وقت حاصل تھی؟ اور کیا سیاست اور رائے عامہ پر اہل جامعہ کا اثر اُسی طرح قائم ہو سکا جس طرح ذاکر صاحب دیکھنا چاہتے تھے؟ اپنے تعلیمی کاموں میں بھی جامعہ کس قدر آزاد ہے، یہ کہنا دشوار ہے۔ بیشک جامعہ ملیہ آج بھی ایک اسلامی ادارہ ہے جو سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام کرتا ہے وہاں منجملہ دیگر علوم کے اسلامی تمدن کی تعلیم بھی دی جاتی ہے اُردو کی خدمت بھی وہاں کے اہل علم تصنیف و تالیف کے ذریعہ برابر کرتے رہے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں۔ لیکن اسلامی تمدن کی تعلیم ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر اور بھی متعدد درس گاہوں میں دی جاتی ہے اور اُردو تصنیف و تالیف کا کام اور مقامات پر بھی ہو رہا ہے۔

ان حالات میں دیکھنا یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کا جو اصلی مقصد تھا آزاد ہندوستان میں وہ کس حد تک پورا ہوا ہے اور آئندہ اس کے پورا ہونے کے کیا امکانات ہیں۔ علی گڑھ تحریک کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی تقلید پسندی اور توہم پرستی کو دُور کرنا تھا اور جامعہ ملیہ ایثار و قربانی کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کا ایسا تصور پیش کرنا چاہتی تھی جو بقول ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم دلوں کو جوڑتا ہے توڑتا نہیں ہے۔

جو کچھ اوپر عرض کیا گیا اس کی روشنی میں یہ سمجھنا چنداں دشوار نہیں کہ یہ دونوں ہی ادارے ابھی اس منزل سے بہت دور ہیں۔ لیکن ان اداروں کی خاکستر میں ایسی چنگاری یقینی پوشیدہ ہے جسے کرید کر شعلہ بنایا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کارکنوں، اساتذہ، اور طلبا کو ہمت و جرأت کا وہ سبق پڑھنا ہوگا جو سید احمد خاں اپنی ذاتی مثال سے انھیں پڑھانا چاہتے تھے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اراکین کو ایثار و قربانی کے اس نمونے کی پیروی کرنی ہوگی جو ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں نے اپنے عمل کے ذریعہ ان کے سامنے پیش کیا تھا۔ آزاد ہندستان کو سید احمد خاں کی جرأت و ہمت کی بھی ضرورت ہے اور ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں کے ایثار و قربانی کی بھی۔ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد اتنی ہے جتنی انڈونیشیا کو چھوڑ کر کسی مسلمان ملک میں بھی نہیں ہے اور اس ملک کی جو ہیئت ترکیبی ہے اس میں مسلمانوں کا رول بلاشبہ بہت اہم ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی راہ میں بہت سی دشواریاں حائل ہیں۔ لیکن دشواریاں تو ۱۸۵۷ء اور ۱۹۲۰ء میں بھی حائل تھیں۔ ان کی نوعیت یقیناً بدل گئی ہے۔ لیکن ان کی شدت میں میرے خیال سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ان دشواریوں کے باوجود مسلمان خود اپنی اور اپنے ملک کی خدمت صحیح طور پر اسی وقت انجام دے سکتے ہیں جب یہ دونوں ادارے ایسے نوجوان پیدا کریں جن کے دماغ روشن اور دل وسیع ہوں اور جو سچ کو سچ کہنے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں تامل نہ کریں، خواہ اس کے لئے انھیں کوئی بھی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ اس سچ کا مظاہرہ انھیں دوسروں کے مقابلے میں بھی کرنا ہوگا اور خود اپنے ہم مذہبوں کے مقابلے میں بھی۔ سچ کہنے کے ساتھ سچ سننے اور اسے برداشت کرنے کی عادت ڈالنا بھی ضروری ہے۔ اب جبکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو وہ اندرونی خود مختاری ایک مرتبہ پھر حاصل ہو گئی ہے جو اس سے ۱۹۶۵ء میں چھن گئی تھی، میں سمجھتا ہوں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ارباب حل وعقد کے ساتھ اس کے ارباب حل وعقد بھی اپنی توجہ اور صلاحیتیں اس کام پر پوری طرح صرف کر سکتے ہیں۔

ایک اور مسئلہ بھی قابل توجہ ہے۔ ایک طرف سائنس، ٹیکنالوجی اور سائنسی علوم کے میدان میں ان اداروں کو ملک کی دوسری درسگاہوں کے دوش بدوش چلنا ہوگا اور دوسری طرف ان علوم و فنون میں جو ان کی اسلامیت اور مشرقیت کے ضامن ہیں یعنی عربی، فارسی، اردو، اسلامیات اور دینیات[؟] ایسا معیار پیش کرنا ہوگا جیسا کہیں اور موجود نہ ہو۔ یہ صرف اس لئے ضروری نہیں ہے کہ جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ علوم و فنون ان کا طرۂ امتیاز ہیں اور ان سے ان کی شناخت ہوتی ہے بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اسلام کو پوری طرح سمجھنے اور دوسروں

کو سمجھنے کی خاطر ان کا حصول ناگزیر ہے۔ بہت سے مسائل محض غلط فہمیوں کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں ہندوستان میں ایک ہزار برس سے زیادہ مدت سے ساتھ ساتھ رہنے کے باوجود آج بھی یہاں بسنے والوں کے درمیان بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ غلط فہمیاں اسی وقت دور ہو سکتی ہیں جب ایک دوسرے کے مذہب اور روایات سے بھی واقفیت حاصل کی جائے۔ میرے نزدیک یہ کام ایک طرف بنارس ہندو یونیورسٹی اور دوسری طرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذریعہ سب سے بہتر طور پر انجام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے کھلے دماغ اور وسیع دل کی شرط ہے۔ سید احمد خاں کی تفسیر قرآن کے ہر حصے سے اتفاق ضروری نہیں لیکن اس کا درمیانی عقل اور عقیدے کے درمیان مفاہمت اس راہ میں ہماری رہنمائی ضرور کر سکتا ہے۔

مسلمانوں کی اقتصادی حالت دوسروں کی بہ نسبت کمزور ہے۔ اس لئے نادار مسلم طلباء کی تعلیم کا مسئلہ خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ کسی ہونہار اور باصلاحیت نوجوان کو محض پیسے کی کمی کی بنا پر تعلیم سے محروم نہیں رہنا چاہیئے۔ یہ فریضہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دیگر تعلیمی اداروں کی بہ نسبت زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں۔ علی گڑھ میں اس سلسلے میں بہت کچھ ہو بھی رہا ہے۔ خاص طور سے ڈیوٹی سوسائٹی جس کے بانی مسلم یونیورسٹی کے ایک نامور وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں تھے، اسی مقصد سے سرگرم عمل ہے لیکن یہ کام مزید اور زیادہ توجہ کا طالب ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کی خدمت نہیں ہوگی بلکہ ہندوستان کی خدمت بھی ہوگی کیونکہ تعلیم یافتہ باصلاحیت اور روشن خیال مسلمان ملک کے زیادہ اچھے اور کارآمد شہری ثابت ہو سکتے ہیں۔

علی گڑھ اور جامعہ کے بانیوں کے پیش نظر اپنے حدود سے باہر بھی مسلمانوں کی سماجی اور اقتصادی بہتری کا کام تھا اور یہ ادارے کسی نہ کسی حد تک یہ کام انجام دیتے رہے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بعض کارکنوں نے جن میں شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب کا نام سرفہرست ہے، تعلیم بالغان کی طرف خاص توجہ دی اور اس سے بہت سے لوگوں نے (جن میں غیر مسلم بھی شامل تھے) فائدہ اٹھایا۔ تقسیم ہند کے دنوں میں ذاکر صاحب کی قیادت میں اس ادارے کے اراکین نے بے گھر مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد نے پچھلے دنوں یوپی میں مسلمانوں کے صنعتی اداروں کا جائزہ لیا اور انھیں مفید مشورے دیے۔ اس یونیورسٹی کی تاسیس بہت دنوں تک اس لئے معرض التوا میں پڑی رہی تھی کہ اس کے ہمدردوں کی خواہش تھی کہ اسے مسلمانوں کے دوسرے تعلیمی اداروں کے الحاق کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ یہ خواہش تو پوری نہیں ہو سکی لیکن مسلم یونیورسٹی کے ارباب کار مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کی بہتری اور ترقی میں ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ اور اس کام میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا خاص رول رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کے کاموں کو نہ صرف جاری رکھا جائے بلکہ ان کی رفتار اور تیز کی جائے۔ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ صرف تعلیم گاہیں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت تحریکوں کی ہے، اور تحریکیں اسی وقت زندہ رہ سکتی ہیں جب کہ ان کا رشتہ اپنے عوام سے استوار رہے اور وہ ان کی فلاح و بہبود کی طرف سے غافل نہ ہوں۔

••

آل احمد سرور

• پروفیسر آل احمد سرور (پ ۱۹۱۱ء)

ہمارے عہد میں اردو کے ممتاز ترین نقاد، صاحبِ طرز ادیب، شاعر اور اس لحاظ سے اہم ترین دانشور جو ادب، مذہب، تہذیب اور سماج کے سبھی مسائل پر غور و فکر کرتے رہے ہیں اور مسائل پر جرأت کے ساتھ لکھ بھی رہے ہیں۔

فی الحال ڈائرکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر

کون کس سے مایوس

مسلمان اسلام سے ؟ یا اسلام مسلمانوں سے !

اس بات سے کوئی ہوش مند آدمی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کی تیرہ سو سال کی ایک شاندار تاریخ ہے اور اس نے دنیا کے ہر گوشے اور علم و عمل کے ہر دائرے پر اپنا اثر چھوڑا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں ایک مدت تک دنیا کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، مگر جدید دور میں صورت حال بدل گئی ہے۔ بقول مارشل ہاجسن اس وقت دنیا کی آبادی کا ۱۲ فی صد حصہ مسلمان ہے اور اگرچہ اسلامی ممالک ایشیا اور افریقہ میں بڑی تعداد میں ہیں اور ہندوستان میں بھی اُن کی آبادی ۱۲ فیصد سے کم نہیں ہے، مگر سائنس اور ٹیکنالوجی، علم و فن، صنعت و حرفت، خوشحالی اور اقتصادی ترقی کے لحاظ سے مسلمان مغرب سے بہت پیچھے ہیں۔ بیشتر اسلامی ممالک کا شمار ترقی پذیر ممالک میں ہوتا ہے اور ان کا معیارِ زندگی ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں خاصا پست ہے۔ مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں تیل کے ذخائر کی دریافت نے ان علاقوں کے باشندوں کو خوش حالی عطا کی ہے مگر علمی اور سائنسی لحاظ سے یہ اب بھی ترقی یافتہ نہیں کہے جا سکتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ازمنہ وسطیٰ تک ذہنی اور مادی قیادت کے بعد مسلمان جدید دور میں کیوں پیچھے رہ گئے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے دور ہو گئے، یا اسلام ان کی ترقی کے راستے میں حارج ہوا؟ مغرب نے اتنی آسانی سے ان پر کس طرح غلبہ حاصل کر لیا؟ یہ بھی واقعہ ہے کہ اسلام کے اندر اتنی اندرونی طاقت موجود ہے کہ جب اُسے کسی ابتلا کا سامنا ہوا، یا کوئی بحران پیدا ہوا تو کسی نہ کسی تحریک نے اسے ایک نئی زندگی عطا کی۔ یہ تحریکیں احیا کی بھی تھیں اور اصلاح کی بھی۔ دوسری جنگ عظیم نے دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملک جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی آزاد ہوئے۔ ان کے یہاں قومیت کا جذبہ بھی بڑھا۔ ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں قومیت کے فروغ کے ساتھ مسلمانوں کے مخصوص مسائل اور ان کے مستقبل پر غور و فکر شروع ہوا۔ سائنسی طرزِ فکر کے پیدا کردہ مسائل، صنعتی زندگی کے پیدا کردہ مسائل، مغرب سے مستعار لئے ہوئے جمہوری اداروں کے پیدا کردہ مسائل ایسے ہیں کہ ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا ہر طرح مضر ہوگا۔ اس لئے ہر ایسی

کوشش جس میں ایک طرف اسلام کی بنیادی خصوصیات کا جائزہ لیا جائے، اور اس کی توانائی اور طاقت کی روح دریافت کی جائے اور دوسری طرف موجودہ دور کی برکتوں اور لعنتوں کا معروضی مطالعہ کیا جائے، یقیناً موجودہ دور کے آشوب سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری مدد کر سکتی ہے اور مضطرب اور سراسیمہ انسانیت کے لئے راہ فلاح کی نشان دہی کر سکتی ہے۔

دراصل آج مذہب کے متعلق ایک بڑے طبقے کا مرض یہ ہے کہ ایک جذباتی لگاؤ کے باوجود مذہب پوری زندگی کا رہنما نہیں ہے۔ اسے چند عقاید اور عبادات میں محصور سمجھ لیا گیا ہے۔ معاملات کے سلسلے میں جدید دور کی ضروریات کی فکر نہیں ہے۔ اسلام میں قرآن کے احکام، حدیث کے ذریعے سے اُسوۂ حسنہ پر نظر کے علاوہ قیاس، اجماع اور اجتہاد کے ذریعے سے ہر دور کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت موجود ہے، مگر ہمارے علما شریعت کے حصار میں رخنہ پڑ جانے کے اندیشے سے عملاً اجتہاد کا دروازہ بند کر دیتے ہیں، گو نظری طور پر وہ اس کی ضروریات کو تسلیم کرتے ہیں۔ پھر اُن کے سامنے دارالسلام یا دارالحرب یا دارالامن کی اصطلاحیں ہیں۔ اسلام کی تاریخ میں ایسا بھی ہوا ہے کہ علما کی فکر جامد ہوگئی اور انھوں نے نزاع کے اندیشے سے جابر حکومتوں کے خلاف آواز بلند نہیں کی کیونکہ ان کے نزدیک جابر حکومت بدامنی کے مقابلے میں بہتر تھی۔ پھر انھوں نے تقلید کو اپنا شیوہ بنایا اور حریتِ فکر سے بھڑکتے رہے۔ دولت اور طاقت، یہ دو چیزیں ایک نشہ پیدا کرتی ہیں اور ان کے زیر اثر عدل، مساوات اور اخلاق کی طرف سے روگردانی برتی جاتی ہے۔ اسلام نے ان پر پابندیاں عاید کی ہیں، لیکن مطلق العنان حکومتوں اور اُمرا نے اپنی من مانی کرنے سے گریز نہیں کیا۔ اس مرحلے پر تصوّف کی تحریک نے سماجی اصلاح، اخلاق کی درستی اور خدا اور رسول سے لگن پیدا کرنے میں بڑی مدد کی، اور تصوّف نے اسلام کے مشن کو پھیلانے میں جو نمایاں کام انجام دیا ہے اس کا اعتراف ضروری ہے۔ مگر رفتہ رفتہ تصوّف بھی مزاج، خانقاہی اور ترکِ دنیا کے فلسفے کا شکار ہوگیا اور مسلمانوں کے عملی قوی شل ہوگئے۔ جدید دور کا چیلنج دراصل اسلام کو سب سے بڑا چیلنج ہے کیونکہ جدید دور نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے سے انسان کو جو اقتدار عطا کیا ہے اور جس طرح فضا اور بحر و بر پر اس کی حکومت ہوگئی ہے، اُس سے انکار ممکن نہیں ہے مگر اس ترقی نے کچھ مسائل بھی پیدا کیے ہیں اور اقبال کے الفاظ میں جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا ہے، وہ زندگی کی شبِ تاریک کو سحر نہیں کر سکا ہے۔ چنانچہ ضرورت اس بات

کی ہے کہ اسلام کی روح کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور اس کے آفاقی اور اخلاقی مشن کی روشنی میں انسان
کی مادی، ذہنی اور روحانی ضرورتوں کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ زمانہ پیچھے کی طرف نہیں جا
سکتا، گھڑی کی سوئی ماضی کی طرف نہیں موڑی جاسکتی۔ ہم قرونِ اولیٰ میں واپس نہیں جاسکتے، ہاں
قرونِ اولیٰ کی روح کی مدد سے آج بھی تازہ بستیاں آباد کرسکتے ہیں۔ جس طرح ہم ماضی میں واپس
نہیں جاسکتے، اسی طرح موجودہ دور کے سیلاب میں تنکے کی طرح بھی نہیں بہہ سکتے۔ شاہ ولی اللہ،
سرسید، مولانا آزاد اور اقبال نے دین اور شریعت کا فرق واضح کیا تھا اور اجتہاد کی ضرورت پر
زور دیا تھا۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ" میں اس بات پر
زور دیا ہے کہ حکمت ولی اللہی آج بھی ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے۔ قرآن ہماری اساس ہے اور علم اعتقاد
اس اساس کو مستحکم کرتا ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے نزدیک قرآن اسلام کی اجتماعی تحریک کا اساسی
قانون ہے اور اصولِ فقہ کو آج کل کی اصطلاح میں "بائی لاز" کہا جاسکتا ہے۔ اگر اس نکتے کو سمجھ لیا
جائے، تو جدید دور کی بہت سی مشکلات رفع ہوسکتی ہیں۔ اسی لئے اجتہاد اسلام کی آفاقی اور اخلاقی
تعلیم کے ہر دور میں جاری و ساری رکھنے کا دوسرا نام ہوجاتا ہے، اور اس کی جتنی ضرورت آج ہے،
کبھی نہ تھی۔ لیکن اجتہاد کا حق قرآن کی تعلیم اور سیرت رسول کی روشنی میں ہی استعمال کیا جاسکتا
ہے! یہ جدھر کی ہوا ہو، اُدھر کو پھر جانے کا نام نہیں ہے۔ بہرحال اس وقت ان مسائل پر سنجیدگی
سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

روٹی روزی کے مسئلے کی اہمیت مسلّم ہے اور کوئی ایمان دار آدمی اس کی اہمیت سے
انکار نہیں کرسکتا۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ تہذیب و اخلاق انسان کو ایک سمت اور مقصد عطا کرتے ہیں،
اس لئے دراصل دونوں میں توازن پیدا کرنا ہی دانش مندی ہے۔ اس طرح تغیر اور تسلسل دونوں
کے تقاضوں کو سمجھنا اور برتنا، پھر بنیادی اور جزوی باتوں میں فرق کرنا بھی ضروری ہے۔ آج زندگی
پیچیدہ بھی ہے اور قدرتی وسائل کے اندھے استعمال کی وجہ سے اور بڑھتی ہوئی آبادی کے دباؤ
کی وجہ سے نئے خطرات سے دوچار بھی ہے۔ اس لئے موجودہ دور اپنے سارے امکانات کے ساتھ
ایک چیلنج ہے، انسانیت کی بہتر تنظیم اور سماج کی تفہیم کے لئے۔ اسلام اس کام میں ہماری رہنمائی
کرسکتا ہے بشرطیکہ ہم اضطراب اور خوف اور بے یقینی کی دلدل سے نکل سکیں اور اپنے

آپ کو سمجھتے ہوئے کائنات اور اس کے قوانین اور آداب کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

سولہویں صدی عیسوی تک مسلمانوں نے علوم کی اہمیت کو مدنظر رکھا۔ اُس کے بعد ان کے یہاں علم کی طرف سے بے توجہی اور تحقیق و تجربے کی طرف سے بے پروائی عام ہوگئی۔ نتیجے میں انسانیت کے کارواں کی ترقی مغرب کے ہاتھ میں آگئی۔ مغرب نے انسانیت کو جو کچھ دیا ہے اُسے نظرانداز کرنے یا اس کی تحقیر سے کام نہ چلے گا۔ مغرب کی ترقی' دراصل علوم کی ترقی اور سائنس کی ترقی سے عبارت ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسان کو جو اقتدار دیا ہے فرد کی آزادی پر جو توجہ کی ہے' سماج کی اصلاح میں اس کا جو رول ہے' جمہوری تصورات اور جمہوری اداروں کے فروغ میں جو اس کا کارنامہ ہے' معیار زندگی بڑھانے میں جو اس کی سعی بلیغ ہے' انسان کے علم اور اس کے وسائل میں جو اس کا اضافہ ہے' اسے تسلیم کرنا ضروری ہے۔ جدید کاری (MODERNIZATION) اب صرف مغرب کی جاگیر نہیں' یہ ساری دنیا میں ایک کارکشا اور کارساز طاقت ہے' لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کے لئے مغرب کی آنکھ بند کر کے تقلید کی جائے۔ ہر ملک اور ہر قوم کو جدیدکاری کے عمل سے اپنی تاریخ' اپنی روایات' اپنے ماحول اور اپنے مزاج کے مطابق گزرنا ہے۔ مغرب کی ترقی نے کچھ مسائل بھی پیدا کیے ہیں جو وہاں کی تاریخ اور فکر و فن کے مخصوص میلانات کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارا کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم ترقی کے راستے میں چند افراد کی خوش حالی پر نظر نہ رکھیں بلکہ پورے سماج کی خوش حالی پر زور دیں۔ ہم دولت کے حصول کو زندگی کا نصب العین نہ سمجھیں' بلکہ تقویٰ اور پرہیزگاری کو اپنا شعار بنائیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ دولت اور اقتدار کا نشہ بہت سی اخلاقی خرابیوں کا باعث ہوتا ہے۔ اسلام نے اسی لئے دولت کو محدود رکھنے اور اقتدار کو اعلا انسانی اقدار کے تحت برتنے پر زور دیا ہے۔ پھر ہمارے یہاں علوم اور نئی معلومات کی طرف سے ایک خوف ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم جدید علوم کی تحصیل کرلیں گے تو ہمارے پاس جو کچھ رہ گیا ہے' وہ اغیار کی نذر ہوجائے گا۔ ہمارے علما کو اس عہد' اس زمانے' اس کے مسائل اور اس کے امکانات کا احساس نہیں ہے۔ ان کے پاس جو علمی سرمایہ ہے وہ ازمنۂ وسطیٰ کی دین ہے اور آج کی دنیا جدیدیت (MODERNITY) کے راستے پر گامزن ہے۔ زندگی تسلسل اور تغیر دونوں میں توازن سکھاتی ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اسلامی اقدار کو بنیاد بنا کر نئے زمانے

اور نئے حالات سے عہدہ برآ ہوں ۔ اسلام کی روح میں جو حرکت کا عنصر ہے، اس پر اقبال نے اپنے خطبات "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" میں بجا طور پر زور دیا ہے ۔ اُنھوں نے کہا ہے کہ حرکت کا یہ عنصر مسلسل اجتہاد کا مطالبہ کرتا ہے ۔ اسلام نے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھنے کی وجہ سے اس نظر کی گنجایش رکھی ہے مگر افسوس یہ ہے کہ اس کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اس سلسلے میں کوئی نمایاں کام نہیں ہوا ہے ۔ حالات کے دھارے پر تنکے کی طرح بہنے اور جدید کاری کے عمل میں بہت سی باتوں کو چار و ناچار اختیار کرنے کے بجائے رَدّ و قبول کے ایک ایسے ہوش مند رویّے کی ضرورت ہے، جو انسان کی انسانیت برقرار رکھے ۔ لیکن "تشنیوں کے دعوئیں نے سیہ پوش" اور "بیکاری و مے خواری و عریانی و افلاس" کے مغرب و مشرق کے راستے سے الگ اخلاقی اور سماجی خیر کی طرف عوام کو لے جائے ۔ مغربی تعلیم سے بہرہ ور اشخاص سے امید بھی کہ وہ اس سلسلے میں رہنمائی کریں گے، مگر وہ ہماری اپنی جڑوں سے کٹ گئے ہیں اور مغرب کی ذہنی غلامی نے انھیں ہمارے کام کا نہیں رکھا ۔ علما کو اس کرب، اس ذہنی، اس ابتلا، اس آشوب کا احساس نہیں ۔ وہ اپنے بسم اللہ کے گنبد میں مگن ہیں ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مغربی تعلیم سے بہرہ ور اشخاص اور جدید علوم کے ماہرین اپنی بنیاد، اپنی تاریخ اور اپنے علوم سے واقف ہوں اور انھیں فرسودہ اور از کار رفتہ سمجھ کر نظر انداز نہ کریں ۔ دوسری طرف علما کو بھی ان مسائل معاملات، ترقیات اور میلانات سے آگہی حاصل کرنی چاہیے جو اس دور کی خصوصیت ہیں ۔ اس کے ساتھ دونوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف تنگ نظری کا مظاہرہ نہ کریں بلکہ مل بیٹھ کر تبادلۂ خیالات کر کے ایک دوسرے کے نقطۂ نظر پر غور کر کے آج کے سفر میں اپنی سمت متعین کریں اور اپنے سماج اور اپنی قوم اور انسانیت کی فلاح و بہبود کی طرف اپنی ساری کوشش مرکوز کر دیں ۔ اقبال نے اپنی ایک مشہور نظم "پیر رومی و مرید ہندی" میں آج کے مسائل کا جو تجزیہ کیا ہے، اور اُن کا جو حل پیش کیا ہے، وہ آج بھی ہماری رہنمائی کر سکتا ہے ۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ علم حاضر سے دین زار و زبوں ہو جاتا ہے، ان کے لئے رومی کی یہ ہدایت ہے کہ علم کو تن کے لئے نہیں، دل کے لئے کام میں لاؤ ۔ سلاطین کے ندیم ہونے کی کوشش نہ کرو، بلکہ کسی مرد روشن دل کا بندہ ہو ۔ دانائے دین کو ابلہ دنیا نہیں بننا چاہیے، کیونکہ جو افلاک کی سیر کر سکتا ہے اس کے لئے زمین پر چلنا (یعنی دنیا کے ہنگاموں کو سہل کرنا) مشکل نہیں ہونا چاہیے ۔ پھر یہ خاص نکتہ بیان کیا ہے کہ علم و حکمت نانِ حلال سے پیدا ہوتے ہیں اور عشق و رقت بھی اسی سے آتی ہے ۔ آخر میں اس نظریے کے جواب میں کہ ہند میں اب نہ

نور ہے نہ سوز، اور اہلِ دل اس دیش میں تیرہ روز ہیں، یہ حیات افروز اور ولولہ انگیز پیام ملتا ہے کہ مردوں کا کام روشنی اور گرمی پھیلانا ہے۔ ہاں پست فطرت لوگوں کا کام حیلہ سازی اور بے شرمی ہے۔

آج کا مسئلہ یہ ہے کہ مادیت، ہوسِ زر، بے لگام انفرادی آزادی، اخلاقیات کے زوال، اقتدار کی ہوس، بے جا توقعات، سیاست کی بے اصولی، سرمایہ کی چیرہ دستی، سستی مسرت اور لذت کی تلاش، ریڈیو اور ٹیلی ویژن اور اخباروں میں کاروباری یا تجارتی نقطۂ نظر نے ایسی مقبولیت حاصل کرلی ہے کہ ساری ترقی کے باوجود انسانیت کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ یہ خطرہ آسانی سے نہیں ٹل سکتا۔ صنعت کاری سے اور مشین سے مفر نہیں ہے، مگر صنعت کاری کو انسانی مقاصد اور واقعی اور حقیقی سماجی ضروریات کے تحت ہونا چاہیئے۔ اور مشین کی انسان پر حکومت کے بجائے، انسان کی مشین پر حکومت ہونی چاہیئے۔ یہ کام صحت مند اور صالح بنیادوں پر منصوبہ بندی چاہتا ہے اور اس منصوبہ بندی کے لئے ایسے دانشوروں کو سامنے آنا چاہیئے جو قدیم و جدید کی حد بندی میں اسیر نہ ہوں بلکہ دونوں پر نظر رکھتے ہوں۔ اس منصوبہ بندی کا مقصد ذہنی، اخلاقی، سماجی، معاشرتی، تعلیمی، سیاسی، سبھی دائروں میں ایسی تبدیلی لانا ہوگا، جو حقوق اور فرائض کے درمیان توازن قائم کرے، جو انسان کو شیطان کا مرید بننے کے بجائے خدا کا خلیفہ بننے کا اہل کرے اور جو دنیا کو ہلاکت اور تباہی کے بڑھتے ہوئے خطرے سے بچا کر امن و آشتی، اخوت و مساوات کی جنت بنا سکے۔

○

جدید دنیا، ایک ایسی حقیقت ہے، جس کے پیچھے ایک سائنسی نظر، ایک جدید کاری کا عمل، ایک صنعتی نظام، ایک سماجی انقلاب، ایک جمہوری سفر، ایک اخلاقی رویہ ہے۔ اسے نہ تو محمد حسن عسکری کی طرح گمراہیوں کا ایک سلسلہ کہا جاسکتا ہے نہ کچھ تہذیب کے فرزندوں کی طرح انسانیت کی نجات کا واحد راستہ! ہمارا فرض ہے کہ ہم وقت کے سمندر میں اس موج کو خلاصۂ کائنات نہ سمجھیں بلکہ وقت کا عرفان حاصل کریں۔ اور ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ اس موج کی عظمت اور طاقت کو بھی ذہن میں رکھیں۔

جدید دنیا کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس کی طاقت اور کمزوری کیا ہے؟ کن عناصر سے اس کی تشکیل ہوئی ہے، اور انسانیت کو اس نے کہاں پہنچایا ہے؟ کیا جدید دنیا مغربی اثرات کی نمود کا دوسرا

نام ہے؟ کیا اس کا محور مغربیت ہے؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات' جدید دنیا کا نام آتے ہی ہمارے
سامنے آتے ہیں۔ ان سب کا مختصر اور شافی جواب آسان نہیں ہے۔ پھر بھی یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ جدید
دنیا کی پہلی خصوصیت روایتی نقطۂ نظر کے بجائے عقلی اور سائنسی نقطۂ نظر ہے۔ عقلی اور سائنسی نقطۂ نظر
کے نشانات جدید دور سے پہلے بھی ملتے ہیں' مگر اس کی حکمرانی نہیں ملتی۔ چنانچہ روایتی سماج سے عقلی سماج
تک ترقی' جدید دور کی خصوصیت ہے۔ اس دور میں رنگ' نسل' حسب نسب کے بجائے ذاتی صلاحیت
معیار بنتی ہے۔ ترقی ایک قدر کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ سائنس کی ترقی ٹیکنالوجی میں ترقی کا باعث ہوتی
ہے اور ٹیکنالوجی انسان کو اتنا اقتدار اور اتنے وسائل عطا کرتی ہے کہ بنی نوع انسان' اقتصادی' سماجی'
اور ذہنی ترقی کی بہت سی منزلیں طے کر لیتا ہے۔ تکنیکی مہارت زندگی میں ایک کیفیاتی (QUALITATIVE)
تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔ روایت اور اس کے تسلسل کا احساس رہتا ہے مگر روایت کی جبریت' اس کی
آمریت باقی نہیں رہتی۔ تخصیص' آفاقی انسان کے بجائے ماہرین پیدا کرتی ہے۔ فرد کی آزادی بنیادی
اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کی صلاحیت' سماج میں اس کے درجے کو متعین کرتی ہے۔ جمہوری تصورات کو
ترقی ہوتی ہے اور اقتدار میں عوام کا حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی' صداقت اور آزادی کے
علامت بن جاتے ہیں۔ جدید کاری کا عمل ایک طور پر صنعت کاری کا عمل ہے۔ اور زراعت میں ترقی بھی صنعت کاری
کی مرہونِ منت ہو جاتی ہے۔ ماورائی اور مابعد الطبیعیاتی تصورات' یہاں تک کہ مذہب کی گرفت
ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ سماجی رشتوں میں تبدیلی ہوتی ہے اور خاندان کی مرکزیت باقی نہیں رہتی۔ عورتوں کی
آزادی اور ان کی زندگی کے بہت سے شعبوں میں شرکت سے پرانے سماجی اور اخلاقی خیالات کو خاصی زک
پہنچتی ہے۔ جامد مشرق' مغرب کی تکنیکی مہارت کی وجہ سے نہ صرف اس سے مغلوب ہو جاتا ہے' بلکہ اس
کی تقلید پر مجبور ہوتا ہے۔ جدید کاری مغرب کے نقش قدم پر چلنے کے مترادف ہو جاتی ہے۔

لیکن اس ترقی نے کچھ مسائل بھی پیدا کیے ہیں' اور جدید کاری کو چونکہ مغرب کے راستے پر چلنے کا
دوسرا نام مان لیا گیا ہے' اس لئے مغرب کے ان مسائل سے اب مشرق بھی دوچار ہے۔ عقلی اور سائنسی نقطۂ نظر
میں اتنی رعونت آگئی ہے کہ وہ اپنے حدود کو بھلا بیٹھا ہے۔ مادی خوشحالی اور صارفیت (CONSUMERISM)
کے فلسفے نے بدن کو بیدار اور روح کو خوابیدہ ... ہے۔ انسان کا مشین پر حکومت نہیں ہے مشین حاکم ہو گئی
ہے جمہوری ادارے جمہور کی آواز نہیں ہے' حکومت یا سرمایے کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئے ہیں۔ فرد

کی آزادی کی لے اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ ہر سماجی اور اخلاقی پابندی سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ طاقت کی پرستش نے بے رحمی اور سخت دلی پیدا کی ہے۔ عورت کی بے لگام "آزادی" نے اُسے شتر بے مہار بنا دیا ہے اور وہ مردوں سے ہزاروں سال کے ظلم و جبر کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ تعلیم نے مہارت پر زور دیا ہے، سیرت سازی پر توجہ نہیں کی۔ اس نے علم دیا ہے، بصیرت نہیں دی۔ ہُنر دیا ہے، نظر نہیں پیدا کی۔ سرمایہ دارانہ سماج، فلاحی ریاست کے ذریعے سے اپنی اصلاح کی ناکام کوشش کر رہا ہے، مگر اشتراکی سماج نے بھی جو عوام کی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، بقول جلاس ایک نئے طبقے کو جنم دیا ہے جو مادیت اور اقتدار کو سب کچھ سمجھتا ہے اور پُرانے تہذیبی ورثے سے صرف ایک عجائب خانے کی زینت کا کام لیتا ہے۔

جدیدیت سے تو مفر نہیں ہے، لیکن جدیدکاری کے عمل کو مغرب کے نقش قدم پہ آنکھ بند کر کے چلنے سے روکا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم جدید دَور اور جدیدکاری کے مضمرات کو سمجھیں۔ یہ مضمرات، جدید سماجوں میں جو کچھ فتوحات ہوئی ہیں اُن میں یکسانیت دیکھنا اور اسی طرح دوسرے سماجوں میں جو جدیدیت سے متاثر ہو رہے ہیں توقعات کی یکسانیت کو مدنظر رکھنا ہیں۔

جو فتوحات یا توقعات کی یکسانیت ہے، اس کی بنیاد میں اقتصادی پہلو کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس لئے اقتصادی ترقی جدیدکاری کا ایک اچھا معیار ہے۔ جدیدکاری وہ سماجی ماحول پیدا کرتی ہے جس میں ہر شخص کی دولت میں اضافہ کرنے کی اہمیت ہے اور دولت آفریں رویّے کو ملحوظ رکھنے اور اُس کو عام بنانے کی وجہ سے تمام سماجی قدروں، جیسے طاقت، احترام، محبت، خوش حالی، مہارت اور روشن خیالی کی نئی تشکیل ہوتی ہے اور ان سے نیا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ ترقی کے لئے اقتصادی عوامل اور دوسرے عوامل میں باہمی رشتوں کے اس احساس کا نام جدیدکاری ہے، جو ایک طرف عمومی جواز رکھتا ہے اور دوسری طرف ساری دنیا کو اپنے دائرے میں لے لیتا ہے۔

جدیدکاری میں اقتصادی نظام کی ترقی پذیری، سیاسی نظام میں عوامی رول اور جمہوری نمائندگی، تہذیب میں عقلی اور دنیوی معیار، سماج میں نقل و حرکت کی آزادی (جو جدوجہد کی تمنائیں اور آرزوئیں پیدا کرے) کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس طرح جدیدکاری صرف اس ترقی کا نام نہیں جو پیداوار اور خرچ میں اضافہ کرتی ہے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ سماجی اداروں کے ذریعے سے انسانی وسائل کی نئی تنظیم بھی ہے۔ چنانچہ صنعت کاری، شہروں کی طرف میلان، اقتصادی ترقی، روشن خیالی (جو تعلیم اور MASS MEDIA کے ذریعے

وجود میں آئے) سیاسی اقتدار میں شرکت اور شخصیت میں تغیر اور تسلسل کا توازن قائم کرنے کی صلاحیت۔
یہ سب جدید کاری کی ایسی خصوصیات ہیں جن سے انکار ممکن نہیں ہے۔ جدید کاری، اہلِ نظر کی تازہ بستیاں
آباد کرنے کا نام بن چکی ہے اور اس عمل کو اس کی برکتوں کے علاوہ اس کی لعنتوں کے ساتھ ذہن میں رکھنا
ضروری ہے۔ صرف برکتوں پر اصرار جتنا غلط ہوگا، اتنا ہی صرف لعنتوں پر اصرار بھی۔

آج صورت حال یہ ہے کہ ایشیا اور افریقہ میں ان ملکوں کی آزادی نے جو کل تک مغرب کے غلام تھے،
جدید کاری کے عمل کو اتنی تیزی سے روایتی سماجوں تک پہنچا دیا ہے کہ وہ توازن قائم نہیں رکھ سکے۔ اگر یہ
عمل آہستہ آہستہ ہوتا تو شاید تبدیلی اتنی ہوش رُبا اور قیامت خیز نہ ہوتی۔ مگر تبدیلی وقت کا تقاضا اور
فطرت کا قانون ہے۔ مغربی سماج میں جو مسائل پیدا ہوئے، ان کے حل کی طرف توجہ بھی ہے، خواہ اس حل سے
ہمیں کتنا ہی اختلاف ہو۔ مگر مشرقی سماجوں کے مسائل میں مغربی حل تمام تر کام نہیں آسکتے۔ کیونکہ کوئی سماج
بیرونی اداروں کو بجنسہ اپنے یہاں نافذ کر کے صحت مند نہیں رہ سکتا۔ اسے ان اداروں کے تصورات کو
اپنے طور پر اپنانا ہوتا ہے۔

چنانچہ اس وقت مشرق، خصوصاً دنیائے اسلام کا مسئلہ یہی ہے کہ اس کا جدید کاری کے عمل سے
سابقہ ہے اور اسے وقتی طور پر اپنی فلاح مغربیت ہی میں نظر آتی ہے۔ اگر اس کے روایتی سماج میں جو حرکی
عناصر ہیں، ان کی طرف توجہ ہوتی اور جامد عناصر کا غلبہ نہ ہوتا تو وہ اس تبدیلی کے لئے مناسب سانچے وضع
کر لیتا اور آنکھ بند کر کے مغربی سانچوں پر تکیہ نہ کرتا۔ مگر اس کے یہاں اس تبدیلی کے لئے ذہنی آمادگی تو کیا،
ایک قسم کا خوف ہے، اپنے خول میں سکڑنے کا جذبہ ہے، پھیلنے اور پھیلانے، خدا کی زمین میں ہاتھ پاؤں مارنے
کا عزم نہیں ہے۔ تجربے سے جھجک ہے، ایسے علم سے ہراس ہے جو مسائل اور مشکلات پیدا کرے، آگے
دیکھنے کی اُمنگ نہیں ہے، صرف پیچھے دیکھنے کی صلاحیت ہے۔ تبدیلی کو قبول کرنے سے پس و پیش ہے،
ہاں چار و ناچار تبدیل ہوجانے کو قسمت کا کھیل سمجھ کر گوارا کرنے کی عادت ہے!

ستم ظریفی یہ ہے کہ اس نفسیاتی گرہ، سماجی پس ماندگی اور ذہنی جمود کے لئے سہارا اسلام
سے لیا جاتا ہے۔ جو دنیا کو آخرت کی کھیتی کہہ کر صاف کہتا ہے کہ دنیا انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے، جو فطرت
کے مشاہدے کو اور خدا کی نشانیوں کو ضروری سمجھتا ہے، جو ایک منصفانہ سماج اور ایک اخلاقی نظام کو
مرکزی اہمیت دیتا ہے، جو علم کے حصول پر کوئی حد مقرر نہیں کرتا، جو مساواتِ انسانی کا علمبردار ہے، جو

مرد عورت کی برابری کا قائل ہے، جو بھائی چارے اخوت اور انسانی برادری پر زور دیتا ہے، جو امن و آشتی کی تلقین کرتا ہے، جو عقیدے اور عبادت کے ساتھ ساتھ معاملات میں عدل و انصاف پر اصرار کرتا ہے، جو فرد کو عمل پر اکساتا ہے اور اس کی تخلیقی صلاحیت کو بیدار کرتا ہے، جو حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کو ضروری سمجھتا ہے۔ جو دولت کے چند افراد یا گروہوں کا اجارہ ہونے کے قطعی طور پر خلاف ہے، جو زمین کو خدا کی ملکیت سمجھتا ہے، جو جمہوریت پسند ہے، جو اپنی تعلیم کی ابدیت کے باوجود وقت اور حالات کی تبدیلی میں اجتہاد کے لئے دروازہ کھلا رکھتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حقیقی اسلام اور تاریخی اسلام میں فرق نہیں کیا گیا۔ حقیقی اسلام اپنے کو خدا کے حوالے کرنے کا نام ہے۔ مگر آج عام طور پر اسلام کے معنی اسلام کی پوری تاریخ کے لئے جاتے ہیں جس میں ظاہر ہے، اس طویل عرصے میں بہت سے غیر اسلامی عناصر بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اس میں شہنشاہیت اور اس کے ظلم و جبر کی خونیں داستانیں بھی ہیں اور تصوف کی وہ بے اعتدالیاں بھی ہیں جو مزاجِ خانقاہی کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں۔ پھر جاگیرداری کے دور کی وہ روایات بھی ہیں جن میں بہت سی فرسودہ ہو گئی ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم جدید کاری کے عمل سے نہ تو اس طرح مرعوب ہوں کہ آنکھ بند کر کے مغرب کے راستے پر گامزن ہو جائیں اور نہ اس سے اس طرح دامن بچائیں گویا یہ گمراہی اور پستی، شیطنت اور بے راہ روی کا دوسرا نام ہے۔ بلکہ اس زریں اصول پر عمل کریں جو 'خذ ما صفا و دع ما کدر' کے مقولے میں پوشیدہ ہے۔

یہ بات اب کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ مادیت کے فروغ نے دولت کی ہوس پیدا کی ہے اور اس دولت کی ہوس نے بہت سی سماجی اور اخلاقی بدعنوانیوں کو جنم دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان اسلامی ممالک میں بھی جہاں تیل کی وجہ سے دولت کی فراوانی ہے، ایک انتشار پیدا ہوا ہے اور اوپر کی اسلامی زندگی کے اندر بہت سی اخلاقی خرابیاں وجود میں آ گئی ہیں۔ اس لئے ہر ایسے سماجی نظام کے قیام کی خواہش، جس میں دولت چند افراد یا حکومت کے چند افراد کے ہاتھ میں نہ ہو، بلکہ سب کو اس کا مساوی حصہ ملے، عین اسلامی ہے۔ اسلامی سوشلزم اور کمیونزم میں صرف یہ فرق ہی اہم نہیں کہ اس میں تاریخی مادیت اور اس کی بنا پر لامذہبیت کو مرکزی اہمیت دی گئی ہے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ اس میں صارفیت یا (CONSUMERISM) پر توجہ ہے۔ جب کہ اسلام، سادگی، اور ایک طرح کی پرہیزگاری یا تقویٰ (ASCETCISM) سکھاتا ہے۔ اس زہد اور مسیحی زہد میں فرق یہ ہے کہ اسلامی زہد دنیا کو قبول کرتا اور خدا کی دی ہوئی نعمتوں پر سب کا حق سمجھتا ہے، جبکہ

مسیحی زہد ترک دنیا کی تلقین کرتا ہے اور زندگی کو بھی ایک گناہ سمجھتا ہے۔

پھر اسلام، جمہوری طرز حکومت کے حق میں ہے۔ جمہوری طرز حکومت یا جمہوری ادارے، مغرب کی جاگیر نہیں انسانی ادارے ہیں۔ لیکن مغرب میں جمہوریت کا جس طرح فروغ ہوا ہے، وہ وہاں کے مخصوص تاریخی حالات کی وجہ سے ہوا ہے اور ہم اس بات کو پھر دہرائیں کہ کوئی ادارہ بجنسہٖ کہیں سے لایا جائے تو اس سے الجھنیں پیدا ہوں گی اور اگر اس کو اپنے مخصوص حالات کی روشنی میں اپنی تاریخ اور اپنے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے طور پر نافذ کیا جائے تو اس سے فلاح کی صورت یقیناً نکلے گی۔ اس لئے مغربی جمہوریت کی بجنسہٖ تقلید لازمی نہیں ہے بلکہ اس کی روح کے لئے مشرقی قالب کی ضرورت ہے۔ موجودہ پارلیمانی نظام کی اصلاح اسی ذیل میں آتی ہے۔

جدید کاری میں بینک کاری کو جو اہمیت ہے، وہ ظاہر ہے۔ سرمایہ داری اور صنعت کاری کے فروغ میں اس کا جو رول ہے، وہ مسلم ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا سود سرے سے ناجائز ہے، یا سود اور سودِ مرکب یا ربا میں فرق ہے جس سے سود خوری (USURY) وجود میں آتی ہے؟ دنیا میں مسلمان اقلیت میں ہیں، اکثریت میں نہیں۔ وہ سود دینے پر ایک طرح مجبور رہیں، مگر سود لینا ان کے لئے نامناسب ہے۔ ہمارے علما اس صورتِ حال میں ہماری کتنی رہنمائی کرتے ہیں؟ فقہ اسلامی میں قیاس، اجماع اور اجتہاد تینوں کی روایات موجود ہے۔ کیا اس سے پورا پورا کام لیا گیا ہے؟ شریعت جو ڈسپلن قائم کرتی ہے اس کی ضرورت مسلم ہے اور اس ڈسپلن کے بغیر انتشار فطری ہے۔ مگر اس ڈسپلن کے پیچھے ایسی نظر بھی ضروری ہے جو قدیم و جدید، ماضی و حال، دونوں سے گہری واقفیت رکھتی ہو۔ مذہب صرف اوامر و نواہی کا نام نہیں ہے، صرف چند قوانین کا مجموعہ نہیں ہے، اس کی ایک روح ہے۔ اس میں ایک عقیدہ ہے، ایک ایمان، ایک جذبۂ تسلیم، ایک عشق الٰہی، ایک عشق رسولؐ کی مرکزیت ہے، جس کے لئے وقت کی ضرورت کے مطابق قوانین پر اصرار ہوتا ہے۔ اس لئے اسلام کے ابدی اصولوں کی روشنی میں قانونِ وراثت، تعددِ ازدواج اور حدودِ شرعی پر برابر غور کرنے اور ان کی روح کے مطابق ان کی عملی تعبیروں کی ضرورت بہرحال مسلم ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا نظام تعلیم ناقص ہے۔ اس نے دو الگ الگ دھاروں کو چلنے دیا ہے۔ ایک طرف ایک بڑی تعداد اُن تعلیمی اداروں کی ہے جو روزگار مہیا کرنے اور دنیا میں جگہ بنانے

کے لئے ہیں۔ گو وہ اب اس مقصد میں بھی خاصے ناکام ہیں۔ دوسرے وہ قدیم ادارے ہیں جو مذہبی تعلیم دیتے ہیں اور اس تعلیم میں درس نظامیہ کے نہج پر اصرار کرتے ہیں جو قرآن اور حدیث کے علاوہ قدیم علوم اور قدیم طرزِ فکر (METHODOLOGY) کو کافی سمجھتے ہیں۔ ان ممالک میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں نظام تعلیم ایسا ہونا چاہیے جو قرآن اور اسلامی اخلاق کی تعلیم کے ساتھ جدید طبیعیاتی علوم، معاشیاتی علوم، سماجی علوم اور انسانی علوم کی تعلیم دے۔ اور جہاں اسلامی تعلیم صرف دینیات کو لازمی قرار دینے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ اسے دوسرے علوم کے ساتھ موجودہ ذہن کی ضروریات کے مطابق حرزِ جان بنائے۔ اُن ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، عام اداروں میں مذہبی تعلیم کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے مسلم رہنماؤں، مسلم اداروں اور اوقاف کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ان اداروں کے طالب علموں کے لئے ایسے جزوقتی ادارے قائم کریں جن میں اس کمی کو پورا کیا جاسکے۔ مسلم اسکولوں اور کالجوں میں رسمی طور پر دینیات کی تعلیم کافی نہیں۔ یہاں دنیوی علوم کی تعلیم کے ساتھ اسلامی بنیاد کو مضبوط کرنے کے لئے تدریس کے اوقات میں اضافے کو صرف قبول ہی نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس پر اصرار کرنا چاہیے۔

ایسا لگتا ہے کہ اسلام مسلمانوں سے مایوس نہیں ہوا ہے، بلکہ مسلمان اسلام سے مایوس ہو گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آج عالم اسلام میں ایک بیداری، ایک احیا، ایک نئی زندگی کے آثار ہیں۔ مگر یہ تیل کی طاقت، مادی وسائل اور اسلحہ کی فراہمی میں اسیر لگتی ہے۔ اس بیداری میں دانش وری کی کمی ہے۔ ہندوستان کو دیکھئے تو اس کا دستور اور اس کا جمہوری نظام نہ صرف ہر شہری کو اس نظام میں شرکت کی ضمانت دیتا ہے، بلکہ اپنے عقاید اور تعلیمات کو عام کرنے کی بھی۔ اس اصول کے نفاذ میں تاریخی اور سیاسی وجوہ کی بنا پر بہت سی دشواریاں ہیں جو مسلم ہیں۔ پھر بھی بنیادی دستوری ضمانتوں کی کلید بہرحال موجود ہے۔ مگر دانش وری کی روایات کے ضعیف ہونے کی وجہ سے کچھ حلقوں میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ جب تک طاقت ہاتھ میں نہ ہو اسلامی مشن کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ صرف اسلام کے مدنی دَور کو سامنے رکھتے ہیں، اس کے مکی دور کو جو مدنی دَور سے پہلے تھا مناسب اہمیت نہیں دیتے۔ سرسید کے دَور سے ہمارے یہاں دانش وری کی جو روایت شروع ہوئی وہ اب بھی خاصی کمزور ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ علمی اور عقلی نقطۂ نظر کو فروغ ہو، فکر روشن زندگی اور عمل کا سہارا ہو، اور علم وعمل کے لئے راہ ہموار کرے۔ یہ دانشوری صرف قدیم علوم کے سہارے ممکن نہیں اور جدید علوم کا سچی دانشوری کی راہ نہیں

دکھاتے اسے یک رخا بنا دیتے ہیں۔ اس لئے ہندستان کے مسلمانوں کو ایسی دانشوری کی ضرورت ہے جو بقول اقبال کہنہ پیکر میں نئی روح کو آباد کرے یا کہن روح کو تقلید سے آزاد کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے لئے دانشوری وہی ہوگی جو ہماری مذہبی قدروں سے نہ صرف واقف ہو بلکہ ان پر ایمان رکھتی ہو، اور جدید دور، جدید علوم اور جدید زندگی کے سارے تقاضوں سے خائف ہونے کے بجائے ان کا معروضی طور پر جائزہ لے سکتی ہو، اعمال کے ذریعے سے انسان کو جو طاقت میسر آتی ہے اس سے صحیح طور پر کام لینے کا گر جانتی ہو۔

اسلام جب دنیا میں پھیلا ہے تو اس نے دوسرے علاقوں، قوموں اور تہذیبوں کو متأثر بھی کیا ہے اور ان سے متأثر بھی ہوا ہے۔ یہ ذہن اُن ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں عام نہیں ہے۔ وہ مذہب سے زیادہ مذہبیت پر زور دیتے ہیں۔ تشخص کے معنی علاحدگی پسندی سمجھتے ہیں۔ مذہبی ارکان کی بجا آوری کو تو ضروری سمجھتے ہیں مگر دنیوی معاملات میں اسلام کے اصولوں کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتے اور دیانت، ایمانداری، رفاہِ عام، خدمتِ خلق، سماجی بہبود کے تقاضوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہ اسلام کی جامعیت کو بھلا دینے کے مترادف ہے۔ سرسید نے غلط نہیں کہا تھا کہ "دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی، مگر دنیا چھوڑنے سے دین بھی جاتا ہے۔" اسلام دین اور دنیا دونوں کو ملحوظ رکھتا ہے اور دونوں کے ساتھ انصاف کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

سولھویں صدی عیسوی تک مسلمان علمی دنیا میں نمایاں رہے۔ اس کے بعد مغرب نے علمی دنیا کی قیادت سنبھالی۔ یہ اسلام کا قصور نہیں، مسلمانوں کا قصور ہے۔ اسلام میں وقتاً فوقتاً احیا اور بیداری کی جو تحریکیں اٹھی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں یہ اندرونی طاقت موجود ہے کہ وہ نئے حالات اور نئے تقاضوں کے مطابق اپنی از سرِ نو تنظیم کر سکے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک طرف ہم حقیقی اسلام کو سمجھیں اور دوسری طرف دانشوری کی روایت کو مضبوط کر کے تنگ نظری، تعصب، توہمات، رواج پرستی اور اندھی ماضی پرستی کی دلدل سے نکلیں۔ حقیقی اسلام زندگی کے ہر موڑ پر ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔

●●

○

جا بجا سے ...

علی گڑھ کدھر

یہ ادارہ اب بہت بڑا ہو گیا ہے اور وقتی سیاست اور سستے مفادات اس پر غالب آ گئے ہیں۔ یہاں ایک بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا، ایسے لوگوں کے ایک گروہ کو بے مقصد تعلیم دینا جن کی صلاحیت مشتبہ ہے، ایسے لوگوں کا تقرر کرنا جو کسی اور جگہ نہیں کھپ سکتے، ہوتوں پر اصرار کرنا اور ذمّے داریوں کو نظر انداز کرنا کچھ عرصے سے علی گڑھ میں عام ہو گیا ہے۔ جنگل اور چمن میں فرق ہے اور باغبان چمن بندی کے لیے خس و خاشاک کو ہٹاتا ہے اور بڑھتی ہوئی شاخوں کی قطع و برید کرتا ہے۔ اگر علمی نظر کے بجائے جذباتیت، اگر قدروں کے احساس کے بجائے ذاتی مفادات، اگر اخلاقی اور روحانی معیاروں کے بجائے حُبِّ زر اور اقتدار کی ہوس، اگر سیاسی شعور کے بجائے موقع پرستی عام ہو جائے تو پھر علمی ادارے تہذیبی گہوارے اور ادبی مرکز، سیاسی اکھاڑے اور گروہ بندی کے دنگل بن جاتے ہیں۔ تعلیم اور سیاست کا فرق ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ کی جوبلی کے موقع پر بڑی خوبی سے واضح کیا تھا۔ سیاست بے صبر ہوتی ہے تعلیم صبر اور ریاض چاہتی ہے، سیاست لہو کی دھار اور شعلے کی لپک ہے، تعلیم ماتھے سے محنت کا پسینہ۔ ایک سے کچھ دیر کے لیے نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں، دوسرے سے چمن بندی ہوتی ہے، بستیاں بستی ہیں، ذہنوں میں روشنی ہوتی ہے اور دلوں میں تعمیر و تشکیل کے ولولے پیدا ہوتے ہیں۔ تعلیم کے لیے سیاسی شعور مفید ہی نہیں ضروری بھی ہے، مگر وہ سیاست جس پر ہمارے ملک کی سیاسی پارٹیاں، اقتدار کے لیے داؤ پیچ میں مصروف رہتی ہیں، تعلیم کے مرحلے کے لیے اس انجن کی طرح ہے جو پٹری کو بھی ٹیڑھا کر دیتا ہے۔

اقبال، ابوالکلام، ذاکر حسین

اقبال نے ایک تاریخی آفاقی اور سماجی رول کے لیے مردِ مومن اور مردِ کامل کے تصور پر زور دیا جس میں نطشے کے فوق البشر کی جھلکیاں ہیں مگر جو در اصل خیر البشر کا تصور ہے اور جو صرف سماج کو آگے کی راہ دکھاتا ہے بلکہ اس کا رشتہ ماضی کی صالح روایات سے بھی مستحکم رکھتا ہے۔ "پیامِ مشرق" کے دیباچے میں اقبال نے لکھا ہے کہ ان کا مقصد اسلام کی وکالت نہیں بلکہ روحِ عالم میں ایک انقلاب اور ایک نئی انسانیت کی تخلیق ہے۔ ہاں اس مقصد کی تعبیر و تفسیر اگر ان کے نزدیک اسلام کی حقیقی تعلیم کے ذریعے سے ہو سکتی ہے تو اسے کیوں نہ پیش کیا جائے۔ میرے نزدیک یہاں اقبال حق بجانب ہیں، کیوں کہ ہر عمومیت کے لیے کسی خصوصیت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہ بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ تغیر اور تبدیلی پر ایمان کے باوجود اور تاریخی ضروریات کو ملحوظ رکھنے کے باوجود جدید دور کی بعض قدروں مثلاً جمہوریت، قومیت اور سائنسی نظر کے ساتھ اقبال نے انصاف نہیں کیا۔ اقبال نے جمہوریت، قومیت اور سائنس اور صنعت و حرفت کی خرابیوں پر تو نظر رکھی مگر ان کے روشن پہلوؤں، ان کی طاقت اور ان کے امکانات کو مناسب اہمیت نہیں دی۔ اقبال کا عشق کا تصور اگرچہ عقلیت کو رد نہیں کرتا، کیوں کہ ان کا مقصد عقل کو ادب خوردہ دل بنانا ہے مگر مجموعی طور سے اس کی وجہ سے اردو داں طبقے میں علم و عقل کی طرف سے ایک خوف اور اس کی تحقیر کا میلان ضرور پیدا ہوا۔ اقبال حبِ وطن کے قائل تھے مگر وہ قومیت کو نئی تہذیب کا تراشا ہوا بُت سمجھتے تھے۔ بے شک قومیت کا تصور نشانِ راہ ہے منزل نہیں۔ منزل آفاقیت ہی ہے مگر قومیت کی اہمیت، اس کے اثرات اور مطالبات سے چشم پوشی حقائق سے گریز کرنا ہے۔ اقبال کو اتنا احساس تو تھا کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو وہاں قومیت اور اسلام ایک دوسرے سے مطابقت پیدا کر لیتے ہیں مگر انھیں یہ خیال نہ رہا کہ قومیت کے اثرات وہاں ناگزیر ہیں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ اسلام کی حقیقی تصویر مکی اور مدنی دَور دونوں سے عبارت ہے۔ اسلامی ریاست کا قیام مدنی دَور سے وابستہ ہے۔ مولانا آزاد کا یہ خیال غلط نہ تھا کہ اسلام اور قومیت میں کوئی تضاد نہیں اور مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک "امتِ واحد" بنا سکتے ہیں۔ اقبال اس نقطۂ نظر سے متفق نہ تھے۔ انھوں نے مولانا حسین احمد مدنی کے اس قول کی [illegible] مولانا حسین احمد نے ایک قوم کا لفظ استعمال کیا

تھا جس کا رشتہ ایک سرزمین سے لازمی ہے۔ اسلام ایک مذہب ہے، اور عالمگیر مذہب ہے۔ یہ قومیت سے ماوراء ہے اور ایک بین الاقوامی نظریہ رکھتا ہے مگر تاریخِ اسلام یہ بتاتی ہے کہ اسلام نے قومیت کو نظرانداز نہیں کیا ہے۔ دراصل اس معاملے میں مولانا آزاد اور اقبالؔ دونوں اپنی انا کے شکار ہوئے۔ مولانا آزاد نے اسلام کے سارے سرمایے پر فخر کیا اور اس میں سے کسی چھوٹے سے حصّے سے محرومی گوارا نہ کی مگر ہندوستان کی اکثریت سے ہندوستان میں اسلام کو زبان سے نہیں دل سے قبول کرنے بلکہ ہندوستان میں اسلام کے رول اور اس کے افکار و اقدار کی ضمانت پر وہ اصرار نہ کیا جس کی ان سے توقع تھی۔ یہاں یگانہ کا ایک شعر بے ساختہ یاد آتا ہے:

صد رفیق و صد ہمدم پر شکستہ و دل تنگ وا در انجمن زبید یا دل و برہمن تنہا

دراصل مولانا آزاد کو گاندھی جی کی تقلید کرنی چاہیے تھی۔ انھیں حکومتِ ہند میں وزارتِ تعلیم کا عہدہ قبول نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس طرح ڈاکٹر ذاکر حسین کو علی گڑھ سے سبکدوش ہونے کے بعد جامعہ واپس آنا چاہیے تھا۔ بہار کی گورنری، نائب صدر کا اعزاز اور پھر صدرِ جمہوریہ کا اعزاز بہت بڑی چیزیں ہیں مگر ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کا مسئلہ ان سب عہدوں سے زیادہ اہم تھا۔ مولانا آزاد اور ذاکر صاحب یہ قربانی نہ دے سکے یا شاید انھوں نے نیک نیتی سے یہ سمجھا کہ ان کے حکومت میں شریک ہونے سے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان کی نئی جمہوریت انصاف کر سکے گی مگر ہندوستانی مسلمانوں کی راہ نمائی جس دانشوری، جس دوررس طریقۂ کار، جس منصوبہ بندی، اسلام کی بنیادی خصوصیات پر اصرار کے ساتھ معاملات میں عدل اور خدمتِ خلق، سب میں شرکت کی ضرورت تھی، اس سے ہندوستانی مسلمان محروم ہو گئے۔ حکومت کا پرزہ بن کر آدمی عوام سے کٹ جاتا ہے۔ یہ بات عوامی اور جمہوری حکومت کے دور میں بھی صحیح ہے۔ عوام کے ساتھ رہ کر وہ عوام کی بہتر رہنمائی کر سکتا ہے۔ اقبالؔ نے دراصل کمال اتاترک سے بڑی امیدیں وابستہ کی تھیں مگر وہاں کے لادینی طرزِ حکومت سے بگڑ کر انھوں نے یہ سوچا کہ اگر ہندوستان کے ان علاقوں کی نئی تنظیم ہو جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں تو ان علاقوں کے ذریعے سے اسلام کی خدمت اور ہندوستان کی حفاظت ہو سکتی ہے۔ اقبالؔ کو پاکستان کے نظریے کا خالق کہنا میرے نزدیک کسی طرح درست نہ ہوگا۔ اقبالؔ نے تھامسن کے نام ایک خط میں ۱۹۳۴ء میں لکھا تھا کہ پاکستان اسکیم میری اسکیم نہیں ہے۔ میری اسکیم ہندوستانی فیڈریشن میں مسلم علاقے کی اسکیم ہے:

علی گڑھ کے فرزند

وہ گہری مذہبیت رکھتے تھے مگر ان کے یہاں کسی قسم کا کٹرپن نہ تھا۔ تنگ نظری اور تعصب کا ان کے یہاں شائبہ بھی نہ تھا۔ وہ رواداری اور اعتدال کو تہذیب کی روح سمجھتے تھے اور ان کے یہاں یہ رواداری ایک طرز زندگی بن گئی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں لبرل تھے۔ ان کے یہاں مشرقیت اور مغربیت دونوں کا ایک دلآویز سنگم تھا۔ تہذیب اور شرافت انسان دوستی اور اخلاقی نقطۂ نظر، قومیت اور بین الاقوامیت ان کے یہاں گھل مل گئے تھے۔ ان کے مزاج میں ایک ہلکی سی شوخی بھی تھی۔ وہ سیاسی آدمی نہیں تھے اور اس پر خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ وہ آزادی رائے کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور مخالف حالات میں بھی بڑی نرمی لیکن صفائی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ حالات نے انھیں اکثر ملول کیا مگر وہ نہ مایوس ہوئے، نہ برہم، نہ بیزار۔ ان کے یہاں نرم دلی کے ساتھ ذہن کی پختگی اور مضبوطی، خودی کی اہمیت کے احساس کے ساتھ خود پسندی سے احتراز، طرفداری کے بجائے سخن فہمی اور ایمان، امید اور محبت تینوں اصولوں سے وفاداری نے ان کی شخصیت کو جو آب و تاب عطا کی وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔

دو سو سال کی غلامی
ایک ہزار سال کی غلامی

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کو جب میں لکھنؤ کی سڑکوں پر آزادی کا جشن دیکھ رہا تھا تو میرے کانوں میں دو علاحدہ نعرے گونج رہے تھے۔ ایک جواہر لال نہرو کا کہ ہم دو سو سال کی غلامی کے بعد آزاد ہوئے ہیں، دوسرا پنڈت گووند بلبھ پنت کا کہ ہم ایک ہزار سال کی غلامی سے آزاد ہوئے ہیں۔ حکومت جواہر لال کی تھی مگر بات پنت کی مقبول تھی۔ اس بات کو میں ایک تاریخی مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ جب امام حسین کوفے جا رہے تھے تو راستے میں عرب کے مشہور شاعر فرزدق سے ملاقات ہوئی۔ امام نے ان سے کوفیوں کے رویے کے متعلق سوال کیا۔ فرزدق نے جواب دیا کہ کوفیوں کے دل آپ کے ساتھ مگر ان کی تلواریں یزید کے ساتھ ہیں۔ ہندستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ ابتک ہندستان کی اکثریت کا دل (میں یہاں ذہن کا لفظ استعمال کرنا بہتر سمجھتا ہوں) جواہر لال کے ساتھ ہے مگر اس کی تلواریں ابھی تک یزیدیت کے ساتھ ہیں۔ اس لیے سیکولرزم کو طرز زندگی بنانا اور اکثریت اور اقلیت دونوں کے لیے اسے منفعت خیز، موثر اور کارکشا اور کارساز قرار دینا ہمارا اولین فریضہ ہے۔

سیّد ہاشم علی

• جناب سیّد ہاشم علی (پ ۱۹۲۶ء تقریباً)

سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے بعد حیدرآباد سول سروس میں رہے پھر عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے، آزادی کے بعد کامیاب ترین وائس چانسلروں میں ان کا شمار ہے۔ اب اپریل ۱۹۸۵ء سے علی گڑھ کی سربراہی کر رہے ہیں۔ سیّد حامد کے بعد علی گڑھ کی وائس چانسلری سنبھالنا ایک اور رخ سے اتنا ہی مشکل کام تھا جتنا علی محمد خسرو صاحب کے بعد کسی کا جم جانا۔ پہلا سال بتا رہا ہے کہ وہ اس سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ اور مضبوطی کے ساتھ علی گڑھ کو اس کی تحریک کے ساتھ تعلیمی توانائی بخشنے میں کامیاب رہے ہیں۔

کچھ علی گڑھ کے بارے میں

سرسید کے خوابوں کی، میں سمجھتا ہوں، پوری طرح تکمیل نہیں ہوئی۔ جس طرح ان کو سماجی برائیوں سے ٹکر لینے کی عادت تھی، جس طرح ان کی لوگوں نے مخالفت کی اور وہ ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے، اسی دیوانگی کی اب بھی ضرورت ہے۔ غیر اہم اور غیر قانونی اختلافات کی پروا کیے بغیر آج ہم سب کو یونیورسٹی کی اور ملک کی ترقی کے لئے کوشش کرنا ہے۔

ڈسپلن (ضبط و نظم) پورے ملک کے لئے ضروری ہے۔ ضبط و نظم کی کمی تمام ہندوستان میں ہے اور علی گڑھ میں بھی ہے، اور جب کبھی کوئی اسے شروع کرے گا، ابتدا میں لوگوں کو ناگوار معلوم ہوگا۔ لیکن کسی نہ کسی شخص کو تو شروع کرنا ہے۔ میں اپنے پروگرام میں ضبط و نظم کو سب سے پہلے اہمیت دوں گا۔ ہم لوگ آزاد ملک ہونے کے باوجود آج ترقی نہیں کر سکے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ ورنہ جاپان اور مغربی جرمنی وغیرہ، وہ چھوٹے ملک جو جنگ میں تباہ ہو گئے تھے، آج معاشی اور صنعتی حیثیت سے امریکہ سے کسی طرح کم نہیں ہیں! اس لئے ہندوستان کی ترقی کے لئے ضبط و نظم کی سخت ضرورت ہے۔

آندھرا میں ہر روز ہم کو ایسے سیکڑوں فیصلے کرنا ہوتے تھے جس میں ایک پارٹی کا فائدہ ہوتا تھا اور دوسری کا نقصان۔ ظاہر ہے پچاس فیصدی لوگ ہمیشہ مخالف رہے۔ کیونکہ ان کے خلاف فیصلہ ہوا۔ کسی بھی بڑے کام کے ساتھ مخالفت اور نکتہ چینی تو ہوتی ہی ہے۔ اگر ہر بڑے آدمی یا ہر بڑے عہدیدار کو اپنے دفتر کے ان لوگوں کی باتیں سننے کا موقع مل جائے، جو اس کے خلاف باتیں کرتے ہیں، تو وہ ایک دن زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندگی میں مختلف قسم کے لوگوں کا ہمیشہ ساتھ رہتا ہے پھر جن سے آپ کام کروانا چاہیں گے ظاہر ہے وہ بھی مخالفوں کی صف میں شامل ہو جائیں گے۔ لہٰذا مخالفت کی پروا کیے بغیر ہمیں طلبا کے زیادہ سے زیادہ فائدے کے لئے کام کرنا چاہیے۔

ہمیں اپنے ذہن کو مقصد کی تکمیل کے لئے تیار کرنا ہے۔ ہندوستان میں اس کی بہت کمی ہے۔ کتنے ایسے طالب علموں سے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں میں نے پوچھا کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ لیکن انھیں اپنی منزل کا علم نہیں ہے۔ میں نے امریکہ میں چھوٹے چھوٹے بچوں سے جو دس سال سے بھی کم عمر کے تھے، معلوم کیا کہ تم کیا بننا چاہتے ہو؟ کسی نے کہا ڈاکٹر، کسی نے انجینئر، یہاں تک کہ ایک بچے نے کہا کہ میں ٹرک ڈرائیور بننا چاہتا ہوں۔ یعنی ہر شخص کا شروع سے ہی اپنا ایک مقصد ہے۔ اس لئے ہمیں اپنا مقصد شروع ہی سے متعین کرنا چاہیے اور پھر اس کو پانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

○

حالات اتنے مایوس کن نہیں ہیں جتنی کہ مایوس کن خود ہماری اپنی کاہلی ہے۔ ہمیں حالات کے صحیح تجزیہ کی توفیق نہیں۔ ترقی کی راہیں ہمارے لئے وا ہیں، ضرورت ہے سخت محنت اور کوشش کی۔ ہمیں سماج میں ایک مقام بنانے کی صلاحیت پیدا کرنا چاہیے۔ ہر شخص کو چاہے وہ اُستاد ہو یا طالب علم اپنے سے بہتر کی طرف بڑھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ جہاں تک ہماری یونیورسٹی کا معاملہ ہے بہت اچھے اساتذہ ہمارے پاس ہیں۔ قابلِ عزت لوگ ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس قابل نہیں ہیں کہ استاد کہلائیں۔ بدقسمتی سے یہ عام خیال رہا ہے کہ ان کے ساتھ کچھ کیا نہیں جا سکتا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ادارے کے سربراہ کا یہ فرض ہے کہ جہاں اچھے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرے، وہاں ان لوگوں کے ساتھ جو ادارے کے لئے نقصان دہ ہیں ایسا رویہ اختیار کرے جس سے ان کو شرمندگی ہو اور اپنی غلطی کا احساس ہو۔

○

ہمارے تعلیمی مسائل میں عربی مدارس کی اصلاح کا مسئلہ اہم ہے اور معاشرتی مسائل میں عورتوں کے قرآنی حقوق کی بازیافت کا مسئلہ!

مدارس کو یہ بات تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ سائنس کی تعلیم بھی دیں گے۔ سائنس پڑھانے جانے کے لئے جس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا، ہر مضمون کے اعتبار سے سائنس کی اچھی کتابیں موجود تھیں۔ اب NCERT کی کتابیں مختلف مضامین کی مختلف زبانوں میں قومی سطح پر پورے ہندوستان کے طلباء کے لیے چھپ رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتابیں کافی ہیں۔ سب سے پہلے یہی سوال اُٹھتا ہے کہ مدارس فیصلہ کریں کہ کیا ان کے لئے سائنس ضروری ہے، اور وہ سائنس کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ بہت سے ایسے اسکول ہیں جنھوں نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ میرے پیشرو نے اس سلسلے میں کچھ کوشش کی تھی اور میں بھی کروں گا۔ میں نے ایسے بہت سے مسلم اداروں کو چار پانچ سو خط لکھے ہیں۔ ان میں جنوبی ہند سے

بڑا اچھا جواب آیا ہے اور شمالی ہند سے کم۔ تو یہ ایک کوشش ہو گی جو سرسید کے وقت سے جاری ہے، اور آئندہ بھی رہے گی۔ کیونکہ توہم پرستی ہمیشہ ہر وقت میں اور ہر مذہب میں رہا ہے۔ اس کا خاتمہ سب کا فرض ہے۔

عورت کو جتنے حقوق قرآن میں دیئے گئے تھے وہ سب ہندوستانی (مسلمانوں کی) موجودہ مروّجہ (اینگلو محمڈن) قانون نے واپس لے لیے ہیں اور قرآن کا شریعت کی رو سے جو حیثیت عورت کو ملنا چاہیئے تھی وہ نہیں ملی ہے۔ اس سے زیادہ اگر میں بولوں گا تو ان لوگوں کو اختلاف ہوگا جو یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کے بارے میں صرف وہی لوگ بول سکتے ہیں۔ لیکن مذہب کسی ایک شخص کی جائداد نہیں ہے۔ ہر شخص کو اپنی کتاب اور مذہب کے بارے میں آزادانہ طور سے اظہار خیال کرنے اور رائے قائم کرنے کا پورا حق ہے اور مجھے اس بات پر قطعی اعتراض نہیں ہوگا اگر یونیورسٹی کے دانشور موجودہ معاملات کے بارے میں اپنی رائے دیں، یا اس کے خلاف آواز اٹھا سکیں۔ یہ اتنا جذباتی معاملہ ہے کہ یہاں پر لوگ یہ سوچنے پر راضی نہیں ہوتے کہ اگر خود اپنی بیٹی کو کوئی شخص چھوڑ دے یا معلق رکھا کرے تو برسوں اس کی زندگی تباہ رہے گی۔

قومی سطح پر ایک اہم مسئلہ ہمارا لسانی مسئلہ ہے!!

ایک ہندی چلنے والی تھی جس کو لوگ ہندی کہتے ہیں اور ہم سب لوگ روزمرہ میں بولتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے اس کو اتنا مشکل بنا دیا گیا کہ جنوبی ہند کے صوبے اس کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ہندوستان میں ہمیشہ ہندی سے مشتق ایک زبان لنگوافرانکا رہی ہے۔ اس کا نام ڈھائیا اور رسم الخط بدلتا رہا ہے مگر ہندی، ہندی رہی ہے۔ اردو میں ہندی اور فارسی زبانوں کا ملاپ ہوا، جبکہ دکنی زبان اردو کی بہ نسبت اور زیادہ دوسری زبانوں کے اشتراک سے بنی جیسے: تیلگو، مراٹھی، کنڑی، اور فارسی وغیرہ۔ عوام کی زبان ہی عام زبان ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے ہم نے کوشش نہیں کی۔ ایک بہت اچھی کتاب آندھرا پردیش کے چیف جسٹس گوپال راؤ ایک بوٹے کی آئی ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ ہندوستانی آئین کی دفعہ ۳۵۱ میں آیا ہے کہ ہندی کو فروغ دے کر عوام کی زبان بنایا جائے، لیکن زبان کے فروغ دینے کا کام نہیں کیا گیا؛ ہمیں ہندی کو اس طرح بنانا چاہیئے کہ وہ لوگوں میں خود بخود مقبولیت حاصل کر سکے؛ اس کے لئے ہندی والوں نے کوشش نہیں کی اور جو علاقائی ہندی مروّج تھی اس کو قابلِ تسلیم بنانے کی کوشش کی گئی۔ ہندی میں اگر الفاظ کم ملتے ہیں تو دوسری زبانوں سے لینا چاہیئے۔ جہاں تک ممکن ہے یہ زبان آسان اور عام فہم

ہو۔ اس کو ہم اُردو بھی کہہ سکیں اور ہندی بھی۔ جس طرح انگریزوں نے انگریزی کو عوام کی زبان بنانے کے لئے کافی تبدیلیاں کیں اور آسان انگریزی شروع کی؟ تب ہم ہندوستان میں ایسا کیوں نہیں کرتے۔ ہندی زبان والے جب اس کو قابلِ قبول بنائیں گے تو یہ سارے ملک کی نیچرل زبان ہو سکے گی۔ ہم کو اپنے لسانی مسائل کے بارے میں عقل کی روشنی میں غور کرنا چاہیئے اور خواہ مخواہ کے تعصبات اور جھگڑوں کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ ہندی پرچار ہمارے ملک کی زبان ہے لیکن اُسے تنگ نظری سے دور رہنا چاہیئے۔ لوگ ہندی عوام کی زبان ہے جو ہم سب بولتے ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جنھیں اُردو نہیں آتی اور بہت سے ایسے ہیں جنھیں ہندی نہیں آتی۔ لیکن بولتے دونوں ایک ہی زبان ہیں! یہ تو ریاکاری ہے؛ اگر یہ ختم کر دیجئے تو سارا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔

ہر سمجھدار شخص اس ملی جلی زبان کو پسند کرے گا۔ ہمارا ذہن صاف ہونا چاہیئے کہ ہندوستان میں ۱۵ مختلف زبانوں کے اشتراک سے ایک عام زبان بنی ہے۔ جو بھی سرکاری زبان ہوتی ہے وہ عوام کی زبان کو متأثر کرتی ہے۔ اس وقت ہم لوگ پورے ہندوستان میں بغیر انگریزی زبان کے الفاظ شامل کیے اپنی مادری زبان نہیں بول سکتے۔ پانچ چھ برس تک جب فارسی سرکاری زبان رہی تو اس کا اثر بھی پڑا۔ تیلگو میں نو ہزار فارسی الفاظ ہیں تامل میں چار ہزار فارسی الفاظ ہیں اور کنڑ میں پانچ ہزار۔ اسی طرح ہندی میں بھی شامل ہے۔ تو ہر زبان فارسی الفاظ کے ساتھ چل رہی ہے۔ لیکن ہندی کو اس میں کیا اعتراض ہے جو لوگ ہندی مروج ہے اس میں ایسا نہیں ہے۔ اگر آپ "بالکل" یا "مطلب" بولتے ہیں تو یہ فارسی لفظ ہے؛ گاندھی جی کا کہنا تھا کہ ہندی ہندوستان کی عام بول چال کی زبان ہے۔ وہ شمال اور جنوب میں بولی جاتی ہے۔ اسے ہندو اور مسلمان دونوں بولتے ہیں اور اس میں دوسری زبانوں مثلاً فارسی اور عربی کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ اور جب فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے تو اُردو ہے۔ اس طرح گاندھی جی دونوں زبانوں کے ملاپ کی کوشش کرتے رہے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں آزادی کے بعد اور تقسیم ہند کے بعد اُنھوں نے گورنر کے نام ایک خط لکھا کہ تم جو زبان بولو، دونوں رسم الخط میں لکھا کرو۔ اگر ہم لوگ یہ بات اُسی وقت تسلیم کر لیتے کہ ایک ہی زبان دو رسم الخط میں لکھی جائے گی، تو سارا جھگڑا وہیں ختم ہو جاتا؛ لیکن دونوں طرف سے تعصب اختیار کیا گیا!

○

آپس میں میل جول اور اتحاد ہو۔ سوچنے کا انداز فکر پر مبنی ہو اور سائنسی نقطۂ نظر ہو، اُن تمام

مقاصد کی نشانات اور تہذیب اخلاق کے ذریعے تشہیر ہونا چاہیئے۔ کیونکہ نشانات ہندی رسم الخط میں ہے اور ہمارے ہندی قارئین تک بھی پہنچتا ہے۔ اس طرح متحد ہوکر ملک کی ترقی کی راہ ہموار کی جاسکے گی۔ سرسید رح کی ایسی بہت سی تصنیفات ہیں جو تعصبات کو دور کرتی ہیں اور ایسے بہت سے واقعات ہیں جو آپسی تعلقات میں خوشگواری پیدا کرتے ہیں۔ انھیں سامنے لانا چاہیئے۔ مثلاً ایک جلسے میں جس میں سرسید شامل تھے۔ ایک صاحب نے کھڑے ہوکر یہ اعلان کیا کہ جو مسلمان طالب علم بی۔اے میں اول آئے گا، اس کو میں انعام دوں گا۔ سرسید اسی وقت کھڑے ہوئے اور انھوں نے اعلان کیا کہ جو ہندو طالب علم اول آئیگا اس کو میں انعام دوں گا۔ سرسید ایک بہت بڑے سیکولرسٹ تھے، وہ سمجھتے تھے ہم سب میں آپس میں کسی طرح کا فرق نہیں ہے۔ آج بھی ہمارے بیچ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اس بات کو نہیں سمجھتے کہ ہندوستانیوں کی نجات اسی میں ہے کہ ہم سب آپس میں مل کر رہیں۔

میں تمام وائس چانسلروں کو خطوط بھی تحریر کر رہا ہوں کہ اس دسمبر یا جنوری میں ہر یونیورسٹی سے دس دس طالب علم یہاں آئیں اور ہمارے طالب علموں کے ساتھ رہیں، جس سے ان کو معلوم ہو کہ علیگڑھ کے طلبا کتنے شائستہ اور مہذب ہیں۔ ہمارے طلبا کو سب سے مختلف اور دیگر یونیورسٹی کے طلبا کے لئے مثالی ہونا چاہیئے۔ آزاد ہندوستان میں ہماری نوجوان نسل کو تعصب اور نااتفاقی سے دور رہنا ہے، یہ بہت اہم کام ہے۔

●●

تصحیح اغلاط

فہرست کا صفحہ ۱/سطر ۴ پیشکش • صفحہ تین/۶ تہذیبی • چار/۲ تسلسل • چار/۹ والوں کو کون • پانچ /۱۲
ہو لیتیں • چھ/۵ ہونے کی بھی • ذرا ان کو • سات/۱، تحریک • سات/۷، نے اپنے • آٹھ/۱۱ تربیت • گیارہ/۲۲ میرے • تیرہ/۱۶
سکتے ہیں • چودہ/۲۱ درد کے اس • اٹھارہ/۸ حقائق سے آنکھیں چار کرتے ہوئے گزرتا ہے • اٹھارہ/۱۲ باقی ماندہ پندرہ برسوں •
اٹھارہ/۱۶ نجات کی راہ • اٹھارہ/۱۸ زیاں • اٹھارہ/۱۹ تیوہاروں • انیس/۱۵ ماضی سے • انیس/۲۲ ماضی کے • اکیس/۳ پیارہ
بیس/۵ باپ • بائیس/۱ شکل میں سجائی ہوئی۔

۲/۶ قسم کے ۱۰/۱۶ تعلیم ہوتا ۱۱/۲ جس میں کئی جگہ ۱۲/۱۴ حب للہ ۲۳/۲ دارالمصنفین ۲۹/۴ بڑے (بجائے بڑے)
۲۲/۲ محنت کا ۲۱/۲۲ کر سکتا ۲۶/۲۱ بھی ۴۴/۲ اہمیت ۵۸/۱۶ ہتھیار ۵۹/۱۸ انھوں نے صاف ۹۲/۱۳ موجودہ ہندی
۹۸/۱ لفظ ۱۰۵/۱۳ بارھویں (بجائے بارھواں) ۱۰۶/۱ تاکہ ۱۰۶/۱۳ ہو ۱۵۹/۲۳ ہمارے ۱۶۲/۸ جس (سے) عہدہ پر ۱۶۵/۵ سب مجھے
۱۶۶/۲۳ بلکہ ایک دو منٹ پہلے ۱۶۷/۱۳ لاپرواہی ۱۷۵/۱۱ مجھ سے ۱۷۶/۱ بتاؤ ۱۸۲/۱۸ اسکول نے ۱۸۳/۱۲ اگر یکلچر
(بجائے ایگریکلچر) ۱۸۶/۱۱ ہی ۲۰۴/۱۳ دنیا ۲۱۲/۲ تب ہم ہندی میں ۲۱۲/۵ زبان ۲۱۳/۷ ریاکاری ۲۱۴/۳ اور ایسے۔

••

حرفے چند

سید حامد کی جو تحریریں یہاں پیش کی جا رہی ہیں وہ پچھلے اُن پانچ سال میں لکھی گئیں جب وہ علی گڑھ کے قافلے کے سردار تھے۔ اور کیسے سرِ دار گزرے ہیں یہ پانچ سال! علی گڑھ کی محبت میں سرشاری کے بغیر اس بال سے باریک اور تلوار سے تیز راستے پر رسانیت سے گزر جانا سیّد حامد کیا کسی کے لیے بھی ممکن نہ ہوتا۔

اصغر (گونڈوی) کی طرح یہ شخص بھی عمرِ عزیز کے چہل سال گزارنے کے بھی ایک مدت بعد، اس وقت دریافت (DISCOVER) ہوا جب علی گڑھ کا وائس چانسلر ہوا۔ شاید یہ سب کچھ اس نے اسی وقت کے لیے بچا رکھا تھا۔ بنیادی طور سے انتظامیہ کا ایک پرزہ ہونے کے باوجود وہ سب کی آنکھ بچا کے گاہے گاہے علاوہ مضامین لکھتے رہتے تھے لیکن ان میں نہ 'جذبۂ بے اختیارِ شوق' کا پتا چلتا تھا نہ 'خمارِ چشمِ ساقی' کا۔ وہ علی گڑھ کے فرزند ضرور تھے لیکن 'سیدنا الاکبر' کی جانشینی کچھ چیز ہی اور تھی:

جاں فزا بادہ ہے جس کے ہاتھ میں جام آگیا - سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

ایسے ہاتھ میں اب قلم یا تو وہ قلم ہی دوسرا تھا، ایک خاموش قلبِ ماہیت ہو چکی تھی: اب لگتا تھا "مقصد" کے مصنف کے قلم سے وہ نکلتا جو اس مقدس درگاہ کی روح اس سے لکھواتی تھی۔ تحریر میں، موضوع کوئی بھی ہو، بظاہر کتنا ہی غیر متعلق، لیکن کسی نہ کسی طور علی گڑھ کی فکر اس میں در آتی تھی جیسے ع اختر ٹوٹے جھانکتے ہیں فلک سے زمیں کو!

میں نے سیّد حامد کی کم سے کم چار اور دو تقریریں سنی ہیں۔ کہہ سکتا ہوں کہ ذاکر صاحب اور سیدین صاحب کی طرح ان کے یہاں بھی تقریر اور تحریر میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس کا کچھ اندازہ آپ بھی لگا سکتے ہیں اگر آپ ان کے خدا بخش خطبہ کو پورا پڑھ جائیں اور اس کے بعد ہی آپ کو یہ پتا چلے کہ اس کا صرف پہلا صفحہ لکھا ہوا تھا اور دوسرا سراسر زبانی!

جامعہ ملیہ میں خدا بخش دانشوری سمینار کے مندوبین کے لیے استقبالیہ دیا جا رہا تھا۔ رسمی موقع تھا، رسمی تقریریں ہوتی رہیں۔ سیّد حامد نے بھی مختصر تقریر کی لیکن اختصار کے باوصف، کیفیت اور کمیت میں

کوئی کمی نہ تھی۔ رسمیات سے نپٹتے نپٹتے کہہ گئے، تقریری الفاظ میں ایک اچھی تحریر کی پوری دلآویزی موجود تھی:

"اپنے اکابر کو خراج تحسین ادا کر کے ہم الفاظ کو اعمال کا بدل سمجھ بیٹھے ہیں"۔ "کہیں ہم قصۂ پارینہ کو تقویم پارینہ تو نہیں بنا رہے ہیں!" "ہم اپنے ماضی پر نازاں ہیں تو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہم اس سے کتنا انحراف کرتے جا رہے ہیں"۔ اور ___ "یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ کیا اس ایثار کی کوئی رمق بھی باقی ہے جس پر اس ادارہ کی بنیاد تھی!"

انگریزی اور فارسی ادبیات میں اعلیٰ اسناد کے حصول کے ساتھ ان دونوں زبانوں کے بہترین ذخیروں سے آشنائی نے انہیں دونوں کی جینیئس سے قریب تر کر دیا۔ انگریزی نے بنیادی طور سے ان کا اسلوب متعین کیا اتنا کہ فارسی سے دلکش خوبصورت تراکیب تراشنے کی "اقدامیت" (سید حامد کی ایک خوبصورت ترکیب) بھی انگریزی ہی نے دی۔

اسلوب نگارش میں ان کا اصل انسپریشن رشید صاحب ہیں جو یوں بھی نہیں چھپتے ___ مگر اب تو ڈاکٹر اصغر عباس کی مرتبہ "رشید احمد صدیقی افکار و آثار" میں شامل خوبصورت مضمون میں سید حامد اقبالی جرم کے طور سے سامنے آگئے ہیں۔

تاہم یہ سب تو اسلوب کے محض بلنے بانے ہوتے ہیں۔ اس میں اصل جان آتی ہے "جاندار مقصد سے! کوئی ایسا کام جسے زندگی کا مقصد بنا لیا گیا ہو اور جو ذاتی حوادث کے لیے سپر کا کام دے جس کے آگے ذات اور سانحات اور واردات کی حیثیت جزئی، فروعی اور ثانوی ہو کر رہ جائے" (سید حامد)

اسلوب خلا میں پرورش نہیں پاتا۔ یہ دراصل فکر ہے جسے اسلوب کی تشکیل میں سب سے زیادہ دخل رہتا ہے۔ فکر جتنی اُتھلی یا گہری ہوگی اسلوب میں اسی نسبت سے اتھلاپن یا گہرائی ہوگی۔ بسا اوقات کسی صاحب تحریر پر بھی صاحب طرز ہونے کا گمان گزرتا ہے لیکن رفتہ رفتہ پتا چلتا ہے کہ یہ تو کاغذ کے پھول تھے! وجہ وہی رہتی ہے کہ وہ بے چارہ صرف الفاظ اور تراکیب سے اپنی دکان سجائے بیٹھا ہوتا ہے اندرونی جان کچھ بھی نہیں ہوتی۔ سید حامد کے یہاں ایک جاندار مقصد بھی واضح طور سے موجود ہے اور اس کے حصول کے لیے فکر کی گہرائی بھی۔ اس سے ان کے اسلوب میں اندرونی جان بھی آئی دلآویزی بھی۔ اسی لیے سید حامد کے اسلوب میں کہیں آپ کو پُرفریب انداز تحریر نہیں ملے گا۔ لفظ تراشی، ترکیب تراشی اور

لفظیاتی آہنگ کی شعوری کوشش کے باوجود نہ کہیں تصنع ملے گا نہ فضول گوئی۔ جتنی بات کہنی ہو اس کیلئے جتنے کم سے کم الفاظ درکار ہوں اتنے ہی لفظوں کا استعمال، یہ انشا پردازی میں خصوصاً اُس صنفِ سخن میں آسان نہیں جسے سید حامد نے اپنایا' یعنی؛ بیسؔ کا عہد تو اکثر و بیشتر ایک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھنا والا سلسلہ ایسیؔ کی روایت سے جڑتا چلا جا رہا ہے۔ سیدؔ حامد کو انگریزی نے اس فضول گوئی سے بھی باز رکھا۔

سیدؔ حامد کی فکر کے کچھ مرکزی نکتے ذیل کے چند جملوں میں ملیں گے؛

—● تعلیمی صورت حال یہ ہے کہ ایک طبقہ دینی تعلیم حاصل کرتا ہے دوسرا جدید انگریزی تعلیم؛ اس طرح ملّت دو نیم ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ ہم آہنگی یا توازن اور اتحاد سے اس وقت تک محروم رہے گی جبتک کہ دینی اور دنیاوی تعلیم پانے والوں کے درمیان فاصلہ باقی رہتا ہے۔

—● گذشتہ سو سال میں ہم نے جدید تعلیم صرف حصول معاش کے لیے حاصل کی ہے جدید علوم سے استفادہ کے لیے نہیں۔ اسی بنا پر ہم میں ذہنی غلامی پیدا ہوئی اور اس تصور سے نکلنا ہمارے لیے دشوار ہو گیا ہے۔ یہی ہماری ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

—● کسی اقلیت کی بقا کے لیے تین تدابیر ہیں:-

(۱) وہ اپنے مذہب اور تمدن پر مضبوطی سے قائم رہے (۲) ان تھک ریاضت کر کے اپنے آپ کو اکثریت سے بہتر ثابت کرے۔ (۳) اکثریت اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ اپنے تعلقات خوشگوار رکھے۔

—● کاش مسلمان برادرانِ وطن کا دل جیتنے کی کوشش کرتے؛ لیکن یہ ذمہ داری صرف مسلمانوں پر نہیں بلکہ برادرانِ وطن پر بھی اسیطرح عائد ہوتی ہے؛ اکثریت پر کچھ اور زیادہ!!

اور ان کے اسلوب کی دلآویزی اور دلنشینی اِدھر اُدھر سے لیے گئے ان چند جملوں میں اوپر مذکور شدہ خصوصیات کے ساتھ کافی حد تک مل سکے گی:

—● "اردو نثر سے ہنوز اس پر استدلال، توانا اور دلنشین عبارت کا جواب نہیں بن پڑا جو سرسید کے قلم سے گزشتہ صدی میں ٹپکی تھی۔"

—● "وہ مسلمانوں کی نیندیں اچاٹ دیتا۔"

—● "علی گڑھ تحریک اعتماد کی بازیابی کی تحریک تھی"۔

——— "انگریزی تعلیم کی مخالفت میں باقاعدہ دراڑ پڑ گئی"

——— "جسے عہد آفریں ہونا تھا وہ عہد شکن ثابت ہوئی"

——— "خدا ہمیں اس افلاس سے بچائے جو زر زر ہونے کا دوسرا نام ہے اور اس افلاس و محرومی سے بھی جو زر کے سائے میں شروع ہوتے"

اردو ادب بالعموم جس بے دانشی سے دوچار ہے اس کے مظاہر سب سے زیادہ واضح طور سے انشائیے کی صنف میں نظر آ سکتے ہیں۔ اچھے اچھے لکھنے والوں کے نقاب یہاں آ کے اتر جاتے ہیں جب کہنے کے لیے کچھ نہ ہو، (کیوں کہ جینے کے لیے یا مر مٹنے کے لیے پاس کچھ بھی نہیں!) تو عبارت آرائی یا لفظی انشا پردازی کے سوا لکھنے والا اور کرے گا بھی کیا۔ پہلے، اسی لیے 'انشائیے' کے بجائے اسے سیدھے سادے انشا پردازی کہا جاتا تھا۔ غزل کی طرح انشائیہ بھی نثر نویس کی کسوٹی ہے جہاں کھرے کھوٹے کی پہچان بڑی سہولت سے ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ہوشیار نثر نگار تحقیق یا تنقید کا میدان اپنانے کے بعد ادھر کا رخ نہیں کیا کرتے۔ سید حامد نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ادبی تنقید کا میدان ترک کر کے انشائیہ نگاری کی طرف عنانِ قلم موڑ دی، جس سے سچ تو یہ ہے کہ انشائیے کو ہمارے عہد میں اس کا وہ صحیح استعمال بھی ملا جس کا یہ صنفِ سخن مدت سے مطالبہ کرتی رہی تھی ——— اور، رتبہ بھی مل گیا کہ ع جو زمیں تھی گئی تا آسمان لیتا گیا۔

انشائیے کے اس خوبصورت اور کارآمد استعمال سے ایک طرف اسکی زبونی ختم ہوئی، دوسری طرف انشائیے محض مزاح، طنز، ظرافت یا پھکڑ کے ہم معنی لیے جانے سے بھی بچ گیا ——— کہ اس طرف کسی نہ کسی سبب انشائیے سے طنز و مزاح کو ملتبس کیا جانے لگا تھا جو دو مختلف چیزیں ہیں اگرچہ انشائیے میں طنز بھی ہو سکتا ہے مزاح بھی؛ مگر ضروری نہیں کہ ایک طنزیہ یا ایک مزاحیہ انشائیہ کہلایا جانے کا مستحق ٹھہرے۔

سید حامد کے مضامین پڑھ کے مجھے امید ہے، آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ اردو میں ایک اچھے صاحبِ طرز نثر نگار کا اضافہ ہو چکا ہے۔

——— عابد رضا بیدار

علی گڑھ تحریک

ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی کی صدارتی تقریر

سر سید احمد خاں اور علی گڑھ موومنٹ کے اوپر جتنا عبور حامد صاحب کو ہے، جتنا یہ جانتے ہیں اور جس طرح عملی طور پر انھوں نے اس کو سنبھالا اور سمجھایا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ان سے زیادہ کوئی موزوں آدمی نہیں تھا جو اس سبجکٹ پر خدا بخش لکچر دیتا۔

میں حامد صاحب کو بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ ان کے جذبات اور ان کے کام کرنے کا وہی طریقہ ہے جو سر سید احمد خاں کا تھا۔ جب یہ منسٹری میں ایڈیشنل سکریٹری تھے، اس زمانے میں ہی انھوں نے ایک پبلک اسکول "کریسنٹ اسکول" قائم کیا اور ان ہی کی کوششوں کی وجہ سے وہ آج ایک اچھا پراسپرس (PROS PEROUS) اسکول ہے اور ترقی کر رہا ہے۔ علاوہ اپنی آفیشیل ذمہ داریوں کے، وہ تعلیم کے، کلچر کے، لٹریچر کے، اور سیرت کے جلسوں میں برابر حصہ لیتے تھے۔ دہلی میں سب سے ایکٹیو مسلمانوں میں جو شخصیت تھی وہ حامد صاحب کی تھی۔ ان کے دہلی سے آجانے سے دہلی کی زندگی میں کافی کمی پیدا ہوئی ہے جو ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔

وہ اسٹاف سروس کمیشن کے صدر تھے اور اس کے بعد پلان کے مطابق ان کو یو پی ایس سی (U.P.S.C) میں آنا چاہیئے تھا اور اس کے بہت چانسز (CHANCES) تھے؛ چند مہینے کے بعد آجاتے۔ لیکن اس کے باوجود جب ان سے علی گڑھ کی وائس چانسلری کے لئے لوگوں نے درخواست کی تو انھوں نے اسٹاف سروس کمیشن سے ریزائن (RESIGN) کر دیا؛ اور ان کو جو دوسرے مواقع تھے، ان کو چھوڑ کر کے علی گڑھ کی وائس چانسلری ایکسپٹ (ACCEPT) کر لی: ایسے وقت جب علی گڑھ بہت ہی مشکل حالات سے گزر رہا تھا! وہاں پر جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی، امتحانوں میں ایڈمیشن (ADMISSIONS) میں

اور پڑھائی کے کاموں میں جو بدنامی ہو رہی تھی، مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے بہت بہادری اور کوشش کے ساتھ حالات پر قابو پایا اور آج علیگڑھ کو پھر انھوں نے اس لایق کر دیا ہے کہ وہ اچھی یونیورسٹیوں کی طرح چل سکے۔ جب ایسے کام کیے جاتے ہیں تو اس میں مشکلات بھی پیش آتی ہیں؛ ان سب مشکلات کو انھوں نے بڑی بہادری اور ہمت کے ساتھ جھیلا، مقابلہ کیا، جبھی وہ اس منزل پہ پہنچ سکے! ہم کو خوشی ہے کہ ان کی قیادت میں یونیورسٹی صحیح طریقہ پہ چل رہی ہے، اور ہماری دعا ہے کہ اور ترقی کرے۔

دوسری چیز جو بہت کم لوگوں نے کی ہے وہ یہ کہ علیگڑھ سے ان کی وابستگی محض وائس چانسلر کی حیثیت سے ایک ٹرم (TERM) کے لیے نہیں ہے؛ جس جذبہ کے ماتحت انھوں نے اپنی نوکری چھوڑی اور اس کو قبول کیا، وہ علی گڑھ موومنٹ اور مسلمانوں کے پرابلم تھے جن کے پیش نظر انھوں نے اس کو قبول کیا۔ تو وہ نہ صرف علیگڑھ یونیورسٹی کو چلا رہے ہیں؛ یعنی اس کے انتظامی حالات کی درستی اور اس کو صحیح تعلیمی طریقے سے چلانا، بلکہ انھوں نے اس چیلنج کو بھی قبول کیا کہ علیگڑھ موومنٹ کو موجودہ حالات میں چلانے کا چیلنج۔ اور میں سمجھتا ہوں یہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ سر سید نے خاص حالات میں جب علیگڑھ یونیورسٹی شروع کی، تو اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں میں اس بات کا احساس پیدا کیا جائے کہ وہ بجائے آئی سولیشن (ISOLATION) کے نئے حالات میں، نئی زندگی میں، اپنا رول، اپنا کردار ادا کریں اور جو حصہ ہونا چاہیے وہ پورا پورا حصہ لیں، سائنس اور جو سیاست کی اور حکومت کی منجدھار ہے، اس میں پوری طرح سے شریک ہوں۔ یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس جذبہ کے تحت حامد صاحب نے علیگڑھ یونیورسٹی کو چلایا اور علیگڑھ موومنٹ کے لئے وہ جگہ جگہ گئے۔ لوگوں سے بات چیت کی۔ 'تہذیب الاخلاق' شروع کیا؛ تہذیب الاخلاق سے بہت پہلے وہ یونیورسٹی گزٹ میں بھی لکھتے رہے اور توجہ دلاتے رہے۔

مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے یہاں آکر علی گڑھ موومنٹ کے مقاصد کو سمجھایا اور انھوں نے خاص طور پر اس بات کو سمجھایا کہ علی گڑھ موومنٹ ایک میسیج (MESSAGE) تھا، چند اصول تھے جن کی بنا پر سر سید نے یہ ادارہ شروع کیا تھا کہ: "مسلمانوں کو بلکہ ہر قوم کو، ہر شخص کو، زمانے کے حالات... کے مطابق ایڈجسٹ (ADJUST) کرنا چاہیے، ان کے مطابق چلنا چاہیے

اور اپنے لئے ایک جگہ بنانی چاہیئے کہ وہ قابلِ عزت زندگی بسر کرسکے اور یہ امر جس کے لئے انھوں نے کام کیا تھا یہ آج بھی اتنا ہی صادق آتا ہے اور اتنا ہی ویلیڈ (VALID) ہے، جتنا پہلے تھا۔ جب حامد صاحب سرسید کے اقتباسات پڑھ رہے تھے تو لگ رہا تھا سرسید کے عہد پر نہیں، یہ سب تو آج کے حالات پر ہے! یہ اس لئے کہ وہ کچھ اصول تھے اور اصول ہر زمانے اور ہر وقت کے لئے ویلڈ (VALID) ہوتے ہیں، کسی ایک سچویشن (SITUATION) کے لئے نہیں ہوا کرتے۔

پہلے وائس چانسلروں نے علی گڑھ یونیورسٹی کو تو چلایا، مگر میں سمجھتا ہوں، ذاکر صاحب کے علاوہ کسی نے اس بات کی کوشش نہیں کی کہ سرسید کی جو مومنٹ تھی، اس کو سمجھ کر کے، اس مومنٹ کو بھی چلایا جائے، اس کا احیا کیا جائے اور نئے حالات کے مطابق اس کو پیش کیا جائے۔ ہم کو خوشی ہے کہ حامد صاحب نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ساتھ سرسید کی علیگڑھ مومنٹ کی ذمہ داری بھی سنبھالی ہے، اور اس طرح سنبھالی ہے جو اس کا حق تھا۔ اور یہ بہت بڑا کام ہے۔

میری دعا ہے کہ وہ علیگڑھ یونیورسٹی کو چلانے میں اور ان خیالات کو اور ان باتوں کو جو انھوں نے کہیں، لوگوں کو سمجھانے میں اور توجہ دلانے میں کامیاب ہوں۔ ان کی کامیابی محض ان کی کامیابی نہیں ہوگی، بلکہ سب مسلمانوں کے لئے، اور میں سمجھتا ہوں، ملک کے لئے کامیابی ہوگی۔ اس لئے کہ مسلمان ملک کا ایک اہم حصّہ ہیں۔ اگر وہ اس کی زندگی میں پورا حصّہ لیں اور کامیابی کے ساتھ اس میں کنٹری بیوٹ (CONTRIBUTE) کریں، تو یہ ملک کے لئے بہتر ہوگا، مفید ہوگا۔

(سید حامد، وائس چانسلر علی گڑھ کے "خدا بخش خطبہ" کے موقع پر صدارتی تقریر بتاریخ ۹ فروری ۱۹۸۲ء)

●●

سیّد حامد

جناب سیّد حامد : پیدائش ۲۸ مارچ ۱۹۲۰ء (مراد آباد)، ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس میں گریجویشن، پھر یہیں سے ۱۹۴۱ء میں انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کیا۔ فرسٹ کلاس فرسٹ آنے پر یونیورسٹی سے مزمل اللہ گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ۱۹۴۷ء میں فارسی ادب میں بھی ایم اے کیا۔ ۱۹۴۳ء میں اسٹیٹ سول سروس کے لئے اور پھر ۱۹۵۱ء میں انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس (آئی۔ اے۔ ایس) کے لئے منتخب ہوئے۔ وزارت تجارت (خارجہ) کے جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے آپنے ہندوستان کے چوتھے پنجسالہ منصوبے کی تشکیل میں ہاتھ بٹایا اور بہت سے تجارتی معاہدے بھی آپ کی زیر نگرانی ہوئے۔ علی گڑھ کی وائس چانسلر شپ سنبھالنے سے قبل آپ اسٹاف سلیکشن کمیشن کے چیرمین رہے۔ بلگریڈ میں ۱۹۸۰ء میں منعقدہ یونیسکو کانفرنس میں آپنے ہندوستان کی نمائندگی کی۔ جامعہ ازہر، قاہرہ کی ہزارویں سالگرہ کے موقع پر ہندوستان کی نمائندگی کی۔ ۱۹۸۲ء میں برطانیہ اور امریکا میں آپنے لکچر بھی دیئے تھے۔

آپ مارچ ۱۹۸۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اور فروری ۱۹۸۲ء میں علی گڑھ کے ادارہ کو علی گڑھ تحریک کا پرانا مشن یاد دلانے کے لئے سرسید کے انداز پر سرسید کے "تہذیب الاخلاق" کا اجرا کیا جو اب تک جاری ہے۔

●●

فہرست مضامین

حصۂ انگریزی :

سید حامد
وائس چانسلر
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

لائبریری میں

خدابخش خطبات کا ایک سلسلہ جاری ہے

قبلاً

- ڈاکٹر زبیر صدیقی
- پروفیسر آصف فیضی
- جناب قاضی عبدالودود
- پروفیسر حسن عسکری
- پروفیسر کلیم الدین احمد
- جناب بدرالدین طیب جی
- ڈاکٹر ہاشم امیر علی
- پروفیسر عبدالسلام خاں
- پروفیسر وحیدالدین
- پروفیسر مقبول احمد
- پروفیسر محمد شفیع اگوانی
- ڈاکٹر نذیر احمد وغیرہ

یہ خطبات دے چکے ہیں

۷ فروری کو جناب سید حامد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ۱۹۸۳-۸۴ کا خدابخش خطبہ دیا۔

••

"زمانہ بہتوں کو رویا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا، لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آوے، نہایت رنج اور غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔"

یہ سطور سر سید نے مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھی تھیں۔ یہ سطور ایک طرف ان کی فراخدلی کی دلیل ہیں، تو دوسری طرف خود ان کی ذات پر کئی گنے زور کے ساتھ عائد ہوتی ہیں۔ سر سید نے علیگڑھ تحریک کی بنا ڈالی اور اس کو پروان بھی چڑھایا۔ انھوں نے یہ کمال کر دکھایا کہ ستم رسیدہ، کچلے ہوئے اور ہمت باختہ ہندوستانی مسلمانوں کو نہ صرف اعتماد اور عزت نفس سے ہمکنار کر دیا، بلکہ ان ظالم انگریز حکمرانوں سے جنھوں نے ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے تھے، ہندوستانی مسلمانوں کے تعلقات کو شگفتگی کی سطح تک پہنچا دیا۔ وہ ایسا نہ کرتے تو ایک عرصے تک مسلمان کڑھتے رہتے، سلگتے رہتے اور اجتماعی زندگی کی لہر سے دور تر ہوتے چلے جاتے!

سر سید کی پذیرائی، تنگ نظروں نے کفر کے الزام سے کی۔ انھیں انگریزی حکومت کا زر خرید غلام کہا گیا۔ ان فتووں میں جو ان کے خلاف ہندوستان اور حجاز سے حاصل کئے گئے، سر سید کو ابلیس کا خلیفہ بنایا گیا، جس کے ملحدانہ عقائد یہودیوں اور عیسائیوں کے عقائد سے بدتر ہیں۔ جب وہ انگلستان گئے تو یہ افواہ پھیلائی گئی کہ وہ بپتسمہ کے لئے گئے ہیں یعنی عیسائی بن کر واپس آئیں گے۔ ہمارے سب سے بڑے مزاح نگار شاعر نے ان پر پھبتیاں کسیں۔

اس محفل میں جو حضرات کھیلوں کے آداب اور ہنر سے واقف ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ بہت سے کھیلوں میں کھلاڑی کا کمال اور نسخۂ تسخیر یہ ہوتا ہے کہ فریق مخالف نے جو طاقت صرف کی ہے اسے اپنے کام میں لایا جائے، اپنی جیت کے لئے معاون بنایا جائے۔ کرکٹ میں بہت تیز پھینکی ہوئی گیند کو بلّے کے ہلکے سے اشارے سے باؤنڈری میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ علیگڑھ تحریک کی شدید مخالفت بھی کچھ اسی طرح کے برگ و بار لائی۔ لیکن یہاں ہلکے سے اشارے سے کام نہیں چلا۔ اس تحریک کو پھیلانے کے لئے جو پاپڑ سر سید اور ان کے رفقا نے بیلے، جو مصیبتیں جھیلیں، جن مخالفتوں اور بیدردیوں اور الزام تراشیوں کا مقابلہ کیا، اس کا وہ لوگ اندازہ نہیں لگا سکتے جو سر سید کی ملک گیر تحریک سے کئی سیڑھیاں گزرنے کے بعد فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ جس طرح ہم اس ہوا کے احسان مند نظر نہیں

آتے جو سائنس کے روپ میں ہمیں زندہ رکھتی ہے، اُسی طرح علم و عقل کی اس فضا کے لئے جس میں ہم سانس لے رہے ہیں سر سید کی طرف جنھوں نے اس فضا کو تشکیل دی، پر سپاس نگاہوں سے مڑ کر نہیں دیکھتے۔

علیگڑھ تحریک اعتماد کی بازیابی کی تحریک تھی۔ اس کا مقصد تھا کہ ہندوستانی مسلمان تھکے کے ڈھنے کی طرح زمین کے سینہ پر بوجھ بننے کے بجائے باخبر اور حوصلہ مند شہری بنیں۔ زمانہ سے خائف اور نفور ہونے کے بجائے وہ زمانہ سے صحتمندانہ ہم آہنگ ہوں۔ اپنے درخشاں ماضی پر وہ فخر ضرور کریں لیکن اس فخر کو حرکت کا ذریعہ بنائیں، نیند لانے والی دوا نہیں اور محنت اور اتحاد کے ساتھ وہ کام کریں جس سے حال سنور جائے اور مستقبل نکھر جائے۔ وہ خول میں سمٹنے کی جگہ ساری دنیا کو ذہن و نظر کی جولانگاہ بنالیں۔ خُذ ما صفا و دع ما کدر کے تحت اپنے زمانے اور معاصروں سے اچھی باتیں سیکھیں، اور علوم نے جو ترقی کی ہے اُسے جذب کریں۔ زمانہ کے ہمقدم ہوں، اس کی گرد راہ نہ بنیں۔ اپنے مذہب کو ان ساری ملاوٹوں، واہموں اور جہالتوں سے پاک کریں جنھیں گردش ایام نے اس میں شامل کردیا ہے۔ مذہب کو علم اور عقل کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں، اسلام اور جدید علوم میں کوئی تضاد نہیں ہے روزمرہ کی زندگی میں شائستگی، خوش اطواری، استدلال اور افہام و تفہیم کی روش اختیار کریں۔ باتوں اور عقیدوں کو عقل کی کسوٹی پر کسیں، علم کی روشنی میں پرکھیں۔ قوم اور وطن کی محبت کو جزوِ ایمان جانیں۔ حالی نے سرسید کے مسلک کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی زندگی اور آثار بیرونی اور غیر مسلم حکومت کے تحت زندگی گزارنے کے آداب سکھاتے ہیں۔ چونکہ مسلمان اپنے بازوؤں کی طاقت سے اب ہندوستان پر حکومت نہیں کر رہے ہیں، اس لئے اُنھیں چاہیئے کہ اپنے حکمرانوں اور اپنے اہل وطن کے دل جیت لیں، کہ اب عزت اور احترام حاصل کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے۔ کاش کہ بدلے ہوئے زمانہ میں ہندوستان کی آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمان اپنے اہل وطن کا دل جیتنے کی کوشش کرتے، لیکن یہ ذمہ داری صرف مسلمانوں پر ہی نہیں، بلکہ برادران وطن پر بھی اُسی طرح عاید ہوتی ہے، اکثریت پر کچھ اور زیادہ !!

بدقسمتی سے ایسے حادثے ہوتے رہے ہیں، جو تعلقات کی خوشگواری میں سدِّ راہ ہوتے ہیں۔ حکومت اور اکثریت دونوں کا فرض ہے کہ ایسا نہ ہونے دیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں سے یہ احساس نکالنا ہوگا کہ وہ مظلوم اور محروم ہیں اور ملک کی ترقی پر جو وسائل صرف ہوتے ہیں اور یہ وسائل خوش حالی کے جو برگ و بار لاتے ہیں، ان دونوں میں اُن کا حصہ برائے نام ہے۔ اگر علیگڑھ تحریک کا بانی اس وقت زندہ ہوتا تو اپنے وطنی دینی بھائیوں کی محرومی پر نہ کڑھتا، نہ فریاد کرتا، نہ بدگمانی کو ہوا دیتا۔ وہ ہندوؤں سے کہتا کہ بھائی آگے بڑھنے کے لئے

جتن کرتے پڑتے ہیں۔ پیچھے کھینچنا سہل ہے۔ ہمارا قافلہ آگے جب ہی بڑھ سکتا ہے جب سب قافلے والے قدم ملا کر چلیں۔
اگر ہمارے ساتھ آدمیوں میں کوئی ایک آگے بڑھنے سے ہی ہچکچائے گا، یا آگے بڑھنے ہی نہ پائے گا بلکہ پیچھے کی طرف جائے گا، تو قافلے کی رفتار لامحالہ سست
ہو جائے گی۔ اگر اُس ایک آدمی کے دل میں یہ خوف کروٹیں لیتا رہا کہ جان و مال کا جوکھم ہے، یا یہ احساس کھٹک پیدا کرتا
رہا کہ ملک کے انتظام اور اس کی خوشحالی میں ہمیں اپنا حق نہیں مل رہا ہے، تو وہ کیونکر وطن کو خوش حال اور ترقی یافتہ
بنانے میں ولولے اور اُمنگ کے ساتھ شریک ہو سکے گا: افسردگی اور محرومی کے احساس کو ملک کے ساتھ بے وفائی سے
تعبیر کرنا بے دردی ہے۔ دوسری طرف، وہ مسلمانوں کو سمجھاتا کہ کوتاہ دستی میں محرومی ہے۔ خود کو مستحق بناؤ اور ہاتھ بڑھا کر
اپنا حق لو۔ وطن عزیز کی ترقی اور خوش حالی کے لئے تن من دھن لگا دو۔ وطن کسی ایک فرقہ کی جاگیر نہیں ہے، اس پر
تمہارا اتنا ہی حق ہے جتنا کسی دوسرے فرقہ کا۔ جمہوریت کی صحت اور سلامتی کی بنیادی علامت یہ ہے کہ اقلیتیں
محفوظ اور بہرہ یاب رہیں۔ وہ مسلمانوں کی نیندیں اُچاٹ دیتا، تا وقتیکہ وہ اپنی علمی اور معاشی اور اقتصادی بدحالی
اور پسماندگی کو دور نہ کر دیتے۔

علیگڑھ تحریک باوجود شدید مخالفت کے روزِ روشن کی طرح ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔ اس نے
اعتماد کے علاوہ مسلمانوں میں قومیت کے احساس اور آگے بڑھنے کے ولولے کو جنم دیا۔ مسلمان جدید تعلیم سے بہرہ ور
ہونے لگے۔ سرسید کا آوازۂ تجدید، تقلید فرنگی کا بہانہ نہیں تھا۔ فرنگیوں سے مرعوب ہونے کے باوجود سرسید ہندوستانی
مسلمانوں کو ان کے سانچے میں ڈھالنے پر راضی نہیں تھے۔ ہندوستان کے کسی مسلمان خاندان کو ٹٹولئے، چار پیڑھیوں
میں سے کسی ایک کا ناتا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یا علیگڑھ تحریک سے جڑا ہوا ملے گا۔ یہی نہیں، دنیا میں کہیں جائیے، آپ
کو ایسے لوگ ضرور مل جائیں گے جو علم کے اس سرچشمہ سے اپنی پیاس بجھا چکے ہیں، بلکہ اپنی پیاس بڑھا چکے ہیں۔

گزشتہ تقریباً ڈیڑھ سو سال میں ہندوستانی مسلمانوں میں بڑے بڑے نوابغ روزگار پیدا ہوئے۔ خود بیسویں صدی
کی پہلی تہائی میں مسلمان قائدین کے پرے کے پرے نظر آتے ہیں، ایسے لوگ بھی جن کی آواز پر سارے ہندوستانی
مسلمان لبیک کہہ کر نکل آئے۔ لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی علیگڑھ تحریک کے بانی کی گرد کو نہیں
پہنچا۔ زمانہ گزرتا جا رہا ہے، ان کے قد گھٹ رہے ہیں مگر سرسید کا قد بڑھ رہا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا۔ یہ وجہ
ڈھونڈنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ علیگڑھ تحریک کی کامیابی کے راز کا سرا بھی یہیں ملے گا۔ سرسید والا گہر کی پہلی
خصوصیت جس میں کوئی مسلمان رہنما ان کا شریک نہیں تھا، ان کی حکمت عملی ہے۔ ان میں بیک وقت خواب دیکھنے
اور خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی وہ صلاحیت موجود تھی جو شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ ایسے رہنما تو ہوں اور

ملتوں کی تقدیر بدل دیا کرتے ہیں۔ سرسید ہر چند کہ زاویۂ نگاہ اور افتادِ طبع میں مسلمانانِ ہند کے نمائندہ نہ تھے، تاہم ان کا ہاتھ مسلمانوں کی نبض پر تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمان ان کا ساتھ بدقت کہاں تک دے سکتے ہیں اور کون سی حد ایسی ہے جس کے آگے اگر قدم رکھا تو سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے تعلیم نسواں پر زور نہیں دیا۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے لوگ لڑکوں کی جدید تعلیم کے خوگر ہو جائیں، پھر کہیں لڑکیوں کی تعلیم کا قصہ چھیڑا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بعد میں جہاں تک شمالی ہندوستان کا تعلق ہے ان کے ایک شاگرد شیخ عبداللہ نے علیگڑھ میں اور دوسرے شاگرد کرامت حسین نے لکھنؤ میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے باوجود مخالفت کے، اسکول کھولے جو اب ڈگری کالج ہیں۔

اصولوں پر قائم رہتے ہوئے ان کی مصلحت اندیشی یا حکمت عملی کی ایک دوسری مثال کچھ اس طرح ہے: سرسید نے "تہذیب الاخلاق" کو اپنے اصلاحی مقاصد کا ترجمان بنایا تھا۔ یہ رسالہ تین قسطوں میں کوئی بارہ سال چلا۔ لیکن جب کچھ ان با اثر اور اہلِ زر حضرات نے جن سے سید عالی مقام ایم اے او کالج کے لئے امداد کے طالب تھے، اس رجحان پر احتجاج کیا جو ان کے دین سے متعلق مضامین سے جھلک رہا تھا، تو انھوں نے ایسے متوقع معاونین کی تالیفِ قلب کی خاطر اپنے اس لختِ جگر کو دفن کرنا قبول کر لیا۔ انھوں نے بھانپ لیا تھا کہ علیگڑھ تحریک میں ایم اے او کالج کی اہمیت مرکزی ہے۔ ایک دفعہ یہ کالج جسے بالآخر یونیورسٹی بننا ہے، قائم ہو گیا تو پھر خود ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے جو اس تحریک کو فروغ دیں گے۔

یہاں یہ کہہ دینا شاید بے محل نہ ہو کہ سرسید کے اصلاحی اور تعلیمی مقصد کو لے کر "تہذیب الاخلاق" کا احیا اِس دور میں کیا گیا ہے۔ دو سال سے یہ رسالہ اپنے معیار اور مقصد کو برقرار رکھتے ہوئے نکل رہا ہے۔ جیسا کہ میں آگے چل کر کہوں گا، ہمیں پھر علیگڑھ تحریک کی ضرورت ہے اور یہ رسالہ جو اس تحریک کا ترجمان ہے مسلمانانِ ہند کے التفات کا طالب اور حقدار ہے۔

"تہذیب الاخلاق" کا تذکرہ ہمیں علی گڑھ تحریک کے ایک اہم وصف اور اس کی حیرت انگیز کامیابی کے ایک بڑے سبب کی طرف لے جاتا ہے۔ سید علیہ الرحمۃ نے مسلمانوں کے مزاج کو بدلنے کی جو کوشش کی اس کی ایک شکل زبان اور ادب کے مزاج کو بدلنے میں مضمر تھی۔ اردو زبان خصوصاً اردو نثر کو سرسید نے تصنعات اور دم گھٹنے والی بندشوں سے چھڑا کر مقصدیت، معنویت، سادگی، روانی، توانائی اور صحت سے لبریز کر دیا۔ اپنے مضمون "ہمارا علم ادب" میں سرسید نے ایک حوالے سے لکھا تھا "ہمارا علم ادب جس میں فقرہ بندی اور قافیہ بھی

پر کمال ہمت مصروف رہتی ہے، اس قسم کی صاف و سیدھی تحریر کے سامنے کیسا بھونڈا اور خراب معلوم ہوتا ہے؛ اور جو تفاوت آورد اور آمد میں ہے، وہ بخوبی دکھائی دیتا ہے۔ قافیہ بندی کی عبارت ایک آورد ہوتی ہے، جیسے کوئی ایک بھاری لکڑی کو رسّی باندھ کے زور سے کھینچے لیے جاتا ہو۔ صاف و شستہ عبارت ایک آمد ہوتی ہے، جیسے نہایت شفاف پانی بہتا چلا جاتا ہو۔" اور جس شخص کو ایک پسماندہ قوم کو تیزی کے ساتھ آگے بڑھانا ہو، وہ اس رفتار پر کیسے قناعت کر سکتا جو رسّی میں بندھے ہوئے بھاری لٹھے کو نصیب ہوتی ہے۔ چنانچہ سرسید اردو زبان کی ادا، اور تاثیر اور استدلال کی بیکراں مخفی صلاحیتوں کو خلاقانہ ڈھنگ سے بروئے کار لائے۔ غیر معمولی ترقی کے باوجود اُردو نثر سے ہنوز اس پُر استدلال توانا اور ذہن نشین عبارت کا جواب نہیں بن پڑا جو سیّد کے قلم سے گزشتہ صدی میں ٹپکی تھی۔

نثر کی داستان آپ نے سُن لی۔ سائنٹفک سوسائٹی گزٹ کے ایک دوسرے مضمون کا عنوان ہے: "تدبیر ترقیِ نظم" محمد حسین آزاد کے ایک مضمون کے متعلق سرسید لکھتے ہیں: "ہم اس مضمون کی بہت تعریف کرتے ہیں کہ نظم کلام میں جس چیز کی نہایت توصیف کی جاتی ہے وہ صرف یہی نہیں ہے کہ پیچیدہ اور متعلق مضامین بیان کیے جاویں اور آدمی کو پہاڑ اور پہاڑ کو آدمی بنایا جاوے اور جھوٹے مبالغہ سے اصل مطالب کو بھی خبط کر دیا جاوے۔ بلکہ حقیقت میں خوبی یہ ہے کہ غم کا ذکر ہو تو سُننے والوں کے دل پُر غم اور چشم پُرنم ہو جاویں، اور خوشی کا ذکر ہو تو روتے ہوئے ہنس پڑیں۔ اگر میدان کارزار کا ذکر ہو تو دلاور حملہ کرتے اور نامرد بھاگتے نظر آجاویں، اور اگر سخاوت کا ذکر ہو تو بخیل بھی دریا دل ہو جائیں۔ غرض کہ ہر مضمون کی صورت بن جاوے۔ کیونکہ حقیقت میں فصاحت جس چیز سے عبارت ہے وہ صرف ایسے مناسب اور نرم الفاظ کے استعمال کرنے کا نام ہے جو خود بخود سُننے والے کے دل میں بیٹھ جاویں۔ اور بلاغت جو چیز ہے وہ صرف مقتضائے حال کے موافق کلام کرنے کا نام ہے۔"

اسی مضمون سے آگے چل کر معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی تعلیم کی مخالفت میں بالآخر دراڑ پڑ گئی تھی اور ان سبزی خوروں کی طرح گاہے ماہے جو چھپ کر گوشت کھا لیتے ہیں، انگریزی کے مخالف در پردہ انگریزی کے قریب پہنچنے لگے تھے۔ ملاحظہ ہو:— "ہم خوب جانتے ہیں کہ ہر چیز اور ہر فن کی ترقی کسی نہ کسی امید پر مبنی ہوتی ہے ... البتہ ایک ادنیٰ سند جو فوراً قابل تسلیم ہوتی ہے یہ ہے کہ انگریزی زبان جو ہمارے حاکمِ وقت کی زبان ہے، برابر ہمارے ملک میں ایسی پھیلتی جاتی ہے جیسے ایک ہوا کا جھونکا دم کے دم میں اِدھر

سے اُدھر نکل جاتا ہے، حالانکہ اس کی تعلیم کے واسطے کوئی تحریکِ ظاہری نہیں ہے... یہاں تک کہ جو لوگ بڑے بڑے اتقیا میں شمار ہوتے ہیں اور جن کے جلسوں میں ہر وقت کفر و اسلام ہی چھنا کرتا ہے اور جب پوچھو تو اوروں کو انگریزی پڑھنا حرام ہی بتاتے ہیں، وہ بھی خفیہ انگریزی کے مشتاق ہیں اور عوام الناس کی نظر سے غائب ہو کر حکام کے سامنے انگریزی بولنے اور سمجھنے پر فخر کرتے ہیں پس اس سے معلوم ہوا کہ امید عجیب چیز ہے اور امید سے بڑے بڑے کام چلتے ہیں اور علوم و فنون کی ترقی صرف قدر دانی پر ہی موقوف ہوتی ہے۔"

حضرات! آپ خود سے یہ سوال کر رہے ہوں گے کہ فی زمانہ اُردو کوئی پڑھے تو کس امید پر! مذکورہ اقتباس سے پھر سامعین کو سید احمد خاں کی عملی بصیرت اور ژرف نگاہی کا اندازہ ہوا ہوگا۔

اقتباسات کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ ان سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ سید احمد خاں، اُردو نثر اور نظم کی اصلاح، اور ان کے ذریعہ قوم کے سُدھار کو علیگڑھ تحریک کا ایک بڑا وسیلہ اور اہم مقصد سمجھتے تھے۔ جو اقتباس آگے آ رہا ہے وہ تحریک کی کامیابی کے ایک اور سبب پر روشنی ڈالے گا۔ سماعت فرمائیے۔ اس مضمون کا عنوان:

—— ہے مسدس بطور مرثیہ مسلمانوں کی قوم کی تباہ حالت پر، جب ہم نے سید یحییٰ قرطبی کا قصیدہ مرثیہ اندلس کے غم کا دیکھا تو ہم نے اپنے شفیق مکرم مولوی الطاف حسین حالی سے کہا: کیا افسوس ہے کہ اندلس پر تو رونے والے بھی تھے، مگر ہمارا زمانہ ایسا ہے کہ ہماری قوم کی ابتر حالت پر کوئی رونے والا بھی نہیں ——

—— حالی سے ہم نے کہا کہ اے میرے مخدوم خدا نے تم کو زبان دی ہے اور تم نہیں بولتے! خدا نے تم کو معجز بیانی دی ہے اور تم کوئی معجزہ نہیں دکھاتے! خدا نے تمہاری آنکھیں ابرِ نیساں سے بہتر آنسو بھرے ہیں اور تم ایک قطرہ بھی نہیں بہاتے!!! یقین کرو کہ ابرِ نیساں صدف کے دل میں جاتا ہے، مگر تمہارا آنسو انسان کے دل میں جاویگا۔ للہ اپنی قوم کے حال پر روؤ، اور قوم کی جو تباہ حالت ہے اس پر مثل قرطبی کے ایک مرثیہ لکھ دو۔

—— ہم حالی کا اور اپنے نالہ کا دل سے شکر کرتے ہیں کہ اس نے ان کے دل میں اثر کیا اور انھوں نے ہماری تمنا کو قبول کیا، ایک مسدس قوم کی حالت پر لکھنا شروع کیا اور ابتدا سے انتہا تک قصہ کہنے کا ارادہ کیا تاکہ نمو اور ترقی کے بعد تنزل کی حالت کا دل پر زیادہ اثر ہو اور قوم خفتہ بیدار ہو اور اپنی اپنی اولاد کی بھلائی و ترقی و تربیت کی فکر کرے۔"

یہ وہی مسدس ہے جس کے متعلق سرسید کا خیال تھا کہ ان کا اس کا حالی سے لکھوانا روزِ حشر ان کی بخشایش کا سبب بن جائیگا۔ غور فرمائیے یہ دیو قامت انسان، یہ بطلِ جلیل کس طرح نوابغ روزگار کو اپنے گرد جمع کرتا ہے، کس طرح ان کو، جو اس عمر اور قامت میں بہت چھوٹے تھے، اپنے سر و چشم پر بٹھاتا ہے! انھیں مخدوم کہہ کر خطاب کرتا ہے، اور ان ہی مسلمانوں کی بیماری اور تحریک کے فروغ کے لیے آمادہ کرتا ہے۔

سرسید کی یہ تحریک جو علی گڑھ تحریک کے نام سے منسوب ہے۔ چالیس پچاس سال تک پورے زور و شور کے ساتھ سارے ہندوستان میں جاری و ساری رہی۔ سرسید کو بہت بڑی کامیابی اس امر میں ہوئی کہ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو جدید تعلیم سے ہم آہنگ کرنے کا فریضہ اپنی زندگی میں انجام دیدیا اور اس روشنی اور اس علم کی کرنیں ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئیں۔ اس لحاظ سے سرسید نے اپنی زندگی میں جو کامیابی حاصل کی وہ محیر العقول ہے۔ یہ کم لوگوں کو میسر آتی ہے، اور اس میں ان کی بصیرت اور ان کی عملی صلاحیت کا بڑا دخل ہے۔ اور اس میں اس کا بھی دخل ہے کہ انھوں نے مشاہیر کو، اکابرین کو، باصلاحیت لوگوں کو، اپنے گرد جمع کر لیا اور نہ صرف جمع کر لیا بلکہ ان کی تربیت بھی کی، ان کو شوق دلایا، ان کے حوصلے کو بڑھایا۔ چنانچہ سرسید کے گرد ہمارے اُردو ادب اور ہماری اصلاحی تحریک کے بڑے بڑے مشاہیر جمع ہو گئے۔ حالی کا ذکر ابھی آیا۔ حالی، ذکاء اللہ، شبلی، ڈاکٹر نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک یہ سب ایسے نوابغ روزگار تھے جو کسی بھی ملت اور کسی بھی ملک کی فضا میں اپنی دھاک بٹھا سکتے تھے — ہر بڑے آدمی کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے گرد ایسے لوگوں کو جمع کرتا ہے، جن میں صلاحیت ہو؛ اور ایک مقصد کے تحت ان صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے؛ جو آگ اس کے سینے میں سلگ رہی ہوتی ہے وہ دوسرے سینوں میں منتقل ہو جاتی ہے اور جو مقصد وہ لے کر چلا ہے وہی مقصد اس کے متبعین کا، اس کے رفقا کا مقصد بن جاتا ہے۔ سرسید کو یہ بڑی فضیلت حاصل ہے کہ انھوں نے نہ صرف اُردو ادب اور اُردو زبان کو فروغ دیا، بلکہ اس سے وہ کام لیا جو ترقی اور پیش رفت کی راہ میں معاون بنا۔

اس زمانہ میں مسلمانوں کی پسماندگی کا کوئی جواز نہیں اور یہ بات کہ ہندوستانی مسلمان پچھڑے ہوئے ہیں، یہ بات بالکل واضح ہے! اور اس کا احساس غالباً ہمیں پورے طور سے نہیں ہے!! وہ اس لئے نہیں ہے کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اہل حرفہ کی مزدوریاں بڑھ رہی ہیں؛ ہمارے کچھ ساتھی مشرق وسطیٰ چلے جاتے ہیں، وہاں سے زر نقد کی کچھ بازیافت ہو جاتی ہے، اور ہندوستانی مسلمان سمجھتے ہیں کہ ہماری اقتصادی حالت سنبھل رہی ہے۔ لیکن صرف اقتصادی حالت کا سنبھلنا ترقی نہیں ہوتا۔ مسلمان تعلیم کے میدان میں دن بدن پیچھے جا رہے ہیں۔ اس کو مطلق الفاظ میں اگر کہا جائے، تو تناسب کے اعتبار سے یقیناً ان کی پسماندگی کسی ثبوت اور کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان اگر اپنا سارا وقت اس میں صرف کر دیں گے کہ فلک ناہنجار کا

شکوہ کریں یا وطنِ عزیز کی بے رُخی کا ماتم کریں، یا حکومت کی بے مہری کا گلہ کریں، یا یہ سمجھیں کہ ہماری تقدیر ہمارا ساتھ نہیں دے رہی ہے: تو، اگر یہ رُخ اختیار کیا تو ہم ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یہ زمانہ بہت تیز رفتار ہے۔ اور اگر ہم آگے بڑھیں گے تو اس پر ہمیں تکیہ نہیں کرنا چاہیے کہ ع مرد ے از غیب بروں آید و کاری بکند!

سام ہم کو کرنا ہے اور میں آپ سے یہ عرض کروں گا کہ وہ دَور ختم ہو گیا کہ کوئی شخص ملک گیر قیادت کو سنبھال سکے۔ بالخصوص مسلمانوں میں، وہ دَور بلند قامت انسانوں کا ختم ہو گیا۔ لیکن اس کا نعم البدل ضرور ہے: ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں جہاں کہیں میں گیا ہوں مجھ کو یہ احساس ہوا ہے کہ ہندوستانی مسلمان عام طور پر اس بات سے آزردہ، آشفتہ اور پریشان ہیں کہ وہ کیوں پیچھے جا رہے ہیں۔ اگر اس احساس کو وہ اپنے دل میں صرف سُلگنے دیں گے، کڑھتے ہی رہیں گے تو یہ ایک غیر صحتمندانہ جذبہ ہو گا۔ جہاں یہ احساس دل میں آئیگا اور جہاں یہ خیال دل میں موجزن ہو، وہاں پہلا قدم اُٹھا لینا چاہیے مسلمانوں کو اپنی اصلاح اور پیش رفت کے انتظام کے لئے!

کسی اقلیت کو کامیاب اور سرخرو ہونے کے لئے تین شرطوں کو پُورا کرنا ہو گا۔ ان میں سے اگر کسی ایک شرط میں بھی کسر رہ گئی تو، نہ تو جانبری ممکن ہو گی، نہ عزت ممکن ہو گی، نہ سرخروئی دائرۂ امکان میں آ سکیگی۔

پہلی شرط یہ ہے، اور اس کا ضامن ہمارے ملک کا جمہوری آئین ہے، کہ ہم اپنے مسلک، اپنے مذہب اور اپنی روایات پر کاربند رہیں، کیونکہ اگر ہم ان پر کاربند نہیں تو ہماری کوئی ہستی باقی نہیں رہتی۔ اور، جو اپنے مذہب، اپنے مسلک اور اپنی روایات سے وفا نہیں کرتا وہ نہ اپنے وطن سے وفا کرے گا نہ عالمِ انسانیت سے وفا کرے گا۔ لہٰذا پہلی شرط جو میں نے عرض کیا یہ کہ آپ اپنے مسلک، اپنے مذہب اور اپنی روایات پر کاربند رہیں، آپ دیکھیں گے کہ اگر آپ اس طرح سے کاربند رہیں تو سب آپ کی عزت کریں گے۔ مذہب پر کاربند ہونے کو کوئی بُری نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ بُری نگاہ سے جب دیکھا جاتا ہے، جب لوگ مذہب سے انحراف کرتے ہیں، اور مذہب کے نام پر وہ باتیں کرتے ہیں، اور ان سے وہ اعمال سرزد ہوتے ہیں، جن میں اور مذہب میں دراصل بَیر ہے۔

دوسری شرط یہ ہے، اقلیت کے سرخرو اور جانبر ہونے کی، کہ وہ اپنی ریاضت سے، محنت سے، جفاکشی سے، انہماک سے، اپنے آپ کو اکثریت کے افراد سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ وہ اگر اپنے آپ کو بہتر ثابت نہیں کرتی تو اس کو یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ ملک کے نظام میں یا معیشت کی ترقی میں کوئی نمایاں

حصہ لے سکے گی۔

تیسری شرط: یہ میں آپ سے عرض کروں کہ ہمارا آئین جمہوری آئین ہے جس میں ہر فرد کو اور ہر شہری کو برابر کا حق حاصل ہے اور حکومتوں کا جو حکومتیں بنتی رہی ہیں ان کی ملکی پالیسی اور ان کا پروگرام بھی یہ رہا ہے کہ اس میں کسی مذہب و ملت کے ساتھ امتیاز نہ برتا جائے۔ لیکن امتیاز کسی نہ کسی عنوان راہ پا جاتا ہے! نہ تو آئین اس کی اجازت دیتا ہے، نہ حکومت کی یہ پالیسی ہوتی ہے، لیکن امتیاز راہ یوں پاتا ہے کہ ہم میں' اور دوسرے فرقوں میں' اکثریت میں ایک فاصلہ رہتا ہے' ایک دیوار حائل رہتی ہے: وہ ہمیں نہیں سمجھ سکتے، ہم انھیں نہیں سمجھ سکتے۔ تو کسی اقلیت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دوسرے فرقوں کے ساتھ' بالخصوص اکثریت کے ساتھ' پہلی شرط پر کاربند رہتے ہوئے' اپنے تعلقات کو شگفتہ رکھے غلط فہمیوں کو دور کرے۔ مگر جیسا کہ میں نے آغاز داستان میں عرض کیا تھا' یہ پابندی صرف اقلیت پر نہیں' یہ پابندی اور یہ فرض اکثریت پر بھی عائد ہوتا ہے۔

اگر یہ شرائط پوری ہوتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اقلیت سرخرو نہ ہو' اپنے آپ کو ملک کی ترقی میں برابر کا شریک نہ سمجھے' اور ملک کے وسائل سے برابر کی منفعت نہ حاصل کرے۔ سب ——— بعض لوگوں کے ذہن بعض اوقات مسموم ہوتے ہیں' اس میں کسی فرقہ یا کسی ملت کی قید نہیں ہے لیکن اگر مسلمان اپنے آپ کو جہالت سے نکال سکیں' اپنے آپ کو تعلیم دے سکیں' اور اپنی رائے عامّہ کا وزن محسوس کرا سکیں' تو بہت سی غلط فہمیاں اور بہت سی بدگمانیاں' جو مسلمانوں سے متعلق بعض اہل وطن کے دل میں راہ پا جاتی ہیں' وہ دور ہو جائیں گی۔ سر سید کی تحریک کا سب سے بڑا اور سب سے اہم عنصر تعلیم کو عام کرنا تھا۔ آپ غور فرمائیں کہ ملک میں کتنے مسلمان ایسے ہیں' آپ ہاتھ کی انگلیوں پر ان لوگوں کو گن سکتے ہیں' ان ہندی مسلمانوں کو' جنھوں نے ملک کی سطح پر یا بین الاقوامی سطح پر کوئی امتیاز حاصل کی ہو۔ ایک ہاتھ کی انگلیاں بھی شاید تشنہ رہ جائیں اور آپکو بیچ ہی میں کہیں رکنا پڑے۔ آپ غور کیجئے اسکی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سر سید کی تحریک' جو علم کی تحریک تھی' جو علم کو عام کرنے کی تحریک تھی' وہ ایک پچاس سال چلی' اور اس کے بعد پھر ہم نے اس تحریک سے منھ موڑ لیا اور ہم دن بدن جہالت کی طرف جا رہے ہیں۔

ہم ان بستیوں میں بھی گئے جہاں مسلمان اہل حرفہ ہیں' بہت سے شہر ہیں۔ وہاں یہ معلوم ہوا کہ مسلمان والدین یا تو اپنے بچوں کو اسکولوں میں بھیجتے نہیں' اور اگر بھیجتے ہیں تو دو تین سال کے بعد ان کو اٹھا لیتے ہیں' واپس بلا لیتے ہیں' اس خیال سے کہ ان کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا اگر دس سال یا بارہ سال کا لڑکا ان کے ساتھ

صنعت و حرفت میں لگ جائے گا اور کمانے لگے گا۔ مجھے توقع طلبہ اہلِ حرفہ سے خطاب کرنے کا ، اور میں نے ان سے سوال کیا ہے کہ جب تم سے حشر کے روز مواخذہ ہوگا کہ ہم نے ان لوگوں کو بحیثیت اولاد کے تمھاری تحویل میں دیا تھا ، تم نے محض اس غرض سے کہ تم خوش معاشی کر سکو ، آسائش کے ساتھ زندگی بسر کر سکو ، تم نے ان کو جہالت کے غار میں جھونک دیا! اور تم اس پر مطمئن بیٹھے رہے!! تو تم کیا جواب دو گے؟ اور ، آپ کو حیرت ہوگی کہ ، اس کا اثر ہوا! بعض لوگ محسوس کرنے لگے ہیں!! میری درخواست آپ سب حضرات سے یہ ہوگی ، اور یہ اسی علی گڑھ تحریک کے سلسلے میں ہے ، کہ یہ سوال کہ کوئی آکر ہمیں راہ دکھائے گا ، کوئی بڑا رہنما پیدا ہوگا وہ ہماری نقل ماہیت کر دیگا ، ایسے سوال نامناسب ہے؛ یہ امید نامناسب ہے۔

بحیثیت ایک کمیشن کے ، جو جونیر پوسٹ کی بھرتی کرتا تھا ، مجھے ہندوستان بھر میں جا جا کر انٹرویو کرنے کا اتفاق ہوا ، اور میں نے یہ عبرت ناک منظر دیکھا کہ بحیثیت مجموعی جو ہریجن لڑکے انٹرویو دینے کے لئے آتے تھے وہ بحیثیت مجموعی مسلمان لڑکوں سے بہتر ہوتے تھے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہریجن لڑکے بڑھ رہے ہیں ، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم پیچھے کی طرف ہٹتے چلے جائیں۔ ان میں آگے بڑھنے کا جذبہ ہے ، ولولہ ہے؛ ہم میں آگے بڑھنے کا جذبہ ابھی پیدا نہیں ہوا۔ اس جذبہ کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ، اس جذبہ کو اگر ہم نے بیدار نہیں کیا ، تو یہ زمانہ سخت مقابلہ کا زمانہ ہے ، اور بہت تیز رفتار زمانہ ہے ، جو لوگ پیچھے رہ گئے ہیں ، وہ آگے جانے والوں کو کبھی نہیں پکڑ سکیں گے اگر انھوں نے اسی عنوان سے تساہل برتا۔

میں آخر میں آپ سے یہ عرض کروں گا کہ سرسید کی تحریک جو علم اور روشنی کی تحریک تھی ، اس کے احیا کی ضرورت ہے۔ ہمیں گھر گھر یہ پیغام پہنچانا ہے کہ بغیر علم کے اس دنیا میں کامیابی ناممکن ہے۔ سرسید اور مسلمانوں کے دوسرے قائدین میں بڑا فرق یہ ہے کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے رہنماؤں نے مسلمانوں کے جذبات سے اپیل کی ، اور مسلمان جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ ان میں سے صرف سرسید ایک ایسے ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کے شعور ، مسلمانوں کی عقل سے ، اپیل کی ، اور ان سے کہا کہ " اپنے نیک و بد پر غور کرو ، ہر بات کو پرکھو۔ کسوٹی پر رکھو ، اور جب کسوٹی پر وہ بات سچی ثابت ہو ، تب اس کو اختیار کرو۔ عقل کے ساتھ اپیل ، سرسید کا طرۂ امتیاز تھا۔ سرسید نے ہماری زبان کے مزاج کو بدل دیا لیکن ہمارے اقدار کے مزاج کو وہ بدل نہیں پائے۔ یہ جان کاشن تھا کہ مزاج جذباتی نہ ہے ، مزاج عقل پر مبنی ہو ، انسان پرکھے ، انسان بہکے نہیں! ہمارے لئے بہت آسان ہے کوئی افواہ بنا کر اگر ہمارے درمیان مشتہر کر دے تو ہم چند

لمحوں میں اسے باور کر لیتے ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ یہ افواہ قرین قیاس ہے بھی کہ نہیں۔ لہٰذا میری آپ سے اپیل ہو گی اور اپیل آپ حضرات سے تو کم ہے، ان حضرات سے زیادہ ہے جن تک آپ کی رسائی ہو گی، آپ ان سے کہیے کہ علم کے بغیر انسان دنیا میں جانور کی حیثیت رکھتا ہے، اور بڑے انسان کبھی پیدا نہیں ہو سکتے جب تک علم کی بیس (BASE) بہت وسیع نہ ہو۔ جب علم کی بیس (BASE) وسیع ہوتی ہے، جبھی بڑے بڑے مشاہیر، بڑے بڑے اکابر، بڑے بڑے صاحب ذہن و دماغ، لوگ بھی پیدا ہوتے ہیں جب لاکھوں کی بیس (BASE) ہوتی ہے۔ مسلمان لڑکوں کے متعلق میں بتا رہا تھا کہ مسلمان ابتدائی تعلیم میں بہت کم داخل ہوتے ہیں اور تناسب ڈراپ آؤٹ (DROP-OUT) کا بیٹھ جانے کا، جتنا مسلمانوں میں ہے وہ کسی فرقہ کسی طبقہ میں نہیں ہے۔ جیسے جیسے آگے بڑھتے رہتے ہیں، تناسب کے اعتبار سے مسلمان لڑکوں کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سرسید کی روح مضطرب ہو گی۔ انھوں نے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا، لیکن مزاجوں کو وہ بدل نہیں سکے! اور جتنا انھوں نے کر لیا، اگر ایک انسان اس کا عشر عشیر بھی کرے تو اس کے لئے قابل فخر ہو گی، یہ بات! لیکن مزاجوں میں تبدیلی ضروری ہے، ورنہ ہم ہر موقع پر دھوکا کھائیں گے! ہم ہر قدم جو اٹھائیں گے وہ پیچھے کی طرف بڑھے گا؛ آگے کی طرف ہماری نظر نہیں ہو گی۔

یہ انوکھی بات ہے کہ مسلمان، جن کے مذہب میں ہر قدم پر علم کی بڑی تاکید ہے: مبصرین نے تو یہ بھی کہا ہے کہ کلام مجید میں جتنی آیتیں تدبر، تفکر اور استخراج نتائج سے متعلق ہیں اتنی آیتیں جملہ امور دینی کے متعلق نہیں ہیں اور انھیں ہدایات کا اثر تھا کہ ۸۰۰ء سے ۱۲۰۰ء تک، یہ سائنس کے عیسائی مؤرخین لکھتے ہیں کہ، ۸۰۰ء سے ۱۲۰۰ء تک، چار سو سال، دنیا کے علوم میں کوئی اضافہ ایسا نہیں ہوا جو مسلمانوں سے شروع نہ ہوا ہو۔ یعنی دنیا کے علوم میں سارے اضافے، چار سو سال تک، مسلمانوں کے اجتہاد، ان کی ندرت نگاہی، ان کی علم دوستی کے مرہون منت ہیں۔ اس کے بعد تین سو، چار سو سال بتدریج زوال کے گزرے اور پھر اس کے بعد چار سو سال ایسے گزرے جب مسلمانوں کے ساتھ علم کا کوئی کارنامہ بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دنیاوی علوم، جن کو سائنس کہتے ہیں، آپ کو حیرت ہو گی کہ ہر دس سال میں دنیاوی علوم دُگنے ہو جاتے ہیں؛ اس رفتار سے علم بڑھ رہا ہے۔ جب علم اس تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہو، تو کیا یہ عبرت اور شرم کا مقام نہیں کہ اس میں ہمارا تعاون، ہماری شرکت، ہمارا حصہ، تقریباً صفر ہو۔ یہ صفر محض اس بنا پر ہے کہ ہم نے علم سے منہ موڑ لیا ہے۔ علی گڑھ تحریک جو پیام لے کر آئی تھی، اس ندی کی طرح جو ریگ زار میں جا کے خشک

ہوجائے، وہ پیام خشک ہوگیا اور ہم اس سبق کو بھول گئے، جو سید والا گہر نے ہمیں دیا تھا۔ مسلمان اگر اپنی تعمیر کرنا چاہتے ہیں، اور اپنے وطن عزیز کی پیشرفت میں اپنے بھائیوں کے ساتھ شانہ بشانہ اور قدم بقدم چلنا چاہتے ہیں، اور دنیا میں امتیاز حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو ان کو وہ سبق دُہرانا ہوگا! ان کو علم کی اس رسّی کو پھر سے پکڑنا ہوگا جس کو آپ "عُروۃُ الوُثقیٰ" کہہ سکتے ہیں۔

وہ رسّی اگر آپ نے پکڑ لی تو پھر، نہ آپ کو پسماندگی کا گلہ ہوگا، نہ آپ کو فلک ناہنجار سے شکایت ہوگی۔ بلکہ، آپ مطمئن ہوں گے کہ جو کچھ آپ کے مقدور میں تھا، جو کچھ آپ کی قدرت میں تھا، وہ آپ نے انجام دیا۔

لہٰذا میری آخری التماس آپ سب حضرات سے یہ ہے کہ ہم یاس اور محرومی کا ماتم کرنا چھوڑ دیں۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ماتم کرنے سے جوانمردی ختم ہوتی ہے، ماتم کرنے سے قوتِ عمل شل ہوجاتی ہے شکایت کرنے سے انسان کا ظرف اُتھلا ہوجاتا ہے، انسان میں وزن نہیں رہتا۔ جو لوگ مردِ میدان ہیں، وہ کام کرتے ہیں، وہ قدم آگے بڑھاتے ہیں؛ وہ شکوہ نہیں کرتے، وہ شکایت نہیں کرتے۔ آپ کے آئینی حقوق بہت سے ہیں۔ آپ کے بہت سے رہنما ہیں جو آپکے آئینی حقوق کا مطالبہ کرتے رہیں گے۔ لیکن آپ کی بنیادیں جب تک مضبوط نہیں ہونگی جب تک کہ آپ علم کا دامن مضبوطی کے ساتھ نہ پکڑ لیں، اور میں نے جو معروضات کیے تھے کہ اقلیت کے لئے تین شرطوں کی پابندی ضروری ہے، اگر اس سے غفلت برتی گئی تو، پھر کوئی اقلیت اس کی حقدار نہیں ہوگی کہ وہ شکوہ کرے کہ ہمارے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے، ہم پیچھے رہے جارہے ہیں، ہمارے خلاف امتیاز برتا جارہا ہے: اس قسم کے واقعات ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کی رائے عامہ، یا جبر رائے عامہ تو ہو! آپ کے پاس، ہندوستانی مسلمانوں کے پاس کوئی اخبار بھی ایسا نہیں ہے۔ آپ کی حیثیت گونگوں کی سی ہے۔ آپ اپنی ترجمانی بھی نہیں کرسکتے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کے پاس اخبار ہونا چاہیئے، آپ کے مسلک کو واضح ہونا چاہیئے۔ مسلمان، ہندوستان کے سینہ پر بار بن کر نہیں جینا چاہتے، وہ اپنے وطنِ عزیز کو ترقی دینا چاہتے ہیں، اس جذبہ اور اس حوصلہ کے ساتھ کہ وہ اس میں کسی سے پیچھے نہ رہیں! دعا ہے کہ خدا اس مدّعا کو پورا کرے!

●●

کہ آشیاں کسی شاخِ شجر پہ بار نہ ہو

یہ بات کچھ زیادہ پُرانی نہیں کہ ہم ہندوستانی مسلمان مطمئن تھے۔ اپنے ماضی پہ نازاں، حال سے بے فکر اور مستقبل سے غافل تھے۔ کسی کو احساس تک نہ تھا کہ ہم نے کیا کھویا ہے اور ہم ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے کتنے پیچھے رہ گئے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آج ہمیں احساسِ زیاں تو ہے! ہمارے رفیق میدان میں اُترے تو ہیں۔ اُنھوں نے کسی شہرت کی خاطر نہیں، کچھ کر گزرنے کے خیال سے اس میدان میں قدم رکھا ہے۔ یہ احساس ہوا تو ہے کہ سائنس اور ریاضی کی تعلیم ضروری ہے اور اس تعلیم میں جو خامیاں ہیں ان کو دُور کرنا ہے۔ آج ہم اس حقیقت سے واقف تو ہیں کہ ہمارے تعلیمی اداروں کا معیار اچھا نہیں۔ ان میں جن اداروں کی حالت نسبتاً بہتر ہے ان میں ہمارے طلبا اقلیت میں ہیں اور جن کی حالت سقیم ہے وہاں ہمارے طالب علم اکثریت میں ہیں۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں غیر مسلم بھائیوں کی شرکت ایک اچھی علامت اور اتحاد کی نشانی ہے مگر اس شرکت کا تناسب قابلِ غور ہے۔

اس پر غور کرنا چاہیے کہ امریکا پر یہودیوں کا تسلط کیسے ہوا۔ وہ اپنی محنت اور صلاحیت کی بنا پر تمام بڑے اداروں پر چھا گئے۔ اُنھوں نے اپنے بچّوں کو تربیت دی، ان میں مقابلے کا شوق پیدا کیا، اَوروں پر سبقت لے جانے کا جذبہ بیدار کیا۔ یہ سب ہمیں بھی کرنا ہوگا اور فلکِ ناہنجار کا شکوہ ترک کر کے میدانِ عمل میں اُترنا ہوگا۔

ہمیں کسی سے عداوت نہیں۔ برادرانِ وطن آگے بڑھتے ہیں تو اس کی شکایت نہیں، بلکہ ہمیں ان کی ترقی سے خوشی ہے کہ یہ ملک کے آگے بڑھنے کا

نشانی ہے۔ اس پر ہمارا ردِّ عمل مثبت ہے اور ہونا چاہیے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کہیں ہم پسماندہ نہ رہ جائیں۔ کہیں ہماری پسماندگی ملک کی ترقی کے راستے میں حائل نہ ہو جائے۔ ہم اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں، اور جس ملک کی اتنی بڑی تعداد پسماندہ ہو وہ ترقی یافتہ کیسے کہلا سکتا ہے؟ اگر ہم نے اپنی پسماندگی کو دور نہ کیا تو ہم پر یہ الزام عائد ہوگا کہ ہم اپنے ملک کی خوشحالی کے راستے میں رکاوٹ اور اس کی معیشت پر بوجھ بن گئے!

(مسلم اسکولوں کے سربراہوں کی کانفرنس کے خطبۂ صدارت سے ۱۰ اگست ۷۴،

●●

ہمارے مسائل

سو سال سے زیادہ ہوئے سرسیّد نے ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" کے نام سے جاری کیا تھا۔ یہ تین بار نکلا اور بند ہوا۔ تہذیب الاخلاق کی کل مدت حیات دس برس سے آگے نہ بڑھ سکی۔ سرسیّد نے پہلی بار اسے اس لئے بند کیا کہ جن اصلاحی خیالات کا اظہار وہ اس کے ذریعہ کر رہے تھے وہ بعض اُن با اثر اور قدامت پسند اشخاص کو ناگوار تھے جن کی مدد سرسید ایم اے۔ او کالج کے قیام اور فروغ کے لئے لینا چاہتے تھے۔ انھوں نے یہ رسالہ بادل ناخواستہ بند کیا، اگرچہ اُن اشخاص کا اور خود اسی تحریک کا بھرم رکھنے کے لئے انھوں نے اپنے اس لخت جگر کو پیوند خاک کرتے ہوئے کہا تو یہی کہ وہ اپنا مقصد پورا کر چکا تھا۔ مقصد کی ایک گونہ تحصیل ضرور ہوئی تھی یعنی پڑھے لکھے مسلمانوں کے ایک طبقہ میں یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ ہمیں مایوسی، جہالت، جھوٹی قناعت اور اندھی قدامت سے دل کے دامن کو بچانا ہے، ان بُرائیوں سے نجات حاصل کرنا ہے، ہمیں زمانہ کے تقاضوں کو سمجھنا ہے اور انھیں پورا کرنا ہے، اگر ہم نے جدید تعلیم سے منہ موڑا تو زندگی کی دوڑ میں ہم پیچھے رہ جائیں گے اور پیچھے رہ جانے کا انجام شروع میں تحقیر اور رسوائی اور آخر میں فنا ہے۔ لیکن یہ احساس ابھی عام نہ ہوا تھا کہ یہ رسالہ بند ہو گیا۔ سرسیّد نے سوچا ہوگا کہ جس کالج اور جس یونیورسٹی کا خواب انھوں نے دیکھا ہے اس کے قیام کے بعد وہ ادارہ خود سرچشمۂ تہذیب و ہدایت بن جائے گا اس نور کے منبع سے جو کرنیں پھوٹیں گی وہ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے ہر گوشے کو منور کریں گی، اس ادارے کا کام نہ صرف تعلیم دینا اور تحقیق کرنا ہوگا، بلکہ تربیت دینا اور اخلاق کو سنوارنا بھی ہوگا۔ محمڈن اینگلو اورنیٹل کالج کو قائم ہوئے ۱۰۴ سال ہو گئے اور اسے یونیورسٹی بنے ہوئے دو اوپر ساٹھ سال۔ تہذیب الاخلاق کو جو کام کرنا تھا وہ یہ ادارہ نہ کر پایا۔ اس میں شک نہیں کہ اس ادارہ نے حوصلہ پیدا کیا، روشنی بخشی، اس نے ایسے فرزندوں کو جنم دیا جو ملک و ملت کے لئے سرمایۂ افتخار بنے۔ جو کچھ روشنی ہم ہندوستانی مسلمانوں میں دیکھتے ہیں وہ بڑی حد تک اسی ادارہ کی دین ہے۔ لیکن آگے چل کر یونیورسٹی کے ولولے سرد ہو گئے۔ ملک کی تقسیم کے لئے اُسے الزام دیا گیا۔ یہ اس کے ساتھ ناانصافی تھی۔ یہ خیال کہ ہم پر شبہ کیا جا رہا ہے، ہمیں عداوت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے، صحت کے لئے مضر ہے۔ ہمارے طالب علم سمجھنے لگے کہ ہمارے ساتھ اپنے ملک میں انصاف نہیں ہوگا۔ ہمیں یہاں

روزگار نہیں ملے گا۔ اور واقعی جب انھوں نے روزگار کے دروازہ کو یہاں بند پایا تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ روزگار کی تلاش میں سرحد کو پار کریں۔ وہ اس طرح گئے تو نہ جانے والوں کو اور شبہ کر گئے۔ شبہ رہنے کے بعد حوصلہ کہاں باقی رہتا ہے۔ چنانچہ جس ملت کو سر سید نے سرگرم عمل ہونا اور آگے بڑھنا اور زمانہ کے ساتھ چلنا سکھایا تھا وہ ملت اپنے خول میں واپس چلی گئی۔ خول کے اندھیرے سے اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچی۔ روشنی کھٹکنے لگی۔ مایوسی نے الٹے مشورے دیے۔ خود پر ترس کھانے لگے۔ طبیعت شکایت کی خوگر ہو گئی۔ شبہ کا جواب بدگمانی سے دیا گیا، غرض کہ حالات کے صحت مند اور نارمل ردّ عمل سے ہم لوگ محروم ہو گئے۔ فسادات اور تجربات نے اس لَے کو اور تیز کر دیا۔

یونیورسٹی جو کھوں میں پڑ گئی تھی۔ اس کو ایک بڑے رہنما اور اس کے ایک مشیر کی بصیرت نے بچا لیا۔ یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کی تعداد، اس کی عمارتوں اور ساز و سامان، اس کے بجٹ میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اس کے سارے مصارف کی حکومت کفیل بن گئی۔ لیکن اس دارالعلوم میں وہ روح پلٹ کر نہ آئی جس نے اسے تعلیم و تہذیب کی ایک بڑی تحریک کا مرکز بنا دیا تھا۔ اس کے فرزند اس اعتماد اور ولولے سے محروم ہے، جو ان کی پہلی پیڑھیوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ انھوں نے ریاضت سے دامن بچایا، مقابلے سے آنکھ چرائی۔ انھوں نے مقدار کو معیار کا بدل سمجھا۔ بساط سے زیادہ داخلے کئے گئے۔ ہم آگے بڑھے صرف تعداد میں۔ اس اطمینان نے بھی کہ حکومت وقت سارے اخراجات کی ضامن ہے ہمت کو پابہ زنجیر کر دیا۔ انجام کار یہ یونیورسٹی عام یونیورسٹی کی صف میں بیٹھ گئی۔ جسے عہد آفریں ہونا تھا، وہ عہد شکن ثابت ہوئی، اس عہد کو توڑنے والی جو اس نے اپنے بانی سے کیا تھا، یعنی یہ پیمان کہ وہ شجر سے پیوستہ رہتے ہوئے جدید ترین ترقیوں کو جذب کرے گی، تعلیم اور تہذیب کی نقیب اور کارواں سالار بنے گی۔ افسوس کہ یہ جیتا جاگتا، امنگوں، خوابوں اور زندگی سے بھرپور ادارہ ضابطۂ آسایش، بے امنگی اور معیار فراموشی کے شکنجے میں جکڑ گیا۔ اب یہ خود کو سنبھال لے، اپنے طالب علموں کو روشنی اور حوصلہ بخشے تو بڑی بات ہے۔ پوری ملت کی رہنمائی کا اس کا ہونا نہیں ہے حالاں کہ یونیورسٹی کے ایکٹ میں حال ہی میں جو ترمیمیں ہوئی ہیں ان میں ایک کی رُو سے یونیورسٹی پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی بہبود اور ترقی کے لئے جد و جہد کرے یہ دفعہ اہم اور دھیان دینے کے لائق ہے اس کام میں ایسے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ کانفرنس نے ایک زمانہ میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس کے سالانہ اجلاس ہندوستانی مسلمانوں کے سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان اجلاس کے صدارتی خطبے مسلمانان ہند کے تمام اہم مسائل کا احاطہ کرتے تھے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی تجاویز پیش کرتے تھے۔

تہذیب الاخلاق کی طرح کانفرنس علی گڑھ تحریک کا اہم جزو تھی۔ وقت کا تقاضا ہے کہ تہذیب الاخلاق کو نئے سرے سے زندہ کیا جائے اور کانفرنس کی مردہ رگوں میں خون زندگی دوڑایا جائے۔

ہم تہذیب الاخلاق کو کوئی دوسرا نام دے سکتے تھے لیکن وہی نام رکھنے کی جسارت تسلسل کی خاطر کی جارہی ہے اور توانائی اور روشنی حاصل کرنے کے لئے بھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں یہ موڑ بہت کچھ دنیا بدلنے جیسے ۱۸۵۷ء کی بغاوت یا جنگ آزادی کے بعد کا موڑ۔ اسی انداز سے آزادی کے بعد مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے کہ پہلی جنگ آزادی کے بعد پہلی بار ان کے اطوار و افعال اور زاویہ نگاہ کو انگریزوں نے شکست اور ان کے مظالم نے مسخ کر ڈالا تھا۔ بٹوارہ اور آزادی کے بعد ایک بار پھر ان کے اعتماد کو زبردست دھکا لگا۔ انھوں نے بے رحم دنیا سے بدلہ اس طرح لیا کہ اس ہماہمی اور اس کی پیش رفت سے کنارہ کش ہوگئے۔ بند پانی میں فساد کی بو آتی ہے۔ پانی مرتا ہے تو سڑنے لگتا ہے۔ کارواں رُک کے ناکارہ ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کی دوسری بڑی اکثریت ہیں۔ انھیں اقلیت کہنا نامناسب ہوگا۔ صدیوں تک صاحب اقتدار و اختیار رہ چکے ہیں۔ ان کا تعلق ایک ایسی ملت سے ہے جس نے علم و عمل کی مشعلیں روشن کیں، جس نے اخوت، حریت اور مساوات کے دیئے جلائے، ان مشعلوں، ان چراغوں کو لے کر چشم زدن میں دنیا کو منور کر دیا۔ تاریخ کا یہ بڑا طنز ہے کہ چند صدیاں گزرنے کے بعد وہی لوگ جو مشاہدہ، تجربہ اور غور و فکر کے علمبردار، علم و اخلاق کے کارواں سالار تھے، جہالت، جمود اور اندھی تقلید کے حصار میں آ بیٹھے۔ جہالت نے انھیں کہیں کا نہ رکھا۔ اپنے بھلے برے کا انھیں شعور نہ رہا۔ جب تک کہ تعلیم عام نہیں ہوتی، مسلمان تہذیب کی برکتوں سے محروم رہیں گے۔ علم ہماری گمشدہ میراث ہے اسے حاصل کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے، اس پیغام کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام 'تہذیب الاخلاق' انجام دے گا۔

اردو میں اخبار اور رسائل کی کمی نہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے 'جو سنجیدہ انداز میں مسلمانوں کے تعلیمی، سماجی اور اقتصادی مسائل پر غور کرتا ہو؛ جس کا مقصد ہو مسلمانوں میں وہ خواص پیدا کرنا جو انھیں تنزل سے ہٹا کر ترقی کی طرف لے جائیں۔ یہ بات کہتے ہوئے ہماری گردن شرم سے جھک جاتی ہے کہ مسلمان اس ملک کا سب سے پسماندہ فرقہ ہیں۔ اس سے زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ انھیں اپنی پسماندگی کا علم ہے نہ احساس۔

ہماری دوسری شانِ امتیاز کاہلی ہے۔ اگر ہمارا کوئی عضو سرگرم عمل ہے تو زبان۔ زیادہ بولنے والے دو طرح ٹوٹے میں رہتے ہیں۔ اس عادت سے ایک تو قوتِ عمل کو زنگ لگتا ہے۔ دوسرے یہ سننے، غور کرنے

اور سمجھنے کا موقع نہیں دیتی۔ ہم قول کو فعل کا بدل سمجھنے لگتے ہیں۔ یہیں سے خود فریبی کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جو کردار کو کھوکھلا کر دیتا ہے اور انسان کو جھوٹ کے گڑھے میں دھکیل دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ آرام طلبی ہماری طبیعت بن گئی ہے۔ محنت، ریاضت اور جفاکشی سے ہم جی چراتے ہیں۔ ہم وقتی جوش میں کبھی کبھی خون بہانے کی بات تو کرتے ہیں، مگر پسینہ بہانے سے گھبراتے ہیں۔ پتہ مارنے کے بجائے ہم ڈینگ مارتے ہیں۔ بادشاہی، جاگیرداری اور زمینداری کے زمانے ختم ہوئے، لیکن وہ مزاج ہنوز باقی ہے۔ رسی جل گئی، بل نہ گیا:

لے خاک میں پر رعونت وہی ہے ⁂ ہوئی صبح اور خواب راحت وہی ہے

شراب، کی طرح کاہلی بھی ام الخبائث ہے۔ ان گنت برائیوں کی جڑ ہے۔

اور رعونت وہ تیسرا روگ ہے جو گھن کی طرح ہمیں لگ گیا ہے۔ جسے دیکھئے فرعون بے سامان بنا ہوا ہے۔ اگر سامان ہوتا تو نہ جانے کیا کرتے۔ یا شاید بے سروسامان ہونے کی نفسیاتی تلافی مریضانہ گھمنڈ کے ذریعہ کی جا رہی ہے۔ انانیت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ بڑے بڑے اہم ملی مسائل میں کیا رخ اختیار کیا جائے، اس کا فیصلہ صرف اس بات پر ہوتا ہے کہ جو شخص براہ راست اس مسئلہ سے متعلق ہے وہ آپ کی طرف کس حد تک ملتفت ہوا۔ اس نے قصداً یا سہواً آپ کو نظرانداز کر دیا تو آپ نہ صرف اس کے دشمن ہو جائیں گے بلکہ اس مسلک کی مخالفت پر تل جائیں گے جو اس غریب نے اپنایا ہے۔ امور کے متعلق ردعمل کا یہ انداز خامکاری اور تنگ ظرفی کی دلیل ہے۔ یہ طریق کار، افراد کی یہ سوجی اور پھولی ہوئی انانیت، جماعت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ عبرت کی جگہ ہے کہ انفرادی نخوت نے اجتماعی عزت نفس کا خون کر دیا ہے، بلکہ خود جمعیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں ⁂ موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

یہی رعونت نفاق کی جڑ ہے۔ اتحاد نہ ہوگا تو طاقت کہاں سے آئے گی، جسے دیکھئے لڑنے مرنے کے لئے تیار ہے۔ بے جہاد انفرادیت نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ طغیان آمادہ انانیت اور بے زنجیر انفرادیت پر انکس لگانا ہے۔

انانیت نے ایک اور بہروپ بھرا ہے: حسد۔ اس کے جو زیادہ قریب ہوتا ہے وہی زیادہ مورد التفات ہوتا ہے۔ بیگانے ترقی کریں، پھلیں پھولیں، کوئی فکر نہیں۔ لیکن اپنوں میں کوئی بننے نہ پائے۔ آگے بڑھنے نہ پائے۔ اس سے یہ راز کھلا کہ بیچارے مسلمانوں پر جو برق گرتی ہے وہ انھیں کی خود ساختہ پرداختہ ہوتی ہے۔ اسلام نے اجتماعیت اور قناعت پر بڑا زور دیا ہے۔ یہ دونوں سبق ہم فراموش کر چکے۔

دوسرے حیوانوں پر انسان کی برتری عقل کی وجہ سے ہے۔ عقل ہی جذبات کو قابو میں رکھتی ہے، ان کی

عناں گیر ہوتی ہے، ان کو راہ پر لگاتی ہے، ان کو اچھے کاموں میں استعمال کرتی ہے۔ عقل ہی بُرے بھلے کو پہچانتی ہے، وہی اندھیرے میں راستہ دکھاتی ہے۔ ہم نے عقل کو معزول کر رکھا ہے۔ ہمارے یہاں سارا کھیل جذبات کا ہے۔ کوئی خطیب، کوئی چابکدست اہل قلم، کوئی سیاست داں، کوئی بانیٔ شر جب چاہے ہمارے جذبات کا رخ جس طرف چاہے موڑ دے۔ جذبات کا طوفان ہمیں اونچ نیچ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔ جو چاہے ہمیں برانگیختہ کر دے، بیوقوف بنادے، خودکشی پر آمادہ کر دے۔ جذبات کے سیلاب میں بہنا کون سی اچھی بات ہے۔ سیلاب میں تو خس و خاشاک بھی بہتے ہیں۔ ہمیں چٹان کی طرح قدم گاڑ کر رہنا ہے۔ یہی عزتِ نفس کا تقاضا ہے۔ بقا بھی اسی میں ہے۔ عقل بھی یہی سکھاتی ہے۔ عقل کی بازیابی، عقل کی بالادستی ہمارا مقصود ہے۔

یہاں تک تو ہم نے اپنے مزاج، اپنی افتادِ طبع کو آئینہ دکھایا ہے، وہ افتادِ طبع جو ہماری خوشحالی، ہماری ترقی کے خلاف جاتی ہے۔ اب ہم ان باتوں کا ذکر کریں گے جن پر رسالے میں خاص طور پر دھیان دیا جائے گا۔ پہلے ان توہمات کو لیجئے جنھوں نے ہمیں کمزور، اپاہج اور ڈھلمل یقین بنا دیا ہے۔ خدا کے بنائے ہوئے چھوٹے اور دن انسان کو امکانات اور مواقع فراہم کرنے میں یکساں ہیں۔ ہم نے اپنی ضعیف الاعتقادی کے باعث اُن پر مبارک اور منحوس کے لیبل لگا دیے ہیں۔ بہت سی تباہ کن، وقت، پیسہ اور اعتماد ضائع کرنے والی رسموں کو ہم نے پتھر کی لکیر مان لیا ہے۔ عقلی اور علمی ترقی کے دور میں ہم جھاڑ پھونک اور ٹونے ٹوٹکے پر ایمان لائے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات کے لئے ہم دوسروں کے دست نگر بن جاتے ہیں اور اپنے اور اپنے خدا کے درمیان فاصلوں کو طول دیتے رہتے ہیں۔ خدا کے ماسوا ہر ایک سے ہم ڈرتے ہیں۔ مل کر ہم کوئی کام نہیں کر سکتے۔ ہماری شرکت کی ہنڈیا ہمیشہ چوراہے پر پھوٹتی ہے۔ اسی لئے ہمارے کاریگر اور ہنرور امداد باہمی اور سہکارتا اور اشتراک عمل سے طاقت اخذ نہیں کر پاتے۔ جہالت اور نفاق اور کم حوصلگی ہنر کے باوصف انھیں آگے بڑھنے نہیں دیتی۔

علی گڈھ کا اُدبی اور لسانی پہلو کس قدر درخشاں تھا۔ اُردو زبان اور ادب کو اس تحریک نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ لیکن یہ احسان یک طرفہ نہ تھا۔ اگر اُردو زبان اور ادب کی پُرزور تائید اسے حاصل ہوتی تو یہ تحریک کھلا کر رہ جاتی۔ سرسید اور ان کے رفقا، حالی، شبلی، ذکاء اللہ، نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک وغیرہ نے اردو تحریر و تقریر کو سرسید کے مقاصد اور منصوبوں کی تکمیل اور اشاعت کے لئے استعمال کیا۔ اس زمانہ میں اردو میں سلیقہ اور خلوص سے جو بات کہی یا لکھی گئی، مسلمانوں کے دلوں میں اُتر تی چلی گئی۔ اِس زمانہ میں یہ عالم ہے کہ دن بدن مسلمانوں میں اُردو جاننے والوں کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کے

اہلِ قلم کے گھروں کو ٹٹولئے تو بیشتر کے بچوں کو اُردو سے ناواقف پائیے گا۔ اگر زمانہ کی رفتار یہی رہی تو وہ دن دور نہیں، جب اُردو ایک بحرِ بیکراں سے سمٹ کر جوئے کم آب رہ جائے گی، یعنی صرف ایک بولی جس کو بولنے والے بہت ہوں گے اور لکھنے پڑھنے والے بہت کم۔ اُردو کو مطالبات سے زیادہ مجاہدات کی ضرورت ہے۔ یہ ریاضت اور ایثار کی طالب ہے اور ان احساس کی جو اتک ہمارے ذخیرہ کو نہیں لگی۔

شادیوں میں داد و ستد کا شرمناک سلسلہ کہیں کہیں ہمارے یہاں بھی شروع ہو گیا ہے۔ اس رسم کو بڑھنے سے پہلے جڑ سے اکھاڑنا ہوگا، ورنہ لڑکیوں کی زندگی اجیرن ہو جائے گی اور ان کے والدین پر عرصۂ حیات تنگ ہونے لگے گا۔

جمود اور آسایش طلبی اور تن آسانی نے خانہ نشینی کو فروغ دیا ہے۔ وہ لوگ جو ایک صدی میں دنیا بھر میں پھیل گئے تھے، اب گھر چھوڑتے ہوئے گھبراتے ہیں، لہٰذا ترقی سے جس کے لئے نقل و حرکت ضروری ہے محروم رہتے ہیں۔

تعلیمِ نسواں کی اہمیت ہم نے دیر سے تسلیم کی جس کا اثر آئندہ نسلوں کی تعلیم پر پڑ رہا ہے۔ جب لڑکیوں میں تعلیم پھیلی تو ایک اور مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو حسبِ صلاحیت بر سرِ روزگار بر ملنے مشکل ہو گئے۔ ملک کے بٹوارہ کے بعد جب بہت سے لڑکے تلاشِ معاش میں پاکستان چلے گئے، اس مسئلہ نے اور شدت اختیار کرلی۔ نہ معلوم کتنے مسلم گھرانوں میں لڑکیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انتھک کوشش کر کے روزگار کی راہیں لڑکیوں پر کھولی جائیں۔

تہذیب اور شائستگی مسلمانوں کے ساتھ منسوب کی جاتی ہے لیکن جب یہ حدود سے بڑھ جاتی ہے تو بناوٹ اور تصنع بن جاتی ہے۔ کبھی ظاہر داری کی شکل اختیار کر لیتی ہے، کبھی مبالغہ اور غلو کی، کبھی کھوکھلی لفاظی کی، ان سب سے گریز ادیا۔

مسلمان اسراف پر ناز کرتے ہیں۔ فضول خرچی کو شاہ خرچی اور فراخ دلی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس آیت کریمہ کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ (فضول خرچ شیاطین کے بھائی ہیں) اس اسراف کی بدولت لاکھوں گھر تباہ ہو گئے اقتصادی بنیادیں کھوکھلی ہو گئیں۔ ہمارے یہاں دُور اندیشی اور منصوبہ بندی جو فی زمانہ افراد کے لئے اتنی ہی ضروری ہیں، جتنی اقوام کے لئے بُخل اور ناقناعتی ضعفِ ایمان پر محمول کی جاتی ہیں۔

ہم لوگ زبان کے زخم خوردہ ہیں۔ ایک پہلو دماغ نفسی اور یادہ گوئی کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ زبان کا

چٹخارہ گفتگو تک محدود نہیں رہتا، لذتِ کام و دہن اس کی لپیٹ میں آجاتی ہے اور لذتِ کام و دہن صحت جسمانی اور ذہنی صحت کے زیاں کے علاوہ وقت کی تضیع کا ذمہ دار بھی ہے۔ اوسط مسلمان گھرانے میں عورتوں کا سارا وقت کھانا پکانے میں صرف ہوتا ہے۔ ان کا سابقہ چھکنی اور دست پنے، چولہے اور توے دھوئیں اور انگاروں سے رہتا ہے۔ لذیذ مرغن مسالے دار کھانے عورتوں کے اوقات کو تلخ اور مردوں کے اذہان کو گُند کرتے ہیں، اس حد تک کہ مسلسل دماغی ریاضت اور یکسوئی سے ہم بیشتر دامن بچاتے ہیں۔ ریاضی ہمیں اسی لئے آج تک راس نہ آئی۔ سائنس کے مضامین کو ہم ہفت خواں سمجھتے ہیں۔ یہ ہماری غذا ہے، جو ہمیں سہل پسندی اور آرام طلبی کی طرف لے جاتی ہے۔ ہمارے طالب علم اکثر وہ مضامین لیتے ہیں جن میں متواتر اور باقاعدہ محنت کی ضرورت نہ پڑے۔ امتحان کے قریب نصاب کی ورق گردانی کی اور اگلی جماعت میں ڈھکیل دیئے گئے۔ کاش ہمیں احساس ہو کہ وقت اور صحت کام و دہن کی لذت سے زیادہ اہم ہیں اور مہارت اور کامیابی کے لئے لگاتار اور انتھک محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ دور سخت اور جانفشاں مقابلہ کا دَور ہے۔ جو لوگ محنت سے جی چرائیں گے، وہ صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے جائیں گے۔ یہ دَور دماغ کی بالادستی کا دَور ہے اگر دماغ پر ہم نے زنگ لگنے دیا یا اُسے دُھوئیں یا کہرے میں گھر جانے دیا، یا اُسے طویل وقفوں میں جُست کے ساتھ کام کرنے کا عادی بنا دیا تو ہمارا نام پستی میں بالاتر ہو جائے گا اور ذلت کی راہ سے ہم فنا کے دہانہ پر پہنچ جائیں گے۔ جسم اور دماغ کے باہمی ربط کو نظر انداز کر کے کوئی پنپ نہیں سکتا۔ دماغ کو پس پشت ڈال کر کوئی جماعت جانبر نہیں ہو سکتی۔ ہمیں زندگی کے ہر شعبہ میں تکلف اور تصنع سے دامن بچانا ہے، خصوصاً غذا میں۔ سادہ اور صحت مند غذا رواج پا جائے تو ہمارا "دِلِدّر" دُور ہو جائے۔ بہت سی بُرائیوں سے جن میں سرِ فہرست 'کاہل الوجودی' ہے' چھٹکارا مل جائے۔ غذا میں سادگی کے ساتھ توازن کا اہتمام بھی کرنا پڑے گا۔ ذائقہ برحق مگر اعتدال کے ساتھ۔ خدا ہمارے چٹورے پن سے بچائے۔

من حیث القوم ہم جسمانی ورزش سے بھی جی چرانے لگے ہیں۔ "نماز نیند سے بہتر ہے" کی صدا ہمارے کان تک نہیں پہنچتی اور پہنچ بھی جائے تو دوسرے کان سے نکل جاتی ہے۔ کسی بستی میں جا کر دیکھ لیجئے، ان لوگوں میں جو علی الصباح چہل قدمی کے لئے نکلتے ہیں، مسلمان ڈھونڈے نہ ملیں گے۔ ع "کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے"
اور اُن لوگوں میں جو روز سویرے غسل کرتے ہیں، کسی کلمہ گو کا گزر نہ ہوگا۔ زندگی کی دوڑ میں ہم روز پیچھے رہتے ہیں۔ ہمارے دن کا آغاز دیر سے ہوتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ طہارت کی لطافت تک ہم پہنچ جاتے ہیں، لیکن بنیادی صفائی اور حفظانِ صحت سے ہم غفلت برتتے ہیں۔ خواہ اس کا تعلق جسم سے ہو، خواہ گھر سے۔ ہمارے ساتھ کا پانی کے

علاوہ گندگی منسوب کی جانے لگی ہے، اور یہ الزام کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔

جذبات کے ہاتھ میں عنان دیدینے سے ہمیں بہت نقصان پہنچے ہیں۔ ہمیں بھڑکانا اور اکسانا اور بھڑکانا بہت آسان ہوگیا ہے۔ ہم کوئی منصوبہ نہیں بنا سکتے اور اگر بنا بھی لیا تو اس پر عمل نہیں کر سکتے، کیونکہ جذبات ہمارا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ منصوبہ عقل بناتی ہے، وہی نشیب و فراز سمجھ سکتی ہے۔ جذبات کو ثبات کب ہے۔ ندی کی طرح چڑھتے ہیں اور اسی طرح اترتے ہیں۔ وہ غور و فکر کا موقع کہاں دیتے ہیں۔ جذباتیت سے ہمیں ناتا توڑنا پڑے گا۔

مذہب کا نفوذ و اثر جتنا مسلمانوں میں ہے، کسی اور قوم میں نہیں۔ لیکن محرومی نے ہمارا یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ ہم نے عبادت کے ظواہر تک محدود کر دیا۔ زبان آیات کو فرفر پڑھنے لگی۔ دل تک آنچ بھی نہ پہنچی، دل کو آہٹ بھی نہ ملی۔ جو لوگ ٹکریں مار لیتے ہیں انھیں سجدہ اور عبادت کی قدر و قیمت کا احساس بھی نہیں ہوتا، وہ سجدہ جس کے لئے اقبال نے کہا ہے:

وہی سجدہ ہے لائق احترام ⁂ کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

حضور قلب بڑی بات ہے، کاش ہم نماز حضور ذہن کے ساتھ پڑھنے لگیں تو ہمارے اخلاق و اطوار خود بخود سنور جائیں۔ نماز میں جو کچھ پڑھتے ہیں اس کا مفہوم ذہن نشین ہونا چاہیے۔ ذہن تک بات پہنچے دیجیے، تان بالآخر دل پر ٹوٹے گی۔ فی الحال ہم نہ عبادت کا حق ادا کر رہے ہیں نہ عباد کا۔ خلق خدا کی خدمت اور معاملات میں راست روی کو ہم نے ثانوی حیثیت دے رکھی ہے۔

خلق خدا کی خدمت کا جہاں تک تعلق ہے۔ یہ روایت ہمارے یہاں متروک ہو چکی ہے۔ بہت کم تنظیمیں ہمارے یہاں ایسی ہیں اور بہت کم افراد، جو سماج کی خدمت کے لئے میدان میں آئے ہیں۔ سوشل ورکر نام کی کوئی چیز ہمارے یہاں نہیں ہے۔ کیونکہ معاشرہ کی خدمت اور اصلاح کے جذبے نے ہمارے دامن دل کو چھوا تک نہیں۔ یہ کام محنت، بے نفسی، جانفشانی، پامردی اور استقامت کا طالب ہے اور ہم صرف وقفوں کے ساتھ چونکتے ہیں۔ ہمارا مزاج "صحافی" وضع کا بن گیا ہے یعنی شہرت اور سنسنی والا مزاج۔ ملک کی اکثریت سے اپنا موازنہ کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ ان کے یہاں سنجیدگی، خاموشی اور محنت سے خلق کی خدمت کرنے والوں کا ہجوم ہے ——— ہمارے یہاں وہ معدوم ہیں۔ محنت اور خدمت کے بجائے یہاں سیاست کا چٹخارہ لگا ہوا ہے، چھوٹی اور ارزاں سیاست جو تبادلہ اور پرمٹ سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ جو ارباب اقتدار کے ٹکڑوں پر گزر کرتی ہے۔ ہماری قیادت ٹکاؤ نہیں بکاؤ ہے۔ اپنے آپ کو بازار میں لئے پھرتی ہے کہ جنس کاسد کی جو قیمت لگ جائے غنیمت ہے۔

ہمارے مقامی رہنما ارباب اقتدار کا طواف کرتے رہتے ہیں اور انکی نگاہِ لطف کا انتظار۔ ملک گیر قیادت درکنار اب صوبے کی سطح کے رہبر بھی ہمیں میسّر نہیں۔ مستثنیات ہر جگہ ہوتی ہیں اور کلیہ کو بنانے میں ان سے مدد ملتی ہے۔ بہرحال بہ حیثیت مجموعی ہماری رہنمائی حاضر باشوں اور خوشہ چینوں اور ہنگامہ خیزوں کے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں احساس نہیں کہ کسی ملّت یا جماعت کی تعمیر اور ترقی سیاست سے نہیں ہوتی، تعلیم، تربیت اور محنت سے ہوتی ہے۔ طاقت، امداد باہمی سے آتی ہے۔ ہمارا یہ حال ہے کہ ہم نے صلۂ رحمی کو بے دردی کے ساتھ ترک کر دیا ہے۔ تعلیم اور تربیت کے سلسلے میں اپنے عزیزوں کی مدد کرنا ہمیں گراں گزرتا ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مقابلہ کیجئے تو مسلمانوں کی یہ خامی اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ اُن کے یہاں مشترک خاندان کا تصور ابھی تک باہمی امداد اور مناسب پرداخت کا ضامن ہے۔ ہمارے یہاں سب کچھ انانیت کی طغیانی اور نفسی نفسی کے سیلاب میں بہہ گیا۔ ہمارے یہاں جو افراد ترقی کرتے ہیں ان سے نہ رہبری ملتی ہے، نہ مدد۔

افلاس نے ملّت کو دو نیم کر دیا ہے۔ ہم لوگ دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک وہ طبقہ جس نے دینی تعلیم پائی ہے، اور دوسرا وہ گروہ جس نے عام تعلیم انگریزی اسکولوں میں پائی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک وسیع کھائی ہے۔ گویا دونوں الگ الگ دنیاؤں میں رہتے ہیں، ایک کو دوسرے سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کھائی کو پاٹنا ہوگا۔ یہ کام بہت دشوار اور زہرہ گداز ہے۔ ایسا نہ ہوا تو ملّت کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔ دینی تعلیم کے ساتھ جدید تعلیم کا اہتمام کرنا ہوگا اور ان طلبہ کو جو عام اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں جز وقتی طور پر دین کی تعلیم دینا ہوگی۔ یہ نہ ہوا تو ایک دنیا کا نہ رہے گا اور دوسرا دین کا۔

ہم نے مندرجہ بالا سطور میں ان برائیوں، کمزوریوں اور بیماریوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو ہندوستانی مسلمانوں خصوصًا شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے زوال اور پستی کے لئے ذمہ دار ہیں۔ 'تہذیب الاخلاق' کے مضامین شرح و بسط کے ساتھ ان کمزوریوں اور دوسری خرابیوں کا ذکر کریں گے اور ان کو دور کرنے کی عملی تجاویز سامنے رکھیں گے۔ حالات اور اُن سے زیادہ ہماری کم ہمتی میں 'تہذیب الاخلاق' کہاں تک دراڑ ڈال سکے گا یا نہیں، کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن اس رسالہ کا اجراء اور احیا اسی امید کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ ہم ان حضرات سے اپیل کرتے ہیں بلا لحاظ مذہب و ملّت جنھوں نے مسلمانوں کے مسائل پر غور کیا ہے جو ان کی اخلاقی فکر مندی کی اصلاح کی اس مہم میں ہمارا ہاتھ بٹائیں، ہمارا حوصلہ بڑھائیں۔ جیسے جیسے وقت گزرے گا تجربہ اور وسائل کے تحت ہم اس رسالہ کی وضع میں ترمیم اور اس کی افادیت میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ ممکن ہے کہ اسے آگے چل کر ایک سے زیادہ زبانوں میں شائع کیا جائے۔ بہرکیف 'تہذیب الاخلاق' کا مستقبل اور منفعت قارئین کرام کے تعاون اور مدد پر منحصر ہوگی۔

دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان مقاصد میں کامیاب کرے اور یہ رسالہ اصلاح اور ترقی کی ایک لہر اور ملک گیر مہم کا ترجمان بن جائے۔ — آمین

(عہد جدید کا پہلا شمارہ : یکم فروری ۱۹۸۲ء) ●●

ہماری جذباتیت

ہندوستانی مسلمان سوچ بچار اور غور و فکر کے بجائے جذبات کی رو میں بہتے ہیں۔ جذبات کے طوفان کو روکنے کے لئے انسان کو خدا نے دو چیزیں دی ہیں۔ ایک عقل اور دوسرا ضمیر۔ یہ نہ ہوں تو انسان جانور سے بدتر ہو جائے۔ عقل انسان کو بُرے بھلے، نفع نقصان میں فرق کرنا سکھاتی ہے۔ جس وقت عقل نفس کی شہ پاکر اس کام کو انجام دینا بند کر دیتی ہے جب وہ لالچ اور ہوس کی غلام ہو جاتی ہے، جب وہ عداوت اور غصّہ سے دھندلا جاتی ہے، تو وہ انسان کو دھوکا دینے لگتی ہے۔ اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا ثابت کر دکھاتی ہے، تاکہ دل کی آرزو پوری ہو جائے، تاکہ ہوس کی پیاس بجھ جائے گویا پاسبان رہزن بن جاتا ہے اور رہبر فریب دینے لگتا ہے۔ ایسے آڑے وقت میں ضمیر آگے بڑھتا ہے، عقل کو گمراہی سے بچاتا ہے، زمام اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ شاعر نے کہا تھا:

اب کوئی کس پہ اعتبار کرے ❖ عقل ہے آرزو کی حلقہ بگوش

ایسے نازک لمحہ میں انسان صرف ضمیر پر اعتبار کر سکتا ہے۔ ضمیر ہی اس کی عقل کو اور خود اس کو تباہی سے بچاتا ہے۔ دل کی آواز اسے بھٹکنے سے روکتی ہے۔ اس کے سامنے ہوس کا چراغ نہیں جلتا۔ فریب خوردہ عقل کی منطق نہیں چلتی۔ ضمیر کا فیصلہ سخت ہوتا ہے، اس کا فیصلہ تلخ ہوتا ہے۔ اس کی بات ماننے تو کڑوے گھونٹ پینا پڑتے ہیں۔ بہت سی آرزوؤں اور امنگوں سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔ اس لبریز جام سے بیتاب ہاتھ کھینچنا پڑتا ہے جو آپ کی دسترس میں ہے، آپ کے قبضہ میں، اب آیا، اب آیا۔ ضمیر کی بات ماننے کے لئے بڑا دل گردہ درکار ہوتا ہے۔ تمناؤں کی طغیانی، ہوس کا سیلاب، طمع کی شدت، طیش کی سرکشی، انتقام کی آگ کو یکلخت پیچھے کی طرف ڈھکیلنا ہوتا ہے۔ ان پر آنکس لگانا پڑتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے چابک سوار سرکش اور منھ زور گھوڑے کو رام کرتا ہے، یا سرکس کا ماہر درندوں کو زیر نگیں کرتا ہے۔ دراصل وہ چیز جو انسان کو حیوان سے جدا کرتی ہے بولنے کی طاقت یا نطق سے بھی زیادہ بُرے بھلے کو پرکھنے اور بُری خواہشوں اور میلانوں کو روکنے اور قابو میں رکھنے کی طاقت ہے۔

عام خیال ہے کہ وہ چیز جو انسان کو حیوان مطلق سے جدا کرتی ہے، بولنے کی طاقت یا نطق ہے۔

لیکن ہم یہ کہیں گے کہ وہ طاقت عقل ہے، وہ طاقت ضمیر ہے۔ عقل اس وقت جبکہ وہ ہوس کے تابع فرمان نہ ہو، [illegible] برے اور مفر و مفید میں امتیاز کر سکتی ہے۔ عقل کی حدیں جب وہ جذبات کے گہرے سے اوپر نکل جاتی ہے، جب وہ آرزو کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے، جب استدلال اس کی گرد راہ بن جاتا ہے، اس وقت عقل کی حدیں ضمیر سے مل جاتی ہیں اس وقت اسی کو ضمیر کا نام دیا جاتا ہے اور جب عقل ہوس کی غلام ہوتی ہے اور کینہ، عداوت، نفرت کی آلۂ کار، تو اسے چالاکی اور مکاری کہتے ہیں۔ اس وقت فریب اس کا شیوہ ہوتا ہے۔ وہ راہ نہیں دکھاتی، گمراہ کرتی ہے اسے عقل سفلی بھی کہہ سکتے ہیں۔ غرض کہ عقل جب ضمیر سے ملتی ہے، تو وہ عقل علوی بن جاتی ہے اور جب جذبات کے ساتھ شیر و شکر ہوتی ہے، تو عقل سفلی۔ یہ عقل سفلی ہے جو برے کاموں کے لئے طرح طرح کی تاویلیں کرتی پھرتی ہے۔ یہ ضمیر کو خاموش کرنے کی ترکیبیں ہیں۔ لیکن ضمیر اس بیج کی طرح ہے جو برف پوش زمین میں مہینوں دبا رہنے کے بعد انکر کے پر و بال نکالتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں انکر موسم بہار میں نکلتے ہیں، ضمیر میں انکر موسم خزاں میں یعنی جب جوانی، دولت اور جاہ و اقتدار کا نشہ اترنے لگتا ہے۔ قویٰ میں اضمحلال آجاتا ہے اور انجام کی فکر دامن گیر ہوتی ہے تو وہ برائیاں، وہ بداعمالیاں وہ ناانصافیاں جنھیں عمل نے بھلا کر کے دکھایا تھا، کھٹکنے لگتی ہیں۔ ایک آن چین نہیں آتا۔ اس دن سے ڈرنا چاہیئے۔ وہ دن جب نہ تلافی مقدور ہوتی ہے نہ ازالہ۔ وہ دن ہم سب کو دیکھنا ہے۔ جس کسی نے اپنی عنان جذبات کے ہاتھ میں دیدی تھی۔ اس دن اس کو ایک لمحہ چین نصیب نہیں آتا۔ جو کوئی عقل اور ضمیر سے جذبات کا عنان گیر ہوا تھا، اس کا یہ دن بلکہ سب دن آسان اور بے خلش گزرتے ہیں۔ وہ زندگی کا سفر سر اٹھا کر، سینہ تان کر بے نیازانہ طے کرتا ہے۔ اس کی خاطر ہمیشہ شگفتہ رہتی ہے۔ انسان کے بہت سے میلانات اسے بدی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ہوس اسے چین لینے نہیں دیتی ہے۔ ہمسایہ کے چمن کے پھول کو دیکھ کر اسے آرزو ہوتی ہے کہ اسے چرا کر اپنی دستار میں سجالے۔ اس سے ساری برائیاں شروع ہوتی ہیں۔ انھیں چاہے زر، زن، زمین کی طلب کا نام دیجئے، جس کو حاصل کرنے کے لئے جھوٹ، فریب اور ظلم روا رکھا جاتا ہے، چاہے انھیں حسد اور جلن کہیئے۔ برے میلانات اور تیز و تند جذبات انسان سے وہ کچھ کرا لیتے ہیں، جنھیں اگر وہ غور و فکر کرتا تو ہرگز گوارا نہ کرتا، جو اس کی اخلاقی گراوٹ اور پشیمانی کا سبب بن جاتے ہیں۔

انسان خود ہی اس چراغ کی طرح ہے جو ہوا کی زد میں ہو۔ ایک طرف اسے تند و تیز میلانات کا، دوسری طرف تحت الشعور کے جلاگھی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان پر قابو پانا بڑی مردانگی کا کام ہے۔ ان سرکش میلانات

کو دیکھتے ہوئے جذبات سے کک پہنچانا کہاں کی دانشمندی ہے۔ تعزیری زبان میں اسے اقدام خودکشی کہیں گے جہاں بریک لگانا ہو، وہاں پر ایکسلریٹر پر پاؤں رکھ دینا مہلک حادثہ کو دعوت دینا ہے۔ آگ لگ گئی ہو تو اسے بجھانے کے بجائے چھو دینا نری موورکھتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ افراد کے لئے جذبات آمادگی کتنی ضرر رساں ہے۔ اس سے زیادہ نقصان دہ جماعتوں کے لئے ثابت ہوتی ہے۔ ایک فرد جو جذبات کے سیلاب میں بہہ رہا ہو کبھی کبھی سنبھل بھی جاتا ہے۔ لیکن ایک جماعت جسے جذبات کی باڑھ بہالے گئی ہو، نہ سنبھل سکتی ہے نہ چٹان کی طرح قدم گاڑ سکتی ہے۔ جماعت کا ہر فرد دریں پھلنس کر ایک دوسرے کو دھکیلتا ہے اور اس سے وہ تُندروی وہ مومینٹم پیدا ہوتا ہے جو کسی گرفت کسی روک کو قبول نہیں کرتا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا ہے اس کی بھنسری اٹھتی جاتی ہے، جسے میانہ روی ایک آنکھ نہیں بھاتی، وہ صلاحت روی سے بیگانہ رہتا ہے۔

جذبات پرست لوگ ریاضت سے جی چراتے ہیں۔ کوئی بات جم کر نہیں کر سکتے۔ جلد اوقات اور مفادومت سے گریز کرتے ہیں۔ پڑا مارنا اور پسینہ بہانا ان کے بس کی بات نہیں اور دونوں کے بغیر کوئی بڑا کام نہیں ہو سکتا کوئی عمارت بغیر اینٹ پر اینٹ رکھے کھڑی نہیں کی جاسکتی۔ یہ عمل تدریجی، صبر آزما اور دیر طلب ہے پہلے ضروریات کا تعین ہوگا پھر خاکہ بنے گا، پھر نیو کھدے گی، پھر مسالہ سے ایک ردّے پر دوسرا ردّا جا کر دیوار کھڑی کی جائے گی، اس پر پلاسٹر ہوگا۔ یہ سب عقل کی قلمرو ہے۔ یہ سب عقل کے بغیر ناممکن ہے۔ عقل آگے کے لئے سوچتی ہے اور اس کے لئے تیاری کرتی ہے۔

اب جذبات کی سُنئے۔ وہ یا تو بنیاد ہی کو بہالے جائیں گے یا سرے سے نیو کھدنے ہی نہ دیں گے، پھر عمارت کا کیا ذکر۔ اور یہی راز ہندی مسلمانوں کی پسماندگی کا ہے۔ انھوں نے جذبات کی خاطر عقل سے دست کشی اختیار کرلی۔ مسئلہ چھوٹا ہو یا بڑا، ہمارا ردّعمل جذباتی ہوگا۔ ہم عقل کو موقع ہی نہ دیں گے کہ اونچ نیچ دیکھ سکے، راستہ دکھا سکے۔ جذبات کی دلدل میں لوٹنا ہم نے ایک یہی کام سیکھا ہے۔ عقل سے کنارا کشی کرنا ہی ہمارا شیوہ ہے۔ یہ سودا ہمیں بہت مہنگا پڑ رہا ہے۔ اس سے آسان کوئی طریقہ نہیں کہ جذبات جدھر بہالے جائیں بہتے چلے جائیں۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جذبات شرِ محض ہیں۔ سوال ان کو قابو میں رکھنے کا ہے۔ ان کو بھٹکنے سے بچانے کا ہے، انھیں بے اعتدالی سے روکنے کا ہے۔ اس کے لئے عقل بھی درکار ہے، ضمیر بھی۔ کوئی شخص آپ کے درپئے آزار ہوتا ہے سیدھا سادہ آسان ردّعمل یہ ہے کہ عداوت کا جواب عداوت سے، جراحت کا جواب جراحت سے

دیا جائے۔ آپ کو اُس نے نقصان پہنچایا ہے اس کا بدلہ لیا جائے۔ آپ بھی اس کی گھات میں رہیئے۔ موقع ملے، تو بھرپور وار کیجیے۔ اس سے جذبات کی تشفی ہو جائے گی۔ لیکن نفرت، عداوت اور خون ریزی کا سلسلہ بڑھتا چلا جائے گا اور آپ محض دیکھا دیکھی، محض غضب کی حالت میں وہی بُرائی کر بیٹھیں گے جو آپ کے ساتھ کی گئی۔ دشمن کو اس سے بڑھ کر داد کیا دی جا سکتی ہے کہ اس کے کام کی اس کے طرزِ عمل کی تقلید کی جائے۔ لیکن عقل ساتھ دے جائے، ضمیر یاور ہو، بصیرت راستہ دکھائے، تو ایک دوسرا ردِّ عمل بھی ممکن ہے۔ یعنی عداوت کا جواب رافت، دشمنی کا جواب دوستی، نفرت کا جواب ہمدردی سے دینا۔ یہ کام دشوار ہے لیکن کام کرنے کا یہی ہے۔ اس روش کی وجہ سے تہذیب کو ترقی ہوئی، انسانیت کو فروغ ہوا۔ غور کیجیے، تہذیب دراصل جذبات کی عنان گیری اور ان کے ارتفاع کا نام ہے۔ ہم ادنیٰ کو اعلیٰ، سفلی کو علوی بنا سکتے ہیں۔ اگر اسے انسانی فطرت کی ضد نہ سمجھا جائے تو ہم کہیں گے کہ بنیادی طور پر بحیثیت حیوان کے ہمارے میلانات، ہمارے محرکات، ہوس، طمع، انانیت، جور اور استیلا سے عبارت ہیں۔ عقل اور ضمیر انھیں بھٹی میں پگھلا کر بے غرضی، بے نفسی، رحم اور ایثار میں بدل دیتے ہیں۔ یہ تجربہ کہ انسان کو اس کی فطری حالت پر چھوڑ دیا جائے، مضحکہ خیز ہے۔ ایسا کر کے دیکھیے، وہ ایک دوسرے کو پھاڑ کھائے گا۔ تہذیب کی نگہبانی کے باوجود اب بھی جب اسے موقع ملتا ہے، وہ پاسبان کو مغلوب کر کے باہمی قطع و برید کے بھیانک مشغلہ سے دل بہلاتا ہے۔ تہذیب کی راہ توازن اور اعتدال کی راہ ہے۔ یونانیوں کے اس نظریہ میں عملی صداقت ہے کہ خوبی وسط میں ہوتی ہے اور اس میں زیادتی اور کمی افراط و تفریط اس کے دائیں بائیں بُرائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً شجاعت یعنی بہادری خوبی ہے۔ شجاعت کی کمی ہو تو جُبن یا بزدلی میں بدل جاتی ہے، بُرائی بن جاتی ہے۔ اس شجاعت میں زیادتی ہو، شجاعت اعتدال سے تجاوز کر جائے تو اُسے تہوّر کہتے ہیں یعنی وہ بہادری جس میں بے ضرورت، خطر طلبی اور جارحیت شامل ہو۔

جذبات اور میلانات کے اشارے پر چلنے والے کبھی جم کر محنت نہیں کر سکتے۔ وہ عقل اور ضمیر کی رہبری کے علاوہ ریاضت اور استقامت سے بھی محروم رہتے ہیں اور بغیر ریاضت اور استقامت کے کوئی فرد آگے نہیں بڑھ سکتا، کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ یہ بات اس زمانہ میں اور صادق آتی ہے جبکہ ہمارا سابقہ زہرہ گداز مقابلہ سے ہے۔

یہ سچ ہے کہ جذباتیت کسی قوم یا گروہ کو متحد بھی کر دیتی ہے۔ مگر یہ اتحاد چند روزہ ہوتا ہے۔ چڑھی ہوئی ندی کے اُترنے میں دیر نہیں لگتی۔ باڑھ پیچھے ہٹتی ہے تو دُور تک کشتِ امید کی بربادی کا سماں دکھائی دیتا ہے۔

تند و تیز شعلے بجھتے ہیں تو اپنے پیچھے راکھ کا ڈھیر چھوڑ جاتے ہیں۔ ہر طرف خاک اڑنے لگتی ہے۔ یہی نہیں مزاج پر جذباتیت کا غلبہ ہو تو ہر فرد وقتی جذبے کے تحت مختلف سمت میں چلے گا۔ قدم ملا کر چلنا، اشتراکِ عمل، تعمیر کے لیے تعاون مشکل ہو جائے گا۔ اسی کو افراتفری کا عالم کہتے ہیں، یہی نفسی نفسی کا سماں ہے، یہی جذباتیت کی دین ہے، یہی اقوال و ملل کے زوال کا پیش خیمہ ہے۔

ہم جوشِ اسانی کے طلسم میں گرفتار ہیں۔ موقع پاتے ہی اپنی عنان جذبات کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ جذبات کے ساتھ جہاد کرنا، میلانات پر ٹیکس لگانا، خواہشوں کو ضابطہ کی قدر میں لانا، استخواں گداز تمناؤں کو ٹھنڈا کرنا، نفسِ امّارہ کو مارنا، یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور ہمارا مزاج یہ بن گیا ہے کہ ہر اس کام سے جو آسان نہیں ہے جی چراتے ہیں۔ عقل عنان کھینچتی ہے، ضمیر سخت گیری کرتا ہے، دونوں جی کا جنجال بن جاتے ہیں، ان کو ہم نہیں پھٹکنے دیں گے۔ ہمیں یکسوئی کوئی کھلتی ہے، ہمیں فراغت کوئی ناگوار ہے، ہمیں آسان روی سے کوئی بیر ہے کہ عقل اور ضمیر کو پاس آنے دیں۔ ہمارے لیے جذبات کافی ہیں۔ اُن کی رو میں بہنا کسے بُرا لگتا ہے، بے سدھ ہو کر لہروں میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔

اپنوں میں جہاں کہیں نفاق دیکھیے گا، اور یہ کہاں نہیں ہے، اس کا سرچشمہ مجروح انا اور زود مشتعل جذباتیت میں پائیے گا۔ تحریکوں اور اداروں کو دیکھیے جہاں وہ کامیاب اور خوش حال ہوئے حسد اور ہوس کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ادارہ اور تحریکوں کا مستقبل خاکستر ہو گیا۔ خانہ جنگی اور دھینگا مشتی کی نذر آبرو بھی ہو گئی اور عافیت بھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں زر کا ظرف نہیں، زر ہمیں راس نہیں آتا۔ یہ بھی ایک عنوان بے تعبیر ہے اور "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ" کی جب تک شان امارت میں اس کا سماں رہا، ہم زندہ رہے۔ اب امارت ہم کو راس نہیں آتی کہ اس میں فقر کا شائبہ باقی نہیں۔ اس کی عبرت ناک مثال اس دولت میں ملے گی جو شرقِ اوسط کو پٹرولیم سے حاصل ہوئی ہے اور پٹرو ڈالر کہلاتی ہے۔

لیکن اس دَور میں وسائل کے بغیر کام ہی نہیں چلتا۔ ضرورت صرف اس بات

کی ہے کہ ہم مسائل کے غلام نہ بنیں، ان کے امام بنیں، جذبات ہم پر مستولی نہ ہوں، ہمیں جذبات پر استیلا حاصل ہو۔ خدا ہمیں جذباتی مزاج سے نجات دے۔

آیئے ہم ارزاں جذباتیت کے خلاف علم جہاد بلند کریں، تن آسانی اور خود فراموشی اور بے خودی سے دامن بچائیں؛ جانکاہی، جاں فشانی، عرق ریزی سے عقل کو جلا بخشیں؛ صلاحیتوں کو چمکائیں۔ ہمیں ضرورت ہے بصیرت بدوش عقل کی اور ایسے ضمیر کی جو کائنات کو محیط ہو۔

ہمیں چاہیے کہ اپنے بچوں کو ایسی تربیت دیں کہ ان کا ردّ عمل جذباتی ہونے کے بجائے عقلی، ان کی گفتگو پُر جوش ہونے کے بجائے مدلّل ہو۔ وہ سادہ دلی سے ہر بات کو باور کرنے کی جگہ تحقیق کے خوگر ہو جائیں۔ ہر بات، ہر افواہ، ہر دعوے کو پہلے عقل کی کسوٹی پر پرکھیں، پھر اس پر یقین کریں۔

●●

زبان کا چٹخارہ

زبان کے چٹخارے نے ہمیں دو طرح سے گھائل کیا۔ ہماری زبان کترنی کی طرح چلتی رہتی ہے، جو کوئی اس کی زد میں آجائے اُسے کاٹتی ہوئی ہم گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ یہی ہمارا محبوب مشغلہ ہے۔ گھنٹوں باتیں ہوں گی تو مجروح کون ہوگا۔ پہلے تو خود وقت عزیز جس کا کوئی بدل نہیں۔ اس کے بعد حقیقت جس کا اس طرح کی بات چیت سے خون ہوتا ہے اور آخر کار خود وہ لوگ جو گفتگو کا موضوع بنے ہوں اُسے جہالت یا تن آسانی کا ثمرہ کہیے کہ ہماری گفتگو، مسائل پر کم ہوتی ہے، افراد پر زیادہ۔ مسائل پر گفتگو کے لیے غور و فکر اور مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ افراد کے تذکرے کو اس قسم کی ریاضت درکار نہیں ہوتی۔ عیب جوئی، نکتہ چینی اور مذمت کے لیے کسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ یاوہ گوئی، ہرزہ سرائی، الزام تراشی اور طنز و استہزا ہم سے بداہتہً سرزد ہوتے ہیں اور ہماری محفل کو گرماتے ہیں۔ زبان کو بہتان اور اتہام، دشنام طرازی اور داستان سرائی کی چاٹ لگ جاتی ہے جو چھڑائے نہیں چھوٹتی۔ اس کا انجام، تلخی، عداوت، جراحت اور کدورت ہوتا ہے۔ ہدف کی طرف سے جوابی وار کیا جاتا ہے اور ستم کا اخلاق سوز سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر زبان کے کہنے پر نہ چلتے۔ اگر زبان کو قابو میں رکھتے، اگر اس کا استعمال گاہ بگاہ نہ کرتے۔ اگر زبان کو احتیاط، اختصار اور سلامت روی کا عادی بنا لیتے تو نہ کسی کو ایذا پہنچتی، نہ کوئی تلملاتا، نہ پھوٹ پڑتی اور نہ بے سبب عداوت کے دروازے کھلتے۔ زبان جیسی چھوٹی سی چیز کتنے فتنوں کو جنم دے سکتی ہے۔ زبان کے ذریعہ نفاق کے صدہا باب کھلتے ہیں، وہ بے سبب حرکت میں آئی اور انتشار کے چشمے پھوٹے!

زبان کے غلط استعمال کا ناتا فرصت اور بیکاری کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ جو لوگ کاموں میں مصروف رہتے ہیں اُن کے پاس اس کا وقت کہاں کہ دوسروں کی ٹوہ میں رہیں، ان پر نکتہ چینی کریں اور اُن پر تہمت دھریں۔ جو لوگ اپنے فرائض کو ایمانداری کے ساتھ انجام دیتے ہیں، جو فرائض کا حق ادا کرتے ہیں، اُن کے ذہن اور زبان کے دامن لغویات اور خرافات سے لامحالہ بچے رہتے ہیں۔ جو لوگ زیادہ بولتے ہیں انھیں بیشتر مواد جھوٹ سے ملتا ہے۔ سچ ایک سیدھی لکیر کی طرح ہے۔ جھوٹ کی راہیں بے شمار ہیں۔ حقیقت عناں بستہ، دروغ عناں گسستہ ہے۔ زیادہ بولنے والے تنگنائے حقیقت میں محدود نہیں رہ سکتے، اس میں ان کا دم گھٹتا ہے۔ سچی بات کو سیدھے سادے

انداز سے کہد یجئے تو کون کان دھرے گا۔ ہاں چٹپٹی بات کہئے جس میں دروغ کا مسالہ، استہزا کا نمک مرچ اور مبالغہ کی چاشنی ہو تو سب لوگ کام چھوڑ کر سننے لگ جائیں گے۔ اس عادت میں معاشرے کی خرابی اور فطرت کی کجی دونوں کو دخل ہے۔ بہرکیف جو شخص بُرائی کی طلب کی تشفی کرتا ہے وہ بُرائی کو فروغ اور بُرائی کے ذوق کو بڑھاوا دیتا ہے۔

سننے والوں پر اس کی براہ راست ذمّہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ غیبت، اتہام اور استہزاء پر کان نہ دھریں تو ایسا کرنے والوں کے حوصلے پست ہو جائیں اور وہ بتدریج بادل ناخواستہ سچائی، سنجیدگی اور احتیاط کی راہ پر واپس آجائیں۔ ہمارا یہ عالم ہے کہ ہر بات کو جس میں کسی کی بُرائی ہو، شوق سے اور مزے لے لے کر سُنتے ہیں اور بیدریغ سامعہ اور دل کو آلودہ کرتے ہیں۔ غلاظتوں کو غذا بنانا کتنی بڑی نادانی ہے۔ کوئی ایسا کرتے ہوئے نظر آئے تو ہم کراہت سے منہ پھیر لیں۔ لیکن بُری بات ہم کس رغبت اور چاؤ کے ساتھ سنتے ہیں اس غلاظت کو ہم کیونکر برداشت کرتے ہیں اور نہ منفعل ہوتے ہیں اور نہ بدخطاء لوگوں کو بدزبانی، درازنفسی اور دریدہ دہنی سے روکنے کا طریقہ یہی ہے کہ ایسی باتیں کُن کر بھی چیں بہ جبیں اور ایسی صحبتوں سے کنارہ کش ہوں۔ ورنہ کچھ عرصہ کے بعد ہمارا ذوق سماعت اس قدر مسخ ہو جائے گا کہ پاکیزہ، سنجیدہ اور سیدھی سچی بات سننے کو ہم تیار نہ ہوں گے۔ ہمارے کان اور ہمارا ذہن چٹپٹی اور صحت سوز غذا طلب کرے گا۔ "ھل من مزید" کی صدا بلند ہو گی۔ یعنی دروغ اور مزید دروغ، مبالغہ اور شدید مبالغہ، کینہ اور متواتر کینہ، غبار اور گھنگور غبار۔ بُرائی سننا بند کیجئے، بُری باتیں کرنے والوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ اس نوع کی شکوہ سنجی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا "ہمارا سماج اس قدر بگڑ گیا ہے، اس کا ذوق اتنا مسخ ہو گیا ہے کہ اچھی باتیں کام کی باتیں سننے کے لئے کوئی تیار نہیں، مزاج غیبت کے لذّت آشنا اور خوگر ہو گئے ہیں" سماج کی اصلاح ہم نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔ ہم سب اپنی اصلاح شروع کریں، معاشرہ خود سنبھل جائے گا، سُدھر جائیگا۔

'مردے از غیب' کا ذکر اور اس کے آنے کی امید ایک حیلہ ہے جو کاہلی اور تن آسانی تراشتی ہے۔ جس محفل میں بھونڈی مذمت، بے حس عیب جوئی اور بے درد نکتہ چینی کا دور دورہ دیکھئے، وہاں سے اُٹھ جائیے۔ اور اگر اس خاموش احتجاج کی ہمت نہیں ہے تو گفتگو کا رخ بدل دیجیے۔ بدگو بزدل ہوتا ہے، ورنہ پیٹھ پیچھے بُرائی کیوں کرتا۔ اشارہ نہ سمجھے تو فہمائش کیجئے۔ جس طرح رشوت دینا اور رشوت لینا دونوں جرم ہیں اسی طرح تہمتوں اور نکتہ چینیوں پر کان دھرنا اور تہمت لگانا اور نکتہ چینی کرنا دونوں گناہ ہیں۔ بعض لوگ تہمت

اس لئے لگاتے ہیں کہ وہ کسی کے در پئے آزار ہوتے ہیں۔ اُن کے سامنے ایک ہولناک مقصد ہوتا ہے۔ ہمارا روئے سخن اس وقت اُن لوگوں کی طرف نہیں ہے۔ یہاں ذکر اُن لوگوں کا ہے جو بغیر کسی عناد کے صرف زبان کے چٹخارے کے لئے غیبت اور بہتان سے دل بہلاتے ہیں۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ زبان کا گھاؤ کتنا گہرا ہوتا ہے، اور شہرتیں کتنی آسانی سے مسمار ہو سکتی ہیں اور پھوٹ کتنی جلدی ڈالی جا سکتی ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہے۔ ہمارے مسلم معاشرے نے اس عادت کو خصوصاً بڑھاوا دیا ہے۔ بیکاری، ناعاقبت اندیشی اور غیر ذمہ داری کے سایہ میں یہ بُری عادت پروان چڑھی ہے۔ اس کو فروغ ہماری جذباتیت سے ملا ہے۔ عقل عناں کھینچتی ہے، اعتدال اور میانہ روی کی تلقین کرتی ہے۔ اس کے برعکس جذباتیت غلو کی طرف لے جاتی ہے۔ جذباتیت ہمیں آمادہ کرتی ہے کہ اس شخص یا ادارہ کی بابت جس سے ہم بدظن ہیں، ہر مبالغہ آمیز بُرائی بغیر پرکھے باور کر لی جائے، اور اس اتہام کو دوسروں تک بڑھا چڑھا کر پہنچا دیا جائے۔ مبالغہ جھوٹ کا ہراول دستہ ہے اگر یہ سامنے آگیا تو جھوٹ بھی زیادہ پیچھے نہ رہے گا۔

زبان کے چٹخارہ میں ایک خرابی اور ہے۔ اس کے زیر اثر ہم قول کے سحر میں اس طرح گرفتار ہو جاتے ہیں کہ اسے فعل کا بدل سمجھنے لگتے ہیں۔ بات کرنے کی عادت بڑھتی ہے تو کام کرنے کی عادت گھٹتی چلی جاتی ہے۔ ایسا شخص بہت سی باتیں روانی کے ساتھ کہہ جاتا ہے۔ باتوں کے دوران مضمرات کا جائزہ لئے بغیر وعدے کر لیتا ہے۔ اسے یاد بھی نہیں رہتا کس وقت میں نے کس سے کیا بات کہی تھی، کیا وعدہ کیا تھا۔ بات کی لاج نہیں رکھی جاتی۔ وعدہ وفا نہیں ہوتا تو انسان نظروں سے گر جاتا ہے۔ اس کی شخصیت میں وزن نہیں رہتا۔ کم کہو اور اس پر جم کر رہو، بجائے اس کے کہ زیادہ کہو اور کم کرو۔ آخر الذکر سے ساکھ ختم ہو جاتی ہے، شخصیت میں کچھ باقی نہیں رہتا۔ زیادہ بولنے والا ہمیشہ ٹوٹے میں رہتا ہے۔ لوگ اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اس میں کارکردگی، ایفائے عہد اور تکمیل منصوبہ کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ اُس کے ظاہر اور باطن کے درمیان طویل فاصلہ حائل ہو جاتا ہے۔ اب کیا دیر ہے، شخصیت دونیم ہو کر رہے گی۔

غور کیجئے، زبان کے چٹخارہ کی خاطر ہم دوسروں کو جراحت پہنچاتے ہیں، اُن کی دل شکنی کرتے ہیں، اپنوں اور بیگانوں میں پھوٹ ڈالتے ہیں، اپنی اجتماعی طاقت کو زک دیتے ہیں، اور خود اپنی شخصیت کے خلوص، توانائی اور سالمیت کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔ خدا ہمیں زبان کے چٹخارے سے بچائے۔

انسان کو حیوان سے جدا کرنے کے لئے اسے حیوان ناطق کہتے ہیں، یعنی وہ جانور جو گویائی رکھتا ہو۔

نطق کے شانہ بشانہ عقل اور استدلال کا تصور بھی ہے۔ بجرت کا مقام ہے کہ انسان جس کا مابہ الامتیاز نطق ہے اس کا غلط استعمال کرکے حیوانوں سے بدتر ہو جاتا ہے۔ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ۔ گویا دو دھاری تلوار ہے۔ اس سے ظلم و جہل، نفاق اور شر کا ازالہ بھی ہو سکتا ہے اور اُن میں اضافہ بھی۔ زبان کے چٹخارہ سے البتہ فساد کا اندیشہ زیادہ ہے اصلاح کی امید کم۔

یہی زبان کا چٹخارہ تھا، جس نے ایک عرصے تک اردو نظم و نثر کو گمراہ کیا۔ ہماری توجہ معانی و مفاہیم سے زیادہ الفاظ و عبارت پر جانے لگی۔ الفاظ کے شکوہ، عبارت آرائی، رعایت لفظی، تکلف اور تصنع کے طلسم میں اردو ادب گرفتار ہو گیا۔ نتیجہ ظاہر ہے، معنویت کا خون ہوا۔ یہی نہیں ادب کے متوازن ارتقا اور اس کی سالمیت کو ٹھیس پہنچی۔ شکر ہے کہ اس دور سے ہم نکل چکے ہیں۔ حتیٰ کہ مشاعروں میں بھی الفاظ کے دروبست سے زیادہ شعر کے معنوی جمال کو ستائش کا خراج ملنے لگا ہے۔ الفاظ نے جس طرح ہمارے ادب میں باطنی اوصاف کو پس پشت ڈالا، اسی طرح ہماری شخصیتوں میں گفتار نے کردار کی جگہ لے لی۔

زبان کے چٹخارے کا دوسرا پہلو کم مضرت رساں ثابت نہیں ہوا، یعنی ایسی غذا کا استعمال جس میں مرچ مسالا اور روغن کی افراط ہو۔ ایسے کھانوں سے آنتوں، آنکھوں اور عام صحت کو نقصان پہنچتا ہے۔ مرغن کھانے دل کے لئے سخت مضر ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں جب کہ جسمانی ورزش کا رواج اور مواقع کم ہوتے جاتے ہیں، یہ کھانے ہلاکت کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگر اتفاقاً سنگین امراض سے بچے بھی رہے تو یہ نقصان کیا کم ہے کہ جسم سست پڑ جائے اور ذہن دھندلا جائے اور قوت عمل گھٹنا جائے اور ہوس کو مہمیز لگے اور ان سب پر مستزاد وہ بیتا جوان لذائذ کی تیاری میں خواہ وہ مرچ مسالے والے سالن ہوں، خواہ مرغن حلوے، ہماری خواتین پر پڑتی ہے۔ وہ وقت جو وہ بچوں کی تربیت پر صرف کرتیں مردوں کے کام و دہن کی تشفی کی نذر ہو جاتا ہے۔ خود ان کے ارتقا اور ذوق کی ترقی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری نصف آبادی طباخی پر مامور ہے۔ بچوں کی تربیت کے لئے وقت، یکسوئی اور تعلیم و صلاحیت درکار ہیں۔ یہ سب زبان کے چٹخارے کی نذر ہو جاتے ہیں۔ مسلمان بچے ذہنی طور پر ہندوستان کے دوسرے بچوں سے کم نہیں لیکن تعلیمی اعتبار سے وہ اُن سب سے بہت پیچھے ہیں۔ وجہ ظاہر ہے اُن کی مائیں نہ اپنی تعلیم کو اور نہ اُن کی تربیت کو وقت دے سکتی ہیں اور اس زمانہ میں جب کہ طلباء کی تعداد اور اُن سے اساتذہ کی بے تعلقی بڑھ گئی ہے امید یہ کی جاتی ہے کہ بچے زیادہ کام گھر پر ماں باپ کی نگرانی میں اور ان کی مدد سے کریں گے۔ ہمارے یہاں باپ روایتی طور پر بچوں کی تعلیم سے بے نیاز ہے۔ ماں تعلیم دینا چاہتی ہے، بچے کے ہوم ورک میں اس کی مدد کرنا چاہتی

ہے گویا تو اس کے پاس وقت نہیں یا علم نہیں۔ اگر ہمارے مرد سادہ کھانے پر قناعت کرتے تو عورتیں خود بھی پڑھ سکتیں
اور بچوں کو بھی پڑھا سکتیں۔ پھر اُن بچوں کو ہوم ورک نہ کرنے کی وجہ سے آئے دن کلاس میں خفت نہ ہوتی۔ خجالت سے
حوصلہ مجروح ہوتا ہے اور حوصلہ مجروح ہوا تو دوسری صلاحیتوں پر بھی ضرب لگتی ہے۔ آج کل ضابطہ کی پڑھائی سے
بھی زیادہ اہم وہ پڑھائی ہے جو انسان اپنے گھر فرصت کے اوقات میں کرتا ہے۔ گویا پڑھنے اور سیکھنے اور خود کو
ترقی اور جلا دینے کے سلسلہ کو عمر بھر جاری رکھ سکتے ہیں۔ لیکن ہماری عورتیں جو مردوں کی لذتِ کام و دہن کی ستائی
ہوئی ہیں، اس کا تصور کبھی نہیں کر سکتیں۔ ان کا بیشتر وقت باورچی خانہ میں گزر جاتا ہے۔ چولھا جلانے، مسالہ پیسنے،
آٹا گوندھنے، برتن مانجھنے اور کھانا پکانے میں ان کا سارا وقت چلا جاتا ہے۔ کھانے کے ذائقے میں ذرا سی کسر رہ گئی تو
شوہر نے گھر سر پر اٹھا لیا۔ ہماری عورتیں جنھیں اسلام نے مردوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا، کنیزوں اور مزدوروں کی
طرح سے خدمت اور محنت پر مامور ہیں۔ انھیں وہ لمحات ملتے ہی نہیں جنھیں وہ اپنا کہہ سکیں جن سے وہ سکون حاصل کر
سکیں اور جنھیں وہ اپنے ارتقا کے لئے صرف کر سکیں۔ چھوٹے سے تنگ مکان اور دھوئیں سے بھرے ہوئے باورچی خانہ
میں گھٹ گھٹ کر عمر گزارنے کا اثر ظاہر ہے کہ صحت پر کس قدر ناخوشگوار پڑتا ہوگا۔ ان کا سارا وقت اس
غذا کی تیاری میں گزر جاتا ہے جو اثرات کے لحاظ سے زہر اور افیون کا آمیزہ ہے۔ اس افیون کا اثر فوراً ظاہر
ہوتا ہے اس زہر کا دیر سے۔ چٹورا پن اسراف کی طرف لے جاتا ہے۔ آمدنی سے زیادہ خرچہ کی ترغیب دیتا ہے۔
ہمارے یہاں مقابلہ ہوتا ہے۔ کسی نے کسی کی دعوت کی، کسی نے سادگی برتی، تو اس کی شامت آگئی وہ
نکو بن جاتا ہے۔ کنجوس مکھی چوس حتّٰی کہ منحوس کہلاتا ہے۔ ہمارے یہاں کفایت شعاری سے بڑا کوئی عیب اور
عاقبت اندیشی سے زیادہ کمیاب کوئی وصف نہیں۔ یہ مزاج یہ افتادِ طبع زبان کے چٹخارہ کی دین ہے۔ سادگی
زبان سے شروع کیجئے۔ بتدریج طبیعت میں سرایت کر جائے گی۔ بڑائی سادگی میں ہے، تکلف میں نہیں۔
بڑائی خواہشات پر قابو پانے میں ہے، ان سے زیر ہو جانے میں نہیں۔ بڑائی کفایت شعاری میں ہے۔ نام و نمود
کے لئے فضول خرچی میں نہیں۔ اسراف نے ہمیں اقتصادی طور پر کھوکھلا کر دیا ہے۔ لیکن ہم ابھی تک اسی
کے گن گائے جاتے ہیں۔ کیونکہ ہم زبان کے مارے ہوئے ہیں۔ چٹخارے نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔

ہماری غذا کے مضر اثرات سے قطع نظر اس کا منفی نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم اس سادہ متوازن
اور صحت بخش غذا سے محروم رہ جاتے ہیں جو جسم اور دماغ کے لئے ضروری ہے۔

کھانے میں تھوڑی سی اصلاح کر لیجئے۔ زبان کے چٹخارے سے منہ موڑ لیجے۔ زندہ رہنے

کے لئے کھائیے ، کھانے کے لئے زندہ نہ رہیئے۔ جلد ہی آپ ایک خوشگوار انقلاب کے روبرو ہوں گے۔ یہ نظام آپ کی صحت اور توانائی، چستی اور چابکدستی، آپ کی عورتوں کی صحت، یکسوئی، علمی اور ذہنی پیش رفت اور آپ کے بچوں کی نشوونما اور تعلیم و تربیت اور ترقی کا ایک حد تک ضامن ہو جائے گا۔

خدارا زبان کے چٹخارے سے بچیے، خواہ اس کا تعلق نُطق سے ہو، خواہ ذائقہ سے۔ لفاظی اور چٹور پن دونوں نے ہمیں شدید نقصان پہنچایا ہے۔

••

سامری پھر کوئی سرگرم فسوں ہے شاید

سعدیؒ نے کہا تھا کہ: "خوش بخت آں کہ خورد و کشت و بدبخت آنکہ مرد و ہشت"۔ جو کھاتا رہا اور بو کر گیا وہ خوش نصیب (جو جمع کرتا رہا اور) چھوڑ کر مرا وہ بدنصیب۔ یعنی زر کا مصرف یہ ہے کہ انسان اپنی ضرورتوں کو پورا کرے اور حاجت مندوں کی مدد کرے۔ جس نے ایسا نہیں کیا اور دولت جمع کرنے میں لگا رہا، وہ زر کا غلام بن گیا۔ اس کی حالت یونانی کردار "ٹین ٹے لس" کی سی ہے، جو پانی میں گھرا ہونے کے باوجود پیاس بجھانے سے محروم رہا۔ ایسے شخص کے لئے روپیہ مقصد بن جاتا ہے، وہ روپیہ جو درا صل صرف ایک وسیلہ ہے ضروریات پورا کرنے کے لئے۔ روپیہ اس پر حکومت کرنے لگتا ہے۔ وہ روپیہ کے اشاروں پر چلتا ہے۔ جس کسی میں عزتِ نفس ہوگی وہ روپے کی غلامی کیوں کرنے لگا۔ لیکن ہم آئے دن یہ تماشا دیکھ رہے ہیں کہ اچھے بھلے، شائستہ مہذب، لوگ دیوانہ وار زر کا تعاقب، زر کا طواف، زر کی پرستش کرتے رہتے ہیں۔ اس تعاقب، طواف اور پرستش میں وہ عزتِ نفس گنوا بیٹھتے ہیں، انسانیت سے ہاتھ دھو لیتے ہیں، قدروں سے منھ موڑ لیتے ہیں۔ اب تک سُنا تھا کہ موجودات میں جمادات سے بڑھ کر نباتات، نباتات سے افضل حیوانات اور حیوانات میں سب سے اعلیٰ انسان ہے۔ اب یہ ترتیب بدل گئی ہے۔ انسان جمادات کے زیر نگیں ہوگیا ہے اور وہ سونے چاندی کے سامنے سربسجود ہے۔

موجودہ تہذیب کی سرحدیں بربریت سے ملنے لگی ہیں اور انسان اُن قدروں اور عادات و اطوار کو چھوڑ رہا ہے جو اُسے تہذیب کے جلوس میں ملے تھے اور اُن خصائل اور اطوار کی بازیابی کے لئے کوشاں ہے، جو آغازِ داستان اور ابتدائے آفرینش میں اس کے حلیف تھے۔ لباس اب اس کے تن پر راس نہیں آتا اور وہ اسے مختصر کرنے اور بالآخر اُتار پھینکنے کی فکر میں ہے۔ اس لباس میں حیا کا جامہ اور ادب کی قبا بھی شامل ہے۔ ضمیر نے تہذیب کی مدد سے ہوا و ہوس میں جو پابندیاں لگا دی تھیں وہ ایک ایک کر کے رخصت ہوتی جارہی ہیں۔ یعنی تہذیب کا قافلہ جہاں سے چلا تھا، پورا چکر لگا کر وہیں واپس ہو رہا ہے۔ ارتقائی انحطاط جب ساری انسانیت پر محیط ہے تو اس بات پر حیرت کیوں کہ انسان خود کو جمادات سے فروتر سمجھنے لگا ہے،

نقرہ و زر کی پرستش کرنے لگا ہے گویا ارتقا کی انتہا پستی کی ابتدا ہو گئی۔ چکر پیدا ہو گیا۔ لیکن شاعر کا ردِ عمل سماج کا پابند نہیں، نہ اس کی آنکھیں ملمع سے خیرہ، نہ اس کی زبان مصلحت کی اسیر۔ چنانچہ زر کی یہ ریل پیل۔ یہ گہما گہمی، یہ اقتدار دیکھ کر وہ چلا اٹھتا ہے:

سامری پھر کوئی سرگرم فسوں ہے شاید　　　سب کا معبود ہوا جاتا ہے زر کا بچھڑا؟

بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰؑ نے توحید کا درس دیا تھا۔ ان کی عارضی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر جادوگر سامری نے سونے کا ایک بچھڑا بنایا اور بنی اسرائیل کو اس کی پوجا میں لگا دیا۔ واپسی پر حضرت موسیٰؑ نے اپنے غیظ و غضب کا اظہار کرنے کے بعد اس طلسم کو توڑا۔ ایک بذلہ سنج کا قول ہے کہ زر کی محبت جو سامری کے فسوں نے ان کے دلوں میں پھونک دی تھی، بنی اسرائیل سے زیادہ دن جدا نہ رہ سکی۔ لیکن تاریخ کچھ اور بھی کہہ رہی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ عرب کے ریگ زار، وہاں کے بے آب و گیاہ علاقہ، وہاں کی وادی غیر ذی زرع میں چھٹی صدی عیسوی میں ایک ہادیٔ برحق آیا۔ جس نے ساتویں صدی کے آغاز میں دنیا کی کایا پلٹ دی۔ جس نے مادیت کے اصنام کو توڑ ڈالا جس نے روح کی بالا دستی کو ایک عالم سے منوا لیا۔ جس نے فقر پر فخر کیا اور جس نے زر کی ساکھ چشم زدن میں گرا دی۔ جس نے علم اور اخلاق، اخوت اور مساوات، تفکر اور تدبر، حریت اور توحید کا پرچم بلند کیا:

سماں "الفقر فخری" کا رہا شانِ امارت میں　　　"بہ آب و رنگ و خال و خد چہ حاجت روئے زیبا را"

حیرت اور عبرت کا مقام ہے کہ اس ہادیٔ برحق کی امت اس کی تعلیمات کو بھول گئی اور اس نے بنی اسرائیل کی طرح سامری کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کر دیا۔ زبان پر خدا کا نام اور افکار و اقوال پر سامری کی مُہر۔ جسے دیکھیے وہ دینی، دنیاوی اور منصبی فرائض کو چھوڑ کر زر کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہا ہے، غافل اس سے کہ اس حرکت میں ارتفاع نہیں ابتذال ہے، ترقی نہیں زوال ہے۔ زر کسی معبود کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ "مشترک نامیہ" لے کر اس کے حضور میں نہیں جا سکتے۔ زر جہاں ایک دروازہ سے داخل ہوا، سادگی، معصومیت، پاکیزگی، خدا کا خوف، رسولؐ کی محبت، انسان کی دوستی، دردمندی، حریت، اخوت، مساوات، غرض کہ ساری صالح قدریں، دوسرے دروازے سے نکل گئیں۔ زر جماد سے ہے۔ اس کی محبت دل کو پتھر کر دیتی ہے۔ جو لوگ پہلو میں پتھر چھپائے پھرتے ہیں، وہ انسان نام کو نہیں۔

روحانی اور مادّی طاقت میں جو فرق ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آج سے تقریباً تیرہ سو سال پہلے جزیرہ نمائے عرب میں اللہ کا آخری رسولؐ پیدا ہوا اور اس نے ساری دنیا کو راستی اور انصاف، علم اور

انسانیت کی روشنی سے منور کر دیا۔ عرب جہاں گئے، رحمت، علم اور عدالت، اخلاق اور شرافت کے پیامبر بن کر گئے۔
انسانیت ہنوز ان کی رہین منت ہے۔ اس واقعہ کو تیرہ سو سال گزرنے کے بعد جزیرہ نمائے عرب اور دوسرے
عرب ممالک میں سب سے بڑی مادی دولت کا انکشاف ہوا۔ جس کی نہ کوئی حد ہے نہ حساب۔ زرِ سیال نے عرب
کو ارب پتی بنا دیا۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک عربوں کے دست نگر بن گئے۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا، دنیا کو کیا ملا۔ خود عربوں
کو کیا حاصل ہوا۔ عربوں کو بے مصرف دولت ملی۔ دنیا کو وقتی تشویش، نتیجہ صفر۔ عرب جب روحانی طاقت لے کر
اٹھے، دنیا پر چھا گئے۔ انسانیت کو سنوار گئے۔ مادی طاقت ہاتھ میں آئی تو ایک چھوٹے سے ملک سے نبرد آزما
اور عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ زر کے لیے ہاتھ خالی کرنا تھا، میراث کو ہاتھ سے گرا دیا۔ عجم کو زرِ سیال ہاتھ آیا تو
بہا لے گیا۔ منصفانہ تقسیم نہ ہو تو زر، سمِ قاتل بن جاتا ہے۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، ہمارا روئے سخن تو ہندوستانی مسلمانوں کی طرف ہے۔ یہاں رونا اس
کا نہیں کہ کثرتِ زر نے اخلاق کو گرا دیا ہے۔ یہاں شکایت اس بات کی ہے کہ زر کی کمی اور اس کی ہوس نے
اقدار کو مسمار کر دیا ہے۔ صہبا کی طرح زر بھی ظرف کا طالب ہے۔ نا اہلوں کے پاس جہاں پہنچا جوتی میں دال بٹی۔
کسی ایک فرد کی جھولی بھر گئی تو وہ جامہ میں نہیں سمایا۔ آنکھوں پر پردے اور عقل پر پتھر پڑ گئے۔ شرافت کام
آگئی، انسانیت رخصت ہو گئی۔ مثل ہے کہ اللہ چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ کم ظرفوں کو مل جائے تو چھپر کے ساتھ کلیجہ
بھی پھٹ جاتا ہے، کردار شق ہو جاتا ہے۔ ہمارے سامنے دو عبرت ناک مثالیں موجود ہیں؛

ان سطور کو زر کی ہجو نہ سمجھا جائے۔ موجودہ زمانہ میں جب عالم کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور وسائل کی بدولت
ملک باہم اس قدر قریب آگئے ہیں کہ تخلیہ میں خلل پڑتا ہے، جب انسان کے انسان پر انحصار کا سلسلہ عالمگیر ہو گیا
ہے، جب زر کے بغیر داد و ستد ممکن نہیں، ایسی صورت میں زر سے مفر کی تلاش بے سود ہو گی۔ زور، زر سے فرار
پر نہیں، زر کے صحیح استعمال پر دینا چاہیے۔ اسلام کی تعلیم، جہاں رہبانیت کا گزر نہیں، اس باب میں بالکل واضح
ہے۔ چنانچہ سعدیؒ نے خوردن کے ساتھ کشتن، کھانے کے ساتھ بونے پر زور دیا ہے۔ یعنی سمندر میں رہو لیکن
پشت پانی سے اوپر رہے۔ کنارے پر کھڑے ہو کر دامن بچانے والے بزدل ہوتے ہیں۔ محنت کرو، کماؤ، خود کھاؤ اور
حاجتمندوں کی مدد کرو کہ یہی آخرت کی کھیتی ہے جب تک کہ حقداروں اور حاجتمندوں کی مدد کرتے رہو گے زر کی چربی نہ ذہن پر چڑھنے پائے گی نہ آنکھوں
پر۔ زر تمہارا خادم رہے گا، آقا نہ بن پائے گا۔ جہاں پتھر آقا بن گیا، تم آزاد انسان نہ رہو گے۔ غلاموں اور
چوپایوں سے بدتر ہو جاؤ گے ــــــ زر کو صنم بنایا ہے تو کھل کر پتھر کی پرستش کیوں نہیں کر لیتے۔ اسلام کا الزام تو نہ آئے

نفسِ ضمیر کے ساتھ، مادیت روحانیت کے ساتھ، ازل سے ستیزہ کار رہے ہیں۔ لیکن مادیت کو جیسا فروغ بیسویں صدی میں حاصل ہوا ہے، پہلے کبھی نہ ہوا تھا اور یہ سب کچھ صنعتی اور تکنیکی انقلاب اور زر کے نظامِ تبادلہ کے ذریعہ ہوا ہے۔ دنیا کی مختلف بستیوں میں جب فاصلہ تھا تو طاعون کی طرح اخلاقی فساد بھی محدود ہو کر رہ جاتا تھا صحت مند جز اثر متاثر نہ ہوتے۔ لیکن اب جسمانی بیماریاں ہوں یا روحانی اور اخلاقی وبائیں، ملکوں کی سرحدوں کا احترام نہیں کرتیں۔ ہر وبا، ہر بُرائی جہانگیر ہو جاتی ہے۔

زر کے ذریعہ ایک خرابی اور آئی۔ جب تک زر کا چلن اور بین الاقوامی کرنسی اور تبادلۂ زر کا نظام وجود میں نہ آیا تھا، ہوس پیشہ اور استیلا آمادہ اور جویائے اقتدار انسان اُن اشیا کو تصرف میں لا کر مطمئن ہو جاتے تھے جن سے اُن کی انفرادی ضروریات اور ہوس کی تشفی ہوتی۔ زر نے کاغذ کے جن پرزوں اور بینکوں کے جن کھاتوں کو جنم دیا ہے انھوں نے انسان کی ہوسِ زر کو بیکراں اور اس کو دوسرے انسانوں کے لیے بے حس اور بے درد بنا دیا ہے۔ زر کی طاقت افراد و اقوام کو ایک طرف گھمنڈ اور دوسری طرف استحصال کی جانب لیجاتی ہے۔ پہلے زراندوزی کی حدبندی چوری اور ڈکیتی کے خوف سے بھی ہوتی تھی۔ بینکوں نے یہ خوف بھی دور کر دیا۔

بہرکیف ہمیں یہ مان کر چلنا ہوگا کہ روپیہ ضروری اور ناگزیر ہے۔ ہمیں آغازِ سفر میں ہی یہ طے کر لینا ہوگا کہ روپیہ کو اس کی اوقات سے نہ بڑھنے دیں، یعنی اُسے وسیلہ بنا کر رکھیں، مقصد نہ بننے دیں اور جب یہ طے کر لیا کہ زر صرف ایک ذریعہ ہے ضروریات کو پورا کرنے کا تو ہمیں یہ بھی مان لینا ہوگا کہ وہ صرف انفرادی اور نجی ضروریات کو پورا کرنے کا ذریعہ بن کر نہیں رہ سکتا۔ اس طرح تو نفسی نفسی کا دَور شروع ہو جائے گا اور تصادم، ہنگامے اور انتشار کی راہیں کھل جائیں گی۔ صَرفِ زر کو انفرادی ضروریات کے ساتھ اجتماعی مقاصد کو محفوظ رکھنا پڑے گا، ورنہ زر اور انسانیت میں ضد کا ناتا قائم ہو جائے گا۔ اگر وہ رہا تو یہ نہ رہے گی۔ اجتماعی ضروریات کا پاس رکھتے ہوئے حاجتمندوں کی انفرادی امداد کے علاوہ ان اداروں کی مدد یا ان کا قیام لازم ہے جن کا مقصد منظم ڈھنگ سے بنی نوعِ انسان کے دُکھ درد کو دُور کرنا، ان کی اصلاح، خوشی اور خوش حالی کے لیے تدابیر کرنا ہے۔ کارِ خیر گھر سے شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا اسلام کی رو سے انسان پر پہلی ذمّہ داری اقربا کی ہے، پھر یتیموں، مسافروں اور دوسرے حاجتمندوں کی۔ زر کی ہوس ساری ذمّہ داریوں کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔

دنیا میں کم اجتماع اتنے خطرناک ہوں گے جتنا زر کے ساتھ بیکاری یا زر کے ساتھ جہالت اور بیکاری کا جمع ہونا: ع "ہوئے یہ جمع جہاں، آگ لگ گئی گویا" گیاہِ خشک و شرر، زر کے ساتھ بیکاری

جو روپیہ بغیر محنت کے ہاتھ آئے وہ جائز ہی کب ہوا -

پھر وہ بیشمار برائیوں کو جنم دیتا ہے۔ قمار خانوں، قحبہ خانوں اور شراب خانوں کی آبادی اسی کے دم سے ہے۔ ہر چیز معاشرے کے لئے اتنی ہی مہلک ہے جیسے ذمہ داری کے بغیر اقتدار۔ اپنے ملک میں دورِ انحطاط کے دولتمندوں یا بعض ممالک کے نو دولتیوں پر نگاہ ڈالئے، یہ بات آئینہ ہو جائیگی۔ سُود کو حرام اسی لئے کیا گیا ہے۔

زر کے ساتھ جہالت یا بے خبری جمع ہونے کی مثال ہمارے اہلِ حرفہ ہیں جن میں سے ایک کثیر تعداد کو اب اپنی محنت کا معقول اجر ملنے لگا ہے۔ وہ روپیہ پس انداز کر سکتے ہیں، اپنے بچّوں کو اچھی تعلیم دے سکتے ہیں، اپنی صنعت کی تجدید کر سکتے ہیں، نئے ڈیزائن، نئے ساز و سامان، نئے بازار اُن کی دسترس میں ہیں۔ لیکن وہ ہاتھ نہیں بڑھاتے۔ بے خبری ایک نشہ کی طرح ہے جو آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ ہمارے حرفت کار جو پاتے ہیں اُڑا دیتے ہیں۔ اقبال نے کہا تھا:

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

ہمارے اہلِ حرفہ کے حُسن آفریں ہاتھ صورتِ سوال پھیلے ہوئے ہیں، مہاجنوں سے آس لگائے ہوئے۔ ان کی صنعت نہ معلوم کہاں سے کہاں پہنچ جائے اور اُن کے اور اُن کے بچّوں کے دن پھر جائیں اگر وہ جہالت کی نشیلی تیرگی کو چھوڑ کر علم و خبر کی بیدار کن روشنی میں آ جائیں۔

کسی شاعر نے زورِ بیان میں زر کو حلّالِ مشکلات بلکہ قاضی الحاجات تک بنا دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زر سے ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ چنانچہ بہت سی دوسری چیزوں کی طرح زر کی بُرائی یا بھلائی اُس کے محلِّ استعمال پر منحصر ہے۔ ہم اس کی خواہش کو حدود میں رکھیں، اس کے عناں گیر ہوں، اسے کارِ خیر، تحصیلِ علم اور تعمیر و اصلاح میں صرف کریں تو اس میں دین اور دنیا کی بھلائی ہے۔ اور اگر اسے پاکر نشہ میں بہک جائیں، بےحسی اور بیدردی اختیار کرلیں، جامہ سے باہر ہو جائیں تو اُس سے بُری کوئی شئے نہیں۔ یہیں افراد کا امتحان بھی ہوتا ہے اور جماعت کا بھی:

زر کو پرکھ لیے ہیں کسوٹی پہ اہلِ زر غافل کہ آدمی کی کسوٹی بھی زر میں ہے

اقبال مند قوموں کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ زر کا ناتا علم سے جوڑتی ہیں۔ ان کے برعکس ادبار آمادہ قومیں زر سے جہالت کی پرورش کرتی ہیں۔ زر کا ناتا علم سے جُڑتا ہے تو علم اور ٹکنولوجی کو فروغ ہوتا ہے اور یہ فروغ مزید زر کی تخلیق کرتا ہے۔ ایک سے دوسرے کو مدد اور ترقی ملتی ہے۔ تائیوان، جاپان، کوریا اور اسرائیل کی مثالیں سامنے ہیں۔ افسوس کہ امدادِ باہمی کے اس زر خیز اور علم آفریں سلسلہ سے ہم نے دامن کھینچ لیا ہے۔

زر کے خطرات کئی ہیں۔ ایک تو اخلاقی برائیاں، دوسرے تن آسانی، عیش کوشی، کمزوری جس کے سایہ میں انسان جفاکشی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس جفاکشی سے جو خدا کی بہت بڑی دین ہے، تیسرا خطرہ زیادہ مہیب ہے کہ وہ زرداروں اور بے زروں دونوں کو متاثر کرتا ہے یعنی قدریں بدل جاتی ہیں۔ معاشی روایات کھٹکنے لگتی ہیں۔ اچھی قدریں مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔ تجارتی ذہنیت دل ودماغ کے دریچوں کو بند کر دیتی ہے۔ محبت اور شفقت کی جگہ قساوت اور شقاوت لے لیتی ہیں اور انسان بہرا، گونگا اور اندھا ہو جاتا ہے، اور اخلاقی طور پر مفلس اور کنگال۔ خدا ہمیں اس افلاس سے بچائے جو زر نہ ہونے کا دوسرا نام ہے اور اس افلاس اور محرومی سے بھی جو زر کے سائے میں شروع ہوتا ہے۔

اَنَا وَلاَ غَیرِی

"ہوں تو میں ہوں، میرے سوائے کوئی نہیں" کسی جماعت میں اگر افراد یہ رُخ اختیار کرلیں، تو سمجھ لیجئے کہ اب اس کا شیرازہ بکھرنے میں کوئی دیر نہیں۔

دو باتیں ہیں جو کسی جماعت کو یکجا رکھتی ہیں۔ ایک تو مسلک، مقاصد، مفادات، روایات اور رادصاف کا اشتراک۔ ان کا احترام جماعت کے سب افراد کرتے ہیں اور ان کی خاطر وہ اپنے ذاتی مقصد اور مفاد کو ثانوی حیثیت دیتے اور بعض صورتوں میں قربان کرنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اگر افراد کے مقاصد باہم ٹکرائیں تو ہر فرد حریف کے نقطۂ نظر کو سمجھے اور اپنے مطالبات کو کم کرنے کے تیار ہوجائے۔

ہندوستانی مسلمان ان دونوں شرطوں میں سے کسی ایک کو بھی پورا نہیں کررہے ہیں۔ وہ اشخاص جو اپنے متعلق حسنِ ظن میں غلو کرتے ہیں وہ نہ افراد کے جذبات کا خیال رکھتے ہیں نہ جماعت کے مفاد کا۔ انانیت، نخوت اور گھمنڈ کے نشے میں چور ہوکر وہ مصالح اور انجام کار سے غافل ہوجاتے ہیں۔ زبان پر جو کچھ آیا، کہہ دیا، نوکِ قلم پہ جو کچھ آیا، لکھ دیا۔ دل میں جو کچھ آیا، کر ڈالا۔

انانیت کی صہبا کا اثر میخواروں پر بقدرِ ظرف ہوتا ہے۔ ایک طبقہ جو صلاحیتوں میں بالکل کورا ہے، بلائے لپکتا ہے۔ کم صلاحیت والوں کے لیے وہی ایک جرعہ کافی ہے۔ باصلاحیت افراد میں سے کچھ تو پھل دار درخت کی طرح انکسار اور تواضع میں جھکے جاتے ہیں اور کچھ رعونت کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں۔ انانیت کا نشہ جہالت کے ساتھ مل جائے تو دو آتشہ ہوجاتا ہے۔ علم انکسار کی طرف لے جاتا ہے۔

انسان کی فطرت ہے کہ جو شخص اپنی بڑائی کا اظہار (اپنے قول، فعل، طور طریقوں سے) کرے اس کی بڑائی تسلیم نہیں کرتے۔ مشک کی خوشبو عطار کے اعلان کی محتاج نہیں۔ جس نے ڈینگ لی وہی کھوکھلا سمجھا گیا:

؎ جو ظرف کہ خالی ہو، صدا دیتا ہے اکثر۔

انانیت کی کئی قسمیں ہیں خود پسندی، خود بینی، خود نمائی، خود ستائی، خود غرضی، خود پرستی۔ ان میں سے خود غرضی اور خود پسندی اسی وقت انانیت کے حدود میں آتی ہیں جب وہ اعتدال کا دامن

بچھوڑ دیتی ہیں۔

خودستائی اپنی تعریف کرنے کو کہتے ہیں، اسے ڈینگ اور شیخی کر کر بھی پکارا جاتا ہے۔ خودستائی سے سامعین حظ اندوز ہوتے ہیں۔ زیر لب مسکراتے ہیں لیکن جلد ہی لبوں کا تبسم غروب ہو جاتا ہے اور جبیں پر شکن طلوع۔ جو شخص اپنا تذکرہ اور اپنی تعریف کرتا ہے 'بور' کہلاتا ہے اور زیادہ دیر تک اس کو انگیز کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ سننے والوں کا پیمانۂ صبر چھلک جاتا ہے اور تعلق کا ظرف ٹوٹ جاتا ہے۔

انانیت کی مذکورہ قسموں میں سے خود پسندی بےضرر ہے، اگر وہ اظہار کے لئے بیتاب نہ ہو جائے۔ جہاں تک تلافیٔ مافات کے طور پر خود کو پسند کر کے دل کو خوش کرنے کی بات ہے، کسی کو اعتراض کیوں ہونے لگا۔ خودغرضی کو بھی دنیا چنداں قابل اعتراض نہیں سمجھتی بشرطیکہ وہ خدمت اور خلوص کا دعویٰ کرتی ہوئی نہ آئے۔ ایک شرط اور ہے خودغرضی کبھی کبھی کمینہ پن، بےدردی و محسن کشی کی شکل اختیار کر لیتی ہے ایسی صورت میں ان کا شمار بدترین برائیوں میں ہوتا ہے۔ انانیت سے خودغرضی کا تعلق صرف اتنا ہے کہ اس کے زیر اثر انسان کو خود سے اتنا شغف رہتا ہے کہ وہ دوسروں کو بالکل نظرانداز کر دیتا ہے۔

خودنمائی وہاں تک گوارا بلکہ دلفریب ہوتی ہے جہاں تک وہ نشوونما کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ انسان خودنمائی، خودافزائی کے لئے مجبور ہے۔ حسن اظہار کے لئے بےتاب رہتا ہے، خواہ وہ فطری حسن ہو، خواہ تخلیقی۔ فنون لطیفہ، تحقیق، اختراع، ایجاد، کشف و ریاضت، وہ خودنمائی جس کے سرے عمل تخلیق یا اظہار نشوونما کے حسن سے ملتے ہیں، حسین اور ہوش ربا ہوتی ہے۔ لیکن وہ خودنمائی جس کا مقصد دوسروں کو مرعوب کرنا ہے، نہ مرعوب کر پاتی ہے، نہ متاثر متنفر ضرور کر دیتی ہے۔ شعر و حکمت سے سرشار ہو کر جوش تخلیق میں فیضی چلا اٹھا تھا:-

امروز نہ شاعرم حکیم	دانندۂ حادث و قدیم
بانگ قلم درین شب تار	صد معنی خفتہ کرد بیدار

(آج میں شاعر نہیں، حکیم ہوں، قدیم اور حادث کا رمز آشنا۔ اس اندھیری رات میں میرے قلم کی آواز نے صدہا خوابیدہ معانی کو جگا دیا ہے)

یہی تخلیقی خودنمائی غالب کے یہاں اس طرح جلوہ گر ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں　　　غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

شاعر نے جوشِ تخلیق میں یہ محسوس کیا کہ اس کے دل و دماغ پر براہِ راست نزولِ انوار ہو رہا ہے۔

خود بینی اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ انسان خود ہی کو دیکھتا ہے اور اسی عمل سے حظ اندوز ہوتا ہے، اس کی نگاہ دوسروں کی طرف نہ جائے اور اسے دوسروں کے جذبات و احساسات کا خیال نہ رہے۔ خود بینی کے راستہ سے خود غرضی کی راہ بھی نکلتی ہے۔ غالب نے خود بینی کی توجیہ اس انداز سے کی تھی کہ اگر تم اپنی جبیں کا آئینہ میرے سامنے نہ کر دیتے تو میں خود بینی پر کیوں مجبور ہوتا۔

کہتے ہو کہ خود بیں و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں　　بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

خود بینی لطافت کے ساتھ ہو تو گلکاری کرتی ہے اور بھونڈے انداز سے تو دلآزاری۔ دلآزاری سے ہی انانیت کی حدیں قائم ہوتی ہیں۔ انا اپنا اظہار کسی طرح کرے، اس کا بے ضرر اور دلکش روپ وہ ہے جس میں دلآزاری کا شائبہ تک نہ ہو اور بھونڈا اور کریہہ اور کرخت روپ وہ، جس میں اہانت حقارت اور دل آزاری شامل ہوں۔ انا ایک طرف تخلیقی سرشاری اور فرطِ اعتماد کی خبر لاتی ہے تو دوسرے سرے پر چھچھورے پن، بے حسی، بے دردی، بے راہ روی، اکڑ، گھمنڈ اور اتراہٹ کی شکل اختیار کرتی ہے۔

گھمنڈ سے زیادہ مضحکہ خیز کوئی چیز نہیں۔ خود دنیا میں انسان کا وجود مکانی اعتبار سے ایک ذرّہ اور زمانی اعتبار سے ایک لمحے سے کم ہے۔ اور یہ ذرّہ ہر وقت حادث کی زد میں ہے اور لمحہ ایک بلبلہ کی طرح جو بنتے ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر خود یہ دنیا جس کی گولائی کو بھی ہم نہیں دیکھ سکتے، نظامِ شمسی میں ایک بہت چھوٹا سیارہ ہے جو ہمیشہ سورج کے طواف میں مشغول رہتا ہے اور اسی سے گرمی اور روشنی حاصل کرتا ہے۔ حیرت بالائے حیرت یہ کہ یہ طواف بھی سیدھے سادے انداز سے نہیں کرتا بلکہ ناچتے ہوئے، اپنی کیلی پر تھرکتے ہوئے۔ اور جیسا ہمارا نظامِ شمسی ہے، کائنات میں ایسے اربوں نظام ہیں۔ چنانچہ انگنت ستاروں کی روشنی باوجود تیزی رفتار کے ابھی تک دنیا میں نہیں پہنچی۔ غور کیجئے اگر کائنات کا نقشہ بنایا جائے تو دنیا اتنی چھوٹی اور حقیر ہے کہ اسے نقشہ پر دکھایا ہی نہیں جا سکتا۔ پھر دنیا میں پیدا ہونے والے ایک حقیر سے انسان کی کیا اوقات۔ وہ اگر اترائے، گھمنڈ کرے، لقا کبوتر کی طرح اکڑتا چلے اڑد کے آٹے کی طرح اینٹھا جائے تو کس کو ہنسی نہ آئے گی اور کون اس انسان کی قسمت کو نہ روئے گا۔

انانیت بعض اوقات جھوٹے انکسار کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ شکل بھی تقریباً اتنی ہی مکروہ ہے جیسے ملمع کاری یا ریاکاری، جو نفس پرستی کو خدمت اور ہوس کو خلوص کا نام دیتی ہے۔ اس نوع کے انکسار کا

افتخار مقلوب کیجئے۔ خود کو ہیچمداں کہیں گے اور توقع کریں گے کہ اس طرح دنیا انھیں فخر العلما سمجھے، خود کو عاصی پُر معاصی کہیں گے اور امید یہ کریں گے کہ دنیا زاہد پارسا سمجھے۔ جھوٹا انکسار ہر بُری چیز اور ہر بے جا تصنع کی طرح بُرا ہے۔ اس میں ایک بُرائی یہ بھی ہے کہ جھوٹے انکسار میں اپنی جھوٹی مذمت اس لیے کیجاتی ہے کہ مخاطب اخلاقاً اور مروتاً جھوٹی مدح سرائی کرے۔ گویا انکسار کے پردے میں جھوٹ کا پرچار کیا جا رہا ہے۔

انانیت کئی سرچشموں سے پھوٹتی ہے۔ کوئی مال پر افتخار کر رہا ہے، کوئی جمال پر۔ غافلؔ سعدی کی اس تنبیہ سے،

برمال و جمال خویشتن غرہ مشو　　کاں را بہ شبے برند و ایں را بہ تبے

اپنے مال اور حسن پر گھمنڈ نہ کرو، پہلا ایک رات میں لُٹ جاتا ہے۔ دوسرا بخار میں جاتا رہتا ہے۔ پرستارانِ حسن غرورِ حسن میں افزائشِ جمال کو دیکھ لیتے ہیں۔ غرور میں البتہ حسن کا کوئی شائبہ نہیں ملتا۔ جو چیز خلق سے نیچے نہیں اُترتی وہ علم کا غرور ہے اور اس سے بھی زیادہ پارسائی کا زعم۔ غور کیجئے غرور کرنے والوں نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ انھوں نے شکر کھویا اور جگ ہنسائی پائی۔ اور اگر انا کے اظہار میں دل دُکھا دیئے تو نفرت اور بد دعائیں لیں اور انتقام کا خوف بھی شاملِ حال ہو گیا۔ ستم ہے کہ جن خصائل اور خوبیوں اور نعمتوں پر شکر کرنا چاہیئے تھا ان باتوں پر ہم غرور کرتے ہیں۔ کفرانِ نعمت کا رشتہ بد اطواری سے جوڑتے ہیں، دلوں کو بلا وجہ توڑتے ہیں۔

یہاں تک تو انانیت کے انفرادی پہلوؤں کا ذکر تھا۔ اب ہم آغازِ داستاں کی طرف لوٹتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں نے انانیت کے ہاتھوں بہت نقصان اٹھائے ہیں۔ ہم میں ہر شخص کی انا اس قدر بڑھی بڑھی ہوئی ہے کہ اسے ذرا سی ٹھیس پہونچی اور وہ توازن کھو بیٹھا۔ انفرادی انا پر ہم اجتماعی مفاد کو قربان کر دیتے ہیں۔ اور ماتھے پر بل تک نہیں آتا۔ ہم افراد کے متعلق رائے معروضی اور غیر جانبدارانہ انداز سے قائم نہیں کرتے کوئی شخص خواہ کتنا ہی بُرا، اخلاق باختہ اور سماج دشمن کیوں نہ ہو اگر وہ اپنے برتاؤ سے ہماری انا کی تشفی کر سکتا ہے تو ہم اس کا اس کے مذموم مقاصد کے حصول میں ساتھ دیں گے۔ کوئی شخص کتنا ہی اچھا، پارسا اور انسان دوست ہو اور اس کے مقاصد کتنے ہی ارفع اور اعلیٰ ہوں اگر اس نے قصداً یا سہواً کبھی ہمیں نظر انداز کر دیا تو ہم اس کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جو کام وہ کر رہا ہے وہ ملک و ملت کے لیے بالواسطہ یا بلا واسطہ مفید اور ضروری ہے۔ اکثر اس غریب کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوگی کہ یہ تغافل، یہ عداوت، یہ مخالفت آخر کیوں؟

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اَنا دلوں کے درمیان حائل ہوتی ہے۔ شدّت اختیار کرے تو دلوں کو توڑتی ہے، عام ہوجائے تو شیرازہ کو بکھیر دیتی ہے۔ جمعیت کو پراگندہ کر دیتی ہے۔ انکسار افراد کو قریب لاتا ہے۔ دلوں کو جوڑتا ہے۔ جماعت کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ تلخی کو خوش دلی اور طیش کو محبت میں بدل دیتا ہے۔

آیئے، ہم عہد کریں کہ اِن امور میں جو اجتماعی مفاد کے ہیں اپنی ذات کو بیچ میں نہ آنے دیں گے۔ مقاصد و اقدار کو پیشِ نظر رکھیں گے۔ افراد کی حیثیت ثانوی ہے اور اس سے بھی کم وزن ہے ان افراد کا میرے ساتھ تعلق یا برتاؤ۔ اَنا نے ہمیں کبھی مِل کر کام نہیں کرنے دیا۔ پیش رفت میں سدا ہماری اَنا سدّ راہ ہوئی۔ اُس نے ہمارے نقطۂ نگاہ کو مسخ کر دیا۔ اس کے فریب میں آکر ہم اقدار کو بھول گئے، حصولِ مقصد سے ہٹ گئے۔ اتحاد کو اس نے بے دخل کیا۔ نفاق کو تخت پر بٹھا دیا۔ ہمارے دلوں کو کلیوں کی طرح کِھلنا تھا، وہ انگاروں کی طرح دہکنے لگے۔ جو کام کرنے کے لئے اٹھے، ان کی راہ میں ہماری انا نے کانٹے بوئے اور خود ان کی اَنا نے انھیں کام سے دست کش کر دیا کہ وہ بُرائی الزام اور دشنام کی تاب نہ لاسکے۔ انھوں نے اس مقصد کو جو انھیں عزیز تھا اور جس میں دنیا اور آخرت کی فلاح تھی، اس لئے تج دیا کہ اُن کی اَنا نے انھیں گالی کھانے، بُرائی سُننے، رُسوائی سہنے کی اجازت نہیں دی۔ مسلمانوں میں سماجی خدمت کی روایت مفقود ہے اور یہ بڑی حد تک اُن کی تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی پسماندگی کا سبب ہے۔ روایت مفقود اس بنا پر ہوئی کہ جو مقصد لے کر کام کرنے اُٹھے، تنگ نظر اور اخلاق باختہ نکتہ چینیوں کی دشنام طرازیوں اور بہتان تراشیوں کی تاب نہ لاسکے۔ اَنا نے انھیں خدمتِ خلق اور مقصدِ زندگی سے محروم کر دیا۔

ہمارے افراد کی اَنا ہمارے مِلّی اتحاد اور ہماری پیش رفت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اچھا ہوتا جو اُسے راستے سے ہٹا دیتے، اقبالؔ نے کہا تھا:

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　　موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

ربطِ ملت کو پراگندہ کرنے والی اندھی انا ہماری نخوت، ہماری رعونت ہے۔ اس نے ہمیں دریا سے جدا کر دیا، ہماری طاقت کو پارہ پارہ کر دیا۔ انا کی بدولت موجوں نے دریا کا دامن چھوڑ دیا۔ جھاگ بن کر ہوا میں بکھر گئیں، وہ جھاگ جن میں نہ سمندر کا جلال ہے نہ موج کی طاقت اور اضطراب!

یہ انانیت اسی جذباتیت کی پروردہ ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ پہلے باب میں آچکا ہے۔ انانیت جہالت کے بطن سے پیدا ہوتی ہے اور عداوت، نفاق، نفسانیت اور انتقام کو جنم دیتی ہے۔ ایسے

دشمن سے حذر اولیٰ۔ ہمیں غرور کی تباہ کاریوں سے بچنا چاہیئے۔ جس جماعت میں افراد غرور میں مبتلا ہوں اس کو نفاق کی آگ جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ اتحاد کے لئے نسخۂ کیمیا انکسار ہے۔ بے نفسی انفرادی انکسار سے اجتماعی افتخار کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ جماعت کی کامیابی فرد کی بے نفسی پر مبنی ہے۔ انکسار جوڑتا ہے، غرور توڑتا ہے۔ انکسار فرد کو مقصد کے تابع کر دیتا ہے۔ انا مقصد کو فرد کے تابع کر دیتی ہے۔ ایک فرد نہیں ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں افراد کی خواہشات اور رجحانات کے تابع۔ جتنے افراد اتنی ہی راہیں۔ ایسی حالت میں حصول مقصد معلوم۔

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ وہ مسلمان جو سرکاری ملازمتوں یا تعلیمی اداروں سے سبکدوش ہوتے ہیں۔ ریٹائر ہوتے ہی خانہ نشین ہو جاتے ہیں۔ اپنی پگڑی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے انھیں یہ اندیشہ ستاتا ہے کہ گھر سے باہر نکلے تو کوئی پگڑی نہ اُچھال دے۔ گویا زندگی کا سارا سرمایہ پگڑی میں چھپا ہوا ہے۔ یہ پگڑی، یہ آن، یہ نام نہاد عزت، یہ جھوٹا رعب داب یہ سب انانیت کے دھندے ہیں۔ انانیت نہ ہے، تو یہ بھی نہ رہیں۔ اللہ کے بندے یہ نہیں سوچتے کہ ان کی ساری عمر مزدوری میں گزر گئی۔ مزدوری ملتی رہی، کام کرتے رہے۔ زرخرید غلامی ختم ہوئی تو کام کرنا بند کر دیا۔ گویا پیسے کے سوا اُن کے لیے کام کا کوئی محرک نہیں ہے۔ بغیر پیسہ کے لالچ کے کوئی کام کرتے تو یہ بات ثابت ہو جاتی کہ وہ زرخرید غلام نہیں ہیں۔ آزاد اور خود دار اور ذی حس انسان ہیں۔ جن کے دل میں انسانوں کا درد ہے اور جو زر کی طمع اور صلہ کی خواہش کے بغیر خدا کی راہ میں اس کی مخلوق کی خدمت کر سکتے ہیں۔ انھیں ایک موقع ملا غلامی کی زنجیریں توڑنے کا، مخلوق کی خدمت کرنے کا، اپنے بھائیوں کی لیماندگی دور کرنے کا۔ انھوں نے اس زریں موقع کو ہاتھ سے جانے دیا۔ محض اس لیے کہ ان کی اَنا نے یہ گوارا نہیں کیا کہ کوئی ان پر انگلی اٹھائے، نکتہ چینی کرے، کوئی انھیں بُرا بھلا کہے، کوئی انھیں گالیاں دے، کوئی ان کی نیت پر شبہ کرے۔ کیوں کہ ایسا ہوتا تو ان کی عزت چلی جاتی۔ وہ نہیں جانتے کہ عزت اور ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ فیصلہ قادر مطلق ہی کرتا ہے۔ کسی اچھے مقصد کے لیے بدنامی مول لینا، گالیاں کھانا، خطرات سے مقابلہ کرنا اور گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہونا، خطرات سے سراسیمہ نہ ہونا، مصائب و حوادث سے سینہ سپر ہونا، علاوت کے نرغے میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا مانگنا، نماز اور ثابت قدمی کے ساتھ کسی عبادت سے کم نہیں۔ حافظ شیراز کہتا تھا:

اے صاحب کرامت، شکرانۂ سلامت   روزے تفقدے کن درویش بے نوا را

یعنی سلامتی کا شکرانہ یہ ہے کہ بے نوا درویش پر مہربانی کی جائے۔ شکرانۂ سلامت یہ ہے کہ انسانوں کی بھلائی

کے لیے وقت اور پیسہ اور محنت صرف کریں۔ اجتماعی خیر انفرادی خیر سے بڑھ کر ہے۔ لہٰذا اصلاح، تعلیم، تربیت اور امداد کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔ پارسیوں، عیسائیوں اور سکھوں کو دیکھئے! پیش رفت اور اصلاح کے کام ہر طرف دیکھنے میں آتے ہیں اور یہی حال ہمارے اولو العزم ہندوستانیوں کا ہے لیکن ہمارے یہاں جہاں اس طرح کی تحریک شروع ہوئی وہیں پھوٹ پڑ گئی۔ افراد کی انانیت یہ گوارا نہیں کر پاتی کہ دوسرے افراد کو کارہائے خیر کے سلسلے میں کوئی نیک نامی حاصل ہو جائے۔ نکتہ چینی، حسد، الزام، بہتان کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی راز ہماری پسماندگی کا ہے۔ کاش اصلاحی مقاصد کے درمیان ہم اپنی ذات کو نہ لائیں اور خود کو مٹا کر مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ہماری پیش رفت کی راہ میں کوہِ گراں ہماری انانیت ہے۔

اپنی ذات کے متعلق ہمارے حسن کی مریضانہ ذکاوت نے ہمیں کسی کام کا نہیں رکھا۔ ہمارا ردِ عمل صحت مند نہیں رہا۔ ہم تدبّر اور تفکّر پر جذبات کے دھماکے کو ترجیح دیتے ہیں۔ پھر تعجب کیوں کہ ہمارے فیصلے صحیح نہیں ہوتے۔

انانیت اور عزتِ نفس کے درمیان بُعد المشرقین ہے۔ عزتِ نفس کا تقاضا ہے کہ ذاتی اغراض کے لیے کسی انسان کے سامنے سر نہ جھکاؤ؛ لیکن انسانی فلاح کے لیے خود کو جھکانا اور مٹانا بھی پڑے تو اس سے گریز نہ کرو۔ یہی فرق دراصل خود غرضی اور خودداری کے درمیان ہے۔

'انا' ایک فطری جذبہ ہے۔ ہمیں کوشش سے اس کو قابو میں رکھنا ہے، اس کو زیر کرنا ہے۔ اس کا ارتفاع کر کے اسی تخلیقی کاموں میں لگانا ہے۔ اسے عزتِ نفس کے منصب پر بٹھانا ہے۔ دوسری جانب خدمتِ خلق کے لیے اُسے زیر کرنا ہے، تاکہ انا اشتراکِ عمل کا راستہ نہ روک پائے۔

●●

خطبۂ افتتاحیہ

بہرائچ دینی تعلیمی کانفرنس

اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ اس دور میں جبکہ بالعموم انسان تجارت اور سیاست کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے کچھ بندگان خدا ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے دل کے دامن کو سیاست کی گرد اور تجارتی ذہنیت کے غبار سے محفوظ رکھا ہے۔ باری تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس عہد میں جبکہ ہندستانی مسلمان مایوسی، بے علمی، خود غرضی اور کجی کا شکار ہیں خود ان ہی میں سے کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس عزم جزم کے ساتھ کہ ان کو تباہی کے جبڑے سے نکال کر آبِ حیواں کی طرف لے جائیں گے۔ خالقِ کائنات کا بڑا کرم ہے کہ اس پُر آشوب زمانہ میں جبکہ مسلمان، جو خدا کا آخری پیغام ہیں، اپنے دین سے بے تعلق اور اس کی بنیادی تعلیم سے بے بہرہ ہو چلے تھے، کچھ نفوس نے جن کے دل درد کی دولت سے مالامال تھے۔ اس بات کا بیڑہ اٹھایا کہ مسلمانوں کو دین سے بے خبر نہ ہونے دیں گے، کیونکہ اگر دین نہ رہا تو پھر وہ کہاں رہے، وہ اللہ تعالیٰ کے اس پیغام کے امین ہیں جو انسان کے لئے ابد تک سرچشمۂ ہدایت بنا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کی ثنا کے بعد ہم ان حضرات کے سپاس گزار ہیں کہ انھوں نے گذشتہ ۲۲ سال میں انتہائی نیک نیتی، بے نفسی، خاموشی اور ایثار کے ساتھ مسلمانوں میں دینی تعلیم کو عام کرنے کا کام کیا۔ فی زمانہ انسان کے کام کرنے کے محرکات چار ہیں: زر، اعتراف، اشتہار، اقتدار۔ جن صاحب دلوں نے دینی تعلیم کی اشاعت میں حصہ لیا نہ انھیں زر کی خواہش ہے، نہ اعتراف کی جستجو، نہ شہرت کی طلب، نہ اقتدار کی ہوس۔ ان سب سے مستغنی ہو کر وہ صمیم قلب، اور نیت و نگاہ کی پاکیزگی کے ساتھ اپنے بھائیوں کو جہالت، بے دینی اور گمراہی سے بچانے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ رب العزت انھیں اس کا اجر عطا فرمائے، ان کی کوششوں کو کامیابی سے نوازے اور ان کے حوصلوں کو مضبوط اور بلند کرے۔ آمین!

میرا اشارہ صرف ان اکابر کی طرف نہیں جنھوں نے دینی تعلیمی کونسل کی تاسیس اور رہبری میں نمایاں حصہ لیا اور جن میں سے گزشتہ دو سال میں ہم جناب ظفر احمد صدیقی اور جناب قاضی عدیل عباسی کو کھو بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ میرا روئے سخن خصوصاً ان غیر معروف کارکنوں کی طرف ہے جو اس تحریک کے قالب میں دوران خون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے مشکلات کا ہجوم مہمیز کا کام کرتا ہے، حوادث جسے ایڑ لگاتے ہیں، نامساعد حالات سے جو خائف نہیں ہوتے، مایوسی اور شک جنھیں چھو نہیں سکتے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن کے لئے

اقبال نے کہا تھا،

گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا — بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

صدہا موانع و مشکلات کے باوجود دینی تعلیمی مہم کی کامیابی کا راز اس کے سربراہوں اور کارکنوں کے خلوص، یقین، شہرت نا طلبی میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست ' گھن لگا دینے والی اخلاص سوز سیاست ' اس میں داخل نہیں ہوئی۔ اس تحریک کو ہمیں سیاست سے ہر قیمت پر بچانا ہے۔ ہمارے بعض بڑے ادارے جس طرح سیاست اور انانیت اور ہوس کے ہاتھوں برباد ہوئے ان کی داستان بہت عبرتناک ہے جسے دہرانے کا یہ موقع نہیں۔ دینی تعلیم کی یہ تحریک ہزاروں بندگانِ خدا کے اخلاص، ایثار اور محنت سے پروان چڑھی ہے۔ آپ اس تحریک کو اسی نہج پر چلنے دیجے۔ اس تحریک کو چلتی ہوئی ہوا اور بہتے ہوئے پانی اور گرماتی اور اجالا کرتی ہوئی کرنوں کی طرح ہے، ادارتی حصار میں سمیٹ کر محدود نہ کیجے کہ عناصر کی طرح اخلاص و ایثار کو بھی حد بندی گوارا نہیں ہوتی۔ یہ تحریک ضرورت کے سوتوں اور ایمان کے سرچشموں سے پھوٹی ہے۔ اسے روایت اور سخت گیر انتظامی ڈھانچے اور مرکزی گرفت سے پابہ زنجیر نہ کیجے کیونکہ ایسی صورت میں بڑا خطرہ اس بات کا ہوتا ہے کہ کہیں سیاست نہ در آئے، خدمت کے جذبے اور فطری جوش و خروش کو گھن نہ لگ جائے ضابطہ کا آہن روح میں نہ اتر جائے، آمد اور آورد کا رنگ اختیار نہ کرلے تصنع کہیں حاوی نہ آجائے۔ علاوہ بریں فی زمانہ مسلمانانِ ہند میں یہ صلاحیت ڈھونڈے نہیں ملتی کہ کسی بڑی ملک گیر تحریک کو ایک مرکز سے چلا سکیں ان بکھرے دانوں کو ایک تسبیح میں پرونا اب کسی بشر کے بس کی بات نہیں۔ لیکن دانے جو بکھرے ہوئے ہیں جہاں ہیں وہیں تسبیح و تہلیل کے کام آئیں گے۔ ہر دانے سے ہزاروں دانے نکلیں گے اور یہی راہ اب ہمارے لئے کامیابی اور سرخروئی کی راہ ہے۔ اس طرح نہ صرف مذکورہ خطرات سے ہم بچے رہیں گے، بلکہ جا بجا مقامی خلوص کی نشو و نما ہوگی اور مقامی افادیت کو پہنچنے کا موقع ملے گا۔ کونسل کا کام رہبری، رہنمائی، نگہبانی اور حوصلہ افزائی ہوگا۔ اس کا رول یہ ہوگا کہ ہر کارِ خیر میں خود کو قریب رہے، ہر بیج میں زمین کا سینہ چیر کر انکر نکالنے کی جو طاقت ہوتی ہے اس کو بروئے کار لانے میں مدد دے اور بالیدگی کے لئے جو غذا درکار ہے اس کی فراہمی کا حسبِ مقدار انتظام کرے۔ اور ایک تربیت گاہ قائم کرکے مقامی کوششوں اور ان کی پیشرفت پر نظر رکھے اور زندگی اور نور کو اس پیغام کو پھیلانے میں مدد دے۔

بات کم عبرت ناک نہیں کہ سرسید احمد خاں، ان کے رفقا، اور متبعین کی کوششوں کے باوصف ہندوستانی مسلمان ہنوز تعلیمی طور پر پسماندہ ہیں۔ تعلیم کے اعتبار سے ان سے زیادہ پچھڑی ہوئی قوم اس ملک میں نہیں۔ ستم یہ ہے کہ وہ مسلمان جو کبھی علم و جستجو کے کاروان سالار تھے ترقی کی گردِ راہ بن کر رہ گئے ہیں۔ ہندوستان کی یہ دوسری بڑی اکثریت

ہندستانی قوموں میں سب سے پچھڑی اور سب سے زیادہ جاہل ہے حتیٰ کہ ہریجن بھائیوں میں علم کا ذوق اور ترقی کا حوصلہ اور آگے بڑھنے کی لگن اور تعلیم میں اضافہ کی شرح ہم سے بہت زیادہ ہے۔ ہم علم سے غافل ہو گئے ہیں۔ دوسری قومیں علم کا سفر تیز رفتاری کے ساتھ طے کر رہی ہیں۔ فاصلہ دن بدن بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ دینی تعلیمی کونسل عام طور پر تعلیم کی توسیع کے سندیسہ کو گھر گھر پہنچا سکتی ہے وہ نئی نسل کے دلوں میں یہ بات بٹھا سکتی ہے کہ مسلمانوں پر تحصیل علم فرض ہے اور اگر ہم جاہل رہے اور ہم نے اپنے بچوں کو جاہل رکھا یا پڑھنے یا پڑھانے یا پڑھوانے کا حق پوری طرح ادا نہیں کیا تو دنیا میں کم نصیبی اور بے چارگی اور بدنامی کے علاوہ حشر کے روز شرمسار ہونا پڑے گا۔ کسی دین نے تحصیل علم پر اس قدر زور نہیں دیا ہے جتنا اسلام نے، اسے تاریخ کا طنز کہئے یا ہماری کجروی اور گمراہی کہ مسلمان ہی علم سے بے نیاز ہو بیٹھے، علم کی بازیابی، بالیدگی اور نشاۃ ثانیہ کے فرائض انجام دینے کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ گئے اور علم نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ ایک لمحہ کی غفلت تو سال پیچھے کر دیتی ہے۔ حساب لگائیے چار سو سال کی غفلت نے ہمیں کتنے پیچھے ڈھکیل دیا ہوگا۔ بہرکیف قسمت کا گلہ کرنے، اپنائے زمانہ سے شکوہ سنج ہونے سے نہیں چلتا۔ ہمیں ترقی کرنا اور باعزت زندگی بسر کرنا ہے تو علم حاصل کرنا ہوگا۔ ضرورت ہے ایک علمبردار، ملک گیر کوشش کی یا تعلیم کے پیغام کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا یا جائے۔ مسلمان تاریخ کے اس موڑ پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر انھوں نے جہالت کے آسیب کے دامن نہ چھڑایا تو جانبر نہ ہو سکیں گے اور بفرض محال ہو بھی گئے تو عزت کے ساتھ نہ رہ سکیں گے۔

افسوس کہ ہماری آنکھوں پر ابھی تک غفلت اور رعونت کے پردے پڑے ہوئے ہیں ایسا نہ ہوتا تو ہم دیکھتے کہ ہندستانی مسلمان اس راستے پر چل رہے ہیں جو فنا کی منزل کی طرف لے جاتا ہے۔ ہر دن جو گذرتا ہے اس عبرتناک انجام کو قریب لا رہا ہے۔ اگر ہم کو سنبھلنا ہے اگر ہم کو زندہ رہنا ہے، تو علم حاصل کرنا ہوگا، علم کو عام کرنا ہوگا صدیوں کا فاصلہ سالوں میں طے کرنا ہوگا ———————— جہالت اس زہر کی مانند ہے جو آہستہ آہستہ رگ و پے میں سرایت کرتا ہے۔ اس طرح کہ آہٹ تک نہیں ملتی اور بالآخر کام تمام ہو جاتا ہے۔ ہماری سب سے بڑی دشمن جہالت ہے۔ اسلام اور جہالت باہم اضداد کو باہم جمع کرنے کے بظاہر مرتکب ہوئے ہیں۔ جہالت تو ثابت ہو گئی البتہ وہ اسلام جو جہالت کو گوارا کرے، اس کی رفاقت کو برداشت کرے، اسلام نہیں اسلام کا مضحکہ خیز اور دردانگیز خاکہ ہوگا۔ دینی تعلیمی کونسل کے پاس اپنا ہی کام بہت ہے لیکن جو لوگ کام کرتے ہیں وہ مقناطیس کی طرح کاموں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ عام تعلیم کی بابت نقطۂ نگاہ درست کرنا اور میدان ہموار کرنا اور اس کی ضرورت کی طرف توجہ دلانا اتنا کام دینی تعلیمی کونسل اپنے ذمہ لے لے تو بہت اچھا ہو۔

تعلیم میں دین و دنیا دونوں کی فلاح ہے۔ علم کے معنی ہیں جاننا۔ جاننے کا نتیجہ ہے پہچاننا۔ جاننے اور پہچاننے سے مراد ہے کسی چیز کی بھلائی اور برائی سے واقف ہونا۔ اور اس کے لئے پرکھنا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ علم کا جوہر حافظہ سے زیادہ غور و فکر میں ہے۔ اسی غور و فکر، اسی تدبر اور تفکر کی تاکید کلام مجید میں کی گئی ہے؛ ایک بار نہیں سیکڑوں بار۔ اسی غور و فکر نے مسلمانوں کو عالمی علم کا حامی اور امین اور داعی اور ناشر بنا دیا تھا۔ اپنے گرد و پیش کا اور ارض و آفاق کا مشاہدہ کرنا، قدرت کے مظاہر، مشاہدات اور تجربات پر غور و خوض کرنا اور غور و فکر کے بعد نتائج تک پہنچنا یہی ہمارے اسلاف کا شعار تھا اور یہی ان کا نشانِ امتیاز۔ علم میں دین کی بھلائی اس لئے ہے کہ علم نیک و بد میں امتیاز کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، ضمیر کے ساتھ مل کر برائی سے روکتا ہے اور بھلائی کی طرف لے جاتا ہے۔ علم میں دنیا کی فلاح کے فوائد ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔ علم شعور کو جلا دیتا ہے، زندگی سلیقہ سے بسر کرنے کا ڈھنگ سکھاتا ہے۔ بھلے برے کی تمیز اور برائیوں سے بچنا سکھاتا ہے۔ اس کے علاوہ تخصیص کے اس دور میں کوئی شخص اپنے کام میں خواہ اس کا تعلق دفاتر سے ہو، خواہ کارخانوں سے، خواہ کھیتوں اور کھلیانوں سے، خواہ حمل و نقل کے وسائل سے، خواہ گھریلو صنعت اور ہنر اور دستکاری سے، بغیر علم حاصل کئے ترقی ہی نہیں کر سکتا۔ بات یہاں بھی ختم نہیں ہوتی۔ خود صحت جس پر ہر چیز کا، ہر خوشی کا دارو مدار ہے، علم کی دست نگر رہتی ہے۔ یہ دعویٰ کہ علم طاقت ہے اب کسی ثبوت کا محتاج نہیں رہا۔ وہ قومیں جو علم کی دوڑ میں آگے ہیں طاقتور ہیں، صاحبِ اقتدار ہیں، دنیا میں ان کا طوطی بولتا ہے۔ ان کے نام کا سکہ چلتا ہے۔ ٹکنالوجی ان کے اختیار میں ہے۔ جو قومیں علم لگن کے ساتھ حاصل کرتی ہیں وہ جرمِ ضعیفی کا ارتکاب کر ہی نہیں سکتیں۔ جس کے سینے میں علم ہے اس کے ہاتھ میں طاقت ہے۔ شعور اور طاقت کے اس سرچشمہ سے ہم خود کو محروم کیوں رکھیں۔ یاد رکھئے علم فراموشی اور خودکشی کے مابین زیادہ فاصلہ نہیں رہتا۔

اب میں دائرہ کو چھوٹا کرتا ہوں، مرکز کی طرف آ رہا ہوں۔ دینی تعلیم کے نصاب اور اس کے طلقہ پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ اس تیز رفتار دنیا میں جو احتساب اور ترمیم سے غافل ہوا کہنگی اور فرسودگی کا شکار ہو گیا۔ ہمیں اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ انسان کی شخصیت اور کردار، اس کی افتادِ طبع، اندازِ فکر اور طریقِ ردِ عمل، ان سب کی تشکیل اور یک گونہ تکمیل بچپن میں ہو جاتی ہے۔ بعض ماہرینِ نفسیات کی نگاہ میں زندگی کے ابتدائی پانچ سال اس ضمن میں سب سے اہم ہوتے ہیں اور جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے ہیں تعلیم و تربیت اور ماحول کے اثرات کا شخصیت کو ڈھالنے میں حصہ بتدریج کم ہو جاتا ہے۔ اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں۔ ایک یہ کہ والدین کو دین سے روشناس کرانا اور گھروں کے ماحول میں دین کو داخل کرنا اتنا ہی ضروری ہے، جتنا بچوں کو دین کی تعلیم دینا۔ یہ گوشہ مبلغین کی

چشمِ التفات کا منتظر ہے۔ ہمارے معاشرے کی زبوں حالی اور محرومی پکار پکار کر کہہ رہی ہے:

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

دوسرے یہ کہ بچوں کو پہلے دین کی تعلیم دی جائے، پھر عام رواج یافتہ تعلیم۔ دل و دماغ پر پہلے نقوشِ دینی تعلیم کے ثبت ہونے چاہئیں، مروّجہ دنیاوی تعلیم تک بھی دینی تعلیم کے راستے سے پہنچنا چاہیے۔ جو لوگ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دینی تعلیم کی طرف آتے ہیں وہ دینی تعلیم کے بے واسطہ، بے آمیزش فیض سے محروم ہوجاتے ہیں۔ وہ اپنے دین کو دوسروں کی نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ دل و دماغ لمعاتِ دینی سے منوّر نہیں ہو پاتے۔ ان پر سرچشمۂ ہدایت، اور دستورِ حیات کا نزول براہِ راست نہیں ہوتا۔ لہٰذا بچوں کے نصاب کو دو طرح ترتیب دینے پر غور کیا جائے۔ ایک تو ان بچوں کے لئے جنھیں انگریزی تعلیم کی طرف نہیں جانا ہے اور دوسرے ان بچوں کے واسطے جو ایک قلیل مدت کے لئے دینی تعلیم کے نقوش دل و دماغ پر مُرتسم کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں اور جنھیں اقتضائیات کا نظام اور مقابلہ کی دنیا کا نظام جلد ہی رائج الوقت دنیاوی تعلیم کی طرف لے جائے گا۔

حضرات! آپ اس گتھی کو بھی حل کیجئے کہ جن بچوں کو، اور اکثریت اُن ہی کی ہے، دینی، تعلیمی مدارس میں جانے کی توفیق نہ ہوگی، ان کو عام اسکولوں میں انگریزی یا ہندی تعلیم کے دوران دین سے روشناس کرنے، دین اور روایات سے پیوستہ رکھنے کا طریقہ کیا ہوگا۔ کیا دینی تعلیمی کونسل اس طرف بھی توجہ دے گی؟ کیا یہ ممکن ہوگا کہ ان بچوں کے لئے جز وقتی اور مراسلاتی تعلیم کی سبیل نکالی جائے؟ یہ طبقہ اتنا بڑا ہے کہ ہم اسے نظر انداز نہیں کرسکتے، نہ اسے لادینی اور گمراہی اور تشکیک کے حوالے کرکے چین سے بیٹھ سکتے ہیں۔ صورتِ حال کا المناک تقاضا یہ ہے کہ بہتر صلاحیتوں کے بچے دینی تعلیم کی طرف نہیں آتے۔ اگر وہ حالات کے فشار اور والدین کی غفلت کے تحت دینی تعلیم کی طرف نہیں آتے تو ہم سپر انداز کیوں ہوں؟ کیوں نہ دینی تعلیم کو ان کے پاس بھیجیں۔ میں درخواست کروں گا کہ دینی تعلیمی کونسل اس مسئلہ کی طرف ملتفت ہو۔

مادیت کو دن بدن فروغ ہو رہا ہے۔ قدریں تیزی سے بدل رہی ہیں۔ شخصیتوں کو زر میں تولا، لباس میں پہچانا اور ظواہر سے آنکا جاتا ہے۔ باطن جو یوں ہی چھپا ہوا تھا، بالکل روپوش ہوگیا ہے۔ دور دورہ اب ظواہر کا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سطحیت کے سیلاب میں زندگی کی بنیادی قدریں بہہ گئی ہیں۔ ہمارے بچے گرد و پیش جو کچھ دیکھتے ہیں اسی سے متاثر ہوتے ہیں۔ جو لوگ انھیں خوش حال اور خوش پوش اور بہ ظاہر خوش اطوار نظر آتے ہیں انھیں کی وہ قدر کرتے ہیں، انھیں سے وہ مرعوب ہوتے ہیں۔ انگریزی لباس اور انگریزی لب و لہجہ

یعنی ہمارا اگر یہ پالیسی کے برعکس جو لوگ دینی تعلیم دیتے ہیں وہ ایک طرف جدید تہذیب کی چمک دمک سے محروم ہیں اور دوسری جانب مادی خوشحالی سے محروم۔ چنانچہ بچے اکثر ان کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ استاد کا احترام اگر دل میں نہ ہو تو شاگرد سیکھے گا کیا؟ جو کچھ بھی استاد جو کچھ پڑھائے گا وہ عدم توجہ یا عدم احترام کی نذر ہو جائے گا۔ اس لئے ضروری نظر آتا ہے کہ اسلام کی بنیادی اقدار بچوں کے دلنشیں کر دی جائیں تاکہ ان پر آگے چل کر نہ سامری کا جادو چل سکے نہ ساحر المود کا فسوں۔ یہ بات شروع سے دل میں بٹھا دینی چاہیئے کہ ظاہری چمک دمک ایک فریب ہے جو یہ فریب کھا گیا وہ عمر بھر بھٹکتا رہے گا، سکون کو ترستا رہے گا۔ یہ بات ذہن نشین کر دینی چاہیئے کہ آدمی بڑا وہ ہے جو سچا، بے لوث، دردمند، پاک دامن اور اللہ کا فرماں بردار ہو۔ آدمی بڑا وہ ہرگز نہیں جو اچھے کپڑے پہنتا ہو، اچھے اور آراستہ مکان میں رہتا ہو اور اچھی سواری میں بیٹھتا ہو اور مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو۔ اگر شروع میں ہی بچے کو زندگی کی بنیادی قدروں سے آشنا کر دیا گیا، اس کی گرفت ان پر مضبوط کر دی گئی تو نصاب اور مثال کے ذریعہ دینی تعلیم حاصل کرنے اور مذہب کو جذب کرنے میں بہت آسانی ہو جائے گی۔ نظام کائنات کے پس منظر میں مشاہدات کے وسیلے سے زندگی کی صالح قدروں کی تعلیم دینی چاہیئے جو لوگ غور و خوض کرتے ہیں انھیں چمن کا پتا پتا بوٹا بوٹا خالق کائنات کی طرف اشارہ اور اس کی حکمت کی نقاب کشائی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ سعدی نے کہا تھا:

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ٭ ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

اور جب انسان سوچنے لگتا ہے کہ ساری کائنات احکام الٰہی کے تابع اور ان کی تعمیل کے لئے وقف اور خود انسان کی پرورش اور پرداخت پر مامور ہے، تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ خالقِ کائنات کے احکام سے سرتابی کرے تو یہ ناانصافی ہوگی، ظلم ہوگا، جہالت ہوگی۔ جب کائنات ایک طرف جائے گی اور وہ دوسری طرف تو نتیجہ ظاہر ہے:

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند ٭ تا تو نانی بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار ٭ شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

حاصل کلام نصاب پر اس لحاظ سے نظر ثانی کی شدید ضرورت ہے۔ اس سے کچھ کم اہم اور دور رس نہ ہوں گی والدین کے نقطۂ نگاہ کو بدلنے اور ان کے طرز فکر کو سنوارنے کی کوششیں۔ یہ نسل جو آزادی کے بعد پروان چڑھی ہے اس کو اسلامی روایات میں پلنے کا موقع کم ہی ملا ہے۔ اچھے معلمین کی فراہمی

اور ان کی تربیت اور دشوار ہے۔

حاضرینِ کرام، دائرہ کار بڑھتا چلا جا رہا ہے اور کام دشوار سے دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ اُن بچوں کی پرداخت جو دینی تعلیم کے لئے سامنے آ رہے ہیں، آئس برگ کی اس کہاوتی نوک جیسی ہیں جس کا سرا پانی کے اُوپر نظر آتا ہے۔ اس تعلیم کا فیض ان بچوں تک بھی پہنچنا چاہیے جو عام اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ دینی تعلیم کے دور رس اور دیرپا ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اچھے معلّمین کی فراہمی اور تربیت پر دھیان دیا جائے اور والدین کو بھی دینی تعلیم کے حلقۂ فیض میں کھینچ لایا جائے۔ ان میں سے ہر کام دشوار اور حوصلہ فرسا ہے۔ لیکن آپ لوگ یہاں نہ سہل انکاری کے لیے جمع ہوئے ہیں نہ سہل آشامی کے لیے۔ دشواری کی کشش ہی آپ کو یہاں کھینچ کر لائی ہے۔ یہ شعلہ آشامیوں کی انجمن ہے، شیر خواروں کی نہیں۔ اس پروگرام کی کامیابی کے لیے ہمہ جہت کوشش کی ضرورت ہے۔ یک جہتی پروگرام برحق لیکن ناکافی ہے۔ نصاب کا ذکر چھڑ گیا ہے تو ایک بات جو میں ایک موقع پہ بھی عرض کر چکا ہوں دہراؤں گا:

تعلیمی صورتِ حالات نے ہماری ملّت کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ ایک طبقہ دینی تعلیم حاصل کرتا ہے، دوسرا جدید انگریزی تعلیم۔ ان دونوں کی دنیائیں الگ ہیں۔ دینی تعلیم پانے والے بالعموم جدید تعلیم سے بیگانہ رہتے ہیں اور جدید تعلیم پانے والے عام طور پر مذہب سے بے بہرہ۔ اس طرح ملّت دونیم ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ ہم آہنگی، توازن اور اتحاد سے اس وقت تک محروم رہے گی جب تک کہ دینی اور دنیاوی تعلیم پانے والوں کے درمیان فاصلہ باقی رہتا ہے۔ دنیاوی تعلیم دینے والوں کو یہ فکر کیوں لاحق ہونے لگی کہ ان کی تعلیم یک رخی نہ رہے۔ یہ کام دینی تعلیم دینے والوں کا ہے کہ اس خلیج کو پاٹیں۔ اوّل تو دینی تعلیم کے نصاب کو اس طرح دکھائیں کہ اس میں آگے چل کر دنیاوی تعلیم کے ساتھ توام ہونے کی صلاحیت رہے، دویم عام اسکولوں میں تعلیم پانے والوں کو مذہب کی جز وقتی یا مراسلاتی تعلیم دینے کا انتظام کریں۔ یہ کام بہت بڑا ہے لیکن کرنے کا ہے۔ اس سے کونسل کا دائرہ کار بہت وسیع ہو جائے گا۔ اس کام میں اچانک، بے سوچے سمجھے، بنا تیاری کے ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ پہلے وسایل پر غور کرنا ہوگا، مالی اور افرادی اور تنظیمی وسائل۔ نیا کام ہاتھ میں لینے سے پہلے یہ اطمینان کرنا ہوگا کہ اس کام میں پڑنے سے کہیں اس ابتدائی اور بنیادی کام میں خلل تو نہیں پڑے گا، جو دینی تعلیمی کونسل اب تک کرتی چلی آئی ہے۔

جہاں تک دینی تعلیم کی بنیادی مہم کا تعلق ہے اس کے نصاب پر وقتاً فوقتاً نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس نصاب کے ساتھ زمانۂ حاضر اور اس کے مسائل کو پیوست کر کے اس کی جامعیت اور افادیت میں اضافہ کرنا مناسب ہوگا۔ عقاید کے علاوہ اعمال پر زور دینے سے بات ذہن نشین کرانے میں مدد ملے گی اور دین کے عملی پہلو کو تقویت ہوگی۔ بچوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دینی چاہیے کہ دین کی قلمرو صرف حافظہ نہیں، صرف دل و دماغ نہیں، اعمال بھی ہیں۔ اسلام کے متعلق دنیا رائے مسلمانوں کے معتقدات کی بنا پر قائم نہیں کرے گی، بلکہ ان کے افعال و کردار کی بنا پر۔ انسان کے دل میں کیا ہے، یہ صرف خدا ہی جانتا ہے، یا خود وہ انسان۔ لیکن وہ کیا کرتا ہے، کیا کہتا ہے، اُسے دنیا دیکھتی ہے، جانتی ہے، اس سے متأثر ہوتی ہے اور نتائج نکالتی ہے اور رائے قائم کرتی ہے۔

کسی اقلیت کی باعزت بقا کے لیے تین تدابیر ضروری ہیں:

۱۔ وہ اپنے مذہب اور تمدن پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔

۲۔ اَن تھک ریاضت کر کے اپنے آپ کو اکثریت سے بہتر ثابت کرے۔

۳۔ اکثریت اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ اپنے تعلقات خوشگوار رکھے۔

اس وقت زیر بحث صرف پہلی تدبیر ہے:

بچوں کے دلوں میں یہ بات شروع ہی سے ڈال دینی چاہیے۔ مذہب کے بنیادی عقاید کے علاوہ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے کردار کی بابت ایک جیتا جاگتا تصور ہونا چاہیے۔ کیونکہ تصورات بالآخر شعور اور تحت الشعور، دل و دماغ اور رگ و پے میں سرایت کر جاتے ہیں اور افعال و اعمال و اقوال و کردار کے برگ و بار لاتے ہیں۔ انھیں سمجھنا چاہیے کہ اسلام دین فطرت ہے، وہ فطرت کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اس کی پابندیاں بے راہ روی کو روکنے کے لیے ہیں۔ اس کی پابندیوں میں کشایش اور بالیدگی پنہاں ہے۔ کائنات خدا نے بنائی ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ خدا کی طرح اس کی مخلوق بھی ایک ہے۔ مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔ اس لیے ہماری محبت کی مستحق ہے۔ اس کے ساتھ مسلمان نیکی، شرافت، رحم اور نرمی کا سلوک روا رکھتا ہے۔ اس کا مسلک ہے:

اللہ کے بندوں کے ساتھ رحم کرو، اللہ تم پر رحم کرے گا۔ سچ بولو کہ سچ حقیقت ہے اور جھوٹ باطل۔ سیدھے راستہ پر چلو۔ ظلم، جہالت، حسد، جھوٹ اور فریب سے گریز کرو۔

غریبوں، یتیموں، مسافروں اور حاجتمندوں کی مدد کرو۔ صرف خدا سے ڈرو۔ جو مانگنا ہے اسی سے مانگو۔ محنت کی کمائی کھاؤ، دل غنی رکھو، عمل کا ایک ذرّہ بھی ضائع نہ ہوگا۔ جیسا کروگے، ویسا بھروگے۔ دنیا اور آخرت دونوں میں بڑوں کا ادب کرو اور چھوٹوں پر شفقت۔ اللہ کے رسول اور آخرت پر ایمان لاؤ، بھلائی کے کام کرو اور لوگوں کو سچائی کی طرف بلاؤ۔ اس زندگی میں جہاں قدم قدم پر مصیبتیں ہیں، خوف اور لالچ اور ترغیب اور آزمائش ہے، ثابت قدم رہو۔ کوئی خوف تمھیں حق کے راستے سے ہٹا نہ سکے، کوئی لالچ تمھیں ورغلا نہ سکے۔ خدا کے سوائے کسی کے سامنے نہ جھکو، دل کو حرص اور حسد سے پاک رکھو، علم حاصل کرو، عقل سے کام لو، غور و فکر کی عادت ڈالو۔ دنیا نہ خواب ہے نہ خیال، ایک زندہ حقیقت ہے، طویل سفر کی ایک منزل ہے، ایک امتحان گاہ ہے۔ انسانیت انسانوں کے ساتھ بھلائی کرنے میں ہے۔ جو لوگ دوسرے مذاہب کے ماننے والے ہیں ان سے بدگمان نہ ہو۔ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ انسانیت کے ٹکڑے جغرافیہ یا رنگ و نسل کی بنا پر نہ ہونے دو۔ اسے افضل و اعلیٰ، اور ذلیل و اسفل کے خانوں میں نہ بانٹو۔ تمھارا لطف، تمھاری ہمدردی اسی طرح عام ہونی چاہیے جیسے ہوا اور پانی، حرارت اور روشنی۔ محنت کرو اور پھل کے لیے خدا پر بھروسہ رکھو۔ قناعت کا مطلب ہے ضرورتوں کو نہ بڑھاؤ۔ توکّل کا مطلب ہے خدا کے مسبّب الاسباب اور کارساز ہونے پر یقین رکھو۔ اپنے قویٰ اور اپنی صلاحیتوں کو کماحقہٗ استعمال نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے، توکّل نہیں۔ توکّل اور قناعت دونوں کا مفہوم ہے اکلِ حلال کے لیے محنت اور کوشش! انتھک محنت اور لگاتار کوشش! اور نتیجہ کو خدا پر چھوڑ دینا!! اگر کوشش کامیاب نہیں ہوتی تو کبیدہ خاطر اور شکوہ سنج نہ ہو۔ مایوسی سے دامن بچانا کہ مایوسی کفر ہے۔ اس کا مطلب ہے خدا کی رحمت سے انکار۔ ہر فرد اپنے افعال کا ذمّہ دار ہے۔ اس کے اعمال کا جواب کوئی دوسرا نہیں دیگا، خود اسے دینا پڑے گا۔ انتہا پسندی، شدّت اور سختی سے بچو۔ اعتدال اور سلامت روی اختیار کرو۔ یاوہ گوئی اور الزام تراشی اور تضیع وقت سے احتراز لازم ہے۔ پیٹھ پیچھے کسی کو بُرا نہ کہو۔ ظلم اور بیدردی سے بچو اور نرمی اختیار کرو۔ لیکن حق گوئی اور باطل کی مدافعت کے سلسلہ میں کسی خوف یا تامّل کو راہ نہ دو۔

یہ تھی ایک مسلمان کی شبیہہ۔ یہ اُن تاثرات سے کتنی مختلف ہے جو مسلمانوں کے متعلق عام ہیں۔ اگر ممکن ہو تو دینی تعلیم کے نصاب کے آئینہ میں اس شبیہہ کو اُتار لیا جائے۔ نصاب میں اس عنوان کی ترمیم کی جائے کہ عقاید و عبادات کے علاوہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور ان پر عمل کرنے والوں کی شبیہہ کو بھی

کے تصورات اور طرز فکر میں پیوست ہو جائے۔

دینی تعلیمی کونسل نے گزشتہ بائیس[۲۲] سالوں میں جو کام کیا ہے وہ لائق صد ستائش ہے لیکن مسئلہ کی وسعت، اہمیت اور نزاکت کو دیکھتے ہوئے یہ کام ناکافی ہے۔ یہاں مجھے اپنی بات کو وزن اور وسعت دینے کے لیے چند سابق دینی تعلیمی کانفرنسوں کے خطبات صدارت میں سے اقتباسات کی اجازت دیجیے۔ ۱۹۷۵ء کے خطبۂ صدارت میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہٗ العالی اسلام کی نظر میں تحصیل علم کی اہمیت ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"کیا ایسی ملت کے لیے کسی وقت اور کسی جگہ بھی اس کا جواز ہے کہ وہ اپنی بقدر ضرورت دینی واقفیت اور اپنی آیندہ نسل کے شعوری وعملی طور پر اسلام پر باقی رہنے کی جدوجہد اور اس کے تحفظ کے مسئلے سے زیادہ کسی اور مسئلے پر اپنی توجہ اور دلچسپی، اپنی سعی وجہد اور اپنی ایثار و قربانی کا اظہار کرے اور اس تعلیمی محاذ پر دفاع اور اقدام اور ہر اس منفی ومثبت تدبیر کو کام میں نہ لائے جو وقت کا تقاضا اور مسئلہ کا مطالبہ ہے۔"

دینی تعلیمی کونسل کے کیکونوسس قاضی محمد عدیل عباسی صاحب نے ایک دوسرے موقع پر فرمایا تھا:

"خیرانسٹر کالج بستی کے ایک لکچرر نے مجھ سے کہا کہ ہندو لڑکے اپنے مذہب کی تمام باتیں جانتے ہیں لیکن مسلمان لڑکوں کی دینی معلومات اور اپنے اسلاف کے حالات اور تاریخ کا علم بمنزلہ صفر ہے۔۔۔۔ ہندو لڑکیاں اپنے مذہبی ماحول کو برقرار رکھے ہوئے ہیں، لیکن مسلمان لڑکیاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہیں۔ ان کا نہ کوئی اصول ہے نہ نصب العین۔ باد حوادث کا جھونکا تنکے کی طرح ان کو ادھر سے ادھر اڑائے پھرتا ہے۔ انھوں نے پھر کہا کہ اصل وجہ یہ ہے کہ اسکولوں کا کورس ہندو مذہب کی تعلیمات اور دیومالا سے بھرا پڑا ہے اور مسلمان لڑکے اور لڑکیاں بھی انھی اسباق کے پڑھنے پر مجبور ہیں۔ پھر انھوں نے سوال کیا کہ کیا حشر ہوگا آیندہ نسل کا جو ان ہی لڑکیوں کی گود میں پلے گی۔۔۔۔"

آگے چل کر قاضی صاحب مرحوم ومغفور لکھتے ہیں:

"دینی تعلیمی تحریک ان ہی مذکورہ مشکلات اور پریشان کن سوالات کے حل کے لیے جاری ہوئی تھی۔ دینی کونسل بنی، ضلع ضلع کونسل کی شاخیں انجمن تعلیمات دین قائم ہوئیں۔۔۔۔ کونسل جبریہ تعلیم کامیابی کے ساتھ لڑی، درجہ ۶ میں اپنے بچوں کا داخلہ منظور کرایا۔ ۱۹۵۹ء کا پراسپیکٹس منسوخ کرایا۔ اصلاح نصاب کے لیے انتہائی زبردست شورش کی۔۔۔۔ گاؤں گاؤں مکاتب قائم ہو گئے۔"

پانچ چھ لاکھ بچّے بذریعہ اُردو تعلیم پا رہے ہیں۔ ان سب باتوں سے تعلیم یافتہ طبقے کی بے خبری کیوں ہے۔ کیوں ہر جگہ اس تحریک کی افادیت، ضرورت اور اہمیت کا تذکرہ نہیں ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ آج پورا ملک اس صدا سے گونج رہا ہوتا کہ ایک بچّہ یا ایک بچّی ایسی نہ رہ جائے جسے دین کی تعلیم بذریعہ اُردو نہ دی جا رہی ہو۔ ہر محفل میں اس کا تذکرہ ہوتا۔ ہر وعظ میں یہ ایک عنوان ہوتا مگر ایسا نہیں ہے۔ کیوں؟ اے رفیقانِ کار مقام غور و فکر ہے!"

قاضی صاحب نے کہا کہ "مقامِ غور و فکر" ہے۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ ماتم یا عبرت کا مقام ہے۔ مردانِ کار کبھی وقتِ عزیز کو ماتم اور شکوہ سنجی میں ضائع نہیں کرتے۔ وہ محاسبہ کرتے ہیں اور منصوبہ بناتے ہیں اور منصوبہ کے جَسد میں عمل کی روح پھونکتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامّل نہیں کہ دینی تعلیمی تحریک ایک عنوان سے ہندوستانی مسلمانوں کی اہم ترین تحریک ہے۔ اس کا تانا بانا عوام نے بُنا ہے۔ یہ کوئی کاغذی اور خیالی تحریک نہیں جس کا تصوّر آرام کرسی پر دراز ہو کر کیا گیا ہو۔ اس تحریک کو تنگ نظری اور عناد کی ہوا تک نہیں لگی۔ اس کی بنیاد فراخدلی، انسان دوستی، ہدایت، پیش رفت اور اجتماعی عزتِ نفس پر ہے۔ اسے دَور کا بھی تعلق بھی ابن الوقتی، موقع پرستی، بزدلی، خویشتن سوزی، ریاکاری اور شہرت طلبی سے نہیں۔ میں ایک عرصہ تک ساحل پر کھڑا موجوں سے لڑنے والوں کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ حالات نے مجھے بھی بحرِ ذخّار میں ڈھکیل دیا، تلاطم سے برسرِ پیکار کر دیا۔ مجھے مسلمانانِ ہند کے مرکزی تعلیمی ادارہ سے وابستہ ہونے کی سعادت بخشی گئی ہے۔ اس ادارہ کا ناتا دینی تعلیمی تحریک سے جڑنا چاہیے تھا۔ آپ نے مجھے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے نمایندہ کی حیثیت سے یہاں بلایا ہے۔ میں یونیورسٹی کی طرف سے دینی تعلیمی کونسل کی خدمت میں دعائے خیر اور سپاس و عقیدت کا ہدیہ پیش کر رہا ہوں۔ اسے خدارا منجملہ آدابِ مجلس نہ سمجھیے، خدا نے چاہا تو یہ ایک معنی خیز تخلیقی اور تعمیری رابطہ کا نقطۂ آغاز ثابت ہوگا۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ اپنے سفیر ہمارے یہاں بھیجیں اور یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ کو دینی تحریک سے روشناس کرائیں۔ تاکہ جب وہ تعلیم سے فارغ ہو کر نکلیں تو دوسرے فرائض کے ساتھ اس اخلاقی فریضہ کو ذوق اور محنت اور لگن کے ساتھ اپنے قرب و جوار میں ادا کریں۔ ہمارے ذہنوں میں یہ خیال گردش کر رہا تھا کہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے تعلیمی اداروں کی شیرازہ بندی اور ان کے معیار کے ارتفاع کا کام اپنے ذمّہ لے۔ نئے ایکٹ نے تو یونیورسٹی کے مقاصد میں اس بات کو شامل کر دیا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشرتی ترقی کے لیے سرگرم عمل ہو۔

کیا عجب کہ مقامی جذبہ اور اقدامیت کی اہمیت کو گھٹائے بغیر مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی تعلیم کے سلسلہ میں مفید مشورے دے سکے اور کارآمد اقدامات کر سکے۔

اعداد و شمار کے فریب میں گرفتار ہونا پرُخطر ہے۔ لیکن اعداد و شمار سے کام لینا منصوبہ بندی اور احتساب دونوں کے لیے ناگزیر ہے۔ ہمیں ضروری اعداد و شمار جمع اور مشتہر کرنا چاہئیں اور ان کا تجزیہ کرنا چاہیے، تاکہ پیش رفت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ یہ زمانہ منصوبہ بندی کا ہے۔ پہلے اہداف طے کیے جاتے ہیں، پھر ان کے حصول کے لیے مدت معین کی جاتی ہے۔ زمانی اعتبار سے منصوبے تین طرح کے ہوتے ہیں۔ قلیل مدتی منصوبہ جو بالعموم ایک سال پر حاوی ہوتا ہے، درمیانی جو عموماً تین یا پانچ یا سات سال کے لیے بنایا جاتا ہے اور طویل جو ۱۵، ۲۰، یا ۲۵ سال تک کا احاطہ کرتا ہے۔ طویل منصوبہ PROSPECTIVE PLAN کہلاتا ہے۔ اس کا مقصد سمتوں کا تعین ہوتا ہے۔ درمیانی منصوبہ سمت کے علاوہ جُزوی اہداف اور ان کے لیے مالی وسائل کا تعین کرتا ہے۔ عملی منصوبہ عموماً یکسالہ ہوتا ہے۔ دینی تعلیم کے لیے ہمیں ان تینوں منصوبوں کی تشکیل کرنی ہوگی۔ آئندہ سال ہم کیا کرنے جا رہے ہیں۔ آئندہ پانچ سالوں میں ہم کیا کریں گے اور سن ۲۰۰۰ء تک یعنی ۱۸ سال میں ہماری پیش رفت کی شرحِ ترقی اور نہضت کی سمتیں کیا ہوں گی۔ منصوبے کی تشکیل اور اہداف اور سمتوں کے تعین سے دو فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو کارکنوں اور رضاکاروں کے سامنے ایک واضح مقصد ہوتا ہے جس کے حصول کے لیے وہ ہفت خواں طے کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ کہ جائزہ اور احتساب کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ ہر سال کے آخر میں یہ حساب لگایا جا سکتا ہے کہ کام کی رفتار کیسی رہی۔ اگر اہداف ہاتھ نہ آئے تو طریق کار میں کیا کمیاں تھیں انھیں کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔

منصوبہ بندی کے تجارب نے ماہرین کو اس نتیجہ پر پہنچا دیا ہے کہ کام آگے جبھی بڑھتا ہے جب مرکزیت کی شدت کو کم کیا جائے۔ اختیارات کارکنوں کو تفویض کیے جائیں۔ ساتھ ہی ساتھ مرکز میں اطلاعات آتی رہیں تاکہ اس پر نگاہ رہے کہ کام کس طرح چل رہا ہے۔ جہاں لال بتی نے آنکھ جھپکائی وہیں غلطی کی اصلاح کر دی گئی۔ دینی تعلیمی تحریک کو بھی اسی طرح کی نگرانی یا MONITORING سے استوار کیا جا سکتا ہے۔ جب کام پھیلتا ہے تو اس کو ڈھنگ سے چلانے کے لیے نگہبانی کا یہ دستور ناگزیر ہو جاتا ہے۔ نگہبانی کے ایوان میں دو ستون ہیں اوّل تحریری اطلاعات، زمانی تعین کے ساتھ۔ دوم معائنہ۔ یہ عمل سوز بجاں اکثر اداروں اور شعبوں میں دیکھنے میں آیا ہے کہ مرکز اتنی زیادہ تحریری اطلاعات مانگتا ہے

کہ میدان میں کام کرنے والوں کا وقت کاغذوں کی خانہ پُری میں گزرنے لگتا ہے اور کبھی کبھی فرضی اعداد وشمار کی تخلیق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ دینی تعلیم کے رضاکار جنھیں نہ ستائش کی تمنّا ہے نہ صلہ کی پروا، اعداد وشمار کے ساتھ کھیلیں گے نہیں۔ دینی تعلیمی کونسل کو البتہ یہ چاہیئے کہ صرف چند معنی خیز اُمور کے متعلق سال میں ایک یا دو اطلاعات طلب کرے۔ حاصل کلام منصوبہ بندی، جائزہ، احتساب، احصاء اور معائنہ کے ادوات کا استعمال غالبًا کونسل کے لیے سود مند ہوگا۔

میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ نصاب میں تبدیلیاں کرنا ہوں گی اور نصاب کو بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں ہمہ وقت زیر نظر رکھنا ہوگا۔ اس مشینی دَور میں MODULES کا تصور راہ پا گیا ہے۔ یعنی اس طرح کے مرکب اجزا جو مختلف مشینوں میں لگائے جا سکتے ہوں اس سے محنت اور پیسہ اور وقت بچتے ہیں۔ ہمارا دینی تعلیمی نصاب اگر اس تصور کو قبول کرلے تو دوسرے مروّجہ نصابوں کے ساتھ تال میل میں آسانی ہوجائے اور دینی تعلیم کے سند یافتہ بآسانی مروّجہ انگریزی تعلیم کے نصاب میں کھپ سکیں۔

مقصود اس دراز نفسی سے صرف یہ تھا کہ دینی تعلیم کے فیض کو عام کیا جائے۔ تاکہ اس دونیم ملّت کی وحدت بحال ہوسکے اور محدود ذرائع بہترین اور نتائج خیز ڈھنگ سے استعمال ہوسکیں۔ تحقیق کے ایک اور آلہ کا ذکر کردوں، یہ ہے سروے یا پایان کے قریب عملی جائزہ۔ ہمہ شماری سینسس "کائنات" کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کا عمل دیر طلب، زر طلب اور دشوار ہوتا ہے۔ سامپل سروے میں ایک نمائندہ نمونہ لے کر اس سے "کائنات" کے بارے میں نتائج نکالے جاتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ضلع ضلع میں اس قسم کے عملی جائزے لیں جن سے یہ معلوم ہو کہ مسلمان بچّے کس تناسب سے دینی تعلیم سے بہرہ پا رہے ہیں۔ اس کے بعد نقشے بنائے جائیں، جغرافیائی نقشے۔ اور ان کو پیش نظر رکھ کر آئندہ کی کارروائی کے منصوبے تیار ہوں۔ منصوبوں کے لحاظ سے نقشوں میں کوئی جگہ ایسی نہ رہ جائے جہاں مسلمانوں کی معقول آبادی کے باوجود دینی تعلیم کا بندوبست نہ ہو۔ نقشہ کی خالی جگہوں کو کتنے وقت میں پُر کرنا ہے اس کا انحصار آپ کے حوصلے پر ہوگا۔ حوصلہ اگر ہے تو وسائل کی کمی کبھی سدّراہ نہیں ہوتی۔

پایانِ گفتگو میں اجازت دیجیے کہ میں اپنے معروضات کو دہرادوں۔ دینی تعلیم پر ہماری بقا، پیش رفت، اور عزتِ نفس کا انحصار ہے۔ ہمیں اس کے پیغام کو عام کرنا چاہیئے اور اس کی کامیابی اور توسیع کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا چاہیے۔ دینی تعلیم کے نصاب میں عبادات وعقاید کے علاوہ اطوار، اخلاق اور اقدار پر

زور دیا جائے۔ دینی تعلیمی نظام اور مروجہ نظام میں تال میل کی سبیل نکالی جائے تاکہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مروجہ تعلیمی رَو میں شریک ہونا دشوار نہ ہو۔ دینی تعلیمی جز وقتی اور مراسلاتی فیوض کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لے۔ منصوبہ بندی سے آلات وادوات اور اس کی تکنیک کا استعمال اس طرح سے کیا جائے کہ نشانول تک پہنچنے اور غلطیوں اور کمیوں کو دور کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ تعلیم کے مختلف طریقوں نے ملت کو دونیم کر دیا ہے، اس خلیج کو پاٹنے کی ضرورت ہے۔ تمام اسکولوں میں تعلیم پانے والے بچوں کو جز وقتی تعلیم دینے کی اہمیت شایانِ التفات ہے۔ والدین اور معلّمین کی تربیت کو دینی تعلیم کا اہم جز سمجھنا چاہیے۔

نشانوں کا تعین، منصوبوں کی تشکیل، پیشرفت کا جائزہ، شرح ترقی کی رفتار یہ سب امور توجہ کے جویا ہیں۔ مزید ترقی اور توسیع میں یہ انداز کار شاید معاون ہو۔

ہم ان صاحبدلوں اور ان کارگزار دردمندوں کو خراج تشکر اور نذرانۂ عقیدت ادا کرتے ہیں جنھوں نے اس تحریک کو شروع کیا، چلایا اور آگے بڑھایا۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ جو مہم ہمیں سر کرنی ہے، جو قلمرو ہمیں تسخیر کرنی ہے ابھی ہم اس کے حاشیہ پر ہیں۔ جتنا کام ہوا ہے اس کا ہزار ہا گنا کام ابھی کرنے کو ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں، ہم میں سے ہر مرد و زن کو توفیق عطا فرمائے کہ اپنی ذمّہ داری کو محسوس کریں۔ اپنے فرض کو ادا کریں۔ شکم پُری کو جو پائے بھی کر لیتے ہیں، ہمیں اس حالت سے اُوپر اٹھنا ہے، دوسروں کے درد کو اپنے دل میں جگہ دینا ہے۔ ہمیں ہدایت اور روشنی کی شعاعوں کو جذب کرنا ہے اور گرد و پیش کو ان سے مستنیر کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہم نصرت کے طالب ہیں۔ وہ منظر ہماری نگاہوں کے سامنے ہے:

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا	جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے اور آپ دیکھ لیں کہ لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں، تو اپنے رب کی حمد کیساتھ اسکی تسبیح کیجیے اور اس سے مغفرت کی دعا مانگیے۔ وہ بیشک توبہ قبول کرنیوالا ہے

اللہ تعالیٰ ہمیں توبہ کی توفیق عطا فرما تاکہ ہمیں اپنی کوتاہیوں کا احساس اور جبیں کی پشیمانی مضطرب اور سرگرم عمل کر دے۔ اللہ تعالیٰ دینی تعلیم کے میدان میں انسانوں کو جوق در جوق داخل فرما! خدایا انسان دوستی، دردمندی، دینی غیرت اور دینی آگاہی کی اس مہم کے فیوض کو عام کر دے!!

●●

سیّد احمد خاں کی یاد میں

سیّد احمد خاں علیہ الرحمہ کی شخصیت ہشت پہلو تھی۔ انھوں نے اپنی ذات میں بہت سی حیثیتوں کو جمع کر لیا تھا اور ہر حیثیت میں امتیاز اور اختصاص حاصل کیا تھا۔

اس وقت میں ان کے صرف ایک وصف کا ذکر کروں گا۔ یہ تھی ان کی فراست اور حکمتِ عملی، ہر مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر اور تحقیق کی عادت۔ اس میں وہ اسلام سے بہت قریب تھے اور ہندوستانی مسلمانوں سے بہت دور۔ یہ کہنا چنداں ضروری نہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں نے جذبات کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ ذرا سی تحریک ہوئی اور وہ جذبات کی رَو میں بہ گئے۔ جذبات سے عقل کا آئینہ دھندلا ہو جاتا ہے اور سوچنے سمجھنے کی طاقت کمزور پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ جذباتی انسان کے لئے نفع و نقصان اور دوست دشمن کی شناخت بھی دشوار ہو جاتی ہے۔ ایسے انسان کو ہر وقت بہکایا جا سکتا ہے۔ وہ جذبات کے سیلاب میں بہتا ہے اور عقل پر ضرب نہیں پڑنے دیتا۔ وہ سوچ کر نہ منصوبہ بنا سکتا ہے نہ لگ کر محنت کر سکتا ہے۔ جذبہ کی رَو میں اس سے وہ باتیں سرزد ہو جاتی ہیں جن سے اسے بالآخر نقصان ہی پہنچتا ہے اور جن پر اسے اکثر پشیمان ہونا پڑتا ہے۔ جذباتی آدمی کی شخصیت، وزن، وقار، ریاضت اور استقامت سے محروم رہتی ہے۔ وہ شعر کہہ سکتا ہے، شاعری سے حظ اندوز ہو سکتا ہے۔ لیکن جستجو اور تحقیق، سائنس اور علم اس کی دسترس سے باہر رہتے ہیں۔

سیّد احمد خاں نے سائنسی اور علمی طرزِ فکر پہ زور دیا۔ اس سے ان کا مقصد نہ صرف یہ تھا کہ مسلمان جدید علوم سے بہرہ وَر اور زمانہ سے ہم آہنگ ہو سکیں، بلکہ یہ بھی کہ ان میں سوجھ بوجھ کا مادہ اور نفع نقصان اور اچھائی بُرائی کو پرکھنے کی صفت پیدا ہو سکے۔ وہ جوش کی ناہموار زمین سے نکل کر ہوش کی ہموار شاہراہ پر قدم رکھ سکیں۔

افسوس یہ ہے کہ اس بڑے مصلح کو اپنے اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی اور ہندوستانی مسلمان اپنے آپ کو جذبات کے شکنجے سے نہ نکال سکے۔ انھوں نے عقل اور تحقیق، جستجو اور تفتیش اور غور و خوض کا خیر مقدم کبھی نہ کیا۔ انھیں کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ کہرے میں نگاہ کی پہنچ کتنی محدود ہو جاتی ہے اور جذبہ اور جوش میں چند قدم

دُور کی چیز بھی صاف نظر نہیں آتی ۔ انھوں نے دلفریب ابہام اور عقل آشوب جذبات اور نعروں سے ناتا جوڑ لیا اور بقا اور ترقی اور روشنی کو پس پشت ڈال دیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمت اور ریاضت کے علاوہ ایک بہت بڑا سبق جو ہم سید احمد خاں سے لے سکتے ہیں وہ ہر بات اور ہر مسئلہ کو ٹھنڈے دل سے عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی عادت ہے ۔

چونکہ ہم نے یہ سبق سیکھنے سے انکار کر دیا اس لئے سرسید کو چھوڑ کر ہمارے بیشتر رہنما جذبات میں بہتے بھی ہیں اور جذبات سے اپیل کرتے ہیں ۔ جذبات کا تسلط خامکاری کی دلیل ہے ۔ ایسا انسان ہمیشہ دوسروں سے دھوکا کھاتا ہے اور اکثر خود کو دھوکا دیتا بھی ہے۔

سید احمد خاں کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ جذبات سے انسان عاری ہو جائے ۔ جذبات ہی سے زندگی میں حرکت اور آب و رنگ آتا ہے ۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ جذبات پر انسان حکومت کرے، ان کا محکوم نہ بنے ۔ انھوں نے ایک مرکزی جذبے سے رشتہ جوڑ لیا تھا، قوم کی محبت اور اس کی ترقی کی آرزو ۔ اس کے بعد انھوں نے عقل سے پوچھا کہ حصول مقصد کے لئے کیا کیا جائے اور عقل کی رہبری میں انھوں نے منزل طے کی ۔ اقبالؒ نے جو یہ کہا ہے :

وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام ⁘ کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

اس کا مفہوم بھی سید عالی گہر کے مسلک سے ملتا جلتا ہے کہ ایک شریف جذبہ، ایک اعلیٰ مقصد کو زندگی بنالو اور عقل کی روشنی میں اس کے حصول کی تمام عمر کوشش کرتے رہو۔

بس میرے عزیزو ! چھوٹا منہ، بڑی بات، میری گزارش بھی تم سے وہی ہے جو اس کے بانی نے اپنی قوم سے کی تھی کہ مایوسی، اور بے حسی، غم و غصہ، قدامت پرستی اور جمود سے ناتا توڑ کر جستجو، تحقیق اور زمانہ سے ہم آہنگی اور شرافت سے دلبستگی اور عقل کی روشنی میں مسائل کو جانچنے کی عادت ڈالیں ۔ جذبات کو ایک طرف عقل اور دوسری طرف ضمیر کے قابو میں رکھیں اور انفرادی مفاد کو اجتماعی مفاد پر ترجیح دینا ترک کر دیں ۔

●●

سر سید احمد خاں

ایک مستقل سرچشمۂ فیض

انسانی دنیا میں اکثر ایسے رہنما ہوتے ہیں جن کی معنویت ان کی زندگی ہی میں ان سے جدا ہوجاتی ہے۔ زمانہ کی سازگار ہوا کے جھونکے انھیں امتیازی درجہ عطا کردیتے ہیں۔ مگر یہ امتیازی درجہ بہت جلد ان سے منھ موڑ لیتا ہے۔ جب ان کی شہرت درجۂ کمال میں پہنچ جاتی ہے، اس وقت کوئی شخص تصور بھی نہیں کرسکتا کہ یہ شہرت اتنی جلد زوال پذیر ہوگی۔ کچھ ایسے رہنما بھی ہوتے ہیں جن کی شہرت نسبتاً پائدار ہوتی ہے۔ ان کی شہرت اور معنویت کی حیثیت عارضی نقش کی طرح نہیں ہوتی۔ انکی موت کے بعد ایک نسل یا دو نسل تک ان کا ذکرِ خیر باقی رہتا ہے۔ بعدازاں رفتہ رفتہ ان کی شہرت معدوم ہونے لگتی ہے۔ کچھ رہنما ایسے بھی ہوتے ہیں جو زندۂ جاوید قرار پاتے ہیں۔ ایک احسان مند طبقہ کے ذہن میں ان کی یادیں محفوظ رہتی ہیں، خواہ صدیاں گزر جائیں مگر ان کی قوتِ معنویت اور ان کی چمک ختم نہیں ہوتی۔ ان پر فرسودگی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں میں ایک بنیادی خصوصیت ہوتی ہے۔ وہ لوگ اپنی ذہنی ساخت کے اعتبار سے ٹھوس قدروں کے حامل ہوتے ہیں اور ان میں بہت سی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی بڑی سکت ہوتی ہے۔ بنابریں وہ لافانی ہوجاتے ہیں۔ وہ لوگ چونکہ غیر فانی اور محکم اصولوں کی نمائندگی کرتے ہیں اس لئے ان کی عظمت مرورِ ایام سے متاثر نہیں ہوتی۔ وہ عہد ساز ہوتے ہیں اور ان کی معنویت اپنے عہد سے آگے متجاوز ہوتی ہے۔ ایسے ہی ایک انسان سر سید احمد خاں تھے۔ وہ لافانی ہیں کیونکہ انھوں نے ایک قوم کی فکر کو بدل کر رکھ دیا۔ اسے قعرِ مذلت سے نکالا۔ اسے زمانۂ حال میں جینا سکھایا اور مستقبل کو سنوارنے کا حوصلہ بخشا۔ عصرِ جدید میں ہندوستان نے ان جیسے چند ہی بلند قامت لوگ پیدا کیے ہیں۔ وہ درحقیقت عہدِ حاضر کے سب سے زیادہ قدآور ہندوستانی مسلمان ہیں۔ وہ اپنے زمانے کے انسانوں میں ایک بطلِ جلیل تھے۔ جو لوگ ان کے بعد آئے وہ قد و قامت میں ان سے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی خوبیوں میں سے ایک خوبی ان کی عقل کا عملی رجحان ہے۔ ان کی بصیرت کا اندازہ اس وقت ہوتا تھا جب حالات اور

حقائق سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت کے اظہار کا موقع ہو۔ ایسے موقع پر ان کی بصیرت تخلیقی عمل کی صورت اختیار کر لیتی تھی اور اس سے حالات میں تبدیلی رونما ہوتی تھی۔ آیئے ہم غور کریں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ حالات میں سرسید احمد خاں کا کیا ردعمل ہوتا۔ ہمیں موجودہ حالات کا جائزہ لینا چاہیئے :

اوّلاً یہ کہ ہندوستانی مسلمان ایک ایسے گھر کی مانند ہے، جس کے رہنے والوں میں شدید اختلاف ہو۔ یہ ایک ایسی جماعت ہے جو تعلیمی لحاظ سے عمودی شکل میں تفرقہ سے دوچار ہے۔

(الف) کچھ لوگ جدید تعلیم سے آراستہ ہیں۔

(ب) کچھ لوگ روایتی طریقہ سے تعلیم حاصل کئے ہوئے ہیں۔ مؤخرالذکر لوگوں کو غیر تعلیم یافتہ عوام کا کلی طور پر اعتماد و تعاون حاصل ہے۔

ثانیاً یہ کہ ایسا لگتا ہے کہ سرسید احمد خاں کی تحریک ختم ہو چکی ہے اور مسلمان اپنے آپ کو تعلیم کی انتہا پر پہنچا ہوا سمجھ رہے ہیں۔

ثالثاً یہ کہ مسلمان، معاشی اعتبار سے پسماندہ ہیں۔ تجارت میں ان کا حصہ، ملک کی آبادی میں ان کے تناسب کے لحاظ سے کم ہے۔ ملک کے صنعتی نقشہ پر بھی ان کا نام نمایاں نہیں ہے۔ مختلف پیشوں میں ان کی نمائندگی تقریباً برائے نام ہے۔ حکومت کے دفتروں میں خواہ پالیسی سازی کے شعبے میں ہوں، یا احکام کے نفاذ سے متعلق ادارے میں ہوں، ان کا کوئی شمار نہیں۔ منظم پرائیویٹ سیکٹر اور پبلک سیکٹر میں ان کو ملازمتوں کے مواقع حاصل نہیں ہیں۔

رابعاً یہ کہ جہاں تک ان کے طرز عمل کا تعلق ہے وہ زیادہ حسیاتی اور جذباتی ہے، عقل پسندانہ اور دانش مندانہ کم۔ اگر اس رفتار سے مقابلہ کیا جائے جو باقی معاشرہ کی ہے، تو معلوم ہوگا کہ ہندوستانی مسلمان رینگ رہے ہیں۔ وہ ان تمام تر وسیع ذرائع و وسائل سے جو ملک کی ترقی میں استعمال کئے جاتے ہیں، پورا فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں۔ ملک کی تقسیم سے ان کا اعتماد مجروح ہو گیا۔ ایک نئی نسل تقسیم ملک کے ایک عرصہ کے بعد پوری خود اعتمادی اور خودداری کے ساتھ ابھر کر سامنے آئی ہے۔ بدقسمتی سے خود اعتمادی بھی بسا اوقات فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے مجروح ہو جاتی ہے۔ یہ فرقہ وارانہ فسادات ہی ملک کی پیش رفت میں حصہ لینے اور ملک کی کامیابیوں پر فخر و ناز کرنے سے مسلمانوں کو روکتے ہیں۔ مسلم جماعت کے منظم اور معتبر رائے عامّہ کا اثاثہ نہیں اور نہ اسے پختہ کار قیادت مل رہی ہے۔ قیادت کو ملت کے ذہن کا

صحیح اندازہ نہیں۔ یہ قیادت جو ملّت کو حاصل ہے عارضی فوائد کو مستقل مفادات پر ترجیح دیتی ہے۔ محرومیوں
اور ناکامیوں کی صورت میں یہ اپنے خول میں چھپ جاتی ہے، ورنہ تنگ نظر ہوکر یہ دیکھنے لگتی ہے کہ حالات
اس کے سخت ناموافق ہیں اور یہ کہ اسے اس کا حق کبھی نہیں مل پائے گا۔ سیّد احمد خاں ایسی صورت میں کیا کرتے؟
وہ ہندوستانی مسلمانوں کو یہی مشورہ دیتے کہ وہ باعزت طریقہ پر حکومت اور بدلے ہوئے حالات سے سمجھوتا
کریں۔ وہ ان کو غم و غصہ اور جذبات کے جوش و خروش کی صلاح نہیں دیتے۔ بلکہ وہ خود اعتمادی اور امید کے
ساتھ حالات کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے۔ وہ اس نکتہ کو سمجھاتے کہ شکایات کا پیچ در پیچ سلسلہ خواہ کتنی ہی
مستحکم بنیادوں پر مبنی ہو، مریضانہ ذہنیت اور منفی رویہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ انھیں تنبیہ کرتے کہ یہ "بڑبڑانا
کیسا! یہ کراہنے کی آواز کیسی؟ کیوں حالات کا بار دیگر اندازہ نہیں لگاتے۔ کیوں دونوں ہاتھوں میں
قوت پیدا نہیں کرتے، کیوں اعلان نہیں کرتے ان حقوق کا جو تمھارے ہیں؛ کیوں اعلان نہیں کرتے اپنے
حقوق کا مناسب اجتماعات میں؛ بغیر کسی عناد و عداوت کے اپنے حقوق مانگو، عظیم قوم کے حصہ دار کی حیثیت
سے اپنے حقوق طلب کرو۔ اپنے حقوق کا مطالبہ جاری رکھو۔ ہر وقت اور ہر حالت میں سخت مقابلہ کی دنیا
میں سبقت لے جانے کے لئے تیاریاں کرتے رہو۔" وہ موجودہ حکومت اور اکثریتی فرقہ کے سامنے اتنی ہی
صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے جتنا کہ انھوں نے حکومت برطانیہ کے روبرو کیا۔ وہ ان سے کہہ ڈالتے کہ ہندوستانی
مسلمان ہندوستان کی آبادی کا ایک خاصا بڑا حصہ ہیں۔ اگر وہ پس ماندہ اور جمود کا شکار رہے تو ملک کی
ترقی کے لئے رکاوٹ ثابت ہوں گے۔ اگر انھوں نے ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینے کا احساس کھو دیا تو
سیکولرازم کے تمام دعوے اور دستور کی جملہ ضمانتیں بے معنی ہوکر رہ جائیں گی۔ اس لئے قوم کے وسیع تر
مفاد کے پیش نظر انھیں ملک میں وہ تمام سہولتیں اور امدادیں دینی ہوں گی، جو ترقی پذیر ممالک طلب
کرتے رہے ہیں اور کسی نہ کسی حد تک ترقی یافتہ ممالک سے پاتے بھی رہے ہیں۔ وہ اس حقیقت پر زور
دیتے کہ ترقی کی رفتار اپنے آپ میں نہایت بے رحم ہوتی ہے جو اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں وہ اور زیادہ
پیچھے رہ جاتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ دوڑ میں آگے بڑھنے والوں کے برابر پہنچ جانے سے ناامید ہو جاتے
ہیں اور پھر کوشش بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ وہ اپنے ترغیب آمیز دلائل کے ساتھ بحث کرکے واضح کر دیتے
کہ انھیں مشترکہ کامیابیوں کی سطح تک لانے کے لئے مخصوص کوشش کی جائیں۔ وہ پھر اپنے ہم مذہبوں
کی طرف متوجہ ہوتے اور ان سے جذبات و تعصبات کو ترک کر دینے کا مطالبہ کرتے، کیونکہ یہ بصیرت

کی روشنی کو دھندلا کر دیتے ہیں۔ وہ ضرورت ظاہر کرتے ٹھنڈے دل اور کھلی ہوئی آنکھوں سے جائزہ لینے کی۔ جوشیلے نعرے اور گروہی تعصبات سے مملو کلمات، جذبات کو برانگیختہ ضرور کر سکتے ہیں اور خون کے دوران کو تیز تر کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ کسی جماعت کے معیاروں کو ملند کر سکتے ہیں، نہ اس کی نزاکت میں اضافہ۔ وہ ان سے برابر یہ کہتے رہتے کہ یہ زمانہ عقل و دانش کا ہے، ابلاغ و ترسیل کا ہے اور سائنس و ٹکنالوجی کا ہے۔ جو لوگ زمانہ کے ان تقاضوں کو نظرانداز کر رہے ہیں، وہ دنیا سے نیست و نابود ہونے کا مختصر ترین راستہ اختیار کر رہے ہیں۔ زبان کے اشتعال انگیز مسئلہ کے متعلق وہ کثیر الاوصاف نابغۂ عصر وہ جدید اردو نثر کا موجدِ اولیں، وہ صاحب طرز انشا پرداز جس کی انشا پردازی سے آج بھی اردو مالا مال ہے، ہندی میں کمال قابلیت حاصل کرنے پر اتنا ہی زور دیتا جتنا کہ اس نے اپنے وقت میں انگریزی پر دیا تھا۔ وہ مسلمانوں کو مسلسل یہی مشورہ دیتے کہ اکثریتی فرقہ سے اپنے تعلقات بہتر سے بہتر بناؤ، اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ صلح و آشتی کے ماحول میں زندگی گزارو اور باہمی عزت و احترام کی فضا پیدا کرو، تاکہ مشترکہ مقاصد حاصل ہو سکیں۔

وہ اپنے یہی مشورے دوسرے فرقہ کو بھی دیتے جنھیں ادب و احترام کے ساتھ سماعت کیا جاتا۔ کیونکہ بڑے انسانوں پر کسی ایک جماعت کا اجارہ نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ کوئی ایک ملک بھی ان کا اجارہ دار نہیں بن سکتا۔ کیونکہ عقل و حکمت کی ترغیب انگیز صدا اور اخلاص کی بے خطا مضراب سے ایک عالم کے دلوں کے تار جھنجھنانے لگتے ہیں۔

یہ یقینی بات ہے کہ سید احمد خاں تعلیمی اور سماجی ترقی کی عظیم تحریک کا احیا کرتے جو کہ افسوس ہے ان کی موت کے کچھ عرصہ کے بعد ہی اپنا اثر کھو بیٹھی۔ وہ اس تحریک کو نقطۂ عروج تک پہنچانے کے لئے اپنی جبلی توانائی کے ساتھ سرگرم عمل ہو جاتے اور پورے ملک کو اس کی لپیٹ میں لے لیتے۔ چونکہ اس راہ کی رکاوٹیں ان کی زندگی ہی میں دور ہو چکی تھیں۔ اس لئے تعلیمی و سماجی اصلاح کی یہ تحریک اب تک بہت زیادہ ترقی کر چکی ہوتی۔ اہل نظر کی تنقیدی رائے یہ ہے کہ جو عظیم کام سید احمد خاں نے تقریباً تنہا اور کر اس قدر کامیابی کے ساتھ پورا کر دکھایا، اس کے مقابلہ میں آسان تر کام بھی ملک کے سب مسلمان وہ تمام کر انجام نہ دے سکے۔ انھوں نے سید مرحوم کی تحریک کے چشمۂ رواں کو جاری رکھنا تو کجا، نہایت بے اعتنائی سے اسے خشک ہو جانے دیا۔ سید احمد خاں مسلمانوں کو تنبیہ کرتے کہ وہ روٹی کے ٹکڑوں کے لئے بھیک نہ مانگیں، بلکہ خود اعتمادی، بے نیازی،

اور بے لچک آزادی کا ثبوت دیں۔ وہ انھیں سستی، کاہلی، اوہام پرستی، تنگ نظری، عدم بیزاری، نا اتفاقی، ہلاکت آفرینی، خود غرضی، کوتاہ اندیشانہ تعصب پسندی اور کینہ پروری سے بچنا چھڑانے کی ہدایت کرتے۔
اس میں ذرا شک وشبہ نہیں کہ وہ ان دُو طبقوں کے درمیان حائل خلیج کو کم سے کم کرنے کی کوشش کرتے جن میں مسلم جماعت بٹی ہوئی ہے۔ یہ کام وہ اس طرح انجام دیتے کہ اولاً نصاب تعلیم کی تجدید و اصلاح کرتے اور ثانیاً وہ ایک جزووقتی تدریس کی تحریک شروع کرتے۔ یہ جزووقتی تدریس کی تحریک عبادت ہوتی تکملے یا ضمیمے کے طور پر پڑھائی سے، جس سے پڑھنے والوں کی معلومات میں نئے اضافے ہوتے۔ جہاں تک ملازمتوں کا تعلق ہے وہ قومی وسائل دولت کے نظم ونسق سے مختلف سیکڑوں کے ملازمت دینے والوں سے رابطہ قائم کرتے اور بحث و استدلال سے انھیں وسیع تر قومی مفاد کے پیش نظر مسلمانوں کو ملازمتیں دینے کی افادیت سمجھاتے۔ وہ اپنے وسیع تر ذہنی ذخیرہ میں محفوظ سارے دلائل و براہین ارباب حکومت کو یہ جتانے اور منوانے میں صرف کر دیتے کہ مسلمانوں کو ایک قابل لحاظ تناسب کے ساتھ پولیس اور فوج میں بھرتی کیا جائے، یہ فرقہ وارانہ فسادات کے بدنما داغ کو مٹانے کے لئے ایک موثر ترین قدم ہوگا۔ دوسری طرف یہ عمل مسلمانوں کو ملک کے دفاع اور اس کے باشندوں کی سلامتی کی کوششوں میں فخر و مباہات کے ساتھ شرکت کا احساس بخشے گا۔
مسلمانوں کی طرف دوبارہ نظر ڈال کر انھیں ان کے بعد ہونے والی ترقی کی روشنی میں ٹکنیکل ایجوکیشن پر زور دینا پڑتا اور لڑکیوں کی تعلیم پہ بھی اپنی توجہ مرکوز کرنا ہوتی جسے وہ فی الواقع نظر انداز کر گئے تھے۔ انھیں ان کی اس بھول کی وجہ سے ہدف تنقید بنایا جاتا رہا ہے۔ یہ درحقیقت ان کی عملیت پسندی، عقل اور ان کے کبھی نہ خطا کرنے والے عصری شعور کا مظہر ہے۔ اسی طرح وہ بہت جلد اپنے بنائے ہوئے ادارہ کے مصنوعی تکلفات سے آراستہ کردار کو بھی خیرباد کہہ دیتے۔ کیونکہ اس طرح کے کردار سے شخصیت میں توانائی نہیں آتی۔ وہ یونیورسٹی سے یہ امید کرتے کہ اس کی خدمات اور اثرات کی روشنی قرب و جوار کے علاقے میں بھی پھیلے۔ وہ تعلیمی معیار کے گر جانے پر غضبناک ہوتے اور وہ نئے داخلوں کی کثرت کو مطمح نظر بنانے اور اس وجہ سے استعداد میں تخفیف کرنے پر سخت برہم ہوتے۔ وہ تعقل سے گریز اور تفکر سے فرار کی وجہ سے بجد رنجیدہ ہوتے۔ اس گریز و فرار کی وکالت جن شواہد و دلائل سے کی جاتی ہے، انھیں انکی نظر نہیں تسلیم کرتی۔

ہر شخص غیر محدود طور پر تصور کر سکتا ہے کہ سید احمد خاں کا ردِ عمل، موجودہ حالت میں کیا ہوتا۔
یہ ان کی عظمت کا پیمانہ ہے کہ ان کے کارناموں کی عمر زیادہ ہو جانے کے باوجود آج بھی ہر شخص انھیں کی طرف دیکھتا ہے اور یقین کے ساتھ جان سکتا ہے کہ اگر وہ ہوتے تو کس طرح آگے بڑھتے اور یہ کہ ان کا طریقِ فکر و عمل آج کے زمانے سے بھی مربوط ہے۔ یہ عمل پسند عقل کا جوہرِ اصلی ہے۔ یہ نظر ہے جو نظریۂ عملیت کی حامل ہے۔ یہ فکر و تعقل ہے جس میں ہمدردی اور محبت کا امتزاج ہے۔ یہ کوشش ہے دوسرے انسان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی اور اپنے نقطۂ کو سمجھانے کی۔ یہ کاوش ہے مفاہمت اور ہم آہنگی کو بڑھاوا دینے کی اور علم و آگہی کو پھیلانے کی۔

سید احمد خاں فرشتہ نہ تھے۔ انھوں نے غلطیاں بھی کی ہیں۔ یہ غلطیاں رائے زنی سے متعلق ہیں، یا زورِ احساس و عمل سے، تاہم یہ ان کے کمالِ بصیرت کو متاثر نہیں کرتیں۔ یہ انھیں اس راستے سے منحرف نہیں کرتیں جو انھوں نے ذہن کی صفائی اور صحتِ فکر کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ یہ راستہ امن و آشتی، ترقی و بہبود، خود اعتمادی و خودداری اور علم پروری و بیداری کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

●●

ناموں میں کیا رکھا ہے

سرخی صورتِ سوال ہے۔ جواب ملے گا "بہت کچھ"۔ افراد کو چھوڑیے، اداروں پر نظر ڈالیے، ان کے ناموں سے نام رکھنے والوں کی ذہنیت اور طرزِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔

سماج نے ایک ادارہ کو پاگل خانہ کا نام دیا تھا۔ یعنی پاگلوں کا گھر"۔ اس نام میں تضحیک اور تحقیر ملے گی۔ ہمدردی اور انسانیت اور رحم دور، دور تک نظر نہ آئے گا۔ گویا بیچارے پاگل، انسان نہیں، جانور ہیں۔ یہ نام سُن کر وہ سماں سامنے آجاتا ہے کہ پھٹے کپڑوں میں ایک سہما ہوا انسان جس کی آنکھوں سے خوف اور دہشت ٹپک رہی ہے، بھاگا ہوا جا رہا ہے اور لڑکے پتھروں اور آوازوں سے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ یہ سماں عبرت ناک ہے اور شرمناک بھی۔ ظالم سماج نے پہلے تو ایک فرد پر ظلم ڈھا کر اس کے دماغی توازن کو برباد کر دیا اور پھر اس خطا پر کہ وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے، وہی سماج شکاری کتوں کی طرح اس کے پیچھے پڑ گیا۔ ذہن روم کے باشندوں کی اس شیطانی تفریح کی طرف جاتا ہے کہ جب کسی شخص خصوصاً نچلے طبقہ کے فرد نے قواعد کی خلاف ورزی کی یا استبداد کے خلاف سر اُٹھایا، اس کو بھوکے شیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور "ایمفی تھیٹر" میں بیٹھے ہوئے ہزارہا انسان اس منظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں کہ سہمے ہوئے آدمی کو شیر کس طرح چشم زدن میں پھاڑ کھاتا ہے، ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

انوکھی بات ہے، الفاظ کی ترتیب سے ان کے مفاہیم میں تبدیلی آجاتی ہے۔ "خانہ" اگر کسی ترکیب کا آخری جزو ہو تو اس میں بسا اوقات اس میں ایک پہلو تحقیر یا بُرائی کا آجاتا ہے۔ مثلاً: شراب خانہ، پاگل خانہ، قحبہ خانہ (کبھی کبھی نہیں بھی آتا ہے۔ جیسے: دواخانہ، شفاخانہ)

جسے پاگل خانہ کہا جاتا تھا، اسے اب "دماغی ہسپتال" کہنے لگے ہیں۔ کیا نام یہ بتاتا ہے کہ سماج اب ان لوگوں کو جو ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں، حقارت اور بربیت کے ساتھ نہیں دیکھتا۔ اسے احساس ہے کہ جو لوگ پاگل ہیں وہ گنہگار نہیں ہیں۔ گنہگار اور ذمّہ دار خود سماج ہے اور سماج

پر اس کی ذمّہ داری ہے کہ ان کے ساتھ انسانیت اور رحم کا برتاؤ کرے اور ان کا علاج کرائے اور انھیں ہوش و حواس کے دیار میں واپس لاکر آباد کرے۔

آج کی صحبت میں ہم صرف ایک اور نام کا ذکر کریں گے۔ یتیم خانہ، یعنی یتیموں کے رہنے کی جگہ۔ ہندی میں اسے اناتھالیہ (अनाथ आलय) اور انگریزی میں (ORPHANAGE) کہتے ہیں۔ ان سب میں تحقیر اور تحقیر نہیں تو بے چینی اور بے تعلقی کا شائبہ ملتا ہے۔ یہ نام اس مکان کے مکینوں کو عام انسانوں کے حلقے سے نکال باہر کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسی ادارہ کے لیے ایک دوسرا نام سنیے۔ "بچوں کا گھر"! کتنا اچھا اور پیارا نام ہے یہ۔ جو بچے بچوں کے گھر میں رہتے ہیں، ان کو یہ احساس ہوتا ہوگا کہ وہ اپنے گھر میں رہ رہے ہیں۔ وہ بے آسرا اور بے سہارا یتیم نہیں، جیسے اور بچے ہیں، ویسے ہی وہ ہیں۔ دنیا ان کے ساتھ دوسرے بچوں کا سا برتاؤ کرتی ہے۔ ان کے لیے بھی وہی امکانات ہیں جو دوسرے بچوں کے لیے۔ دیکھیے ان بچوں کی نفسیات پر، جو اس ادارہ میں پلے بڑھیں گے اور خود سماج کے نقطۂ نگاہ سے اس نام کا کتنا اچھا اثر پڑے گا۔ نام میں بہت کچھ رکھا ہے۔ سعدی کا قطعہ یاد آ رہا ہے:

پدر مردہ را سایہ بر سر فگن — غبارش بیفشان و خاکش بکن

جس بچے کا باپ نہ رہا ہو، اس پر اپنی شفقت سے سایہ کرو۔ اس کے غبار کو جھاڑ دو اور اس کی خاک کو دور کر دو۔ غبار اور خاک سے یہاں دل اور جسم دونوں کی طرف اشارہ ہے۔

ان سطور کا آغاز سوال اور جواب سے ہوا تھا۔ مناسب ہے اگر انجام بھی اسی پر ہو۔ آپ بتا سکتے ہیں جس ادارہ کو ہم بے دردی اور بےحسی سے یتیم خانہ کہتے ہیں، اُسے "بچوں کا گھر" جیسا محبت بھرا نام جس شخص نے دیا، خود اس کا نام کیا تھا؟

جواب: "ذاکر صاحب"

شیکسپیئر کے چار بڑے اَلمیے "ہیملٹ"، "میکبتھ"، "اوتھیلو"، اور "کنگ لیئر" ہیں۔ لوح کی محبت آخر الذکر کے لیے وقف ہے۔

شاہ لیئر کی تین بیٹیاں ہیں: گونیرل، ریگن، کارڈیلیا۔ اولاد نرینہ نہ ہونے کا اُسے غم بھی نہیں۔ اُس کی بیٹیاں اُسے چاہتی ہیں اور وہ بھی اُن سے محبت کرتا ہے، اور کارڈیلیا سے سب سے زیادہ۔ گونیرل اور ریگن کی شادی ہو چکی ہے، کارڈیلیا کی ہونا باقی ہے۔ دو شاہی پیام زیرِ غور ہیں۔ خواستگار خود حاضر ہیں۔

لیئر زندگی کی اس منزل میں پہنچ گیا تھا جب انسان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے چنانچہ اُس نے یہ ٹھان لی کہ راج کاج اولاد کے حوالے کر دے۔ ایک روز اس نے تینوں بیٹیوں کو بُلایا اور دل کی بات اُن کے سامنے رکھی۔ "آپ جانتے ہیں کہ ہر انسان کے دل میں چاہے جانے کی آرزو ہوتی ہے۔ لیئر جو ایک زبردست اُولوالعزم اور مضبوط اور عالی حوصلہ اور رُوئیں تن بادشاہ تھا وہ بھی اِس انسانی کمزوری سے نہ بچ سکا۔ ملک تقسیم کرنے سے پہلے اُس نے کہا آؤ دیکھیں ہماری بیٹیاں ہمیں کتنا چاہتی ہیں اور کون سب سے زیادہ چاہتی ہے، اسی حساب سے وہ ملک کے حصے بخرے کرے گا۔

وہ اسے کتنا چاہتی ہے؟ اس سوال کے جواب میں گونیرل نے کہا کہ "وہ اسے ہر شئے سے زیادہ چاہتی ہے، بینائی اور آزادی سے بھی زیادہ۔ دنیا میں کوئی اُس کو اس قدر عزیز نہیں، جتنا اس کا چہیتا باپ" ریگن نے پہلے پر دہلا لگایا، گویا باپ کے بغیر زندگی بے کار ہے۔ باری اب چہیتی بیٹی کارڈیلیا کی تھی۔

اس نے کہا "میں آپ سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں، جتنی ایک بیٹی کو باپ سے کرنی چاہیے نہ کم نہ زیادہ" یہ سننا تھا کہ تندخو بادشاہ کے بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ "دُور ہو جا میری نظروں سے۔ اب مجھے اپنی منحوس شکل نہ دکھانا" طیش میں آکر بیچاری کو ورثہ سے بھی محروم کر دیا۔ ملک بڑی اور مجھلی بیٹی کو بانٹ دیا گیا۔ لیئر نے طے کیا کہ باری باری ان کے ساتھ رہے گا۔

حکومت کا ہاتھ میں آنا تھا کہ گونیرل اور ریگن کی نگاہیں بدل گئیں۔ بے التفاتی سے شروعات

ہوئی اور اہانت، عداوت، اور ظلم و ستم پر خاتمہ۔ لیئر کو اتنے آدمی اپنے ساتھ رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان لوگوں نے گھر کے نظام اور سکون کو برہم کر دیا ہے۔" گونیرل نے جس کو باپ کی میزبانی کا شرف حاصل تھا اعتراضات کر کرکے لیئر پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ اس بیدرد نے باپ کو اس قدر ذلیل کیا کہ وہ اس کا گھر چھوڑ کر چلا گیا، انتہائی بے آبروئی کے ساتھ۔ منجھلی لڑکی کے یہاں پہنچا تو اس سے پہلے بڑی بیٹی کا پیغام پہنچ چکا تھا، وہاں بھی ٹھکانا نہ ملا اور ملا کیا تحقیر اور بیرخی۔ کل تک جو جلیل القدر بادشاہ تھا آج در در کی خاک چھان رہا تھا۔ خود اس کی بیٹیوں نے اسے راندۂ درگاہ بنا دیا۔

فراخ دل، عالی ظرف قد آور، گرجوش لیئر اپنی بڑی بیٹیوں کے تغیر رنگ، محسن کشی، وفا دشمنی اور کینہ پن کی تاب نہ لا سکا۔ ان کے ہاتھوں اہانت اور تذلیل اس سے برداشت نہ ہو سکی۔ دنیا اس کی نظروں میں تاریک ہو گئی۔ اسے باور نہ آتا کہ خود اس کی بیٹیاں جو اسی کی آنکھوں کا نور، اس کے جگر کا ٹکڑا تھیں، جو کل تک اس کی محبت کا دم بھرتی تھیں اسے اس طرح دغا دیں گی۔ محبت کا اعلان کیا سب فریب تھا؟ اس کا مقصد کیا صرف دولت اور حکومت حاصل کرنا تھا؟ لیئر کا اعتبار زندگی اور اس کی قدروں، انسان اور اس کی زبان، رشتوں اور ان کی پاکیزگی، فطرت اور اس کی استواری۔ سے بالکل اٹھ گیا۔ کوئی پر پیچ یا فریب آشنا یا دنیا دار انسان ہوتا تو اسے اولاد کی بے مہری اور محسن کشی سے اتنا دھکا نہ پہنچتا۔ لیئر سادہ دل، دیو قامت، پاک نہاد یک رخ انسان تھا۔ فریب کھانا اس کے لیے آسان تھا۔ لیکن فریب اور نمک حرامی اور احسان ناشناسی کے طشت از بام ہو جانے کے بعد اسے برداشت کر لینا لیئر کے بس کی بات نہ تھی۔ ایسا زلزلہ آیا کہ دنیا تہ و بالا ہو گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا طغیانی پر ہے۔ سمندر میں جوار بھاٹا کا سا سماں تھا۔ ایک جوالا مکھی تھا جو آگ اور لاوا اگل رہا ہو۔

لیئر کے اندر جو طوفان بپا تھا، ایسا لگتا تھا کہ اس پر فریب دنیا کو تہس نہس کر دے گا۔ اس ظالم طوفان نے دنیا کو تو تہس نہس نہیں کیا۔ لیئر کی شخصیت، اس کوہ پیکر انسان کی سالمیت کو پارہ پارہ کر دیا۔ وہ دماغی توازن کھو بیٹھا اور دیوانوں کی طرح فلک شگاف چیخیں بلند کرنے لگا۔ دھکا ایسا لگا کہ وہ چیخ اٹھا:

"اے آبشارو! اے طوفانو! پانی کے دھارے اگل ڈالو۔ ڈوب جانے دو ان میں اس قصر کے کنگروں کو۔ گندھک کے آبخرات کو بکھیرنے والی آگ اور فکر آشام شعلو اور تناور اوک

آرے کی طرح دونیم کرنے والی بجلیو! جھلس ڈالو میرے سفید سر کو۔ ——————
—— جھنجھوڑ ڈالنے والی گرج، ہلا دینے والی رعد گرد اور اس فربہ زمین کی گولائی کو پچکا کر
چورس کر دو۔"

اپنی غدار اور شقی بیٹیوں کو اس نے کوسنا اور بددعائیں دینا شروع کر دیا:

"اے احسان فراموش چڑیل! تیرے پاس دل نہیں پتھر ہے۔"

خدایا اس عورت کے رحم میں بانجھ پن کو اُتار دے اور اس میں جنم دینے والے سوتوں کو خشک کر دے۔

الٰہی اس کے ذلیل بدن سے کبھی کوئی بچہ پیدا نہ ہو، جو اُسے ماں کے پاکیزہ نام سے پکارے۔

خدا کرے کہ تیرے باپ کی بددعاؤں کے نیزے تیرے حواس کو چھید چھید کر چھلنی کر دیں"

"ریگن تو نے تیز دانتوں والی بے مہری کو گدھ کی طرح اس جگہ (اپنے دل کی طرف اشارہ کرتا ہے) باندھ رکھا ہے۔"

دنیا میں اب رہ کیا گیا تھا اور دنیا خود لیئر کے قابل کب رہی تھی۔ گھاؤ ایسا کاری لگا تھا کہ لیئر سنبھل نہ سکا۔ اس کو سنبھالنے کے لیے تھا بھی کیا؟ کوئی کام ایسا نہ تھا جسے اس نے زندگی کا مقصد بنا لیا ہو اور جو ذاتی حوادث کے لیے سپر کا کام دے سکے۔ جس کے آگے ذات اور سانحات اور واردات کی حیثیت جزئی، فروعی، ثانوی رہ جائے۔

کنگ لیئر کو اس احساس نے بھی جھنجھوڑا ہو گا، کچوکے پر کچوکے لگائے ہوں گے کہ اس کے ساتھ بے لوث، بے صدا، بے ریا محبت اس کی چھوٹی بیٹی کارڈیلیا کرتی تھی۔ وہی کارڈیلیا جس کو اس نے حق گوئی کی اتنی بڑی سزا دی تھی، جس کو اس نے ذلیل کر کے گھر سے نکال دیا تھا، جس کو وراثت سے محروم کر دیا تھا، وہی کارڈیلیا جس نے سزا کا بدلہ اس طرح دیا کہ باپ کی مصیبت کے ایام میں اپنے آپ کو اسے سنبھالنے میں مٹا دیا۔ باپ کی تالیف قلب، اس کے زخموں کا اندمال، اس کی افتاد طبع اور دماغی توازن کی بازیابی، اس کو دلاسا دینا، اُس کے ہیجان کو دور کرنا، اسے سکون پہنچانا کارڈیلیا کی زندگی اسی کوشش پر مشتمل رہ گئی تھی۔

کسی کے ساتھ احسان پر احسان کیے جائیں اور وہ جواب میں خنجر بھونک دے، اس کو برداشت کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ لیکن بہت بار ایسا ہوا ہے کہ احسان کا بدلہ اسی طرح چکایا گیا ہے۔

جب ہی تو اللہ تعالیٰ دریافت کرتا ہے :- هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ـــ احسان کا بدلہ احسان کے سوا کیا ہے !

یعنی لوگ احسان کا بدلہ احسان کے سوا چکاتے آئے ہیں اور یہ لوگ گمراہ ہیں !!

دراصل کسی انسان کو پرکھنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی احسان کر دیجیے اور پھر کچھ عرصے اس کے تیور، اس کا ردّ عمل دیکھتے رہیے، پتا چل جائے گا کہ وہ زرِ ناب ہے یا جنس کاسد، نیک طینت ہے یا کج نہاد - اگر ہماری زندگی میں احسان شناسی اور محسن کشی چند مثالوں تک محدود رہتی تو شیکسپئر جیسا عالی مرتب ڈرامہ نگار جس نے فطرت کو آئینہ دکھایا ہے اسے اپنی ایک عظیم تمثیل 'کنگ لیئر' کا موضوع نہ بناتا ۔

ایک بادشاہ کی داستان آپ سن چکے جو تخت و تاج کا وارث تھا اور جس نے پہلے تخت و تاج پر لات ماری اور اس کے بعد دنیا اور انسان اور عقل و ہوش پر۔ اب ایک ایسے بادشاہ کی کہانی سنیے جس کو تخت و تاج سے کوئی سروکار نہ تھا، لیکن جو شخصیت اور طبیعت، حوصلے اور عزائم توانائی اور صلاحیتوں میں بادشاہوں کا بادشاہ تھا۔ وہ پیدا اس وقت ہوا جبکہ ہندوستان میں مغل بادشاہت کا چل چلاؤ تھا اور ابھی اس نے اپنی نصف عمر طے کی تھی کہ ہندوستان میں انگریزی بادشاہت کا آغاز ہوا۔ لیکن نہ وہ مغل بادشاہ جس کے دربار سے وہ وابستہ تھا نہ وہ انگریز ملک جس کی حکومت سے اسے منسلک ہونا پڑا، شاہانہ قد و قامت میں اس کی حریف تھی ۔

یہ شاہ قامت انسان ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء میں دلّی میں میر متقی کے گھر میں پیدا ہوا اور وہیں پروان چڑھا۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں رہ کر اس نے اندازہ لگا لیا کہ مغل شہنشاہیت کا یہ دمِ واپسیں ہے اور مستقبل اب ان طاقتوں کے ساتھ ہے جنھوں نے مشاہدہ، تجربہ، اور غور و فکر کو شعار بنایا ہے جنھوں نے بھاپ اور بجلی کے بازوؤں پر پرواز کی ہے، جنھوں نے صنعتی انقلاب برپا کیا ہے اور جنھوں نے تجارت سے تسخیر کا کام لیا ہے ۔ وہ غدر کے پر آشوب اور حوصلہ فرسا دور سے گزرا، مسلمانوں کے ہاتھوں سے بادشاہت بھی گئی، اقتدار اور اعتماد بھی گیا، حوصلہ اور ولولہ بھی جاتا رہا ۔ اس بیدار مغز اور دُوربیں، پُر بصیرت اور درد مند انسان نے یہ ٹھان لی کہ انھیں یاس اور علاحدگی، غم اور غصّے سے نکال کر نئی صنعتی دنیا کے تقاضوں سے روشناس اور عصری ترقیوں سے ہمرکاب کرے گا۔ اس فرزانے نے، جس کی عملی بصیرت

اور دور اندیش حکمت کی ہندوستانی مسلمانوں نے کوئی دوسری مثال پیدا نہیں کی، اپنی زندگی کو دیوانہ وار ان مقاصد کے حصول کی خاطر وقف کر دیا۔ وہ اپنے وطن عزیز کو دنیا کی محفل میں عزت کا مقام دلانا چاہتا تھا اور اس کی آرزو تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو جہالت، مایوسی، تنگ نظری اور قدامت پرستی سے نکال کر علم، روشنی، خود اعتمادی اور رہم جوئی سے لیس کر دے۔ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے اسکو یہی فکر دامنگیر تھی۔ اس نے قوم کی فکر میں خود کو فنا کر دیا۔ زندگی کا کون سا شعبہ تھا جسے اس نے مسلمانوں کی اصلاح اور پیش رفت کے لیے نہ کھنگالا ہو، کون سی صعوبت تھی جسے اس نے قوم کی خاطر گوارا نہ کیا ہو۔ مدرسے قائم کیے، کالج بنایا، رسالہ نکالا، اخبار شروع کیا، سائنٹفک سوسائٹی قائم کی، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ دلی کی اسلامی تعمیرات پر ایسی کتاب لکھ ڈالی جو آج تک سند ہے۔ یہ سب کچھ اس قوم کے لیے کیا جو اس کی منظور نظر تھی۔ اس نے اسلام پر ایک مغربی مصنف کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے گھر کا سامان بیچ کر ولایت کا سفر کیا اور لائبریریوں میں مطالعہ اور تحقیق کرنے کے بعد مدلل اور مسکت جواب لکھا۔

اس احسان (اور یہاں احسان کے ساتھ ایثار بھی شامل تھا) کا جواب خدا کے اس بندے کو ایسا دیا گیا جو اس جواب سے کہیں زیادہ تلخ اور جارحانہ تھا، جس پر تلملا کر پیر بادشاہ نے اپنا دماغی توازن کھو دیا۔ قدم قدم پر اس کا مذاق اڑایا گیا۔ اسے نیچری، دہریہ، کافر و قوم فروش اور انگریز پرست بتایا گیا۔ یہاں سب سے بڑے مزاح نگار شاعر نے اپنے ترکش کے بہت سے تیروں کا ہدف سید احمد کو بنایا۔ مصلح کو مجرم، خیرخواہ کو بدخواہ قوم پرست کو خودغرض قرار دیا گیا۔ اس کی حکمت پر نکتہ چینی کی۔ اس کی نیت پر حملہ کیا۔ اس بطل جلیل نے علیگڑھ کالج کو قائم کرنے کے لیے دربدر بھیک مانگی۔ چندہ کرنے کے لیے وہ اسٹیج پر گھنگھرو باندھ کر آ گیا۔ اس نے گالیاں کھائیں، پھبتیاں سنیں، تہمتیں اٹھائیں، لیکن اُف نہیں کی۔ توازن کھونا درکنار، اس کے پائے ثبات کو جنبش [illegible]۔ اس کی استقامت پر آنچ نہیں آئی۔ اس شخص پر جس نے اپنا سارا اثاثہ قوم کے لیے برباد کر دیا تھا خیانت کا الزام لگایا گیا، اسے کافر قرار دیا گیا۔ کفر کے فتوے، پھبتی اور عداوت کی صبر شکن اور اعصاب دوز آوازیں ہر طرف سے کانوں میں آئیں۔ فضا ان آوازوں سے بھر گئی۔ کوئی اور ہوتا تو دیوار سے سر ٹکرا کر مر جاتا کہ ناسپاسوں کی تہمت اور استہزا کے ان تیروں سے نجات

پانے کا' جو کلیجہ کو چھید رہے تھے' صرف ایک ہی راستہ نظر آتا تھا، لیکن اس کے ماتھے پر شکن بھی نہیں آئی ۔ وہ اپنے دمیدہ دہن اور بے شعور اور تنگ بین نکتہ چینیوں کے سامنے ہاتھ جوڑتا اور ہاتھ پھیلاتا رہا' گڑگڑاتا رہا کہ مجھے جتنا بُرا سمجھنا چاہو' تمہیں اختیار ہے سمجھو اور کہو' لیکن خدارا اس کام میں میری یاوری کرو۔ اس نے ایم۔ اے۔ او کالج کے لیے ایسی عمارتیں بنوائیں جو آج بھی یونیورسٹی کے سر کا تاج ہیں ۔ اپنی دُور اندیش بصیرت سے کام لے کر اس نے مستقبل کا احاطہ کیا ۔ مستقبل اس کے سامنے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح تھا۔ آگے چل کر بیسویں صدی میں اقبال نے کہا :

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں   آنے والے دَور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اقبال نے آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر دیکھی یا الفاظ کے آب و رنگ سے تیار کی تھی ۔ سید احمد کی تیز اور دُور رس نگاہ نے مستقبل کی تصویر کے خدوخال کو روشن کر دیا تھا ۔ اس نے آج سے ایک سو پانچ سال پہلے ایم۔ اے۔ او کالج کے لیے زمین اور تعمیر کا اہتمام اس انداز سے کیا کہ وہ سو سال کام آئیں ۔ اس کے بعد جو لوگ آئے وہ چند سال آگے کی سوچتے رہے اور اب تو ایک عرصہ سے لمحہ بہ لمحہ جی رہے ہیں!

روایت ہے کہ سید احمد نے یہ عمارتیں باوجود اپنی کثیر اور گراں قدر مصروفیات کے خود کھڑے ہو کر بنوائیں۔ اور یہاں تک التزام کیا کہ راج ردّے میں کوئی اینٹ بھگوئے بغیر نہ لگانے پائے ۔ روزانہ صرفہ کا تفصیل کے ساتھ بنفس نفیس حساب لکھا۔ ان حسابات کے رجسٹر یونیورسٹی میں آج تک محفوظ ہیں ۔ لیکن اس عدیم المثال ریاضت' ایثار اور اخلاص اور انضباط کا جواب کیا ملا۔ کسی بے درد اور تیرہ باطن معترض نے کہا کہ عمارتیں اس لیے بنوائی جا رہی ہیں کہ اپنے لیے کچھ پیسہ انداز کرلیں۔ ظالمو! اس نے جو کچھ پس انداز کیا' آخرت کے لیے کیا ۔ حالانکہ توشۂ آخرت بھی اس کا منظور و مقصود نہ تھا ۔ اس کا مقصود صرف ایک تھا: ہندوستانی مسلمانوں میں قومی حمیت بیدار کرنا' انھیں جدید تعلیم سے سنوارنا' انھیں ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کھڑا کر دینا ۔ ان میں بھلے اور بُرے کا شعور پیدا کرنا ۔

اور جب وہ مرنے کے قریب ہوا تو خود اس کے گھر میں اس کے لیے جگہ نہ تھی ۔ دلیروں کا دلیر دل شکستہ مرا ۔

اب قارئین ہی بتائیں کہ 'کنگ لیئر' پر جو بیتی کیا وہ اس کے برابر تھی جو سید احمد پر گزری ۔ اس قوم نے جس کے لیے اس نے عمر بھر پاپڑ بیلے' ہزارہا مصیبتیں اور تکلیفیں اُٹھائیں اس قوم نے اپنے

محسن کے ساتھ کون سا ظلم تھا جو نہ کیا۔ لیکن ان محسن کشوں کی یلغار میں بھی سید احمد نے وہ دماغی توازن نہ کھویا جس سے کنگ لیر نے اپنی بڑی بیٹیوں کی بے مہری اور احسان فراموشی کے کارن ہاتھ دھو لیا تھا۔ وجہ ظاہر ہے۔ لیر نے انسانی محبت کی رسّی کو اس مضبوطی کے ساتھ نہیں پکڑا تھا جیسے سید احمد نے؛ یہی محبت آفات و احساسات کے مقابلہ میں آخرالذکر کی ڈھال بن گئی۔ لیر شاید شاہی آن بان کے احساس کو یکسر مٹا نہ سکا۔ سید احمد نے اپنی اَنا کو اس طرح توڑ ڈالا، اپنی ذات کو اس طرح مٹا ڈالا، خود کو مقصد میں اس طرح ضم کر دیا کہ اس کی ذات اور نام نہاد عزت اس کے لیے غیر مربوط، بے معنیٰ اور فروعی سے بھی کمتر ہو گئی۔ اس نے لیر کی طرح دھوکا بھی نہ کھایا، نہ اس نے کسی کو جراحت پہنچائی تھی۔ لیکن تھے دونوں احسان فراموشی کے زخم خوردہ!

مسلمانوں کی پسماندگی کا بڑا سبب یہی ہے کہ ہر اس شخص کو جو ان کی بھلائی کے لیے کوشاں، ان کی اصلاح اور پیش رفت کے لیے سرگرم ہو، بدگمانی، الزام، اتہام، اور استہزا کی صلیب تھما دیتے ہیں کہ جب تک زندہ ہو اسے شانوں پر لے کر چلو اور مرنے کے بعد بھی بیشتر طبقہ اگلی پیڑھیوں کو بھی ہماری طرح صلیب سازی اور صلیب برداری کی توفیق ہوئی۔ ایسی قوم اچھی قیادت سے خود کو ہمیشہ کے لیے محروم کر لیتی ہے۔ فراست، عظمت اور بصیرت سے قطع نظر کوئی دوسرا سید احمد کا سا کلیجہ کہاں سے لائے کہ گالیاں سُنے اور مسکرائے:
'اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آئے۔'

کوئی قوم ترقی جبھی کرتی ہے جب اس کا ماحول اپنے رہنماؤں کو قبول کر سکتا ہے اور جب اس میں اداروں کو بنانے اور ڈھنگ اور اتحاد سے چلانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں نہ رہنما سرخرو ہوتے ہوتے ہیں، نہ ادارے کامیاب۔ اور اب ہمیں ایسے ہی رہبر ملنے لگے ہیں جن کے ہم مستحق ہیں؛ غیرت ناشناس، تنگ حوصلہ، خوشہ چیں، کوتاہ اندیش، تنگ نظر، خود غرض، خود نگر، خود پرست! یہ سید احمد کا ایثار تھا اور اس کا حسنِ نیت کہ اس کا ادارہ بے شمار حوادث اور خطروں کے باوجود آج تک قائم ہے اور عنوان پھل پھول رہا ہے۔ مذکورہ خطروں میں سب سے بڑا خطرہ اس ادارہ سے وابستہ افراد میں سے کچھ کی خود غرضی اور بے حسی سے ہے۔ ان پر سامری کا سحر پوری طرح چل گیا ہے۔ ان کے دل کی آنکھوں کو زر کی چمک نے خیرہ کر دیا ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد اور تناسب کا فیصلہ میں قارئین کے ظن و تخمین پر چھوڑتا ہوں۔

حالی نے 'حیات جاوید' لکھی اور خوب لکھی۔ لیکن اس کے پاس شیکسپیئر جیسے "ڈرامانگار کا قلم نہ تھا کہ ان زلزلوں، طوفانوں، اور آتش فشاں قیامتوں کی شبیہہ اُتار سکتا جو ایک بے حس اور بے شعور قوم کی محسن کشی نے سید احمد کے دل میں برپا کر رکھی تھیں لیکن یہ طوفان اور یہ قیامتیں دل کی دل میں رہ گئیں، دماغ تک نہیں پہنچیں، زبان تک نہیں آئیں۔ سید والا گہر کی مقصدیت اور لگن، بے نفسی اور عالی البصیرت نے انھیں آگے بڑھنے نہ دیا۔ قوم کی محبت نے طوفانوں کو جذب کر لیا، غیض و غضب کو پی لیا۔ اس نے ساری محبت اپنی چہیتی قوم کو دی، خود قوم سے محبت کا مطالبہ نہیں کیا۔ لہٰذا وہ اس مایوسی اور صدمے سے محفوظ رہا، جس نے 'کنگ لیئر' کو ہلا ڈالا۔ جس نے توقع ہی نہیں کی' صلہ ہی نہیں مانگا' اسے شکایت کیوں ہو۔ اس نے اس ظالم ناشکری قوم کو جس نے اس کو قدم قدم پہ ایذا پہنچائی نہ برا بھلا کہا، نہ گالی دی، نہ بد دعا دی، نہ کوسا۔ جو سراپا دُعا بن کر آیا تھا وہ بد دعا کیسے دیتا۔ جو سدھارنے اور سنوارنے آیا تھا وہ بگاڑنے اور برباد کرنے کی بات زبان پہ کیوں لاتا جس کا ہر لمحہ، جس کا ہر فعل ایک مقصد کے تابع تھا' اُس کے ذہن میں اور زبان پہ کوئی دوسری بات کیسے آسکتی تھی کہ یونیورسٹی کی جامع مسجد کے پہلو میں آسودہ اس بطل جلیل کی روح آج بھی مضطرب نہ ہوگی۔ اتنی مضطرب وہ عارضی زندگی میں بھی نہ ہوئی ہوگی۔ اس کی زندگی میں اس کی محبت' اس کے ادارہ کی خدمت کا دعوٰی کرنے والا کون تھا، خدمت کرنے والے، محبت کرنے والے خاموشی سے اپنا کام کرتے رہتے تھے۔ آج اس کے دعویدار ہر گوشہ میں نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ دعوے گونیرل اور ریگن کے دعووں کی طرح پُر فریب اور کھوکھلے نہیں۔ اس ادارہ میں جس کی بنیاد وفا اور ایثار پر تھی کیا اس نام کی کوئی چیز باقی ہے؟ کیا کوئی بے صدا کارڈیلیا کسی گوشے سے نکل کر بوڑھے باپ کو دلاسا دے سکتی ہے؟

●●

نکتہ چیں ہے غمِ دل.....

غالب کو محبوب سے سدا شکایت رہی: غم کا مداوا نہ کرتا تو صبر کر لیتے، ظلم کی تلافی نہ کرتا تو بھی برداشت کر لیتے، بے اعتنائی برتتا تو وہ بھی کسی صورت گوارا ہو جاتی۔ لیکن ستم تو یہ ہے کہ وہ ان کا حالِ زار سننے کے لیے تیار ہی نہیں۔ جہاں انھوں نے غمِ دل سنانا شروع کیا اس نے بال کی کھال نکالی۔ الفاظ پر اعتراض، مفہوم پر استہزا، خود ان کی ہیئتِ کذائی پر ابتسام۔ بات آگے کیوں کر بڑھتی۔ گئے تھے دردِ دل بیان کرنے، محبوب کی نکتہ چینیوں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ ایک قدم آگے نہ بڑھا سکے۔ بات بننے اور مراد پانے کا ذکر کیا۔ خدائے سخن کو بات نبھانے، حرفِ مدعا ادا کرنے کا موقع بھی نہ دیا گیا۔

یہ تو ذکر تھا، اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا۔ محبوب کی نکتہ چینی میں شوخی اور ستمگری، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی، چھیڑ چھاڑ اور تفننِ طبع شامل تھا، لیکن جس نکتہ چینی کا ہم ذکر کرنے جا رہے ہیں اس میں شوخی اور شگفتگی، ظرافت اور زندہ دلی نام کو نہیں۔ اس کا مدعا دفاع اور جان بچانا نہیں، اس کا مقصد عیب تلاش کرنا اور جراحت پہنچانا ہے۔ اس نکتہ چینی کا محرک ہے برائی ڈھونڈنے کا جذبہ۔ فارسی کی ایک مثل ہے 'کند ہم جنس با ہم جنس پرواز'۔ انگریزی زبان میں بھی ایک مثل بالکل اسی مضمون کی ہے۔ اس مثل کو ذرا پھیلائیے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ دوسروں میں برائی وہی شخص ڈھونڈے گا جس کی طبیعت میں بدی ہے۔ جس انسان کی طبیعت میں بھلائی اور اچھائی ہوتی ہے، اس کی نگاہ دوسروں کی اچھائیوں پر پڑتی ہے۔ انگریزی ناقد اور شاعر کولرج نے اپنے رفیق ورڈس ورتھ سے کہا تھا کہ ہم وہی پاتے ہیں جو کچھ ہم نے دیا ہے۔ یعنی ہر شخص اپنے دل میں جھانکتا ہے اور دنیا اسے ویسی ہی نظر آتی ہے۔ برائی ڈھونڈنے والے کو ہر طرف برائی ملتی ہے اور بیرونِ در کی برائی سے درونِ خانہ کی برائی کو کمک اور غذا ملتی ہے۔ داخلی برائیوں اور خارجی برائیوں میں لین دین کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اکثر عمر بھر بعض منقاریں گلی سڑی چیزوں کو کریدتی رہتی ہیں، وہی فضا اُن کو راس آتی ہے۔ صاف ستھری اشیا اور تازہ ہوا میں ان کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ سؤر صاف شفاف ہری بھری گھاس کو حقارت سے چھوڑتا ہوا غلاظت کی جانب دوڑتا ہے کہ —— یہی اس کی

فطرت کا تقاضہ، یہی اس کی ترجیحات کا تقاضا ہے۔ وہ غریب مجبور ہے۔ لیکن کیا عیب جو انسان بھی اسی طرح
مجبور ہے؟ کیا شعور اس کی رہنمائی نہیں کر سکتا؟ کیا ضمیر اسے برائیاں ڈھونڈنے اور غلاظت کریدنے سے نہیں روک سکتا؟
انسان کا دل آئینہ کی طرح ہے۔ اس میں جس طرح کا عکس پڑے گا ویسی شکل اس کی ہو جائے گی
لوگوں میں اچھائیاں دیکھیے، خوبیاں ڈھونڈیے تو ان اچھائیوں کی صحبت میں آپ کا دل بھی اچھائیوں کی طرف
مائل ہو جائے گا۔ برائیاں ڈھونڈیے گا تو برائی دل پر چھا جائے گی، رگ و پے میں سرایت کر جائے گی لیکن
اس کو کیا کیجیے کہ عیب جوئی صرف انفرادی نہیں اجتماعی بیماری ہے۔ ایک تو یہ متعدی ہے۔ دوسرے انجمن میں
فروغ پاتی ہے۔ جہاں دو آدمی جمع ہوئے، کسی تیسرے پر نکتہ چینی شروع ہوئی۔ مصرع پر مصرع اور گرہ پر گرہ لگتی
چلی گئی۔ یہ سب فرصت اور بے ضمیری کے مشغلے ہیں۔ فرصت اور بیکاری ہی اس بری عادت کی طرف لے جاتی ہیں
جسے ٹوہ کہتے ہیں۔ ٹوہ کا پہلا تختۂ مشق پڑوسی ہوتا ہے اور اس کے بعد یہ دائرہ پھیلتا چلا جاتا ہے۔ کون ہے
جو اس کی زد میں نہیں آتا۔ شاعر چلاتا ہی رہ گیا: "تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو" — لیکن عیب جوئیوں
کی جس انجمن میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی ہو، وہاں شاعر کی آواز کون سنے گا۔

ترتیب کا فرق ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ شروع میں تفننِ طبع کے طور پر نکتہ چینی شروع کرتے
ہیں، زبان کا چٹخارہ جلد ہی انھیں عیب جوئی کے راستے پر ڈال دیتا ہے اور پھر جس دن انھیں کسی میں برائی
نظر نہیں آتی انھیں چین نہیں پڑتا۔ ان کی طبیعت کو برائیوں کی طلب اسی طرح ہونے لگتی ہے جیسے عادیوں
کو تمباکو، شراب یا دوسرے نشوں کی طلب۔ یہ ایک مریضانہ حالت ہے، جیسے جیسے اس کو غذا ملتی ہے
مرض زور پکڑتا جاتا ہے۔

نکتہ چینی اور عیب جوئی کو بڑھاوا دو چیزوں سے ملتا ہے، جن میں ایک داخلی ہے، ایک خارجی۔
یعنی طبیعت کی کجی یا تنگ دلی یا بخل اور فرصت یا بیکاری۔ بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں جو دوسروں کی اچھائی
یا ان کی نیک نامی کو گوارا نہیں کر پاتیں۔ وہ دوسروں کی اچھائیاں اور کامیابیاں دیکھ کر جلتی ہیں اور دل
کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے ان میں کوئی پہلو برائی کا نکال لیتی ہیں۔ دوسروں کی مصیبت یا برائی پر خوش
ہونا سنگین اخلاقی مرض ہے۔ اس نوع کی خوشی اکثر نکتہ چینی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اگر تنگ دلی کا ساتھ
وقت کی وسعت دیدے تو گویا سونے پر سہاگا ہو گیا۔ وہ لوگ جو گاڑھے پسینہ کی کمائی کھاتے ہیں، جو شام کو تھک ہار
کر گھر آتے ہیں انھیں کہاں اس کی فرصت، کہاں اس کا ولولہ کہ دوسروں کے مزاج اور چال چلن میں عیب ڈھونڈیں۔

وہ لوگ جن کی نظر وسیع ہے اور جو بنی نوع انسان کے مسائل سے ناآشنا نہیں' انھیں فرصت اگر ملتی ہے تو عالمی یا ملکی' یا ملی یا مقامی مسائل کی نذر یا تخلیقی اور تہذیبی اور خدمتی اور فلاحی کاموں میں صرف ہو جاتی ہے۔ نکتہ چینی اور عیب جوئی کے ہنر کو برتنے والے تو وہ لوگ ہیں جو یا تو کسب معاش یا حلال کی کمائی سے بے نیاز ہیں۔ آخرالذکر گروہ ان لوگوں میں پایا جاتا ہے اور اس کی تعداد روز افزوں ہے' جو دفاتر یا اعلیٰ تعلیمی اداروں میں کام کرتے ہیں' لیکن صرف اتنا کہ ملازمت محفوظ ہے' روزی پر آنچ نہ آئے۔ اپنی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو کر وہ دوسروں میں کیڑے ڈالتے ہیں' ان پر تہمت دھرتے ہیں' ان کی ہر طرح کی بے راہ روی کی داستانیں تراشتے اور سناتے ہیں۔ رائی کا پہاڑ بناتے ہیں اور اپنی تخلیقی طاقت پر ناز کرتے ہیں' کوئی انکشاف کرتا ہے' کوئی اختراع۔ اللہ تعالیٰ ستار ہے' گنہگاروں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ اسی اللہ کے یہ بندے پردہ دری سے لذت اندوز ہوتے ہیں۔ فدا دیر کے لیے یہ نہیں سوچتے کہ دوسروں کی پردہ دری کرنے والا اس کا مستحق نہیں رہتا کہ پروردگار اس کے عیوب اور بداعمالیوں کی پردہ پوشی کرے۔

ہمارے معاشرہ میں بے تکلف دوستوں میں جو باتیں ہوتی ہیں' اس کا برجستہ ایک نمونہ لیجیے' ٹیپ کر لیجیے اور تجزیہ کیجیے تو پتہ چلے گا کہ یہ گفتگو زیادہ تر افراد کے متعلق ہے جس میں مزے لے کر برائیاں کی گئی ہیں۔ اگر کسی ایسے آدمی میں جس کی شہرت اچھی ہے کوئی برائی نظر آ گئی تو گویا کشف و کرامات کی منزل پر پہنچ گئے' ایک نیا براعظم دریافت کر لیا۔ کولمبس کو امریکہ دریافت کرنے پر کیا اتنی خوشی ہوئی ہوگی جتنی ان مخفل ساز عیب جویوں کو کسی بھلے آدمی کی کسی دیرینہ یا حالیہ لغزش کا سراغ لگانے پر۔ انسان خطا اور عصیان کا بنا ہوا ہے۔ بہتان پرداز اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں جہاں کوئی خطا نظر آئی بغلیں بجانے لگے' رنگ رلیاں منانے لگے۔ ہاں' ان کی نکتہ چینی سے ایک ذات محفوظ ہے: ان کی اپنی ذات

نکتہ چینی جن لوگوں کی خو بن جاتی ہے وہ اپنے آپ کو فراخدلی' عالی ظرفی اور حلم سے تو محروم کرتے ہی ہیں' سچائی اور سنجیدگی کے دروازے بھی اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں۔ خامیاں نہیں ملتیں تو انھیں وضع اور اختراع کرتے ہیں۔ نکتہ چینی کو دلکش بنانے کے لیے وہ داستان طرازی' دروغ بافی اور مبالغہ سے کام لینے لگے ہیں اور وہ حجاب جو فطرتاً ان کو جھوٹ بولنے میں ہوتا ہے' اس طرح اٹھ جاتا ہے اور زبان رواں ہونے لگتی ہے۔ مبالغہ اور جھوٹ کی سان پر ایک دفعہ زبان چڑھ گئی' پھر سچائی کی لکنت اور ضمیر کی دھمک اور حقیقت کی بے کیفی اسے گوارا نہیں ہوتی۔

نکتہ چینی اور عیب جوئی، غیبت اور بدگوئی کو بازگشت سے کوئی نہیں روک سکتا :

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

یہ بھی تجربہ ہے کہ آپ جس شخص سے کسی کی بُرائی کریں گے وہ سامنے ہاں میں ہاں ملائے گا اور پھر جاکر نمک مرچ لگا کر اس شخص سے کہہ دے گا کہ فلاں تمھیں بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس کی بُرائی کی جا رہی ہے یہ سب کچھ سُن کر وہ کیوں نہ پیچ و تاب کھائے گا اور دندان شکن جواب کیوں نہ دیگا۔ گیند کے اکثر کھیلوں خصوصاً ٹینس اور کرکیٹ میں فریق مخالف نے گیند جس شدت سے پھینکی ہو، اس میں جتنی طاقت بھری ہو، اُتنی ہی زور آور اور اُتنی ہی طاقت سے اچھا کھلاڑی بغیر اپنی طاقت استعمال کئے اسے واپس بھیج سکتا ہے۔ باہمی نکتہ چینی اور مہاجات کا بھی کچھ ایسا طریق ہے۔ پسکہ بستی کے ساتھ ایک کنکری پانی کی سطح کے متوازی پھینکیے، ایک چھوٹے دائرہ کو حصار میں لیتے ہوئے بہت سے بڑے بڑے دائرے بنتے چلے جائیں گے۔ بدگوئی بھی اپنے آپ کو اسی طرح پھیلاتی چلی جاتی ہے۔ ایک تیسری مثال اس سلسلہ کی اور سُن لیجیے وہ ہے 'بوم رَینگ' کی یعنی ایسا تیر جو چلانے والے کے پاس واپس آجائے۔ نکتہ چینی اور بدگوئی سے زیادہ سچا کوئی 'بوم رَینگ' نہیں۔ یہ ہدف سے زیادہ خود چلانے والے کو گھائل کرتی ہے۔ یہ بھی دو طرح: ایک تو اس عنوان کہ بسیر بُرائی کے جواب میں سوا سیر بُرائی حصہ میں آتی ہے۔ دوسرے اس طرح کہ بُرائی کرنے والا صرف ایک بات ثابت کر پاتا ہے وہ یہ تو ثابت نہیں کر سکتا کہ جس شخص میں وہ کیڑے ڈال رہا ہے وہ دراصل ہے بھی ویسا ہی؛ البتہ وہ یہ ضرور ثابت کر دیتا ہے کہ وہ خود بُرا ہے، نکتہ چیں ہے، عیب جو ہے، دوسروں کی تعریف سُن کر وہ جل بھُن کر کباب ہو جاتا ہے، دوسروں کی اچھائیاں اسے گوارا نہیں، اس کی طبیعت بُرائیاں ڈھونڈنے میں لگی رہتی ہے۔ یہ سب کچھ طبیعت کی کجی پر دلالت کرتا ہے۔

اسی پر بس نہیں۔ جو لوگ نکتہ چینی کا روگ پکڑ لیتے ہیں ان میں عمل کی صلاحیت مفلوج ہو جاتی ہے۔ حرکت کا مفہوم ان لوگوں کی نظر میں صرف زبان چلانا رہ جاتا ہے۔ جو زیادہ گرجتے ہیں وہ برستے نہیں، جو زیادہ بھونکتے ہیں وہ کاٹتے نہیں، جو زیادہ باتیں کرتے ہیں وہ کام کم کرتے ہیں، جو شخص دوسروں کی ٹوہ میں رہتا ہے وہ خود کو سنبھال نہیں پاتا، سدھار نہیں سکتا، سنوار نہیں پاتا، نکتہ چینی اور خوردہ گیری کی طرف طبیعت جھک جائے تو اقدامیت اور عمل کی طاقت سلب ہو جاتی ہے۔ ایسا انسان بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کر سکتا ہے، چٹپٹی، مزیدار، چھچھوری باتیں، لیکن ذرا دیر کے لیے اٹھ کر کام نہیں کر سکتا۔ زبان چلانے پر وہ قادر ہے

بسنا اس کے بس کا نہیں۔ زبان کا رسیا کسی کام کا نہیں رہتا۔ انسان کے پاس صرف زبان ہی نہیں ہے، قد
رت نے اسے دماغ بھی دیا ہے، ہاتھ بھی دیے ہیں اور پاؤں بھی۔ چنانچہ جو آدمی باتیں زیادہ کرتا ہے،
پہلی ملاقات میں ہی آپ کی نگاہ میں اس کی عملی صلاحیت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ گفتار کے غازی کو دنیا حقارت
کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ گفتگو کی آبرو عمل سے ہے۔ جہاں اس نے عمل کو بے دخل کیا، خود بیجان ہو گئی۔ فارسی
مثل ہے: "کردن صد عیب، نکردن یک عیب" کچھ نہ کرنا تو صرف ایک برائی ہوئی، کرنے میں سو برائیاں ہیں۔
گفتار کے غازی شاید اسی کہاوت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ زبان چلاتے ہیں، ہاتھ پیر چلانے سے پرہیز کرتے ہیں۔
فقدانِ استعمال سے ہاتھ پیر کی طاقت، کام کرنے، آگے بڑھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔

آپ نے دیکھا نکتہ چینی کے یہ چٹخارے، عیب جوئی کی یہ پھلجھڑیاں، بدگوئی کے یہ پٹاخے کتنے مہنگے پڑتے
ہیں۔ زبان کا گھاؤ بہت گہرا ہوتا ہے، کبھی نہیں بھرتا۔ نکتہ چیں اٹھتے بیٹھتے دل دکھاتا رہتا ہے، بجائے اس کے
تحسین کے کلمے، تعریف کے جملے سے دل بڑھائے، ڈھارس بندھائے وہ بھلائی کر کے دلوں کو توڑتا رہتا ہے۔

جو شخص اپنی زبان کے سحر میں گرفتار ہو گیا، وہ خود اپنے دل سے دور ہو جاتا ہے۔ اس کے جینے کی
سطح زبان سے آگے نہیں بڑھتی۔ وہ عیب چنتا رہتا ہے، داستان بنتا رہتا ہے۔ دل کو وہ طاق پر بٹھا دیتا ہے۔
زبان کی سطح پر جینے کا نتیجہ معلوم۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ برا بنانے یا بتانے سے طبیعت میں کجی آتی ہے۔ برائی
کی گفتگو میں گھر جانے سے جینے کی سطح اتھلی ہو جاتی ہے، شخصیت تہ دار نہیں بننے پاتی، بے تہی رہ جاتی ہے۔

نکتہ چیں، عیب جو، خوردہ گیر، الزام تراش، غیبت آشنا، بدگو، بدزبان، دریدہ دہن (کہ یہ
انسان (یہ سب ایک ہی سفر کی منزلیں ہیں) خود محروم جیتا ہے اور محرومی کا کاروبار اور تہی مائگی کی اشاعت کرتا ہے۔
جو شخص گفتگو کو عمل کا بدل سمجھنے لگے، جو اپنے معائب سے غافل ہو کر دوسروں کی خامیوں میں گم ہو جائے، اس میں عمل کی
صلاحیت تو ختم ہوتی ہی ہے، اصلاح کے امکانات بھی معدوم ہو جاتے ہیں۔ جو اوقات خود کو سنوارنے میں صرف ہونے
چاہئیں وہ دوسروں کے عیب ڈھونڈنے میں ضائع ہو جاتے ہیں:

فرصت ملی جو تزکیۂ نفس کے لیے — وہ صرف نکتہ چینیٔ اغیار ہو نہ جائے

نکتہ چینی، خردہ گیری اور زبان درازی کی تباہ کن عادت اگر زور سے جماعت میں پھیل جائے تو حالت
بہت تشویشناک ہو جاتی ہے۔ پھر اس بری عادت سے کوئی بچ نہیں پاتا۔ اس حمام میں سب ننگے ہو جاتے ہیں۔ سارے
پردے رنگ پکڑنے لگتے ہیں۔ جن افراد کا رجحان خود نمائی و آبرو اور نازیبا گفتگو کی طرف نہیں ہوتا وہ بھی

اور ماحول سے متاثر ہو کر اس بُری عادت، اس مہلک روگ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کسی قوم میں اگر نکتہ چینی اور یاوہ گوئی کا چلن عام ہو جائے تو سنبھلنے اور ترقی کرنے کی راہیں اس پر بند ہو جاتی ہیں۔ غور کیجئے، جس جماعت سے ہمارا تعلق ہے، اس نے ہندوستان بھر میں بالعموم اور شمالی ہندوستان میں بالخصوص اپنا دامن زبان کی درازدستی اور عمل کی کوتاہی کے ساتھ جوڑ لیا ہے۔ ارزاں اور لذت خیز نکتہ چینی اور محنت اور عمل سے محرومی ہمارا شعار بن گئی ہے۔ نکتہ چینی نے دل توڑے ہیں اور اتحاد کے شیرازہ کو بکھیر دیا ہے۔ غالب نے ٹھیک ہی کہا تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں نکتہ چینی کا غلبہ ہو وہاں نہ فرد کی بات بن سکتی ہے نہ قوم کی ـــــ وہاں کاہلی، وجودی، دل شکنی اور ملفوظ اور دروغ کا دور دورہ ہوتا ہے۔

اجتماعی زاویہ سے دیکھیے: نکتہ چینی نے یقین کو مجروح کر دیا ہے۔ ہم ہر شخص کی نیت اور خلوص پر شبہ کرنے لگے ہیں۔ اسی لیے نہ ہم کسی فرد کی قیادت کو قبول کر سکتے ہیں، نہ کسی ادارے کو ہم آہنگی، خوش دلی اور خوش اسلوبی کے ساتھ چلا سکتے ہیں۔ کسی اجتماعی مقصد کے لیے سر جوڑ کر ہم نہیں بیٹھ سکتے، نہ قدم ملا کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔

اور اس تباہ کن نقطۂ نگاہ اس مہلک جنبشِ زبان، اس تفرقہ پرداز افتادِ طبع، اس حوصلہ شکن زیاں کاری کی انتہائی عبرتناک مثالیں ڈھونڈنے ہمیں زیادہ دور جانا نہیں پڑے گا!

نکتہ چینی اور عیب جوئی کا سرچشمہ یا نخوت ہے یا حسد یا شرارت یا محض بیکاری اور اس کی رفیق راہ بے دردی ہے اور بھی۔ وہ لوگ زیاں کار ہیں جو ذرا سی لذت کے لیے دوسروں کی شہرت اور اپنے سکون کو برباد کرتے ہیں، جو چلتے پھرتے نفاق کا بیج بوتے ہیں، جو بُرائیوں سے کھیلتے رہتے ہیں، جو سنجیدگی، وزن اور وقار اور گہرائی اور انضباط سے اپنی شخصیت کو محروم کر دیتے ہیں، جو بیہودہ دری کو شعار بنا لیتے ہیں اور جو اپنے اور دوسروں کے لیے تلخی کی کاشت کرتے ہیں۔ ایک پل کی ارزاں لذت کے لیے کیا یہ سودا گراں نہیں؟

●●

ہری پتلیوں والا عفریت

تہذیب الاخلاق کے پہلے شمارہ میں "ہمارے مسائل" کے عنوان سے وہ معایب گنائے گئے تھے جو ہندوستانی مسلمانوں کے گلے کا ہار اور ان کی راہ کا روڑا بن گئے ہیں۔ ان میں سرفہرست حسد ہے۔ انگریزی میں نہ جانے کیوں اسے Green Eyed Monster کہتے ہیں۔ میں نے اس کا ترجمہ "ہری پتلیوں والا عفریت" کیا ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ Monster اور عفریت میں باہم کوئی تعلق نہیں۔ مجھے یقین ہے قارئین اس سے بہتر ترجمہ کریں گے اور ترجمہ کے علاوہ اصل کی وجہ تسمیہ پر بھی غور فرمائیں گے۔

حسد کی حیثیت ساری برائیوں میں منفرد ہے۔ دوسری کسی اخلاقی برائی کو لے لیجیے۔ اس میں بظاہر آپ کی منفعت کا کوئی پہلو، خواہ کتنا دور از کار اور پُرفریب کیوں نہ ہو، ضرور نکل آئے گا جو اس کو اپنی طرف کھینچے گا۔ اس طرح اسے یک گونہ جواز مل جائے گا۔

حرص یا طمع یا ہوس یا ہَوَکے یا لالچ کو لے لیجیے۔ جس شخص کو یہ جذبہ لاحق ہوتا ہے وہ کسی چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ خواہ وہ دولت ہو، خواہ اقتدار، خواہ جاہ و ثروت، خواہ خدم و حشم خواہ زمین و مکان، زن، زر، زمین کی طمع سے کم لوگ اپنا دامن بچا سکے ہیں اور یہ طمع اکثر فتنہ و فساد اختلاف و نفاق کا باعث بنی ہے۔ وہ چیز اسے ملے یا نہ ملے لیکن جذبہ کا جواز یہ ہے کہ انسان کچھ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی خواہش اور کوشش اعتدال سے تجاوز کر جائے اور اس کی شدت اسے سلامت روی اور سکون سے محروم کر دے۔ یا وہ کوئی چیز اس مقدار میں چاہے جس کو وہ استعمال نہ کر سکے اور اس کی طمع دوسروں کی محرومی کا سبب بن جائے۔ یا وہ کوئی ایسی چیز چاہے جس پر اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا ہو یا وہ کسی ایسی چیز پر للچائے جو اس کے لئے مضر اور تباہ کن ہو۔ طمع بہرحال سکون اور بسا اوقات راست روی سے محروم کر دیتی ہے۔

اخلاقی معایب میں غصہ اکثر پشیمانی کی طرف لے جاتا ہے۔ غصہ کی باڑھ اُتر جاتی ہے۔ تو غصہ کرنے والے کو اپنے دونوں طرف افسردگی اور اضمحلال کی ریت بچھی ہوئی نظر آتی ہے۔ "آخر مجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں

آپے میں در ہا جو کچھ منہ میں آیا بک دیا، نہ جانے کتنوں کا دل دکھا ہوگا۔ غصہ انسان کو بے قابو کر دیتا ہے۔ اسے خود پر اختیار نہیں رہتا۔ غصہ میں دوسروں کو جراحت پہنچانے کی نیت بالکل نہیں ہوتی، لیکن پہنچ جاتی ہے۔ اس اخلاقی عیب میں خود غرضی شامل نہیں۔ بھیانک نتائج سے قطع نظر غصہ اخلاقی معائب میں نسبتاً کم سنگین ہے۔ یہ جس طرح خود غرضی سے محفوظ ہے اور اس میں ایذا رسانی کی نیت بھی نہیں ہوتی۔

جسمانی یا جنسی خواہش نسل کی بقا اور افزائش کی ضامن ہے۔ اس کے تقاضوں کو رد کرنا سیلاب پر بند باندھنا ہے۔ لیکن اس کو بے مہار چھوڑنے کے معنی ہیں انسانیت اور تہذیب دونوں کو موت کے گھاٹ اُتار دینا۔ زر، زن، زمین کی آشوب پرور تثلیث میں اس جذبہ کا ردِ سخن زن کی طرف ہے۔ لیکن جب فریق مرد اور زن ہوں تو زن کو ہی موردِ الزام کیوں قرار دیجیے۔ قلم یا موقلم ابھی تک مردوں کے ہاتھ میں تھا، شبیہ جس طرح چاہا کھینچ دی۔ ظاہر ہے کہ عورت ٹوٹے میں رہی اور فساد اسی سے منسوب کیا گیا۔ حالانکہ قصور زیادہ مرد کا ہے۔ اب عورت کے ہاتھ میں بھی برش آگیا ہے اور خامہ بھی۔ اب جو تصویر بنے گی وہ حقیقت سے قریب تر ہوگی۔ بہرکیف جنسی خواہش جسے اہلِ نظر نے ہوس کا نام دیا ہے، دراصل بُری شے نہیں۔ حدود سے تجاوز کرنے کے بعد بُری ہو جاتی ہے اور اس کی بدولت انسان اسفلِ سافلین کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

بُغض اور کینہ سے زندگی تلخ ہو جاتی ہے اور فتنہ و فساد کی نئی نئی راہیں نکلتی ہیں۔ اس کی شروعات غبار اور کدورت سے ہوتی ہے، شاعر نے کہا تھا:

کر دیجیے معاف، یہ پاکیزہ صاف دل ؎ ہے کس لیے غبار کو مہماں کیے ہوئے

غبار کی تہ پر تہ جمتی چلی جائے تو وہ کدورت کی راہ سے کینہ، بغض اور عداوت تک پہنچ جاتی ہے۔ کینہ انسان کو بلندی سے پستی کی طرف لے جاتا ہے۔ نگاہ کا انداز بگڑ جاتا ہے۔ کینہ جس کے خلاف ہے اس میں کینہ پرور کو کوئی بات اچھی نظر نہیں آتی۔ اس کی خوبیاں برائیوں میں بدل جاتی ہیں۔ طرزِ فکر مسخ ہو جاتا ہے۔ لیکن کینہ خواہ کتنا ہی غارت گر کیوں نہ ہو، بے سبب نہیں ہوتا۔ کوئی سبب واقعی یا خیالی ضرور ہوتا ہے، جو غبار بن کر دل کے آئینہ کو مکدّر کر دیتا ہے۔ کدورت کو عداوت بنتے دیر نہیں لگتی۔

بخل کے شکنجے سے خدا بچائے۔ اس کی بہن حرص برابر اس کا ساتھ دیتی ہے۔ اس کا دستور ہے کہ جو کچھ نظر آئے، جہاں تک ہاتھ پہنچے سب کچھ سمیٹ لو اور کسی دوسرے کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دو۔ کنجوس جو کچھ کماتا ہے یا جوڑتا ہے، اس کا فائدہ خدا کی مخلوق تک پہنچنا تو درکنار، خود اس تک بھی نہیں پہنچتا۔ وہ

وہ خزانہ پر سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا ہے۔ بخیل اور تنگ نظری میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بخیل آدمی کسی کی تعریف بھی نہیں کر سکتا۔ اگر وہ مجبور ہے تو اچھے نمبر دیتے ہوئے اس کی جان پر بن جاتی ہے۔ اس کے سامنے کسی کی تعریف کی جائے تو اس کی جبیں پر شکن آجاتی ہے، اور شکن نہ بھی آئے تو تیور صاف بتا دیتے ہیں کہ تعریف اسے ذرا بھی نہیں بھائی۔ بخل سے شخصیت ممی کی طرح سکڑ جاتی ہے، بے جان ہو جاتی ہے ایسا لگتا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ ولولہ، ذوق، حوصلہ، امنگ، آرزو سب کملا جاتے ہیں۔

گھمنڈ کا شمار کلیدی عیوب میں ہے۔ انسان کی، اس ذرّۂ ذلیل کی بساط ہی کیا جس پر اترانا پھرے۔ وسیع کائنات میں زمین خود ایک ذرّہ سے زیادہ نہیں۔ پھر اس میں انسان، جسے ایک لمحہ ثبات نہیں، اینٹھتا اور اکڑتا ہوا دکھائی دے، یہ منظر کتنا مضحکہ خیز ہے! مضحکہ خیز ہی نہیں عبرت ناک بھی!! پھر گھمنڈ ایک نشہ ہے جس کی جھونک میں انسان بھلے بُرے، دوست دشمن میں فرق نہیں کر سکتا اور دوست دشمن دونوں کو اہانت آمیز برتاؤ سے جراحت پہنچاتا ہے۔ گھمنڈی انسان اس مرغ کی طرح ہے جو پر پھڑپھڑا کر سینہ تان کر، گردن اٹھا کر ساری دنیا کی طرح چیلنج پھینک کر بانگ دیتا ہے۔ اس سے غافل کر بلّی اس کی گھات میں ہے اور اس کی اکڑی ہوئی گردن کے لئے دانت تیز کر رہی ہے۔ گھمنڈ سے کچھ حاصل نہیں ہوتا سوائے مداوتوں اور خود فریبیوں کے۔

ایک اور عیب ہے بے حسی، بے تعلقی، بے پروائی۔ یہاں ایک شعر یاد آگیا جو بیت بازی کے ایام میں اکثر کام آتا ہے:-

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ؛ ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

ہمدردی اور دردمندی کے لئے تو انسان پیدا کیا گیا اور وہ اسی سے کنارہ کش ہو جائے!

گر از نیستی دیگری شد ہلاک ؛ مرا ہست بط را ز طوفاں چہ باک

(اگر کوئی دوسرا اس لئے مر گیا کہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا تو کیا ہوا، میرے پاس تو ہے، باڑھ سے بطخ کو کیا ڈر)۔ بے حسی کو جذبہ کیوں کہیے، یہ تو ایک منفی کیفیت ہے جسے جذباتی افلاس کہنا اولیٰ ہے جس آدمی میں کوئی جان نہیں ہوتی، کوئی دم خم نہیں ہوتا۔ وہ گوبر گنیش یا مٹی کے مادھو کی طرح زمین پر بوجھ بنا بیٹھا رہتا ہے۔ سوئیاں چبھو دیجیے تو بھی اس پر کوئی اثر نہیں۔ لیکن گنیش کو اس ہاتھی سے کوئی نسبت نہیں جسے نومبر میں ہونے والے ایشیائی کھیلوں کا نشان بنایا گیا ہے اور جسے اپّو کا سامعہ نواز نام اور بامرہ نواز

شکل دی گئی ہے۔ الّو کی چشم تنگ میں آسمان کی تجلیاں اور زمین کی ساری شرارتیں بھری ہوئی ہیں۔ ایسا جان پڑتا ہے کہ اس نے ابھی ابھی کوئی شرارت کر کے دم لیا ہے یا کوئی شرارت سوجھی ہے۔

بہرحال بے حسی، بے تعلقی، بے پروائی عیب ضرور ہے۔ لیکن بے ضرر۔ یہی عیب جب خود غرضی کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے، تو طرح طرح سے غضب ڈھاتا ہے۔ دوسروں کو روندتا ہوا چلا جاتا ہے اور مُڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ لیکن خود غرضی بھی کسی مقصد کے تحت ہوتی ہے، خواہ وہ کتنا ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو۔

ریاکاری کا مرض بہت عام ہے۔ اس کا روگی گیہوں دکھاتا ہے اور جَو بیچتا ہے۔ اس کے دل میں زہر اور زبان پر امرت ہوتا ہے۔ جو کچھ اس میں ہے اُسے چھپاتا ہے اور جو کچھ نہیں ہے اس کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کے اقوال، افکار و افعال میں تضاد کارشتہ ہوتا ہے۔ ریاکار کے کردار کا گھناؤنا پن جلد یا بدیر ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ ریاکاری ایک مقصد کے تحت ہوتی ہے۔ اپنی شبیہ کو سجا کر پیش کرنا اور اپنی پاکبازی اور راست روی اور خدا ترسی اور انسان دوستی کے ڈنکے بجانا اور ممکن ہو تو اس طرح شہرت عزت اور اقتدار حاصل کرنا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے دور نے ریاکاری کو قبولِ عام کی خلعت دیدی ہے اور ہمارے زمانے کا یہ سب سے بڑا خطرناک وصف ہے جسے اہلِ سیاست بالخصوص فن کارانہ انداز سے برتتے ہیں۔ ہمارے عہد کے نوجوانوں میں بغاوت، سرکشی اور اقدار فراموشی اور تشکیک اور استہزا اور نظم شکنی کا رشتہ معمرین بزرگوں کی کھوکھلی ریاکاری کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ ریاکار سمجھتا ہے کہ وہ دنیا کو دھوکا دے رہا ہے، دنیا خود کو ہے۔ ریاکاری فریب کی ہی ایک شکل ہے۔ فریب کا بھانڈا چوراہے پر پھوٹتا ہے، یا زنداں میں۔ ریاکاری، مکر و فریب سب دروغ کے گھرانے کے افراد ہیں۔ جھوٹ کی سرزمین میں یہ پیدا ہوتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ سچ کی "سموم" کے ایک جھونکے سے مرجھا جاتے ہیں۔

اخلاقی بُرائیوں میں پھیلنے اور خود کو بڑھاوا دینے کی ایک غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ اخلاقی بُرائیاں کسی میں جمع ہو جائیں تو یہ جوڑ کا نہیں ضرب کا عمل ہوتا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے اس قدر شہہ ملتی ہے کہ ان کا اجتماعی اثر ان کے مجموعہ سے کہیں آگے نکل جاتا ہے۔

مذکورہ عیوب میں سے سوائے غصہ اور گھمنڈ کے، کوئی بے مقصد نہیں۔ ان میں کوئی نہ کوئی پہلو خیالی عارضی یا ذاتی منفعت کا نکل آتا ہے۔ غصہ اور گھمنڈ کے پیچھے ایذا رسانی کی نیت نہیں ہوتی۔ غصہ اچانک آتا ہے سیلاب کی طرح اور ہوش و حواس کو بہا لے جاتا ہے۔ گھمنڈ میں انسان اپنی خوبیوں سے متاثر ہو کر غبارے

کی طرح پھولنے لگتا ہے۔ اس سے دوسروں کو تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ لیکن گھمنڈ اپنے حامل سے ایذا رسانی کا مطالبہ کبھی نہیں کرتا۔ تنہا حسد ایک ایسا عیب ہے جس کا سرے سے کوئی وجہ جواز نہیں جس سے حسد کرنے والے کو کسی فائدے کے پہنچنے کا احتمال تک نہیں اور جو حاسد کو ہر وقت جلاتا ہے اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتا ہے۔ یہ عجیب حالت ہے یہ ایک ایسی بیماری ہے کہ انسان کو اچھائیاں بُری لگنے لگیں۔ دوسروں کی خوشیاں اس کے لیے غم بن کر آئیں۔ ہمسایہ کی کامیابی اور خوش حالی اسے جلا کر خاک کر دے۔ یہ کیسا اوندھا آئینہ ہے جس میں ہر تصویر اُلٹی نظر آتی ہے۔ دوسروں کی مصیبت اور تکلیف سے حاسد خوش ہوتا ہے۔ ان کی شکست اور رسوائی پر بغلیں بجاتا ہے۔ بات یہیں تک رہتی تو بھی ہم صبر کر لیتے۔ لیکن حسد کرنے والا دوسروں کو آگے بڑھتا ہوا دیکھتا ہے تو چپکا نہیں بیٹھتا۔ انھیں ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہے، گرا دیتا ہے۔ خود جل بھن کر کباب ہو جاتا تو اچھا تھا، اس کے خبث نفس سے ہمنفسوں کو نجات ملتی لیکن جو آگ اس کے دل میں سلگتی ہے، بھڑکتی ہے، اس کی منزل مقصود دوسروں کے گھر ہوتے ہیں۔ جب تک وہ نہ جل جائیں اس کے کلیجہ میں ٹھنڈک نہیں پڑتی۔ آپ ہر شخص کو رام کر سکتے ہیں، سوائے حاسد کے:

توانم آنکہ نیازارم اندرون کسی ✣ حسود را چہ کنم کو زخود برنج دراست

(میں یہ تو کر سکتا ہوں کہ کسی کا دل نہ دکھاؤں، لیکن حاسد کو کیا کروں کہ خواہ مخواہ خود بخود رنجیدہ ہے)

حاسد سدا خود سوزی میں مبتلا رہتا ہے اور جہاں سوزی کے لیے مستعد۔ اسے پھول کانٹا نظر آتا ہے اور اگر در اصل کانٹے سامنے آئیں تو اس کے دل کا چمن لہلہا اٹھتا ہے:

بنا لیا ہے نگاہِ حسود کو معیار ✣ وہ پھول پھول نہیں ہے، جو خار ہو نہ سکا

اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہوگی کہ انسان بلا وجہ بنی نوع انسان کا دشمن بن جائے اور ان کی خوشی اسے ایک آنکھ نہ بھائے اور ان کی تکلیفوں پر شکر لائے۔ اب اس قوم کی بدنصیبی پر قیاس کیجیے۔ جس کے بیشتر افراد اس روگ میں مبتلا ہوں۔ ہندوستانی مسلمان (میں ملک کی حدود کو چھوڑنا نہیں چاہتا) من حیث القوم حسد کی زلف گرہ گیر کے اسیر رہے ہیں۔ ان کے زوال اور ادبار کا ناٹک اگر کبھی منچ پر کھیلا گیا، تو اس میں حسد کا کردار سب سے اہم ہوگا۔ بات لمبی ہو گئی ورنہ بتایا جاتا کہ حسد نے کس کس عنوان اور کس کس شکل میں ہماری جڑوں کو کھودا ہے۔ حسد، نفاق، انتشار اور پراگندگی کو جنم دیتا ہے۔ حسد کو

افراد کا پھلنا پھولنا گوارا ہوتا ہے، لیکن اپنوں میں سے اگر کوئی ترقی کر گیا یا خوش حال ہو گیا تو حاسد کے
تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ اپنوں میں سب سے پہلے قریبی اعزہ اور ہمسائے آتے ہیں۔ قرب کے
دائرے وسیع ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی مسلمان ترقی کرتا یا امتیاز، یا خوش حالی یا شہرت
حاصل کرتا ہوا نظر آئے، تو مسلمان اس میں کیڑے ڈالنے اور عیب ڈھونڈنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ
لیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کوئی تنظیم زیادہ عرصے تک ڈھنگ سے کام نہیں کر پاتی۔ کوئی ادارہ
ٹھیک سے نہیں چل پاتا جہاں کسی ادارے یا انجمن نے کامیابی حاصل کی، اس کے سربراہوں پر
حسد کے زہریلے دہانے کھول دیے جاتے ہیں اور ان غریبوں کو عافیت صرف کنارہ کشی اور
روپوشی میں نظر آتی ہے۔ ہمارے ایک بڑے محترم بزرگ نے اس دور میں مسلمانوں کی پسماندگی
اور زبوں حالی کی ایک وجہ یہ بتائی کہ ان میں اچھے اداروں کو بنانے اور چلانے کی صلاحیت کا
فقدان ہے۔ اس کی بڑی وجہ حسد ہے۔ جو ہمارا قومی وصف بن گیا ہے۔ ہمارا شعار ہے خود
سلگنا اور دوسروں کو جلانا۔ حسد کی اس جہاں سوزی کے آگے نہ قاید ٹھہر پاتے ہیں، نہ ادارہ، نہ انجمن۔

اگر طبیعت میں حسد ہو تو اسے بالکل خارج تو نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اسے کم اور اس کی آنچ کو دھیما
ضرور کر سکتے ہیں۔ جہاں تک خود سلگنے اور جلنے بھننے کا تعلق ہے، عقل کو بروئے کار لایا جائے اور سوچا
جائے کہ خود کو سلگانے اور تباہ کرنے سے ہمیں کیا مل جائے گا۔ عقل سمجھائے گی کہ اگر ہمسائے کے چمن میں پھول
کھل رہے ہیں تو ہمارے دل میں کانٹا کیوں چبھ رہا ہے۔ اگر پھولوں کو دیکھ کر ہم حظ اندوز نہیں ہو سکتے
تو ان کی طرف سے نظر کیوں نہیں ہٹا لیتے۔ اس طرح طبیعت مکدر ہونے سے بچ جائے گی۔ جہاں تک
خود سلگنے کے بعد دوسروں کو جلانے کا سوال ہے۔ وہاں ضمیر کو بروئے کار لانا پڑے گا۔ اپنوں کو تباہ
کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ وہ زندگی میں کامیاب ہوں گے، انسانی پیش رفت میں معاونت کا شرف
حاصل کریں گے تو ساری قوم کی عزت بڑھے گی۔ ہمیں تو اس پر فخر کرنا چاہیے، خوش ہونا چاہیے اور کسی
ایسے شخص کو نقصان پہنچانا جس نے ہمیں کوئی تکلیف نہ دی ہو، ہمارا حق نہ چھینا ہو، صریحاً ناانصافی
نہیں تو اور کیا ہے۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ ہم اپنے سفلی جذبات کو جڑ سے اکھاڑ نہیں سکتے۔ لیکن ان کو
سفلی سے علوی میں بدل سکتے ہیں۔ ادنیٰ کو اعلیٰ بنا سکتے ہیں۔ حسد کے جذبہ کو ہم ارتفاع کے ذریعہ رشک کے

سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔ تاکہ جب ہم دوسروں کو ترقی کے زینہ پر چڑھتا دیکھیں، تو انھیں ٹانگ پکڑ کر کھینچنے
کے بجائے ہمارے دل میں یہ صحت مند جذبہ پیدا ہو کہ ہم بھی اس زینہ پر چڑھیں، اور کچھ اور تیزی
کے ساتھ۔ اا مثال کی ضرورت ہو تو وہ بھی دُور نہیں۔ کچھ عرصہ ہوا میں جنوبی ہند کے دَورے پر
گیا تھا۔ یہ جان کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ جنوبی ہند کے مسلمانوں میں اس وقت سب سے زیادہ
جوش وخروش تعمیری اور تعلیمی کاموں کے لئے حیدرآباد میں پایا جاتا ہے۔ نئی نئی انجمنیں وجود میں
آرہی ہیں۔ کوئی انجینئرنگ کالج قائم کر رہا ہے، کوئی بیت المال، کوئی پولی ٹکنیک، اور کوئی میڈیکل
کالج قائم کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔ میں وہاں ایک محفل میں اپنے ان تاثرات کا پُرستائش اظہار کر رہا تھا
کہ ایک صاحب نے میرے کان میں کہا کہ "یہ کارگزاری حسد اور رقابت کی دین ہے جس نے رشک اور مسابقت
کا روپ دھارا ہے"۔ تخریب کو تعمیر بنتے دیر نہیں لگتی۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ مسائل پر ٹھنڈے دل سے
غور کیا جائے اور گرم جذبات کو تباہی کے بجائے آبادکاری پر لگایا جائے۔ ہری تیلیوں والے عفریت کو
شیشہ میں اُتارا جا سکتا ہے، اسے قابو میں رکھ سکتے ہیں۔ اس سے جہاں سوزی کے بجائے چمن بندی کا کام
لے سکتے ہیں۔ یہ مؤکل کیا نہیں کر سکتا۔ شرط ہے اس کو قابو میں رکھنا اور سیدھی راہ پر ڈالنا !

●●

عمر کا جمال

قدرت کا قانون اٹل ہے۔ وہ اپنے تقاضے پورے کرتی ہے۔ یہ تقاضے انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ جوانی کے جلو میں جمال ہوتا ہے۔ وہ ایک نئی آب و تاب، ایک دل آویز، چمک دمک، ایک ہوشربا خوش نمائی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ جسمانی ساخت کے جھول، زاویوں کی کمی، عدم تناسب کی بانمرہ خراشیں چشم زدن میں دور ہو جاتے ہیں: ع "کرشمہ دامنِ دل می‌کشد کہ جا اینجاست"

لیکن جوانی کا لایا ہوا جمال چار دن کی چاندنی کی طرح ہے۔ جوانی کے ڈھلتے ہی چہرہ کی چمک، جسم کا گداز، اعضا کا تناسب، رنگ و روپ کا تناؤ، لچک، موزونیت، سیمابی انداز، صباحت کی صیقل، ملاحت کی فتنہ سامانی، سب اترنے، گھلانے لگتی ہے۔ چالیس سال کی سرحد پار کی، زیادہ سے زیادہ پچاس سے آگے بڑھے اور ساری قلعی کھل گئی۔ ایسا لگنے لگا، جیسے ہم جس کو حسن سمجھ رہے تھے سب ملمع تھا۔ عمر کی خراش لگی اور ملمع اتر گیا۔

لیکن ہر جگہ کچھ لوگ ایسے نظر آتے ہیں کہ عمر جن سے خوبصورتی نہیں چھین پاتی۔ اب ان کا حسن نہ حشر سامان ہوتا ہے نہ فتنہ انگیز اور نہ جمال سکون اور وقار آگیں، وجاہت اور اطمینان کی تصویر ہوتا ہے۔ اس طبقہ میں وہ لوگ بھی ہیں جن کے چہروں سے نیکی اور نور کی بارش ہوتی ہے۔ لگتا ہے کہ تجربہ کی بھٹی نے انھیں ہر آلائش، ہر کھوٹ سے پاک کر دیا ہے، اور اب یہ خیر محض بن گئے ہیں۔ ان کے چہرے، ان کے اطوار و گفتار سے ایقانِ خیر کی تائید اور پیمانِ خیر کی تجدید ہوتی ہے۔ انھیں دیکھ کر وہ بدگمانیاں جو انسان کے فطرت کے متعلق تجربہ نے سمیٹی تھیں اس طرح چھٹنے لگتی ہیں جیسے سورج کی کرنوں سے اندھیرا۔ ان لوگوں کا حسن لازوال ہے۔ سدا بہار ہے۔ دنیا کاتب ان کے چہرے پر خستگی، افسردگی، تھکاوٹ، اضمحلال، مایوسی اور جھنجھلاہٹ کے نقوش بنانے کی کوشش کرتا ہے اور ہر بار مات کھاتا ہے۔ آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ کوئی پل یا کوئی عمارت، یا کوئی سڑک، جس کے بنانے کی بار بار کوشش کی گئی اور ہر بار ناکام ہوئی، اس لئے نہ بن سکی کہ اس کے نیچے کوئی بزرگ دفن تھے۔ ہمیں اس وقت ان روایات کی صحت یا عدم صحت سے سروکار نہیں ہے۔ اس وقت ان کا ذکر تمثیلاً کیا گیا ہے کہ بزرگی اور بھلائی شکست ناپذیر ہیں اور ان کے نقوش

خواہ وہ ارض کے بطن میں ہوں، خواہ انسان کے خدوخال پر کوئی مٹا نہیں سکتا۔

لیکن عمر کا عکس ان لوگوں کی وجاہت اور لمعات تک محدود نہیں، جن کی زندگی خالق کی عبادت اور مخلوق کی خدمت، خیر کی تائید اور شر کی تردید میں گزری ہے :

ہمیں ان لوگوں کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ اور ان کی تعداد زیادہ ہے — جو شر سے برسرِ پیکار رہنے کے باوجود اپنے جمال کو لیل و نہار کی دستبرد سے صاف بچالے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے یا تو دنیا کو بازیچۂ اطفال سمجھ کر اپنی طمانیت پر کبھی زیادہ آنچ نہیں آنے دی اور زمانہ کے سرد و گرم کو سکون اور اطمینان اور سلامت روی کے ساتھ برداشت کیا۔ انھوں نے تمازت اور حدت کو اپنے چہرے اور اپنے دل دونوں سے دور رکھا۔ ایسا کرنے میں انھیں اپنے مزاج سے مدد ملی۔ لیکن اس میں ان کے ارادے کو برابر کا دخل رہا۔

ان ملکوں میں جہاں درجۂ حرارت افراط و تفریط کی مسافت طے کرتا رہتا ہے، آدمی گرمیوں میں تپتا ہے، جھلستا ہے، جلتا ہے اور سردیوں میں ٹھٹھرتا ہے، کانپتا ہے، سکڑتا ہے۔ جب لیل و نہار یہ ہوں تو پتھر کی عمارت کی طرح بدن کی عمارت بھی ٹوٹنے لگتی ہے۔ کل کی بات ہے گرمی شباب پر تھی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی خوبصورت جامع مسجد کا فرش غروبِ آفتاب کے وقت بھی تپ رہا تھا۔ راقم سے تپتے ہوئے فرش کی شکایت کی گئی اور مشورہ دیا گیا کہ ٹیوب ویل سے ایک نل براہ راست مسجد میں لایا جائے، تاکہ روز شام کو مسجد کے صحن کو پانی سے بھرا جا سکے۔ تجویز بظاہر معقول تھی۔ یونیورسٹی انجینئر سے رائے لی گئی تو انھوں نے بتایا کہ اس عمل سے فرش کے پتھر تڑخ جائیں گے ؛ اوپر کا حصہ سیراب ہو کر ٹھنڈا ہو جائے گا اور سکڑے گا اور نیچے کا دیر میں ٹھنڈا ہوگا ؛ ایک حصہ سکڑے گا، ایک گرمی کے اثر سے اسی طرح پھیلا رہے گا تو پتھر ٹوٹ جائے گا۔

یہی اثر گرمی اور سردی کے ردّوبدل کا انسانوں کے جسم پر ہوتا ہے۔

بہرکیف ہمارے معاشرہ میں وہ لوگ بھی ہیں جن میں سرد و گرم کو جذب کرنے کی صلاحیت پتھروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے زندگی سے صلح کر رکھی ہے۔ آفاتِ ارضی و سماوی سے کسی کو مفر نہیں۔ یہ لوگ اپنی سلامت روی سے ان آفات کے فشار اور تباہی کو کم کر دیتے ہیں اور اپنی باقاعدگی اور زندگی کے انضباط اور طرزِ اعتدال سے وہ ان تباہیوں اور گھبراہٹوں، حادثوں اور پریشانیوں سے بچے رہتے ہیں جن کو بیشتر انسان اپنی بے قاعدگی، لاپرواہی یا انتہاپسندی یا ہوس یا حسد کے ذریعہ دعوت دیتے ہیں۔ یہ ہوشمند جانتے ہیں کہ زندگی کے بہت سے مراحل آسانی سے سر ہو جاتے ہیں اگر انسان اچھی عادتیں اختیار کر لے۔

اس کے بعد سب کام وقت سے بغیر کسی کوشش کے خود بخود چلتے جاتے ہیں۔ ایسی شخصیتوں کو منظم اور منضبط کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اس داخلی توڑ پھوڑ سے محفوظ رہتے ہیں جن سے زیادہ تر انسانوں کو سابقہ رہتا ہے۔ اور جو توڑ پھوڑ ان کے جسم اور خدوخال کو بھی اپنے شکنجہ میں کس لیتی ہے۔ بیماریوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انسان جب کمزور ہو جاتا ہے، وہ اسے دبا لیتی ہے۔ یہی حال شکل کے بگڑنے کا ہے۔ عمر ڈھلتی اور ... اور شکل میں بگڑنے کے جو سامان تجربے اور صلاحیتیں ہیں سب کے سب بروئے کار آجاتے ہیں۔ ہم اکثر کہتے ہیں کہ یہ شخص جوانی میں کس قدر خوبصورت تھا، اسے کیا ہو گیا۔ کتنی جلدی اکثر لوگ حُسن سے قبح، خوش قامتی سے بد قوارگی کی منزلیں طے کر لیتے ہیں۔ کتنا عبرتناک ہے یہ سفر جسے زیادہ تر انسان طے کرتے رہتے ہیں، نادانستہ! بلاارادہ! بغیر سفر کے!!

وہ لوگ جو خود پرستی میں مبتلا ہو گئے یا جنھوں نے دل شکنی، ہوس اور بیدردی کو اپنا شعار بنا لیا ان کی شکل کو مسخ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ شاعر نے تنبیہ کی تھی کہ نفس کی خباثت کا پتہ سالہا سال نہیں چلتا۔ لیکن وہ لوگ جو قیافہ شناس ہیں اس کا پتہ ایک پل میں لگا لیتے ہیں! اور ذرا عمر بڑھ جائے تو انسان کی طبیعت کے شر کی دریافت ہر عام آدمی بھی آسانی سے کر سکتا ہے۔ رُخ کو مصحف کہا گیا ہے۔ یہ شاعروں اور عاشقوں کی عقیدت مندی ہے، وہ مصحفِ جاں کے خدوخال کو پڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن عام آدمی کے لئے "رُخ" نامۂ اعمال ہے۔ انسان کے اعمال اس کی شکل سے جھانکتے رہتے ہیں۔ چہروں پر عمر کے ساتھ جو سختی اور کرختگی آجاتی ہے وہ سب انسان کے اپنے اعمال کی دین ہے۔ عمر کے ساتھ شر آمادہ طبیعتیں بدی میں رواں ہو جاتی ہیں۔ بہرکیف حسن وہی ہے جو دیرپا ہو اور جس کا رشتہ خدوخال کے بجائے افکار و اعمال اور نقطۂ نگاہ کے ساتھ جڑا ہو۔ بہت سے لوگ ساحل پر رہ کر اپنی پیٹھ ٹھونکتے ہیں کہ دامن کو تر نہیں ہونے دیا۔ لیکن داد اُن کو ملنی چاہیے جو گرداب سے نبرد آزما ہو کر بھی شگفتگی، ہمدردی، خوش دلی کے دامن کو آلودہ یا شکن آلود نہیں ہونے دیتے۔ یہ لوگ خواہ ہر لمحہ موج کے تھپیڑوں کی زد میں رہیں، نہ طمانیت سے ہاتھ دھوتے ہیں نہ سکون سے۔ عمر کے ساتھ ان کے جمال اور وجاہت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

●●

اُٹھائے کچھ ورق لالہ نے ....

حضرت امیر خسروؒ کے عرس کے موقع پر خواجہ حسن نظامی دوسری تقریبات کے علاوہ، ایک ادبی محفل بھی برپا کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ اس بار صدارت میں کروں۔ چنانچہ بیک وقت بغلیں اور کتابیں جھانکنا شروع کر دیں۔ مولانا آزاد لائبریری سے امیر خسروؒ کی مثنویاں نکلوائیں۔ خیال آیا کہ انگریزی ادب کی چند طویل نظمیں بھی پڑھی جائیں جو اس دور کے قریب لکھی گئی ہوں۔ جیوفرے چاسر کی حیثیت انگریزی نظم کے باوا آدم کی ہے۔ خسرو اور چاسر کے درمیان تقریباً ایک صدی کا فاصلہ ہے۔ "کینٹربری کی کہانیاں" (CANTERBURY TALES) چاسر کی سب سے مشہور اور مقبول طویل نظم ہے۔ نظم کی ساخت سادہ سی ہے۔ کینٹربری کی زیارت کے لیے قافلہ روانہ ہو رہا ہے۔ مسافر سفر کو بہلانے کے لیے طے کرتے ہیں کہ اُن میں سے ہر ایک راہ میں دو کہانیاں سنائے گا۔ زائرین عمر، عادات، کردار، اطوار، افتادِ طبع، پیشہ، مشاغل، حیثیت اور تجربات کے لحاظ سے رنگا رنگ ہیں۔ شاعر نے ان کے کردار کی عکاسی میں کردار نگاری اور داستان گوئی کی آمیزش اور آویزش سے ایک جیتا جاگتا نگارخانہ، ایک چلتی پھرتی ہنستی بولتی دنیا پیدا کر دی ہے۔ انگریزی ادب میں اس پایہ کی خلاقی صرف ایک اور فن کار کے حصّہ میں آئی۔ اس کا نام شیکسپیئر تھا۔

"کینٹربری کی کہانیاں" کی ورق گردانی کے بعد خیال آیا کہ خسرو کی عشقیہ مثنویوں کی ردیف میں چاسر کی طویل عشقیہ نظم TROILUS & CRISEYDE کا مطالعہ زیادہ برمحل ہوگا۔ اس کتاب کو دیکھنا شروع کیا۔ بلکہ چاسر پر ایک کتاب میں اس طویل نظم سے متعلق تبصرہ کو۔ اس نظم میں کرداروں کی جو دلنواز اور معنی خیز تصویر کشی چاسر نے کی ہے اور جس طرح کرداروں کا باہم ردِ عمل اور واقعات، دکھ یا سکھ اور کردار اور داستان میں جو ربط باہم پیدا کیا ہے اس کی مثال فارسی اور اردو مثنویوں میں نہیں ملتی۔

قارئین حیران ہوں گے کہ ان سطور کا عنوان سے کیا تعلق۔ واقعی تمہید اتنی ہی طویل ہو گئی جتنی ہم میں سے اکثر ہندوستانی عموماً گفتگو کے دوران روا رکھتے ہیں۔ نفسِ مضمون کی دور دور تک آہٹ نہیں ملتی۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ جو صاحب آپ سے ملنے کسی غرض سے آئے ہیں وہ دنیا اور ملک و ملت کے بہت سے مسائل پر تبصرہ

کرنے اور آپ کے کام کے متعلق ناخواندہ مشورہ کا آپ پر احسان رکھنے کے بعد برسرِ مطلب آتے ہیں اور بیچ مقصد
دراصل ان کی شانِ نزول تھا اس کا ذکر اٹھتے اٹھتے اور چلتے ہوے اس انداز سے کرتے ہیں جیسے وہ فروعی اور
ضمنی بات انھیں اتفاقاً یاد آگئی ہو۔ کوئی اُن سے پوچھے کہ اِس فریب سے کیا حاصل۔ وہ دھوکا کسے دے رہے ہیں؟
اس شخص کو جس کا قیمتی وقت انھوں نے طوالت تمہید کی آڑ میں برباد کیا، یا اپنی ذات کو جو دوسروں کو ناحق
بے وقوف سمجھنے پر تلی ہوئی ہے۔ ان تمہید سازوں کو یہ نہیں معلوم کہ ان کے جانے کے بعد ان کے مخاطب کے دل سے
دھواں اٹھتا ہے اور اس کی زبان کے سرے پر وہ الفاظ تلملاتے ہیں جو اگر ادا ہو جائیں تو بلوے کو جنم دیدیں
اور شائستگی کو پیغامِ مرگ۔

الغرض تمہید سے عذر اولیٰ۔ ان دونوں کتابوں کو کھولنے کے بعد یہ دہ دُور نہ جاسکا تھا کہ راستہ
رُکتا ہوا پایا۔ ایک بہت بڑی سی کھائی نظر آئی، جسے پار کرنا ممکن نہ تھا۔ یعنی پڑھنے والوں نے دونوں کتابوں میں
سے بہت سے ورق پھاڑ لیے تھے۔ اب کیجیے آپ جو کرسکتے ہوں۔ پھاڑنے والے نے یہ نہیں سوچا کہ ان اوراق
کا لب لباب قلم بند کیا جاسکتا تھا، اور اگر دماغ کو محنت کے لیے آمادہ کرنا ممکن نہ تھا تو ان اوراق کو نقل کرنے
میں کیا دشواری تھی۔ لیکن اس عہدی طالب علم نے وہ راہ اختیار کی جو بظاہر آسایش کی راہ تھی۔ لیکن دراصل
یہ راستہ بے حسی، خود غرضی، چوری، بدخلقی اور بربادی کا راستہ ہے۔

علم کی خدمت اور اشاعت کا کام کلاس روم سے زیادہ لائبریری انجام دیتی ہے۔ انسانی آگاہی اور
بصیرت کے دریا کو کوزہ میں بند کرنا لائبریری کے سوا کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں۔ ترقی کے سارے
اشاریوں کو تھوڑی دیر کے لیے بھلا دیجیے، صرف یہ دیکھنے کی کوشش کیجیے کہ آبادی اور کتب خانوں اور فی
کس اُن کے استعمال کا تناسب کیا ہے۔ پتہ چل جائے گا کہ وہ شہر یا ملک کس حد تک ترقی یافتہ ہے اور مزید
ترقی کے کیا امکانات رکھتا ہے۔

کتاب سے ورق پھاڑنے والے ظالم اور جاہل ہیں۔ اُن پر علم کے قتل کرنے کا الزام عاید ہوتا ہے
وہ روشنی کے دشمن اور اندھیرے کے دوست ہیں۔ وہ بصارت اور بصیرت کا خون کرتے ہیں۔ گوشت سے
ناخن کو جدا کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ کتاب کی وحدت کو پارہ پارہ کرکے وہ لذت اندوز ہوتے ہیں۔ کتاب کی
سالمیت کو ٹکڑے ٹکڑے وہ مزے لے لے کر کرتے ہیں۔ وہ محسن کش اور علم دشمن ہیں۔ ان کی نگاہ میں علم کی
چندان وقعت نہیں۔ کتابوں پر مجرمانہ حملہ کرکے یہ لوگ طہارت اور پاکیزگی سے روگرداں ہیں۔ یہ احسان فراموش اور

سیڑھی کو لات مارتے ہیں جس نے انھیں بام پر پہنچایا تھا یا پہنچانے کا وسیلہ فراہم کیا تھا۔ کتاب علم و دانش کا ظرف ہے، روشنی اور ہدایت کی حامل ہے، تہذیب و تمدن کا ذخیرہ ہے۔ کتاب کے ساتھ ظلم کرنے والے زندگی کی اعلیٰ اقدار کے منکر ہیں۔ قلب و نظر کی پاکیزگی سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ وہ وفا نا آشنا ہیں۔ کتاب کے ساتھ جس نے بیدردی برتی ہو وہ مادرِ درسگاہ کا حق کب ادا کر سکے گا۔ اس کے کلیجہ میں خنجر گھونپنے میں اسے کیوں تامل ہونے لگا۔ ایسا کندۂ ناتراش بھلا استادوں کی عزت کیوں کرنے لگا، بزرگوں کو خاطر میں کیوں لانے لگا۔

ہمارے بچپن کی بات ہے، اگر کبھی کتاب ہاتھ سے گر گئی، تو اسے اٹھا کر آنکھوں سے لگاتے تھے، ہونٹوں سے چومتے تھے، احترام اور محبت اور پشیمانی کے زیرِ اثر۔ اور اب یہ عالم ہے کہ ہمارے بعض نونہالوں کو اس کا جگر چاک کرنے میں تامل نہیں۔ اسے گیند کی طرح پھینکنے میں باک نہیں۔ کتاب کی قیمت اب صرف اتنی رہ گئی ہے جتنی اس پر لکھی ہو۔ اس میں جو کچھ لکھا ہے، کتاب کی قدر و قیمت کو اب اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ کتاب کے ساتھ اس نوع کا تعلق بازاری تعلق ہے۔ یہ دھندے اور کاروبار، بالاخانہ اور بہیمیت کی باتیں ہیں۔ علم، روشنی اور تہذیب کی نہیں۔ تہذیب کا لب لباب کیا ہے؟ حرمتیں، پاکیزگیاں، لطافتیں۔ یہ نہ رہیں تو کچھ نہ رہا۔

ہوائی اڈے پر یہ منظر اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ کاونٹر کے سامنے مسافروں کی طویل قطار صورتِ سوال کھڑی ہے۔ ہاتھ میں بریف کیس ہے۔ بریف کیس میں کیا ہوتا ہے؟ بالعموم کاغذات اور کتابیں۔ مسافر اسے اپنے پہلو میں زمین پر رکھ دیتے ہیں کہ جب لکیر یا قطار کو دوبارہ جنبش ہوگی تو اسے اٹھا کر چند قدم آگے بڑھیں گے اور پھر زمین پر رکھ دیں گے۔ لیکن ان میں ایسے مسافر بھی نظر آتے ہیں جو بریف کیس کو اٹھانے کے بجائے اسے پیروں سے سرکاتے ہیں۔ یہاں جان پر بن جاتی ہے۔ انھیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کتنے بڑے ظلم، کیسی شرمناک جہالت کا ارتکاب کر رہے ہیں اور یہ لوگ نوخواندہ ناتراشیدہ طالب علم نہیں بلکہ معاشرہ کے ترقی یافتہ، تربیت یافتہ، صحبت یافتہ افراد۔ آپ اعتراض کیجیے تو برہم ہو جائیں گے "آخر ہاتھ اور پاؤں میں فرق ہی کیا ہے۔ دونوں ایک ہی جسم کے حصے ہیں۔ ہاتھ سے نہ اٹھایا، پاؤں سے سرکا دیا تو کون سی آفت آگئی"۔ اس دلیل کا آپ کیا جواب دیں گے بغلیں جھانک کر رہ جائیں گے۔ منطق کے بغیر مفر بھی نہیں۔ لیکن زندگی میں ایسے مقامات بھی ہیں جہاں منطق کا گزر بھی نہیں۔ بہت سی لطافتیں ہیں۔ بہت سی خوب صورتیاں، بہت سی نفاستیں جنھیں منطق کے شکنجے میں کسا نہیں جاتا۔ جو لوگ ذہنی غذا کے ساتھ یہ برتاؤ کرتے ہیں، انھیں جسمانی غذا کو بھی پاؤں سے دھکیلنے میں کوئی سنکوچ نہ ہوگا، اگر یہ

خوف نہ ہو کہ اس طرح گرد اور جراثیم ان کی غذا میں شامل ہو جائیں گے۔ رزق اور علم دونوں کا احترام واجب ہے۔ دونوں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ اس احترام میں ان کے پیدا کرنے والے، اُن سے ہمیں سرفراز کرنے والے کا احترام اور سپاس بھی شامل ہوتا ہے۔ احترام اور حرمت کے مفہوم میں اثبات کے ساتھ نفی بھی ہے۔ اس نفی سے ہم گریز کریں گے تو اثبات تک کیونکر پہنچیں گے۔ اسلام کا تو یہ شیوہ ہے کہ نفی سے اثبات کی طرف، رد سے قبول کی جانب لے جاتا ہے تاکہ اشتباہ، احتمال اور غلط بحث کی گنجائش نہ رہے۔ خدائے واحد کی خدائی کا اعلان بھی دوسرے خداؤں کے امکان کی نفی کے بعد کیا گیا ہے۔ اوامر اور نواہی ایک ہی مسئلے کے دو رخ ہیں۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ چاسر سے متعلق وہ دونوں کتابیں جراحت خوردہ تھیں اور وہ شخص بھی جو مضمون پڑھ رہا تھا اور ٹوٹے ہوئے سلسلے کو جوڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ غزل ہوتی تو کام چل جاتا کہ اس میں تسلسل خیال اہم نہیں لیکن یہاں تو سابقہ مثنویوں سے تھا۔ کہانیوں سے بیچ کی کڑیاں غائب کر دی جائیں تو کیا رہ گیا۔ وہ شخص اکثر سوچا کرتا ہے کہ اردو والوں نے غزل کے بجائے مثنویوں کو منظورِ نظر بنایا ہوتا تو اردو والوں کے مزاج کی افتاد بدلی ہوئی ہوتی۔ ان کی باتیں زیادہ مربوط ہوتیں، ان کی کاوشیں زیادہ طویل۔ ان کے عزائم زیادہ بلند۔ ان میں تھوڑی دوڑنے کے بجائے میراتھان (MARA THON) دوڑنے والے کا دم ہوتا۔ زندگی کے مراحل میں پہیہ بہلنے سے وہ گریز نہ کیا کرتے۔ خاکہ اور منصوبہ بنا کر آگے بڑھنے سے انھیں وحشت نہ ہوتی۔ لیکن اس شخص کا جھگڑا غزل سے نہیں، اُس بے حرمتی اور بے اتفاقی سے ہے جو کتابوں کے ساتھ روا رکھی جاتی ہے اور جس کی سب سے مکروہ اور شرمناک شکل وہ ہے جو اس دراز نفسی کی محرک ہوئی۔ ہمارے کتب خانوں کی بہت سی کتابیں زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں:

اُٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

●●

رمضان شریف

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، رمضان خیر و برکت کا مہینہ ہے۔ خیر و برکت، عبادت، ریاضت، ضبط، اور نفس کشی کا مہینہ۔ اس سے یہ نہ سمجھیے کہ یہ باتیں صرف ایک ماہ کے لیے ہیں اور باقی گیارہ مہینے ان پابندیوں سے آزاد ہیں۔ مہینوں اور دنوں میں اس قسم کا فرق ہو ہی نہیں سکتا۔ جو باتیں اچھی ہیں، جو باتیں ضروری ہیں، وہ ہمیشہ ہر لمحے اچھی ہیں، ضروری ہیں۔ ہاں ایک مہینہ اس لیے چن لیا گیا ہے کہ ان باتوں کی طرف یکسوئی کے ساتھ بھرپور اور بھرسک دھیان دیا جائے۔ گویا ایک سبق بار بار دہرایا جا رہا ہے تاکہ آنے والے گیارہ مہینوں میں اس کے نقوش دھندلے نہ ہو پائیں۔ گھڑی میں چابی دی جاتی ہے تو وہ ایک مقررہ مدت تک چلتی رہتی ہے۔ بیٹری کو بھی ایک عرصہ کے بعد پھر چارج کیا جاتا ہے۔ کوئی انسان تنہا بیٹھ کر عبادت کرے، ریاضت کرے، یہ ایک اچھی بات ہے، اس کے نتیجے میں اس کی اخلاقی اصلاح اور تربیت ضرور ہوگی۔ لیکن اگر ایک ماہ کو اجتماعی عبادت و ریاضت کے لیے مخصوص کر دیا جائے، اس طرح کہ جدھر دیکھو لوگ اپنے پیدا کرنے والے اپنے پالنے والے کو یاد کر رہے ہیں اور اس کی راہ میں سختیاں جھیل رہے ہیں، بُری خواہشات کو دبا رہے ہیں، کچل رہے ہیں اور خود کو نفس کی تہوں، روح کی گہرائیوں تک نظم و ضبط کا عادی بنا رہے ہیں، تو اس کا اثر سو گنا زیادہ ہوگا۔ گویا افراد کی تعداد سے ان کی نیکیوں اور عبادتوں کو ضرب دیا جا رہا ہے۔ روحانی امداد باہمی کا یہ زرّیں سلسلہ ایک ماہ تک رات دن دہرایا جاتا ہے۔ خدا کے بندے اس کی تسبیح و تہلیل میں کچھ اس طرح مصروف نظر آتی ہیں جیسے پو پھٹتے وقت چڑیاں مل کر اپنے پیدا کرنے والے کی حمد و ثنا کے گیت گاتی ہیں۔

فارسی شاعر شیخ سعدیؒ نے لکھا تھا کہ بادل اور ہوا، چاند اور سورج اور آسمان ہر وقت کام میں لگے ہوئے ہیں، تاکہ انسان روٹی پائے اور اسے غفلت کے ساتھ نہ کھائے۔ ساری کائنات جس کے لیے سرگرمِ عمل اور تابعِ فرمان ہے، اس انسان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ خالق کے حکم سے سرتابی کرے۔ رمضان میں اجتماعی عبادتوں اور ریاضتوں کی کثرت اور شدّت پیمانِ وفا کی تجدید ہے کہ اے خالق! ہم تیرے بندے ہیں، تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد اور نصرت کے طلب گار ہیں۔ ہمیں توفیق دے کہ ہم تیری عبادت

اور تیرے بندوں کی خدمت کریں۔ ہمیں حوصلہ دے کہ ہم بُری خواہشوں سے دامن جھٹک دیں۔ ہمیں طاقت دے کہ خود کو اس طرح تپائیں کہ ساری آلائشیں جل کر بھسم ہو جائیں اور ہم کندن کی طرح نکھر جائیں۔

لہٰذا روزہ صرف دن بھر کھانا نہ کھانے، پانی نہ پینے کا نام نہیں ہے۔ یہ تو بےشمار پابندیوں میں سے صرف ایک پابندی ہے جو روزہ دار اپنے اُوپر عاید کرتے ہیں۔ بلکہ یہ ان ہمہ گیر پابندیوں کی ایک ظاہری شکل ہے۔ ظاہری شکل میں کھو کر باطنی مقصد کو بھول جانا ہرگز روا نہ ہوگا۔ روزہ کا مقصد ہے خود کو رضائے الٰہی کے تابع کرنا، اندرونی بُرائیوں کے خلاف جہاد کرنا۔ اس نظم وضبط کو اپنے اندر اُتار لینا، کائنات جس پر قائم ہے۔ خود غرضی، نفس پروری، بغض، کینہ، حسد اور بدی سے دامنِ دل کو پاک کرنا اور انسانوں کی خدمت، مدد اور دستگیری کرنا۔ مسلمان پر یہ بڑی پابندی لگائی گئی ہے کہ اپنی عبادت کے فوائد کو اپنی ذات تک محدود نہ رکھے۔ عبادت کو خود غرضی کی تہمت سے بچائے۔ اسے معاملات کے ساتھ شیر وشکر کر دے۔ خالق کی عبادت، انسانوں کی خدمت اور ان سے محبت کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو سمجھو کہ تمہاری عبادت میں کچھ کھوٹ، نیت میں کچھ فتور ضرور ہے۔ پھر تو تمہاری عبادت ایک ایسا جسم ہے، روح جسے چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ عبادت سچائی اور پاکبازی، ایفائے عہد، اور دردمندی کو اپنے جلو میں لاتی ہے۔ اگر نہ آئے تو سمجھو کہ اس میں یا تو انانیت، یا خود غرضی یا بےحسی، یا ریاکاری شامل ہو گئی ہے۔

ریاکاری سے زیادہ مہلک کوئی اخلاقی بیماری نہیں۔ اگر عبادت دنیا کو دکھانے کے لیے کی گئی تو وہ سراسر فریب ہے۔ جب ہی تو اسلام نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ ہمارا جینا اور مرنا، گھوارے سے قبر تک کا سفر، سب اللہ کے لیے ہے۔ اگر عبادت ظاہری سطح پر کی گئی تو وہ گناہ تو نہیں، لیکن اسے ثواب میں داخل نہیں کریں گے جس طرح ٹکریں مارنے سے نماز نہیں ہوتی، اسی طرح فاقہ کر لینے سے روزہ نہیں ہوتا۔

نماز پڑھتے وقت، روزہ رکھتے وقت ذہن اور دل اس مقصد سے معمور ہونا چاہئیں جس کے لیے یہ عبادتیں کی جا رہی ہیں۔ عبادتوں کا مقصد ہے روح کو بُرائیوں سے پاک کرنا، اخلاق کو سنوارنا، گھمنڈ اور خود غرضی سے نجات دلانا اور دل میں انسانیت کا درد پیدا کرنا کہ یہی ذریعہ خالق تک رسائی کا ہے اور یہی طریقہ ہے اُس کا شکر ادا کرنے کا۔

بعض لوگ روزہ اس انداز سے رکھتے ہیں گویا وہ خدا اور اس کے بندوں پر احسان کر رہے ہیں۔ روزہ اگر نفس کی فربہی کی طرف لے جائے، تو پھر تن کی لاغری کام نہ آئے گی۔ اس بات پر گھمنڈ کرنا کہ

ہم روزہ رکھ لیے ہیں اور ان لوگوں کو جو روزہ نہیں رکھ سکے، حقارت سے دیکھنا روزہ کی توہین اور تخریب ہے۔ دل میں یہ بھی خیال کرنا کہ ہم بہتوں سے اچھے ہیں، وہ روزہ نہیں رکھتے ہم رکھ لیے ہیں، روزہ کو مکروہ اور بے اثر کر دینے کے لیے کافی ہے۔

وہ لوگ نادان ہیں، جو روزہ کو، جو سراپا رحمت ہے، خلق کے لئے باعثِ زحمت بنا دیتے ہیں۔ جو ہمارے اکثر محلوں میں رمضان شریف کے دوران رات بھر چہل پہل اور گہما گہمی رہتی ہے۔ یہاں تک بھی ٹھیک ہے لیکن اس چہل پہل کے ساتھ شور و غل بھی ہوتا ہے، جو بسا اوقات ان ہمسایوں کی نیندیں حرام کر دیتا ہے، جو مذہباً روزے کے پابند نہیں، یا پابند ہونے کے باوجود روزہ نہیں رکھ پا رہے ہیں۔ اس عنوان سے شور مچانا اور خلق خدا کو تکلیف پہنچانا اور سکون میں خلل ڈالنا رمضان شریف جیسے پاکیزہ مہینہ کو بدنام کرنا اور مذہب کی روح کو بدنام کرنا ہے۔ تم خلق خدا کے لیے رحمت بن کر آئے ہو۔ تمھارے اعمال اور تمھاری عبادات کا اثر دوسروں پر خوشگوار اور خوش انجام پڑنا چاہیے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ لوگ روزہ کو فاقہ میں بدل دیتے ہیں۔ سحری کھائی، دن کسی طرح بھوکے پیاسے گزار لیا، روزہ افطار کیا اور کھانا کھانے بیٹھ گئے اور کھانا پھر اس طور پر کھایا، گویا دن بھر کے بھوکے رہنے کی تلافی ان پر واجب ہو گئی ہو۔ روزہ کو عبادت اور نفس کشی کا مرتبہ جب ہی حاصل ہوتا ہے، جب نمازیں پابندی کے ساتھ پڑھی جائیں اور جب دعیان شکم اور حلق سے زیادہ، کہیں زیادہ، اللہ کی طرف اور اس کی مخلوق کو راحت پہنچانے کی ہو۔ جو لوگ روزہ رکھ کر جھنجھلاتے ہیں، غصّہ کرتے ہیں، کاٹنے کو دوڑتے ہیں، انھیں روزہ سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جو لوگ روزہ کے دوران بُری باتیں زبان پر لاتے ہیں، بُرے خیالات سے زبان کو آلودہ کرتے رہتے ہیں، وہ نفع کے بجائے ٹوٹے کا سودا کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو افطار کرتے ہی ان اخلاقی پابندیوں کو خیرباد کہہ دیتے ہیں جو دن میں انھوں نے اپنے اوپر روا رکھی تھیں، روزہ کی روح سے نا آشنا رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے حقوق سے غفلت کو نظرانداز بھی کر دے مگر بندوں کے حقوق سے پہلوتہی کو معاف نہیں کرتا۔ اس الزام سے حذر کرو کہ فلاں شخص اپنی عبادت کی وجہ سے اپنے فرائض منصبی سے غفلت برت رہا ہے۔ حق العباد کا مواخذہ بہت سخت ہوتا ہے اور اس بازپرس کے وقت عبادت بھی کام نہیں آتی۔ عبادات کی پابندی کرتے وقت اس کا اہتمام لازم ہے کہ فرائض منصبی کو اور زیادہ انہماک کے ساتھ انجام دیا جائے۔ نماز اور روزہ کو کام نہ کرنے یا نہ پڑھنے یا کم پڑھنے کا بہانہ نہ بناؤ۔

برادرانِ وطن میں یہ تصور بہت عام ہے کہ مسلمان دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر کھانا کھاتے ہیں، ہمارے روزہ کو وہ اکثر دن کے فاقہ اور رات کی پرخوری سے تعبیر کرتے ہیں۔ کچھ تو برادرانِ وطن ہمارے ساتھ زیادتی کرتے ہیں اور کچھ ہم روزہ کے ساتھ۔ دونوں طرح کی زیادتیوں کو بند کرنا ہے۔ انھیں بتانا ہے کہ روزہ ضبطِ نفس کے سوا کچھ نہیں۔ اور خود کو یہ راہ دکھانا ہے کہ عبادت رسوم کا نام نہیں۔ عبادت وہ رشتہ ہے جو فرد کو خالق اور مخلوق کے ساتھ جوڑتا ہے، جو برائیوں کی کمر توڑتا ہے، اور انسان کو اچھے رجحانات کی طرف لے جاتا ہے۔

غور کیجیے، تہذیب نام ہی ضبطِ نفس کا ہے۔ جانوروں اور جاہلوں کو ضبط کرتے ہوئے کس نے دیکھا ہے۔ اخلاق باختہ اور دریدہ دہن لوگ کب ضبط کر پاتے ہیں۔ گھمنڈ کے نشہ میں ہوش ہی نہیں، عنان بھی ہاتھ سے جاتی ہے۔ اپنے روزمرّہ کا جائزہ لیجیے۔ دوسروں سے ہر قدم پر واسطہ پڑتا ہے۔ وہ کبھی آپ کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں، کبھی آپ کے احساسات کو مجروح کرتے ہیں، کبھی خود آپ کو ان کی بے طرح بات بھی ناگوار ہوتی ہے۔ اور جب آپ تنہا ہوتے ہیں تو آپ کے دل میں اچھے برے ہر طرح کے خیالات آتے ہیں۔ اس بات کی کسوٹی کہ آپ کس حد تک مہذب ہیں۔ اکثر صرف یہ ہوتی ہے کہ آپ دوسروں کے رویہ پر اپنی خفگی، جھنجھلاہٹ اور غصہ کو اور اپنے برے خیالات اور وسوسوں کو کس طرح دباتے ہیں، کیونکر ان پر قابو پاتے ہیں۔ اگر انسان جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے اور سوچتا ہے اسے ضبط کرے تو جینا دوبھر ہو جائے۔ ہر وقت تصادم اور سر پھٹول ہوتی رہے۔ تو دو آدمی دست و گریباں نظر آئیں گے، پہلے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخیں گے، پھر ہاتھا پائی کی نوبت آئے گی۔ ایک دوسرے کو پچھاڑ کھائیں گے۔ انسان کا ناموس، اس کا بھرم، اس کی اخلاقی تسخیرات سب ضبطِ نفس کی رہینِ منت ہیں۔ باہمی تعاون اسی کا ثمرہ ہے۔ اور ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک بلا قید نوع انسان نے جو ترقیاں کی ہیں اور جو خوشیاں سمیٹی ہیں اور دنیا کو جس طرح سجایا ہے سنوارا ہے وہ سب ضبطِ نفس کی دین ہے۔ روزہ ضبطِ نفس کی سب سے موثر تربیت ہے اور رمضان شریف کا مبارک مہینہ اور ضبط و تشفی کا یہ تواتر روح کی طہارت اور تقویت اور اخلاق کی تہذیب کا سب سے کارگر ذریعہ ہے۔

●●

خودسوزی

اخباروں میں آئے دن خبریں آتی رہتی ہیں کہ فلاں عورت باورچی خانہ میں جل کر مرگئی۔ ان میں سے بعض موتیں دراصل لاپرواہی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ آگ قریب ہو تو اتنی ہی احتیاط برتنی چاہیے جتنی اس وقت جب انسان بُرے لوگوں کی سنگت میں ہو۔ آگ لگنے اور بُرائی پکڑنے میں دیر نہیں لگتی اسی وجہ سے ہمیشہ اصرار کیا جاتا ہے کہ عورتوں کو رسوئی گھر میں نائلون کی ساڑی پہن کر نہ جانا چاہیے اور انسانوں کو بُرے لوگوں کی صحبت سے پرہیز کرنا چاہیے۔

ایسی موتوں کے متعلق لوگ قیاس آرائی کرتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ شوہر اور ساس یا نند نے اس غریب کو اس لیے جلا دیا کہ اس کے ماں باپ جہیز کی مانگ کو پورا نہ کرسکے تھے۔ بسا اوقات یہ بات صحیح ثابت ہوئی ہے۔ سوچیے اس سے زیادہ شرمناک، اس سے زیادہ بے غیرتی کی بات کیا ہوسکتی ہے کہ انسان زندگی کی ساتھی کو اس بنیاد پر پرکھے کہ وہ کتنی دولت لے کر آئی ہے۔ دولت کے یہ پجاری اگر پہلی فرصت میں بیوی سے پیشہ کرانے لگیں تو حیرت نہ ہونی چاہیے۔ بلکہ پیشہ کرانا جہیز مانگنے سے کم بُرا ہے؛ یہ دونوں کام لالچ کی بنا پر کیے جاتے ہیں، لیکن جہیز مانگنے والے ایک پاکیزہ رشتہ کو شروع ہی سے ناپاک کر دیتے ہیں، اور نہ صرف بیوی بلکہ اس کے خاندان پر بھی بے غیرتی اور بے رحمی سے وار کرتے ہیں۔ پیشہ کرانے والا شادی کے بعد بھٹکتا ہے۔ اس کے علاوہ جہیز مانگنے والے کو اکثر احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک بہت بڑا گناہ، ایک سنگین جرم کر رہا ہے اور پیشہ کرانے والا باوجود بے غیرتی کے سر چھپاتا پھرتا ہے۔ وہ اپنے جرم کو محسوس کرتا ہے۔ جس گناہ کا احساس ہو، اس سے توبہ کی جاسکتی ہے، اس کا کفارہ ادا کرسکتے ہیں؛ جہاں گناہ کا احساس ہی نہ ہو، وہاں توبہ، کفارہ، پشیمانی اور اصلاح کا ذکر بےسود ہے۔ یہ لالچی شوہر کیا کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ان کی اولاد اپنے ماں باپ کو کتنی حقارت سے دیکھے گی جب اُسے معلوم ہوگا کہ ان کی ماں اس لائق نہیں تھی کہ مال و دولت کے بغیر کوئی اسے قبول کرتا اور ان کا باپ کتنا بے غیرت اور لالچی تھا کہ اس نے شادی کو دولت حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا تھا! اس پاکیزہ

رشتے سود و زیاں کے تصور سے بالاتر ہے، اس نے پیسہ جوڑنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ ایسی ماں اور ایسے باپ کی کیا عزت اولاد کے دلوں میں رہ جائے گی۔ اس گھناؤنی رسم کے حق میں آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ عام ہے اور کسی کا دھیان اس کی بنیادی بدطینتی اور کراہت کی طرف نہیں جاتا۔ کسی بُری رسم کے عام ہونے کی بات کرنے والے کیا یہ نہیں سوچیں گے کہ گمراہ عورتوں کے لیے جسے 'پیشہ' کہا جاتا ہے اس کی روایت اور زیادہ عام ہے، ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسے تو انسانیت کے سب سے بڑے پیشہ کا نام دیا جاتا ہے! پیشہ کی بُرائی اس بنا پر کم نہیں ہو جاتی کہ وہ عام ہے یا قدیم ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ جہیز مانگنا اس سے بھی زیادہ بُرا ہے، کہ اس کا پھیلاؤ زیادہ ہے، زیادہ لوگ اس کی زد میں آتے ہیں۔ لڑکی کے گھر والوں پر اس کا تباہ کُن اثر تو پڑتا ہی ہے، بے غیرتی اور لالچ کے اس کاروبار میں لڑکے کے گھر والے بھی شریک ہوتے ہیں، بلکہ یہ شرمناک حرکت ان ہی کے اصرار پر سرزد ہوتی ہے۔

آپ اعتراض کریں گے، تو لڑکے کے بے غیرت والد کہیں گے کہ ہمیں جو اپنی لڑکی کو جہیز دینا پڑا تھا، اس نقصان کو پورا کیسے کریں۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ نقصان کو پورا نہیں کر رہے ہیں، بلکہ اس کے سلسلہ کو طول دے رہے ہیں۔ بُری بات کو جتنے زیادہ لوگ دہرائیں وہ اتنی ہی زیادہ بُری ہو جاتی ہے۔ مرض کو وبا کی شکل دینے والے یہ نہیں کہہ سکتے کہ مرض عام ہو گیا اس لیے اسے مرض کہنا ہی نہ چاہیے۔ یہ روگ سماج کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ جس معاشرہ میں گھر کی بنیاد لالچ پر رکھی جائے اور جہاں نسل کی افزائش کا ناتہ سیم و زر کے ساتھ جوڑا جائے اس کی اُٹھان صحت مند کیونکر ہو سکتی ہے۔

لیکن یہ مان لینا صحیح نہ ہوگا کہ گھروں میں جلنے سے موتیں ہوتی ہیں وہ یا تو لاپرواہی کی بنا پر یا سسرال والوں کے ہاتھوں سرزد ہوتی ہیں۔ ان سے بھی زیادہ دردناک وہ موتیں ہیں جب دُلھن اس فکر میں کہ اس کے ماں باپ اس کی سسرال کے مطالبات کو ماننے کی حیثیت میں نہیں ہیں، خود کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ چاہے سسرال والے اس کو جلائیں، یا وہ خود کو جلا ڈالے، قاتل ایک ہی ہیں۔

خود سوزی کی یہ ایک مثال تھی۔ عبرت کا مقام ہے کہ والدین نے جس لڑکی کی شادی اتنی آرزوؤں اور امنگوں کے ساتھ کی، خود لڑکی کتنی تمناؤں اور ولولوں کے ساتھ دُلھن بن کر اپنے رفیق حیات، اپنے سوامی کے گھر گئی: اسے چاندنی کی چار راتیں بھی نہیں ملیں۔ لالچ اور ظلم کے گھور اندھیرے نے اس کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ اُسے روشنی کی صرف ایک راہ نظر آئی، پروانے کی طرح خود کو جلا ڈالے۔ پروانہ خود کو شمع کی

محبت میں جلاتا ہے۔ اس غریب نے خود کو محبت میں نہیں، محبت کی چتا میں جلا ڈالا۔

راقم نے اپنے مضامین اب تک ان بیماریوں کا ذکر کیا تھا جو ہندوستانی مسلمانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس بار قلم بھٹک کر ایک ایسے زخم کو کریدنے لگا جو ہمارے ہندو بھائیوں کے لیے ناسور بن گیا ہے۔ مضمون شروع کرتے وقت ارادہ یہ نہ تھا، جیسا کہ اس مضمون کی دوسری قسط سے ظاہر ہوگا۔ لیکن ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے لے حق ہے کہ کبھی کبھی وہ ان مسائل کی طرف بھی دھیان دے جو مسلمانوں تک محدود نہیں ہیں۔ شرط صرف ایک ہے: ہمدردی اور اصلاح کی خواہش۔ جہیز مانگنے کی رسم کو ہندوستانی مسلمان ابھی تک بچے ہوئے ہیں!

پہلی قسط میں ہم نے اس مکروہ رسم کا ذکر کیا تھا، جس نے لاکھوں گھروں میں اندھیرا کر رکھا ہے۔ لڑکی کیا پیدا ہوئی، ماں باپ کے لیے فکروں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ صرف پالنے پوسنے کی بات ہوتی تو غریبی کے باوجود کام چل جاتا۔ لیکن پال پوس کر، پڑھا لکھا کر، بڑا کر دینے کے بعد کیا کریں گے۔ لالچی لڑکے اور ان سے زیادہ لالچی ان کے ماں باپ منھ پھاڑے ہوئے نظر آئیں گے۔ جہیز مانگیں گے۔ جہیز کے معنی وہ ضروری سامان نہیں جو والدین شادی کے وقت بیٹی کے ساتھ خوشی خوشی کر دیتے ہیں کہ اُسے گھر بسانے میں مدد ملے اور میکہ کی نشانیاں اس کے پاس رہیں۔ اپنی وسعت بھر بلکہ اس سے زیادہ اُمنگوں اور ارمانوں کے ساتھ بیٹی کو جہیز دیتے ہیں۔ اب جہیز کے معنی دوسرے ہی ہیں۔ لڑکے بلکہ اس کے والدین کو ان کے مانگنے پر بدرجۂ مجبوری ایک بڑی رقم اس بات کے لیے دینا کہ ہم نے تمھاری بیٹی کو با دلِ ناخواستہ اپنی کنیز بنانا منظور کر لیا ہے! اس سے بڑی اہانت عورت ذات کی ہو نہیں سکتی۔ وہ ایسا کھوٹا سامانِ تجارت بن گئی ہے جسے پیسہ دیکر نہیں، پیسہ لے کر خریدا جاتا ہے۔ جب تک اس کا رشتہ طے نہیں ہوتا، اس کے ماں باپ اور بھائیوں کی جان سُولی پر رہتی ہے۔ اس غریب کی حیثیت گویا ملبہ کی سی ہے کہ جو لوگ اُسے اٹھا کر لے جاتے ہیں، اُسے ملبہ کے ساتھ پیسہ دیا جاتا ہے۔ ورنہ ملبہ اٹھانے کی تکلیف کون گوارا کرے۔ جہاں سیانی ہوئی اُسے خود اس کا احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کے منحوس وجود نے ماں باپ کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔ بھائی اور بھابیاں الگ پریشان ہیں۔ ایسی صورت میں اس کی اُٹھان اور نشو و نما کیا ہوگی۔ وہ اپنی عزتِ نفس، طمانیت اور خوشی کو وہ کیونکر محفوظ رکھ سکے گی۔ اس کے ماں باپ اُسے سامانِ تجارت کی طرح لے کر گھر گھر دکھائیں گے۔

گھمنڈی لڑکے، جن کی نہ صورت نہ شکل، نہ شخصیت، نہ اہلیت اور نہ لچھن ماں باپ جو لڑکے کو استحصال کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اس بے چاری لڑکی کو چاندی کے گز سے ناپیں گے اور بے دردی سے رد کر دیں گے۔ احساس مند لڑکیاں یہ رسوائی اور ماں باپ کی یہ تکلیف کیسے برداشت کرتی ہوں گی۔ ان کی جان پر بنی رہتی ہوگی۔ چنانچہ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ بعض لڑکیوں کے ہاتھ پیلے بھی نہ ہو پائے کہ انھوں نے اس کرب اور فشار سے تنگ آکر خودکشی کرلی۔ زمین پر بوجھ بن کر وہ رہنا نہیں چاہتی تھیں، زندگی بھر سلگتی رہیں اور چتا میں جل کر راکھ ہوگئیں، جیسے ندی اور بالآخر سمندر نے اپنے فراخ بازوؤں میں لے لیا۔

یہ دور اہل کاروں کا دور ہے جنھیں انگریزی میں بیوروکریسی کہا جاتا ہے اور جسے ہندی والوں نے نوکرشاہی کا نام دیا ہے۔ کون سی نوکری، کون سا منصب، عوام کی نگاہ میں کتنا اہم ہے، اس کا اندازہ شادی کے بازار میں لگتا ہے۔ اگر لڑکا کلرک ہے تو اس کی یہ قیمت ہے، انسپکٹر یا اوورسیر ہے تو یہ اجرت، انجینئر ہے تو یہ بھاؤ، ڈاکٹر ہے تو یہ نرخ، اسسٹنٹ سول سروس میں ہے تو یہ شرح اور انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کا رکن ہے تو یہ دَر۔ یہ تو مقررہ ریٹ ہیں۔ لڑکی والوں سے اس کے علاوہ اور جو کچھ حاصل کیا جاسکے اسے بھاؤ جانیے، بونس سمجھیے یا محنتانہ شمار کیجیے

برائی کو برائی سمجھا جائے تو وہ تیزی کے ساتھ نہیں پھیل پاتی۔ لوگ اسے چوری چھپے کرتے ہیں۔ وہ برائی جسے رواج کی سند مل جائے، وہ آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے سماج میں یہ گھناؤنی رسم ہر طرف جڑ پکڑ چکی ہے۔ وہ نیک بخت جس کا اس طرح سودا ہوا ہے۔ جب لڑکے کی ماں بنتی ہے تو سماج سے اس ظلم، اس تحقیر کا بدلہ لے کر رہتی ہے۔ بدلہ یہی کہ "میرے ماں باپ نے مجھے بیاہنے کے لیے جو جہیز دیا تھا، میں اپنے بیٹے کے لئے اس سے کئی گنا لوں گی، دیکھوں گی کیسے نہیں دیتے ہیں" —— برائی کا یہ سلسلہ جو ہر نئے سودے کے ساتھ اور زور پکڑتا ہے، الٰہی کس طرح ختم ہوگا۔

انسان مظلوم ہے، لیکن قضا و قدر سے زیادہ خود اپنا۔ وہ ظالم ہے اور جاہل ہے۔ ظلم کرتا ہے اور بے خبر رہتا ہے۔ اس کیفیت کو چاہے بے خبری کہیے، چاہے جہالت، اسے معلوم نہیں جہیز مانگ کر وہ کتنا بڑا ظلم کرتا ہے۔ وہ اپنی ماں کو خوار اور رسوا کرتا ہے۔ اس ماں کو جس کی کوکھ سے اس نے جنم لیا ہے۔ وہ عورت کو جتاتا ہے وہ ماں نہیں کنیز ہے۔ اور ایسی کنیز جس کو اس لئے گوارا کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ روپیہ لے کر آتی ہے۔ وہ روپیہ لے کر نہ آتی تو کون اسے گھر میں

گھسنے دینا بیشرمناک برتاؤ صرف اس لئے کہ عورت کمزور ہے اور مرد مضبوط۔ اور جو کمزور سے فائدہ نہ اٹھائے وہ بے وقوف ہے!! اور جو کمزور کو نہ ٹھکرائے اُسے شہ زور نہیں کہتے، جو بے بسوں پہ ظلم نہ کرے وہ بُزدل !!

ہم نے کہا تھا کہ یہ رسم ہمارے ہندو بھائیوں تک محدود ہے — تہ تک جائیے تو یہ بات صحیح نہیں۔ پہلے تو یہ کہ سب ہندوؤں میں اس کا چلن نہیں۔ کچھ ذاتیں اس بُری رسم سے بچی ہوئی ہیں۔ دوسرے یہ کہ آج کل مسلمان بھی اس کی لپیٹ سے جھلسے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں یہ رسم ہنوز عام نہیں۔ کچھ غیرت دریدہ اور اخلاق باختہ اور ہوس پیشہ لوگوں کو چھوڑ کر جنھیں مانگنے میں عار نہیں، باقی مسلمان اِس وبا سے ایک حد تک محفوظ ہیں۔ کب تک محفوظ رہیں گے یہ ایک تشویشناک سوالیہ نشان ہے۔ جس کا تذکرہ اِس مضمون کی آخری قسط میں ہوگا۔

ہم نے کہا تھا کہ جہیز مانگنے کے روگ سے ہندوستانی مسلمان بچے ہوئے ہیں، یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ ایک حد تک بچے ہوئے ہیں۔ سماج کے اثرات کو فرد یا جماعت زیادہ عرصہ تک روک نہیں سکتی؛ پھر لالچ کو زیر کرنے والے ان مستثنیات میں سے ہیں جن سے کلیہ بنتا ہے۔ لہٰذا شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی لڑکی والوں سے مطالبات کرنے کی بُری رسم چور دروازہ سے داخل ہوگئی ہے۔ اوّل تو خواتین کی عزت کا وہ بھرم جو اس دستور میں پنہاں ہے کہ پیغام یا درخواست لڑکے والے کی طرف سے جاتی ہے' آہستہ آہستہ ٹوٹ رہا ہے۔ (اچھے' تعلیم یافتہ' اور برسرروزگار' مسلمان لڑکوں کی کمی نے مسلمان لڑکیوں کے والدین کے لئے دشواریاں پیدا کردی ہیں۔ پیام اب بھی لڑکے والوں کی طرف سے جاتا ہے' لیکن اکثر چھپا ہوا اشارہ لڑکی والوں کی طرف سے ہونے لگا ہے۔ گویا فراہمی اور مانگ والا بے رحم اقتصادی قانون اِس پاکیزہ رشتہ پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے جو کہ انسانی نسل کی بقا کا ضامن اور تہذیب و تمدن کی بنیاد ہے۔ اُس بنیاد کی کجی ظاہر ہے جو حرص و ہوس کے مسالہ سے چُنی گئی ہو۔ اشارہ کا جواب اکثر اشارہ سے دیا جاتا ہے۔ یعنی پیغام دینے کے لئے تیار ہیں' لیکن آپ کیا دیں گے؟ اس طرح لڑکے والے صراحتِ سوال سے تو بچ جاتے ہیں لیکن حسنِ طلب کی غیرت سوز علامت

سے محفوظ نہیں رہتے۔ لیجیے، طمع کی کارفرمائی یہاں بھی شروع ہو گئی۔ اگرچہ طمع ایک خوشنما نقاب
پر ڈال کر آئی۔ لالچ ابھی چور کی طرح دبے پاؤں داخل ہوئی ہے۔ تدارک نہ کیا گیا تو قزاقوں آئے
ایسا ہوا تو نام بیگانہ مانوس۔

غنیمت ہے کہ یہاں طلبی اور "سوالیا اشارہ" کی یہ لعنت مسلمانوں میں عام نہیں ہوئی۔ قیاس
ہے کہ یہ درمیانی طبقہ کے ایک حصہ تک محدود ہے۔ لیکن چنگاری کو آگ بنتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ ا
امتیاز یہ ہے۔ نہ کی خوگر نہیں ہوتی، مسلمان والدین بیٹیاں پالنے کرنے والی اس فکر سے دوچار نہیں کہ لڑکے
کے مطالبات کیونکر پورے ہوں گے۔ ان میں سے بیشتر کو یہ فکر ضرور دامنگیر ہے کہ لڑکیوں کے بر کہاں
اچھے پڑھے لکھے روزگاریافتہ لڑکوں کی کمی اور اچھی تعلیم یافتہ لڑکیوں کی کثرت، آخرالذکر کے ماں با
سوہان روح بن گئی ہے۔ لیکن یہ بات اس وقت ہمارے موضوع کے دائرہ سے باہر ہے۔

ہمیں اس اثنا میں یہ جان کر تکلیف ہوئی کہ جنوبی ہند میں کیرالہ کے مسلمان جو فی زمانہ اور باتوں میں
کے مسلمانوں سے بدرجہا بہتر ہیں، بے شرمی کے ساتھ جہیز مانگنے کی لعنت میں گرفتار ہیں؛ کوئی انہیں
والا نہیں، چنانچہ جس طرح ہمارے ہندو بھائی اپنے لڑکوں پر اس کی روزگاری حیثیت کے مطابق ایک
قیمت کا لگا دیتے ہیں اسی طرح کیرالہ کے پڑھے لکھے شہری مسلمانوں کا ایک طبقہ لڑکی والوں سے نذرانہ
رکھا ہے۔ کیسی انوکھی بات ہے کہ پرائس ٹیگ (قیمت کا پرچہ) لڑکے پر لگا ہوا ہے اور بک رہی ہے

ع "وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا"

بک رہی ہے لڑکی! اور قیمت لڑکے والوں کے ہاتھوں میں جارہی ہے۔ ع دلم بسوخت زحیرت کہ
بوالعجبی است!

اوپر کی سطروں سے پڑھنے والوں کا دھیان اس بات کی طرف گیا ہوگا کہ شادی کے
لڑکی کی توہین اور لڑکے والوں کی ہوس کا یہ ننگ انسانیت سلسلہ شہروں تک اور شہروں میں بھی در
طبقہ کے ایک حصہ تک محدود ہے۔ گاؤں کی آبادی اور شہر کا ان پڑھ اور غریب طبقہ اس لعنت
ہوا ہے۔ اقبال نے خدا کی زبان سے کہلوایا تھا "پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب"
غور کیجیے یہ بات بھی نرالی ہے کہ غریب لوگ اور ان پڑھ لوگ اس شرمناک لالچ اور جہ
محفوظ ہیں، جو شادیوں کے سلسلے میں ہمارے خوشحال اور پڑھے لکھے ہندو بھائیوں اور بعض علاقوں میں

مسلمان بھائیوں سے سرزد ہوتی ہے جنہیں محفوظ ہونا چاہیے تھا، وہی مبتلا پائے گئے۔ عجیب ستم ہے لیکن یوں کا سیلاب شہروں اور طبقوں تک محدود نہ رہے گا۔ شروعات شہروں اور پڑھے لکھوں اور خوش حالوں سے ہوتی ہے، لیکن انجام سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

یہ طلسم بھی اب ٹوٹ چکا ہے کہ جس جگہ ریاست ضروریات کو پورا کرنے لگتی ہے وہاں سے لالچ کوچ کر جاتی ہے اور وہاں انصاف حکومت کرتا ہے۔ چین سے خبریں آ رہی ہیں کہ چین میں لڑکی کو ضائع کرنے کی کوششیں عام ہیں۔ گویا لڑکیوں کو خوش آمدید کہنے کے بجائے انھیں بارگراں سمجھا جاتا ہے۔ لڑکی کیا پیدا ہوئی والدین کی کمر ٹوٹ گئی۔ یہ حال وہاں کا ہے جہاں ریاست مہد سے لحد تک کی ضمانت لیتی ہے؛ اس یقین کے ساتھ کہ انسان کا خاتمہ لحد پر ہے اور موت کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ لیجیے یہ چین والے جاہلیت کے دور کے عربوں سے بھی بدتر نکلے، جو لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اسلام نے اس شرمناک رسم کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ اسلام ہی پہلا دین ہے جس نے سماج میں عورتوں کو عزت کا مقام اور وراثت کے حقوق دیے ہیں اور اب مسلمان بھی اس سیلاب میں بہ جانے کے خطرہ میں ہیں جو عورتوں کی توہین پر کمربستہ ہے جو ان کی پیدائش کو آفت ناگہانی سمجھنے لگا ہے۔ عبرت کا مقام ہے!

(۴)

قسطوں میں لکھنے کے کچھ فائدے ہیں، کچھ نقصان۔ ایک فائدہ یہ کہ اگر لکھنے والے کے پاس سکون اور فرصت کے لمحات کم ہیں تو بھی وہ اپنے خیالات کو پڑھنے والوں تک پہنچا سکتا ہے؛ دوسرا یہ کہ کڑوی دوا اور بھکی سیٹھی غذا اگر مقدار میں کم ہو تو گوارا کر لی جائے گی۔ نقصان یہ کہ ایک ہفتہ پندرہ دن یا ایک ماہ کے وقفے میں وہ اثر زائل ہونے لگتا ہے، جو مضمون کے ابتدائی حصّے نے پہلی قسط کی شکل میں پیدا کیا تھا اور اس غریب پڑھنے والے کا کیا قصور جس نے صرف ایک شمارہ پر نظر ڈالی تھی۔ گویا کہنے کی ایک بات کو قسطوں میں کہنا تجارتی ہتھکنڈہ ہے؛ پڑھنے والے کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ صرف ایک مضمون کے لئے ایک شمارہ اور خریدے لیکن تہذیب الاخلاق تو ایک اصلاحی پرچہ ہے۔ اسے تجارت سے کیا غرض۔

"خودسوزی" کے اس قسط وار سلسلہ کی شروعات اس طرح ہوئی کہ سید حامد معروفیت کی بنا پر کئی شماروں میں غیر حاضر رہا اور اس غفلت پر اسے فہمائش کی گئی۔ ایک ساتھ ایک بسیط مضمون لکھنے کا

اسیر کیا اور ہر بار چند سطریں لکھ دیں۔ لکھنے والے کو ہرگز یہ غلط فہمی نہیں ہے کہ پڑھنے والے اس کے مضمون کی قسطوں کا انتظار کرتے ہوں گے۔ قسطوں کے لیے درا صل اگر کوئی جواز ہے تو داستان گو کے پاس۔ اس کا ہنر ہی یہ تھا کہ کہانی کو ایک نازک اور صبر آزما موڑ پر پہنچا کر باقی داستان کو دوسری صحبت یا دوسری رات کے لیے اٹھا رکھے۔

آپ کو یاد ہوگی الف لیلیٰ کی بنیادی کہانی کہ ایک بادشاہ ہر روز اپنے شبستان میں ایک نئی دوشیزہ کو بر سبیل عقد طلب کرتا اور صبح ہوتے اسے مروا دیتا۔ عیش و عشرت اور قتل و غارت گری کی صد بار اتیں گزر گئیں، تب شہرزاد کی باری آئی، جسے خدا نے حسن کے ساتھ ذہانت بھی دی تھی۔ یہ اجتماع کس قدر نادر ہے کون نہیں جانتا۔ شہرزاد کو داستان سرائی کا ہنر آتا تھا۔ چنانچہ کہانی وہ اس انداز سے شروع کرتی کہ پو پھٹتے وقت کہانی اپنے توڑ پر پہنچتی اور بادشاہ مجبور ہو جاتا کہ ایک رات کے لیے اور اسے جان کی امان دیدے۔ الف لیلیٰ جس میں ہزار راتوں کا بیان ہے انہی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ایک کہانی سے دوسری کہانی نکلتی چلی گئی۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

"آنکھ کھولی الف لیلیٰ کا سماں دیکھا کیے　　　زندگی کو داستاں در داستاں دیکھا کیے"

چاسر نے، جسے انگریزی شاعری کا بابا آدم مانا جاتا ہے، کنٹربری کی کہانیوں میں الف لیلیٰ کی ترکیب سے ایک گونہ فائدہ اٹھایا ہے۔ کنٹربری جانے والے راستہ بہلانے کے لئے باری باری کہانیاں سناتے ہیں۔ لیکن اس میں الف لیلیٰ کی صناعی اور بات میں سے بات نکلنے اور داستان میں سے داستان پیدا ہونے کا لطف نہیں ہے۔ گو کردار نگاری میں الف لیلیٰ کنٹربری ٹیلس کی پاسنگ بھی نہیں۔

بات خود کو جلانے سے شروع ہوئی اور تذکرہ چھڑ گیا شادیوں کے کردہ مطالبات اور بھیانک نتائج کا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں، شمال والوں اور جنوب والوں کا اس معاملے میں کیا رخ ہے، اس کی بات بھی ہوئی۔ تان اس پر ٹوٹ رہی ہے کہ انسان نے عورتوں کے ساتھ طرح طرح کے ظلم روا رکھے ہیں۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے عورتوں کے حقوق کو مانا ہے اور ان کو عزت کی جگہ پر بٹھایا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ مسلمان بھی اپنے دین کو طاق پر رکھ کر عورتوں کی حق تلفی اور ان کی اہانت کرنے لگے ہیں۔ مغرب میں بمبئی اور دکن میں حیدرآباد کو لیجیے۔ ان شہروں میں دوسرے ملکوں سے ایسے لوگ آتے ہیں جن کی روایتیں اور قدیمیں [illegible] شریعت کے لبادہ سے ڈھانکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ پیران فرتوت بھولی بھالی معصوم لڑکیوں کے والدین کو شادی کا پیام دیتے ہیں اور وہ بے زر،

بے بس اور بے غیرت والدین اپنی لڑکیوں کی شادی ان بوالہوس درندوں کے ساتھ کر دیتے ہیں، اس امید میں کہ شاید اللہ تعالیٰ رحم فرمائے اور ان کی بیٹی جو سیانی ہو کر بھی گھر میں بیٹھی ہوئی ہے ٹھکانے سے لگ جائے۔ ہندوستان میں بیشمار مسلمان لڑکیاں سیانی ہو کر گھروں میں بیٹھی رہ جاتی ہیں۔ اس کی ایک الگ المناک داستان ہے جس کی تفصیل کو ایک مستقل مضمون درکار ہوگا۔ اجمال اس کا یہ ہے کہ آزادی اور تقسیم ہند کے بعد پڑھے لکھے اور خوش حال مسلمان ماں باپ کے لئے لڑکیوں کی شادی ایک بہت کٹھن مسئلہ بن گئی ہے۔ خوش حال اور ہونہار لڑکوں کی ایک پوری نسل پاکستان چلی گئی۔ لڑکیاں بیچاریاں یہیں والدین کے ساتھ رہ گئیں۔ ظاہر ہے ان کے لئے اس حیثیت کے بر ملنا دشوار ہو گیا جس کی وہ ماں باپ کے گھر عادی رہی ہیں۔

شمالی ہندوستان کے مسلمان جنھوں نے ملازمت اور زمین داری پر تکیہ کر رکھا تھا دونوں سے محروم ہو گئے۔ اس کے بعد جو مسلمان لڑکے اٹھے وہ بدلے ہوئے حالات اور سکڑتے ہوئے امکانات سے بددل ہو کر محنت اور ولولہ سے دست کش ہو گئے، یا انھوں نے پیشوں اور مناصب کے لئے کوشش کرنا چھوڑ دیا جو اعلیٰ تعلیم کے راستہ سے حاصل ہوتے ہیں۔

لڑکیوں نے تعلیم میں زیادہ دلچسپی لینا شروع کی کہ تعلیم کے بغیر شادی مشکل تھی، اور ایسے لڑکوں کی تعداد کم ہو گئی تھی جن کے پاس علم بھی ہو اور معقول حیثیت بھی —— لڑکیاں مسلمان لڑکوں سے تعلیم میں اکثر آگے نکل گئیں۔ اب ان کے لئے مناسب رشتہ ملنا اور دشوار ہو گیا کہ وہ خوشحال ماں باپ کی بیٹیاں اور غم اور اس سے وابستہ امیدوں کی سرمایہ دار تھیں۔ چنانچہ وہ محرومی کی آگ میں جلتی رہتی ہیں اور فکر کی آنچ سے ان کے والدین زندگی بھر تپتے اور جھلستے رہتے ہیں۔

مسلمان لڑکوں میں اگر غیرت ہوتی، حوصلہ ہوتا تو وہ اپنے لئے نہ سہی اپنی بہنوں کی خاطر سخت جانفشانی کرتے اور علم اور حیثیت حاصل کرتے تاکہ مسلمان لڑکیوں کے لئے ہم علم، ہم حیثیت اور ہم اطوار لڑکے باسانی مل جاتے، اور غیر مسلموں سے مسلمان لڑکوں کی شادی کا فتنہ سر ہی نہ اٹھا پاتا۔

جملہ معترضہ ختم ہوا۔ بمبئی اور حیدر آباد میں جو ناٹک کھیلا جا رہا ہے اس کا خاتمہ المیہ پر ہوتا ہے۔ ہوس کی پیاس بجھانے کے بعد یہ ظالم اجنبی اپنی بیویوں کو طلاق دیدیتے ہیں اور وہ غریب اپنی زندگی بدنامی، تنگی اور رسوائی میں کاٹتی ہیں۔ اس ناٹک میں ' ولین' (VILLAIN) کئی ہیں۔ ایک تو وہی

زردار، بوالہوس، جو شادی کا سوانگ رچا کر دراصل زنا بالجبر کا ارتکاب کرتے ہیں ——————

—— وہ عقد جس میں زندگی بھر کی رفاقت، انسیت اور ہمہ گیر شرکت اور ہمدردی اور باہمی خیر خواہی کا تصور نہ ہو، اُسے عقد کہنا۔ وانہیں ایسی شادی جس کا مقصد صرف جنسی تشفی ہو، کسی تاویل کے ذریعہ جائز نہیں ہو سکتی۔ مرد ہوس آمادہ، عورت ڈری ہوئی، سہمی ہوئی کہ مرد کی ہوس پوری ہونے کے بعد اس بیچاری کا انجام کیا ہوگا۔ یہ صورت حال شادی کے بجائے مجرمانہ تمتع سے قریب تر ہے، اس میں عیاشی، لذّت کوشی اور بہیمیت موجود ہیں، محبت، رفاقت اور محبت کے ثمر یعنی اولاد کا تصور اور اس کو پروان چڑھانے کی امنگیں مفقود ہیں۔

وہ اخلاق باختہ قاضی جو ان اعمال شنیعہ کو دین کی سند دیدیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ ظلم ہے، جہالت ہے، گناہ ہے اور پھر بھی وہ ایسے نکاح پڑھانے میں ذرا سا تامّل نہیں کرتے۔ اس طرح ایک طرف وہ ایک ایسی بیماری کو بڑھاوا دیتے ہیں جو سماج کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ دوسری طرف وہ تھوڑے سے روپیوں کے لئے مذہب کو بدنام کرتے ہیں۔ دین جو عین حق ہے، اس کا رشتہ وہ جھوٹ اور فریب سے جوڑ رہے ہیں اور اس کو ہوسناکی کا آلۂ کار بنا رہے ہیں۔ قصور بیشک اس میں والدین کا بھی ہے اور صریحاً ہے۔ ان کے بعد خطا ان لڑکیوں کی ہے، جو اپنے ماں باپ کی عزت بچانے اور ان کی پریشانی دُور کرنے کے لئے ایک ایسی بات پر راضی ہو جاتی ہیں، جو مذہب کے خلاف ہے، انسانیت کے برعکس ہے اور جوان کی زندگی کو ہمیشہ کے لئے برباد کر دیتی ہے۔ انھیں چاہیئے کہ اس طرح نکاح کا نام سے صاف انکار کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام اور ماں باپ کی خواہش کو بالکل نظر انداز کرنا ہوگا۔ معاشرہ کا بھی فرض ہے کہ ان غریبوں کو اس ظلم و جہل اور ہوسناکی سے بچائے۔

'خود سوزی' دونوں کرتی ہیں، وہ ہندو لڑکیاں جو طمع کا ہدف بنتی ہیں، اور وہ مسلمان لڑکیاں جو اس طرح کی عارضی اور بازاری شادی بدرجۂ مجبوری کر کے تمام عمر کڑھتی رہتی ہیں، جلتی رہتی ہیں۔ الہٰی ہمارا سماج کتنا بیدرد اور کیسا بےحس ہو گیا ہے۔

ہم خود سوزی کی ان مثالوں کی طرف اشارہ کرتے گزر جائیں گے جن سے رجوع کسی بڑے مقصد کی تکمیل کے لئے کرنا پڑے۔ یورپ میں بہت سے لوگ جنھوں نے اپنے عقائد تبدیل کرنے سے انکار کیا، آگ میں جلا دیئے گئے۔ Jesuits نے اس بیدردی کو قانون کی شکل دینے اور اسے جا بجا نافذ

میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ہم ان شہیدوں کو سلام کرتے ہیں جنھوں نے زندہ جلنے کی زہرگداز موت کو اصول و عقائد کی تبدیلی پر ترجیح دی۔ انسانیت ایسے ہی لوگوں کے دم واپسیں سے باقی ہے۔ انگلستان میں بادشاہ نے رڈلے اور لٹیمر کو شاہی مذہب کی پیروی نہ کرنے پر زندہ جلا دیا۔ جس وقت کہ وہ دونوں جلائے جانے کے لئے باندھے جا رہے تھے، ان کے چہروں پر نہ خوف تھا نہ ہراس، نہ مایوسی، اگر کچھ تھا تو عزم اور اعتماد۔ ایک نے دوسرے سے کہا: "جو آگ ہم آج روشن کر رہے ہیں، وہ ایک دن ساری دنیا کو روشن کر کے رہے گی۔" یہ کہا اور جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی، اس طرح کہ آگ کے شعلوں سے گوشت بھون گیا، چربی پگھل گئی اور ہڈیاں تڑاقنے لگیں۔

اس سے بھی شاید بڑی قربانی ان بدھ بھکشوؤں نے کی ہے جنھوں نے ویت نام میں اپنے وطن کی آزادی کے لئے شعلۂ آشام موت کو آغوشِ مادر سمجھا۔ ہندوستان میں خودسوزی کے ایک حادثے نے ایک نئی ریاست کی بنا ڈالی۔ یہی حادثہ آگے چلکر ہندوستان کی لسانی تقسیم کا باعث بن بیٹھا۔ جلنے والے نے خودسوزی ایک مقصد کے تحت کی اور وہ مقصد اس کے مرنے کے بعد حاصل ہو بھی گیا۔ مقصد کچھ بھی ہو اس کے نتائج خواہ اچھے نہ بھی نکلیں، خودسوزی کی بنیاد یہاں حسنِ نیت اور ایثار پر تھی ــــ اسلام اس قسم کی خودسوزی کو بھی گوارا نہیں کرتا۔ احتجاج اور اصلاح کے اور بھی طریقے ہیں۔ کسی فرد کو اپنی جان لینے کا اختیار نہیں ہے!

جاپانی جس کام یا طریقے کو لیتے ہیں اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے خودکشی کو فرار اور بزدلی کی سطح سے اٹھا کر جواں مردی اور ہمت اور عزتِ نفس کے مقام پر پہنچا دیا ہے۔

کسی نے یہ نہ دیکھا ہوگا کہ انسان اپنی گاڑھی کمائی کو آگ لگانے کے لئے صرف کرے لیکن کروڑوں انسان آج کل یہی کر رہے ہیں۔ وہ سگرٹ پیتے ہیں۔ سگرٹ یا بیڑی پھیپھڑوں کو جلا ڈالتی ہے۔ انسان میں کسی جسمانی کام کو لگاتار اور بنا تھکے ہوئے کرنے کا دم باقی نہیں رہتا۔ بڑے بڑے ہونہار کھلاڑیوں کے خوابوں، امیدوں اور امکانوں کو اس منحوس عادت نے جلا ڈالا ہے۔ یہی نہیں سگرٹ پینے والا صحت جلد کھونے، جلد مرنے اور سرطان جیسی موذی بیماری میں مبتلا ہونے کا خطرہ مول لیتا ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے "دنیا میں، اس وادیٔ حرماں میں رکھا ہی کیا ہے کہ انسان عمرِ خضر کے خواب دیکھے یا دیر تک جینے کا جتن کرے" مان لیا، بابا اس غمکدہ سے جلد رخصت ہونا اچھا، لیکن ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینے کو کس نے کہا ہے؟ اپاہج اور

معذور بن کر زندگی کے آخری ایام کاٹنا اور عزیزوں پر بوجھ بن کے جینا کہاں کی دانشمندی ہے؟" وہ روپیہ جو بیڑی اور سگریٹ پر صرف ہوتا ہے، اگر اچھی غذا کے لئے استعمال ہو تو صحتیں کتنی سنبھل جائیں جب پونجی یا جو وسائل کو ہم بدن اور تندرستی بنانے کے کام میں لاتے، اُسے ہم بدن کو مسمار، دل کو کمزور، پھیپھڑے کو چھلنی، خون کو آلودہ اور صحت کو برباد کرنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ کوئی یقین کر سکتا ہے کہ انسان، بظاہر بھلا چنگا انسان، پڑھا لکھا اچھی عادتوں والا انسان اس قسم کی حرکت کر سکتا ہے؟ وہ اپنے صحت کے خرمن کو اپنے ہاتھوں سے پھونک سکتا ہے؟

ابھی تک ہم نے خودسوزی کی ان قسموں ذکر کیا تھا، جہاں ذراسی دیر میں جیتا جاگتا انسان راکھ کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ لیکن خودسوزی کی جس قسم کا تذکرہ اب کیا جا رہا ہے وہ سخت جان، صبر آزما اور خود مطلب ہے۔ اس کی آنچ تلے جو آ گیا، وہ عمر بھر جلتا ہے، ہانپ ہانپ کر جیتا ہے اور سسک سسک کر مرتا ہے۔ کینسر اس کی پذیرائی کرتا ہے۔ معذوری اور لاچاری اس کا ساتھ دیتی ہیں۔ تجربہ بہت جلد اس کے پیروں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ دھڑ پیروں کا ساتھ کب دیگا، کچھ مہینے یا کچھ سال اس بات کا فیصلہ کر دیں گے ہمارے یہاں یہ بیماری مردوں تک محدود ہے۔ کیونکہ یہاں اتنی عورتیں خود کو پل بھر میں جلا کر راکھ کر دیتی ہیں کہ دوسری عورتوں کے لئے دھیمی آنچ سے زندگی بھر خود کو جلانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ کوٹا اسی طرح پورا ہو گیا۔

لیکن یہ بات بھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ زیادہ خوشحال پڑھی لکھی اور جدید مزاج خواتین اب ہمارے ملک میں بھی نکوٹین کی ملکہ کے ساتھ پینگیں بڑھانے لگی ہیں۔ شاید وہ سمجھتی ہیں کہ سگریٹ پینے سے حسن میں اضافہ ہوتا ہے، کشش بڑھتی ہے، نوک پلک درست ہوتی ہے اور وہ حجاب اور فاصلہ کم ہو جاتا ہے جو ہمارے سماج میں مرد عورتوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں کش لے کر دھواں اُڑانے کی ادا میں دعوت بھی ہے اور شان دلربائی بھی، اشتعال اس پر مستزاد۔

بہر کیف سگریٹ میں، خواہ اُسے مرد منھ لگائیں، خواہ عورتیں، بُرائی اور نقصان کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ لڑکے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دبجرہ دار کش لیتے رہیں گے، تو اُن کی گنتی دانش وروں میں ہوگی۔ عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ اس طرح ان کے اعمال کا حُسن اور ہونٹوں کی گرمی اور رنگ روپ دو آتشہ ہوگا۔ تینوں غلطی پر ہیں۔ وہ سایہ کا پیچھا کر رہے ہیں، گھاٹے کا سودا کر رہے ہیں۔ دائمی کو بیچ کر عارضی کو پہلو سے لگا رہے ہیں۔ باطن کو ظاہر پہ قربان

کر رہے ہیں۔ 'خود سوزی' کی یہ وبا عالمگیر ہے، نئی نسل اس بری عادت میں اسیر ہے۔ بی جمالو جو جنگی ڈال کر دور ہو جایا کرتی تھیں، اب جنگی کی زد میں خود آگئی ہیں اور اب بچنا چاہتی ہیں۔ انسان نے ٹھانی ہے کہ پھیپھڑوں کو جلا ڈالے۔ دل کو گھایل کر دے، خون میں آلودگی بڑھا دے، قویٰ میں اضمحلال لے آئے۔ دماغ کو دھندلا دے، انگلیاں ہونٹ اور دانت پیلے پڑ جائیں، منہ سے بدبو آنے لگے۔

سگریٹ پینے والے حالات سے برد آزما ہونے کی صلاحیت بتدریج کھو بیٹھتے ہیں اور جب کبھی ان کی زندگی میں نازک موڑ آتے ہیں، مشکل مسائل یا حوادث کا سامنا ہوتا ہے، تو وہ عقل و ہوش کو گہنا دینے والے سگریٹ کو اور زیادہ کثرت کے ساتھ پیتے ہیں۔ ایک سگریٹ سے دوسرا سگریٹ جلاتے ہیں۔ دشمن سے عہدہ برآ ہونے کا یہ انوکھا انداز ہے کہ اپنے دفاع کو کمزور کر دیا جائے اور دشمن کی رہبری اور پذیرائی کے لئے دود آگیں چراغاں کیا جائے؛ ہوش و حواس کو دھندلاہٹ سے گھیر لیا جائے، اپنے سکون کو مکدر کر دیا جائے؛ اپنے شعور اور سوجھ بوجھ کو ماؤف کرنے کے جتن کیے جائیں۔ انسان ویسے ہی بہت سی مجبوریوں کا اسیر، بہت سے حوادث کا ہدف ہے۔ اس صورت حال کا واحد حل ایک دوسرے کی مدد کرنا ہے؛ چہ جائیکہ اپنے اختیار اور اعتماد کو کمزور کیا جائے، لعنتوں کو دعوت دی جائے، مجبوریوں کو بڑھایا جائے، بری عادتیں اختیار کی جائیں۔ کوئی مورکھ ہوگا جو اپنی ڈھال میں خود چھید کرے گا، اپنے تن بدن میں خود آگ لگائے گا۔

(٦)

ایسا لگتا ہے کہ خود سوزی کا یہ سلسلہ (مضامین) ختم ہونے میں نہیں آئے گا! قاہرہ سے واپسی میں چند گھنٹے دبئی میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ روزنامہ 'اخبار خلیج' میں ایک سرخی پر نظر پڑی "صحافت کی اخلاقیات پر شبہ کا نشان" نیویارک کے پاس ایک قصبہ جیکسن ویل میں سیسل اینڈریوز نے جو جوتوں کی مرمت کیا کرتا تھا اور جس میں بے روزگاری کا مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہ رہی تھی، مقامی ٹیلی ویژن اسٹیشن کو فون کیا، وہ امریکہ میں بے روزگاری کے خلاف احتجاج کے طور پر خود کو نذر آتش کر دے گا۔ اسٹیشن نے پولس کو اطلاع دی، پولس نے مذکورہ جگہ کو چھان ڈالا مگر کوئی نہ ملا۔ اسی اثناء میں کیمرہ مین رونالڈ سمنس (٣٠) ساؤنڈ مین گیری ہیرس (١٨) وہاں پہنچے تو اینڈریوز نظر آیا۔ وہ پیٹرول میں شرابور تھا۔ انھوں نے اُسے دل میں لگائے رکھا، اس امید میں کہ شاید پولس آجائے، وہ لوٹ کر نہ آئی اور اینڈریوز نے دیا سلائی جلائی

اور اپنے سینہ کے قریب لے گیا۔ انھوں نے کیمرہ تیار کر لیا۔ اینڈریوز کو دوبارہ دیا سلائی جلانی پڑی۔ تب آگ نے اسے پوری طرح اپنی آغوش میں لے لیا۔ تب کہیں ہیرسن اُسے بچانے کے لئے دوڑا۔ نیم سوختہ اینڈریوز ہسپتال میں داخل ہے۔ اس المناک ڈرامے کے ۸۲ سیکنڈ کیمرہ کی گرفت میں آگئے اور ٹیلی ویژن پر دکھائے گئے۔ اور اخباروں میں بھی اس واقعہ کا چرچا ہوا۔ اس واقعہ سے اہل صحافت میں بحث چھڑ گئی ہے۔ ضمیر اور قدروں کا سوال اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ سمنس اور ہیرسن کا کہنا ہے کہ ان کا ضمیر صاف ہے۔ انھوں نے اپنا فرض ادا کیا، ان کا فرض ہے کہ حادثات کو بوقت وقوع اپنی گرفت میں لے آئیں۔

ایک دوسرے صحافی نے کہا "ان سوالوں میں سے جن کا جواب نہیں دیا جا سکتا، ایک یہ بھی ہے کہ اگر کیمرہ مین نہ پہنچتا تو کیا پھر بھی اینڈریوز خود کو جلاتا۔ اس کے علاوہ کیا اس تشہیر سے دوسرے لوگوں کی ہمت افزائی نہ ہوگی جو توازن اور عدم توازن کی سرحد پر ہے۔

کارٹر نامی، ایک دوسرے صحافی نے تبصرہ کیا کہ ہم طویل اور تلخ اداریے اس موضوع پر لکھتے ہوئے نہیں جھکتے کہ وکیل اور ڈاکٹر اور دوسرے پیشہ اور اخلاقی قدروں سے بیگانہ ہیں۔ لیکن بعض اعتبارات سے ہمیں زندگی اور موت پر وکیلوں اور ڈاکٹروں سے زیادہ اختیار ہے۔ اس کے باوجود ہم کسی ضابطے یا کوڈ کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔"

بہرکیف زیست سے بیزار ایک بیروزگار کی احتجاجی خودسوزی نے ایک ایسا مسئلہ چھیڑ دیا جو دراصل ہمارے دور کے اہم ترین مسائل میں سے ہے۔ بیشتر صحافی یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے کسی واقعہ کو جلد از جلد چھپوا دیا، تو ان کا فرض پورا ہوگیا۔ وہ معاشرہ، انسانیت، یا زندگی کے تئیں اپنے آپ کو ذمہ دار نہیں سمجھتے۔ یہ نادان اتنا بھی نہیں جانتے کہ ہر شئے جو عرصۂ وجود میں آتی ہے، ہر حادثہ جو وقوع پذیر ہوتا ہے، وہ زندگی کا ایک عضو ہے اور اسے زندگی سے الگ کرنا ایک طرف اسے مفلوج، دوسری طرف خود اس کی زندگی کو مسموم کرنا ہے۔ ایک زمانہ تھا مصنفین کے ایک گروہ نے اپنی تخلیقات کو زندگی سے بالاتر سمجھنا چاہا اور ادب برائے ادب کا نعرہ بلند کردیا۔ انجام کیا ہوا؟ رسوائی، خواری۔ جو کچھ میں آتا ہے ہم بالایا جاتا ہے، جو حرکت بھی ہوتی ہے، زندگی کے دائرہ میں اور زندگی کے لئے ہوتی۔ جب مصنفین کا یہ حال ہوا، تو صحافی کس شمار میں ہیں۔ صحافیوں سے مراد ان سب لوگوں سے ہے جو کام کرتے ہیں، جو پیغام پہنچاتے ہیں۔ ابلاغ کے ذرائع میں بڑی طاقت ہے رائے عامہ کو بنا

اور بگاڑنے کی عوام پر اثر انداز ہونے اور ان کے نقطۂ نظر اور ردِّ عمل کو ڈھالنے کی یہ طاقت سنبھال سکتی ہے، سدھار سکتی ہے، سنوار سکتی ہے؛ یہی طاقت بگاڑ سکتی ہے، فسادات اور شر پیدا کر سکتی ہے، برباد کر سکتی ہے۔ ہر ذمہ دار آدمی کو بات کہنے یا کام کرنے سے پہلے یہ سوچنا ہے کہ اس کام کے نتائج اچھے ہوں گے کہ برے۔ اس ذمہ داری سے اہلِ صحافت کیونکر بچ سکتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں میں وقت کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

ان کا مقصد ہونا چاہیے انسان کی فلاح، زندگی کی بالیدگی، معاشرہ کی سنجیدہ باخبری لیکن بہت سے صحافیوں اور ابلاغ والوں نے سنسنی خیزی کو مقصود اور نمک مرچ کو ذریعہ بنا لیا ہے۔ کوئی اچھا تعمیری کام جو خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ کیا جا رہا ہے، ان کے لئے درخورِ اعتنا نہیں ہوتا کیونکہ ان ہی کی زبان میں اس میں خبر کا پہلو نہیں۔ اگر کسی یونیورسٹی میں نظم و ضبط اور سنجیدگی نظر آئے، تو اُسے گورستان کی خاموشی سے تعبیر کریں گے۔ اگر ہنگامہ برپا ہو گا تو ان کی پو بارہ ہے۔ ایک بیروزگار آدمی زندگی سے تنگ آ کر جان دے رہا ہے، انسانی فتیلہ میں دیا سلائی لگانے کی دیر ہے۔ اور امریکہ کے ڈاڈائیلا چیلے اسے جلنے دے رہے ہیں۔ کہ اگر وہ جلنے کا اعلان کرنے کے بعد بچا لیا جاتا ہے، تو خبر کے لحاظ سے اس کی کوئی اہمیت نہیں رہتی اور اگر جلتا ہے اور اس کی تصویر ہاتھ آ گئی، تو پھر وارے نیارے ہیں۔ دنیا میں دھوم مچ جائے گی۔

پہلے ذکر آ چکا ہے کہ خود کو جلانے والوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ کہ آگ دکھائی اور بھک سے اُڑ گئے۔ دوسرے وہ جو تمام عمر جلتے رہتے ہیں؛ کبھی غم کی آنچ میں، کبھی لوگوں سے ٹکرا کر، جیسے پتھروں کے ٹکرانے سے چنگاریاں پیدا ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ قدرت کی طرف سے زخم خوردہ ہیں اور محرومی کی آگ میں جلتے ہیں۔ انھیں شاید جلنے کا حق بھی ہے۔ لیکن جلنے کے بجائے اگر وہ اپنے اچھے پہلوؤں پر اور دوسروں کی محرومیوں پر نظر ڈالتے تو زندگی کو زیادہ سکون کے ساتھ گزار سکتے۔

ہم نے "سوختن" کے مصدر کی گردان کر دی۔ قارئین بھی اس جلنے جلانے سے اُکتا گئے ہوں گے، ہم بھی تنگ آ چکے ہیں۔ جلنے جلانے کی ایک آخری شکل کا ذکر کر کے اس سلسلے کو ختم کرتے ہیں۔ صرف یہی شکل ہے جو سراہنے کے لائق ہے؛ یعنی دل سوزی؛ دوسروں کے لئے اپنے دل کو جلانا، دوسروں کے درد سے بیتاب ہو جانا، ہمدردی کرنا، غمخواری کرنا۔ کہ انسانیت اسی سے عبارت ہے اور انسان کی فضیلت اسی میں پنہاں ہے، اور تہذیب کی ترقی کا راز یہی ہے۔

(۴)

مضامین کا یہ سلسلہ جو خود سوزی کے عنوان سے قسط وار تہذیب الاخلاق میں چھپتا رہا، پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ لیکن واقعات اور حادثات کو ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ جہیز مانگنے کی لعنت کی دو مثالیں ہمارے علم میں حال ہی میں آئی ہیں۔ انھیں تتمہ کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے:

ا) امین سوسائٹی کی دعوت پر بنگلور جانے کا اتفاق گزشتہ ماہ میں ہوا۔ وہاں پتہ چلا کہ جنوبی ہند کے مسلمانوں میں جہیز مانگنے کی شرمناک عادت کیرالہ تک محدود نہیں، بلکہ کرناٹک اور آندھرا پردیش میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔ اللہ رحم فرمائے۔

آج ۱۰ مئی ۱۹۸۳ء کے قومی آواز لکھنؤ میں ایک سرخی پر نظر پڑی: "عورت کی لاش قبر سے کھود کر نکالی گئی۔ سسرال والوں پر جلا دینے کا الزام"۔

واقعہ اس طرح بتایا جاتا ہے کہ لکھیم پور ضلع کے باشندے مسٹر محمد طاہر کی شادی سیتاپور کی لڑکی عشرت جہاں کے ساتھ ہوئی تھی۔ شوہر اپنی بیوی سے سائیکل اور گھڑی کا مطالبہ کرتا رہا۔ ایک روز لڑکی کے باپ کو اطلاع ملی کہ ان کی بیٹی کوٹھے سے گر کر مر گئی ہے۔ اس کی لاش کو جلدی سے دفن کر دیا گیا۔ ان کی درخواست پر پولس نے لاش قبر سے نکالی۔ وہ جلی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ بے غیرتی اور سفاکی کا یہ سلسلہ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ یہ لعنت شاید کسی اور ملک میں نہ ملے گی ——— اور ہم مہذب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں!

●●

معہودِ ذہنی

عنوان کی ثقالت سے نہ گھبرائیے جو بات کہی جائے گی وہ بہت سادہ سی ہے۔ سرخی اس انداز کی ہے کہ زبان گوا مڑیا کہا جائے اور مفہوم اتنا عام فہم کہ سب کی سمجھ میں آجائے۔ "معہودِ ذہنی" سے مراد وہ باتیں ہیں جو کہنے والے کے ذہن میں ہوتی ہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو بات وہ کہنے جاتا ہے وہ سب کی سب نہیں کہتا۔ وہ یہ تصور کر لیتا ہے کہ موضوعِ گفتگو کے متعلق جو باتیں اس کے ذہن میں ہیں وہ سننے والے کے ذہن میں بھی ہوں گی۔ سننے والا ان باتوں پر اپنے حساب سے اور اپنی سماعت کے مطابق غور کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ کہنے والے نے جو کچھ کہا ہے اس کے علاوہ کیا کیا سوچ رکھا ہے چنانچہ جو بات اس تک پہنچتی ہے وہ اس بات سے بہت کم ہوتی ہے جو کہنے والا کہنا چاہ رہا تھا، وہ جو کہنا چاہ رہا تھا، وہ کچھ ملفوظ تھا۔ (یعنی لفظوں کی گرفت میں آگیا تھا۔ اور کچھ مقدر (یعنی دل ہی دل میں رہ گیا تھا۔ اس کی بابت قیاس کر سکتے ہیں) جو ملفوظ تھا وہ سننے والے تک پہنچ گیا، جو مقدر تھا، اس کی اسے آہٹ بھی نہ ملی۔ جو خبر اس تک پہنچی وہ ادھوری ہی رہی۔ معانی و مفاہیم بیان کرنے کی تعبیر سے اکثر گھائل ہو جاتے ہیں۔ ابلاغ کی کمی، تفہیم کا نقص، بات کی نارسائی، رابطے کی ناتوانائی اور غلط فہمی بارہا اس طرح بھی جنم لیتی ہیں۔ روزمرّہ کی زندگی میں معہودِ ذہنی طرح طرح سے تکلیفیں پہنچاتا ہے ستم ڈھاتا ہے اور چھوٹی بڑی ترشیوں، تلخیوں کی طرف بسا اوقات لے جاتا ہے۔ زبان و بیان کی کوتاہ دستیوں سے قطعِ نظر بات کو پوری صراحت کے ساتھ نہ کہنے کی عادت عملی زندگی میں خود ہمارے اور دوسروں کے لئے تکلیف، تشویش، اُلجھن اور پریشانی کا سبب بن جاتی ہے۔ مثلاً آج آپ شام کو سفر پر نکلنے والے ہیں۔ کثرتِ استعمال سے آپ کا بڑا نازخم رسیدہ سوٹ کیس کئی جگہ سے نکل گیا ہے۔ آپ نے خادم سے کہا۔ بازار لے جاؤ اور اس کی ٹھیک سے مرمت کرا دو۔ وہ بازار گیا۔ دکان دار نے کہا اس میں کام بہت ہے۔ ایک ہفتہ کے بعد لے گا۔ خادم نے کہا بھائی صاحب جلدی ضرورت ہے، صاحب سفر پہ جا رہے ہیں۔ اُس نے کہا اچھا کل اتوار ہے، پرسوں شام کو لے لینا۔ اور سب کام چھوڑ کر تمہارا کام کر دیں گے۔ وہ بیچارہ خوش خوش لوٹا کہ جو کام ایک ہفتہ میں ہونے والا تھا، اُسے میں نے دو روز میں کرنے کے ڈھول ڈال دیئے۔ شام کو صاحب دفتر سے آئے، پوچھا تو پتہ چلا کہ سوٹ کیس دو روز بعد ملے گا

چھوکرے پر برس پڑے کہ احمق تجھے معلوم نہیں کہ میں آج شملہ کو جا رہا ہوں۔ ابھی واپس جا، جیسا ہے ویسا ہی لے آ، ڈوری باندھ کر کام چلا لوں گا۔ بیچارہ دوڑا ہوا گیا تو معلوم ہوا کہ دکان بند ہو چکی ہے۔ ڈوریوں سے بندھا ہوا سوٹ کیس پھر بھی بہتر تھا۔ اب کپڑے، پوٹلی میں باندھ کر لے جانے پڑیں گے۔ غریب نوکر کی جو شامت آئی، سو الگ رہی۔ اب سوال صرف اتنا سا باقی ہے کہ احمق کون تھا، آقا یا خادم۔ جواب ہم آپ کی صوابدید پہ چھوڑتے ہیں۔ احمق کوئی ہو۔ جرم وہی معہود ذہنی پر تکیہ کرنے کی عادت تھی، جو بہت عام ہے اور جو اکثر خلق خدا کے اوقات کو تلخ کرتی اور اس کے کاموں کو بگاڑتی رہتی ہے۔ زبان الگ خراب ہوتی ہے۔ خون کے دباؤ کا اچانک بڑھنا اس پہ مستزاد۔ آپ کا کیا جاتا اگر اسے بتا دیتے کہ ہمیں آج ہی سفر پہ جانا ہے اور سوٹ کیس کی مرمت اسی لئے کرائی جا رہی ہے۔

"خودسوزی" کے سلسلے میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ لڑکے اور لڑکے والوں کی شرمناک لالچ ہر طرف گھروں میں آگ لگاتی جا رہی ہے۔ سماج، بیچاری عورتوں کی بلی دے رہا ہے۔ پہلے مہینوں اور ہفتوں میں ایسی خبریں آتی تھیں، اب کوئی دن خالی نہیں جاتا۔ اس روز اخبار میں تھا کہ صرف دلی میں اس قسم کی موتوں کا اوسط یومیہ دو پڑ رہا ہے[1]۔ لالچ نے لوگوں کو اندھا کر دیا ہے، پاگل بنا دیا ہے۔ قارئین شاید ہمارے ذہنی توازن پر بھی سوالیہ نشان لگا رہے ہوں گے کہ ہم خواہ کچھ بھی لکھیں، اس میں شاہ چارلس کے سر کی طرح خودسوزی کا موضوع ضرور سر اٹھائے گا۔ مان لیا بابا کہ جہیز کی لالچ اور لڑکے کی تجارت انتہائی شرمناک عادت ہے، یہ ہمارے وقار کو مجروح کرتی ہے، اس کے آگے ہمارا روحانیت کا دعویٰ کھوکھلا لگتا ہے، دنیا میں اور کہیں انسانی گوشت کی اس عنوان اور اس بے غیرتی کے ساتھ تجارت نہیں ہوتی، یہ سب کچھ تسلیم لیکن کیا دنیا میں اور کوئی موضوع باقی نہیں رہا جس پر قلم اٹھایا جائے، اور اگر موت ہی کو موضوع بنانا ہے، تو سڑک کے حادثوں میں بھی تو روز سیکڑوں موتیں ہوتی ہیں۔ اگر جلنے سے کچھ موتیں ہو گئیں، تو کیا غضب ہوا۔ اور پھر مضمون کی بے ربطی کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ "معہود ذہنی" کی بات کرتے کرتے ذہن اور قلم دونوں بھٹک گئے اور جلنے جلانے کی بات کرنے لگے۔

قارئین کی جھنجھلاہٹ سر آنکھوں پر۔ اگر جان کی امان پائیں، تو عرض کریں کہ جہیز کی موتیں (اس ترکیب کے طنز پر غور کیجیے۔ حکما تو یہ کہتے ہی چلے آئے ہیں کہ شادی اور غم توام ہیں) گھٹتے ہوئے مطالبہ کی بنا پر کم ہوتی رہیں، توقعات، قیاسات اور ناگفتہ مانگوں کی وجہ سے زیادہ۔ لڑکے والوں نے کہا اسکوٹر دو، ٹی وی سیٹ دو، گھر کا پورا فرنیچر دو، اور ۲۰ ہزار روپیہ نقد دو۔ لڑکی کا باپ قرض لے گا، بھیک مانگے گا، چوری کرے گا اور جو کچھ لاکھ جتن کر کے

۱۔ تمدن شہر سے نکلا ہے اور اب اس کا جنازہ شہر سے نکل رہا ہے۔

بس اندازہ کیا ہے وہ نکالے گا، بیوی کے گہنے بیچیگا، رشوت لے گا اور یہ مانگ پوری کرے گا۔ اور اگر اتنا روپیہ فراہم کرنا اس کے بس کا روگ نہیں، تو مجبور ہو کر دل پر پتھر رکھ کر کہدیگا کہ بہن جی ہماری اتنی حیثیت نہیں۔ لیجیے رشتہ ہی نہیں ہوا، تو جلنے جلانے کی نوبت کیوں آنے لگی۔ یہ نوبت تو اکثر وہاں آتی ہے، جہاں لڑکے والے کہتے ہیں "بگھر پر بھگوان کا دیا سب کچھ ہے، ہمیں کیا ضرورت کہ شادی کر کے تجوری بھریں، ہمیں تو سُندر اور گُن وتی لڑکی کی تلاش تھی سو مِل گئی، ہم زبان سے کچھ نہیں کہیں گے، آپ کی لڑکی ہے۔ آپ اُسے جو دینا چاہیں دیں، ہم بیچ میں کہاں آتے ہیں" جس وقت زبان۔ یہ ارشاد ہوتا ہے، اُسی وقت ذہن کھچڑی پکانا شروع کر دیتا ہے کہ "سمدھی راج کی دو ہی تو بیٹیاں ہیں، تین بیٹے ہیں، ایک بیٹے کی شادی ہو چکی ہے، بہو ڈھیروں دولت لائی ہوگی پھر ان کی نوکری چھوٹی اور تنخواہ کم سہی لیکن اُوپر کی آمدنی تو کافی ہوں گی۔ یہ ضرور ہمارے بیٹے کو نہال کر دیں گے" اور جب دیکھتے ہیں کہ بہو نے ان امیدوں اور ان قیاسات اور ان محلوں کو جو انھوں نے بنائے تھے مسمار کر دیا تو کچھ دن پہلے کا مہذب ذہنی جو ابھی تک سراپا تہذیب بنا ہوا تھا، سمدھیانہ کو نوک زبان سے ڈسنا شروع کرتا ہے بیچاری لڑکی سے اپنے ماں باپ کی بے عزتی اور بے بسی نہیں دیکھی جاتی، اُسے جان دیتے ہی بنتی ہے۔ اگر لڑکے والے شروع ہی میں سودے کی بات کر لیتے تو لڑکی اور لڑکی والوں کو یہ دن کیوں دیکھنا پڑتا۔ ہمارے پاس اس کا وقت نہیں کہ اس کا تجزیہ کریں کہ لڑکے والوں نے چپ کیوں سادھی تھی۔ کیا تہذیب اور انسانیت نے انھیں مانگ نہ کرنے پر مجبور کیا؟ اگر ایسا تھا تو شادی کے بعد تہذیب اور انسانیت غوطہ کیوں لگا گئیں؟ شاید یہ بات کو لپیٹ کر کہنے کی عادت کا اثر ہوگا جو بعض لوگوں کی سرشت میں داخل ہوتی ہے یا اسے جرأت کی کمی پر محمول کیجیے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے تھوڑی دیر کے لیے ان کے دل میں طمع کے دلدل سے اُوپر اٹھنے کا جذبہ پیدا ہوا ہو۔ یا ان سب محرکات کا مجموعی اثر تھا جس نے حسن اخلاق اور شائستگی، ایثار اور دل آسائی اور خوش گوئی کے یہ گل کھلائے۔ لیکن قیاس کہتا ہے کہ لڑکے والوں کا طمع نے کوئی تجدید قبول نہ کی ہوگی۔ انھوں نے سوچا ہوگا کہ لڑکے کا بھاؤ گرانا نری مور کھتا ہے اعلانا بڑھانا کہ گاہک بھڑ جائے غیر مخلوط حماقت، بات گول رکھو جب لڑکی بیاہ کر آجائے گی تو اسے یرغمال بنا کر جو چاہیں گے وصول کر لیں گے پھر کسی کی مجال کہ ہماری مانگیں نہ مانے۔ آپ نے ایسے سرجنوں کی لرزہ خیز داستانیں سنی ہوں گی، جو مریض کا پیٹ چاک کر کے آپریشن کو بیچ میں چھوڑ کر فیس کے متعلق من مانے مطالبات کرتے ہیں اور مریض کے بے بس عزیزوں سے منھ مانگی رقم پاتے ہیں۔ یہی حال لڑکے والوں کا ہے۔ حرام کی کمائی دونوں کھاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک اپنے ہاتھ کے ہنر اور دوسرا بیٹے کے وجود سے۔ انسان گرتا ہے تو اسفل السافلین کی خبر لاتا ہے۔

دیکھ لیا آپ نے معہود ذہنی کا سسٹم۔ بات کو ناگفتہ رکھنے کا ظلم، توقعات کو زبان نہ دینے کا جور۔ قیاسات کی دنیا میں رہنے کا فتنہ اور ابہام کو رہنما بنانے کا فساد۔

زبان کے متعلق پھبتی کسی گئی ہے کہ یہ خیالات اور جذبات کو چھپانے کا ذریعہ ہے۔ جی ہاں، ہوتے ہیں، ضرور ہوتے ہیں۔ ایسے بھی خیالات، ایسے بھی جذبات جن کو چھپانے ہی میں عافیت ہے۔ ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب کھری کھری سنانے میں جان یا سکون کا جوکھم ہوتا ہے، یا جب صاف صاف بات کہنے سے مخاطب کو غیر ضروری ہزیمت پہنچتی ہے۔ لیکن ڈپلومیسی کو نظر انداز کر دیجیے اور روزمرّہ کی ملاقاتوں کی غیر اہم باتوں کو اور شعر اور شاعری اور فن کاری کو، تو یہ کلیہ ماننا پڑے گا کہ افراد کے باہمی تعلقات اور معاملات کی صحت کے لئے صراحت اور وضاحت بہت ضروری ہے۔ قیاس اور ابہام کلام میں دخل نہ ہونا بہتر، معہود ذہنی کا عمل نہ ہونا اولیٰ، ورنہ گاڑی بڑی سے بار بار اُترے گی، حادثے ہوں گے، پریشانیاں، تلخیاں، شکر رنجیاں ہر قدم پہ کج ادائی کریں گی۔ زندگی میں غم ویسے ہی کیا کم ہیں کہ انسانی اپنی مساعی سے ان میں اضافہ کرے۔

اگر آپ کے دل میں ہماری بات ابھی تک نہ اُتری ہو اور آپ سمجھتے ہوں کہ اس عام عادت میں کوئی خطرہ نہیں کہ مخاطب کے متعلق یہ تصور کر لیا جائے کہ وہ نہ صرف آپ کی گفتگو، بلکہ گفتگو کرتے وقت آپ کے ذہن میں جو کچھ گزر رہا ہے اس سے بھی واقف ہے، اور وہ آپ کی بات کو بالکل اسی طرح سمجھ رہا ہے، جیسے آپ سمجھ رہے ہیں، تو ایک اور مثال دینے کی اجازت دیجیے۔ معاہدے جب ہوتے ہیں، خواہ وہ کمپنیوں کے درمیان ہوں، خواہ حکومتوں، خواہ افراد کے مابین، تو پہلے بات چیت کے ذریعہ سمجھوتا کیا جاتا ہے۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر بات طے ہو گئی۔ لیکن جب معاہدہ کو قلمبند کرنے چلتے ہیں، مسودہ تیار ہوتا ہے، اس پر بحث ہوتی ہے، تو پتہ چلتا ہے کہ دونوں فریق اپنے معہود ذہنی کے مطابق سمجھوتے کو الگ الگ معنی پہنا رہے تھے۔ پھر سے بحث شروع ہو جاتی ہے اور ایک ایک لفظ پر ہوتی ہے۔ تب کہیں ایک دوسرے کا مفہوم اور مقصود واضح ہوتا ہے اور اتفاق اور اتحاد کی راہ نکلتی ہے۔ حضرات کے متعلق ایک دوسرے کے تصورات کے درمیان بڑی دوری تھی۔

مینجمنٹ اور انتظام کا یہ اہم اصول ہے کہ پالیسی اور احکام بالکل واضح ہوں۔ ان میں ابہام رہتا ہے تو نیچے پہنچتے پہنچتے معنی کچھ کا کچھ ہو جاتے ہیں اور احکام کی تعمیل اور پالیسی کا نفاذ کرنے والے اپنے اپنے ڈھنگ سے اپنی اپنی فہم کے مطابق ان پر عمل اور ان کو نافذ کرتے ہیں۔ جن لوگوں کا ذہن مرتب اور عادتیں اور افعال سانچے میں ڈھلے ہوتے ہیں اور وہ جو کچھ کہتے ہیں ناپ تول کر صراحت اور قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں۔ اس چمن میں

ان ہی کا طوطی بولتا ہے اور اس دنیا میں ان ہی کے حسنِ تدبیر کا سکہ چلتا ہے ۔ ان ہی کی بات مانی جاتی ہے اور کامیابی ان ہی کی قدم چومتی ہے ۔ ذہن کی صفائی سے بات میں وضاحت آتی ہے اور بات کی وضاحت سے ذہن صاف ہوتا ہے ۔ بات کہیے تو کھری کہیے، خدا لگتی کہیے، دل میں اُترتی کہیے، ذہن میں پیوست ہوتی کہیے ۔ وہ بات بھی کوئی بات ہوئی جو جناب شیخ کے نقشِ قدم کی طرح یوں بھی ہے اور یوں بھی ۔ اس بات سے سننے والے کو نہ روشنی ملیگی، نہ آگاہی، نہ ہدایت ۔ ملے گا تو اُلجھن ملے گی اور ابہام اور کشمکش و پیچ ملیں گے ۔ بات پوری کہیے ۔ وہ کیا بات ہوئی جو روشنی کے بجائے تاریکی لائے، اور فیصلہ کے بجائے تردّد کا پرچم بلند کرے جو معہود ذہنی کے سیاق و سباق سے ٹوٹ کر زبان پر آئی ہو ۔ یاد رکھیے کہ انسان جس طرح خود اپنے تحت الشعور کو نہیں سمجھ پاتا اسی طرح دوسرے اس کے معہود ذہنی کو نہیں سمجھ سکتے ۔ لہٰذا آپ نہ خود کو آزمائش اور تذبذب میں ڈالیے نہ دوسروں کو ۔ آپ اگر کچھ کہہ رہے ہیں تو بات کو پوری تفصیل (دنیا اسے غیر ضروری تفصیل کہے گی، کہنے دیجیے) کے ساتھ دہرائیے، تاکہ سننے والے کو کسی قسم کا شبہ نہ باقی رہے ۔ اور وہ پہلو جو اس بات کے حوارئین ہیں اور تلازمے اور حاشیہ نشیں متعلقات بھی روشن ہو جائیں تاکہ بات آئینہ کی طرح، واقعہ اور ہدایت رائقہ کی پوری عکاسی کر سکے ۔ سننے والے کو بھی چاہیے کہ بات کو اچھی طرح سے ناپ تول کر دیکھے اور ضروری متعلقات اور تاریک گوشوں کو سوالات کر کے روشنی میں لے آئے ۔ اس طریقہ یا عمل کو ہم نے گودھڑی ڈھنگ کا نام دیا ہے ۔ وجہ تسمیہ پھر کبھی بتائیں گے ۔

سعدیؒ نے کہا تھا کہ دو باتیں خلاف عقل ہیں، یعنی بولنے کے وقت دم سادھ لینا کُلّی بھی ہو سکتا ہے اور جُزئی بھی ۔ جو لوگ پوری بات نہیں کہتے، وہ بھی عقل کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں اور فتنہ و فساد کے لئے نئی راہیں کھولتے ہیں ۔ شعرائے کرام کو یہاں چھوٹ دینی پڑیگی ۔ شاعر کے معہود ذہنی کی تلاش میں قارئین اور ناقدین کے قافلے مسافتوں پر مسافتیں طے کئے چلے جاتے ہیں اور اسرار ہیں کہ فاش ہونے میں نہیں آتے ۔ گتھیاں ہیں کہ سلجھنے کا نام نہیں لیتیں اور اشارہ، کنایہ، تشبیہ، استعارہ، شاعر کا اوڑھنا بچھونا ہیں ۔ صراحت سے اُسے گریز ہے ۔ اس کی تخلیقی فضا دلنواز ابہام سے تشکیل پاتی ہے ۔ دھیمی دھیمی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی سے اس کے شبستان میں روشنی ہوتی ہے جس کا سحر دیکھی ہوئی اور معروف اور معمولی چیزوں اور مناظر کو دلکشی میں نہلا دیتا ہے ۔ ایسے طلسم خانہ میں خورشید سے نامحرم کا گزر کہاں ۔ وہ اگر در آیا تو جمال چور دروازہ سے نکل گیا، طلسم ٹوٹ گیا ۔ سورج صراحت کا پرچم لیکر آتا ہے ۔ چاند لطیف اشاروں اور ابہام احتمال، قیاس اور خواب نوشیں کے سایہ میں زمین کے طواف کو نکلتا ہے ۔ پھر حیرت کیوں کہ جنوں کو قمر سے منسوب کرنے لگے ہیں ۔ انگریزی بلکہ لاطینی زبان میں چاند اور جنون کا

مادہ ایک ہی ہے۔ چاند کی کشش، اس کی سحر آفرینی تسلیم، لیکن دنیا کے وجود اور زندگی کی بقا کی بات جب آئے گی، سورج کو چاند پر ترجیح دینا پڑے گی۔ وضاحت سے بات ہوگی، تو زندگی کا کاروبار ڈھنگ سے چلے گا۔ بات ڈھکے چھپے انداز سے، جھلکیوں میں لپٹی ہوئی اور دائرہ دار ہوگی، تو وحشت اور نصف جنوں کا عالم دیکھنے میں آئے گا۔ شاعروں کو چھوڑیئے جنھیں قارئین اور ناقدین پر لگا کر اڑاتے ہیں اور اپنے معہود ذہنی سے اُن کے معہود ذہنی کو ٹکرا کر وہ چنگاریاں پیدا کرتے ہیں جن سے نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اس ٹکراؤ سے ایک نیا مرکب وجود میں آتا ہے، جو شاعر کے وہم و گمان سے بھی پرے رہا ہوگا۔

عام اور سادہ رو انسانوں کی عافیت اسی میں ہے کہ پیغام رسانی، ہدایت اور خطاب اور ابلاغ کا جہاں تک تعلق ہے کہنے کی بات کو ادھوری اور اَن کہی نہ چھوڑیں۔ عام آدمی خیریت اسی میں دیکھتا ہے کہ سورج کی روشنی میں اپنا کام کرے اور دن چھپے گھر آ جائے۔ رات کو باہر رہنے میں زر اور وقت کے ساتھ عزت اور شہرت کا زیاں (اور بڑے شہروں خصوصاً ترقی یافتہ ممالک کے بڑے شہروں میں) اور رجان کا خطرہ بھی ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں آپ کا ساتھ نہ تحت الشعور دے گا نہ معہود ذہنی ساتھ دیں گے تو صرف عقل کی روشنی میں صاف صاف کہے ہوئے دو بول۔

٭٭

... جابجا سے

• ادبار ہمیشہ قحط الرجال اپنے ساتھ لاتا ہے؛ اور فی زمانہ بالائی سطح پر ہندوستانی مسلمانوں میں بہت سے لوگوں کو، بہ عنوانِ نمائندگی، وہ مناصب مل گئے ہیں جن کے وہ کسی صورت اہل نہیں تھے۔

• یہ بدنصیب ملّت کافرگری کے مشغلے سے کب باز آئے گی۔ اسلاف اور اخلاف میں جو فرق ہے اس کی طرف دھیان دیجیے، وہ کافروں کو مسلمان بناتے تھے یہ مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے انہوں نے اسلام کے میدان کو وسیع کیا یہ اس کے دائرے کو تنگ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان حضرات سے جو کفر کی تبلیغ بنا آنکھ چھپائے کرتے رہتے ہیں کوئی پوچھے کہ انھیں داورِ محشر نے یہ پروانہ کب اور کیوں عطا کر دیا کہ لوگوں کے اعمال اور ان کی نیتوں کا محاسبہ کرنے بیٹھ جائیں اور اچھے بھلے انسانوں میں کیڑے ڈالنے لگیں۔

• انسان اکثر اپنی برائیاں دوسروں میں منعکس دیکھتا ہے۔ غلطیاں کس شخص سے سرزد نہیں ہوتیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان غلطیوں کی نوعیت کیا ہے؟ کیا ان سے طبیعت کے شر، طینت کی کجی اور باطن کی خباثت کا پتا چلتا ہے، یا یہ غلطیاں ایسی ہیں جو ایک شریف النفس انسان سے سرزد ہو سکتی ہیں۔

• ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ آیا وہ شخص جو اپنے ظواہر کو دین کی وضع سے آراستہ کر کے نکلا ہے کہیں وہ سب کچھ اپنے خبثِ نفس، اپنی سیہ کاری، اپنی دراز دستی کو چھپانے کے لیے تو نہیں کر رہا ہے۔ ظن و تخمین کی راہ میں ہمیں انسانیت، شرافت اور بھلمنساہٹ کو اونچا مقام دینا ہوگا کہ دین کی روح یہی ہے۔ دنیا کی فلاح بھی اسی میں ہے۔

• عمل کو ہم عقیدہ اور عبادت سے جدا کریں گے، تو عقیدہ اور عبادت کھوکھلے ہو جائیں گے۔ خالق بندوں کے گناہوں، ان کی خطاؤں سے چشم پوشی کرتا ہے؛ اس کے بندے خطاؤں اور گناہوں کو بے نقاب کرنے میں لگے رہتے ہیں، غافل اس سے کہ وہ خود نہ بگناہ ہیں نہ بے خطا۔

• ملّی اداروں کی سربراہی کے لیے ہمیں اپنے معیار اور زاویۂ نگاہ پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ عام کردار اور اکتسابات اور افتادِ طبع کے متعلق اطمینان حاصل کر لینا کافی ہے۔ شجرہ کھنگالنا اور ماضی بعید کو کریدنا اور گڑے مُردے اکھاڑنا، غسّالوں، گورکنوں اور کیڑوں مکوڑوں کا کام ہے۔

• ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان امور میں مداہنت ناروا ہے جہاں غیرتِ ملّی پر آنچ آتی ہو؛ انہیں چھوڑ کر،

ہر چھوٹی چھوٹی بات پر سخت گیری کرنا تنگ نظری اور بے بصری کی دلیل ہے۔ تعصب کی روایتی شخصیت بھی کوئی دلپذیر نہ تھی، چہ جائیکہ ان افراد کی شخصیت جو اپنے داغوں کو بھول کر دوسروں کی قبا کے دھبوں کی نمائش شارع عام پر کرتے رہتے ہیں۔

• اس ادارے کی طرف سرسید کی میراث ہے اور سرسید کی میراث عقل و تدبیر کی میراث ہے، جذبات اور جوش کی میراث نہیں۔ اگر ہم ذرا بھی بہک گئے تو سرسید کے مسلک سے دور ہو جائیں گے۔ ہمیں اپنے ادارے کو دنیا بھر میں ممتاز بنانے کے لیے ایسی چیزوں سے پرہیز کرنا چاہئے جن سے کہ یونیورسٹی پر آنچ آئے اور مادر درس گاہ کی بے حرمتی ہو۔

• ہندستان میں مسلمانوں کی حالت قابل اطمینان نہیں ہے۔ اگر پندرہ سال میں ہم نہ سنبھلے تو بقا کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ ہم کو خوش خرامی سے ہٹ کر سخت محنت کرنی چاہئے کیوں کہ آج کا دور سخت مقابلے کا دور ہے۔ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے ہم کو دوسروں کے مقابلے میں آگے بڑھنا ہے تاکہ ہندستان جیسے ترقی پذیر ملک میں مسلمانوں کا بھی کچھ حصہ ہو۔

••

سید حامد

قطعِ حیات

"جب میں ۶۴ سال کی ہو جاؤں گی" کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں نرگس دلال نے ان خاندانوں کی ایک دکھتی رگ کو چھیڑا ہے جن میں کوئی ضعیف رشتہ دار پلنگ سے لگ گیا ہو جس میں اپنی دیکھ بھال کرنے کی سکت باقی نہ رہی ہو۔ وہ لکھتی ہیں کہ ایسی صورتِ حالات میں کتنی اذیت پہنچتی ہے اور کتنا صرفہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئسیلر، جس نے اس کتاب کا دیباچہ لکھا تھا (جس کا نام EXIT ہے اور جس میں زندگی کو بغیر تکلیف ختم کرنے کے طریقوں کی کھوج کی گئی ہے) نے خود اپنی زندگی کو ختم کیا، تاکہ وہ دنیا سے وقار کے ساتھ اٹھے۔

اس مضمون میں یہ رخ اختیار کیا گیا ہے کہ تکلیف سے نجات پانے یا رلانے کے لئے مارنا جائز ہے۔ میری نگاہ میں دونوں ناجائز ہیں۔ ایک خودکشی ہے۔ دوسرا قتل۔ انسان نے خود کو بنایا ہوتا، تو اسے حق تھا کہ خود کو ختم بھی کر دے۔ وہ اپنی زندگی کا حامل اور نگہبان ہے، اس کا مالک نہیں ہے۔ کیتھولک مذہب نے اس قسم کی موت کی مذمت کی ہے۔

"پوپ پیس دوازدہم نے اپنے ۲۴ر نومبر ۱۹۵۷ء کے بیان میں 'سنگین بیماریوں کے علاج کے لئے معمولی اور غیر معمولی ذرائع کے درمیان امتیاز کیا ہے۔ (معمولی ذرائع سے مراد ہیں وہ دوائیں اور علاج جن سے فائدہ کی کچھ نہ کچھ امید ہو سکتی ہو، اور جن پر بہت صرفہ نہ آتا ہو۔ اور جن کے استعمال میں شدید درد اور ناآسانی اور بے چینی نہ ہوتی ہو) انہوں نے کہا ہے کہ (علاج کا) فرض صرف اوّل الذکر صورت میں عاید ہوتا ہے۔

۱۹۸۰ء کے ایک اعلان میں "ویٹیکن[1]" نے مرگِ ترحم کو ناجائز اور غیر اخلاقی ٹھہرایا ہے۔ اس بار معمولی اور غیر معمولی" ذرائع کے بجائے "مناسب اور غیر مناسب ذرائع" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ذرائع کے متعلق صحیح جائزہ لگانے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ مجوزہ علاج اور اس کی پیچیدگی اور خطرہ کی شدت اور اس پر صرفہ اور اس طریقۂ علاج کو اختیار کرنے کے امکان پر غور کیا جائے۔ ایسا کرتے وقت مریض کی حالت اور اس کی جسمانی اور اخلاقی صلاحیتوں کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا۔" ویٹیکن نے آگے چل کر کہا ہے:

"سنگین بیماریوں میں مبتلا لوگ جب موت کی مانگ کرتے ہیں تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ زندگی کو ختم کرنے کے لئے

۱- VATICAN پاپائے روم کا صدر مقام یا پایۂ تخت۔

التجا کرتے ہیں۔ در اصل اکثر و بیشتر، وہ مدد اور محبت کے لئے گویا مجبور فریاد کر رہے ہوتے ہیں۔ بیمار آدمی دوا کے علاوہ
جس چیز کا بھوکا ہوتا ہے وہ محبت ہے، وہ انسیت اور گرمجوشی جو مریض کے اقربا، والدین، اولاد، ڈاکٹر اور نرسوں
کے دل و دماغ افعال و اقوال سے پھوٹتی ہے اور مریض کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔"

کلیسا نے اوائل ایام سے ہی بے یار و مددگار بوڑھوں، اور مرتے ہوئے انسانوں کی دیکھ بھال اور غمگساری کو
اپنا خوشگوار فریضہ سمجھا ہے۔ کلیسا کے بہت سے عالمی اجتماعات ایسے لوگوں کی خدمت کے لئے وقف ہیں۔ مثلاً: مدر ٹریسا
کے ادارے مبلغین خیر (MISSIONARIES OF CHARITY) "غریبوں کی بہنیں" (LITTLE SISTERS
OF THE POOR) "مسافروں، درویشوں کی پناہ گاہیں" [illegible] یہ تمام بچوں کے گھر کی یاد
دلاتے ہیں۔ [illegible] ایک شمارے میں اچھے بستر [illegible] اور ان لوگوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے، جو مرض الموت
میں مبتلا ہیں۔ یہ تحریک اب عالمگیر ہو چکی ہے۔ بمبئی میں کینسر کا ایک مرکز احباب اور اہل خیر کی مدد سے
جلد ہی ان بیماروں کے لئے اسی طرح کا گھر کھولنے جا رہا ہے۔ جن کی طرف موت منہ کھولے بڑھ رہی ہو۔

کلیسا نے اپنا موقف بالکل واضح کر دیا ہے "ایسی صورت میں، جبکہ علاج کے باوجود موت ملتی نظر
آ رہی ہو، تو اس بات کی اجازت ہے کہ علاج کے ایسے طریقوں کو بند کر دیا جائے جن کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ زندگی
ایک پر خطر اور غیر معتبر طول کی سمت میں گھسٹتی رہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ عام طبی امداد سے ایسے مریض کو بہرحال
محروم نہ کیا جائے۔ اس صورت میں معالج کے ضمیر پر کوئی بار نہیں پڑے گا۔"

۲۷ جون کے ٹائمز آف انڈیا میگزین سیکشن میں درج ہوئے فادر جو اے مینیزیز (FR. JOE A MENEZES)
کے تبصرہ سے اتنا طویل اقتباس اس لئے کیا گیا ہے کہ "تہذیب الاخلاق" کے قارئین کو جدید دنیا کے اس مسئلہ سے
روشناس کرایا جائے، جو بڑھتی ہوئی محرومی اور گھٹتی ہوئی وفاداری کا شاخسانہ ہے۔

ہمارے معاشرہ میں رواج تھا (کسی حد تک اب بھی ہے) کہ لوگ سلامتی ایمان کے اور چلتے ہاتھ پیر اٹھنے
کی دعا مانگتے تھے۔ واقعی دست نگر ہو کر جینے سے موت بہتر ہے اور بار بار بہتر ہے۔ [illegible]
کی دعا دیتے ہیں، وہ دعا دیتے ہیں کہ [illegible] وہ ادھوری دعا ضرور دیتے ہیں۔ ان کو اس میں مذکورہ بالا دوہری
دعا پڑھنا پڑے گی۔ ایمان کا توازن اس قدر نازک، ورانہ پر گرفت، اس قدر پرخطر ہے کہ انسان کسی عمر میں
بھٹک سکتا ہے۔ بھٹک سکتا ہے۔ [illegible] اور دوسرا فراز ایمان داری کا طرز [illegible] ٹوٹ جاتا ہے
اور وحدت پرستی کے قلعہ کو بھی منہدم ہوتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عیسائیوں نے بوڑھوں، محتاجوں اور جان لیوا بیماریوں میں پھنسے ہوئے انسانوں کے لئے اتنا کچھ کیا ہے، مسلمانوں نے اس طرف توجہ کیوں نہیں کی؟ کیا ان میں انفرادیت اس قدر طغیانی پر ہے کہ وہ کسی اجتماعی کام کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ وہ دین جو دنیا کے لئے رحمت بن کر آیا تھا اور جس کا سارا ڈھانچہ اجتماعی ہے، اس نے اس قسم کے ادارے کیوں نہیں قائم کئے جو محتاجوں، اپاہجوں، عمر رسیدوں اور مرگ رسیدوں کی خبر گیری کرتے۔ ہم بھول رہے ہیں، دنیا میں شفاخانوں کے قائم کرنے میں پہل ہم نے کی تھی اور یہ تصور بھی ہمارا لایا ہوا ہے کہ شفاخانے طبی تعلیم کا مرکز ہوتے ہیں۔ لیکن جستجو اور علم کے ساتھ رحم اور خیر کو بھی ہم نے خیر باد کہہ دیا۔ عجیب بات ہے کہ اہل عرب بعض خاندانی روابط سے گریزاں ہے۔ وہ عام انسان کی مصیبت کا احساس اور اس کی تلافی کے لئے کوشش ہماری نسبت کہیں زیادہ کرتے ہیں۔ انھوں نے وابستگی، ذمہ داری (وہ بھی ایک مدت تک) اور محبت کو خاندان کی اس سکڑی ہوئی شکل تک محدود کر دیا ہے جسے گھر کہتے ہیں۔ ہم نے خاندان کے تصور کو یک گونہ وسیع رکھا ہے لیکن ہم خاندان سے آگے نہیں بڑھے اور تصور ان کو اس بڑے خاندان کی طرف لے گیا جس سے انسانیت مراد ہے۔

اس طویل تمہید کے بعد ہم نفس مضمون کی طرف آتے ہیں۔ مغرب نے محتاجوں، بیماروں، لاوارثوں اور مرگ رسیدوں کے مسئلہ کو کچھ تو اس لئے زیادہ محسوس کیا کہ وہاں بعض شدائد اور بے اعتنائیوں کے باوجود بنی نوع انسان کا تصور ہمارے مقابلہ میں زیادہ واضح اور زیادہ زندہ تصور ہے۔ ہمارے یہاں وہ خاندان کے تصور میں دب گیا ہے، کچھ اس بنا پر کہ عام خوش حالی کے زیر اثر وہاں محتاجی، اپاہجی، کنگالی، اور لاوارثی کی مثالیں کثیر ہیں۔ وہ لوگ ان کے عادی نہیں ہیں۔ لہٰذا جب یہ مثالیں سامنے آتی تھیں تو ان کو ہم سے زیادہ گراں گزرتی ہیں اور امداد کے لئے اکساتی ہیں؛ کچھ اس لئے بھی کہ مشرق میں خاندانی رشتوں کا احترام اور خاندان والوں کے لئے ذمہ داری کا احساس ہنوز باقی ہے۔ جب کہ مغرب میں یہ معدوم ہو چکا، نہ سہی، چلا ہے۔ وہاں آخری ایام گھر سے دور نرسنگ ہوم میں گزارنے کی مثالیں وافر ہیں اور یہاں شاذ۔ لیکن اگر رنگ زمانہ یہی رہا اور مغرب کے اثرات کا نفوذ اور مشرق میں ان کی تقلید کا یہی حال رہا تو ایسی مثالیں یہاں بھی عام ہو جائیں گی۔ وہاں ہر شخص باوجود شاہ خرچی کے زندگی کے دھندلے ایام کے لئے کچھ نہ کچھ پس انداز ضرور کر لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ بڑھاپے میں سوائے زر کے اور کوئی ساتھ نہ دے گا۔ اس لئے وہاں لوگ سڑکوں پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان نہیں دیتے۔ حکومت کی فلاحی اسکیمیں بھی آڑے وقت میں دستگیری کرتی ہیں۔ لیکن اس طرح کسمپرسی اور لاوارثی اور کوڑے کے ڈھیر پر ڈال دئیے جانے کے احساس میں کوئی خاص کمی نہیں ہوتی۔ محبت کی پیاس اور توجہ کی بھوک چٹکیاں لیتی رہتی ہے اور جانکنی کے کرب کو یہ احساس اور شدید کر دیتا ہے۔

لیکن سوسائٹی کے رنگ اور روایات کے اختلافات کے باوصف انسانی مسائل عالمگیر ہیں۔ دور اور کثرت
اور زاویہ کے فرق سے ان کی ہمہ گیری متاثر نہیں ہوتی۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ جن مریضوں کو شفا کی کوئی امید نہیں
رہی، جن کے آخری لمحات شدید درد اور تکلیف میں گزر رہے ہیں، جو حرکت نہیں کر سکتے۔ اور چھوٹی سی چھوٹی بات
کے لئے دوسروں کے دست نگر ہیں۔ جن کی تکلیف نہ اپنوں سے دیکھی جاتی ہے نہ بیگانوں سے، کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ
انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور جدید طب کی مجموعی طاقتیں ان کی عمر اور تکلیف کو طول دینے پر صرف نہ
کی جائیں؟۔ ذرا اور آگے بڑھیے، کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ "ترحمانہ اختتام زندگی ان کو بے بسی اور بے کسی اور
تنہائی کے جگر دوز احساس اور درد کی شدت سے نجات دلا دے۔ 'کلیسا' نے اس کی مخالفت کی ہے۔ لیکن ایک
عنوان سے ترحمانہ قطع حیات کی ایک منفی شکل کو جائز قرار دیا ہے۔ یعنی مرض الموت کے لئے عام طبی امداد کا سلسلہ
جاری رکھو۔ لیکن جدید طب کے ان ذرائع کو صرف نہ کرو جو بے بسی، بے چارگی اور اذیت کے ایام کو طول دیتے ہیں۔

لیکن زندگی اور موت کی کشمکش کے ضمن میں معمولی اور غیر معمولی یا مناسب اور غیر مناسب ذرائع
علاج کی بات ہمارے حلق سے نیچے نہیں اترتی۔ نہ انسانی عصبیت اس بات کو گوارا کر سکی کہ صرفہ کا تخمینہ لگایا
جائے اور اسے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے۔ اور دوسرے میں افاقہ کی امید کو۔ اگر کلیسا نے یہاں صرفہ
کا ذکر نہ کیا ہوتا تو اچھا تھا کہ کلیسا کی زبان سے مادی وسائل کا تذکرہ، وہ بھی ایک اخلاقی مسئلہ میں، کچھ نامناسب
اور بے محل سا لگتا ہے۔ علاج کی پیچیدگی یا سادگی بھی اگر معرض بحث میں نہ آتی تو کوئی سہو نہ ہوتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ
جب انسان میں کچھ نہ رہا ہو۔ نہ ہوش نہ حواس، نہ نقل و حرکت کی طاقت، نہ جینے کا ولولہ، نہ زندگی کا احساس، نہ بچنے
کی طاقت۔ اور جب وہ سوچ نہ سکتا ہو، نہ ارادہ کر سکتا ہو، نہ فیصلہ کر سکتا ہو، تو اسے طب کی مجموعی طاقتوں کے
ذریعہ اس انداز سے کچھ دن اور اس طرح زندہ رکھنا کہ سانس کی آمد و شد ہی زندگی کی پہچان رہ جائے اس
کے ساتھ ناانصافی کرنا ہوگا۔ ایک ایسے جسد کو جو روح کے خواص سے تقریباً محروم ہو گیا ہو، مصنوعی طور پر زندہ
رکھنے کی کوشش کرنا، آئین قدرت کی خلاف ورزی ہے اور نعوذ باللہ خالق کی شان میں گستاخی اور اس کے حضور
ایک چیلنج ہے کہ "تو کہتا ہے کہ زندگی اور موت تیرے اختیار میں ہے، دیکھ کہ ہم کس طرح زندگی کو طول دیتے ہیں"۔
لیکن یہ چیلنج کتنا کھوکھلا ہے۔ یہ بات جب ہی واضح ہو جاتی ہے جب اس انسان کی ہیئت کذائی کو دیکھا جائے،
جس کی بیچارگی کی فضیحت کی جا رہی ہے اور جس کے درد کو طوالت میں ڈالا جا رہا ہے۔ ایسا انسان زندہ اس
لئے نہیں رہا کہ اب اس میں سانس اور خون کی گردش کے علاوہ کچھ باقی نہ رہا۔ وہ مردہ سے اس لئے بدتر ہے کہ

کہ اس سکون سے محروم ہے جو موت لے کر آتی ہے۔ اسے حیات صادق نہ کہو، یہ مرگ کاذب ہے کہ موت ہونے کے باوجود زندگی کا اعلان کر رہی ہے۔

یہاں اکابر و مشاہیر کی موت کا وہ عبرتناک پہلو سامنے آتا ہے کہ مر چکے ہیں۔ زندگی کا نام و نشان باقی نہ رہا، لیکن نعش ہے کہ کوچہ بازار میں کھینچی جا رہی ہے، ایک تماشا بن گئی ہے۔ لوگ آخری دیدار کے لئے آ رہے ہیں۔ ہزاروں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں، آخری رسوم انجام دینے میں جتنی تاخیر ہو سکتی ہے، کی جا رہی ہے، تاکہ دنیا مرنے والے کی بے بسی کا تماشا دیکھے۔ روح کبھی کی نکل چکی۔ خاک کے ڈھیر میں کیا رکھا ہے جسے اس طرح رسوا کرتے ہو۔ کیا صرف اس لئے کہ جو تاثر مرنیوالے کی شخصیت کا تھا، زائل ہو جائے اور ایک پھولی ہوئی نعش ایک ورم کیے ہوئے بے جان اور بے نور چہرے کی یاد ساری جاں بخش یادوں کو مٹا دے۔ خیر تمہاری مرضی۔ یہ آخری تاوان ہے جو شہرت پانے والے کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ تاوان وصول کرنے والوں کو کیا خبر کہ وہ اس جگہ جا رہا ہے جہاں یہ شہرت اور سربازار یہ رسوائی ہرگز کام نہ آئے گی۔ جہاں توبہ و اصلاح کا دروازہ بند ہو چکا ہو، وہاں شہرت اور نام نہاد عزت کو بار کہاں۔

قلم بہکنے کا عادی ہو گیا ہے۔ تمو قلم نے دو تصویریں آپ کے سامنے کھینچ کر رکھ دی ہیں۔ ایک تو ایسے مریض کی جسے زندہ کہنا زندگی کی تضحیک ہے، لیکن اسے ایسی حالت میں رکھنے کے جتن کیے جا رہے ہیں۔ دوسرے ایک مُردہ کی جسکی نعش کو مرجع خلائق بنایا جا رہا ہے اور کوچہ و بازار اور شہر و دیار میں کھینچا جا رہا ہے۔ دونوں حرکتیں ناروا اور مذموم ہیں، دونوں جسارتیں مضحکہ خیز اور معیوب ہیں۔ قدرت کا مذاق اُڑاؤ گے تو منھ کی کھاؤ گے۔ دونوں تصویروں کی مشابہت ظاہر ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ دیرینہ عادت ہے کہ مذہب کے نام پر جان دینے کے لئے تیار رہیں گے، لیکن کریں گے سب کچھ۔ اس کے برعکس جو مذہب نے بتایا ہے اخوت اور مساوات کے چرچے زبانوں پر ہیں لیکن اپنے بھائیوں کے ساتھ بھائی چارہ کو نباہتا کون ہے، مساوات کون برتتا ہے؟ دراصل جتنا فاصلہ خوشحال اور غریب مسلمان میں ہے وہ دوسرے فرقوں میں نظر نہیں آتا۔ شراب کی ممانعت ہے لیکن نہ معلوم کتنے مسلمان ہیں جو شراب کو شیر مادر کی طرح پیتے ہیں۔ جسد خاکی کو اسلام کوئی اہمیت نہیں دیتا کہ اس کا کاروبار صرف روح سے ہے۔ لیکن ہم نہ صرف نشانہ ہی، بلکہ بقا کے لئے پختہ قبریں بنواتے ہیں، جو مذہباً سخت ناروا ہے۔ چاہے پکی قبریں بنواؤ، چاہے مرنوالے کی تدفین میں تاخیر کر کے کوچہ و بازار میں رسوا کرو۔ چاہے مرنوالے کو جبکہ ہوش و حواس، عقل و شعور، حوصلہ اور ولولہ، ارادہ اور حرکت ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکے ہیں، مصنوعی طور پر زندہ رکھنے کی کوشش کرو۔ یہ سارے عمل

یکساں ہیں۔ المناک اور عبرت ناک اور حسرت ناک ہیں۔ آخر اوّل الذکر کی بابت کلیسا کا فیصلہ صحیح ہے۔ مگر وہ غلط راستہ سے اس فیصلہ پر پہنچا۔ وسائل کی بات ایک غیر روحانی اور سراسر اضافی امر ہے۔ اسے معرضِ بحث میں لانا اعتقاد کے ضعف کی دلیل ہے۔ دراصل کلیسا کے اس "فتویٰ" کی تعبیر و تفسیر ورثا اور تیماردار اپنے شعور، ذوق اور مفاد کے مطابق کریں گے اور یہیں خطرے کی گھنٹی بجتی ہے۔ بعض ورثا اطبا کو اپنے مفاد کے مطابق سبق پڑھائیں گے۔ علاج کی پیچیدگی اور غیر معمولی اور غیر مناسب وسائل علاج میں پڑنا ہی نہ چاہیے کہ یہ ایک پُرخطر وادی ہے۔ ہماری رائے ناقص میں سوال صرف یہ ہونا چاہیے کہ آیا علاج سے مریض کے ہوش و حواس اور شعور بحال اور بیدار ہو سکیں گے۔ خواہ تھوڑی سی مدت کے لئے سہی۔ اگر اس کا امکان ہے کہ ہو سکیں گے، تو علاج خواہ اس پر کتنا ہی صرفہ کیوں نہ ہو، روا اور برحق۔ اور اگر امکان نہیں ہے تو علاج دردافزا اور طوالت خیز علاج ناروا اور باطل۔ اسے علاج کیوں کہیئے، کہ اس کا مقصود شفا ہے ہی نہیں۔ بلکہ جدید طبی سائنس کی دسترس کی نمائش اور نئی دواؤں کی بیرحم آزمائش ہے۔ بہرحال یہ تو ایک عام بلکہ عامی آدمی کی رائے ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ کی طرف توجہ فرمائیں۔

●●

شئے لطیف

بچپن میں سُنا تھا" فلاں صاحب میں شئے لطیف کی کمی ہے۔" ذہن میں یہ تاثر تھا کہ یہ جملہ ایسے شخص کے لیے کہا جاتا ہے، جس میں بھونڈا پن پایا جائے۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ 'شئے لطیف' سے نہ فکر کی لطافت مراد ہے، نہ اطوار کی نفاست۔ شئے لطیف دراصل تناسب کے احساس کا دوسرا نام ہے۔ کوئی بات کہاں کہنی چاہیے، کس طور پر کہنی چاہیے' اس کا صحیح فیصلہ انسان 'شئے لطیف' کی رہنمائی کے بغیر نہیں کر سکتا۔

آپ کی نظر سے ایسے لوگ گزرے ہوں گے جنھیں اپنی قسمت سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ وہ سدا سچی اور کھری بات کہتے ہیں، پھر بھی کوئی ان کی بات نہیں سنتا۔ لوگ اُلٹے ان کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ جہاں انھوں نے یہ بات شروع کی لوگوں نے تیوری چڑھائی کہ دیکھیے اب کیا آتا ہے۔ بجائے اُن کی سچائی کی تعریف اور پذیرائی کرنے کے' لوگ ان کی باتوں سے مکدر ہونے لگتے ہیں اور بعض تو دشمنی اُترو ہو جاتے ہیں۔ یہ بے محل بولنے والے سوچتے بھی نہیں کہ بات موقع دیکھ کر کرنی چاہیے۔ بے موقع بات جراحت کا سامان بہم پہنچاتی ہے یا استہزا کا۔ جو لوگ سچ بات کہہ کر، بغیر ارادہ اصلاح کے، دوسروں کا دل دُکھاتے ہیں' وہ سچائی کو بدنام کرتے ہیں اور بہتوں کو سچائی سے بدگمان کر دیتے ہیں۔ بات شروع کرتے وقت یہ تو سوچ ہی لینا چاہیئے کہ اس بات کا اثر کیا ہوگا۔ اگر بات کا اثر بُرا ہونے کا ڈر ہے تو بات کی ہی کیوں جائے۔ کیا صرف اس وجہ سے کہ وہ زبان پر آگئی ہے' یا اس بنا پر کہ حقیقت بے نقاب ہونے کے لئے بیتاب ہے۔ کسی شخص نے کوئی غلط قدم اٹھایا اور آپ نے اسے برملا بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا تو کیا نتیجہ ہوگا۔ وہ ضد پکڑ جائیگا اور اپنے دل میں آپ کے لیے کدورت یا عداوت کو جگہ دیدے گا۔ آپ چلے تھے اصلاح کرنے، اس کے بجائے آپ نے مخاطب کو' اس کی غلطی کو' اس کی غلطی میں راسخ کر دیا اور اسے اپنا دشمن بھی بنا لیا۔

آپ کسی سے ملنے گئے۔ اس کے اختیار میں ہے کہ آپ کا کام بن جائے۔ لیکن آپ سوال کے بجائے چھوٹتے ہی مطالبہ کرنے لگے، حکم دینے لگے، جھگڑنے لگے تو اس کا اختیار تمیزی جو آپ کے

مسئلے کو حل کرنے میں صرف ہوتا اسے الجھانے میں لگا دیا جائے گا۔ بات کرنے کا ڈھنگ زندگی کی اہم ترین چیزوں اور کامیابی کے اہم ترین وسائل میں سے ہے۔ اگر ڈھنگ مناسب ہے تو بات بن جائے گی، نہ ہوا ہے تو بات بگڑ کر رہے گی۔

کس وقت بات کرنی چاہیئے اور کس وقت دم سادھ لینا چاہیئے، اس کا فیصلہ ہیں روز کرنا پڑتا ہے۔ صحیح فیصلہ احساس تناسب کے بغیر ممکن نہیں۔ آپ کو اپنے افسر سے شکایت ہے، آپ اس کا ذکر جا بجا کرتے پھرتے ہیں، گویا شکایات کے دو چند ہو جانے کا بنفس نفیس انتظام کر رہے ہیں۔ یاد رکھئے آپکے کلمات موصوف تک پہنچ جائیں گے، "مناسب" یعنی نامناسب اضافوں کے ساتھ۔ اس سے بہتر ہوتا کہ آپ موصوف سے خود بات کر لیتے اور بات کرتے ہوئے اس احساس کا اظہار کر دیتے کہ انھیں آپ کی خوشحالی اور آپ کے مستقبل میں دلچسپی ہے اور اس امید کو زبان دیتے کہ آپ کو ان کی ہمدردی کا پر اعتماد ہے۔ یاد رکھئے کہ ہر انسان ان توقعات کو جو دوسروں کو اس کے متعلق ہیں، پورا کرنے کی کچھ نہ کچھ کوشش ضرور کرتا ہے۔ جس مسئلہ میں آپ نے کسی دوسرے کو ابتدا ہی سے شریک کر لیا وہ مسئلہ آپ کا علی حدہ اس کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ بات یہاں بھی نہیں رکتی۔ ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ ہر فرد ان توقعات کو بھی جو خود اسے اپنی ذات سے ہیں، پورا کرتا ہے؛ یا اس پر سا میں آگے بڑھتا ہے۔ جبھی تو کہتے ہیں کہ اپنے پیشہ کو شکستوں کی یاد یا ان کے تصور سے گرد آلود نہ کرو۔ ناکامیوں اور ناامیدیوں کو بھول جاؤ اور اپنی کامیابیوں اور کامگاریوں کو یاد رکھو۔ اس طرح تم اپنے پیشہ میں آب و رنگ بھر دو گے، جو تمھارے اندر اعتماد اور رافتی ر پیدا کر کے تم سے بڑے بڑے کام کرائے گی۔ جیسے جیسے نئی کامیابیاں تمھیں حاصل ہوں گی، پرانی ناکامیوں کی یاد خزاں کے پتوں کی طرح جھڑتی چلی جائے گی اور نئی کامیابیاں بہار کی کونپلوں کی طرح حافظہ میں پھوٹ کر نکلیں گی۔ تمھارا تصور تمھارے متعلق جو پیکر بنائے گا، اس میں ولولہ، اعتماد، قوت تسخیر جلوہ گر ہوگی۔ ناکامیوں اور شکستوں کے اسباب کا جلد ہی تجزیہ کر کے ان کی حوصلہ شکن یاد کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دو۔

جو لوگ شیخی کے عادی ہیں یا خود ستائی سے باز نہیں آتے وہ بھی انھیں محرومیوں میں سے ہیں — نشۂ لطیف، جو سے کترا کر نکل گئی۔ مان لیجے کہ آپ افلاطون ہیں مگر اس شخص کو جس سے آپ بات کر رہے ہیں، آپ کے افلاطون ہونے سے کیا سروکار۔ اس کے پاس اس زیادہ گوئی کو سننے کے لیے وقت کہاں

آپ ڈینگ لیں گے، تو شروع میں وہ آپ کی سادگی پر مسکرائے گا، لیکن جلد ہی اُکتا جائیگا اور آپکی صحبت سے گریز کرنے لگے گا۔ آپ اگر واقعی افلاطون ہیں، تو آپ کو خود اس کا اعلان کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ کی دانشمندی سورج کی کرنوں کی طرح دنیا میں پھیل جائے گی۔

ایک گروہ ان اشخاص کا ہے جو اپنی تعریف تو نہیں کرتے، لیکن اپنا اور اپنے گھر والوں کا ذکر کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔ یہ خیال ان کے دماغ پر اپنا سایہ نہیں ڈال پاتا کہ آپکے گھرانے کے متعلق دوسروں کو دلچسپی کیوں ہونے لگی اور ان لوگوں کی تو کسی سماج میں کمی نہیں جو آپکے پاس آکر گھنٹوں بیٹھ جائیں گے اور باتیں کیے جائیں گے یا خاموش بیٹھے رہینگے۔ دونوں صورتوں میں انھوں نے آپکا وقت خراب کیا، آپ کے سکونِ خاطر کو برہم کیا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اپنی صحبت کا شرف بخش کر وہ آپ پر احسان کر رہے ہیں، حالانکہ دراصل انھوں نے آپ کو عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ ایسے لوگوں کو انگریزی میں "بور" کہتے ہیں۔ ان کے ساتھ "شۓ لطیف" کا انتساب ناممکن ہے۔

اور ایسے لوگ بھی ہمیں اپنے اردگرد مل جائیں گے جو شیخی مارنے کے بجائے اس کے برعکس عمل کرتے ہیں۔ یعنی اپنی کم مائگی اور نا اہلی کا، وقت ناوقت اعلان کرتے ہیں۔ انھیں کُھرچ کر دیکھیے تو پتہ چلے گا کہ اپنی ذاتِ گرامی کے متعلق انھیں دل ہی دل میں ہزاروں خوش فہمیاں ہیں اور یہ خوش فہمیوں کی طغیانی ہے جو انکسار کا بہروپ بھر کر زبان پر آتی ہے۔ گویا اپنے افتخارِ ذاتی کو اس عنوان برہنہ ہونے سے بچایا جا رہا ہے۔ بعض مبصرین اس انکسار میں دعوتِ ستائش کو کروٹ لیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ موصوف کے پاس صرف ایک صورت ستائش حاصل کرنے کی ہے، اپنے آپ کو برا بھلا کہنا، نیچا دکھانا، ذرّۂ ناچیز بتانا۔ مخاطب کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ موصوف جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی تردید کرے اور ان کی تعریف کے پل باندھے تاکہ محترم کی تفریط اور اس کی افراط سے ایک اوسط نکل آئے، جو حقیقت کے قریب تر ہو، یا کم از کم مخاطب پر یہ الزام نہ لگے کہ محترم اپنی جو ہجو کر رہے ہیں، وہ اس میں برابر کا شریک ہے۔ بہرحال یہ انکسار جھوٹا انکسار ہے، پُرفریب انکسار ہے اور اس کا شمار نسائی حمیدہ میں کرنا فریب کھانے والوں کے لئے بھی دشوار ہے۔ جھوٹے انکسار سے پُرخلوص ڈینگ بہتر ہے۔ "شۓ لطیف" کا پہرہ جہاں ہٹا، اس طرح کے نفسیاتی آسیب دل و دماغ میں داخل ہو جاتے ہیں، اور زبان کے میدان میں آکر دادِ شجاعت دیتے ہیں۔

یوں تو "شۓ لطیف" کی کلی اپنے اظہار کے لئے زبان کی محتاج بھی نہیں۔ اس کے شگفتہ کرشمے بھی

کوئی کم نہیں۔ بے محل اور بے موقع کام بھی لوگ ناحق کر گزرتے ہیں۔ جو بات کسی موقع پہ نہ کہنی چاہیے، جو کام کسی موقع پہ نہیں کرنا چاہیے وہی کرتے ہیں اور سب کو خفت، پشیمانی اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا کرتے ہیں۔ زندگی کا تجربہ جتنا وسیع ہوتا ہے اور انسانوں کے باہمی تعلقات اور ان کے ردّ عمل کے تجزیے کا موقع جس قدر ملتا ہے اسی قدر یہ بات کھلتی جاتی ہے کہ انسان کے لئے تناسب کا احساس بے حد ضروری وصف ہے۔ اگر یہ نہ ہوگا تو وہ ہر قدم پہ ٹھوکریں کھائے گا اور زندگی کے صحرا میں بھٹکتا رہ جائے گا۔ یہ دنیا اتنی وسیع، یہ زندگی اتنی پیچیدہ، یہ تجربات اتنے گوناگوں اور حالات کی صورتیں باہم دگر اس قدر مختلف، اور باہمی روابط اتنے نازک اور افراد کی اَنا اس قدر استیلا طلب اور مختارات اتنے وافر، راہیں اتنی کثیر اور کسی ایک لمحہ میں کچھ کہنے یا کرنے کے امکانات اس قدر متنوع ہوتے ہیں کہ تناسب کا احساس اگر رہنمائی اور یاوری نہ کرے تو فرد ٹکڑا ٹکڑا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے، بھٹکتا رہے اور جیوں جیوں آگے بڑھے منزل سے دُور ہوتا چلا جائے۔ اس قدر دُور کہ مرکز کی طرف واپس آنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ مرکز سے دُور ہونے کا انجام کیا ہے، پارہ پارہ ہو جانا، بکھر جانا۔ یہی انجام اس شخصیت کا ہوتا ہے۔ احساس تناسب جس کی شیرازہ بندی نہیں کرتا وہ شخصیت منقسم (SPLIT PERSONALITY) شخصیت کی سرحد پر منڈلانے لگتی ہے۔

یہ احساس تناسب ہی ہے جو بات کی تہہ تک پہنچاتا ہے۔ ورنہ انسان کے حواس خمسہ دماغ کی طرف ہزاروں لاکھوں تأثرات اور پیغامات بھیجتے رہتے ہیں۔ غریب دماغ ان کے ہجوم سے گھبرا جائے اور اس طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگے جیسے ڈوبتا ہوا انسان موجوں کی یورش میں دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ یہ احساس تناسب ہے جو ان ہزار ہا پیغامات میں سے جو حواس دماغ کو بھیجتے ہیں چند کی طرف دھیان دیتا ہے اور باقی کو تحت الشعور کے گودام میں بھر دیتا ہے۔ اہم اور غیر اہم کا امتیاز، ضروری اور غیر ضروری کی تفریق، بلکہ نیک و بد اور حسن و قبح کی تمیز تک بھی احساس تناسب یا شئے لطیف کی قلمرو میں آجاتی ہے، اسی وصف کا تیسرا نام قوتِ انتخاب ہے۔

طالب علموں کے لئے احساس تناسب کو آزمانے اور اس پر سان رکھنے کا ایک موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ امتحان میں ایک طویل عبارت دے دی گئی اور کہا گیا کہ اس کا خلاصہ (PRECIS/SYNOPSIS) لکھو، اس کا لب لباب بتاؤ۔ جواب سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ امتحان دینے والے میں تناسب کا احساس کس

حد تک ہے، کس پایہ کا ہے۔

زندگی میں ہر قدم پر فیصلے کرنا پڑتے ہیں یعنی کئی راہوں کئی مختارات میں سے ایک کو چننا پڑتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فیصلہ کرنے کے لئے ایک ثانیہ سے زیادہ نہیں ملتا۔ زندگی کے امتحان میں جو پرچے آپ کو آئے دن بلکہ متواتر کرنا پڑتا ہے، وہ سینکڑوں کثیر الختارات (OBJECTIVE QUESTIONS OF MULTIPLE CHOICE TYPE) معروضی سوالات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر آپ کو قدرت نے "شئے لطیف" سے نوازا ہے، اگر آپکو احساس تناسب کی دولت ملی ہے تو آپ زندگی کے اس امتحان میں پورے اتریں گے ورنہ اس بحر ذخار میں بے سمت و ارادہ غوطے کھاتے رہیں گے۔ 'شئے لطیف' بالکل نہ ہو تو مرض لا علاج ہے، تھوڑی بہت ہو تو اس کو بڑھایا اور سنوارا جا سکتا ہے۔ جس طرح طالب علم مشق کے بعد لب لباب یا خلاصہ بہتر لکھنے لگتا ہے۔ اسی طرح انسان محنت اور ممارست کے ذریعہ اپنے احساس تناسب کی گیرائی اور گہرائی کو فروغ دے سکتا ہے۔ شئے لطیف کی کمی جہاں دوسروں کے لئے حظ کا سامان فراہم کرتی ہے وہاں محرومین کے لئے ناکامی کی ضمانت لے لیتی ہے۔

شئے لطیف کی کمی ہو تو انسان پر غلط بات کرنے اور صحیح بات غلط وقت پر یا غلط ڈھنگ سے کرنے اور غلط فیصلہ کرنے اور غلط قدم اٹھانے کا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

"شئے لطیف' احساس تناسب' صلاحیت انتخاب' قوت فیصلہ' قوت ممیزہ' ایک ہی وصف کی مختلف شکلیں ہیں۔ ان میں سے ایک کو مانجھیئے تو باقی سب پر جلا آتی ہے۔ ایک کو غذا دیجیے تو باقی سب کو توانائی ملتی ہے۔ ایک کی مشق کیجیے تو یہ ہمرشتہ قوتیں بھی چپک جاتی ہیں۔ 'شئے لطیف' کو نازک نہ سمجھئے۔ اس میں بہت جان ہے۔ اسے چھوٹی سی نہر جانئے، یہ اسی سرچشمے سے نکلی ہے جہاں سے بڑی بڑی ندیاں پھوٹی ہیں، جو انسان کو سیراب کرتی ہیں، اسے تناور درخت بناتی ہیں۔ اس کی شخصیت کو پروان چڑھاتی ہیں اور اکتسابات کے فروغ کے لئے امکانات کے دروازے کھول دیتی ہیں۔ باقاعدگی' ترتیب' انضباط' یہ سب اسی بنیادی وصف کی دین ہیں۔ بظاہر چھوٹی سی یہ صفت کتاب زندگی کی شیرازہ بند ہے۔ "شئے لطیف" اعتدال کے راستے پر چلاتی ہے۔ جو لوگ اعتدال سے عادتاً تجاوز کرتے ہیں' انھیں "شئے لطیف" سے کوئی سروکار نہیں۔ شئے لطیف سلیقہ کا سبق دیتی ہے' قرینہ سکھاتی ہے، سلامت روی کی چال چلواتی ہے۔ زندگی کے بحری سفر میں اس کی حیثیت "قطب نما" کی ہے۔

●●

اخلاقی غور و خوض

دہلی یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری میں تھوڑی دیر وقت گزارنے کے لیے پہنچ گیا تھا۔ شیلف پر سے ایک کتاب اٹھائی "اخلاقی غور و خوض"۔ کتاب آکسفورڈ کے کلیرنڈن پریس میں دو سال ہوئے چھپی ہے۔ مصنف کا نام آر۔ ایم ہیئر (R.M.HARE) ہے۔

کچھ ورق الٹے، جن مسائل کا ذکر تھا، ان سے ہمارا روز سامنا ہوتا ہے۔ ہر چند اس کتاب سے ہم سرسری گزرے تاہم "تہذیب الاخلاق" کے قارئین کو اس کے بنیادی نکات سے روشناس کرانا بے محل نہ ہوگا۔ یہ کتاب گویا نقطۂ آغاز ہے ان مسائل پر نئے سرے سے سلسلۂ فکر کا۔

اخلاقیات کا ذکر چھڑ جائے تو ضمیر، مذہب، سماج اور عقل چاروں اس کے لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ انسان فطرتاً بعض باتوں کو برا سمجھتا ہے اور بعض کو اچھا۔ یہ فیصلہ کرنے میں اسے عقل کی مدد درکار نہیں ہوتی۔ وہ اس فیصلہ پر بغیر غور و فکر کے پہنچتا ہے جس طرح دن کو دن کہنے سے پہلے اسے سوچنا نہیں پڑتا، نہ رات کو رات کہنے سے پہلے۔ یہ شعور اس کی رگوں میں خون کی طرح رواں دواں ہے۔ اسے فطرت، جبلت، ضمیر اور اس قبیل کے بہت سے نام دیے گئے ہیں، جو ہم معنی نہیں، ہر ایک کا مطلب ایک ہے۔ ان کے کہنے سے یہ مفہوم ظاہر ہو جاتا ہے کہ انسان کے پاس نیک و بد میں امتیاز کرنے کے ذرائع اور ڈھنگ عقل، جائزہ، منطق اور تنقید کے علاوہ بھی ہیں۔ زیر نظر کتاب کا بنیادی خیال یہ ہے کہ تجزیہ کرنے والی عقل، فطری شعور، نیک و بد کی کمک کے لیے طلب کی جا سکتی ہے۔ خصوصاً ان مقامات پر جہاں حل مشکل اور فیصلہ دشوار نظر آتا ہو۔ جہاں انسان کو دو ایسی راہوں میں سے ایک کو چننا پڑتا ہو جس میں سے دونوں راہیں الگ الگ اخلاقی طور پر ناگزیر نظر آتی ہوں۔ ایک راہ کو چنا جائے تو جس راہ کو چھوڑا گیا وہ حسرت اور پشیمانی اور بےچینی کی چٹکیاں دل میں لیتی رہتی ہے کہ حیف صد حیف ہم نے اپنے اخلاقی فرض سے روگردانی کی۔ اور اگر خود اس راہ کو اختیار کر لیا جائے جسے چھوڑا تھا، تو دوسری راہ کو چھوڑنا خلش اور انفعال کا سبب بن جائے۔

اس حاشیہ آرائی کے بعد ہم کتاب کی طرف پھر لوٹتے ہیں۔ اس میں دو مثالیں دی گئی ہیں جن کا دہرانا وضاحت کے لیے ضروری ہے۔ مان لیجیے کہ آپ نے ایک عرصہ سے اپنے بچوں سے وعدہ کر رکھا ہے کہ فلاں اتوار کو

ہم سب ایک ساتھ سیر اور پکنک اور خوش وقتی کے لئے نکلیں گے۔ آپ کی بے اندازہ مصروفیت کی وجہ سے بچے کبھی چھٹیاں منا ہی نہیں پاتے۔ ایک مدت کے بعد انھیں دن بھر بے فکری کے ساتھ باہر گزارنے کا موقع مل رہا ہے۔ عین اس وقت جب ماں باپ اور بچے گھر سے نکلنے والے ہیں، ایرپورٹ سے فون آتا ہے، ایک دوست کا جو آسٹریلیا سے آیا ہے، ۲۴ سال کے بعد آپ سے ملے گا۔ ایک اتوار کا دن ہی اس کے پاس ہے۔ اس کی فرمائش ہے کہ آپ اس کو اور اس کی بیوی کو مقامی میوزیم اور تعلیمی ادارے دکھا دیں۔ اگر آپ اپنے مدت سے بچھڑے ہوئے، دوست کی بات مانتے ہیں، تو بچوں پر کیا اثر ہوگا۔ ان کے شاداب شگفتہ چہرے کمھلا جائیں گے۔ وہ منھ لٹکا کر، منھ لبسور کر رہ جائیں گے۔ ان کے دل ٹوٹ جائیں گے۔ وہ سمجھیں گے کہ ان کے ماں باپ کو اپنے وعدہ کا پاس نہیں۔ ان کی دلشکنی کے علاوہ جو بات آپکو کھٹکے گی وہ یہ کہ آپ کی وعدہ خلافی ان کی تربیت پر اثر انداز ہوگی۔ آپ انھیں سکھاتے رہے ہیں کہ جو شخص اپنی بات کا پاس نہیں کرتا، اپنے وعدہ کو پورا نہیں کرتا، اس کی کوئی شخصیت نہیں ہوتی نہ اس کے قول میں کوئی وزن ہوتا ہے، سماج میں اس کی کوئی ساکھ باقی نہیں رہتی۔ اور آپ خود وعدہ خلافی کر رہے ہیں۔ بچے آپ سے اور آپکی دوسری نصیحتوں سے بدگمان ہو جائیں گے۔ دوسری طرف آپ اگر اپنے دوست کو نظر انداز کرتے ہیں۔ جو آپکے بھروسہ پر آپکے شہر میں اپنی بیوی کو لے کر آیا ہے اس امید کے ساتھ کہ آپ ان کی راہ میں آنکھیں بچھائیں گے اور چند گھنٹے ہمدم دیرینہ اور اس کی شریک حیات کے ساتھ گزارنے سے آپ کو بے اندازہ خوشی ہوگی۔ آپ کس منھ سے اس سے کہیں گے کہ عزیز دوست! آج کا دن تو ہمیں بچوں کے ساتھ گزارنا ہے۔ ان سے وعدہ ہے۔ ہم مجبور ہیں۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ تمہارا ملنا ہمارے لئے ملاقات مسیحا و خضر سے کم نہیں ہوتا۔

اس طرح کے چھوٹے موٹے مراحل ہمیں اکثر درپیش ہوتے ہیں۔ دو اخلاقی فریضوں میں سے ایک کو چننا پڑتا ہے۔ بسا اوقات متبادل فیصلوں کے نتائج اور مضمرات پر غور کرنے کو کچھ وقت بھی مل جاتا ہے لیکن بعض اوقات زیادہ اہم فیصلے چشم زدن میں کرنا پڑتے ہیں: سمندری لڑائی چھڑی ہوئی ہے۔ دشمن کی آبدوز نے آپ کے بیڑے کے ایک جہاز کو مسمار کر دیا ہے۔ اس کے بچے ہوئے افراد جان بچانے کے لئے اوپر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آبدوز کا رُخ اب آپکے بیڑے کے دوسرے جہازوں کی طرف ہوگا۔ ایک پل میں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آپ گولے بارود کے پورے جارج سے آبدوز پر نہ آپ حملہ کر دیں اور اُسے فی النار و السقر کر دیں۔ اگر ایسا نہ کیا تو آپکے فلیٹ کا ایک اور جہاز سارے افراد کے ساتھ موت کے منھ کا نوالہ بن جائے گا اور اگر ایسا کیا تو آبدوز کے ساتھ آپکے شکستہ جہاز کے ساتھی جو اُوپر آنے اور جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں لقمۂ اجل ہو جائیں گے۔

ہے نہ فیصلہ دشوار! دونوں میں سے جو فیصلہ کیجیے یکسوئی اور اطمینان حاصل نہ ہوگا۔ ہاتھ آئے گی حسرت، خلش، پشیمانی
اب دو[۲] مثالیں آپ کے سامنے رکھتے ہیں:

ایک بچہ علم کی جستجو میں گھر سے نکلتا ہے۔ اس کی ماں نے ایک عمر کی کمائی اس کے حوالے کر دی ہے۔ کرتے کے اندر اسے اچھی طرح سی دیا ہے کہ نہ کسی کو اس کی موجودگی کا گمان ہو، نہ اس کے گرنے کا امکان باقی رہے۔ بیچاری ماں نے اپنے لختِ جگر کو وداع کرتے وقت اسے صرف یہی دولت نہیں دی، ایک اور دولت کو بھی زادِ راہ کے طور پر اس کے سپرد کیا۔ یعنی "بیٹا کبھی جھوٹ نہ بولنا، جب بولنا سچ بولنا" قافلہ نے ابھی آدھی مسافت ہی طے کی ہوگی کہ ڈاکوؤں نے اس پر حملہ کیا۔ زر و مال سب لوٹ لیا۔ بچے کی باری آئی۔ اوپر سے ٹٹولا کچھ نہ ملا۔ بچے کے پاس ہوتا بھی کیا۔ ضمناً پوچھ لیا کہ "تیرے پاس کچھ ہے"۔ بچے کو فیصلہ کرنا ہے۔ ایک طرف علم کی پیاس اور ماں کی محنت کا پاس۔ اس نے اپنی عمر بھر کی کمائی بیٹے کے تحصیلِ علم کے شوق کی نذر کر دی تھی۔ اب اگر بتاتا ہے کہ میرے پاس اس قدر روپیہ ہے تو ڈاکو سب چھین لیں گے۔ ماں نے جو کچھ سالہا سال میں پس انداز کیا ہے، ایک پل میں برباد ہو جائے گا اور تحصیلِ علم کا ارمان بھی دل میں گھٹ کر رہ جائے گا۔ اگر نہیں بتاتا ہے تو اشرفیاں تو بچ جائیں گی۔ لیکن ماں کے حکم کی خلاف ورزی ہوگی کہ بیٹا ہمیشہ سچ بولنا۔ اس بچے کو زیادہ تأمل نہیں کرنا پڑا۔ اس نے پلک جھپکتے یہ فیصلہ کر لیا کہ جن اشرفیوں تک ڈاکوؤں کی نگاہ اور ہاتھ نہیں پہنچ سکے ہیں ان کی موجودگی کا اعتراف اور اعلان کر دوں گا۔ جب اس نے کہا کہ "ہاں میرے پاس اتنی اشرفیاں ہیں" تو ڈاکو سمجھے کہ یہ کنگال لڑکا ہم سے مذاق کر رہا ہے۔ اسے پکڑ کر اپنے سردار کے پاس لے گئے۔ قارئین واقف ہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا، یہ بچہ کون تھا اور کس طرح اس کی راست گوئی سے متاثر ہو کر ڈاکو ایمان لے آئے اور انھوں نے توبہ کی۔

غور کیجیے: نیّا کی اس عورت کے دل پر کیا گزری ہوگی جس نے آقا کے بچے کے بستر پر جسے وہ پال رہی تھی اور جسے رات میں طاقتور دشمن قتل کرنے آ رہے تھے اپنے بچے کو لٹا دیا اور آقا کے بچے کو دوسری جگہ چھپا دیا۔ ممتا کہتی تھی کہ ماں جایا ہی کائنات ہے۔ اس کو نو مہینے پیٹ میں رکھا۔ خونِ جگر سے اس کو غذا فراہم کی۔ اتنے ارمانوں اور تکلیفوں کے بعد وہ پیدا ہوا۔ کن امنگوں سے اسے پالا، بید بن کر دشمن کے خنجر کے سپرد کر دیا جائے؟ ماں کی ممتا کو کیا ہو گیا؟ ایسی ماں دھرتی کے ماتھے پر کلنک ہے، ظالم ہے، قاتل ہے، ڈائن ہے۔ وہ عورت اپنے ضمیر سے یہ سب لعن طعن سنتی رہی۔ اس کا جگر چھلنی ہو گیا۔ پھر یہ سوچا کہ جس بچے کو وہ پال رہی ہے اسے اس کے حال پر چھوڑ دے۔ لیکن وفاداری چلّاتی ہوئی آگے بڑھی کہ اے بے وفا! تو نے

جس مالک کا نمک کھایا ہے، جس کے بچے کو اپنے بچے کی طرح محبت سے پالا، اُس پر وقت آ پڑا ہے تو دُور کھڑی ہو کر تماشا دیکھے گی۔ یہ راج کمار مارا گیا تو راج کا کیا ہوگا۔ فتنہ و فساد سر اٹھائیں گے اور خدا کی مخلوق اور راجہ کی رعایا مصیبت میں پھنس جائے گی۔ قارئین جانتے ہیں کہ اس عورت نے وفا کو ماتا پر قربان کر دیا۔ فیصلہ کتنا دشوار تھا۔ مگر اس وفا شعار نے چھاتی پر پتھر رکھ کر بغیر آنکھ جھپکائے وہ دلیرانہ فیصلہ کر لیا۔

فارسی کی مثل ہے کہ وہ جھوٹ جس میں مصلحت شامل ہو، اس سچائی سے بہتر ہے جو فتنہ اور فساد برپا کرے۔ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن اس میں خطرہ یہ ہے کہ خود غرض اور ہوس پیشہ عقل حصولِ مقصد کے لئے مصلحت کے دائرہ کو بہت پھیلا بھی دیتی ہے۔ ضمیر کی آواز کو دبانے کے لئے مصلحت کی مدد اکثر حاصل کی گئی ہے۔ یہ پہچاننا کبھی کبھی دشوار ہو جاتا ہے کہ مصلحت منفعت کے حدود میں کہاں سے قدم رکھ رہی ہے۔

چلتے چلتے ضمیر کی بات بھی ہو جائے جو اخلاقیات کی اس برات کا نوشاہ ہے۔ جہاں تک نیک و بد میں امتیاز اور اخلاقی فیصلے کرنے کا سوال ہے، ضمیر کی راہ نمائی کے بغیر بات آگے نہیں بڑھتی۔ اگر اسے زندہ رکھا جائے تو ضمیر ہی وہ ذریعہ ہے جو ہمیں اخلاقی خطرات سے دُور رکھتا ہے اور جو برے وقت میں جب قدم ڈگمگانے لگیں، ہمارے کام آتا ہے۔ عقل جب ہوس کی آلہ کار بن جاتی ہے اور گمراہ کرنے کے لئے طرح طرح کی تاویلیں کرتی ہے، جب انسانوں کی ہر طرف پھیلی ہوئی گمراہی، بھلے آدمیوں کو نکو بنا دیتی ہے، ضمیر اس وقت ہمیں بھٹکنے سے بچاتا ہے۔ لیکن ضمیر کی بات نہ سُنی جائے، اسے استعمال نہ کیا جائے، تو وہ روٹھ کر الگ ہو جاتا ہے اور انسان اس کی رہبری سے خود کو محروم کر لیتا ہے۔ ضمیر کی آواز بعض اوقات بہت دھیمی ہوتی ہے۔ اس وقت یہ طے کرنا بھی دشوار ہوتا ہے کہ یہ ضمیر کی آواز ہے یا کوئی واہمہ۔ نوائے سروش ہے یا صدائے ابلیس۔ عقل کی ہوس پیشگی اور ضمیر کے ابہام ضعف اور آزردگی کے رحم و کرم پر انسان کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ اس لئے ہدایت کا انتظام کیا گیا ہے۔ کتاب و سُنّت میں یہی اہتمام ہے۔

دروغِ مصلحت آمیز کی بات ہو رہی تھی۔ آپ نے دروغ شناس آلہ (lie detector) کا سُنا ہوگا۔ اس کی گرفت بھی نو آموزوں تک ہے اس کے شکنجہ میں وہی لوگ آ پاتے ہیں جو بالعموم سچ بولتے ہیں۔ اگر وہ کبھی جھوٹ بولیں تو چہرے کی رنگت بدل جاتی ہے۔ شفق کی لہریں اعلان کرتی ہیں کہ روزِ روشن سے ہٹ کر شبِ تاریک میں قدم رکھا جا رہا ہے اور اگر چہرے کی رنگت پر قابو پا لیا، تو جلد کی کہربائی خصوصیات میں تبدیلی آلہ کی مدد اور فائل کی پردہ دری کے لئے آ جاتی ہے یہ ستم ہے کہ نہیں، عادی دروغ گو جو ڈھیٹ

ہوتے ہیں اور جن کا ضمیر مرجھا چکا ہوتا ہے، دروغ شناس آلہ کو دھوکا دیکر صاف نکل جاتے ہیں، جو دروغ کے خوگر نہیں اور جنھیں مصلحت یا وقتی کمزوری نے تھوڑی دیر کے لئے بہکا دیا تھا، وہ گرفت میں آجاتے ہیں۔

داخلی بصیرت اور ضمیر زندگی کے بعض پیچیدہ امور میں تن تنہا واضح رہبری نہیں کر پاتے۔ انھیں عقل کو مدد کے لئے بلانا پڑتا ہے۔ جہاں بصیرت دو متبادل راہوں میں سے کسی کے حق میں فیصلہ نہ کر سکے وہاں عقل کی کمک درکار ہوتی ہے۔ عقل کے پاس تجزیہ کرنے اور منطقی ڈھنگ سے استدلال کرنے اور بالآخر ترجیح دینے کے جو طریقے ہیں، اخلاقی دوراہوں پر ان سے مدد مل جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر عقل ضمیر یا داخلی بصیرت کے تابع فرمان رہتی ہے۔ بصیرت اور فراست کے اشتراک عمل سے بہت سی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔

ضمیر کو اگر کریدا جائے تو دو پرتوں پر نگاہ پڑے گی۔ ایک تو وہ داخلی وصف جو برائی کی آہٹ پاتے ہی الارم دیتا ہے، خطرے سے آگاہ کرتا ہے۔ جو بھلائی کی طرف کھینچتا ہے۔ اس وصف سے کچھ نہ کچھ حصہ ہر انسان کو ملتا ہے۔ بعض انسان برے ماحول کے تحت بداعمالیوں اور بے غیرتی اور بے حسی سے اس کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ اس کو گناہوں اور ڈھٹائی کے بوجھ سے اس طرح دبا دیتے ہیں کہ کروٹ لینا، یا کسمسانا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی فہمائش سے جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ اس کی ناوقت حرکت ان کے لئے سوہان روح بن جاتی ہے۔ اس کی آواز سے انھیں وحشت ہوتی ہے۔ اسے اکھاڑ کر پھینک نہیں سکتے۔ اسے گاڑ دیتے ہیں، دفنا دیتے ہیں۔ لیکن یہ بظاہر کمزور و نازک ضمیر بہت سخت جاں ہے۔ وہ گناہ اور خود غرضی، اور بداعمالی کے نیچے بھی مدتوں اسی طرح دبا پڑا رہے گا جیسے سردیوں میں پودے اور بیج، گیاہ اور سبزہ برف کے نیچے دب جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ بہار کبھی نہیں آئے گی۔ اور زمین، سبزہ و گیاہ سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی۔ لیکن اپریل کا مہینہ آنے دیجئے، بظاہر مردہ سبزہ برف کی تہہ کو توڑ کر باہر نکل آتا ہے۔ ضمیر بھی مدتوں کے بعد اسی طرح سر اٹھائے گا۔ اس وقت پچھتانا کچھ کام نہ آئے گا۔ اس کا ڈنک گناہ گاروں کے آخری ایام کو تلخ کر دیتا ہے۔

ہاں تو ضمیر کی بنیادی پرت انسان کے خمیر کا جزو ہوتی ہے اور دوسری پرت اسے تربیت، ماحول، مذہب اور سماج سے ملتی ہے۔ اس طرح انسان بھلائی کا اس قدر عادی ہو جاتا ہے اور برائی سے اس قدر نفور کہ برائی کے خلاف ضمیر کا ردعمل فوری اور [illegible] ہوتا ہے۔ اس کی آواز اونچی ہو جاتی ہے جسے کوئی نقارہ ڈبو نہیں سکتا۔ اگر بچپن میں دین کے نقوش تعلیم و تربیت سے گہرے بٹھا دیئے گئے اور ماحول اور سماج ایسا ملا جو اخلاقی قدروں کا قدر دان نکلا تو ضمیر کا دائرۂ عمل وسیع، فیصلہ کرنے کی طاقت زیادہ توانا اور حق و باطل کے مابین تمیز کرنے کی شمشیر زیادہ دھاردار ہو جاتی ہے۔ اس طرح گویا پہلی پرت وہبی اور دوسری اکتسابی ہوتی ہے۔

●●

مسز اندرا گاندھی

چند بکھرے ہوئے تاثرات

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ کے مشاہرے اور شرائطِ خدمت کی چھان بین کرنے اور اس کے بعد کمیشن کو اپنی سفارشات پیش کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی ہے۔ اس کمیٹی نے مسئلہ پر غور و فکر کیا اور اساتذۂ جامعات اور ماہرینِ تعلیم سے مشورہ کرنے کے لئے اپنے اراکین کو مامور کیا۔ میرے سپرد وہ سب کمیٹی کی گئی جو جنوبی ریاستوں کا دورہ کرے گی۔ کرناٹک کے دورے کے بعد ہم لوگ کیرالا آئے۔ ماہرینِ تعلیم کے ساتھ بڑی دانشوروں میں ہمارے مذاکرات کا آج دوسرا دن تھا۔ کیرالا یونیورسٹی میں اس ریاست کے تعلیمی مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی کہ یونیورسٹی کے رجسٹرار نے آکر میرے کان میں یہ روح فرسا خبر پھونکی کہ مسز گاندھی پر آج صبح ان کے مکان میں قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے اور وہ نازک حالت میں انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں لے جائی گئی ہیں۔

پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ مسز گاندھی باوجود ان نکتہ چینیوں کے جو وقتاً فوقتاً ان پر کی جاتی رہی ہیں اس وقت ہندوستان کی سب سے قدآور اور اہم ترین شخصیت تھیں۔ ہندوستان کے پھوٹ ڈالنے والے اور فتنہ برپا کرنے والے عناصر اور رجحانات کو قابو میں رکھنا، ان ہی کا کام تھا۔ انھیں خدا نے وہ قامت اور بصیرت عطا کی تھی، جو اتنے بڑے اور پرپیچ ملک کی رہنمائی کے لئے ضروری ہے۔ انھوں نے بڑی حد تک بہ حیثیت وزیرِ اعظم اس اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا، جس کی بنیاد ان کے عہد آفریں باپ نے ڈالی تھی۔ ذاتی دیانت اور اعلیٰ ظرفی اور بلندیٔ معیار کی بدولت وہ سارے ہندوستان کے لئے موجبِ احترام تھیں۔ ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کی ترجمانی، اس ملی جلی تہذیب کی ترجمانی جس میں ہندوستان کی رواداری اور اس کا وسیع ظرف شامل تھے اور جو جدید مغربی تہذیب کی شائستگیوں، رعنائیوں اور علم طرازیوں سے بھی مستنیر تھی، جس قرینہ اور جمال کے ساتھ اندرا گاندھی نے کی، وہ آپ اپنی مثال ہے۔ وہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے ماضی اس کے عبوری حال اور تابناک مستقبل کے لئے اس کے منصوبوں اور عزائم کی پیکر تھیں۔

نہرو خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ سونے کے نوالے اور سنہری شہرت کے ساتھ پیدا ہوئیں۔ ہرچند کہ بچپن میں ہی سانس انھوں نے سیاست کے ماحول میں ہی لی، لیکن منظر عام پر وہ کانگرس کے صدر ۱۹۵۹ء کی حیثیت سے آئیں۔ بہ حیثیت صدر کے ان کی کارگزاری نے جمنا کی لہروں کو شعلہ بار نہیں کیا۔ اور بہ حیثیت وزیر اطلاعات (۱۹۶۴ء) بھی انھوں نے کارگزاری اور کارسازی کے کوئی ہوشربا نقوش محکمہ کے اوراق پر ثبت نہیں کیے۔ بہ ظاہر ایک نازک سی، کم درسی، کم گو، کم آمیز، کم آواز، حسین خاتون سے زیادہ توقعات کی بھی نہیں کی جاسکتی تھیں۔ جب یہ سُنا گیا کہ وہ جواہر لال نہرو کی جانشین ہوں گی، تو خیر خواہوں کے دلوں میں بھی شکوک پیدا ہوئے۔

لال بہادر شاستری جی کے تاشقند میں اچانک انتقال کے بعد جب اندرا گاندھی کو وزارت عظمیٰ کے لئے چُنا گیا، تو دلوں میں طرح طرح کے اندیشوں نے سر اٹھایا "اس برصغیر کی مہار ایک نازک سی خاتون کے ہاتھ میں دیدینا کہاں کی دانشمندی ہے، حد ہوگئی خاندان پرستی کی" بعض نکتہ چینوں نے کہا۔ اور شروع شروع میں ایوان میں نئی وزیر اعظم کی کارگزاری اور گفتگو میں عدم اعتماد، جھجکاہٹ اور رکلنت کے انداز ہمدردوں کی حوصلہ شکنی اور عام ہندوستانیوں کی تشویش کے لئے کافی تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ اعتماد پیدا ہوتا گیا، نقشہ بدلتا گیا اور دنیا نے دیکھا کہ بظاہر نحیف و نازک خاتون، خوش پوش، خوش اطوار، خوشرو، نفاست پسند خاتون، دل بھی رکھتی تھی اور دماغ بھی اور آہنی گرفت بھی، وہ دل جس میں جرأت تھی اور وہ دماغ جو روشن تھا اور جس میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت تھی اور وہ ہاتھ جن کی پکڑ کبھی ڈھیلی نہ ہوئی۔ آہستہ آہستہ اس کا سکہ بیٹھتا گیا۔ اس کی آواز اور انداز میں اعتماد اور گفتگو میں روانی آتی گئی۔ اور پھر سیاست کی ڈوریاں سمٹ کر اس کے ہاتھوں میں آگئیں اور ان کے سِروں پر جو رہنما اور وزراء اور بااثر اور مقتدر انسان تھے، ان کی حیثیت دیکھتے ہی دیکھتے کٹھ پتلیوں کی سی ہوگئی اس نے سیاست کے گُر سیکھ لئے اور کہنہ مشق شاطروں کو پے در پے مات دی۔

اور وہ دن بھی آگیا جب اس کا قد اس پارٹی سے بھی اونچا ہوگیا جس نے اسے اعلیٰ وزارت کے لئے چُنا تھا۔ وہ پارٹی اس کی ذات سے کسب اقتدار و اعتبار کرنے لگی۔ ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۲ء میں اس کے شانوں پر کانگرس پارٹی نے عام چناؤ جیتا۔ ۱۹۷۲ء سے تین سال پہلے اس نے بینکوں کو سرمایہ داروں کے شکنجہ سے نکال کر قوم کے تصرف میں دے دیا، تاکہ وہ خلق کی خدمت بھی کرسکیں۔ کانگرس کے فرسودہ اصنام کو توڑ کر اس نے نئی کانگرس کی بنا ڈالی۔ اس کے عمل آنے سے پرانی کانگرس میں جان ہی نہ رہی اور بڑے بڑے بُت سر کے بل گر پڑے اور ایسا ایک بار سے زیادہ ہوا۔

باوجود زبان کی نرمی اور لہجہ کی شیرینی کے اس نے سب سے مناسب فاصلہ رکھا۔ جہاں کسی نے قریب آنے کی کوشش کی یا یہ ظاہر کیا کہ وہ وزیرِ اعظم کے مزاج میں دخیل ہے، وہیں اس کو اس کی جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کی نگاہ میں اپنی اہمیت کے پل باندھ سکے۔ کانگریس کے بڑے بڑے رہنما اور ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ اس کے دست نگر اور اس کی نگاہِ کرم کے طالب ہو گئے۔ جس کو جہاں چاہا بٹھا دیا۔ کیا مجال کہ دوسرے اُف بھی کر سکیں۔

ایک انگریزی میگزین نے اسے ہندوستان کی ملکہ (ایمپریس آف انڈیا) کہا تھا۔ اس کے بظاہر نازک ہاتھوں میں غیر معمولی طاقت تھی۔ کہا جاتا تھا کہ کابینہ میں صرف ایک مرد ہے۔ اندرا گاندھی (اور وہ بھی مرد آہن)۔

مسز گاندھی کے شانے اتنے فراخ نہ تھے، جتنے ان کے عظیم باپ کے، اور نہ دل اتنا وسیع، نہ دماغ اتنا باخبر۔ لیکن انتظامی امور میں وہ ان سے زیادہ مؤثر تھیں۔ فیصلہ اور کام کی راہ میں وہ تکلف، مروّت اور مراعات کو حائل نہ ہونے دیتی تھیں۔ فیصلہ کا نفاذ بے دریغ کراتیں اور چالاکی اور سینہ زوری اور سازش کرنے والوں یا وزارتِ عظمیٰ کے خواب دیکھنے والوں کی سرکوبی انتہائی شائستہ چابکدستی کے ساتھ کرتیں۔ زبان پر کوئی سخت لفظ نہ آتا۔ ملنے کی نوبت بھی نہ آتی اور سرکش اور سازشی کو پتہ چل جاتا کہ وہ آسمان سے زمین پر پٹک دیا گیا ہے۔ باریابی کے دعویدار کو اچانک پتہ چلتا کہ دروازہ اس پر بند کر دیا گیا ہے۔ سر ٹکرائے گا تو بھی نہ کھلے گا جو معتوب یا مشتبہ ہوا، وہ خواہ کسی ریاست کا وزیر اعلیٰ ہی کیوں نہ ہو، ہفتوں انتظار کرے تب بھی حاضری سے محروم رہے گا۔ اپنا سا منہ لے کر واپس چلا جائے گا۔ اس طرح لوگوں میں احساسِ تناسب بنا رہا اور مرکزی شخصیت کے وزن و وقار کی بالاتری پر آنچ نہ آئی۔

خفگی یا اختلاف کا اظہار براہ راست شاذ ہی ہوتا۔ آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کم ہی کی جاتی۔ آپ باتیں کر رہے ہیں، کوئی بات اہم یا التفات کی مستحق سمجھی گئی، تو سر اٹھا کر دیکھ لیا۔ یہ آپ کی فراست پر منحصر ہوتا کہ اس کی اٹھتی ہوئی نگاہ سے کیا نتائج اخذ کرتے ہیں اور ردّ عمل کی بابت کس قیاس کو راہ دیتے ہیں۔

اس نازک اور خوش اندام و خوش وضع عورت کے اعصاب فولاد کے بنے ہوئے تھے۔ دنیا میں کسی حکمراں کو رات دن اتنے بڑے بڑے گوناگوں حوصلہ شکن، سکون آشوب مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جتنے کہ ہندوستان کے وزیرِ اعظم کے حصہ میں آتے ہیں۔ لیکن اندرا گاندھی ان مسائل و مصائب سے ہمیشہ تازہ دم نکلیں۔ ایسے مسائل کے بوجھ کے نیچے مضبوط سے مضبوط کمر ٹوٹ جاتی۔ لیکن یہاں جبیں پر شکن تک نہ آئی۔ وہی تازہ دمی، وہی تبسم نما سکون، وہی نفاست، وہی شادابی، وہی شگفتگی۔ گویا ایک نازوں کی پلی ہوئی خوشحال خاتون ہے، جس کے

چمن کو بادِ سموم اور جس کے دامنِ دل کو فکروں نے چھوا تک نہ ہو، جس کا منتہائے آرزو، خوش باشی اور خوش پوشی ہو جس نے ڈرائنگ روم سے باہر قدم نہ رکھا ہو۔ جو شخص بغیر یہ جانے ہوئے کہ یہ کون ہے؟ اس سے ملے اسے گمان بھی نہ ہو کہ اس خاتون نے زمانہ کے سنگین سے سنگین، پُرآشوب سے پُرآشوب، جگر دوز سے جگر دوز مسائل سے لوہا لیا ہے۔ اور کسی ایسے ہی مسئلہ سے نبرد آزمائی کر کے ابھی ابھی آرہی ہے۔ ریشم کی ڈوری مضبوط ہوتی ہے، سن رکھا تھا۔ لیکن نہ اتنی مضبوط کہ فولاد شرمائے، نہ اتنی قاطع کہ سیوف کو رشک آئے۔

اس پاکیزہ چہرے کی پاکیزہ کشش کو ہزاروں دلوں نے محسوس کیا ہے، نہ معلوم کتنے دل اس انتہائی دلآویز مسکراہٹ سے کھل اٹھتے ہیں۔ وہ مسکراہٹ جو مونالیزا کے تبسم کی طرح پُراسرار نہیں۔ لیکن اس سے زیادہ دلکش ہے اور اسے سادہ نہ سمجھیے۔ پُرکار بھی ہے اور رمز آلود بھی۔ کبھی اس میں پایانِ گفتگو کی آہٹ ملتی ہے۔ کبھی یہ دانستہ کوشش کہ جانے والا بے التفاتی کا گلہ کرتا ہوا نہ جائے۔ کبھی بے محل بات کو ٹالنے کی تدبیر، کبھی دل موہ لینے کا حربہ، کبھی یہ فہمائش کہ ان چند لمحات سے زیادہ مقسوم نہیں ہیں، تشریف لے جائیے۔

ایمرجنسی کے دوران اہلِ نفاذ نے زیادتیاں کیں، جس کا خمیازہ مسز گاندھی کو بھگتنا پڑا۔ لیکن وہ سپرانداز نہیں ہوئیں۔ اس وقت سب یہ سمجھے تھے ان کا سیاسی اقتدار ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، اس وقت بھی ان کے حوصلے پر آنچ نہیں آئی، نہ سکون نے ان کا ساتھ چھوڑا۔ ان کی شخصیت کا یہ جادو تھا کہ ویرانہ میں رہتے ہوئے بے منصب و جاہ بھی اگر وہ کسی سفارتی جلسے میں چلی جاتیں تو سب لوگ ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ برسرِ اقتدار وزیرِ خارجہ کو چھوڑ کر۔

مصیبت اور معزولی کے ان ایام میں کچھ لوگوں نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ ان کی خدمت میں برابر جاتے رہے۔ ایک روز بڑے امتنان کے ساتھ ایسے لوگوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ شبنم کی بوندیں آنکھوں کی حصار میں تھیں۔

راقم نے پہلی بار قریب سے انھیں اس وقت دیکھا جب وہ طیارہ سے جس میں وہ سفر کر رہا تھا، بمبئی جا رہی تھیں۔ اس کے بعد کئی ایک بار ان مجلسوں میں شریک ہوا جن کی وہ صدر تھیں۔ ان میں سے ایک مجلس قومی یکجہتی کونسل کی تھی۔ ذکر مسئلہ اقلیت کے اعتماد اور خوش حالی کو بحال کرنے کا تھا۔ اس مجلس میں غفور صاحب (اس وقت بہار کے وزیرِ اعلیٰ) نے مذاکرہ میں شرکت کرتے ہوئے کہا تھا کہ محترمہ آپ کسی مسلمان کو صدر یا چیف جسٹس بنائیں یا نہ بنائیں مسلمانوں کو تھانوں میں مامور ضرور کر دیجیے کیونکہ اس کا بڑا اثر مسلمانوں کے احساس سلامتی و احساس اعتماد پر پڑے گا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری جب میں نے قبول کر لی تو وزیرِ اعظم سے ملنے گیا۔ رخصت کے وقت

کہنے لگیں کہ آپ جب چاہیں مجھ سے مل سکتے ہیں۔ حوصلہ بڑھانے کا یہ ایک طریقہ تھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

ہماں روی اور طوائف الملوکی کے بعد نظم وضبط اور قواعد وضوابط کا نفاذ متاثرہ عناصر کو گراں گزرا۔ ہنگامہ برپا کیا کہ شیخ جامعہ کے پیر اکھڑ جائیں یا حوصلہ ٹوٹ جائے۔ طلبہ کے گمراہ سربراہوں نے کسی اشارے پر خاک وخون کی تیاریاں کیں۔ خود قلعہ نشین ہو گئے اور معصوم لڑکوں کو آگ میں جھونک دیا۔ پولیس کو دفاع میں گولی چلانا پڑی اور ایک معصوم عزیز کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ وہی ہو گیا جس کو بچانے کے لئے میں پے در پے جتن کرتا اور خطرے اٹھاتا چلا آیا تھا۔ میں نے شدتِ غم میں استعفیٰ دینے کی ٹھان لی۔ یہ بات دلی پہنچی اور وہاں سے چشم زدن میں "ڈبلی" جہاں وزیر اعظم دورے پر گئی ہوئی تھیں۔ ابھی دلی سے بات ہوئے آدھا گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور وزیر اعظم کا پیغام پہنچا کہ استعفیٰ دینے کا سوال نہیں ہوتا، ثابت قدم رہیے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ہندوستان سے دور، اہم امور میں گھرے ہونے کے باوجود مسز گاندھی نے میری ڈھارس بندھانے اور سبکدوشی سے باز رکھنے کا یہ اہتمام کیا۔ یہی نہیں، دوسرے روز منھ اندھیرے اس وقت کے وزیر داخلہ (حالیہ صدر جمہوریہ) وائس چانسلر کے مکان پر تشریف لائے، بہ ظاہر بچشم خود حالات کو دیکھنے کے لئے، بہ باطن اسی پیغام کو دہرانے کے لئے۔ چند ماہ بعد مسز گاندھی سے ملاقات ہوئی، تو میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی اس خصوصی توجہ نے اس نازک وقت میں میرے دل کے تاروں کو چھو دیا تھا۔

اس سانحہ کے بعد طالع آزماؤں نے یونیورسٹی کو اپنے ذاتی یا سیاسی مقاصد کے لئے تسخیر کرنا چاہا۔ میں سدِّ راہ بنا ہوا تھا۔ چنانچہ تین سال تک لگاتار ایک گروہ میرے خلاف وزیر اعظم کے کان بھرتا رہا۔ لیکن مسز گاندھی نے نہ آئے بدلی نہ رخ۔ میں نے البتہ ان سے معذرت کی کہ میری وجہ سے ان کو الجھن میں ڈالا جاتا ہے۔ راقم سطور کے متعلق ان کی جو کچھ رائے رہی ہو، اس سے قطع نظر ان کے انتظامی شعور نے اس کی اجازت نہیں دی کہ احتجاج کے رَو میں کسی وائس چانسلر کو سبکدوشی پر مجبور کر دیا جائے۔

اس دردناک سانحے کے بعد یونیورسٹی کو بند کرنا پڑا تھا۔ جب کھولنے کا ارادہ کیا تو انتظامیہ نے حامی نہیں بھری۔ ریاستی حکومت کو یقین دلایا گیا تھا کہ اگر یونیورسٹی کھلی تو بہت بڑا انقلاب ہوگا، کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے۔ میں اللہ تعالیٰ کے فضل پر بھروسا کرتے ہوئے احتجاج کر رہا تھا کہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ لیکن کون سنتا تھا۔ جن حضرات نے یونیورسٹی بند کرانے کے ڈول ڈالے تھے ان کی انتھک کوشش تھی کہ یونیورسٹی کھلنے نہ پائے۔

لڑکوں کا ایک سال تو ضائع ہو ہی جائے پھر دیکھیں وائس چانسلر کیسے رُکتا ہے۔ یہ گتھی بھی مسز گاندھی کے خاموش اشارے نے سلجھائی۔ وزارتِ داخلہ میں مجلسیں ہوئیں اور یونیورسٹی کھلی، اور سکون اور امن کے ساتھ پڑھائی ہوئی اور ضائع ہوتا ہوا سال، موت کے جبڑے سے نکال لیا گیا۔

یونیورسٹی کی اقامت گاہوں میں بڑا ہجوم تھا۔ ضرورت تھی ان میں اضافہ کی۔ ایک عرصۂ دراز سے کوئی ہوسٹل نہیں بنا تھا۔ کمیشن اور وزارت میں کون سنتا۔ یہاں بھی وزیراعظم کی ذاتی دلچسپی نے دروازے وا کر دیے اور اس زرِ خطیر سے جو منظور ہوا تھا ایک نئے ہال کی خوب صورت عمارت کھڑی کر دی گئی جو علامہ اقبال کے نام سے موسوم ہے اور جس میں سات سو طالب علموں کے لئے جگہ ہے۔

یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بازیابی کے لئے ۱۹۶۶ء سے ہندوستان کے مسلمانوں نے جدوجہد شروع کی، قربانیاں دیں، یہاں کی تعلیمی فضا مکدّر ہو گئی۔ احتجاج کر کر کے لوگ تھک کر بیٹھ گئے۔ مراد آباد میں فسادات ہوئے پھر علی گڑھ شہر میں، اور بازیابی کردار کی مانگ دب گئی۔ اس وقت جب یہ مطالبہ ایک عرصہ سے فضا میں نہ تھا، اچانک یہ منظور کر لیا گیا۔ ایسا کیوں ہوا، یہ بات ابھی تک صیغۂ راز میں ہے اور رہے گی۔ لیکن اس کا ایک نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ اس کے بعد بہت دیر تک یونیورسٹی میں ہنگامہ آرائی کا حوصلہ کسی کو نہ ہو سکا۔ حالات کا یہ بھی ایک طنز ہے کہ ۱۹۸۱ء کے ترمیمی ایکٹ نے جس کے ذریعہ مسلمانوں کا مطالبہ منظور ہوا اور روایتی کردار بحال کیا گیا، بالآخر ہدف اسی کو بنایا جس کے لئے یہ ساری جدوجہد کی گئی تھی۔ نکتہ چیں خندہ زن ہیں کہ اقلیتی کردار کیا اسی کو کہتے ہیں :

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد ٭ وائے گر در پسِ امروز بود فردائے

پھر ایک وقت آیا کہ ساری مرکزی یونیورسٹیوں کے لئے ایک مشترک ایکٹ کی تجویز کی گئی۔ یونیورسٹیوں کی خود مختاری معرضِ خطرے میں پڑ گئی اور علی گڑھ یونیورسٹی کے احاطہ میں تو کہرام مچ گیا کہ ایک ہاتھ سے روایتی کردار دیا گیا اور دوسرے ہاتھ سے اسے واپس لیا جا رہا ہے۔ ایک بڑی ریلی ہوئی۔ راقم نے اس ریلی کی صدارت کی اور اس کا رخ آئینی مانگ کی طرف موڑا اور کہا کہ ایک نمائندہ گروہ وزیراعظم سے ملے۔ میں اس کی سیادت کو تیار ہوں۔ دوسری یونیورسٹیوں کی نگاہ بھی ہم پر تھی۔ چنانچہ بھان متی کے کنبہ کو لے کر راقم سطور مسز گاندھی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں تو یہ عالم تھا کہ "تار باجا اور راگ بوجھا"۔ میں نے اس اقدام کے مضمرات کا ذکر چھیڑا ہی تھا کہ انھوں نے انتہائی شگفتگی کے ساتھ بات کی تہ تک پہنچنے کی خبر دے دی۔ حامی تو نہ بھری، لیکن ہم مطمئن واپس آئے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن۔ اس مشترک بل کا سراغ بھی کسی کو نہ ملا۔ مسز گاندھی کے کام کرنے کا یہی انداز تھا۔ انھیں بات کی

نہ تک پہنچنے اور فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگتی تھی۔ لیکن اس کا اعلان دورانِ گفتگو کرنا انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ اس میں دو مصلحتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ جب تک ان کا دفتر جس میں انھوں نے لائق ترین افسروں کو جمع کر رکھا تھا تجویز کو چھان پھٹک کر دیکھ نہ لے، کوئی حتمی وعدہ کرنا بعد میں دشواریاں پیدا کر سکتا تھا۔ دوسرے اس طرح وہ ملنے والوں کو ان کی جگہ پر رکھ سکتی تھیں تاکہ ضروری فاصلہ درمیان میں رہے۔ اور گفتگو سوال و جواب یا برابری کی سطح پر بات چیت کی شکل، اختیار نہ کرلے۔ ان کا طور ڈالعن کا سا تھا جس کی پشت بقول شیکسپیر پانی میں رہنے کے باوجود تر نہیں ہوتی۔ اس بات پر اب اتفاق ہے کہ مسز گاندھی مشورہ بہتوں سے کرتی تھیں لیکن فیصلہ ان کا اپنا ہوتا تھا۔ ابتدا میں لوگ سوچتے تھے کہ ان کے مشیران کے لئے فیصلہ کرتے ہیں لیکن بعد میں یہ بات واضح ہوگئی کہ نہیں' فیصلہ کیا ہوا اور کب ہوا' یہ سب کچھ وہ خود طے کرتی تھیں۔ فیصلوں کی ضمن میں ایک عالم ان کے انتخاب ساعت کا قائل تھا۔ صحیح وقت پر فیصلہ کرنے کے لئے ان کے پاس گویا ایک چھٹی حس تھی۔ بینکوں کو قومی تصرف میں لانے کا فیصلہ اتنا برمحل اور بر وقت نکلا کہ اس نے ہندوستان کی سیاست کا نقشہ ہی بدل دیا اور اس وقت سے ان کی سیادت کا سکہ چلنے لگا۔ بہت سی مثالوں میں سے یہ صرف ایک مثال ہے۔

ہر وہ شخص جو آگے بڑھنے اور لے چلنے کے لئے بیتاب ہو' وہ جمہوریت اور اہل کاروں کی آہستہ خرامی سے گھبرا جاتا ہے۔ کام اگر کرنا ہے تو ان تکلفات اور ضوابط اور لایعنی اور پُرتاخیر موشگافیوں کو بالائے طاق رکھنا ہوگا' اندرا گاندھی نے بھی یہی کیا۔

لیکن سارا اختیار جب ہاتھ میں آجاتا ہے' تو وہ اپنے خطرات بھی ساتھ لاتا ہے۔ پھر انسان دوسروں کی رائے کو لائق اعتنا نہیں سمجھتا اور رائے دینے والے بھی اپنی رائے کو صاحب اختیار کی رائے یا رجحان اور افتاد کے مطابق ڈھالنے لگتے ہیں' گویا صاحب اختیار آزاد اور پُرخلوص رائے سے خود کو محروم کر لیتا ہے' اسے جو مشورہ ملتا ہے وہ خود اس کے رجحان کی پھیکی سی نقل ہوتا ہے۔ اپنی ہی آواز کی گونج اس کے کانوں میں آتی ہے اور وہی بھلی لگتی ہے۔ ایسی صورت میں ایک خطرہ اور پیش آتا ہے' صاحب اختیار جو دراصل عوام سے طاقت اخذ کرتا ہے' ان سے کٹنے لگتا ہے' دور ہو جاتا ہے' محصور ہو جاتا ہے۔ ہرچند کہ اندرا گاندھی کا ہاتھ عوام کی نبض پر تھا پھر بھی ان سے ان کا رابطہ وہ زندہ اور پیوستہ رابطہ نہیں رہا تھا جس کی بنا گاندھی اور نہرو نے ڈالی تھی۔ ان کو سلامتی اور تحفظ کے لئے ایک حد تک دامن کش اور روپوش رہنا پڑا۔

شروع میں کانگریس کے جن مکھیاؤں نے اندرا گاندھی کو وزیراعظم کی گدی پر اس امید کے ساتھ بٹھایا تھا

کہ حکومت اندرا گاندھی کی ہوگی اور راج وہ کریں گے، انھیں مایوس ہونے میں دیر نہیں لگی۔ یہ "اتالیق" اسی سرعت کے ساتھ ہٹا دیے گئے جس سے ذوخیز اکبر نے بیرم خاں کو اختیار اور راستے سے ہٹا دیا تھا۔ اوّل تو وہ کام کرنے نہ دیتے؛ دوسرے نہرو کی بیٹی، دوسروں کی تابع فرمان کب ہونے والی تھی؛ تیسرے وہ اصلاحات جو غریبوں اور کمزوروں کے حق میں تھیں کہنہ دماغوں کو راس کیونکر آتیں۔

اشوک مترا نے جو ایک سبکدوش سول سرونیٹ ہیں اور جنھیں شعبۂ اطلاعات میں اندرا گاندھی کے ساتھ کام کرنے کا اور ان کی مجلسوں اور مشوروں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ہے، اسٹیٹسمین میں اپنے مضمون میں اندرا گاندھی کے بیکراں اختیارات کے مضر اثرات کا ذکر اس طور کیا ہے:

"۱۹۶۹ء میں کانگریس پارٹی کے جس وقت دو ٹکڑے ہوئے اس سے سول سرونیٹ کے اس حق پر جو آزاد رائے دینے سے عبارت تھا، بندشیں لگنا شروع ہوگئیں۔ کلّی اتفاق یا کمٹ منٹ کی اصطلاح نے معاملے کو اور سنگین بنا دیا .... اندرا گاندھی یہ سمجھنے لگیں کہ حکومت کرنا ان ہی کا فرض اور حق تھا اور اسی اعتماد کے مطابق ہندوستان کے وفاقی نظام کے ڈھانچے کو توڑ امروڑ اگیا۔ مسز گاندھی کا کارنامہ زبردست اور ہیبت آفریں ہے۔"

اندرا گاندھی نے بحیثیت وزیرِاعظم ۱۶ سال کے عرصے میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ انھوں نے ملک کے اتحاد پر جراحت نہ آنے دی۔ غریبوں اور کمزوروں کے لیے ان کا دل ہمیشہ پگھلتا رہا کہ ان کا نصب العین غریبوں پسماندوں، مظلوموں کو ظلم اور خوش حالی سے روشناس کرانے کا تھا۔ انھیں اپنے عظیم باپ کی طرح جو گرم جوشی تابید ملی، ان کی شخصیت میں جو کہربائی طاقت تھی، اس کا راز نہ صرف اس روحانی عقیدت میں تھا جو ہندوستانیوں کو نہرو خاندان سے تھی، وہ خاندان جو اپنے رنگ و روپ، قامت، جمال اور خدوخال کے لیے مشہور تھا بلکہ اس احساس میں بھی کہ اتنے خوش حال اور آسائش خو افراد نے وطن کی آزادی کے لیے ساری آسائشیں اپنے اوپر حرام کرلیں اور ساری تکالیف کو گوارا بنالیا؛ اندرا گاندھی کی پرستش اس لیے بھی کی گئی کہ وہ عورت تھیں، وہ عورتوں کے شعور اور امکانات کی علامت بھی تھیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ جس چیز نے جواہر لال اور اندرا گاندھی کی شخصیتوں میں وہ کہربائی سحر بھر دیا جسے کیرزما کہتے ہیں، وہ اہلِ ہند کے دلوں میں یہ احساس تھا کہ وہ ایک روشن مستقبل کا تصور رکھتے ہیں اور بشارت لائے ہیں۔ وہ دیانت، ذہانت، لیاقت اور بصیرت سے لیس ہیں۔ وہ ریاستی، لسانی، مذہبی اختلافات اور تنگ نظریوں سے بالاتر ہیں۔ وہ ملک کو عہدِ حاضر کے شانہ بشانہ چلانے کے خواب دیکھتے ہیں اور خواب کو تعبیر میں بدلنے پر قادر ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کو وسائل اور سائنسی اور ٹکنیکل انفرا اسٹرکچر سے مضبوط کیا۔ وہ ایسی

زبان بولتے ہیں جو ہندوستان میں ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ وہ اتنے خوشحال اور نفاست پسند ہونے کے باوجود عوام پر جان دیتے ہیں۔ اندرا گاندھی نے ناوابستہ ممالک کی سربراہی اعتماد اور قابلیت اور قرینہ کے ساتھ کی۔ اشوک مہتا نے ۱۹۶۰ء میں اندرا گاندھی سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر اس ڈھنگ سے کیا ہے "وہ شرمیلی اور لجائی ہوئی سی تھیں۔ حیا نے ان کے چہرے پر سرخی کی لہریں دوڑا دی تھیں اور بولنے میں انھیں تامل تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کی زندگی تنہائی اور حفاظت میں گزری ہو۔"

میں نے ملاقاتوں کے دوران ان سے بات چیت کا آغاز بالعموم انگریزی میں کیا۔ اس خیال سے کہ فاصلہ رکھنے اور ضابطہ کو نباہنے کے لئے بیرونی زبان کارآمد ہے اور مادری زبان میں قرب اور بے تکلفی کا پہلو آجاتا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ مجھے اُردو کی طرف لے آئیں۔ شاید وہ ایک یوپی والے کی غیر مخلوط اردو سننا چاہتی تھیں، جو شائستگی کے آداب اور معنویت کی پرتیں اور لطافت کی تہیں اپنے اندر رکھتی ہیں۔ انھوں نے گزشتہ ساڑھے چار سال کے دوران یونیورسٹی میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ لیکن اس کے وائس چانسلر کی مدد اور پشت پناہی میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ اگر کوئی صلاح دینی ہوئی بھی تو براہِ راست کبھی کچھ نہیں کہا :

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اندرا گاندھی کی عظمت کو ان کی زندگی میں تسلیم کر لیا گیا تھا۔ موت نے اس میں اضافہ کر دیا۔

ان میں کام کی لگن اور ریاضت کی صلاحیت لامحدود تھی۔ ٹیلی ویژن پر ان کے معالج (معالج نہیں طبیب کہ ان کو علاج کی نوبت ہی نہ آتی تھی) نے بتایا کہ وہ روز سولہ سترہ گھنٹے کام کرتی تھیں۔ مشکلات کا وہ خیر مقدم کرتیں، چیلنج کو وہ دوڑ کر قبول کرتیں۔ میری اندرا گاندھی سے آخری ملاقات ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو ہوئی تھی، ذاکر حسین کالج ٹرسٹ کی میٹنگ میں۔ بات بات سے شائستہ اور دلنواز شگفتگی اور خندہ جبینی مترشح ہو رہی تھی۔ وہ نومبر کے دوسرے ہفتے میں علی گڑھ آ رہی تھیں۔ شاید اس روز جبکہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں وہ یہاں ہوتیں لیکن ایسا ہونے کو نہ تھا۔ موت کے ظالم ہاتھوں نے انھیں ہم سے چھین لیا۔

بہ حیثیت وزیر اعظم کے انھوں نے یونیورسٹی میں قدم نہیں رکھا۔ وزیر اعظموں میں وہی ایسی تھیں جنھیں یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ میں نے کئی بار انھیں علی گڑھ آنے کی دعوت بھی دی۔ انھوں نے متبسم ہو کر حامی بھر بھی لی۔ لیکن ہر بار ٹال گیا کہ ایک گروہ کی خواہش تھی کہ وہ علی گڑھ نہ آئیں۔ وہ یہاں آتیں تو انھیں زیر دست خیر مقدم سے نوازا جاتا۔ ان کی راہ میں آنکھیں بچھائی جاتیں علی گڑھ کی روایتی مہمان نوازی

کو ان کی صنف اور دلپذیر شخصیت اور ان کے حسن و جمال سے ایڑ لگتی۔ اور وہ آتیں تو یونیورسٹی کو کچھ دیکر جاتیں۔ میں نے آخر میں انھیں لکھ دیا تھا کہ میں نے طے کر لیا ہے جب تک وزیر اعظم نہیں آتیں، میں تقسیم اسناد کا جلسہ (کونووکیشن) نہیں کروں گا۔ انھوں نے سوچا کہ جانا چاہیئے مگر آ نہ سکیں اور جو امید بندھی تھی وہ مایوسی میں بدل گئی۔

اندرا گاندھی اپنے باپ کی طرح نڈر تھیں۔ ذاتی خطرہ کا انھیں احساس تک نہ تھا اور محنت سے دامن چرانا ان کے تصور میں بھی نہ آتا تھا۔ چیلنج کو بنا آنکھ جھپکائے قبول کرتیں۔ خطرہ میں کود پڑنا ان کی ادا تھی۔ ٹیلی ویژن پر ہی مسز سبھدرا جوشی نے بتایا کہ تقسیم کے ایام میں گھرے ہوئے اور ستائے ہوئے مسلمانوں کی خدمت کے لئے ان کے ساتھ نکلتیں اور بے دھڑک۔ ان مجمعوں میں چلی جاتیں جہاں ہر لمحہ ان کی جان کا جوکھوں تھا۔

ڈاکٹر ماتھر نے یہ بھی بتایا کہ ان کی نگاہ جزئیات پر تھی اور وہ ان لوگوں کا جو ان کے ساتھ مامور تھے، خاص خیال رکھتی تھیں۔ ایک بار دورے پر ڈاکٹر ماتھر کی سال گرہ پڑیی۔ اندرا گاندھی نے ایک خوبصورت سی نظم اس موقع کے لیے لکھی اور تبریک کے ہدیہ اور دلدہی کے وسیلہ کے طور پر انھیں بھیج دی۔

نہرو خاندان کی روایت کے مطابق انھیں اقلیتوں اور ہریجنوں اور وادی باسیوں اور پچھڑے ہوئے طبقوں کی فلاح سے گہری دلچسپی تھی۔ لیکن باوجود ان کی کوششوں کے یہ لوگ نیز ستم کا نشانہ بنتے رہے۔ مسلمانوں نے اکثر ان کا ساتھ دیا لیکن کہا جاتا ہے کہ آندھرا پردیش اور کرناٹکا کے انتخابات کے بعد انھوں نے مسلمانوں کی طرف سے کچھ بے نیازی برتنا شروع کر دی۔ فرقہ وارانہ فسادات نے مسلمانوں کو گلہ مند کر دیا تھا، تاہم بحیثیت مجموعی انھیں مسلمانوں کی زبان، تمدن اور اطوار سے دلچسپی تھی جس کا تقاضہ ان کے بچپن کا ماحول اور ان کا سیکولر اور جمہوری مزاج کرتا تھا۔

مسز گاندھی کے قتل کی خبر پاکر خلقت سکھوں پر ٹوٹ پڑی، یہ جنون نہیں تو اور کیا ہے، جو لوگ مارے گئے یا لوٹے گئے، ان کا گناہ کیا تھا، دوسروں کے قصور کی سزا انھیں کیوں ملی۔ کیا انصاف اسی کا نام ہے۔

اندرا گاندھی کے ہمیشہ تازہ دم رہنے کے دو راز ہیں۔ کام میں انہماک اور کام کرنے کا حوصلہ اور اپنے اوپر غیر معمولی قابو اور ایک مرتب نظام زندگی۔ ہر چیز سانچے میں ڈھلی ہوئی، ہر چیز ناپی اور تلی ہوئی۔ مشکل کام قاعدے سے کیا جائے تو سہل ہو جاتا ہے، آسان کام بےقاعدگی سے کیا جائے تو زندگی خلش اور خلفشار میں گزرتی ہے۔ انکی زندگی بہت مرتب اور منضبط تھی اسی وجہ سے وہ مصروف رہتیں لیکن مصروف نظر نہ آتیں۔

۲ر نومبر کی شب میں تین مورتی اندرا گاندھی کے آخری دیدار کے لئے گیا۔ سارا جسم پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا اور وہ خوبصورت چہرا موت کے سایہ میں بھی خوبصورت نظر آرہا تھا اور وہ ترانشے ہوئے خدوخال اپنے نوکیلے زاویوں کو لئے ہوئے اسی اپنی قوت ارادی کا اعلان کر رہے تھے جس نے ۱۶ سال تک ہندوستان کے شیرازہ کو بکھرنے نہ دیا اور جس نے اقوام عالم کی انجمن میں ہندوستان کو مقام امتیاز عطا کیا۔ ذہن ۲۰ سال پہلے کی طرف گیا۔ جب ہم اسی طرح جواہر لال نہرو کو آخری خراج عقیدت ادا کرنے کے لئے تین مورتی میں آئے تھے۔

ہر کمال کو زوال ہے، لازوال صرف خدا کی ذات ہے۔

●●

ستاروں کی زندگی اور موت

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ (ترجمہ: بیشک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن کے بدلتے رہنے میں، اور کشتیوں میں جو سمندر میں لوگوں کے کام کی چیزیں لے کر چلتی ہیں، اور پانی میں، جسے اللہ نے آسمان سے اُتارا، اور اس پانی سے اس زمین کو جو مر چکی تھی، زندہ کیا اور اس میں سب طرح کے جانور پھیلائے۔ ہوا اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان اس کے حکم کے تابع ہیں۔ بیشک ان سب چیزوں میں اُن لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں، نشانیاں ہیں)۔

مشاہدۂ تفکر، اور مطالعۂ قدرت اور تدبر، زندگی اور موت کا تسلسل، قرآن کریم میں یہ ذکر بار بار آیا ہے اور قدرت سے رابطہ رکھنے اور قدرت کے مظاہر پر غور کرنے اور ان سے نتائج نکالنے کی تلقین جا بجا کی گئی ہے۔ اگر اُن آیات کا شمار کیا جائے جو اس موضوع پر ہیں، تو یہ بات کُھل جائے گی کہ ان کی تعداد ان آیات سے کہیں زیادہ ہے جو قرآن میں کسی دوسرے موضوع پر آئی ہیں۔ مقصد ظاہر ہے، انسان کائنات کا جزو ہے، وہ اگر خود کو قدرت سے الگ رکھنے کی کوشش کرے گا، تو مر جائے گا۔ کیونکہ اس کی جڑیں زمین کے اندر نہیں رہیں گی۔ اس کے علاوہ کائنات کی وسعت کا احساس اسے گھمنڈ سے بچاتا ہے اور بار بار یاد دلاتا ہے کہ زمان کے طول اور مکان کی عرض کے سامنے اس کا وجود بے حقیقت ہے۔ کائنات کا پُراسرار اور حیرت انگیز نظام اسے کائنات کے پیدا کرنے والے اور قائم رکھنے والے کی طرف لے جائے گا۔ وہ خود سے بار بار سوال کرے گا کہ یہ سارا نظام آپ ہی آپ وجود میں کیونکر آسکتا ہے اور یہ باطل اور فضول اور بے کار کیسے ہو سکتا ہے؟

ایک چھوٹے سے پتّا پر ہی نظر ڈال لیے۔ اس کی نشوونما کا بھید کیا ہے؟ وہ پیڑ سے کیا لیتا ہے اور اس کے عوض پیڑ کو کیا دیتا ہے؟۔ اس کی ننھی سی جان کو زندہ اور سرسبز رکھنے کے لئے کیا کیا عوامل کام کرتے ہیں

برگِ درختاں سبز درنظرِ ہوشیار ÷ ہر ورقی دفتریست معرفتِ کردگار

وہ لوگ تو کم نصیب ہیں جو قدرت کے اوراق کا مطالعہ سرے سے کرتے ہی نہیں وہ ان مناظر سے سرسری گزر جاتے ہیں، اور جو لوگ ان کا مطالعہ کرتے ہیں وہ ذوق اور شعور کے بقدر بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ ان اوراق کی مثال کسی بڑے شاعر کے آثار کی سی ہے۔ قارئین اپنے علم اور ذوق کے مطابق اشعار سے حظ اندوز ہوتے ہیں۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ جن قوموں نے فطرت سے اپنا ناتا توڑ لیا، جنھوں نے اپنے ذہن اور اپنی فکر کو انسان کے بنائے ہوئے زنداں میں اسیر کر لیا، جنھوں نے مشاہدہ اور غور و فکر کو ترک کر دیا، وہ قومیں جہالت، پستی، تباہی اور فنا کی طرف گامزن ہو گئیں۔

قدرت کے اوراق میں ایک بہت ہی دلکش اور معنی خیز ورق آسمان ہے، جو انسان آسمان پر نظر رکھتے ہیں، وہ اپنے مسائل اور مصائب کو بہ آسانی برداشت کر لیتے ہیں۔ کم از کم وہ اپنے مسائل کو بڑھا تے چڑھاتے نہیں، نہ ان کے ہجوم سے گھبراتے ہیں۔ آسمان کے سامنے انسان اور اس کے مسائل سمٹ کر حقیر اور غیر اہم رہ جاتے ہیں۔ رات میں آسمان پر نظر ڈالیے اس کی دلائی میں بے شمار ستارے ٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔

۶۲ سال ہوئے ہمارا ایک عالم طبیعات سی وی رمن پانی کے جہاز میں یورپ جا رہا تھا۔ اس نے آسمان پر نظر ڈالی اور سوچنے لگا کہ آسمان نیلا کیوں ہے۔ قدرت کے اس دلنواز منظر پر وہ غور کرتا رہا اور بالآخر ۹ سال بعد اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا اور جواب کے ساتھ طبیعات میں نوبل انعام جو دنیا کا اہم ترین اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ شعاعوں کے انتشار کے متعلق سی وی رمن کے اس انکشاف کو سائنس کی کتابوں میں ان کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا گیا ہے اور وہ "رمن ایفیکٹ" کہلاتا ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ جس سال سی وی رمن کو یہ اعزاز ملا، اسی سال ان کا بھتیجا سبرامنیم چندرشیکھر ان ہی کی طرح پانی کے جہاز میں کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ کے لئے انگلستان جا رہا تھا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔ جہاز کے ڈیک سے آسمان کے ورق کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کی نگاہیں ستاروں پر جم گئیں۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ وجود میں کیونکر آئے، ان کے ارتقا کے منازل کیا ہیں اور بالآخر ان کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ تین سال کی تحقیق اور غور و خوض کے بعد اس نے ستاروں کی پیدائش اور موت کے متعلق ایک جامع نظریہ

کر لیا۔ سبرامنیم چندر شیکھر نے ۱۱ جنوری ۱۹۳۵ء کو ۲۴ سال کی عمر میں رائل ایسٹرو فزیکل سوسائٹی کی میٹنگ
ا اپنا نظریہ پیش کیا۔

اس نظریہ کا لب لباب یہ ہے کہ مرنے والے ستاروں میں سے جن ستاروں کا ماس (MASS)
ورج کے ماس ۱.۴ گنے سے کم ہوتا ہے، وہ ستارے اپنا جوہری ایندھن ختم کرنے کے بعد ٹھنڈے ہو کر
ے گنجان مادے میں گر جاتے ہیں جسے وہائٹ ڈوارف یا "سفید بونا" کہا جاتا ہے۔ لیکن وہ ستارے
ن کا وزن کریٹیکل ماس (سورج کے ماس کے ۱.۴) سے زیادہ ہوتا ہے وہ "وہائٹ ڈوارف" کی منزل
کے بعد بھی سکڑتے چلے جاتے ہیں اور زیادہ گھنے، اور زیادہ گھنے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کو بلیک ہول
یا جاتا ہے۔ سائنس کی کتابوں میں کریٹیکل ماس کو "چندر شیکھر کی حد" کا نام دیا گیا ہے۔

چندر شیکھر ستاروں کی ساخت کا مطالعہ چند سال کرنے کے بعد اس حیرت انگیز انکشاف تک پہنچ
یا۔ مدراس میں اسے ایڈنگٹن کی کتاب جو اس وقت کا سب سے بڑا اختر شناس تھا، انعام میں ملی تھی جس
سے ستاروں میں اس کی دلچسپی کا آغاز ہوا اور بالآخر اس نے ان کی داستانِ حیات کی ساری منازل چھان ڈالیں
در وہ اس جگہ پہنچ گیا، جہاں تک اس سے پہلے کسی ہیئت داں کی نگاہ نہیں گئی تھی۔ چندر شیکھر نے کیمبرج پہنچ کر
اپنے ہیرو ایڈنگٹن سے رجوع کیا اور ۲۴ سالہ شاگرد اور ۵۲ سالہ استاد کی یہ دلچسپ جوڑی فلکیات کی سیر کے
لئے باہم نکلا کرتی۔ لیکن آج اس اہم میٹنگ میں ایڈنگٹن نے چندر شیکھر کی بات کاٹ دی اور اس کے نظریہ کا مذاق
اڑایا۔ اس ہونہار سائنس داں کی امنگوں پر اوس پڑ گئی۔

لیکن سبرامنیم چندر شیکھر ہمت ہارنے والا نہیں تھا۔ وہ سادہ مزاج اور وسیع الذہن انسان
پھر اپنے کام میں لگ گیا اور پھر کیمبرج یونیورسٹی چھوڑ کر شکاگو چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر چندر شیکھر نے اپنے نظریہ کو
ایک کتاب میں قلمبند کیا اور کتاب طاق پر رکھ دی اور دوسری تحقیقات میں مصروف ہو گیا۔ چندر شیکھر
کا دن ۶ بجے شروع ہوتا ہے اور آدھی رات کو ختم ہوتا ہے۔ اس معمول میں کبھی تبدیلی نہیں آئی۔
۵۰ سال پہلے چندر شیکھر کے نظریہ کو دنیا نے حقارت کی نظر سے دیکھا۔ آج اسی نظریہ پر انہیں
نوبل انعام ملا ہے، ایسٹرو فزکس (ASTRO PHYSICS) پر سب سے پہلا نوبل انعام چندر شیکھر
کی دریافت کی اہمیت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اس کی EQUATIONS کو ہم خلائی تحقیق (اسپیس ریسرچ)
اور دوریابی REMOTE SENSING اور جدید علم ہیئت میں استعمال کرتے ہیں۔ درحاصل اب کوئی بھی

میدان ایسا نہیں ہے جس میں اس کے گوناگوں انکشافات کو استعمال نہ کیا جاتا ہو۔

اور یہ سائنس داں جس نے انسان کے علم اور اس کے ذہنی افق میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ انتہائی سادگی اور انکسار کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے، شہرت سے بے نیاز ہو کر اسے اپنے کام سے کام ہے، وہ اس ہندوستانی روایت کا مرقع ہے کہ سادگی سے رہو اور بلندی کی طرف نظر رکھو۔ "میرا مقصد ایک مسئلہ کو حل کرنا نہیں ہے، بلکہ ایک پورے رقبہ کا احاطہ کرنا ہے"

چندر شیکھر نے امریکن قومیت اختیار کرلی ہے، ہر چند کہ ہم نے ایک وقت میں اسے نادانی اور جانبداری کی بنا پر ڈیپا نسٹریٹر کے چھوٹے سے منصب کے لئے رد کر دیا تھا۔ آج ہمارا سر فخر سے اونچا ہے کہ ہمارے وطن کی خاک سے فی زمانہ ایک ایسا انسان پیدا ہوا جس نے انسانی علم کو آگے بڑھایا۔ چند سال پہلے ہرگووند کھرانا نے بھی ہمیں اسی طرح فخر کا موقع دیا تھا۔ لیکن چندر شیکھر کی سادگی، قناعت، استقامت سلامت روی اور نہ بجھنے والی علم کی پیاس اُسے اور بھی ممتاز کرتی ہے اور اسے ابنائے وطن سے بے مہری کی شکایت بھی نہیں۔ وہ نہ صرف بڑا سائنس داں ہے بلکہ بڑا آدمی بھی ہے۔ جس کی لگن کے ناخن نے ستاروں کی دنیا کے بہت سے رازہائے سربستہ کھول ڈالے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ملک نے سائنس کے فروغ میں حصہ لیا ہے اور اس کے بعض فرزندوں نے عالمگیر امتیاز حاصل کیا ہے۔ اس دن کا ابھی ہنوز انتظار ہے، جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سائنس کی دنیا میں سرسید کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرے گی۔

●●

ہماری ذہانت کا معیار

مشہور طنز نگار سوئفٹ نے ایک ایسے ملک کا ذکر کیا تھا جہاں یہ بحث کہ انڈے کو گول سرے یا نوکیلے سرے سے توڑا جائے، شدید، طویل اور تباہ کن اختلاف کا سبب بن گئی تھی۔ اور کیوں نہ ہو، اس خاکدان میں اختلاف ہی سے تو ساری چہل پہل ہے۔ اس کے بغیر دنیا سونی نہ ہو جائے گی اور پھر اس سے زیادہ اہم موضوع ہو بھی کیا سکتا ہے۔ انڈے کی غذائیت سے کون سلیم الطبع انسان انکار کر سکتا ہے۔ اس میں غذا کے اتنے ذخیرے بھرے ہوئے ہیں کہ ایک زندگی وجود میں آتی ہے اور نشوونما پاتی ہے۔ انڈے کو بجائے اس کے کہ بچے کو وجود میں لائے اور اسے غذا فراہم کرے، اشرف المخلوقات انسان اپنے کام و دہن کی لذت اور اپنی نشوونما کے لئے بے محابا اسے تصرف میں لے آیا ہے۔ اس کے بعد لازمی سوال یہ پیدا ہوگا کہ اس "کنٹینر" (کن ٹے نر) اس سربمہر گلاس تک رسائی کس دروازہ سے ہونا چاہئے۔ "گول" کا روئے سخن وسعت اور کرۂ ارض کی طرف سے "نوکیلے سرے" کا انداز تیر بہدف ہونے کا ہے۔ اس میں سمت کا تعین نہیں ہے اور گولائی میں ابہام کا چور چھپا ہوا ہے جبھی تو کہتے ہیں کہ اس نے گول جواب دیا۔ یا کسی بات کو ٹالنے کا ذکر آتا ہے تو کہتے ہیں گول کرو۔ لیکن ہاکی اور فٹ بال کے میدان میں اتر جایئے تو گول کی بے مقصدی اور بے سمتی افعال کے تعین اور مقصد کے حصول میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بہرحال گول سرے اور نوکیلے سرے والوں کی نوک جھونک ختم نہ ہونا تھی، نہ ہوئی۔

جہاں تک اقوام کا تعلق ہے، اس قسم کی معنی خیز اور مابعد الطبیعاتی بحثوں کو پناہ اور فروغ دینے میں گزشتہ صدیوں سے مسلمان پیش پیش رہے ہیں۔ انھوں نے سارے غیر اہم کاموں اور بے مصرف بکھیڑوں، مثلاً قدرت کے مشاہدہ، کتابوں کے مطالعہ، جستجو، ریاضت، مہم جوئی، طالع آزمائی، تحصیل علم اور تحقیق کو خیرباد کہہ دیا ہے تاکہ یکسوئی کے ساتھ ایسے اہم مسائل کو پھٹے ہوئے گلے اور چڑھی ہوئی آستینوں اور کف بھرے ہوئے دہن اور گردن کی ابھری ہوئی رگوں کا خراج دے سکیں، جیسے نماز میں "آمین" کو دبی ہوئی زبان سے ادا کیا جائے یا بلند آواز سے؛ رکوع میں جاتے وقت ہاتھوں کو کانوں تک اٹھا کر لے جائیں یا نہیں۔ شہیدانِ کربلا کی یاد میں سُنّی اور شیعہ ایک دوسرے

کا خون ہر سال کتنے دنوں تک بہائیں اور کتنے افراد کو اس لذیذ موقع سے استفادہ کا موقع دیں۔ پیر کے حضور سجدہ کرنے کے باوجود موحد ہونے کا دعویٰ کریں یا نہ کریں؟ اسلام جیسے ابتدائی سیدھے سادے، بے صیقل، صاف اور واضح مذہب کو جو طفلِ مکتب کی سمجھ میں آجائے اور جس پر عمل کرنے میں ذرہ برابر دشواری نہ ہو، سادگی اور بے رنگی کا تہمت سے کیوں نہ بچائیں۔ اصول اصول کی جو لوگ رٹ لگاتے ہیں، وہ آئین قدرت سے ناواقف ہیں۔ اصل کے معنی جڑ کے ہیں۔ اور فرع بمعنی شاخ کے۔ پیڑوں پر نظر ڈالنے والے جڑوں کو کب دیکھ پاتے ہیں؟ تنا، ڈالیاں، ٹہنیاں، پھل پھول، پتے، کونپلیں ہی نظر آتی ہیں اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی ہیں۔ برگد کو بھول جائیے تو جڑوں کو صرف زیرِ زمیں پائیے گا۔ انھیں کھودنے سے کیا حاصل، جڑیں کھل جائیں گی، مٹی ہٹ جائیگی، تو ٹہنیاں سوکھنے لگیں گی، پتیاں مرجھا جائیں گی۔ اسی لئے نواب۔ ایک عرصہ تک مسلمانوں کے رہنماؤں نے انھیں اصول کی پُرخطر وادی میں قدم رکھنے سے روک دیا ہے۔ انھیں فروعات کے برگ و بار سے آگے بڑھنے نہ دیا کہ ان سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے اور ذہن پر صیقل ہوتی ہے۔ اصول کی راہ میں ایک قباحت اور ہے۔ یہ راہ سیدھی ہے۔ کولھو کے بیل کی طرح ایک بٹے ہوئے راستہ پر آنکھ بند کرکے زندگی بھر چلتے رہیئے۔ ذہانت کو اس راہ میں جوہر دکھانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ طبعزاد باتوں کے لئے دروازہ بند ہے۔ اس راہ سے انحراف، اجتہاد، ایجاد، اُپج، پرواز اور خوشنوازی کی راہیں پھوٹ ہی نہیں پاتیں۔ اصولوں کی بے کیف یک رنگی سے دل کیوں نہ گھبرائے۔ زندگی کیوں نہ اجیرن ہوجائے۔ اصولوں میں رکھا ہی کیا ہے سوائے پابندیوں کے۔ انسان ویسے ہی کیا کم مجبور ہے کہ ایک مجبوری اصولوں کے نام پر اور بڑھائی جائے۔ انسانی فطرت بندشیں قبول نہیں کرتی! اور اسلام دین فطرت ہے۔

●●

مسلم اقلیت کی مشکلات کا مؤثر حل

ال انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے تذکرہ سے بہت سی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ ملک
مسلمانوں کی تعلیم سے اس کانفرنس کا گہرا تعلق تھا۔ اس کے خطبات مسلمانوں کے تعلیمی سفر میں سنگ میل کی
ہمیت رکھتے ہیں۔ ان تاریخی خطبات سے صاف طور پر اندازہ ہوتا تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک مرکز ہے
ں سے پھوٹنے والی شعاعوں میں ایک شعاع یہ کانفرنس ہے۔ جس کے واسطے سے ملک کے ہر خطے میں بسنے
الے مسلمانوں کو روشنی ملتی ہے۔

تمام مسلم ادارے ہر جگہ خستہ حالی کا شکار ہیں۔ مجھے مراد آباد، بلند شہر اور گورکھپور کے اسکولوں کا حال
یب معلوم ہے جبکہ انھیں مقامات پر دوسرے ادارے برابر ترقی پذیر ہیں۔ یہ صورت حال ہمارے لئے تازیانۂ
برت ہے۔ شمالی ہند میں یہ الم انگیز منظر زیادہ نظر آتا ہے۔ تعلیم کے سلسلہ میں ہماری بے توجہی پوری طرح عیاں ہے۔
ں یہ شکایت ہے کہ زمانہ ہمارے خلاف ہے لیکن کبھی ہم نے سوچا کہ کیا خود ہم اپنے خلاف نہیں؟

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم ٭ کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

ین کیجیے کہ اگر ہم اسی حالت پر باقی رہے، تو حرف غلط کی طرح مٹا دیئے جائیں گے۔

جنوبی ہند میں مسلمانوں کا تعلیمی معیار شمالی ہند کے مسلمانوں سے اچھا ہے۔ لیکن اگر وہاں کے غیر مسلموں
سے ان کا موازنہ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمان وہاں بھی دوسروں سے پیچھے ہیں۔ اس کا اصل سبب یہ
ہے کہ ہمیں اپنے فرض کا احساس نہیں۔ ہم اولاد کی تعلیم کے سلسلے میں صرف مالی تعاون کو کافی سمجھتے ہیں لیکن صحیح
بیت کے لئے یہ تصور مضر ہے مجھے انٹرویو کمیشن کے ذریعہ معلوم ہوا کہ پسماندہ اقوام کے لڑکے مقابلے کے امتحان
مسلم لڑکوں سے تعداد میں بھی زیادہ ہوتے ہیں اور قابلیت اور صلاحیت میں بھی اچھے ہوتے ہیں۔ اس بیان کا یہ
عا نہیں کہ ہمتوں کو پست کیا جائے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس صورت حال کو ہم اپنے لئے پیغام عمل سمجھ کر اپنی جذبہ
یز کر دیں اور اپنی ترقی کے لئے خود کوشش کریں۔ ہمیں کسی ایسی ملک گیر قیادت کا انتظار نہیں کرنا چاہیے جو

ہماری مشکلات کو حل کرے۔ ایسی قیادت کا موجودہ حالت میں وجود مشکل ہے۔ "مردے از غیب بروں آید کارے بکند" والی بات کسی اور موقع کے لئے ہے۔ اس وقت ہر شخص کو اپنے دائرہ عمل و رسوخ میں کوشش کرنا چاہیئے۔ دو سو سال میں صرف ایک سر سید مرحوم کی شخصیت ایسی نظر آتی ہے جنھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح و ترقی کے لئے مثبت قدم اٹھایا؛ ان کے علاوہ ہر میدان میں بہت سی نمایاں شخصیتیں موجود تھیں لیکن ان کے حصہ میں یہ دولت نہ آئی۔ ہمیں اصلاح کے لئے اپنے گھر اپنے محلہ اور اپنے شہر سے ابتدا کرنی چاہیئے۔ ہمیں مقابلہ میں دشواریوں کا ضرور سامنا ہے۔ لیکن اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے کمر کسنے کی ضرورت ہے۔ سہل انگاری اور اور خوش خرامی سے مسئلہ کا حل نہ ہوگا۔ علم کا سرمایہ دس سال میں دوگنا ہو جاتا ہے۔ ہم اگر جفاکشی و جہد مسلسل سے کام نہ لیں گے تو اس رفتار کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔

اقلیت کی بقا و خوش حالی کے لئے تین باتیں ضروری ہیں :

(۱) اوّل یہ کہ اقلیت اپنے دین و مذہب کی سختی سے پابندی کرے اور ہمیشہ اس کے ذریعہ اپنے شیرازہ کو منظم رکھے۔

(۲) دوم یہ کہ محنت و ریاضت سے کام لے۔ اپنی قوت بازو کے ذریعہ آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ جانفشانی و تندہی سے کام لے کر اکثریت کا مقابلہ کرے اور ملک کی تعمیر میں دوسروں سے پیچھے نہ رہے۔

(۳) سوم یہ کہ ملک کی اکثریت کے ساتھ خوشگوار اور شگفتہ تعلقات رکھے۔

ہم کو ترقی کرنے کے لئے اپنے اندر احساس تناسب پیدا کرنا چاہیئے۔ آج ہم جزوی مسائل پر لڑتے ہیں لیکن اہم مسائل کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پہلے یہ مرض جنوب کے مسلمانوں میں نہ تھا۔ لیکن اب وہاں بھی یہ فتنہ پہنچ گیا۔ چنانچہ حیدرآباد دکن میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں۔ ستم یہ ہے کہ جس ملت کی بنیاد توحید پر تھی اور جس میں اتحاد و اتفاق پر غیر معمولی زور دیا گیا تھا آج اسی کا اتحاد پارہ پارہ ہے۔ ہمارے اتحاد و اتفاق کی واضح بنیاد خود ہمارے دین میں موجود ہے لیکن ہم نے اسے بھی نظر انداز کر دیا۔ علامہ اقبال نے فرمایا تھا :

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی، قرآن بھی ایک کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

علامہ اقبال نے جو سوال کیا تھا، وہی سوال حالی اور دوسرے مصلحین بھی کرتے ہیں۔ ہمارے اداروں میں جو اختلافات ہیں، اُن سے کیا کوئی فائدہ ہے؟ ہرگز نہیں۔ ضرورت ہو تو انسان اختلاف کر سکتا ہے، بحث کر سکتا ہے، لیکن بلا وجہ اختلاف کا کیا فائدہ۔ ہم پُرانے مسائل کو کیوں اُٹھاتے ہیں۔ ہمیں مستقبل سے متعلق سوچنا چاہیئے، ماضی سے نہیں۔ ماضی سے ہم سبق سیکھ سکتے ہیں۔ اختلافات کے لئے مواد فراہم کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں اپنی اصلاح کے لئے خود قدم اٹھانا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کا حال جانتا ہے۔ وہی قیامت کے دن ہمارے مابین فیصلہ فرمائے گا، ہم کیوں فیصلہ کرتے ہیں؟ ایک شخص اگر اسلام کا اقرار کرتا ہے اور اس کی طرف سے مسلمانوں کی مخالفت یا تحریک کا کوئی عمل ظاہر نہیں ہوتا، تو ہمیں اس پر بھروسا کرنا چاہیئے۔ یقین کیجیے تحریک کے لئے اختلاف اور تعمیری کاموں سے گریز تباہی کا پیش خیمہ ہے۔

اُردو زبان و ادب کے انحطاط کا بڑا سبب یہ ہے کہ اُردو پڑھنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ کسی زبان کا ادب اسی وقت ترقی کر سکتا ہے جب اس کے ادیب کو عزت نفس کے ساتھ اپنا تخلیقی سلسلہ جاری رکھنے کا موقع ملے۔ آج اُردو کی کتابیں فروخت نہیں ہوتیں۔ اہل قلم کو اکادمیوں اور ریڈیو کے پروگراموں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس صورت حال کے اندر کسی اعلیٰ ادب کی تخلیق کی توقع عبث ہے۔ آج مدراس اور کرناٹک میں اردو کے تحفظ کے لئے کوشش ہو رہی ہے، حالانکہ اُردو ان کی مادری زبان نہیں۔ ہمیں اس سے سبق لینا چاہیئے۔ ہم اتنی بڑی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی اپنی زبان کا تحفظ نہیں کر سکتے۔ حالانکہ یہودیوں نے ہم سے کم ہوتے ہوئے بھی اور سخت ترین حالات کا سامنا کرتے ہوئے بھی، اپنی مذہبی زبان عبرانی کو آج تک محفوظ رکھا ہے، بلکہ اس کو برابر ترقی دے رہے ہیں۔ اردو کو بچانے کے لئے ہمیں اس کو اپنے گھروں پر رائج کرنا اور اس کی تعلیم دینا چاہیئے۔ ہماری روایت رہی ہے کہ گھروں میں بڑی بوڑھی عورتیں اُردو وغیرہ کی تعلیم دیا کرتی تھیں، اسی سلسلہ کو فروغ دینا چاہیئے۔ اس لئے بھی اُردو کا تحفظ ضروری ہے کہ اس زبان میں ہمارا عظیم دینی و علمی و تمدنی سرمایہ موجود ہے۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہوں کہ ریڈیو اور فلموں کے ذریعہ اردو محفوظ رہ جائے گی، تو یہ ہماری سادہ لوحی ہے۔ ہمیں سطح کو نہیں دیکھنا چاہیئے، بلکہ اسے کرید کر گہرائی میں پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

آج ضرورت ہے کہ ہم باعزت زندگی کے لئے اور مشکلات میں اپنی بقا کے لئے کوشش کریں اور ملک کی ترقی میں حصہ لیں۔ ہم تعلیم میں بہت زیادہ پسماندہ ہیں لیکن اس بات کا احساس بہت تھوڑے لوگوں کو ہے، ان کا تناسب ۵ یا ۱۰ فیصد سے زیادہ نہیں۔ ہمیں اپنی مدد آپ کرنے کے لئے تیار ہونے کی ضرورت ہے۔ حالی

اور اقبال کے پیغام کو مشعل راہ بنا کر چلنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں دنیا کے حالات کے مطالعہ سے اور اپنے تجربات سے فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔ دل میں ملت کا درد پیدا کرنا چاہیئے۔ ہماری نئی نسل اپنے ماضی سے واقف نہیں۔ اسے اپنے مصلحین کی نصیحتوں کا علم نہیں۔ اقبال کا کلام اور حالی کی مسدس ان کو پڑھانا چاہیئے۔ مسدس کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ جاننا چاہیئے کہ سرسید کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن پوچھے گا کہ اپنی نجات کے لئے کیا کام کیا ہے، تو میں جواب دوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوایا ہے۔

آپ جن منصوبوں کو نافذ کرنا چاہتے ہیں، ان کو نافذ کیجیے، اور مستقبل سے متعلق اندیشہ کو راہ نہ دیجئے۔ اسکول کو ترقی دیجئے۔ لڑکیوں کا کالج قائم کیجئے اور ہمت سے کام لیجیے :

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق ؛ عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

عقل کی لب بامی نے قوموں کو شل کیا ہے۔ ابرہہ جب کعبہ کو منہدم کرنے کے لئے آیا، تو عبد المطلب اپنے اونٹ واپس لینے کے لئے اس کے پاس گئے۔ اس نے پوچھا اونٹ مانگنے آئے ہو، لیکن کعبہ کے متعلق کچھ نہیں کہتے؟ عبد المطلب نے جواب دیا کہ میں اونٹ کا مالک ہوں، اس لئے اس کی واپسی کا سوال کر رہا ہوں، رہا کعبہ تو اس کا مالک اس کی حفاظت کرے گا۔

اسی طرح آپ کوشش کیجئے۔ اگر آپ کا کام اللہ کی راہ میں ہوگا، تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور باقی رکھے گا۔ آپ دوسرے اداروں کے ذمہ داروں سے ملئے، ان اداروں میں اپنے طلبہ کے داخلے کے لئے کوشش کیجئے، ضرور آپ کی آواز سنی جائے گی۔ اور تعلیم کے سلسلہ میں یہ یاد رکھئے کہ نقش اول دینی تعلیم کو بنایئے اور گھروں میں بچوں کو دینی تعلیم دیجئے۔"

(مسلم ہائر سکنڈری اسکول الساعدہ کی طرف سے دیئے جانیوالے عصرانے میں)

● ●

کاروانِ زندگی

اِسلام کے متعلق کبھی کبھی یہ خیال دل میں گزرتا ہے کہ : "خوش درخشید ولی شعلۂ مستعجل بود"
یعنی خوب چمکا لیکن جلد بجھ گیا۔

آٹھویں اور نویں عیسوی کے درمیان، تقریباً سو سال کے اندر اس مذہب کے نام لیوا، اپنی علمی، اخلاقی اور عسکری فتوحات کی بدولت تقریباً (اس وقت کی) ساری دنیا پر چھا گئے۔ چار سو سال تک وہ علم کے کاروان سالار رہے۔ اخلاق و کردار کی پاکیزگی کی ایسی مثالیں انسانیت کے سامنے لے آئے جن کی نظیر پیش کرنے سے دنیا ہر دور میں قاصر رہی ہے۔ لیکن جلد ہی مسلم معاشرے میں فساد راہ پا گیا۔ جس دین کے بازوؤں پر انھوں نے علوم کی تسخیر کی تکلیف کی تھی، اس دین کی روح کو انھوں نے اپنی گرفت سے نکل جانے دیا۔ جستجو، حرکت، ولولہ، تازہ دمی، انبساط، اتحاد، اور تقویٰ کی جگہ سستی، کاہلی، تن آسانی، تقلید، جمود، اور عیش پرستی اور سہل انگاری نے لے لی۔ اپنے دین کی نسبت مسلمانوں کا وہی حال ہوا جو آئینے کے سامنے لائی ہوئی عبارت کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے دین کا عکس معکوس بن گئے۔ چنانچہ اغیار کے لئے اسلام کو سمجھنے کا آسان، مگر عبرت ناک طریقہ یہ رہ گیا ہے کہ مسلمانوں کے دین کو ان کے اطوار و احوال کے برعکس قیاس کریں، مگر وہ ایسا کیوں کرنے لگے۔ وہ تو سمجھتے ہیں کہ جتنے بُرے مسلمان ہیں ان کا مذہب بھی اُتنا ہی بُرا ہوگا۔ انھیں ایسا سمجھنے، حتیٰ کہ ایسا کہنے سے، کوئی روک نہیں سکتا۔ کس کو ایسی جستجو ہوتی ہے کہ دوسرے مذاہب کا مطالعہ کرے اور پھر ان کی بابت رائے قائم کرے؟ لوگ مذہب کے متعلق رائے اس مذہب کو ماننے والوں کو برتنے اور اُن کے اطوار و اخلاق کو دیکھنے کے بعد قائم کرتے ہیں۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر اسلام خدا کا آخری پیغام ہے، اگر اسلام سے ہدایت خداوندی کا ازلی سلسلہ پایاں کو پہنچا ہے، تو پھر کیا وجہ کہ اسلام کو بظاہر اس قدر جلد جراحت پہنچ گئی، اس کی ساکھ اتنے کم عرصے میں گر گئی؛ اس کے ماننے والوں کا شیرازہ اتنی جلد درہم برہم ہوگیا اور ان کے اخلاق اتنی تیزی کے ساتھ بگڑ گئے؟

یہاں ہمیں اسلام اور مسلمانوں کے درمیان فرق کرنا پڑے گا۔ خود کو بدر کے میدان میں لے جایئے۔ کئی کفار کے لشکر جرار سے مٹھی بھر مسلمانوں کا مقابلہ بدر کے میدان میں ہوگا۔ دونوں فوجیں صف آرا ہیں۔ رسول اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم نے دن، لشکر کو ترتیب دینے، خندق کھودنے، اور کھدوانے اور صفِ جنگ کی ترتیب کو آخری شکل دینے میں صرف کیا۔ رات کو جب سب ساتھی سوگئے تو آپؐ نے پروردگار سے رجوع کیا۔ گڑگڑاتے رہے اور فتح و نصرت کی دعا مانگتے رہے کہ یارب کل کی جنگ میں مسلمان ہار گئے تو پھر دنیا میں تیری عبادت کرنے والا، تیرا نام لینے والا کوئی باقی نہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی دعائیں سُن لیں، ان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ اسلام قیامت تک کے لئے محفوظ ہوگیا۔ محفوظ نہ صرف اس طرح کہ ترتیب و حفظ قرآن کا محکم انتظام ہوگیا، بلکہ اس طرح بھی کہ اسلام کی مکمل تشریح احادیث کی روشنی میں؛ مکمل ترجمانی سیرتِ رسولؐ کے ذریعہ؛ اور اس کی وضاحت صحابہ کرامؓ کے اطوار و کردار کی شکل میں اور اسلام کی سچائی کا اثبات اس کی اخلاقی اور ذہنی تسخیرات کے ذریعے کر دیا گیا۔

لہٰذا اس خلش انگیز خیال کا جواب جس کا ذکر آغاز داستان میں آیا تھا، کچھ اس طرح بن پڑتا ہے کہ اس پیغام ہدایت میں تحریف و ترمیم کی گنجائش نہیں رہی۔ مسلمان کتنے ہی زبوں حال، گمراہ اور بدکردار کیوں نہ ہوجائیں ان کے دین کی سالمیت پاکیزگی اور ابدیت پر اس کا اثر کچھ بھی نہیں پڑتا۔ جو دین خلق خدا کے لئے رحمت بن کر آیا تھا، وہ اب بھی رحمت بنا ہوا ہے اور رحمت بن کر رہے گا۔ ابد تک۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلام اپنے نام لیواؤں تک محدود نہیں رہا، ساری انسانیت اس سے متاثر ہوئی۔ کوئی مذہب اب ایسا نہیں ہے جس کے ماننے والوں پر اسلام کی انقلاب آفریں تعلیمات کا اثر نہ پڑا ہو۔ خورشید جب کرنوں کے بھالے تانے ہوئے اپنے خیمے سے نکل آتا ہے، تو لوگ رات کے گھور اندھیرے کو بھول جاتے ہیں۔ خورشید کی کرنیں، اس کی بصارت افروز روشنی، اس کی حیات انگیز حرارت، ساری دنیا اور اس پر بسنے والی ساری مخلوق کے لئے ہے۔ کوئی ایک طبقہ یا گروہ اس کو سمیٹ نہیں سکتا، محدود نہیں کرسکتا۔ نہ اوٹ بن کر دوسروں کو محروم کرسکتا ہے۔ اسلام کیا آیا، سارے مذاہب کے ماننے والوں نے ایک خدا کو کسی نہ کسی عنوان سے تسلیم کرلیا۔ خدا کا تصور جو بعض ادیان میں دب گیا تھا، قرنوں کی گرد اپنے دامن سے جھاڑ کر پھر ابھر آیا۔ توحید، غیر مخلوط توحید کو ساری انسانیت نے بطرزِ مستقیم یا بالواسطہ تسلیم کرلیا۔ ایک خالق کو ماننے کے بعد عقاید اور اعمال کی صفائی اور پاکی کے لئے بہت سی راہیں نکل آئیں۔ خود ہندوؤں نے اسلام کے زیر اثر ویدک دور کی خدا شناسی کو دوبارہ حاصل کرلیا اور چمکا دیا۔

توحید ہی نے اخوت کو جنم دیا۔ اخوت، بے آمیزش اخوت، کا اعلان جیسا اسلام نے کیا ہے، پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اب جبکہ اخوت کا اصول انسانیت کے لئے جزو ذہن بن چکا ہے، یہ اندازہ لگانا مشکل ہے

کہ ایک زمانہ میں یہ تصور کتنا غریب اور بعید تھا اور اس کو ذہنوں میں داخل اور زمانے میں رائج کرنا کتنا بڑا انقلاب تھا۔

اس سے بھی زیادہ اہم کردار اسلام نے مساوات کے تصور کو دلنشیں اور مساوات کے تقاضوں اور مضمرات کو منوا کر ادا کیا۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی عالم اسلام میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو وسائل کی کمی کی بنا پر تحقیر سے نہیں دیکھ سکتا۔ ہندوستان میں کیفیت البتہ مختلف ہے کہ یہاں جاتی واد کا زور رہا ہے۔

اس عالمگیر انقلاب کے اجزائے ثلاثہ کا جو اسلام نے بپا کیا، تیسرا جزو حرّیت ہے۔ اسلام نے غلامی کو بند نہیں کیا، لیکن پہلے قدم کے طور پر اس کو گوارا، بلکہ خوشگوار اور تحقیر، ظلم و ستم اور ناانصافی سے محفوظ کر دیا۔ مساوات نے شہ دی اور حرّیت نے جرأتِ حق گوئی کو اسلامی خصائل کی صف میں بٹھا دیا۔

انسان کو مندرجہ بالا اصولوں کے تحت، اسلام نے انسان کو عزتِ نفس دی۔ اسے اس کے افعال و اعمال کے لئے ذمّہ دار ٹھہرایا۔ اسلام نے انسان کو عذر معذرت، وسیلہ، سفارش، حیلہ، بہانہ، ابہام و اشکال کے دلدل سے نکال کر مسئولیت کی مضبوط دھرتی پر کھڑا کر دیا۔ اب فرد کو یہ اختیار نہیں رہا کہ اپنی غلطیوں اور تباہ حالیوں کے لئے دوسرے انسانوں یا اپنے مقدر کو موردِ الزام ٹھہرائے۔ یا معذوری اور مجبوری کا عذر کر کے اپنی ذمّہ داریوں سے گریز کرے۔

ان جاں بخش اصولوں کی روشنی نے توہمات، ضعیف الاعتقادی، دائرہ بانی، گریز اور غیر ذمّہ داری کے اندھیرے کو دور کر دیا۔ اسلام نے بونے اور کاٹنے کے سادہ اصول پر اخلاق کی بنیاد رکھی۔

ان بڑے بڑے عیبوں کے خلاف جنہوں نے ابتدائے آفرینش سے انسان کو خوار و زبوں رکھا ہے اور جنہوں نے بیشمار دوسری برائیوں کو رواج دیا ہے، جنہوں نے اُم الخبائث بن کر لاکھوں گھر برباد کیے ہیں، ان کے خلاف سب سے مؤثر جہاد اسلام نے کیا، یعنی شراب نوشی، جوا، اور زنا۔ اسلام نے پہلی بار عورت کو تحقیر، ظلم، استحصال اور ناانصافی کا ہدف بننے سے بچایا اور اس کے انسانی مرتبے اور حقوق کو تسلیم کیا۔

اسلام کے ان اوصاف کو دنیا نے عام طور پر تسلیم کیا ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور وصف ہے جس کی طرف نظر کم گئی ہے۔ وہ ہے ہر دور، ہر خطے اور ہر گوشے میں ایسے انسانوں کا پیدا کرنا جو انسانیت کے معیار پر پورے اترتے ہوں، جو پانی میں رہتے ہوئے اپنا دامن تر نہ ہونے دیں؛ جن کے دل میں خوفِ خدا ہو اور جو دنیا کی کسی طاقت سے نہ ڈرتے ہوں؛ جنھیں کوئی طاقت کلمۂ حق کہنے سے نہ روک سکے۔ برائی کے باوجود جن کے دل کا دامن برائی کے احساس سے آلودہ نہ ہو، جنھیں سیدھے راستے سے نہ کوئی ڈر ہٹا سکے، نہ کوئی لالچ؛ تواضع جن کا مزاج ہو، انصاف جن کا شیوہ، فروتنی جن کی خو ہو، انسان دوستی اور ہمدردی جن کا مسلک، اور بے لوث خدمتِ خلق جن کا

مقصدِ زندگی۔ یہ لوگ نرم خو اور آہستہ رَو اور سراپا سکون ہوتے ہیں لیکن حق کی حمایت میں چٹان کی طرح سخت اور باطل کے مقابلے میں شمشیر کی طرح قاطع۔ یہ لوگ بُرائیوں سے بچنے کے لئے دنیا سے گریز نہیں کرتے، دوسروں کو بُرائیوں سے بچانے کے لئے دنیا میں رہتے ہیں۔ اس وقت جبکہ ہوا، اور فضا، مٹی اور پانی سب آلودہ نظر آتے ہوں، تب بھی اُن کی آنکھوں میں ہوتی ہے، دامن پر نہ آلودگی ہوتی ہے، نہ نمی۔ مزدور جب ٹھیکے پر کھدائی کرتے ہیں تو قطعۂ زمین کے ایک چھوٹے سے حصے کو تیشہ کی ضرب سے بچا کر چھوڑ دیتے ہیں، تاکہ جب پیمائش کا وقت آئے کہ کتنی مٹی کھودی گئی تو جو حصہ تیشہ سے مَس نہیں ہوا، اس کی نشان دہی کرے کہ کس سطح سے کھدائی شروع ہوئی تھی۔ مذکورہ نفوس اسی بچے ہوئے تودے کی طرح ہیں، جس سے موازنہ کرکے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ہم کس حد تک نیچے گئے ہیں۔ یہ لوگ اس لائٹ ہاؤس یا منارۂ نور کی مانند ہیں جو اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا لیکن دور دور تک جہازوں کو پُرخطر چٹانوں سے دور رکھتا ہے جو، سے اگر وہ ٹکرا گئے تو پاش پاش ہو جائیں گے۔

پس ہماری دانست میں اسلام کا بڑا کارنامہ نہ صرف یہ ہے کہ اس نے ایک قلیل عرصے میں ایک زبردست انقلاب، اسلام کی اخلاقی اور ذہنی کائنات میں برپا کر دیا۔ نہ صرف یہ کہ اس نے اپنے فیوض کو ان لوگوں تک محدود نہیں رکھا جو اس پر ایمان لے آئے اور اپنی قدروں اور لازوال اصولوں سے ساری انسانیت کو متاثر کیا، بلکہ یہ بھی کہ اس نے قیامت تک ایسی کامل اور پاکیزہ شخصیتوں کو متواتر وجود میں لانے کا اہتمام کیا، جو دنیا کی ترغیبات و ترہیبات اور خبائث و مکروہات سے سرمو اثر پذیر نہیں ہوتیں۔ یہ لوگ ان زمانوں میں بھی جبکہ بدی حاوی نظر آتی ہے اور موج در موج بڑھتی چلی جاتی ہے اس طرح پاکیزہ اور پُرسکون زندگی گزارتے ہیں جیسے کہ ماحول اور موسم ان پر اثر انداز ہو ہی نہیں سکتا۔ جس طرح ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ سورج پورب سے نکلے گا، اسی طرح ہم ان کے متعلق پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اُن کے پائے ثبات کو کبھی لغزش نہ ہوگی اور کوئی دنیاوی طاقت انھیں حق طرازی، حق پسندی اور حق گوئی سے باز نہیں رکھ سکے گی۔ یہ بظاہر سیدھے سادے کمزور اور نرم گو انسان بڑے سے بڑے طوفان کے مقابلے کی طاقت رکھتے ہیں۔ ان ہی کے لئے کہا گیا ہے:

مردانِ خدا، خدا نہ باشند ❊ لیکن ز خدا، جُدا نہ باشند

[خدا رسیدہ لوگ خدا نہیں ہیں، لیکن خدا سے جُدا بھی نہیں ہیں]

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قادرِ مطلق نے جب دین کے اتمام و تکمیل کا فیصلہ کیا اور انبیاء کرام کے زریں سلسلہ پر خاتمہ کی مُہر لگا دی تو یہ بھی مقدر ہوا کہ دین کی ترجمانی کے لئے خدا کے نیک بندوں کا ایک سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا جن پر گردشِ لیل و نہار کے تغیرات کا کوئی اثر نہ ہوگا اور جو بگڑی ہوئی قدروں کی پرچھائیں بھی دامنِ دل پر نہ پڑنے دیں گے جن کی ذاتِ گرامی تاریکی، بیدینی اور بدعملی کے بحرِ ذخار میں منارۂ نور کی حیثیت رکھے گی۔ ان ہی لوگوں کی برکت ہے کہ دنیا باوجود گناہوں اور بداعمالیوں کے ابھی تک تباہ نہیں ہوئی۔ خدا کا فضل ہے کہ یہ لوگ کتاب و سنت کے حامل اور پابند ہیں ایسے ایک دو نہیں سیکڑوں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ آپ اپنے جوار میں دور تک دیکھئے۔ ایک آدھ بزرگ ایسے ضرور نظر آئیں گے جن کا اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا مرنا جینا صرف خدا کے لئے ہوگا۔ انسانیت کو اگر جسم تصور کیا جائے تو یہ لوگ سینے اور بعض کا مقام رکھتے ہیں۔ طمع اور خوف کے علاوہ یہ نام و نمود سے بھی بالاتر رہتے ہیں۔ واقعی یہ اسلام کا کرشمہ ہے کہ ایسے نفوس کا سلسلہ اس کثرت کے ساتھ جاری ہے۔ یہ مختلف مقامات میں بکھرے ہوئے ہیں [illegible]

زادِ راہ اور راہنما

سرسید نے اخلاص کو زادِ راہ اور عقل کو راہنما بنایا تھا۔ عقل راہنما نہ ہو تو بات بنتی نہیں۔ عقل انسان کا امتیازی وصف ہے۔ لہٰذا جو لوگ انسان کہلاتے ہیں اور انسان کی حیثیت سے ترقی کرنا چاہتے ہیں وہ عقل کی رہنمائی کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھ پاتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل، بے حس اور بے مہر عقل، کارہائے نمایاں انجام نہیں دے سکتی۔ اسے جذبہ کی رفاقت، تائید اور متابعت درکار ہوتی ہے۔ بغیر جذبہ کے عقل بے جان رہ جاتی ہے اور بغیر عقل کے جذبہ بے مہار اور خودسر ہو جاتا ہے۔ عقل کا کام ہے جذبہ کو قابو میں رکھنا اور اس سے کام لینا عقل کا کام ہے۔ بھلے اور بُرے میں امتیاز کرنا اور افعال کے نتائج سے آگاہ کرنا۔ جذبات منھ زور گھوڑوں کی طرح ہیں، جن کی روک تھام صرف عقل کر سکتی ہے۔ اور کبھی کبھی ایسے مقامات بھی آتے ہیں جب عقل بھی نہیں کر سکتی۔

سرسید نے جن کی نظر اجتماعی نفسیات پر گہری تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کا جائزہ لیا تو یہ بات ان پر واضح ہوگئی کہ انھوں نے جذبات کو اوڑھنا بچھونا، بنا لیا ہے، جذبات جس راہ پر انھیں چلاتے ہیں اس پر وہ چلتے ہیں۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جذبات کی رَو میں بہنے اور نفع و نقصان سے آنکھیں بند کر لینے کا انجام خودکشی ہے۔ لہٰذا اُنھوں نے عقل کی بالادستی اور علم کی رفاقت پر زور دیا تاکہ انفرادی جذبات اجتماعی شعور کے تابع فرمان ہو جائیں۔ قارئین کرام واقف ہیں کہ سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کی پیش رفت کے لئے علیگڑھ سے وہ تحریک شروع کی جسے ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ تحریک علم و عقل کی تحریک تھی۔ ہم نے یوم سرسید پر ایک تقریر "مقام نیم تعبیر" کے عنوان سے کی تھی۔ ماحصل اس کا یہ تھا کہ سرسید کا خواب شرمندۂ نیم تعبیر ہوا۔ یہ تحریک ۵۰ سال چل کر مضمحل ہوگئی اور اب رو بہ زوال ہے۔

گزشتہ سال یوم سرسید پر ہم نے "تہذیب الاخلاق" میں ایک مضمون "کنگ لیر" کے عنوان سے شائع کیا تھا جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ ایک احسان فراموش بلکہ محسن کش اور تیرہ باطن قوم نے اس عظیم رہنما کی نیت پر رکیک حملے کیے اور اس کے دل کو طنز کے تیروں سے چھید ڈالا۔

آج کی صحبت میں ہمیں یہ دکھانا ہے کہ ہر چند کہ یلنانی ڈائینو، اس نطل جلیل کی غیر معمولی اصلاحی طاقت کے تحت ایک ملت جہالت سے ناتہ توڑنے اور علم سے رشتہ جوڑنے پر مجبور ہو گئی ۔ تاہم اس نے سرسید کے پیغام کو جو روشنی، عقل، سلامت روی، ہوش و گوش، اعتدال، توازن، ثبات، صبر اور استقلال کا پیغام تھا قبول نہیں کیا، اس نے ارزاں جذباتیت، کم کوشی اور تن آسانی سے اپنا تعلق بنائے رکھا۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں بسنے والی قوموں میں مسلمان سب سے زیادہ سادہ لوح، جذباتی، عاقبت ناشناس، زود مشتعل، اور فریب خوردہ ہیں۔ یہ عام کیفیت ہندوستانی مسلمانوں کی ہے جو اپنی انتہائی شدت میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یوں بھی یونیورسٹی کا مزاج تحقیق، تفتیش اور تجزیہ کا ہوتا ہے۔ جس پر سرسید کی ساری تحریک مبنی تھی، استدلال، تجسس، اور تفحص پر۔ تاریخ کا بہت بڑا طنز ہے کہ اس یونیورسٹی میں جو سرسید کی تحریک کا مرکز ہے، مزاج کی تشکیل ان گھڑ، بھونڈے، بے صیقل اور ناتراشیدہ جذبات سے پُر ہوتی ہے۔ یہاں سے عقل اور ہوش و گوش اور عاقبت اندیشی اور غور و خوض کو دیس نکالا مل گیا ہے۔

جس قدر تکلیف زندگی میں سرسید کو تنگ نظر اور خصوصیت پیشہ معترضین کے پُرعناد اعتراضات سے ہوئی ہوگی، اس سے کہیں زیادہ اذیت انھیں پہنچے گی، اگر وہ دوبارہ زندہ ہو کر یونیورسٹی کے انداز مزاج اور طرز نگاہ کو دیکھیں۔ انھیں یہ دیکھ کر کس قدر کرب ہوگا کہ جس روش پر وہ نوجوانوں کے مزاج کو ڈھالنا چاہتے تھے اس کے برعکس اُسے پاتے ہیں۔ بڑے میاں سر پیٹ لیں گے کہ الٰہی یہ کیا۔ وہ دیکھیں گے کہ تحقیق کی جگہ افواہ، تفتیش کی جگہ اختراع، صداقت کی جگہ دروغ، کاوش اور جانفشانی کی جگہ تن آسانی اور چرب زبانی، نظم و ضبط کی جگہ ہنگامہ خیزی، اور دریدہ دہنی نے لے لی ہے، تو اس برصغیر میں انقلاب برپا کر دینے کے باوجود وہ محسوس کریں گے کہ ان کی ساری مساعی رائگاں اور ساری کوششیں اکارت ہو گئیں۔ ان کا مقصد علم کا لبادہ پہنانا نہ تھا بلکہ زاویۂ نگاہ کو درست کرنا تھا۔ اس میں درستی کے بجائے کجی دیکھیں گے تو ان پر کیا گزرے گی!

۲

مختصر یہ کہ سرسید کی بات کو مسلمانوں نے یہاں تک سُنا کہ دنیا سے کنارہ کشی کی مذموم رسم کو ترک کر دیا اور
ریا س کے لبادہ کو تار تار کر پھینک دیا اور حکومت وقت سے بے تعلقی اور اس کے خلاف سلگنے کی بے مصرف
رش سے باز آ گئے اور انگریزی تعلیم کو با دل نخواستہ قبول کر لیا۔ لیکن جدید تعلیم کی اشاعت اس تیزی کے ساتھ
ہو پائی، حالات جس کا تقاضا کر رہے تھے۔ سرسید کی رحلت کے ۵۰ سال بعد جدید تعلیم کی تحریک کا زور ٹوٹنے لگا۔
۱۸۵ء کے ۹۰ سال بعد مسلمانانِ ہند کو ایک دوسرے پُرآشوب دَور کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ملک کی تقسیم اور اس
سے متعلق ہنگاموں نے ان مسلمانوں کے حوصلے کو جو ہندوستان میں رہ گئے تھے توڑ دیا اور وہ غصہ، مایوسی اور
بے بسی کے عالم میں ایک بار پھر خول کے اندر سرک گئے، گردوپیش سے بے تعلق اور بے حس اور ملک کی ترقی
ور خوشحالی سے بے نیاز اور بے بہرہ ہو کر۔ تعلیمی پسماندگی نے ہر قدم پر ان کا راستہ روکا۔ کچلے ہوئے جذبات
، انھوں نے حرزِ جاں بنایا۔ کڑھتے رہے، سلگتے رہے۔ ان کا ردّعمل سر بسر جذبات پر مبنی تھا۔ انھوں نے
س زبوں حالی میں بھی عقل کی رہبری قبول نہ کی۔ جذبات کی رَو میں بہتے رہے۔ عقل کو منہ نہ لگایا۔ اس لیے
پے در پے مات کھائی۔ علیگڑھ ہندوستانی مسلمانوں کا دل اور ان کے طرزِ فکر کا آئینہ دار ہے۔ چنانچہ مسلم
یونیورسٹی نے، بجائے اس کے کہ وہ ان مسائل پر، جو مسلمانوں کو آزادی اور تقسیم کے بعد لاحق ہوئے تھے، غور
فکر کرتی، ۱۹۶۵ء کے سانحے کے بعد ساری توجہ اقلیتی کردار کی بازیابی پر مامور کر دی۔ ہمیں اس کردار کی اہمیت
سے انکار نہیں، لیکن اعتراض ہے اس ابہام اور ناعاقبت اندیشی اور سادہ لوحی پر جس نے سارے حقائق کا بدل
یک نعرہ کو سمجھ لیا۔ ذرا دیر کے لیے بھی ہم نے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا۔ اگر پہلوؤں
ور مضمرات کو فکر کے احاطے میں لے آیا گیا ہوتا تو وہ دردانگیز انکشافات نہ ہوتے جو ۱۹۸۱ء کے ترمیمی ایکٹ
د برتنے پر ہوئے۔ اقلیتی کردار کے مبہم مطالبہ اور یونیورسٹی کی تعریف اور کورٹ کی تشکیل پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانے
ے بجائے ٹھوس بنیادی امور کو ایکٹ کی گرفت میں لائے ہوتے۔ جذبات ساری تحریک پر چھا گئے اور عقل کو
نفع و نقصان کے پرکھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ یہ مسئلہ سرسید کی زندگی میں اٹھا ہوتا، تو وہ اس کے حل کے لیے
سی تحریک کی ضرورت سرے سے سمجھتے ہی نہیں۔ حکومت کو استدلال سے قائل کرتے۔ ان کا ہدف مبہم اقلیتی کردار

نہ ہوتا، بلکہ وہ چند ایسی ٹھوس باتیں منوا لیتے، جن کے نتائج خاطر خواہ ہمہ گیر، نفاذ پذیر اور دُور رس ہوتے۔ اگر ان کے دلائل اور مطالبے کو حکومت رَد کرتی، تب کہیں تحریک کی نوبت آتی جس کی بنیاد ابہام پر نہیں، تصریحات پر ہوتی۔ وہ دانا بینا انسان کبھی سراب کے تعاقب پر راضی نہ ہوتا۔ اسکی حکمتِ عملی موانع اور مخالفت سے عہدہ برآ ہوتی۔

سیّد والا گہر کی رحلت کو چوتھائی صدی بھی نہ گزری تھی کہ علیگڑھ اور مسلمانانِ ہند نے ہوش و گوش اور سوجھ بوجھ اور عقل و دانش کے اس سبق کو بھلا دیا جو انھوں نے دیا تھا۔ چنانچہ ان کے شاگرد علی برادران خلافت کی تحریک کو لیکر اُٹھے، مسلمانانِ ہند نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور قریب تھا کہ ان کے سب سے قیمتی سرمایہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بھی اس تحریک پر قربان کر دیا جائے۔ ہر طرف جذبات کا بول بولا تھا۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ ہندوستان کے مسلمان خلافت کے جسدِ بے جان میں روح کیونکر پھونک سکتے ہیں۔ اور اگر بفرضِ محال پھونک بھی دیا تو خود ان کو اس سے کیا حاصل ہوگا اور دنیائے اسلام کو کرم خوردہ خلافت سے کیا ملے گا۔

یہاں تک ذکر تھا رہنما عقل کا جسے ہم نے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ عقل سے ہم نے سرسیّد کے جاتے ہی ناتہ توڑ لیا۔ اب تذکرہ ہوگا زادِ راہ یعنی اخلاص کا۔ سرسیّد نے فکر اور نظر میں ایک انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔ ایسا کرنے کے لئے انھیں کون سے جتن تھے جو نہ کرنے پڑے۔ کون سی قربانی تھی جو نہ دینی پڑی۔ ساری صعوبتیں، خصومتیں اور تکلیفیں انھوں نے اخلاص کے سہارے برداشت کیں۔ ان کے اخلاص کا نتیجہ ہے کہ علیگڑھ تحریک ہندوستان بھر میں تعلیم و روشنی کے برگ و بار لائی۔ علیگڑھ کے طلبا ایک لڑی میں پرو دیئے گئے۔ بانی کے حسنِ نیت کی بدولت علیگڑھ مسلم یونیورسٹی پُر آشوب ادوار سے جانبر ہوئی اور آج بھی پھل پھول رہی ہے۔

ماتم اس بات کا ہے کہ اخلاص کی روایت بھی یونیورسٹی سے فنا ہوگئی۔ اب جسے دیکھئے نفسی نفسی میں گرفتار ہے۔ کم ہی ایسے لوگ جو اپنے چھوٹے سے فائدے کے لئے یونیورسٹی کا بڑے سے بڑا نقصان کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ اخلاص نام کی کوئی شے یہاں دور دور نظر نہیں آتی۔ خود غرضی کا دَور دَورہ ہے۔ آرزو صرف یہ ہے کہ یونیورسٹی سے جو کچھ مل سکے لے لیا جائے اور اس کے عوض اسے کچھ نہ دیا جائے۔ عمارت کے لئے اخلاص مسالے کا کام کرتا ہے۔ اس کے بغیر اینٹیں الگ الگ رہتی ہیں۔ جڑ نہیں پاتیں۔ ہوا ذرا سی تیز ہوئی اور دیوار اڑاڑا دھم زمین پر آگئی۔ خود غرضی جب رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے تو افراد پنپ جائیں تو پنپ جائیں۔ جماعت کا شیرازہ بکھرا رہتا ہے۔ یہی حال اس وقت یونیورسٹی کا اور ہندوستانی مسلمانوں کا ہے۔ ان کے لئے ترقی کا سفر اور پیش رفت کے منازل طے کرنا محال ہوگیا ہے۔ سفر کریں تو کیسے، زادِ راہ ہی نہیں۔ نہ زادِ راہ، نہ راہنما، نہ اخلاص، نہ عقل۔ ●●

خطا کس کی ہے؟

۱۵ اگست کے گارجین نے ایران و عراق کی لڑائی کا اعتراف اداریہ سے کیا ہے ۔
" یہ لڑائی شروع ہوئی اور ختم ہونے میں نہیں آرہی ہے، صرف اس وجہ سے کہ دونوں ضدی
ی آیت اللہ خمینی اور صدام ایک دوسرے کو ایک آنکھ نہیں بھاتے ۔ لیکن لڑائی سے اتنا زبردست
ان ہرگز نہ ہوتا، اگر دوسرے ممالک نے ہتھیار نہ بھیجے ہوتے ۔ لہٰذا اس بڑے نقصان کی ذمہ داری خلیج تک
ود نہیں ہے ۔ امریکہ اور روس نے اپنی حکمتِ خارجہ کا ایک اہم اوزار اسلحہ کی فروخت کو بنا رکھا ہے ....
سپری" THE STOCKHOLM INTERNATIONAL PEACE RESEARCH INSTITUTE کے جمع کیے
ے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ان دونوں ممالک کے ہتھیاروں کی فروخت کا زیادہ حصہ تیسری دنیا کی قسمت
لکھا ہے ۔ روس دنیا بھر میں بکنے والے کل اسلحہ کا ۶۰ فی صد اور امریکہ ۵۶ فی صد ترقی یافتہ ممالک کو بیچتا
ہے ۔ امریکہ کے اسلحہ کے گاہکوں کی تعداد روس کے گاہکوں سے تین گنی زیادہ ہے اور سوویت روس اسلحہ
بیچنے والے ممالک میں اول ہے ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ روس کے گاہک، جن میں عراق بھی شامل ہے،
بہت بڑی مقدار میں اسلحہ خرید لیتے ہیں ۔ اسلحہ برآمد کرنے والوں میں تیسرا نمبر فرانس کا ہے، اور چوتھا نمبر برطانیہ
ہے ۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء تک سب سے زیادہ اسلحہ خریدنے والے ممالک میں سے ۷ مشرقِ وسطیٰ میں تھے ۔
ب ممالک میں واقعات کی ترتیب کچھ اس طرح ہے ۔ پہلے اسلحہ خریدو، پھر ان کے استعمال کی صورت نکالو ۔
انس عراق کو میزائل بیچنے والا ہے ۔ ان کے ہدف خلیج میں پٹرول کے ٹینکر ہوں گے ۔

یہ کہنا تو مبالغہ ہوگا کہ تیسری دنیا میں جہاں کہیں لوگوں پر بپتا پڑتی ہے، وہ مغربی ممالک کے اسلحہ کی
وخت کی وجہ سے ہے ۔ لیکن لڑائی کا پیمانہ اور اس کی مدت اور اس کے لائے ہوئے عذاب کا سرا براہِ راست ان ترقی
فتہ ہتھیاروں سے جوڑا جا سکتا ہے، جو انھیں فراہم کیے گئے ہیں ۔ ترقی یافتہ ممالک اسلحہ کی فروخت سے خود اپنے
لحہ اندوزی کے پروگرام کو کمک پہنچا رہے ہیں ۔ ایٹمی لڑائی دائرۂ امکان تک محدود ہے لیکن روایتی انداز کی
ڑائیاں دنیا میں جابجا ہو رہی ہیں ..... بے شمار انسان لڑائی کا چارہ بن رہے ہیں اور دنیا مطمئن نظر آرہی ہے "

مندرجہ بالا اقتباسات میں مسلمانوں کے عبرت کا سرمایہ ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام کامل ترین دستورِ حیات ہے۔ یہ اخوت اور مساوات، رافت اور رحمت، اتحاد اور خیر کا پیام لے کر آیا۔ اپنے گریبان میں منھ ڈالیے اور بتایئے کہ ان میں سے کوئی وصف بھی اب ہمارے اندر نظر آتا ہے۔ ہم آپس میں لڑتے مرتے ہیں۔ ہم نے خود کو خباثت میں گلے گلے مبتلا کر رکھا ہے۔ تعیش ہمارا شیوہ ہے۔ جہالت اور بداخلاقی ہمارا وطیرہ۔ عراق اور ایران آپس میں دست و گریبان ہیں، اس پر مصر ہیں کہ ایک دوسرے کو تباہ کر دیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے بعض شہروں میں سنی اور شیعہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو سرمایۂ آخرت سمجھ رہے ہیں۔ دنیا کے باشندے کیا نتیجہ نکالیں گے اور اہلِ ہند مسلمانوں کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ کاش مسلمان یہ سمجھیں کہ اس وقت بظاہر ان میں کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ وہ دنیا میں باقی رہیں گے یا عزت کے ساتھ دیکھے جائیں گے۔

گارجین نے تسلیم کیا ہے کہ آگ پر تیل ترقی یافتہ ممالک چھڑک رہے ہیں۔ اس سے مسلمانوں کی ذمہ داری کم نہیں ہوتی۔ اغیار تو تیل چھڑکیں گے ہی۔ ہم انھیں ایسا کرنے کا موقع کیوں دے رہے ہیں۔ کیا یہ ملت عقل و شعور، غیرت اور حمیت، اتفاق، اور اتحاد، اخلاق اور کردار کے لحاظ سے بالکل دیوالیہ ہو گئی ہے۔

یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ دنیا میں دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی تو برائیوں میں مبتلا ہیں، ان کے یہاں بھی جہالت اور نااتفاقی ہے۔ لیکن اس شدت سے کہاں ہے اور ان کے یہاں تاویل کی گنجائشیں کتنی ہیں۔ اسلام کا مذہب اس قدر واضح ہے کہ اعمال میں انحراف کی ساری راہیں اس کے ماننے والوں کے لئے بند ہو گئی ہیں اور کڑے احتساب کی ساری راہیں کھل گئی ہیں۔ مسلمان اور سب کچھ بھول کر صرف جہالت اور نفاق کی گرد اپنے دامن سے جھاڑ دیں تو وہی نہیں، ساری دنیا بدل جائے۔ کیونکہ سردست انھوں نے اپنی غفلت اور بداعمالی کی نقاب اسلام کے روئے زیبا پر ڈال رکھی ہے۔ جو کوئی دیکھتا ہے اسلام کے متعلق حقارت انگیز رائے قائم کرتا ہے۔

●●

غرور اور فخر

غرور اور تکبر بے شمار برائیوں کی جڑ ہے۔ مسیحی نظامِ اخلاق میں اس کی گنتی کبیرہ گناہوں میں ہوتی ہے۔ اسلام کو غرور ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ دنیا کا کوئی مذہب کوئی ضابطۂ اخلاق غرور کو روا نہیں رکھتا۔ ابلیس کی خطا صرف یہی تھی کہ اس نے گھمنڈ کے نشے میں اللہ تعالیٰ کے اس حکم سے سرتابی کی کہ آدمؑ کو سجدہ کیا جائے۔ گھمنڈ اخلاق کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ وہ حقیر ذرّہ جسے آدمی کا نام دیا گیا ہے، جس کے وجود کا انحصار سانس کے ڈورے، خون کی گردش اور دل کی دھڑکن پر ہے اور جسے ایک لمحہ ثبات نہیں، اُسے تکبّر کیوں کر روا ہو سکتا ہے؟ وہ اِتراتا کس بات پر ہے۔ اسے زعم کاہے کا ہے؟ تکبر کرنے والا خدا کی نہیں صرف اپنی پرستش کرتا ہے۔ وہ اشیاء، حالات اور افراد اور مسائل کے متعلق صحیح رائے قائم ہی نہیں کر سکتا کہ ان سب پر خود اس کی شخصیت اور نخوت کا سایہ پڑنے لگتا ہے۔ اس کے سوچنے کے انداز میں کجی آجاتی ہے۔ وہ فیصلہ اپنی خوشی، آسائش، غرض اور رجحان کو سامنے رکھ کر کرتا ہے شئے کی اچھائی اور برائی سے بے نیاز ہو کر انسان جیسے کمزور وجود کا اکڑ کر چلنا کتنا مضحکہ خیز ہے۔

گھمنڈ، اِتراہٹ، غرور، اکڑ، نخوت، انانیت، خود پرستی یہ سب تکبّر کی ہی شکلیں ہیں۔ ان کا نقصان حامل کو اس طرح پہنچتا ہے کہ وہ ہوش وگوش اور تناظر و تناسب اور بصیرت و شعور اور شئے لطیف سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کا اُفق سمٹ جاتا ہے۔ جو رائے ساری کائنات کے پس منظر میں قائم کرنا چاہیئے تھی، متکبّر اور گھمنڈی انسان اسے اپنی شخصیت کے سکڑے ہوئے اور حقیر پس منظر میں قائم کرتا ہے۔ ایسی صورت میں رائے کے صائب اور فیصلے کے درست ہونے کا امکان بھی نہیں رہتا۔ چونکہ اس کی ذات بیچ میں آجاتی ہے، لہٰذا عقل پر جذبات کا کہرا چھا جاتا ہے اور عقل کی آنکھوں کو کچھ نظر نہیں آتا۔ عقل کو جو صلاحیت پرکھنے کی دی گئی ہے وہ مغلوب ہو جاتی ہے۔

انسان تنہا رہ کر کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کا کام آگے جب ہی بڑھتا ہے۔ جب دوسرے اس میں شریک ہوتے ہیں۔ شرکت اور تعاون کے لئے باہمی ہمدردی اور انسیت درکار ہوتی ہے۔ گھمنڈی انسان سے لوگ کترانے لگتے ہیں۔ گھمنڈ کی قبا میں دوسروں کی تحقیر کا استر لگا ہوتا ہے۔ گھمنڈی کو ہر شخص ناپسند کرتا ہے اور

جب تک سخت غرض نہ پڑے۔ اس سے دور رہتا ہے۔ مغرور آدمی نادانستہ دلوں کو توڑتا ہوا چلتا ہے۔

کبر اور غرور میں فرق ہے اور اس سے کہیں زیادہ فرق غرور اور فخر کے درمیان ملے گا۔ فخر اور ناز پھوٹتے ہیں اعتماد اور ولولے سے۔ فخر کا شمار اچھے خصائل میں ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں اتراہٹ کا پہلو اور دوسروں کی تحقیر پنہاں نہ ہو اور اپنی کم مائگی کا احساس مضمر ہو۔ کوئی فرد، کوئی طبقہ، کوئی قوم اور کوئی ادارہ صحت مند فخر سے محروم ہو کر پنپ ہی نہیں سکتا۔ فخر راست روی کے لئے محافظ، سخت کوشی کے لئے مہمیز، ذہن کے لیے اُفق اور بلند پروازی کے لیے پر و بال فراہم کرتا شاید ہی کوئی انسان اتنا بدقسمت، ایسا تیرہ روز ہوگا جو کسی بات پر فخر نہ کر سکتا ہو۔ ایسے آدمی کے لئے دنیا تا ہو جاتی ہے۔ زندگی میں اسے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ کوئی ولولہ اور کوئی امنگ اسے متحرک نہیں کر سکتی۔ اس میں اور مٹی کے ڈھیر میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ وہ کڑھتا اور سلگتا رہتا ہے، اس کے دل میں گنجائش نہیں رہتی، وسعت اور شگفتہ اس کے پاس نہیں پھٹکتی۔

صحت مند فخر اور عزت نفس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ فخر کو گھمنڈ سے دور رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان یہ محسوس کرے کہ جن اوصاف پر وہ ناز کر رہا ہے وہ اس کے پیدا کرنے والے کی دین ہیں۔ وہ فخر جس میں شکر کا عنصر پنہاں نہ ہو کھوکھلا اور کم وزن ہوتا ہے۔ اگر نگہداشت نہ کی گئی تو وہ تکبر میں بدل جائے گا۔ فخر کرنے والے شکر کرنے والے ہوتے ہیں۔ فخر محسوس ہوتا ہے، الفاظ میں نہیں ہوتا۔ بلکہ آداب، اطوار، چال، ڈھال اور بشرہ سے بھی زیادہ نہیں چھلکتا۔ تراوش ہوتی ہے تو مر اعتماد، تشکر، عزتِ نفس اور رجائیت کے سرمائے ہیں۔ اللہ کے دیے ہوئے شمائل و خصائل پر فخر محسوس نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ فخر محسوس کرنے کی چیز ہے، اعلان کرنے کی نہیں۔ فخر وہ خوشنما جھاگ ہے جو زندگی کے سمندر میں شکر کی لہروں کی کاوش بن کر سامنے آتا ہے۔ فخر اور گھمنڈ میں اتنا ہی فرق ہے جتنا موتی اور خزف میں۔

●●

مسلمانانِ ہند کے تعلیمی، سماجی اور تہذیبی مسائل

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی، تہذیبی اور سماجی صورتِ حالات تمام ملک میں یکساں نہیں، مختلف علاقوں میں مختلف ہے۔ شہر اور دیہات، شمال اور جنوب، مغرب اور مشرق میں بڑا فرق نظر آئے گا۔ ابھی تک ہم ان مسائل کو شہر کے آئینے میں دیکھتے چلے آئے ہیں۔ حالانکہ تقریباً ۸۰ فی صد ہندوستانی مسلمان گاؤں میں بستے ہیں اور مسلمانوں کی حالت کا کوئی جائزہ اور ان کی ترقی کا کوئی منصوبہ اس اکثریت کا احاطہ کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ آبادی کا یہ جزوِ غالب یقیناً درخورِ اعتناء ہے۔ علاوہ بریں ہم نے اکثر مسلمانوں کے مسائل کو یو۔پی کے مسلمانوں کے مسائل کے مساوی سمجھا ہے۔ وہ دور عرصہ ہوا، ختم ہو گیا جب ہندوستان سے مراد تھی شمالی ہندوستان۔ اب ملک کے دوسرے حصے اہمیت حاصل کر چکے ہیں۔ جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق ہے اگر ان کے کسی طبقے میں مسائلِ حاضرہ سے عہدہ برآ ہونے کی تھوڑی بہت صلاحیت نظر آتی ہے تو وہ جنوب کے مسلمان ہیں، شمال کے ہرگز نہیں۔ مسلمانانِ ہند کی قیادت جنوب کو منتقل ہو جانی چاہیے۔ ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جو ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پیشرفت کی ذمّہ دار اور ایک مدّت تک سیاسی اتحاد و اقتدار کی بانی تھی، ایک عرصہ ہوا دم توڑ چکی۔ اس کے برعکس کیرالا میں جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی ہے، وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑھتے ہوئے تعلیمی نظام کا مرکز اور منبع بن گئی۔ اس کے علاوہ کیرالا کی مسلم سروس سوسائٹی نے بھی تعلیمی کام بڑے پیمانے پر شروع کر دیا ہے۔ یہی حال کرناٹکا کی "الامین" سوسائٹی، تامل ناڈو کی ایس، آئی، اِی، ٹی[1] اور سیاکھی ٹرسٹ اور آندھرا پردیش کی متعدد انجمنوں کا ہے۔ کلام کا حاصل یہ ہے کہ جہاں تک مسلمانوں میں جذبۂ ایثار اور تعلیمی و ثقافتی پیشرفت کا تعلق ہے، مرکزِ ثقل اب شمال سے ہٹ کر جنوب پہنچ گیا۔ یہ کہنے سے مدّعا، تاہم یہ نہیں کہ وہاں جو کام ہو رہا ہے وہ کسی اعتبار سے بھی کافی ہے۔ یا دوسرے فرقوں کے کارناموں کے آگے ذرا دیر ٹھہر سکتا ہے۔

ایک ضمنی بات استدراک کے طور پر۔ اس گفتگو کے دوران میں مسائل کا ذکر کرتے کرتے نقطۂ نگاہ اور

۱۔ ساؤتھ انڈیا ایجوکیشنل ٹرسٹ (جنوبی ہند کا تعلیمی ٹرسٹ)

نفسیاتی کیفیت اور صلاحیتوں اور میلانات کی بات کرنے لگوں گا۔ یہ طریقہ نہ مربوط ہے نہ محمود، لیکن میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کے لئے شاید غیر موزوں نہیں۔ مسائل کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں ان کے حل کی طرف بھی اشارہ کروں گا۔

یہاں یہ دُہرانے کی ضرورت نہیں کہ مسلمان ایک صدی کے اندر معلوم دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئے تھے۔ وہ جہاں گئے علم کا چراغ لے کر گئے۔ چار سو سال تک نوع انسانی کے علمی اور تہذیبی کارناموں کی داستان ان کے ذہن رسا اور دلِ زندہ کے ساتھ جُڑی رہی۔ علم اور سائنس کے سارے اکتسابات اور انکشافات ان ہی کے مرہونِ منت ہیں۔ پہلی بار ایسا ہوا کہ ایک مذہب نے عبادات سے زیادہ زور مشاہدے، غور و فکر اور تحصیل علم پر دیا۔ نتائج نے ایک عالم کی نگاہ کو خیرہ کر دیا۔ چار صدیاں گزرنے کے بعد (۸۰۰ تا ۱۱۰۰ عیسوی) انحطاط کا سلسلہ شروع ہو گیا جس پر مُہر پندرھویں صدی کے اواخر میں لگی۔ اختراع کی جگہ اقتدا، ایجاد کی جگہ تقلید نے لے لی اور یہ سلسلہ زور پکڑتا چلا گیا۔ چنانچہ جو لوگ علم و تہذیب کے قافلہ سالار تھے، جہالت اور قدامت کے اجارہ دار بن بیٹھے۔ اقتدار اور اقبال کے دَور میں یہ عنوان ڈھکا چھپا رہا۔ لیکن جب حکومت اور اختیار ہاتھوں سے نکل گئے تو زوال طشت از بام ہو گیا اور اس کی رفتار تیز تر ہوتی چلی گئی۔ ہندوستان مسلمانوں کا زوال اٹھارہویں صدی کی ابتدا سے شروع ہوا۔ اُنیسویں صدی کے اوسط میں انگریزوں کے تسلط کے بعد ہندوستانی مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیئے زندگی سے عہدہ برآ، اور مصائب و مراحل سے نبرد آزما ہونے کا دلولہ باقی نہ رہا۔ ایک چراغ تھا جو گُل ہو گیا۔ ایک آگ تھی جو سرد ہو گئی۔ انیسویں صدی کے آخری ربع میں سید احمد خاں نے علی گڑھ کے ذریعے مسلمانوں کو جہالت اور مایوسی کے شکنجے سے چھڑایا اور ان میں جینے کی لگن پیدا کی۔ انھیں زمانے سے ہم آہنگ اور ہم قدم ہونے کے آداب سکھائے۔ تحقیر کے عادیوں کو تسخیر کا سبق دیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا سہرا، جو بدقسمتی سے ادھورا رہ گیا، سید احمد خاں اور اُن کی تحریک کے سر ہے۔ لیکن قدامت پرستی اور جہالت اور جمود نے اس تحریک کو زیادہ آگے بڑھنے نہ دیا اور ۱۸۵۷ء کے زبردست جھٹکے پر ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ملک کی تقسیم اور آزادی کے بعد ایک اور جھٹکا لگا۔ ملک دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد پاکستان کے حصے میں آئی، یا وہاں چلی گئی۔ جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے، انھیں ایک عرصے تک شبہ کی نظر سے دیکھا گیا۔ بہت دنوں تک مسلمان بٹوارے کے زخم چاٹتے رہے۔ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک مدت تک ہراس چھائی رہی۔ وہ ایک بار پھر اپنے خول میں چلے گئے۔ انھیں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ وہ آزاد ہوتے ہی اسیر ہو گئے ہیں۔ بدیسیوں کے محکوم ہوئے تھے، اب اپنوں کے۔ یہ احساس رفتہ رفتہ زائل ہوا۔ لیکن وہ اعتماد جو مجروح ہو گیا تھا ابھی تک

پوری طرح بحال نہ ہو پایا۔ فرقہ وارانہ فسادات اس کی بازیابی میں سدِّ راہ ہوتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کا سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ مسلمانوں میں یہ احساس عام طور پر پایا جاتا ہے کہ جہاں وہ پنپے اور یکسو ہوئے سراسیمگی اور انتشار کے سامان فراہم کر دیئے گئے۔ یہ احساس بالکل حق بجانب نہ سہی حقیقت سے قطعاً بے تعلق بھی نہیں ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے متعلق جو کمیشن حکومت کی جانب سے بٹھائے گئے ان میں کئی ایک نے ان فسادات کے پیچھے سازش کا ہاتھ دیکھا ہے۔ یہ احساس بھی نہ محدود ہے نہ بے بنیاد کہ کبھی کبھی ان میں پولیس اور پی۔اے۔سی کا رخ مسلمانوں کے خلاف معاندانہ ہو جاتا ہے۔ فرقہ وارانہ بلووں نے ہندوستانی مسلمانوں کو نہ صرف دلجمعی سے محروم کیا ہے، بلکہ ہندوستان کی ملی جلی تہذیب میں شیر و شکر ہونے سے بھی روکا ہے۔ وہ ہندوستان پر اپنا اتنا حق نہیں سمجھتے جتنا کہ وہ دراصل ہے اور جتنا کسی طبقہ کے بلوغ، ترقی اور فروغ کے لئے ضروری ہے۔ ہندوستان کے منصوبہ بند وکاس میں وہ شریک نہیں ہو پاتے، نہ اُس سے کما حقہٗ بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ تعلیم و تمنا اور ترقی کی کرنیں ان کے پہلو کو مستنیر نہیں کر پاتیں۔ بد دل ہو کر وہ علم سے جی چرانے، محنت سے دامن بچانے لگے ہیں۔ طبیعت کی گرمندی، محرومی کا احساس، مظلومی کا فشار، یہ سب نقطۂ نگاہ کی صحت اور ارادہ کی صلابت کے ضامن نہیں ہو سکتے۔ ایسی صورت میں افتادِ طبع مریضانہ ہو جاتی ہے۔ اختیارِ عقل کے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے۔ عنانِ جذبات کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔ بھلے بُرے کا پرکھنا دشوار ہو جاتا ہے اور اپنے مسائل اور مشکلات کو کھُلے دل سے سامنے رکھنا دشوار تر۔ اپنے گوشے میں بیٹھ کر سُلگتے رہیئے، دھواں حصّے میں آ جائے گا، لیکن نہ حرارت ہاتھ آئے گی نہ روشنی۔ محرومی کے فشار کو 'پدرم سلطان بود' کے خیال دامنگیر نے اور بڑھا دیا ہے۔ اسی بنا پر کُن خیال نے ہمیں گھمنڈ اور اسراف کے گرداب میں ڈال دیا اور محنت اور پامردی اور راتقامیت سے محروم کر دیا۔

علیحدگی اور بیچینی اور بے اطمینانی کی آگ کو بیروزگاری نے ہوا دی ہے۔ شمالی ہندوستان کے شہری مسلمانوں کے ایک معتدبہ حصّہ نے یا زمینداری پر تکیہ کیا تھا، یا نوکری کو اوڑھنا بچھونا بنایا تھا۔ زمینداری ختم ہو گئی، نوکری ملتی نہیں، اب کریں تو کیا کریں؟ چونکہ بازار گرم رہا تھا، اس لئے کساد بازاری اور کھلتی ہے۔ پہلے ملازمت میں رعایت برتی جاتی تھی۔ اب کئی سطحوں پر مراعات کے برعکس کچھ اور ہوتا ہے۔ پھر مقابلہ مشکل۔ اکثریت نے جدید تعلیم کا آغاز مسلمانوں سے پہلے کیا تھا، وہ اس دوڑ میں ان سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ خوش حالی اس کی ہمرکاب ہے۔ اس کے نتیجے علمی ماحول میں پروان چڑھتے ہیں اور پڑھے لکھے والدین کے زیرِ سایہ اور زیرِ ہدایت جلا یافتہ ذہن اور پرحوصلہ دل کے ساتھ تعلیم کے مراحل طے کرتے ہیں۔ وہ تعداد میں بھی کئی گنے ہیں۔

لہذا ان کے مقابلے میں ہمت شکستہ، افلاس زدہ اور بیزار مسلمان شاذونادر ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ایک ناکامی مزید ناکامیوں کو جنم دیتی ہے۔ مسلمان جب مسلمانوں کو سرکاری دفاتر اور محکموں میں نہیں پاتے تو ان کا دل اور کھٹا ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ملک کی حکومت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ محرومی کا احساس اور علیحدگی کا رجحان اس طرح اور بڑھ جاتا ہے۔ بڑی صنعت اور بڑی تجارت میں بھی ان کا کوئی معقول حصہ نہیں۔ جب تک حکومت کے محکموں میں حکومت کی پالیسی کے باوجود ان کی شرکت برائے نام ہے، تو پبلک سیکٹر یا منظم پرائیوٹ سیکٹر میں انھیں کون نوکری دے گا۔ وہاں اکثر عزیزوں یا ہم ذاتوں یا ہم مذہبوں کو ترجیح دیجاتی ہے۔ یہاں سوال اٹھتا ہے کہ اگر ہندوستانی روزی کمانے کے محدود مواقع کے لئے اکثریت سے مقابلہ نہیں کر سکتے تو کیا انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینا ملک کے اور خود ان کے حق میں اچھا ہوگا۔ ہندوستان خود بحیثیت ایک ترقی پذیر ملک کے ترقی یافتہ ممالک سے مطالبہ کرتا رہا ہے کہ وہ ترقی کی راہ میں اس کی اور دیگر ترقی پذیر ملکوں کی مدد کریں۔ کیا خود ہندوستان کی اتنی بڑی اقلیت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی حکومت سے اور اپنے ملک کی اکثریت سے یہ مطالبہ کرے کہ اس کو سہارا دے کر آگے بڑھائے، بعض سطحوں پر اس کے لئے ملازمتوں کا تحفظ کرے اور اسے ملک کی ہمہ جہت ترقی میں شریک ہونے کا موقع دے۔ ایک سیکولر، جمہوری اور ارتقاپر داختہ ملک کو خود اس کا انتظام کرنا چاہیئے کہ اس کا ایک بڑا طبقہ پس ماندہ اور غیر مطمئن نہ رہے۔ کیونکہ اگر وہ پسماندہ رہا، تو ملک کی ترقی میں اس کا عنان گیر ہوگا۔ ترقی اور خوشحالی دونوں ناقابل تقسیم ہیں۔

یہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا ذکر تاریخی اور وطنی پس منظر میں کیا گیا تھا، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کی زبوں حالی کی ذمہ داری دوسروں پر ہے۔ شکوہ دراصل خود سے کرنا چاہیے:

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم ∴ کہ با من آنچہ کرد آں آشنا کرد

اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف مسلمان والدین بالعموم توجہ نہیں دیتے۔ تعلیم کی فیس داخل کر دی اور مطمئن ہو بیٹھے۔ یہ ذکر ان کا ہے جو استطاعت رکھتے ہیں۔ کثیر تعداد ایسی ہے، جن کی مالی حیثیت انھیں اس کی اجازت ہی نہیں دیتی کہ بچوں کو اسکول بھیج کر ان کی قبل از وقت کمائی سے گھر کو محروم کر دیں۔ یہاں پیٹ کاٹنا ہوگا، ورنہ اس بچے کا مستقبل اس کی نشوونما کیا، جو مزدوری میں لگا دیا گیا۔ تعلیم اگر گھر گھر نہ پہنچی تو فلاح کے دروازے ہمیشہ بند رہیں گے۔ ہمارا اوّلین فرض ہے کہ پیام تعلیم کو عام کر دیں۔ جہالت میں نہ دنیا کی فلاح ہے، نہ دین کی۔ جو لوگ پڑھ لکھ گئے ہیں اگر انھوں نے علم دوسروں تک نہ پہنچایا، تو وہ بیک وقت بے حسی اور کفران نعمت کا ارتکاب کریں گے۔ ہمارا بنیادی

اور اہم ترین مسئلہ ہے تعلیم کی اشاعت ۔ اسی سے دوسرے امراض کا مداوا ہوگا اور ترقی کی نئی نئی راہیں کھلیں گی۔
مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دیکھتے ہیں تو دل میں یہ ہوک اٹھتی ہے کہ یا الٰہی مسلمانوں میں کوئی دوسرا رہنما
سید احمد خاں کے قد و قامت اور بصیرت کا کیوں پیدا نہ ہوا۔ سیاسی رہنماؤں کی ہمارے یہاں کثرت رہی ہے
لیکن سماجی رہنما اور رضاکار ناپید ہیں۔ تعلیم کی اشاعت بڑی خشک چیز ہے، اس میں نہ اقتدار نہ شہرت، نہ
زبان کا چٹخارہ ۔ اس میں ریاضت درکار ہے، پِتّہ مارنا پڑتا ہے اور اس کے ہم عادی نہیں ۔

ایسا لگتا ہے کہ اسلاف کی مہم جوئی اور خطر طلبی، ریاضت اور ذوق علم کے ردّ عمل کے طور پر ہم نے
تن آسانی اور عشرت کوشی، کاہلی اور جہالت کے اندھیرے میں بسیرا لیا ہے ۔ ہم میں اس کی صلاحیت نہیں رہی
کہ کسی بڑے اور دیر طلب کام کو منصوبہ بنا کر انجام دے سکیں ۔ دل لگا کر یکسوئی کے ساتھ کوئی کام کر سکیں ۔ ہمارا طریقہ
یہ ہے کہ سوتے سوتے بیدار ہوئے ۔ تھوڑی دُور دوڑے، پھر سو گئے ۔ دیر تک دوڑنے کا ہم میں دَم نہیں ۔ جم کر
محنت کرنے، لگاتار ریاضت کرنے کا ہمیں یارا نہیں ۔

غزل ہمارے مزاج کی آئینہ دار ہے۔ بلکہ اس کی تشکیل میں بھی اس کا حصّہ ہے ۔ ناول، منصوبہ،
نقشہ یا پلاٹ ہم تیار نہیں کر سکتے ۔ تسلسل ہم دیر تک قائم نہیں رکھ سکتے ۔ نصاب میں سائنس اور ریاضی سے
ہمارے بچے ایک عرصے تک دامن بچاتے تھے کہ اُن میں یکسوئی اور لگاتار محنت کی ضرورت پڑتی ہے ۔ خدا کا شکر ہے
کہ اب اس میں رجحان میں کمی آرہی ہے ۔

مسلمانوں نے مختلف شہروں میں اسکول قائم کیے ۔ لیکن کچھ مستثنیات کو چھوڑ کر، اور اس مستثنیات
میں اب اضافہ ہو رہا ہے، ان کا معیار اب اچھا نہیں ۔ ان اسکولوں کی اصلاح کے علاوہ ضرورت اس بات کی ہے
مسلمان بچے بڑی تعداد میں اچھے عام اسکولوں میں داخل ہوں۔ جو آزادی اور آلاتی وسائل ان اسکولوں اور کالجوں
کو حاصل ہیں، ان سے فائدہ اٹھائیں ۔ ممتاز اور بااثر شہریوں کو اس کام میں ہاتھ ڈالنا چاہیے ۔ وہ عام اداروں
کے سربراہوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، ان سے اپیل کر سکتے ہیں ۔

تعلیم ہی نہیں، ترقی کی دوسری مدوں میں پلان کے تحت جو سرمایہ کاری ہوتی ہے، مسلمانوں نے کچھ تو
لاعلمی، کچھ بےحسی اور کچھ کاہلی کی بدولت اس سے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے ۔ آبادی میں تناسب کے بقدر فائدہ
اٹھایا ہوتا، تو کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہوتے ۔ عام اسکولوں کے نصاب میں بعض ایسے سبق داخل کر لیے گئے تھے
جن سے مسلمانوں کی تصویر بگڑ کر سامنے آتی تھی ۔ ایسا نفاق انگیز مواد نصاب کی کتابوں سے نکالا گیا ہے اور نکالا جا رہا ہے۔

یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک طرف سے نکالا گیا، دوسری طرف سے پھر داخل ہو گیا۔ یہ کیا کوئی بات ہوئی کہ ہمارے خلاف غلط باتیں پھیلائی جائیں اور ہم خاموش رہیں یا یہ کہہ کر کہ "ہماری بلا سے" دم سادھ لیں۔ ضرورت جو کسی اور ہر کتابچے کی ہے، ورنہ وہ دن دور نہیں جب اہل وطن کے علاوہ خود ہمارے بچے ہمیں حقارت سے دیکھنے لگیں گے۔ کاش کہ مرحوم ظفر احمد صدیقی صاحب کی طرح ہر ریاست میں ایک جری، حق پسند اور بیدار مغز پیدا ہو جائے جو اس فتنے کا سدباب کر سکے۔ صریح الزام تراشی اور دشنام طرازی سے بھی زیادہ خطرناک زاویہ نگاہ اور افتادِ طبع ہے جو سطروں کے درمیان چھپی رہتی ہے جس پر کوئی انگلی رکھ ہی نہیں سکتا۔ اس طرح کی اسلام دشمن کتابوں نے بھی مسلمان بچوں کو بعض اوقات عام تعلیمی اداروں سے دور رکھا ہے۔ مگر ان اداروں سے دور رہنا نہ مسلمانوں کے لئے اچھا ہے نہ ملک کے لئے۔ گھر کے علاوہ اسکول میں ہی بچے، اپنے گردوپیش، اپنے ہمسایوں اور اپنے ہم وطنوں کے متعلق رائیں قائم کرتے ہیں۔ بڑی بدقسمتی ہوگی اگر کتابیں نقطۂ نظر کی صحت میں حائل ہو جائیں، یا ان کی وجہ سے محبت، رواداری اور صلح و آشتی کے بجائے کدورت اور عداوت دلوں میں راہ پائے۔ جن لوگوں نے نفاق انگیز مواد نصاب میں داخل کیا وہ ملک کے دشمن ہیں۔ انھوں نے عداوت اور نفرت کا بیج بویا ہے۔

اعلیٰ تعلیم میں امتیاز کے لئے عام تعلیم کی چوڑی اساس درکار ہے۔ زیادہ تعداد میں اگر بچے تعلیم کے حلقے میں داخل ہو جائیں، تو ان میں ممتاز لائق اور عہد آفریں لوگ بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر اساس تنگ ہے تو معیار بلند نہ ہو پائے گا اور نہ وہ باخبر رائے عامہ پنپ پائے گی جو ایک صالح اور ترقی پذیر سماج کو جنم دیتی ہے اور جو ظلم اور ناانصافی کا راستہ روک سکتی ہے۔ ہم کچھ تو جہالت اور کچھ نفاق کی وجہ سے رائے عامہ کے فیوض سے محروم ہیں، جب ہی تو برائیاں سینہ تانے ہوئے آگے بڑھ رہی ہیں اور اچھائیاں منہ چھپائے ہوئے ہیں۔ نہ ہم اپنوں کی اصلاح کر سکتے ہیں، نہ دوسروں کو اصلاح پر مجبور کر سکتے ہیں۔ رائے عامہ تعلیم کی توسیع سے بنتی ہے۔

تعلیم کی ناہمواری نے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ انھیں دو گروہوں میں بانٹ دیا ہے۔ پہلا طبقہ تو وہ ہے جس نے مدارس میں دینی تعلیم حاصل کی ہے۔ دوسرے طبقے نے عام اسکولوں میں جدید علوم حاصل کیے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک بڑی خلیج حائل ہے۔ ایک نے دین کا دامن پکڑ لیا۔ دوسرے نے دنیا سے ناتا جوڑ لیا۔ ایک دوسرے سے بیگانہ، بے نیاز، بے خبر۔ نتیجے میں ملت دو نیم ہو گئی۔ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ جماعت کے لئے دو نیم ہونا اتنا ہی مہلک ہے جتنا فرد کے لئے۔ شخصیت کی سالمیت اس طرح تباہ ہو جاتی ہے۔ شخصیت پراگندہ ہو تو نہ افعال میں توازن ہوگا، نہ حرکات میں ٹھہراؤ، نہ نیک و بد کا شعور، نہ گردوپیش کا

ادراک، نہ متحد ہو کر قدم اٹھانے کی صلاحیت ۔ ہمارا اس وقت یہی حال ہے
دین کو ہم نہیں چھوڑ سکتے، کہ اگر دین نہیں تو ہم کہاں ؟ ہماری انفرادیت ختم! دنیاوی تعلیم سے ہم منھ نہیں موڑ سکتے کہ ترقی اور خوش حالی اور انسانی ذہن کی تسخیرات سے بہرہ یابی اس کے بغیر ممکن نہیں۔ چارۂ کار صرف یہ ہے کہ ان دونوں تعلیمی دھاروں کو باہم قریب تر لایا جائے ۔ دینی مدارس کا ڈھانچہ کچھ اس طرح ہو کہ ایک تو اس میں جدید تعلیم کو کچھ نہ کچھ شامل کیا جا سکے ، دوسرے دینی تعلیم پائے ہوئے طلبا کے لئے جدید تعلیمی اداروں میں داخل ہونے کی راہیں کھلی رہیں ۔ اسی طرح عام یا جدید اسکولوں کے طلبا کے لئے دین اور اردو زبان کی جز وقتی تعلیم کا انتظام محلہ محلہ، مسجد مسجد کیا جائے ۔ کام بہت بڑا ہے ۔ لیکن چھوٹے چھوٹے پیمانے پر شہر شہر، بستی بستی کیا جا سکتا ہے ۔ مذہبی مدارس کے درسی نظام میں تبدیلی کی طرف توجہ وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے ۔ بشیر الحق نے اپنی کتاب Islam in secular India میں دکھایا ہے کہ درس نظامی میں دیوبند نے جو تبدیلی کی وہ اس لحاظ سے زمانے کے تقاضوں کے برعکس تھی کہ نصاب کا دنیاوی اور عملی اور کاروباری عنصر نکال دیا گیا اور نصاب کو صرف مبلغین اور علما کی ضروریات کے مطابق ڈھال دیا گیا ۔

سائنس اور ٹکنالوجی میں ہندوستانی مسلمانوں کے پچھڑے پن کو دور کرنے کے لئے ادارے کھولنے چاہئیں ۔ جنوبی ریاستوں نے اس بارے میں پہل کی ہے ، شمالی ریاستوں کے مسلمان سبق لیں ۔ دراصل ادارے کھولنے سے بھی زیادہ اہم ان کا ڈھنگ سے چلانا ہے ۔

تعلیم کا اصل مقصد تہذیب نفس ہے ۔ تعلیم سے انسان میں شعور پیدا ہوتا ہے ۔ اس کے اخلاق و اطوار کی صفائی ہوتی ہے ۔ وہ ماحول اور گرد و پیش سے باخبر ہوتا ہے ۔ علاوہ بریں تعلیم کا رشتہ روزگار سے جڑا ہوا ہے ۔ جو طالب علم ڈھنگ سے محنت کرتے ہیں ان پر کسب معاش کی راہ کھل جاتی ہے ۔ سرکاری اور بہت سی غیر سرکاری ملازمتوں میں داخلے کے لئے مقابلے کے امتحانات اور انٹرویو ہوتے ہیں ۔ اس کام کے لئے مرکز اور ریاستوں، ریلوے اور بنکوں وغیرہ نے کمیشن قائم کر رکھے ہیں ۔ مسلمان جو تعلیم میں یوں ہی پیچھے ہیں اور سرکاری محکموں میں جن کی نمائندگی بہت کم ہے ، ان کے لئے یہ بات اہم ہے کہ وہ ملک میں ہونے والے بے شمار مقابلوں کے امتحانوں کے لئے رہبری کے تحت ان تھک محنت کے ساتھ تیاری کریں ۔ اس سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے پہلا قدم اٹھایا تھا ۔ جنوبی ریاستوں میں کہیں کہیں یہ کام شروع ہو گیا ہے ، لیکن یہ ساری کوششیں ضرورت کو دیکھتے ہوئے ابھی تک بہت کم ہیں ، بلکہ نہ ہونے کے برابر ۔

روزگار کا ذکر آگیا ہے تو اہل حرفہ کا تذکرہ بھی ہو جائے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ مسلمان اہل حرفہ ہنرمند ہیں۔ لیکن ان کے دست دولت آفریں کو تخلیق جمال کے لئے مزدوری کا اس طرح ملتی ہے جیسے اہل ثروت غریبوں کو زکوٰۃ دیتے ہیں۔ انھیں وسائل، تعلیم اور سامان اور ان کے ہنر کو صیقل درکار ہے۔ ان کی شیرازہ بندی کرنا، انھیں مہاجن کے چنگل سے اور تقلید کے شکنجے سے نکالنا، ان کے لئے نئے ڈیزائن اور اچھا خام مواد اور بازار کے امکانات فراہم کرنا، ایک ٹھوس قدم اصلاح اور پیشرفت کا ہوگا۔

جہالت بہت سی سماجی برائیوں کو جنم دیتی ہے اور معاشرتی اصلاح میں سدّ راہ ہوتی ہے جہالت اور اختلاط کے زیر اثر خوبیاں برائیوں میں بدل جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کی رسائی براہ راست اور بلاواسطہ اپنے خالق تک ہے۔ رذالت کے دور میں انسان کی خوداعتمادی اور عزت نفس نخوت اور انانیت میں تبدیل ہوگئی۔ چنانچہ ہم لوگ انا و لا غیری کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ہماری انا کو ذرا سی ٹھیس پہنچ جائے تو ہم بڑے سے بڑے مقصد، اہم سے اہم ادارے، قریب سے قریبی دوست کو تباہ و برباد کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ یہی انا ہے جو ہمیں کسر نفسی سے روکتی ہے۔ جو ہمیں ادارے چلانے اور مل کر کام کرنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتی ہے۔ ہم ساری اہمیت اپنی ذات کو دینے لگتے ہیں۔ سماج کی بھلائی کی ہمیں مطلق پرواہ نہیں رہتی۔ اسی کارن ہمارا معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا، نہ برائیوں سے دامن چھڑا سکتا ہے۔

حسد کی جاں سوز کونپل بھی انانیت کی ٹہنی سے ہی پھوٹتی ہے۔ حاسد کسی دوسرے کو پنپتے نہیں دیکھ سکتا۔ پھلنے پھولنے والا اگر حاسد سے نسبی رشتہ یا ہمسائیگی کی قرابت رکھتا ہے، تو حسد کی لَو اور زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ حاسد دوسروں کے درپے آزار رہتا ہے اور خود کو بھسم جلاتا ہے۔ حسد اتحاد کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں یہ بیماری بہ نسبت دوسری ہندوستانی قوموں کے زیادہ پائی جاتی ہے۔ ہمارے سماج کو یہ روگ گھن کی طرح لگ گیا ہے۔ ہم ملک کی دوسری قوموں کو دیکھتے ہیں کس طرح وہ اپنے عزیزوں اپنے محلے یا ذات برادری والوں یا اپنے ہم مذہبوں کو تعلیم و تربیت اور روزگار تک دلا دیتے ہیں اور مسلمان: وہ اقتدار پاتے ہیں، اختیار کو پہنچتے ہیں، آرد کے آٹے کی طرح لب پھٹنے لگتے ہیں۔ ان کے خاندان کا مفہوم اتنا ہی محدود اور حقیر ہوتا ہے، جیسا اہل مغرب کا یعنی میاں بیوی اور بچّے۔ یہ سب انفرادیت کا تاریک پہلو، حسد کا ثمرہ اور نااتفاقی اور غیر ذمّہ داری کا نتیجہ ہے۔

ایمان کی شکل بگڑی تو وہ غور و فکر کے لئے سمِّ قاتل بن گیا۔ نشیب و فراز پر غور کرنا معیوب ٹھہرا،

متروک ہوا۔ حکومت ہاتھوں سے گئی، تو شکایت زبان پر آگئی۔ لیل و نہار اور ابنائے روزگار کا شکوہ عادت بن گیا۔ نبرد آزمائی اور جہانگیری کا یارا نہ رہا تو خانہ جنگی اختیار کر لی۔ قناعت و توکل سے حوصلہ کی یاوری ہوتی تھی، استقامت کو پشتہ ملتا تھا اور ارادے میں بے خوفی آتی تھی۔ اب ان ہی نے قویٰ کو مفلوج اور عزم کو معطل کر دیا۔ بزرگانِ دین کے احترام نے قبروں کی پرستش کا روپ دھارا۔ صحت سند اور بیدار مغز اطاعت شعاری اندھی تقلید بن کر رہ گئی۔ سچ ہے بُرے دن آتے ہیں تو اچھائیاں برائیوں میں بدل جاتی ہیں۔ اس نقلِ ہیئت کا باعث رجعت کا عمل ہوتا ہے۔

اسلام صحرانشینوں کے عزائم کے جلو میں دنیا میں پھیلا تھا، وہ صحرانشیں جو سادہ مزاج، پُرحوصلہ، تازہ دم اور روئیں تن تھے۔ انھوں نے اسلام کو سادہ، پاکیزہ، بے میل، انقلاب آفریں پایا۔ اس دستورِ حیات، اُس منشورِ عمل کو سینہ سے لگایا اور اُسے ساتھ لے کر چار دانگ عالم میں کلمۂ حق بلند کیا۔ ایران کے راستے سے جب مسلمان ہندوستان میں آئے، تو وہ تکلفات، توہمات، آسائش طلبی، خانہ نشینی، عیش کوشی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ یہ رنگ یہاں گہرا ہوتا چلا گیا، جسے مطلق العنان حکومت اور جاگیردارانہ نظام نے اور چمکایا۔ اخوت اور مساوات کے رشتے کمزور ہو گئے، اور حریت نے غلامی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ قوموں میں داد و ستد کے طریقے بھی نرالے ہوتے ہیں۔ وہ باتیں بلا تامل اختیار کر لی جاتی ہیں جن میں آسائش یا کشش ہو۔ مسلمانوں نے یہاں کے دیرینہ باشندوں سے وہی باتیں سیکھیں جو طبیعتوں کو بھاتی تھیں، دیدہ زیب تھیں یا آسائش آفریں لیکن ہندوؤں کی سادگی اور محنت اور فکر کی پرواز کی طرف توجہ نہ کی۔ گرم خون کو ٹھنڈا ہوتے ہوتے آہنی عزم کو کمزور ہوتے ہوتے وقت لگا اور جب ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا، تو اخلاقی انحطاط اور عیش کوشی کے دروازے کھل گئے، مسلم معاشرے کو گھن لگنا شروع ہو گیا۔ یہ سماج تن آسانی اور کاہلی، نکتہ چینی، حسد اور بدگوئی، تفاخر، خود غرضی اور بے عملی کی رسیوں میں جکڑ گیا۔ مذہبی اصلاح کی تحریکیوں نے گراوٹ کو روکا اور اعلیٰ انسانی اقدار کی اشاعت کی، مگر اس کا اثر دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا سماج ہنوز روبہ زوال ہے۔ عام ہندوستانی سماج کو بھی روگ لگا ہوا ہے، لیکن مسلمانوں کا معاشرہ زیادہ سرعت کے ساتھ زوال کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ بے ایمانی دونوں جگہ مشترک ہے۔ لیکن انفرادی خود غرضی اور ریاضت فراموشی میں مسلمان ہندوستان کی دوسری قوموں سے کہیں آگے ہیں۔ سماجی خدمت اور اجتماعی کوشش کی روایت مسلمانوں کے یہاں بہت ضعیف ہو چکی ہے۔ نفسی نفسی کا عالم ہے۔ یہاں وصل کی فکر کسی کو نہیں ہے، "لوگ فصل کے نغمہ سرا ہیں"۔

تن آسانی اور عیش کوشی کے زیر سایہ ذہنوں کو زنگ لگ گیا ہے اور ان ہی کے زیر سایہ زندگی سے متعلق ایک سرسری طرز نگاہ مسلمانوں کا طرۂ امتیاز بن گیا ہے۔ وہ محنت اور سادگی اور صفائی اور صبر وضبط کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ صبح کو دن چڑھے اٹھنے والوں میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ان کے گھر عام طور پر گندے رہتے ہیں۔ ان میں بہت سے گفتگو میں مبالغہ اور غلو سے کام لیتے ہیں۔ وفا کرنے کے ارادے کے بغیر وعدے کرتے ہیں۔ فضول خرچی پر فخر کرتے ہیں۔ جہالت پر نادم نہیں ہوتے۔ باہم کج بحثی پر اصرار کرتے ہیں۔ چھوٹے سے اختلاف پر آستین چڑھا لیتے ہیں۔ جھگڑنے کے لئے ہمہ وقت مستعد رہتے ہیں۔ اوقات کی تضیع میں ان کی کوئی نظیر نہیں۔ مذہب کو ذاتی اغراض کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ باتوں کو کہیے تو رات دن کیے جائیں، کام کو کہیے تو دامن بچا جائیں۔ نام خدا کا لیتے ہیں، پوجا کشتی کی کرتے ہیں۔ زر کی جھلک دیکھی اور فرائض منصبی کو چھوڑ چھاڑ اس کے تعاقب میں رواں ہو گئے۔ وعدہ اور وقت دونوں کی پابندی سے بے نیاز ہیں۔ سنجیدگی اور ذمہ داری سے روگرداں ہیں۔ نفس مارنے کے بجائے ڈینگ مارتے ہیں۔ بیگانے ترقی کریں تو یہ مسرور و مطمئن، لیکن اپنے آگے نہ بڑھنے پائیں۔ ان کی ٹانگ کھینچ کر گرا دیں گے۔ ان کی خدمت کے لئے کوئی سرپھرا نکل پڑے، تو طعن و تشنیع اور زبان درازی سے اس کے کلیجے کو چھلنی کر دیں گے۔

ان کے یہاں ایسے لوگوں کی بہت کمی ہے جو پڑھے لکھے اور باخبر اور باشعور ہوں، ان پر مزید بدقسمتی کہ ایسے لوگ عوام سے اوّلین فرصت میں ناتہ توڑ لیتے ہیں۔ انوکھا BRAIN DRAIN (برین ڈرین)[1] ہے جس سے ہندوستانی مسلمان دوچار ہیں۔ یہ لوگ ملک سے باہر نہیں جاتے، بلکہ ملک میں رہتے ہوئے کسی دوسری اقلیم میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کو اپنے بھائیوں کی خبر بھی نہیں آتی۔ یہ بے غیرت اور حمیت باختہ لوگ اس پر فخر کرتے ہیں کہ ان کا نقطۂ نگاہ عام مسلمانوں سے بالاتر ہے۔ مسلمان عوام کو یہ درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ گویا اگر ان کی طرف ملتفت ہوئے تو ان کے حب وطن، ان کی قوم پرستی پر حرف آئے گا۔ یہ اُن نو دولتوں کی طرح جو غریب باپ کو پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی اصلاح کے لئے بیسویں صدی عیسوی میں اگر کسی نے قدم اٹھایا ہے تو وہ مذہبی جماعتیں ہیں۔ سیاسی جماعتوں سے اس کی امید عبث ہے۔ بہرحال ہندوستانی مسلمانوں کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔ ان کے زوال کی رفتار تیز ہوتی جا رہی ہے۔ چونکہ اہل حرفہ اور مزارعین پہلے کی بہ نسبت

۱۔ ارباب ذہن و شعور کی ہجرت یا کنارہ کشی

،حال ہی اور زیرِ نفت سے بھی کشائش ہو گئی ہے، اس لئے ہندوستانی مسلمان سمجھنے لگے ہیں کہ ان کا حال
ہے! حالانکہ حالت دگرگوں ہے۔ ہندوستان کی زندگی کے ہر شعبے میں اُن کا حصّہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ کسی علمی
کے لئے کوئی مقرّر تلاش کیجیے، تو نتیجہ ہمّت شکن۔ حکومت کے شعبوں اور دفاتر میں مسلمانوں کو ڈھونڈیے
ل سے کوئی نام نظر آئے گا۔ وکلا، اطبّا، صنعت کاروں اور فن کاروں میں بھی ان میں سے کم ایسے ہیں
ناںِ امتیاز تک پہنچے ہوں۔ مفکّروں اور صحافیوں اور دانشوروں اور محققوں کی صفِ اوّل میں مسلمانوں
سے آپ کسے بٹھائیے گا۔ یہ قحط یہ فقدان حکومت کی بے اعتنائی یا اغیار کی مخالفت کی وجہ سے نہیں بلکہ
ہاری غفلت، کوتاہی اور شامتِ اعمال کی بنا پر ہے۔ ایک جمہوری اور سیکولر ملک میں ہم حکومت سے
قوق کا مطالبہ کر سکتے ہیں، ہمیں کرنا چاہیے۔ جستہ جستہ قلم برداشتہ اور دہن کشادہ نہیں، بلکہ متحد
، پیوستہ، متواتر، مسلسل۔ لیکن اپنی بربادی کا الزام ہم حکومت کو نہیں دے سکتے۔ یہ ہمارے اپنے
ت ہیں جو صورتِ انحطاط بن کر سامنے آئے ہیں۔ ہماری قیادت پارہ پارہ ہے۔ اس میں ملک گیر قیادت کا
یا اب سوائے ایک استثنا کے کوئی ایسا بھی نہیں جو ریاستی سطح کی قیادت پر پورا اُترتا ہو۔ ہماری نمائندگی
لوگ دعویٰ کرتے ہیں، وہ اپنی یا آقایان ولی نعمت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اقلیت کی صورتِ حالات میں
نواری چھپی ہوئی ہے کہ اس کی قیادت کو اُبھرنے کے لئے حالات مساعد نہیں ملتے۔ اگر صاف صاف جرأت
باتھ ترجمانی کرے تو حکومت کی نظر میں مشتبہ ہو جائے۔ اگر عقل سے مسائل کو پرکھے اور جذبات سے
نہ کرے، انتہاپسندی کے عوض میانہ روی، جوش کی جگہ ہوش سے کام لے، تو ملت اس کو شمار میں نہ لائے،
اُسے سوءِ ظن کا ہدف بنائے اور قیادت نہ اُبھرے تو اصلاح اور ترقی کے منصوبے کون بنائے۔ ان کو قوت
عمل تک کون پہنچائے۔ یہاں باخبر اور صحت مند رائے عامّہ کی کمی شدّت سے محسوس ہوتی ہے۔

ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ مسلمانوں میں صحتمند قیادت کے اُبھرنے کی ضرورت ہے۔ ایسی قیادت
یازن اور معتدل ہو۔ نہ کاسہ لیس، نہ انتہاپسند۔ مسلمانوں میں تعلیم کو عام کیے بغیر گاڑی آگے نہیں بڑھے گی۔ تعلیم
دنوں مکاتب کو ایک دوسرے سے قریب لانا ہوگا۔ ایک سے دوسرے کو استفادہ کرنا ہوگا۔ مسلمانوں کے
ماجی خدمت کی روایات کو عدم سے وجود میں لانا چاہیے۔ حکومت پر لازم آتا ہے کہ مسلمانوں کو فرقہ وارانہ
نگری اور خوں ریزی سے نجات دلائے۔ اس کے لئے ضروری ہے انتظامیہ کی مضبوطی اور وہ قدم (جس کا حکومت کئی بار اعلان
کر) یعنی پولیس اور پی اے سی میں مسلمانوں کو معتدبہ تعداد میں داخل کرنا۔ آئین یہاں سدِّ راہ نہ ہوگا۔ کیونکہ ایسا کرنا

ملک میں امن و امان قائم رکھنے اور ایک بڑی اقلیت کو اندیشہ اور بے اطمینانی اور خطرے سے بچانے کے لئے ضر
ہے۔ اس کے علاوہ ملازمتوں کی کئی سطحوں میں مسلمانوں کے لئے تحفظ اور اعلیٰ ملازمتوں میں مقابلے کے انتظامات
حکومت پر واجب ہیں۔ اگر یہ دو قدم اٹھائے گئے تو مسلمانوں کے حوصلے اور اعتماد اور وطن عزیز سے ان کی دل
اور اس کی ترقی کے لئے ان کی مساعی میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔

تہذیبی مسائل کا ذکر جستہ جستہ آچکا ہے۔ اس ضمن میں زبان اور ادب کی اہمیت کو کوئی نظرا
نہیں کرسکتا۔ اردو کے متعلق بھی ایک قسم کا جھوٹا سکون اہل زبان کے شامل حال ہے۔ اردو بظاہر نوازی جا
ہے۔ اس کے بولنے اور اس کی قدر کرنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ لیکن اس کے لکھنے اور پڑھنے والوں
اس کے نکتہ سنجوں کی تعداد تیزی سے گھٹ رہی ہے اور بظاہر وہ دن دور نہیں جب اردو زبان کے منہ
ہٹ کر ایک بولی رہ جائے گی۔ اردو کے سلسلے میں بعض ریاستوں نے کچھ اعلانات اور اقدامات کئے ہر
ہمیں ان کی پذیرائی کرنی چاہیے، لیکن اردو کا مسئلہ تب تک حل نہیں ہوگا، جب تک اس کا ناتہ روزگا
نہیں جڑتا اور جب تک کچھ ریاستوں میں اسے لازمی زبان کا درجہ نہیں ملتا۔ لیکن حکومت کے گوشہ نظ
کہیں زیادہ اہم خود اردو والوں کی کوششیں ہونگی۔ اگر گھر گھر، محلے محلے اردو کو بیرون وقت پڑھا
انتظام نہ کیا گیا تو یہ غیر معمولی زبان اپنے متمول اور پُروزن ادب کو آغوش میں لے کر ڈوب جائے گی۔
زبان ہندوستان کی بے مثال مشترکہ تہذیب کی سب سے دلکش علامت ہے۔ اگر یہ ختم ہوگئی تو ہندوس
تہذیب کے تحول اور وقار کو سخت جراحت پہنچے گی اور مسلمان تو اپنے آپ کو اور زیادہ تہی دامن محسوس
کریں گے کہ یہ اُن کے مذہب، تہذیب اور تمدن کی ترجمان بھی ہے۔

زبان سے قطع نظر، ہندوستانی تہذیب کو مسلمانوں نے مالا مال کیا ہے۔ ہندوستانی تہذیب
ہی ہے، جو ایک طرف مقامی اور دوسری طرف ایک عالمگیر تہذیب کے ارتباط کا نتیجہ ہے۔ ہندوستانی تہذیب
ان دونوں ہی کا اعتراف کرنا اور ان سے طاقت اخذ کرنا چاہیے۔ حب وطن برحق، لیکن اس کا یہ مطلب
کہ اخلاقی اقدار آب و گل کے اسیر ہو جائیں۔ ایک مقامی تہذیب کا ایک عالمگیر تہذیب کے ساتھ ارتب
فنون لطیفہ، بلکہ فکر و فلسفہ کے اشجار میں برگ و بار لاتا ہے۔ ہمیں انسان دوستی کا مسلک اختیار کرنا
وطن سے والہانہ محبت، نوع انسان سے محبت کا راستہ نہیں روک سکتی۔

پرانی تہذیبیں اور اخلاقی قدریں، سائنس اور ٹکنالوجی کے انقلابات اور خود غرضی و ہوس

سیلاب کی زد میں ہیں۔ ان کو بچانے کے لئے ہمیں اپنی ملی جلی تہذیب کو توہمات اور الحاقات اور تعصبات سے پاک کرنا ہے، تاکہ دونوں تہذیبوں کا جوہر یعنی ان کی خدا پرستی اور انسان دوستی آلائشوں سے منزہ ہو کر نکھر کر سامنے آجائے۔ اخلاقی قدروں اور انسانیت کے تحفظ کی شکل صرف یہی ہے۔ اگر ہم باہم کدورت لے کر بیٹھے رہے تو ہمارا آئینہ زمانے کے تقاضوں کے انعکاس میں ناکامیاب رہے گا۔

الغرض ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا طرزِ فکر اور زاویہ نگاہ بدلنا ہوگا۔ انھیں کسب فخر کے لئے ماضی کے بجائے حال پر تکیہ کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنے وطنِ عزیز اور اہلِ وطن کے ساتھ اپنے تعلقات کو استوار کرنا ہوگا۔ ہمیں ہندوستان کے سیکولر آئین، اس کی ترقی پسند، مساوات پیکر اور ترقی آمادہ جمہوریت کے لئے ہموطنوں میں امتیاز حاصل کرنا ہے۔ انسان دوستی، اسلام دوستی اور حب وطن میں باہم کوئی مغائرت نہیں۔ ہمارے مسلک کے اجزائے ترکیبی یہ تینوں ہونے چاہئیں۔ رواداری، حلم اور دور اندیشی کو ہمیں اختیار کرنا ہوگا۔ تعصب، زود برہمی اور لمحاتی ردعمل اور خاکسارانہ جوش و خروش سے پرہیز ہم پر بالخصوص واجب ہے۔ تعلیم سے غفلت کا خمیازہ ہم ابھی تک اٹھا رہے ہیں۔ ہمیں اس گناہ کبیرہ کو ترک، اور اس کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ اقتصادی زبوں حالی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہمیں ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جو ذہین طلبہ کو پہچان سکے اور ان کے تعلیمی مصارف کی کفالت کر سکے۔ علاوہ بریں ٹکنیکل اور ووکیشنل (ٹکنیکی، مشغلہ پیوست اور ہنر آموز) تعلیم کی طرف توجہ کو موڑنا ہوگا۔ سماجی معائب میں اسراف، حسد اور نفاق، توہمات، گھمنڈ اور عیش کوشی سے حذر کرنا ہوگا۔ جاگیر دارانہ نظام کی باقیاتِ صالحات سے ہمیں اپنے دامنِ دل کو چھڑانا پڑے گا۔ جمہوریت سے ہمارا رشتہ نازو نیاز اور دادو ستد کا رشتہ ہونا چاہیے۔

میں نے اس مقالے میں ہندوستانی مسلمانوں پر بے دریغ تنقید کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صاف گوئی کا کھری کھری سنانے کا وقت آگیا ہے۔ یہ سارے اعتراضات ہم سب پر عائد ہوتے ہیں۔ میں خود کو ان سے مستثنیٰ کرنے کا گمان بھی نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کے دوسرے فرقوں میں بھی کمزوریاں ہیں، جن میں سے کئی ایک مسلمانوں کی کمزوریوں سے بالکل مختلف ہیں۔ لیکن میرا روئے سخن ان کی طرف نہیں ہے۔ میں اگر انھیں کچھ کہوں گا، تو چھوٹتے ہی بدگمانی کا شکار ہو جاؤں گا اور پھر مجھے اپنوں سے کہاں فرصت کہ بیگانوں کے قدم لوں۔ میری نیت پر شبہ کیا جائے گا، شکایت عداوت پر محمول ہوں گی، نکتہ چینی کو دشمنی تصور کیا جائے گا۔ میں نے مسلمانوں کی خوبیاں بھی نہیں گنائیں کہ میرا مقصد برائیوں اور کمزوریوں کی طرف دھیان اور ان سے

چھٹکارا دلاتا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ پوری ملت ان برائیوں میں شریک ہو، یا برابر کی شریک ہو۔ ہم میں ایسے بھی لوگ ہیں جو ان برائیوں سے بری ہیں۔ لیکن بڑی تعداد میں گہرا رنگ ان ہی کا ہے جن کا نقشہ کھینچنے کی کوشش میں نے ابھی ابھی کی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے زوال کا ایک سبب عورتوں کی زبوں حالی ہے۔ ہماری عورتیں بالکل گھٹی ہوئی رہتی ہیں۔ اس پردے نے جسے مذہب سے کوئی سروکار نہیں، ان کی صحت کو گھائل کر دیا ہے، جسمانی اور ذہنی صحت کو۔ اسیرانہ کم ہمتی ان کی عنان گیر ہوگئی ہے۔ نہ وہ صحت اعتماد اور وسعت نظر کے ساتھ زندگی بسر کر سکتی ہیں اور نہ نئی نسل کو سلیقے سے پروان چڑھا سکتی ہیں۔ جو خود کھو گیا ہو، دوسروں کی رہبری کیونکر کرے گا۔ ہم نے اپنی آدھی آبادی کو مفلوج کر رکھا ہے اور اس کے باوجود فلاح اور ترقی کے خواہاں ہیں۔

مسلمانوں نے سائنس اور ٹکنالوجی سے تعلق قائم نہیں کیا اور نہ ہی ان سے مفاہمت گوارا کی۔ ان کا نقطۂ نظر ہنوز رومانی اور غیر سائنسی ہے، جذبات پر مبنی، عقل سے نفور۔

اقلیتوں کی صورت حال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تین شرطوں کو پورا کیے بغیر کوئی اقلیت پنپ نہیں سکتی۔

(۱) وہ اپنے مسلک، مذہب اور روایات پر سختی سے قائم رہے،

(۲) ان تھک ریاضت کی بدولت خود کو اکثریت سے زیادہ لائق، کارگزار اور بہتر ثابت کرے،

(۳) اکثریت کے ساتھ اپنے تعلقات شگفتہ رکھے۔

ان میں سے ایک شرط بھی اگر پوری نہ ہوئی تو خوش حالی اور ترقی حاصل کرنا محال ہوگا، بلکہ جینے کے لالے پڑ جائیں گے۔ ہمیں اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا ہوگا کہ ہم کس شرط کو پورا کر پائے ہیں؟

شرم کی بات ہے کہ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں بھی لڑکیاں والدین پر بوجھ بننے لگی ہیں۔ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات نہ سہی، توقعات ہونے لگی ہیں اور جنوبی ہندوستان میں تو تحفاً اپنی قیمت لڑکی والوں سے مانگنے لگے ہیں۔ ہندوؤں میں بہت سی دلہنیں جن کے والدین سسرال والوں کے لالچ کو پورا نہیں کر سکے، خود کو آگ میں جلا کر خاکستر ہوگئی ہیں۔ مسلمان ابھی یہاں تک تو نہیں پہنچے لیکن اس راہ میں ان کے قدم پڑنے لگے ہیں۔ شمالی ہند کے مسلمان کھل کر روپیہ ہنوز نہیں مانگتے لیکن زیر لب تو دست سوال دراز کرتے ہی ہیں۔ ہونے والے سمدھیانے کی عقلمندی کی تشفی اشارہ سے کرتے ہیں۔ جنوبی ہند کے مسلمانوں کو تو یہ لعنت پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ ایک عنوان سے لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ مسلمانوں کے یہاں زیادہ سنگین ہے۔ کیونکہ ان میں تعلیم یافتہ اور برسرروزگار

لڑکوں کی تعداد تعلیم یافتہ لڑکیوں کے تناسب سے دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ کسی شہر یا قصبے پر نظر ڈالئے، بہت سے مسلمان گھروں میں ایسی لڑکیاں ملیں گی جو بن بیاہی بیٹھی ہوئی ہیں۔ ایسے بر جو ان کے لئے موزوں ہوں، نہیں ملتے۔ معاشرہ عبوری دَور میں ہے۔ بچوں کی شادیاں ابھی تک ماں باپ کرتے ہیں۔ لڑکیاں سنجیدگی اور محنت کے ساتھ پڑھتی ہیں اور کامیاب ہوتی ہیں۔ ہمارے لڑکے اتنی محنت نہیں کر پاتے، اگرچہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ نہ کریں۔ علاوہ بریں وہ محنت بھی کرلیں تو کیا، گھر کا اور محلے کا ماحول تعلیمی پیش رفت میں سدِّراہ ہوتا ہے۔ تعلیم پوری کرتے ہیں، تو روزگار کے بیشتر دروازوں کو بند پاتے ہیں۔ وہ لڑکیاں جنھوں نے ماں باپ کے گھر اخلاق اور تہذیب کے لحاظ سے خاصی معیاری زندگی گزاری ہے، کس طرح نکھٹو اور نکمے اور ناقص العمل لڑکوں کے گلے باندھ دی جائیں۔ ہمارے نوجوانوں میں اگر وہ شئے "حمیت نام ہے جس کا" ذرا بھی باقی ہے، تو انھیں مسلمان لڑکیوں اور ان کے ماں باپ کو اس تشویش اور پریشانی سے بچانا چاہیے جو اچھے لڑکوں کے قحط نے پیدا کر دی ہے۔ اس کا طریقہ صرف ایک ہے، باقاعدہ محنت۔ وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں ملازمتیں ہیں، خواہ سرکاری، خواہ غیر سرکاری، اگر ہمارے نوجوانوں کی طرف سے یوں مطمئن ہو جائیں کہ وہ زیادہ دیانت دار اور محنتی کارگزار ہیں، تو وہ انھیں لینے پر بالآخر مجبور ہو جائیں گے۔

مذکورہ صورت حال نے دو انوکھی مشکلات ہمارے لئے پیدا کر دی ہیں۔ چونکہ ہمارے لڑکوں کو دفاتر میں ملازمتیں بہت کم ملتی ہیں اور پڑھ لکھ کر وہ اکثر مدتوں بیروزگار رہتے ہیں، اس لئے مسلمان والدین اپنے بچوں کو جدید تعلیم ذوق وشوق کے ساتھ نہیں دے پاتے۔ بنابریں تعلیم کی توسیع کی رفتار ہمارے یہاں اطمینان بخش نہیں ہے اور وہ طبقہ جس کے ہاتھ میں ہنر ہے یا جو محنت کش ہے، وہ یہ دیکھتے ہوئے کہ پڑھ لکھ کر لڑکے کسی کام کے نہیں رہتے، اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دینے سے گریز کرتا ہے کیا یہ بہتر نہیں کہ بچے اوائل عمر سے کمانے لگیں اور پڑھ جائیں تو پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ کمائیں؟ جتنی بار وہ طبقہ یہ سوال خود سے کرتا ہے جواب اثبات میں پاتا ہے۔ اس جواب کے آگے تعلیم کے فوائد پر تقریر سننے کے لئے کون تیار ہوگا۔ تعلیم کے سرے پر روزگار صرف اس لئے اہم نہیں کہ وہ نہ ملا، تو کھائیں گے کیا؟ بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ اگر ہمارے بچے تعلیم پاکر بڑی تعداد میں ملازمتوں سے محروم رہے، تو پھر انھیں پڑھوانے کا شوق ان کے والدین میں کیونکر پیدا ہوگا۔ لاکھ جتن کیجیے، اس چکّر سے کیسے نکلیے گا؟ تعلیم کا رواج گھر گھر نہ ہوگا، تو دوسرے طبقوں سے ملازمتوں اور کاروبار کے لئے مقابلہ کیسے کیجیے گا؟ اور جب تک ملازمتیں نہیں ملتیں، والدین کو اس بات کے لئے کیسے

راضی کیسے ہوگا کہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر بے مصرف اور بیروزگار بنا دیں۔

بیسویں صدی کے دوسرے ربع سے مسلمان والدین نے اپنی لڑکیوں کی تعلیم کی طرف قدرے توجہ کی۔ مستثنیات کو چھوڑ کر یہ توجہ اس بنا پر تھی کہ رشتے چاہنے لگے تھے کہ بیوی پڑھی لکھی آئے۔ اب یہ عالم ہو گیا ہے کہ زیادہ پڑھی لکھی لڑکیوں کو اچھے برسرِ روزگار رشتے نہیں ملتے۔ اگر حالت یہ رہی تو لڑکیوں کی پڑھائی پر پھر دھکا پہنچے گا۔ پہلے تعلیم کی کمی لڑکیوں کی شادی میں سدِّ راہ تھی اور اب ایک حد تک تعلیم کی زیادتی۔ کیونکہ مسلمان لڑکیاں کیریر کی طرف بہت کم جاتی ہیں۔ غریب ماں باپ سارا روپیہ صرف کرا کر پڑھا لکھا گئیں اور پڑھا لکھا برسرِ روزگار بر بھی نہیں ملا، تو کیا حاصل ہوا۔ روایت انھیں نوکری کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ورنہ ملازمت کے دروازے پر دستک دیتیں قطع نظر اس سے کہ دروازہ کھلتا بھی ہے کہ نہیں۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے حالات سے مجبور ہو کر خود کو گرہوں میں باندھ لیا ہے، اور ابنائے وطن بے نیازی سے انھیں دیکھ رہے ہیں کہ انھیں اپنی آگ میں جلنے دو۔ نہ مسلمانوں کو بے حسی اور بے عملی زیب دیتی ہے اور نہ ابنائے وطن کو بے نیازی اور بے تعلقی۔ مسلمانوں کے مسائل جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، کچھ تو دوسرے اہلِ وطن کے ساتھ مشترک ہیں۔ کچھ ان کے مخصوص مسائل ہیں۔ لیکن ان کے مسائل چاہے مخصوص ہوں، چاہے مشترک، ہیں سارے ہندوستان کے مسائل۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے ہندوستان کے سارے باشندوں کو مل کر جتن کرنے چاہئیں کہ سب کی عافیت اور فلاح اسی میں ہے۔ ہندوستان کے جسم میں مسلمانوں کی حیثیت ہاتھ یا ٹانگ کی سی نہیں کہ ٹوٹ جائے یا کٹ جائے، پھر بھی جسم اپنا کام کرتا رہے گا۔ ان کی حیثیت اعضائے رئیسہ میں ایک عضو کی ہے کہ اس کے خلل پذیر ہو جانے کے بعد جسم صحت مند نہیں رہ سکتا۔ مسلمانوں کی پس ماندگی کی بیشتر ذمّہ داری خود مسلمانوں پر ہے۔ لیکن باقی اہلِ وطن خصوصاً ہمارے ہندو بھائی اس ذمّہ داری سے بالاتر نہیں۔ جمہوریت جو ذمّہ داریاں عاید کرتی ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ سب شہریوں کی خوش حالی اور پیش رفت کے لئے کوشش کی جائے۔ کیونکہ اگر کوئی ایک فرقہ یا طبقہ پس ماندہ رہتا ہے، تو جمہوریت کی بنیادیں ہلنے لگتی ہیں۔ اکثریت سے کہے تو یہ لازم ہے کہ اقلیتوں کو ترقی اور خوش حالی کی دوڑ میں اپنے ساتھ لے کر چلے۔ حکومت سے مطالبہ کرنے کا جہاں تک تعلق ہے یہ ہر فرد اور ہر طبقے کا حق ہے۔ اقلیت کے مطالبات پر حکومت کو کان دھرنا چاہیے کہ جمہوری طرزِ حکومت کی آزمائش یہیں ہوتی ہے۔ لیکن حکومت کی توجہ سے کہیں زیادہ اہم اکثریت کا التفات اور اس کی ہمدردی ہے۔ بغیر اس کے حکومت کے فرامین اور احکام زیبِ قرطاس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اکثریت کو چاہیے کہ اپنے افراد میں ایک فضا، ایک رجحان، ایک نقطۂ نظر اقلیت کے ساتھ کشادہ دلی

ہمدردی اور اعانت پیدا کرے۔ یہ فرض اکثریت کا ہے اور اسی کو اسے نبھانا ہے۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کا فرض ہے کہ اکثریت کے ساتھ خیرسگالی، خوش دلی اور شگفتگی کے روابط استوار کریں۔ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ مسلمان جذباتی ہیں، جوش کی رَو میں بہہ جاتے ہیں اور جوش میں ان کے اکثر رہنما، ان کے دیرپا مفاد کو بھول جاتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں ایسا موڑ آگیا ہے، جہاں انھیں صورت حالات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا اور بدلتے ہوئے حالات سے خود کو ہم آہنگ کرنا چاہیے۔ نئی دنیا اور اس دنیا میں اپنی نئی حیثیت کے مضمرات اور عواقب کو سمجھنا اور اپنے رویے اور زاویۂ نگاہ اور اندازِ مزاج کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا بہت ضروری ہے۔ ماضی کے طواف، تن آسانی، خوش خرامی، انتہا پسندی، جذباتیت پرستی اور اَنا کو چھوڑ کر مستقبل کی تشکیل، جفاکشی، میانہ روی، عقلیت پسندی، کو شعار بنانا چاہیے۔ جہالت کی جگہ علم، طغیانی کی جگہ حلم، انفرادیت کی جگہ اجتماعیت کو دینی ہوگی۔ مل کر کام کرنے، ایک دوسرے پر اعتبار کرنے، ڈھنگ سے ادارے چلانے اور انسانیت کی خدمت پر خود کو آمادہ کرنے میں ہی بقا ہے۔ یہ دور سخت مقابلے اور اجتماعی کوشش کا دور ہے۔ جو قومیں قدم ملا کر اور سر جوڑ کر چلتی ہیں، وہی آگے بڑھتی ہیں۔ ترقی کے لئے کوئی چھوٹا راستہ آج تک نہیں نکلا۔ عیش کوشی کو انحطاط سے کوئی جُدا نہ کر سکا۔ نفاق سے زوال کا تانا نہ ٹوٹا ہے، نہ ٹوٹے گا۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اگر عزت کے ساتھ رہنا ہے تو تحصیلِ علم، اتحاد اور انتھک کوشش کے بغیر کام نہ چلے گا۔

(ڈاکٹر سیّد عابد حسین میموریل لکچر) ●●

دینا نہ دینا

ایک مالدار آدمی نے پوچھا: "دینا کسے کہتے ہیں؟" جواب ملا: "جب تم اپنی دولت میں سے دیتے ہو تو برائے نام دیتے ہو مگر جب تم اپنے میں سے دیتے ہو، تو کچھ دیتے ہو۔"

وہ لوگ بھی ہیں جن کے پاس بہت کچھ ہے اور وہ اس میں سے تھوڑا سا دیدیتے ہیں۔ وہ دیتے اس لئے ہیں کہ لوگ جانیں۔ ان کے من میں چھپی ہوئی یہ خواہش ان کے دینے کو اکارت کر دیتی ہے۔

ایسے لوگ بھی ہیں، جن کے پاس بہت کم ہے اور وہ سب کچھ دے ڈالتے ہیں۔ یہ گروہ زندگی اور اس کی فیاضی میں اعتقاد رکھتا ہے، اس کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔

وہ لوگ بھی ہیں جو خوشی خوشی دیتے ہیں، یہی خوشی ان کا انعام ہے۔

ایسے لوگ بھی ہیں جو تکلیف کے ساتھ دیتے ہیں۔ یہ تکلیف ان کا بپتسمہ ہے جو ان کو اخلاص کے حلقہ میں لے آتی ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دیتے ہیں اور دیتے ہوئے نقصان یا تکلیف محسوس نہیں کرتے وہ خوشی کی تلاش بھی نہیں کرتے؛ دیتے ہوئے انھیں۔ احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کوئی کام ثواب کا کر رہے ہیں۔ وہ اس طرح دیتے ہیں جیسے سامنے کی وادی میں وہ لہلہاتا ہوا پھولدار پیڑ جو اپنی خوشبو ہوا میں بکھیر رہا ہے۔ ایسے دینے والے کے ہاتھوں سے پروردگار کی مشیت ظاہر ہوتی ہے اور ان ہی کی آنکھوں کی اوٹ سے وہ دنیا پر مسکراتا ہے۔

مانگنے پر دینا اچھا ہے، پر بنا مانگے دینا اس سے بڑھ کر ہے۔

تمہارے پاس جو کچھ ہے، ایک نہ ایک دن وہ سب کچھ دے دیا جائے گا۔۔۔ اس لئے ابھی دے ڈالو جبکہ دینے کا موسم تمہارے ہاتھ میں ہے، تمہارے وارثوں کے نہیں۔

تم کہتے ہو: "ہم دیں گے ضرور، لیکن صرف ان کو جو دراصل مستحق ہیں۔"

تمہارے باغ کے پیڑ تو یہ نہیں کہتے۔ اور نہ ہی تمہاری چراگاہ میں بھیڑوں کے گلے یہ کہتے ہیں۔ وہ تو اس لئے دیتے ہیں کہ وہ زندہ رہیں، دینا زندگی ہے؛ مٹھی بند کر لینا، نہ دینا موت ہے۔

اور تم ہوتے کون ہو کہ لوگ تمہارے سامنے اپنے جگر کو چاک کر کے دکھاتے پھریں اور اپنی انا کا جامہ تمہارے سامنے اتار پھینکیں، تاکہ تم ان کی اہلیت کو برہنہ اور ان کے انکسار کو بے حجاب دیکھ سکو۔

پہلے اپنی خبر لو۔ بننا ہے تو دینے والے بنو، یا دینے کا ایک وسیلہ بن جاؤ۔ تم کیا دو گے؟ یہ صرف زندگی ہے جو زندگی کو دیتی ہے، یا دے سکتی ہے۔ تم ناحق سمجھتے ہو کہ تم دے رہے ہو۔ تمہارے حصہ میں تو صرف دیکھنا آیا ہے۔ دینا کوئی اور ہے۔ (ترجمہ)

اجتماعی خودکشی کے طریقے

اجتماعی خودکشی کے طریقے کیا کیا ہیں؟

لیجیے سنیے: پہلا طریقہ جسے تیر بہدف سمجھیے پیچھے کی طرف دیکھنا ہے۔ نہ دنیا ساکت ہے نہ زندگی ٹھہری ہوئی۔ لہٰذا انسان کے لئے حرکت میں رہنا ضروری ہے۔ جو پیچھے کی طرف رخ کرے گا وہ پیچھے جائے گا، جس کا رخ آگے کی طرف ہوگا وہ آگے بڑھے گا، جو پیچھے جائے گا وہ بالآخر عدم تک پہنچ جائے گا جس سے وہ کبھی وجود میں آیا تھا۔ عدم کا لا متناہی سکون حاصل کرنا ہے، تو ہمیشہ پیچھے کی طرف دیکھیے۔ حال اور مستقبل سے کنارہ کش ہو جائیے۔ ماضی میں زندگی بسر کیجیے اور بالآخر عدم تک کا سفر طے کر لیجیے۔ جہاں سے آئے تھے وہیں پہنچ جائیے۔ جن قوموں کو آگے بڑھنے کا ولولہ نہیں رہتا، جو زمین کے سینے پر بوجھ بن جاتی ہیں وہ ہمیشہ ماضی کی بات کہا کرتی ہیں اور اس ماضی کی طرح جو ختم ہو گیا ہے خود بھی ختم ہو جاتی ہیں اور جو پیچھے کی طرف رخ کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا وہ لڑکھڑا کر گر جائے گا۔ زندگی نام ہے حرکت کا، جستجو کا اور پیش رفت کا۔ ان تینوں مصیبتوں کا علاج صرف ایک جگہ ملے گا، موت کی آغوش میں۔

اجتماعی خودکشی کے لئے ایک سبیل اور نکلی ہے۔ یعنی وقت ناوقت فریاد کرنا، آہ بھرنا، حرف شکایت زبان پر لانا، اور اپنے حال زار پر پیہم ترس کھانا۔ جو لوگ فریاد کرتے ہیں وہ اپنے ساتھ بے داد کرتے ہیں۔ شکوہ و شکایت کرنے والا پہلے غیرت سے ہاتھ دھوتا ہے۔ خود پر ترس کھانے والا ایک گھن لگا دینے والے اخلاقی مرض میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ جو قوم گلہ مندی کی خوگر ہو جاتی ہے حوصلے کی راہیں اس پر بند ہو جاتی ہیں۔ ولولہ اس سے کترا کر نکل جاتا ہے۔ اس کے یہاں عمل کی طاقت شل ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی تکلیف حقیقی یا خیالی کو بڑھا چڑھا کر اپنے وجود پر حاوی کر دیتی ہے۔ اپنی خام خیالی اور مبالغہ آرائی سے خود کو بے بس بنا دیتی ہے اس میں جینے کی لگن باقی نہیں رہتی اور وہ سسک سسک کر مر جاتی ہے۔ شکایت کو جس جماعت نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا، اس نے فنا کو گلے لگایا۔ شکایت کرنے والے کام نہیں کر سکتے۔

ایک شکایت ہی کیا، گفتار کی کثرت بھی اکثر اجتماعی زندگی کی مشکلات کو آسان کر دیتی ہے!

گفتار کے غازیوں کا کردار کھوکھلا ہو جاتا ہے اور اس بوڑھے پیڑ کی طرح جو کھوکھلا ہو چکا ہے، ہوا کا ایک جھونکا اُسے وجود سے عدم کی طرف لے جاتا ہے۔ جو قوم زبان کے چٹخارے پر جان دینے لگی وہ دراصل جان گنوا بیٹھتی ہے۔ زبان کا چلنا زندگی کی ایک علامت ہے مگر زندگی سے عبارت نہیں۔ جو لوگ باتیں بنانے کے عادی ہو جاتے ہیں، کام کرنے کی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہتی۔ باتیں بنانے سے کام بگڑتے ہیں۔ زیادہ باتیں کرنے والے لوگ بہت سی باتیں غلط کہہ جاتے ہیں، اپنی بات کا پاس نہیں رکھتے، اپنے عہد کو پورا نہیں کرتے۔ اس عادت میں جب وہ راسخ ہو جاتے ہیں تو قول کو فعل کا بدل سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی شخصیت مجروح ہو جاتی ہے، جوانمردی کا ان میں شائبہ باقی نہیں رہتا۔ عزتِ نفس کا احساس ان کی گرفت سے نکل جاتا ہے۔ یہ لوگ حقیقت کے بجائے داستانوں کی دنیا میں رہتے ہیں اور داستان کہتے کہتے سو جاتے ہیں، اس طرح سے کہ ان کی داستان تک بھی داستانوں میں باقی نہیں رہتی۔ یہ لوگ خیالی پَوَن چکیوں پر وار کرتے رہتے ہیں اور بالآخر خود اس وار کے ہدف بن جاتے ہیں جو دستِ قضا سے سرزد ہوتا ہے۔

قومیں خود کو معدوم کرنے کے لئے ایک اور طریقہ بھی اختیار کرتی ہیں: وہ علم سے اپنا ناتا توڑ لیتی ہیں اور جہالت کے حصار میں جا بیٹھتی ہیں۔ اس شبستان میں انھیں بڑا سکون ملتا ہے، وہاں علم کی شعاعیں آنکھوں کو ستاتی نہیں۔ گہری نیند سے جگاتی نہیں۔ ہر سمت اندھیرا، ہر طرف سکون۔ نہ آگہی کی روشنی، نہ جستجو کی تڑپ، نہ پیش رفت کا ولولہ! انسان نے دنیا میں جو کچھ ترقی کی ہے علم کی بدولت کی ہے۔ علاوہ بریں دنیا کے وسائل محدود ہیں۔ ان وسائل کو حاصل اور استعمال کرنے کے لئے دنیا کی اقوام میں سخت مقابلہ ہو رہا ہے۔ جن قوموں کے پاس علم ہے، عالم کی زمام ان کے ہاتھ میں ہے۔ علم طاقت ہے، زندگی ہے۔ جہالت کمزوری ہے، فنا ہے۔ فنا ہونے کا آسان طریقہ ہے جہالت کی قبر میں اُتر جانا، زندہ درگور ہو جانا اور گہری ابدی نیند سو جانا۔ انسان کی تسخیرات اور قدرت پر اس کی بالادستی علم اور عقل کی بدولت ہے۔ علم ہی عقل پر سان رکھتا ہے۔

آپ تو اتنا جانتے ہی ہوں گے کہ قوم افراد سے بنتی ہے۔ افراد متحد ہوتے ہیں تو جماعت مضبوط ہوتی ہے۔ ہر فرد اپنے مفاد کا اسیر ہو جائے تو جماعت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ اینٹوں کو مسالے سے نہ جوڑیئے، یوں ہی اُوپر تلے رکھ دیجیے، تو مکان بن چکا۔ افراد کو ربطِ باہم اور خلوص و ایثار سے جوڑا جاتا ہے۔ مشترک مقاصد اور مشترک عزائم و عقائد ہی جماعت کو توانا بناتے ہیں۔ اگر خلوص، ربطِ باہم اور اشتراکِ مقاصد کی جگہ خود غرضی نے لے لی تو یوں سمجھیے کہ قوم فنا کے راستے کی بہت سی مشکلات سے نجات پا گئی۔ جو قومیں پکے ہوئے پھل کی طرح ٹپکنے کے لئے تیار ہیں، ٹوٹے ہوئے تو وہ افراد کی خود غرضی کی مرہونِ احسان ہیں، اسی کی بدولت اس حالت کو پہنچی ہیں۔ کسی قوم کے

متعلق اگر یہ فیصلہ کرنا ہو کہ وہ باقی رہے گی یا فنا ہو جائے گی، تو یہ دیکھیے کہ اس کے افراد اپنے ذاتی مقاصد کو ترجیح دیتے ہیں یا اجتماعی مقاصد کو۔ اجتماعی موت کو حاصل کرنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ افراد کے کانوں میں خود غرضی کا سبق پھونک دیا جائے۔ افراد مختلف سمتوں میں جائیں گے، تو جماعت منزل مقصود تک پہنچ چکی۔ ہندوستان میں کونسی قوم ایسی ہے جس کے افراد اپنے چھوٹے سے چھوٹے فائدے کے لیے قوم کا بڑا سے بڑا نقصان کو تیار نہیں؟

خود غرضی کے جلو میں تکبر، انا اور نخوت آتے ہیں۔ ان سب کی پرچھائیں عقل و شعور پر پڑتی ہے۔ نخوت کے نشے میں انسان اجتماعی فلاح کو فراموش کر دیتا ہے۔ نخوت جدھر جاتی ہے، عداوت اور نفاق کے بیج چھڑکتی ہوئی جاتی ہے۔ نخوت، جہالت کی بہن ہے اور اس کے زیر سایہ پروان چڑھتی ہے۔ کسی قوم میں نفاق اور انتشار برپا کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کے کانوں میں تکبر کا منتر پھونک دو۔ پھر ایسی پھوٹ پڑے گی جس کا مٹنا قسم ہے۔ انا گزیدہ لوگ پھنکارتے اور ڈستے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ ان کے کاٹے کا علاج نہیں، ان کا کاٹا سوتا ہے۔

حسد ہماری قوم کا طرۂ امتیاز ہے، اس کی وجہ سے شیرازہ سب سے زیادہ بکھرتا ہے۔ بظاہر حسد خود غرضی کے برعکس ہے، جو زیادہ قریب ہوتا ہے وہی اس کا ہدف زیادہ بنتا ہے جس سے کوئی تعلق نہیں، وہ پھلیں پھولیں ترقی کریں کسی پر گراں نہیں گزرتا۔ اپنے عزیز ہمسائے اور احباب اگر کامیاب ہوتے ہیں، ترقی کرتے ہیں تو لوگ آگ بگولہ ہو جاتے ہیں۔ اغیار اگر پنپتے ہیں، ترقی کرتے ہیں تو کوئی اثر نہیں پڑتا۔ گویا قدرت کی طرف سے ایک مضبوط انتظام اس بات کا ہو گیا کہ یہ قوم کبھی مل کر نہ رہ سکے۔ ہمیشہ جوتی میں دال بٹتی رہے۔ لہٰذا حسد کو راہ نما بنالیا جائے تو قوم کے فنا ہونے کی منزل آسان ہو جاتی ہے۔ حسد اچھائی کو پنپنے نہ دے گا، برائی کو شہ دے گا۔ اچھائی بقا کی ضامن ہوتی ہے، برائی موت کا باعث۔ حسد محبت کی قبا کو پارہ پارہ کر دیتا ہے، اتحاد کی دیوار میں دراڑ ڈال دیتا ہے۔

کسی جماعت کا شیرازہ بکھرنے لگے، تو امید بندھتی ہے کہ جلد ہی زندگی کے مصائب سے نجات مل جائے گی۔ موت اسے اپنی آغوش میں لے لیگی۔ دہر میں نفسی نفسی کے کلمہ گو موت کی راہ سے حشر کے میدان تک پہنچ جائیں گے۔ وہاں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ لیکن یہاں کے نت نئے بکھیڑوں سے تو رستگاری ملے گی۔ ساتھ ہی کبھی کبھی یہ اندیشہ ہوتا ہے، جیسا کہ اقوام و ملل کی تاریخ میں بارہا ہوا ہے کہ

اُن ہی میں سے کوئی فرد ایسا اٹھے جو زوال آمادہ قوم کو سنبھال لے۔ اس کی رگِ غیرت کو جوش میں لے آئے، اس کی تب بت اور شیرازہ بندی اس عنوان کر ے کہ بقا فنا کی جگہ لے لے، پیشرفت پسپائی کی۔ لہٰذا اس قوم یا جماعت پر جس نے دنیا سے منہ موڑ لیا ہے اور فنا ہو جانے کی ٹھان لی ہے، لازم آتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے کسی فرد میں ضدوں اور رہبری کو اکٹھا نہ ہونے دے اور اگر وہ جمع ہو جائیں تو ایسے راہ نما کی وہ تھکا فضیحتی کرے، اس کی تذلیل اور تحقیر کے اتنے اسباب فراہم کر دے کہ خود اس کی جان پر بن جائے۔ یا تو اصلاح کا سودا اس کے سر سے نکل جائے یا جان تن سے۔ اس کی نیت پر شبہ کرے اور الزامات کی بوچھار سے اس کی طمانیت کو بے ہم اس کے عزائم کو متزلزل اس جذبۂ اصلاح کو مجروح کر دے۔ جو قوم صالح قیادت کو پنپنے نہیں دیتی اس کے لئے موت بغایت آسان ہو جاتی ہے۔

اجتماعی خودکشی سے بچنے کا ایک راستہ اور ہے، چلئے اسے بھی بند کرتے چلیں۔ وہ ہے اداروں کو چلانے کی صلاحیت۔ جب تک کوئی قوم اداروں کو ڈھنگ سے چلا سکتی ہے، وہ مر نہیں سکتی۔ ادارے انفرادی برائیوں کی روک تھام کرتے ہیں اور اجتماعی ترقی کا انصرام۔ خدا جس قوم کو فنا کرنا چاہتا ہے اس سے صحت مند قیادت کے علاوہ اداروں کو چلانے کی صلاحیت بھی چھین لیتا ہے؟ خدا کے بندے بھی ایسا کر سکتے ہیں۔

لیکن ایک اور مشکل راہ میں حائل ہے، وہ ہے انسان کی عقل، اس کے سوچنے کی طاقت۔ عقل سوچنے اور غور کرنے سے باز نہیں آتی۔ غور کرے گی تو بھلے برے کو سمجھنے لگے گی اور کبھی نہ کبھی راہ پر پڑ جائے گی۔

مانا کہ عقل کو طاق پر نہیں بٹھا سکتے، اسے معطل نہیں کر سکتے لیکن اسے غیر ضروری باتوں میں اُلجھا تو سکتے ہو۔ اسے اصول سے ہٹا کر فروعات کے دلدل میں ڈال دیجیے! لاکھ جتن کرے اس میں سے نکل نہ پائے گی، پھنستی چلی جائے گی۔ فضولیات، توہمات اور خرافات کی گرفت میں ایک بار عقل آ گئی تو ادراک اور بصیرت سے محروم ہو جائے گی۔ اسے اس کا یارا ہی نہ رہے گا کہ قوم کو فنا سے بچائے۔ مثلاً جب دو انسان ملتے ہیں تو جوش اور خوشی کے ساتھ ایک دوسرے کی پذیرائی کرتے ہیں۔ کوئی آداب عرض کرتا ہے، کوئی سلام علیکم کہہ کر خیر مقدم اور خیر سگالی کرتا ہے۔ سلام کا مقصد ہے دلوں کو ملانا، افراد کو جوڑنا۔ اس کا رخ موڑ دیجیے تو یہ دلوں میں بیر ڈال دیگا، افراد کو ایک دوسرے سے توڑ دیگا۔ افراد کو اس بحث میں اُلجھا دیجیے کہ سلام ہاتھ اٹھا کر کیا جائے، کہ ہاتھ چھوڑ کر، یا یہ کہ سلام بآواز بلند کیا جائے، یا ہاتھ کے اشارے سے۔ اس بحث کو تیز و تند کر دیجیے ——— اس قدر تیز کہ عقل بیچاری کو فرار ہوتے ہی بنے اور افراد کشت و خون پر تل جائیں اور صدیوں تک اپنا وقت اور صلاحیتیں اس مباحثے کی نذر کرتے رہیں۔ اور جتنی باتیں زندگی، ترقی، بقا اور پیشرفت کے لئے ضروری ہیں انھیں

بھول جائیں۔ دیکھا آپ نے سلام کا مقصد فوت ہوگیا، ملک اُلٹ گیا۔ کسی قوم کو اصول سے ہٹا کر فروعات میں اُلجھا دیجئے وہ ہمیشہ اپنے لئے مشکلات پیدا کرتی رہے گی جن سے نجات موت کے ہی ہاتھوں ملے تو ملے۔ ایسے لوگ پیڑ گنتے ہیں اور جنگل ان کی نگاہوں کی گرفت میں آتا ہی نہیں۔ یہ تجزیہ کو کل پر اور نقطے کو حروف پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ فروع آشنا، اصول سے منحرف رہتے ہیں، تناسب اور تناظر سے محروم ہوجاتے ہیں، نیک و بد کا انھیں شعور نہیں رہتا؛

قوم کی مجموعی حالت کچھ بھی ہو، خواہ کتنی ہی مفلس، جاہل، جھگڑالو، سطحی اور بے وقار کیوں نہ ہو، اُس میں سے اُبھر کے کچھ لوگ ایسے ضرور نکلتے ہیں جو خوش حال پڑھے لکھے سنجیدہ، سمجھ دار اور بااثر ہوتے ہیں۔ مگر قوم پسماندہ ہے تو یہ ترقی یافتہ طبقہ اس کی اصلاح کے بجائے اس کے استحصال پر کمربستہ ہوجائے گا۔ اس کی نعش پر کھڑا ہو کر اپنے قد کو اونچا کرے گا۔ اس کا نمائندہ بن کر اسے دھوکے دے گا اور حکومتِ وقت کا قرب حاصل کرے گا؛ حکومت کو اطمینان دلائے گا کہ جس جماعت سے اس کا تعلق ہے وہ خوش حال اور شادماں ہے اور حکومت کے اقبال اور انصاف کے گن گا رہی ہے۔ یہ طبقہ گورکن کا وصف رکھتا ہے۔ قوم کی بالاقساط تدفین کرنا اس کا مشغلہ اور پیشہ ہے۔ یہ قوم کی جڑ کاٹنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ ہے۔ یہ وہ جنسِ گراں ہے جو مصر کے بازار میں بکنے کے لئے سدا تیار ہے اور اس کی قیمت بھی کوئی ایسی زیادہ نہیں؛ چند ٹکڑے چاندی کے یا روٹی کے۔ یہ طبقہ بڑے کام کا ہے۔ اس کی امداد شریکِ حال رہی تو قوم کل کی مرتی آج مر جائے گی۔

اس سلسلے کی ایک کڑی اب بھی رہ گئی ہے۔ جس قوم کو ابدی نیند سلانا ہے، اس کو آہستہ آہستہ حرکت اور محنت سے دُور لے جانا ہوگا۔ حرکت میں برکت ہے۔ محنت بارور ہو کر رہتی ہے۔ جفاکشی میں توانائی چھپی ہوئی ہے۔ جو قومیں منزلِ فنا کے لئے رختِ سفر باندھ لیتی ہیں وہ محنت، حرکت، جدوجہد سے جی چُراتی ہیں۔ کاہلی، تن آسانی اور عیش و عشرت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتی ہیں۔ بسا اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ جس قوم نے اپنے عروج کے زمانے میں ایک عالم کو تہ و بالا کر ڈالا، جس نے چشم زدن میں دنیا کو تسخیر کر لیا، علم و عمل دونوں سے، وہی زوال کے زمانے میں خانہ نشیں ہو گئی؛ اپاہج ہو کر گھر میں بیٹھ رہی، اس طرح منجمد ہو کر گویا کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ جسے خود حرکت سے گریز ہو اس کا لہو کب تک گردش میں رہے گا۔ ایسی قوم کے افراد سلامتی اور آرام کا کلمہ پڑھتے ہیں، جستجو اُن کے دامنِ دل کو چھوتی نہیں؛ مہم جوئی سے انھیں گریز ہوتا ہے۔ ملکِ خدا ان کے لئے تنگ ہوجاتا ہے۔ وہ معذور ہو کر گھر میں بیٹھ جاتے ہیں اور اسی طرح ایک دن قبر میں اُتر جاتے ہیں۔ تن آسانی، خانہ نشینی، عیش طلبی کا بھلا ہو، جانکنی کی مدت مختصر ہو جاتی ہے۔

ایک شاعر نے جسے مدتوں زعم رہا کہ وہ زوال کے سیلاب کو بند باندھ کر روک سکتا ہے، کہا تھا :

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم ٭ جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

سچ ہے جو قوم یقین کی دولت کھو بیٹھتی ہے۔ وہ اپنی شخصیت کو محفوظ نہیں رکھ پاتی؛ فنا ہو جاتی ہے۔ یقین سے ہی عمل کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ گمان کے صحرا میں قدم رکھا تو بھٹکنے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ کسی قوم کے یقین کو مجروح کر دو، اس میں نہ ولولہ باقی رہتا ہے نہ زندگی۔ عمل کا جذبہ نہ آگے بڑھنے کی تمنا۔ شاعر نے بہت شور مچایا، زوال آمادہ، فنا بستہ قوم کسمسائی، پھر سو گئی۔ بڑی رعایت کی تو اس کے اشعار گنگنانے لگی۔ اس سے بڑا طنز کیا ہوگا کہ جن اشعار میں عمل کی تلقین کی گئی ان اشعار کو ہی عمل کا بدل بنا لیا گیا، دھرے رہ گئے۔ شاعر کے سارے عزائم۔ انقلاب برپا ضرور ہوا۔ لیکن زبانوں تک رہ گیا، حلق کے نیچے نہیں اترا۔ جس یقین کو بیابان کی شب تاریک میں قندیل رہبانی بننا تھا، اس کی لو دھیمی ہوتی چلی گئی وہ بجھ گیا۔ حرکت اور جدوجہد کا جو صُور شاعر نے اُمنگ اور آرزو اور اعتماد کے ساتھ پھونکا تھا اُسے سُن کر قوم نے کروٹ لی پھر اس طرح سو گئی کہ جاگنا حشر تک قسم ہے۔

میرے ہاتھ میں نہ قلم ہے، نہ موقلم۔ ایک آئینہ ہے جسے میں نے بظاہر ایک جیتی جاگتی قوم کے سامنے رکھ دیا ہے۔ جو کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے، جو کچھ میں قلمبند کروں گا، وہ عکس ہے ایک ایسی قوم کا جو مٹنے پر تلی ہوئی ہے۔ وہ ہر ڈھنگ اختیار کر رہی ہے جو اُسے فنا کی منزل تک پہنچا دے۔ دنیا کی تاریخ میں کب کسی قوم نے مرنے کے لئے اتنے سامان فراہم کیے ہوں گے۔ رہتی دنیا تک خودکشی کرنے والی اقوام خودکشی کے ان طریقوں پر کوئی اضافہ نہ کر سکیں گی۔ خدا گواہ ہے میں نے اس فنا آمادہ قوم کے سامنے آئینہ اس لئے رکھا کہ اس کی تصویر بلا کم و کاست سامنے آجائے۔ جنید نکتہ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ میں نے آئینہ چہرے کے سامنے یہ دیکھنے کے لئے رکھا کہ سانس آ رہی ہے یا مریض دم توڑ چکا!

●●

مسلم یونیورسٹی میں تعلیمی اور اقتصادی سیمینار

گزشتہ ماہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ہمدرد فاونڈیشن کے بزنس اینڈ امپلائمنٹ بیورو کے اشتراک عمل سے علی گڑھ میں مسلمانان ہند کی تعلیمی اور روزگاری حالت پر غور وخوض کرنے کے لئے ایک دوروزہ سیمینار منعقد ہوا۔ یہ اس اہم سلسلے کی دوسری کڑی تھی۔ پہلا سیمینار گزشتہ سال دہلی میں کیا گیا تھا۔

مسلمانان ہند کا بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ اصول کو چھوڑکر فروع سے الجھ جاتے ہیں۔ ان کا ذہن تعمیری کے بجائے تنقیدی اور اکثر تخریبی ہوجاتا ہے۔ ان میں اداروں کو چلانے اور منصوبہ بنانے اور اسے عملی جامہ پہنانے کی صلاحیت بہت کم رہ گئی ہے۔ ان کا ردعمل عقل سے زیادہ جذبہ پر منحصر ہوتا ہے۔ ان کا زاویۂ نگاہ اجتماعی سے زیادہ انفرادی ہوتا ہے۔ یہ دونوں خصوصیات انکی پیش رفت میں سد راہ ہیں۔

تازہ ترین ثبوت علی گڑھ سیمینار کی بابت ردعمل میں ملےگا۔ محض اس بنا پر کہ اس سیمینار میں اقلیتی کمیشن کے صدر جسٹس عبداللہ بیگ نے شرکت کی تھی اس کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ کسی نے رُک کر یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ سیمنار نے کن مباحث پر غور کیا اور ان کے متعلق وہ کس نتیجہ پر پہنچا اور آئندہ کے لئے غور وفکر، سروے اور تحقیق کی کیا کیا راہیں نکلیں۔ بہتر ہے اس کا فیصلہ ہوجائے کہ اقلیتی کمیشن پر ہمیں اثر انداز ہونا چاہیئے اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ یا اسے ایسی مجلسوں اور محفلوں سے دور رکھنا چاہیئے۔ دور رکھنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ وہ کمیشن جو بالعموم اقلیتوں اور بالخصوص مسلمانوں کے مسائل پر غور اور تحقیق کرنے کے لئے ترتیب دیا گیا ہے مسلمانوں کی صورت حالات اور ان کے مسئلوں سے بے بہرہ رہ جائے گا اور ان کے حق میں کوئی مؤثر سفارش نہ کرسکے گا۔ اس گنہگار انسان کو جس کے ہاتھ میں اس وقت قلم ہے یقین کامل ہے کہ اگر مسلمانوں نے اوائل اسلام میں یہی رخ اختیار کیا ہوتا جو وہ گزشتہ چند صدیوں سے کررہے ہیں تو اسلام مکہ معظمہ میں اور وہ بھی چند بزرگانِ دین تک محدود رہ جاتا۔ حیرت ہے کہ جو لوگ صرف خدا سے ڈرنے پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنوں اور بیگانوں کی نکتہ چینی سے کیونکر خوف کھانے لگے، جو دین کہ دنیا کی رہبری کے لئے تھا اس کے ساتھ یہ کیسا انوکھا برتاؤ ہے کہ اسے دنیا کی نگاہوں سے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ اس کے ماننے والے کھُل کر بات کرنے کا یارا بھی نہیں رکھتے۔ جس دین نے

مشاہدۂ فکر و غور، تدبر و تفکر، جستجو، اور حرکت پر زور دیا تھا۔ اس کے نام نہاد ماننے والوں کا واسطہ اب صرف جمود سے رہ گیا ہے۔ طریق کار دراصل یہ ہونا چاہیئے کہ اپنوں اور بیگانوں میں سے اگر کوئی شخص ایسی بات کہے جو مسلمانوں کے مسلک یا عمومی مفاد کے خلاف ہو تو ہمارے اہل فکر اس کا معقول اور مسکت جواب دیں۔ ہم زندہ ہیں اور اس دنیا کا اور انسانیت کا ایک حصہ ہیں۔ اس لئے لوگ ہماری حالت، ہمارے مسلک، ہمارے نقطۂ نظر کے متعلق گفتگو ضرور کریں گے اور ان کا منہ کوئی بند نہیں کر سکتا۔ اگر ہم خدانخواستہ مردہ ہوتے اور آثار قدیمہ میں گنے جاتے تو ہم پر مؤرخانہ اور ترحمانہ نظریں ڈالی جا سکتی تھی، اور وہ بھی کبھی کبھی ہمیں زندہ ہونے کا حق ادا کرنا ہے، ہم پر تبصرہ ہوگا، نکتہ چینی ہوگی، ہمارا موازنہ دوسروں کے ساتھ کیا جائے گا، ہمیں تبصرہ کی توضیح کا ہوگی، نکتہ چینی کا جواب دینا پڑے گا۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم دوسروں کے بالمقابل تولے جا رہے ہیں تو وہ شخص جو ترازو لے کر بیٹھا ہے ڈنڈی تو نہیں مار رہا ہے، جو ڈنڈی مارنے پر تلا ہوا ہے وہ جب تولے گا تو ڈنڈی مارے گا۔ ڈنڈی پر نگاہ رکھنا اور اُسے سیدھا رکھنا ہمارا کام ہے۔ لڑ جھگڑ کر نہیں، سمجھا کر، مناظرہ اور مباحثہ سے نہیں۔ استدلال، تو جیہ، توضیح، افہام و تفہیم سے کہ یہی طریقہ اللہ تعالی نے کلام پاک میں اختیار کیا ہے اور اسی راہ پر چل کر اسلام کی اشاعت کی گئی تھی۔

جہاں تک اجتماعی کے بجائے انفرادی زاویۂ نگاہ کو اختیار کرنے کا تعلق ہے۔ اس کی مثال بھی مذکورہ سیمنار سے مل جائے گی۔ ایک محترم صحافی کو اپنے قیام کے متعلق کچھ شکایات ہیں (جو ایک حد تک بجا تھیں) ان کی آزردگی نے سیمنار کی تحقیر کی شکل اختیار کر لی۔ بہرکیف جس طرح گلدار اپنے نقوش نہیں بدل سکتا ہندوستانی مسلمان بھی اپنی بے مصرف نکتہ چینی اور اپنی انفرادی انانیت کو چھوڑنے کی طرف ہرگز مائل نہیں ہے۔ بیکار نکتہ چینی سے ایک طرف نکتہ چینی کی قوتِ عمل بالکل ضائع ہو جاتی ہے، تو دوسری طرف جس پر نکتہ چینی کی گئی اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ اور اگر اس کا اخلاص جنون کی حد تک نہیں ہے تو وہ یہ کہہ کر کنارہ کش ہو جائے گا کہ بھاڑ میں جائے وہ لوگ جو نکموں، کاہلوں، باتونیوں، ناکاروں، لفاظوں، ریاکاروں کو تو گوارا کر لیتے ہیں، اگر گوارا نہیں کرتے تو صرف اس شخص کو جو ان کی حالت سدھارنا چاہتا ہے، انھیں آگے بڑھانا چاہتا ہے، وہی تو ایک ان کا دشمن ہے۔ جذبات کے ابال کو بہ طیب خاطر قبول کرتے ہیں لیکن حقیقت پسندانہ تجزیہ اور کسوٹی پر پرکھنے کے ڈھنگ پر چیں بہ جبیں ہو جاتے ہیں۔

فی الحال ہم ان بیشمار اور گرانقدر مقالوں کا ذکر کریں گے، جو مختلف اجلاسوں میں ماہرین تعلیم

دماہرین اقتصادیات نے پیش کئے۔ ہم خطبۂ صدارت اور مسٹر سکسینہ جوائنٹ سکریٹری اقلیتی کمیشن کی تقریر سے اقتباسات پر اکتفا کریں گے۔

" یہ تصور کیاجاتا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جو ہندوستان کے مسلمانوں کو جدید دور سے عہدہ برآ کرنے کی تحریک کا مرکز تھی، مسلمانوں کے مسائل پر غور اور تحقیق کرے گی۔ یہ خواب ہنوز تشنۂ تعبیر ہے۔ یہ بات دراصل ایک نیک فال ہے کہ یونیورسٹی اب اس بات کے لئے تیار ہو چکی ہے کہ مسلمانوں کی سماجی اور اقتصادی حالت کے متعلق تحقیق و تفتیش اور معنی خیز غور و خوض کرے گی ۔ ۔ ۔ ۔"

مرکزی اقلیتی کمیشن، اقلیتی پینل اور ریاستوں کے اقلیتی کمیشن اپنی سی کوشش کر رہے ہیں لیکن مسلمانوں کے مسائل ہنوز ان کی گرفت میں نہیں آسکے ہیں۔ ان کے متعلق اعداد و شمار صفر کے برابر ہیں۔ مسلمان اپنی صورتِ حالات کے متعلق رائے صرف تاثرات کی بنا پر کرتے ہیں۔ اگر اعداد و شمار فراہم ہو جائیں اور ان کا تجزیہ اور اشاعت کی جائے تو مندرجہ ذیل نتائج نکلیں گے۔

(۱) ملک اور قوم کے اجتماعی ضمیر کو دھکا لگے گا جس کے نتیجہ میں دوسرے فرقے اور خود حکومت کا زاویۂ نگاہ مسلمانوں کے متعلق بدل جائے۔

(۲) اور وہ بے حسی اور بے تعلقی جو مسلمانوں کو اپنی حالت کی نسبت ہے، ٹوٹ جائے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے زوال کے اسباب حسب ذیل ہیں :

۱۔ تعلیم سے غفلت، جسے افلاس نے اور بڑھا دیا۔

۲۔ تبدیلی کی مدافعت اور جدید زمانہ سے عہدہ برآ ہونے سے گریز۔

۳۔ ملت دو دنیاؤں میں بٹ گئی ہے، جنھیں ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہیں۔ ایک دنیا جدید تعلیم یافتہ اور خوش حال مسلمانوں کی، دوسری دنیا دینی تعلیم حاصل کرنے والوں اور ان کے ساتھ ساتھ عام غیر تعلیم یافتہ مسلمانوں کی۔ اس خلیج کو جس نے ملت کو دونیم کر دیا ہے، پاٹنا ہوگا۔

۴۔ ہمارے اندر مل کر کام کرنے کی صلاحیت مفلوج ہو چکی ہے۔ اس صلاحیت کے بغیر ترقی کی ہی نہیں جا سکتی۔

۵۔ ایک ایسی ملت میں جہاں زیادہ تعداد ان پڑھ اور غریب عوام کی ہے، تعلیم یافتہ، بااثر اور صاحبِ منصب لوگ نادانستہ ان کا استحصال کرنے لگتے ہیں، اس سے ایک نقصان یہ بھی ہے کہ

عوام صحت مند قیادت سے محروم ہو جاتے ہیں اور آگے بڑھنے کا ولولہ باقی نہیں رہتا۔

۶۔ خوف اور غیر محفوظ ہونے کا احساس جو مسلمانوں کے ذہن میں جاگزیں ہو گیا ہے اس کے سایہ تلے ریاضت، جوش، اور امنگ سب مرجھا جاتے ہیں۔ ہر وقت یہ خطرہ دامنگیر رہتا ہے کہ ہمارے ساتھ جب ہوگی زیادتی ہوگی، انصاف کبھی بھی نہ ہوگا۔ یہ ذہنیت کیوں پیدا ہوئی اس کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں، اور اس کے متعلق دو رائے ہو سکتی ہیں لیکن اس بارے میں سب کو اتفاق ہوگا کہ یہ ذہنیت ناگمند اور مضر ہے۔ آئین کی غیر جانب داری کے باوجود مسلمانوں کی ایوان اقتدار میں نمائندگی برائے نام ہے۔ وہ شرکت کے حوصلہ انگیز احساس سے محروم رہتے ہیں اور اس ولولہ سے بھی جو ملک کے ارتقا اور تعمیر نو کے جلو میں آتا ہے۔

۷۔ کچھ تو تعلیم کی کمی کی وجہ سے، کچھ خشگلیں علاحدگی اور کچھ بڑھی ہوئی انانیت کی وجہ سے بہت سے مسلمان تناسب کے احساس سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ چنانچہ وہ چھوٹی چھوٹی غیر اہم باتوں پر جھگڑ تے رہتے ہیں اور اہم مسائل کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ معاشرہ کی خدمت کا ان کے یہاں صیغہ ہی نہیں اور سوشل سروس کے بغیر کوئی معاشرہ ترقی کر ہی نہیں سکتا۔ اگر افراد معاشرہ کی فلاح اور ترقی کے لئے کام کرنے کو تیار نہ ہوں گے، تو معاشرہ ترقی کر ہی نہیں سکتا۔

۸۔ بہت سی سطحوں پر مسلمانوں کے خلاف امتیازی برتاؤ روا رکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ دوسروں کی عداوت اس قدر نہیں، جتنی ذات برادری اور اقربا پروری کی روایت۔

کسی اقلیت کے جاندار اور سرخرو ہونے کے لئے مندرجہ ذیل تینوں شرطوں کا پورا ہونا ضروری ہے:

۱۔ وہ اپنے مذہب، ثقافت اور روایت پر سختی سے پابند رہے۔

۲۔ ریاضت اور جانفشانی کے ذریعہ وہ اپنے آپکو اکثریت سے بہتر ثابت کرے۔

۳۔ وہ اکثریت کے ساتھ اپنے تعلقات شگفتہ رکھے۔

یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی تعلیمی پسماندگی سے جلد از جلد نجات حاصل کریں۔ اب دوسرا قدم جو اٹھانا ہے، وہ یہ ہے کہ تحقیق، ریسرچ، سروے، جائزے اور اعداد و شمار کی فراہمی کا کام انتہائی سنجیدگی، سلیقہ اور ثابت قدمی کے ساتھ کیا جائے۔

اس کا خیال رکھنا ہوگا کہ مسلمانوں کے مسائل کو سارے ملک کے مسائل کے پس منظر میں دیکھا جائے۔

مسلمانوں کو چاہیئے کہ مشترک مسائل کو حل کرنے کے لئے وہ برادرانِ وطن کے ساتھ سر جوڑ کر اور قدم ملا کر آگے بڑھیں۔

مسٹر سکسینہ نے اپنی تقریر میں عبرت ناک اعداد وشمار دیئے اور دو باتیں ایسی کہیں جو مسلمانوں کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لئے کافی ہیں۔ انھوں نے ہمدردانہ تجزیہ کے بعد اس رائے کا اظہار کیا کہ ان ممالک میں جہاں مسلمانوں کی آبادی دوسرے طبقوں کے ساتھ مخلوط ہے، ہر جگہ مسلمان تعلیمی اعتبار سے پسماندہ نظر آئیں گے۔

دوسری بات جو سکسینہ صاحب نے کہی اس کا تخاطب صرف ہندوستان کے مسلمانوں سے تھا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ اقلیت کی صورت حالات کی منطق یہ ہے کہ وہ اکثریت سے بہت زیادہ محنت کرے اور اس پر فضیلت حاصل کرے۔ اس منطق پر ممالک واقوام کی تاریخ نے مہر لگادی ہے۔ ایک ہندوستان ہی ایسا ملک ہے جہاں اقلیت نے نہ محنت کی، نہ دوسرے فرقوں سے مقابلہ کا دم بھرا۔

●●

طلبا سے خطاب

عزیزانِ گرامی !

علی گڑھ تحریک علم اور عقل، روشنی اور تازہ ہوا، امید اور ولولہ، درد اور خلوص کی تحریک تھی۔ اس نے ہزیمت خوردہ اور مظلوم مسلمانوں کو مایوسی اور غفلت سے چھٹکارا دلایا۔ اس نے ان کے مرجھائے ہوئے دلوں کو زندگی اور ولولہ دیا۔ اس نے انھیں یہ بھی سمجھا دیا کہ خودغرضی اور نفسی نفسی سے ہرگز کام نہ چلے گا، کوئی طبقہ، کوئی قوم، کوئی ملت اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک کہ اس کے افراد، انفرادی مفاد کو اجتماعی مفاد پر ترجیح دیتے رہیں گے۔ اور جب تک ان میں تعمیری اداروں کو ڈھنگ سے کام چلانے کی صلاحیت پیدا نہ ہوگی۔ اس نے یہ اعلان کیا کہ جہالت انسان کے لیے سب سے بڑی لعنت ہے اور کوئی قوم جہالت دور کیے بغیر ترقی نہیں کرسکتی۔ اس تحریک نے علم کی اشاعت سے بھی زیادہ جس کام کو سمجھا وہ نقطۂ نگاہ کی تبدیلی کا تھا۔ یعنی ہمارا ردِّ عمل، ہمارے فیصلے، جذبات پر نہیں، عقل پر مبنی ہونے چاہئیں۔ چنانچہ اس نے ہندوستانی مسلمانوں میں علم اور عقل کی بالادستی کو رواج دینے کی کوشش کی۔ اس نے انھیں یہ بھی سکھایا کہ الگ تھلگ رہ کر کڑھنے اور سلگنے یا ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا لینے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہمیں سب کے ساتھ مل کر چلنا ہے اور تہذیبِ حاضر اور وطنِ عزیز کی برکتوں اور نعمتوں سے دوسروں کے ساتھ بہرہ اندوز ہونا ہے۔ اس تحریک نے جہالت کے ازالہ اور اخلاق و اطوار کی تہذیب و اصلاح کا کام بیک وقت انجام دیا۔

اس تحریک کے بانی سید احمد خاں علیہ الرحمہ نے، جن کی قدروقامت کے سامنے گزشتہ دو سو سال کے بیشتر قدآور مسلم رہنما پستہ قد نظر آتے ہیں؛ اپنی تحریک کو نہ صرف خلوص اور ولولہ، بلکہ دانش مندی، حکمتِ عملی اور بصیرت کے ساتھ چلایا، جو کچھ فی الوقت ممکن تھا اس کو انجام دینے کی کوشش کی۔ موقع اور محل کا خیال رکھا۔ اور کسی وقت اصلاح کے تدریجی پہلو کو نظرانداز نہیں کیا۔ مثلاً انھوں نے لڑکیوں کی جدید تعلیم کو اس وقت چنداں اہمیت نہ دی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ ٹیکنکی تربیت سے جو

انھوں نے صرفِ نظر کیا، وہ بھی اسی وجہ سے۔ سید احمد خاں نے اپنے ذمّہ کوئی ایسا کام نہ لیا جو ہر چند کہ اچھا تھا مگر اس وقت درخورِ عمل نہ تھا۔ انھوں نے اپنی تحریک کو چند گنے چُنے مقاصد پر مبنی رکھا اور اسے اور اپنے خواب کو مقاصد کی ریل پیل اور تعبیروں کی کثرت سے بکھرنے نہیں دیا۔ انھوں نے اصولوں پر کوئی مفاہمت روا نہ رکھی۔ لیکن فروعات اور معاملات میں اس لچک اور داد و ستد کو آلۂ کار بنایا جس کے بغیر پیشرفت ناممکن تھی۔ سید احمد خاں نے حکومتِ وقت سے تعلقات کو خوشگوار بنایا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر مسلمان اسی طرح برہمی، علیحدگی اور غم و غصّہ کا شکار بنے رہے تو علم، روزگار اور اصلاح کی دوڑ میں وہ اس قدر پیچھے رہ جائیں گے کہ شبہ ہونے لگے گا کہ وہ کبھی دوڑے بھی تھے؟ انھوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنا ہندو مسلم اتحاد پر ڈالی۔ ایسے اتحاد پر جس میں اقلیت کی عزّتِ نفس اور اس کی روایات اور مفادات محفوظ رہیں۔

علیگڑھ تحریک بشکل ۷۰ سال چلی۔ آغاز میں انتہائی زور و شور کے ساتھ، برصغیر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک وہ مسلم اور تازہ ہوا اور روشنی بکھرتی چلی گئی۔ لیکن ۶۰ سال کے بعد ہی انحطاط شروع ہو گیا، اور گزشتہ ۲۵، ۳۰ سال میں اس انحطاط نے شدّت پکڑ لی۔

وہ خلوص، وہ دردمندی جس سے اس تحریک اور اس کی علامت علیگڑھ یونیورسٹی نے توانائی حاصل کی تھی، مفقود ہو گئی اور ان کی جگہ خود غرضی نے لے لی۔ علیگڑھ یونیورسٹی اور علیگڑھ تحریک کے ساتھ وفاداری، ہمدردی اور رہنمائی کا اعلان ہر کوچہ و بازار سے ہوتا ہے، لیکن یہ اعلان کرنے والے کیا یونیورسٹی کا حق ادا کرنے کے لئے کبھی تیار ہوئے۔ کیا انھوں نے حقوق و مطالبات کے نقار خانہ میں فرائض اور خدمت کی آواز پر بھی کبھی کان دھرا۔ یہ سچ ہے کہ یونیورسٹی کے آڑے وقت میں اس کے بیرونی ہمدرد قربانی دینے کے لیے بے محابا آگے بڑھے۔ لیکن خود گھر والوں نے کیا کیا اور کب تک۔ علیگڑھ میں نفسی نفسی کا یہ کاروبار جب تک جاری رہے گا۔ کوئی مجیر العقول اصلاح تو درکنار، خاطر خواہ اصلاح بھی اس ادارہ کی نہ ہو سکے گی۔ آئیے ہم سب اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھیں کہ آیا ہم اپنی ذات پر ادارہ کو ایک لمحہ بھی ترجیح دینے کے لیے تیار ہیں۔

تعلیم کی توسیع کی رفتار بھی رُک گئی اور اب ہندوستانی مسلمانوں کا شمار تعلیمی اعتبار سے ملک کے پسماندہ طبقات میں ہے۔

اور ایک بات جس میں علیگڑھ تحریک کبھی بھی دراڑ نہ ڈال سکی، ہماری جذباتیت ہے۔ عقل کی بالادستی کو ہم نے دراصل کبھی تسلیم نہیں کیا۔ ہمارا اوڑھنا بچھونا جذبات بنے رہے اور اب بھی ہیں۔ چنانچہ ہم اپنے

بھلے بُرے میں امتیاز نہیں کرسکتے۔ امکانات، عواقب اور نتائج کو عقل کی روشنی میں پرکھ نہیں پاتے۔ لہٰذا ہم دھوکا اور ٹھوکر ہم کھاتے رہتے ہیں، نعروں پر دھیان دیتے ہیں اور عقل اور عافیت اور پیشرفت کی راہ سے منہ موڑ لیتے ہیں۔

علیگڑھ تحریک کا اہم دوسرا جزو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس تھی۔ اس نے بھی ایک عرصہ سے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔

ضرورت ہے علیگڑھ تحریک کو نئی زندگی دینے کی ـــــ کیا خلوص، علم اور عقل کی بازیابی میں ہم کامیاب ہوسکیں گے؟ ہماری بقا اس امکان پر منحصر ہے کیا ہم علیگڑھ یونیورسٹی کو مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی کا ذریعۂ اولیٰ بنا سکیں گے؟ ہمیں خود سے پوچھنا ہے۔

کیا ہم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی رگوں میں خون زندگی دوڑا سکیں گے، تاکہ ملک میں بکھرے ہوئے مسلم تعلیمی اداروں کی شیرازہ بندی، توسیع اصلاح اور نگرانی ہو سکے۔ کیا ہم سائینٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق کو جس کا حال ہی میں احیا ہوا ہے، وہی مقصدیت اور افادیت دے سکیں گے جو اس کے عظیم الشان بانی کا مطمح نظر تھا۔ کیا ہم یونیورسٹی کو مقدار کی جگہ معیار، فرش کی جگہ بامعنی سکون، تقلید کی جگہ تنوع اور ایجاد، گفتار کی جگہ کردار، تن آسانی کی جگہ محنت اور پس ماندگی کی جگہ فضیلت اور کسب کمال سے ہمکنار کر سکیں گے۔ اگر ہم نے ایسا کر لیا تو ہم سب کی جیت ہے اور اگر ہم نے ایسا نہ کیا، تو علیگڑھ تحریک کا احیاء درکنار خود یونیورسٹی کی خیر نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بے حسی، بے دردی، بے علمی، بے عقلی اور بے عملی سے بچائے۔

۳۰ جنوری، ۱۹۸۳ء
(طلبا یونین کے ایک سیمنار کے موقع پر) ●●

بہیمیت یا تہذیب

"خواتین کو جنسی انداز سے ستانا، دلی کے مردوں کا معروف اور محبوب مشغلہ بن گیا ہے۔ "حوا سے چھیڑ چھاڑ" (EVE TEASING) کی اصطلاح گویا اس رسم کو بہ طیب خاطر تسلیم کرتی ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم تو عام طور پر یہ لیا جاتا ہے کہ عورتوں کو دیکھ کر "ہوس ناک" سیٹیاں بجائی جائیں اور آوازے کسے جائیں لیکن راہ چلتی عورتوں پر جو بپتا پڑتی ہے اس میں تذلیل بھی ہوتی ہے اور مردوں کا ان پر ظلم کر کے حظ اندوز ہونے کا پہلو بھی۔"

"اندرپرستھ کالج کے سامنے چند لڑکیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ موٹر سائیکل پر سوار دو نوجوان ان کے پاس آتے ہیں۔ انھیں بیباکی اور ہوس کے ساتھ گھورتے ہیں۔ ان پر دست درازی کی کوشش کرتے ہیں۔ لڑکیاں اعتراض کرتی ہیں، تو ان میں سے ایک لڑکا ایک لڑکی کے تھپڑ رسید کرتا ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ کے موٹر سائیکل چلا دیتا ہے اور کئی گز تک چیختی چلاتی ہوئی لڑکی کو گھسیٹتا لے جاتا ہے۔"

"رام کرشنا پورم کی سرکاری کالونی میں دو لڑکیاں سڑک پر جا رہی ہیں۔ ایک نوجوان سائیکل پر آ رہا ہے۔ جب وہ ان کے برابر سے نکلتا ہے، تو ان میں سے ایک لڑکی کی گردن پر تھوک دیتا ہے۔ غریب چلاتی ہے تو ہنس کر اس کے زخم پر نمک چھڑکتا ہوا نکل جاتا ہے۔"

"بسوں میں، سینماؤں میں، کالجوں میں، بازاروں میں، غرضیکہ ہر جگہ عورتوں کو ستا کر لذت اندوز ہونے کا سین دیکھنے میں آتا ہے۔ عورتوں کو چھیڑنے والوں میں سے بعض ہوا میں پیار کا اشارہ کر کے، یا سوقیانہ فقرے کس کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یہ عادت اتنی عام ہو گئی ہے کہ عورتیں اب اسے سڑک کے دوسرے خطرات کی طرح، جیسے تیز رفتار سواریاں اور گڑھے، بغیر احتجاج کے قبول کرنے لگی ہیں۔ لیکن ان بدمعاشوں میں سے بعض کے حوصلے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ لڑکیوں کو نوچتے ہیں۔ پیروں سے ان کے پیر دباتے ہیں، ان پر دست درازی کرتے ہیں۔ اپنے بدن کو ان کے جسم سے رگڑتے ہیں۔"

"یہ غنڈہ پن ہولی کے زمانہ میں اپنے شباب کو پہنچ جاتا ہے۔ عورتیں اب ہولی کے تصور سے کانپتے

لگی ہیں۔ ایک ہفتہ پہلے نوجوانوں کی ٹولیاں سڑکوں پر شکار کی تلاش میں گھومتی ہیں اور عورتوں پر رنگ سے اور بنارنگ کے یورش کرتی ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں ہولی کے زمانہ میں دو سو نوجوانوں نے جو چھڑیوں اور لوہے کی سلاخوں سے لیس تھے، ہندو کالج اور سینٹ اسٹیفن کالج کے احاطوں پر چھاپہ مارا۔ لڑکیوں کو کلاس روم سے کھینچ کر باہر نکالا اور ان کے ساتھ جی بھر کے دست درازی کی اور ارباب اختیار دیکھتے رہ گئے۔ بعض لڑکیوں کی تو ایسی گت بنی کہ انھیں گھر لوٹنے سے پہلے کپڑے بدلنے پڑے۔ سب سے افسوسناک پہلو اس داستان کا یہ ہے کہ انتظامیہ اور طلبہ نے طالبات کو بچانے کی کوئی فکر نہیں کی۔ طالب علموں نے تو خود کو غنڈوں کے خوف سے کمروں میں مقفل کر لیا اور پرنسپل اور اساتذہ لڑکیوں سے ٹک ٹک دیکھتے رہے۔"

"بے حسی اور بزدلی کے اس قسم کے مظاہرے شہر بھر میں ہوتے رہتے ہیں۔ شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص عورتوں کی مدد کو آگے بڑھے۔ تختۂ مشق بنی ہوئی عورت جب مدد کے لئے چلاتی ہے تو بھی کسی کے کان میں جوں نہیں رینگتی۔"

"چند ماہ ہوئے کالج کی ایک لڑکی کے ساتھ ۱۷ جوانوں نے ایک ہی بس میں چھیڑ خانی کی۔ ان میں سے ہر ایک باری باری لڑکی کے پاس گیا، اس کو پیار کیا اور بس سے اتر گیا اور مسافر دیکھتے رہے۔"

"ایک اور لڑکی کے ساتھ بس میں ایک نوجوان نے دراز دستی دکھائی۔ وہ چلائی تو نوجوان نے اسے تھپڑ مارا، دھینگا مشتی میں وہ بس سے گر گئی۔ کسی نے نوجوان کو روکنے یا پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔ عام طور پر ڈرائیور اور کنڈکٹر بھی مزاحم نہیں ہوتے۔ بلکہ کبھی کبھی وہ دست درازی کے خود مرتکب ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں پولس نے عورتوں کے ساتھ چھیڑ خانی کے الزام میں ۲۴۲۶ گرفتاریاں کیں۔"

"پولس نے بہت سے اقدامات اس بری عادت کو روکنے کے لئے کیے ہیں۔ لیکن بات ابھی تک بنی نہیں۔ لڑکیوں کا کہنا ہے کہ پولس کے جو خصوصی اسکواڈ کالجوں کے سامنے تعینات کیے گئے ہیں ان کا وقت اکثر گپ مارنے میں اور لڑکیوں کو گھورنے میں صرف ہوتا ہے۔"

"عورتوں کی تنظیموں نے بھی اس آوارگی کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ کہتی ہیں کہ ان کے پاس افراد، وسائل اور وقت کی کمی ہے۔ اس لئے وہ جہیز سے متعلق مظالم اور مجرمانہ حملوں کے دفعیہ سے آگے نہیں بڑھ سکتیں۔"

"اس موضوع سے متعلق سیمیناروں میں یہ تجویز بھی رکھی گئی کہ عورتیں آل پنیں اور پسی ہوئی مرچ (آلات دفاع کے طور پر) اپنے ساتھ رکھا کریں۔ لیکن یہ کوئی حل نہیں ہے۔ لفنگے شکار کھیلنے ٹولیوں میں نکلتے ہیں۔ اور اگر اکیلے بھی ہوں، تو ان کی طاقت کا پلہ عورتوں کے مقابلہ میں بھاری رہتا ہے۔ بلکہ جو عورت مقابلہ کرتی ہے اس کو اور

زیادہ ذلت کا منہ دیکھنا پڑتا ہے ۔"

اقتباس یہاں ختم ہوتا ہے ۔ آج دلی کا نقشہ کھینچا گیا، کل مدراس کی باری ہے ۔ اسی طرح سارے بڑے شہروں میں عورتوں پر مردوں کی شرمناک دست درازی کے حالات انڈین ایکسپریس میں چھاپے جائیں گے ۔ گویا یہ گھناؤنی بیماری ملک گیر ہے ۔ کیا یہی وہ قدیم تہذیب اور روایتی شائستگی اور پاک دامنی ہے جس پر ہمیں فخر ہے ؟ کیا ہماری بعض خواتین کا یہی مقدر ہے کہ شادی سے پہلے سر بازار لفنگے ان پر زبان درازیاں اور دست درازی کریں اور شادی کے بعد سسرال والے اور بے غیرت شوہر مال و زر کے مطالبات سے ان غریبوں پر عرصۂ حیات تنگ کردیں اور ان میں سے بہت سی سسرال والوں کی ایذا رسانی سے تنگ آکر خود کو جیتے جاگتے آگ کے حوالے کردیں اور جو خود نہ جلیں ان کو سسرال والے جلا ڈالیں ؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، اس کی سرشت میں اچھائیاں ہی اچھائیاں بھر دیں اور جب انسان کو گرایا تو تحت الثریٰ میں پہنچا دیا ۔ یہ انسان نہیں جانور ہیں، جو عورتوں کو ہوس اور بدزبانی اور دراز دستی، اور طمع اور ظلم کا تختۂ مشق بناتے ہیں، بلکہ یہ جانوروں سے بدتر ہیں ۔ ان میں نہ شرم ہے نہ حیا، نہ محبت ہے نہ وفا ۔ انسانیت انھیں چھو کر نہیں گئی ۔ انھیں اندازہ نہیں کہ تہذیب اور انسانیت دونوں کا تقاضا ہے کہ صنف نازک کی عزت کی جائے ۔

ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ ۱۷ جولائی کے شمارہ پر نظر پڑی ۔ آج ذکر مدراس کا ہے ۔ وہاں بھی ذن آزاری زندگی کا جزو بن گئی ہے ۔ اگرچہ دلی کا، مدراس مقابلہ نہیں کرسکتا ۔ یہ بات پھر دہرائی جاسکتی ہے کہ فی زمانہ جنوب شمال سے اطوار و اخلاق اور نظم و ضبط کے لحاظ سے کہیں بہتر ہے ۔ چلتے چلتے ایک بات اور کہہ دی جائے ۔ دنیا کو امریکہ نے بہت کچھ دیا ۔ اہل امریکہ میں بہت سی خوبیاں ہیں، ولولہ ہے، جستجو ہے، علم کی طلب ہے، ٹیکنولوجی پر گرفت ہے، جمہوری طرز فکر ہے ۔ اپنے قدرتی اور افرادی وسائل کے بازوؤں پر امریکہ نے تسخیر کائنات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ۔ اس نے آدمی کو چاند پر اتار دیا اور چاند سے بہت دور ان جہازوں تک اپنے بےجان لیکن خود نویس، عکس کار اور خبر رساں قاصد بھیج دیئے جو ستاروں سے کہیں آگے ہیں ۔ تجربہ، تجزیہ، تنظیم نے اسے سائنس، ٹکنالوجی اور صنعت و تجارت اور بندوبست (مینجمنٹ) کا قافلہ سالار بنادیا ۔ طالع آزمائی اور مہم جوئی میں بھی اس نے باقی دنیا کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ۔ کھیلوں کی اقلیم میں بھی اس کا سکہ چلنے لگا ۔ لیکن امریکہ نے خود دیوتاؤں کی طرح روایات، اقدار اور آداب کے بندھنوں سے بھی خود کو آزاد کرالیا ۔ انجام ظاہر ہے آوارگی، اوباشی، زر پسندی، مشین پرستی، اخلاق باختگی، اقدار سوزی ۔ اچھا ہوتا اگر بات یہیں تک رہتی

اور ہم یہ کہہ کر خاموش ہو جانے کہ نئی دنیا کو اس کا طرزِ زندگی مبارک۔ لیکن ٹکنالوجی کے انقلاب نے عالم کی طنابیں کھینچ کر رکھ دیں اور نئی دنیا اور پُرانی دنیا میں وقت اور دسترس کو دیکھتے ہوئے اتنا فاصلہ بھی نہیں رہا، جتنا پہلے ایک ریاست کے دو شہروں کے درمیان ہوتا تھا۔ امریکہ کی خوشحالی، اقبال مندی اور کاروباری سے مرعوب ہو کر ساری دنیا اخلاق و اطوار، وضع و لباس، طرزِ ادا، لب و لہجہ غرضیکہ سارے اسالیبِ زندگی میں اس توازنِ گم کردہ خطۂ زمین کی پیروی کرنے لگی۔ نظامِ جسمانی میں فساد ہو تو جلد پر پھوڑے، پھنسی، خارش اور ناسور کی شکل میں جھلک آتا ہے۔ ہپیوں پر نظر ڈالئے جو اپنے چیتھڑوں اور تہذیب کی قدروں کو پھونکتے ہوئے ایک زمانہ تک چار دانگ عالم میں گھومتے رہے۔ ان مخصوص کلیساؤں کو دیکھئے، جہاں ہم جنسوں کی شادی کا سوانگ رچایا جاتا ہے۔ "واٹرگیٹ" اور "لاک ہیڈ" کی داستانیں دہرائیے جو نئی دنیا کی سیاست اور تجارت کی بے ضمیری کا اعلان کر رہی ہیں۔ جرائم کے اعداد و شمار پر نگاہ دوڑائیے جن میں ۱۷ سال سے کم عمر والے غالب ہیں۔ اسکولوں کی خورد سال طالبات میں بن بیاہی ماؤں کی تعداد پر غور کیجئے۔ امریکہ کے جسم پر یہ سارے پھوڑے پھنسیاں اور اس کے روئے زیبا پر یہ بدنما دھبے سخت مند نگاہوں کو کراہت آمیز لپسپائی پر مجبور کرتے ہیں اور خود امریکی انھیں ہنوز اپنے رخِ روشن پر خال اور قد آور فربہی مائل جسم پر جوانی کے نقوش سمجھ کر نظر انداز کرتے رہیں۔ لیکن ستم یہ ہے کہ نئی دنیا جو کچھ آج کرتی ہے، پُرانی دنیا اُسے کل اختیار کر لیتی ہے۔ مشرقی دنیا نے بہ استثنائے مشرقِ بعید نئی دنیا کا حوصلہ، ولولۂ محنت، اور جستجو اور تجزیاتی اسالیب تو اختیار نہیں کیے لیکن بے راہ روی، بے ضمیری، لباس، اطوار، اقدار سوزی، روایات کشی، مشین پرستی اور چمک دمک اور پرستش زر کو بلا تکلف اپنا لیا۔ انسانیت اور راست روی اور اخلاق و کردار کو روئے زمین پر امریکہ کے اثرات نے بڑی طرح مسمار کیا ہے۔

خود ہمارے ملک میں اس کی مثال موجود ہے۔ پنجاب کا صوبہ زندہ دلی، محنت، آگے بڑھنے کی لگن، سنگلاخ زمینوں کو گلزار بنانے، پہاڑ کاٹ کے جوئے شیر لانے، ساری دنیا کو زیرِ قدم سمجھنے، زراعت اور صنعت کو اپنے نقطۂ عروج پر پہنچانے، ہم جوئی، طالع آزمائی کے لحاظ سے ہندوستان کی ریاستوں میں سرِ فہرست ہے۔ لیکن امریکہ کی طرح اس نے بھی سخت کوشی اور جانفشانی کے ساتھ ساتھ عیش کوشی اور کامرانی کو بھی شعار بنا لیا۔ اس نے اپنے راستے میں کوئی رکاوٹ قبول نہیں کی، خواہ وہ سفر کی دشواریاں ہوں، یا راہروؤں کی مخالفت یا اقدار اور اصول۔ اس نے شمالی ہندوستان کی تہذیبی روایات کو چشم زدن میں پامال کر دیا۔

جہاں جہاں پنجابی گئے انھوں نے ریاضت اور حوصلہ مندی، بے اصولی، زرپرستی اور بے عنوانی کی مثالیں قائم کردیں۔ دلی جوان کے زیر اثر ہے اس نے اپنے اطوار اور اپنا زاویہ نگاہ اہل پنجاب کی روش پر ڈھالا ہے۔ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں، صنف نازک کے ساتھ جو برتاؤ ملک کی راجدھانی میں کیا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اہل پنجاب کے اثرات کا رہین منت ہے۔ کیا عجب کہ دلہنوں سے جو مطالبات کیے جاتے ہیں اور جو انجام اکثر جہاں پر ہوتا ہے، وہ بھی اس زرپرستی، ہوس اور طمع کا نتیجہ ہوں جسے اہل پنجاب کی اقبال مندی اور خوش حالی نے سکۂ رائج الوقت بنادیا ہے۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کے ساتھ جو کچھ امریکہ نے کیا، ہندوستان کے ساتھ وہی پنجاب کررہا ہے۔

اب ہم اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ زنانِ آزادی کے اعداد وشمار میں سال بہ سال اضافہ کی بابت پولیس کے ترجمان نے یہ توجیہ کی ہے کہ پولیس کے تعینات کیے جانے کے بعد وہ عورتیں جنھیں چھیڑا جاتا ہے، ہمت کرکے آگے آنے اور رپورٹ درج کرنے لگی ہیں۔ واللہ اعلم۔ گزشتہ ماہ کچھ نوجوانوں نے جن کے خلاف عورتوں کو چھیڑنے کی رپورٹ کی گئی تھی، رپورٹ کرنے والے کے مکان پر دھاوا بولا اور اسے وہاں نہ پاکر اس کے لڑکے کو مار ڈالا۔

عام طور پر مردوں نے جس میں پولیس اور پولیس کی باوردی خواتین شامل ہیں، اس رائے کا اظہار کیا کہ چھیڑ خانی کے بہت سے واقعات کی ذمہ دار ایک حد تک خود عورتیں، بالخصوص کالج کی لڑکیاں ہیں۔

ایک پولیس آفیسر نے کہا کہ گزشتہ ماہ انھوں نے شکایت موصول ہونے پر ۱۵ نوجوانوں کو حراست میں لیا تھا انھوں نے اپنی صفائی میں کہا کہ لڑکیوں نے اپنے ہوس انگیز لباس اور اپنی اداؤں سے ان کی ہمت افزائی کی تھی۔

ریڈی میڈ کپڑوں کی فیکٹریوں میں سپروائزر، کام کرنے والی عورتوں کے خلاف گندی زبان استعمال کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ان کی مجال نہیں کہ مردوں کو اس طرح خطاب کریں۔

گندی بستیوں میں رہنے والی نچلے طبقوں کی عورتوں کو مقامی غنڈے اکثر ستاتے رہتے ہیں۔ ان کو اندھیری سڑکوں اور غریبوں کے گھر میں فراغت کا انتظام نہ ہونے سے خبث نفس کا اظہار کرنے میں مدد ملتی ہے۔

تعلیمی اداروں میں بعض اوقات استانیوں کے ساتھ خانگی نوکروں کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ لیڈی ڈاکٹروں کو سینیر ڈاکٹر چھیڑتے اور ستاتے ہیں۔

درمیانی طبقہ میں عورتوں کو بعض اوقات دیوروں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ اور جنسی آزار کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یہ تھا مدراس کی روداد کا خلاصہ جو انڈین ایکسپریس میں شائع ہوا — عورتوں کے خلاف بے عنوانی، بدتمیزی

اور ظلم کی رفتار تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ دوسرے امور کے علاوہ ان ہوسناک دراز دستیوں کی ایک وجہ مردوں اور عورتوں کا آزادانہ ملنا ہے۔ عورتیں گھر کی چہار دیواری میں رہیں، گھر چلائیں، بچوں کی پرورش کریں، یا باہر نکل کر مردوں کے دوش بدوش کام کریں؟ اس سوال کا جواب موجودہ زمانہ نے اپنے حالات اور شعور کے مطابق دیدیا ہے۔ کیا یہ جواب اطمینان بخش ہے! کیا عورتیں جب گھر سے نکل کر دفاتر وغیرہ میں کام کرتی ہیں، تو ان کے بچے غفلت اور بے ترتیبی کا شکار نہیں ہوجاتے؟ کیا نئی نسل میں ٹھہراؤ، ثبات، سکون اور خوشی کی جو کمی ہے، وہ بچپن میں ماں کی نگرانی اور شفقت سے محروم رہ جانے کی وجہ سے تو نہیں؟ طفولیت کا ڈر اور بے اطمینانی، جوانی میں بے حسی، بیدردی، بے مہاری کی شکل تو اختیار نہیں کرلیتی؟

مغربی ممالک اور مشرقی ممالک کے حالات الگ، ان کے مزاج مختلف؛ یہاں آبادی کی اتنی کثرت کہ بیروزگاری، کم روزگاری اور غریبی ترقی اور خوشی میں سدراہ ہیں۔ مغرب میں آبادی کی اتنی قلت کہ صنعت اور تجارت اور خدمت کی اقالیم میں مشینوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جارہا ہے اور موٹے موٹے زیادہ محنت کے کاموں کے لئے مزدور غریب ممالک سے درآمد کیے جاتے ہیں۔ ان کی معاشیات کا انحصار مشین اور سرمایہ پر، یہاں کی معاشیات کا انحصار افرادی طاقت پر۔ مشرقی ممالک نے آزادی کے بعد منصوبہ بند ترقی کا آغاز کیا، تو اس فرق کو بھول گئے۔ انھوں نے بڑی بڑی مشینیں درآمد کرلیں۔ چنانچہ بڑی صنعتوں میں اضافہ کے ساتھ روزگار کے مواقع گھٹتے چلے گئے۔

اسی قسم کی غلطی ان ممالک نے مغرب کی وضع پر عورتوں کو ملازمتوں اور ان کاموں میں ڈال کر کی، جو مرد بھی کر رہے تھے۔ جہاں لاکھوں مرد بے روزگار اور کروڑوں جزوی روزگار تھے، وہاں عورتوں کی مداخلت نے بے روزگاری اور کم روزگاری کی شدت اور بڑھادی۔ لیکن اس مسئلہ پر اتنی آسانی سے محاکمہ نہیں کیا جاسکتا اگر ملازمت نہ کریں تو وہ عورتیں کیا کریں جن کی شادی نہ ہوئی ہو۔ لیکن زمانہ کی رفتار کے مطابق دولت کی طرح روزگار بھی ان ہزارہا خاندانوں نے سمیٹ لیا ہے، جن میں میاں بیوی دونوں کام کرتے ہیں اور لاکھوں گھرانے ایسے ہیں جہاں نہ میاں کے پاس کوئی معقول دھندا ہے، نہ بیوی کے پاس۔

(۲)

۱۷ جولائی کے انڈین ایکسپریس (دہلی ایڈیشن)، سے ایک خبر مختصراً ذیل میں درج ہے جو حیدرآباد کے نامہ نگار کے قلم سے ہے:

"ایک اسٹیج آرٹسٹ کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا، کیونکہ راتوں میں ریہرسلوں کے دوران وہ حکام بالا کی

فرمائش پوری نہ کرسکی ؟

" ایک عورت حیدرآباد کے قریب ایک تھانہ میں لائی گئی، خطاً چھوٹی سی چوری ، سزا ، پولیس اسٹیشن میں مجرمانہ حملہ"

کئی انجمنیں عورتوں کو ستانے کے خلاف جہاد کررہی ہیں، لیکن بے نتیجہ۔

" استری شکتی سنگٹھن " یا " تنظیم طاقت نسواں " کی سکریٹری نے کہا کہ حیدرآباد بھی ، جسے اپنی شائستگی اور روایات پر ناز تھا ، اب دہلی کی پیروی کررہا ہے ۔ کسی عورت کے لئے تنہا نکلنا بہت بڑی سزا ہے ۔ مرد اس کا پیچھا کرتے ہیں ، اس پر فقرے کستے ہیں اور ستانا ہو تو اس پر حملہ کرنے میں بھی انھیں باک نہیں ہوتی ۔

عورتوں کا ستانا کلکتہ میں بھی شروع ہوگیا ہے ۔ درمیانی طبقہ کے بنگالی ، دہلی اور ملک کے بعض دوسرے حصوں کے مقابلے میں عورتوں کی زیادہ عزت کرتے ہیں ۔ رپورٹ کیے ہوئے واقعات کی تعداد ۱۹۸۱ء میں چوتھی ، ۱۹۸۲ء میں ایک ، لیکن اعداد و شمار پر اعتبار کون کرے ، خصوصاً ایسے معاملہ میں جہاں افشا کے بجائے اخفا کو مصلحتاً پسند کیا جاتا ہو ۔

گزشتہ دس پندرہ سال میں کلکتہ کا اخلاقی معیار بہت گر گیا ہے ۔ عورتوں کی اتنی عزت اب نہیں ہوتی جتنی کہ ہوا کرتی تھی ۔ اس کی وجہ ہے ذہنیت کا تجارتی قالب میں ڈھل جانا ۔

اخبارات اور رسالے ایسے اشتہارات چھاپتے ہیں ، جن میں عورتوں کو بطور جنس کے دکھایا گیا ہے ۔ فلموں کے اشتہارات بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں ۔ عورتوں پر مجرمانہ حملہ اور زہرہ گداز سزائیں ۔ عورت فلموں کا تانا بانا ہے ، اسے خرید سکتے ہیں ، بیچ سکتے ہیں اور لذت اندوز ہونے کے بعد اسے نکال باہر کرسکتے ہیں ۔ عورتوں کے خلاف جسارت کرنے والوں کی مثالیں یہاں اب بھی کبھی کبھی سامنے آجاتی ہیں ۔

۔ ۲۲ جولائی : مدھیہ پردیش کے باوردی بھیڑیئے زنا بالجبر کے علاوہ " پولیس والے بے سہارا عورتوں پر ہوس آمیز فقرے کستے ہیں ، ان کی طرف لذت طلب ڈھنگ سے بڑھتے ہیں ۔ عورتوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ، زنا بالجبر کی ایک ہلکی شکل ہی تو ہے ۔ اس علاقہ میں عورتوں کو خریدنا اتنا ہی آسان ہے ، جتنا بھینسوں کا خریدنا ۔

جاگیردارانہ سماج میں کھیتوں میں مزدوری کرنے والی عورتیں ، مالداروں کی عزت کا سامان ہیں ۔ زمیندار سمجھتے ہیں کہ ان کا پیدائشی حق ہے کہ ہر جگہ عورتوں کو اپنے بستر میں جگہ دیں ۔ " شری چندر شیکھر نے اپنی پد یاترا کے

دوران اس علاقے سے گزرتے ہوئے بتایا" ادیواسی عورتوں کے متعلق یہ تصور عام ہے کہ انھیں ذرا سی ترغیب
دو، تو وہ تمہارے بستر کے اندر نظر آئیں گی" چھبوا کے ادیواسی ضلع میں ہزاروں نوجوان اُندوز دھر اور دوسرے
قصبات سے بھگوریا کے میلہ کا رُخ اس لئے کرتے ہیں کہ آدیواسی عورتوں کے گداز بدن کی چٹکیاں لیں، پیترولاسے
انھیں کریدیں، انھیں چھیڑیں اور اپنے جسم کو ان کے بدن سے ٹکرائیں۔

ایک لڑکی نے کہا کہ بسوں میں زیادہ تر مرد اپنی نگاہوں سے ہمیں برہنہ کرنے میں مشغول ہوتے ہیں۔

قارئین کی نظر سے گزرا کہ دلّی، مدراس، حیدرآباد اور مدھیہ پردیش میں عورتوں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ
روا رکھا جاتا ہے۔ ہم پھر دہرائیں گے کہ کسی قوم کے مہذب ہونے کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اس میں عورتوں کا احترام کیا
جاتا ہو۔ اس سلسلہ میں قول فیصل انگریزی مضمون نگار (غالباً چارلس لیمب) کا ہے۔ جس نے کہا تھا کہ تعلیم یافتہ، خوشحال،
بااثر اور خوش پوش خواتین کی عزت کون نہیں کرتا۔ مہذب ہونے کی کسوٹی یہ ہے کہ عورت کی بہ حیثیت عورت کے عزت کی
جائے خواہ وہ دھوبن، گھوسن، یا مہترانی یا کنیز ہو۔ کچھ عرصہ پہلے کلکتہ میں یہی حال تھا۔ وہاں کسی کی مجال نہ تھی کہ کسی غریب
یا خستہ حال عورت کو حقارت کی نظر سے دیکھ سکے۔ اسی بنا پر راقم یہ سمجھتا ہے کہ باوجود جذباتی اور ہنگامہ آرا ہونے کے
اہل کلکتہ دراصل مہذب تھے۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس مرض کا علاج کس طرح کیا جائے جو وبا کی طرح پھیل رہا ہے اور جسے زن آزادی،
چھیڑ خانی، لذّت کوشی اور اظہار ہوس کے نام دیئے گئے ہیں۔ دراصل مذہب ہی ایسا ضابطۂ اخلاق ہے جس کے ابتدائی نقوش
بداطواری، بے شرمی، بدچلنی اور ہوس گفتاری کی راہ میں زندگی بھر حائل ہوتے ہیں۔ اگر یہ نقوش بچپن میں گہرے پڑ گئے، تو
گمراہی کے امکانات کم ہوتے جاتے ہیں اور اگر انسان بھٹکا بھی تو ایک باخبر تربیت یافتہ اور بیدار ضمیر اسے سرزنش کرنا
شروع کر دیتا ہے اور جس راہ سے وہ بھٹک کر گیا تھا، اس راہ پر واپس لے آتا ہے۔ مذہب کے علاوہ معاشرہ بھی اگر صالح
اور جری ہو تو افراد شرمناک برائیوں سے بچ جاتے ہیں۔ مذہب کے ساتھ ساتھ معاشرہ کا صحتمند رجحان بھی فرد کے ضمیر
کو بیدار اور گرم انتباہ رکھتا ہے۔

بہرکیف ہم ہندوستانیوں کے لئے جو ایک قدیم تہذیب سے بہرہ اندوز ہیں اور جنھیں مغرب کی مادیت کے مقابلہ
میں اپنی روحانیت پر ناز ہے، یہ طور طریقے جن میں مرد بے حجاب اور ہوس ریشہ اور درندوں سے بدتر ہو جاتا ہے، انتہائی
شرمناک ہیں۔ پرائی بہو بیٹیوں کو نہ صرف تاکنا، جھانکنا، بلکہ ان پر ہوس آمیز نگاہیں ڈالنا، ان کے متعلق گندے تصورات
کو دل و دماغ میں راہ دینا اور موقع ملنے پر انھیں چھیڑنا ستانا، بے عزت کرنا اور مختلف طریقوں سے اور مختلف مراحل
میں ہوس کا تختۂ مشق بنانا، اس سے زیادہ رذالت اور دنائت تصور میں نہیں آتی۔

●●

حاضرینِ کرام : سب سے پہلے اس جلسے کے منتظمین کا شکریہ ادا کردوں۔ شکریہ اس کا نہیں کہ آپ نے اتنی محبت سے پذیرائی کی، ایسے اعلیٰ پیمانے پر جلسے کا اہتمام کیا، ایسی فیاضی اور دریا دلی کا ثبوت دیا۔ شکریہ تو یقیناً اس کا بھی واجب ہے۔ لیکن میں کسی استقبال کی امید، کسی اعزاز کی تلاش میں نہیں نکلا ہوں۔ مجھے تلاش ہے ایسے مواقع کی کہ میں اپنے بھائیوں سے، دُور دراز کے علاقوں میں بسنے والے دوستوں سے، گفتگو کرسکوں، اپنے دل کی بات ان تک پہنچا سکوں۔ تو اصل شکریہ اس کا کہ آپ نے ایسا موقع فراہم کیا۔

حضرات ! میں آپ سے جو گفتگو کرنے والا ہوں۔ اس میں آپ کو زبان کا چٹخارہ نہیں ملے گا، جو تصویریں آپ کے سامنے پیش کرنے والا ہوں وہ کوئی دلکش و دل آویز تصویریں نہیں، جو کچھ میں عرض کرنے والا ہوں اس سے آپ کو سرور و انبساط کے بجائے ذہنی کرب حاصل ہوگا۔ آپ کے دل کو بے چینی محسوس ہوگی۔ مگر میں کیا کروں۔ مجھے احساس ہوا کہ قوم کو ایک سخت مرحلہ درپیش ہے اور یہ گھڑی امتحان کی گھڑی ہے۔ اس احساس نے مجھے مجبور کردیا کہ میں علی گڑھ سے قدم نکالوں اور دیوانہ وار سارے ملک کا دورہ کروں، اپنے درد میں آپ کو شریک کروں، ممکن ہے اس سے قوم کی بہتری کی کوئی سبیل نکل آئے اور اس دشوار مرحلے سے گزر جانے کا کوئی راستہ نکلے۔

دوستو ! اس وقت صورت یہ ہے کہ ہم مسلمان ہر جگہ اور ہر معاملے میں دوسروں سے بہت پیچھے ہیں۔ افسوس اس کا ہے کہ بہتوں کو تو اس پسماندگی کا احساس تک نہیں اور جنھیں احساس ہے بھی، ان پر ایسی بے حسی طاری ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ اقلیتی کمیشن کے جوائنٹ سکریٹری مسٹر سکسینہ نے دو ایسی باتیں کہی ہیں جو ساری قوم کو بے چین کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انڈونیشیا سے لے کر مصر تک جن ملکوں میں مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ آباد ہیں، وہاں وہ تعلیم، سائنس اور ٹکنالوجی میں اپنے ہم وطنوں سے بہت پیچھے ہیں۔ دوسری بات اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ اقلیت کو زندہ رہنے کے لیے اکثریت سے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے، اور دنیا میں ہمیشہ یہی ہوا ہے۔ لیکن تاریخ

میں پہلی بار اس کے برعکس ہو رہا ہے: ہندوستانی مسلمان اکثریت سے زیادہ تو کیا، اس کے برابر محنت کرنے کو بھی آمادہ نہیں رہا۔

اس بے حسی اور بے علمی کا اصل سبب یہ ہے کہ مسلمان جدید تعلیم سے محروم ہیں اور ملال اس کا ہے کہ یہ قوم ہے جس کے دین میں علم حاصل کرنے کو بےحد اہمیت دی گئی ہے۔ ارشاد ہوا کہ پیدائش سے موت تک برابر علم حاصل کرو۔ اے ایمان لانے والو مردو اور عورتو! علم حاصل کرو۔ جن اصحاب نے اس نظر سے قرآن حکیم کا مطالعہ کیا ہے ان کا بیان ہے کہ جن آیتوں میں کائنات کا مشاہدہ کرنے اور اس پر غور و فکر کرنے کے بعد نتائج تک پہنچنے اور علم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ اُن آیتوں سے گنتی میں کہیں زیادہ ہیں جو عبادات سے متعلق ہیں۔ یہ بات بھی توجہ کی طالب ہے کہ آج عربی میں سائنس کا ترجمہ علم ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی سے بارھویں صدی عیسوی تک یعنی چار سو سال مسلمان خدا اور اس کے رسولؐ کے اس حکم پر کاربند رہے۔ سائنس کے مؤرخین تسلیم کرتے ہیں کہ اس زمانے میں دنیا کا کوئی علم ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کا شرمندۂ احسان نہ ہو۔ علوم میں کوئی اضافہ ایسا نہیں ہوا جس کا سہرا اس دور کے مسلمانوں یا عربوں کے سر نہ رہا ہو۔ اس کے بعد چار سو سال ایسے گزرے جنھیں ڈھلان کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کے بعد مکمل تاریکی ہے۔ جہالت، زوال، بے حسی کی تاریکی۔ آج کا مسلمان علم، سائنس اور ٹکنالوجی سے کوسوں دور ہے اور ان تینوں چیزوں پر غیر مسلموں کی حکمرانی ہے۔

یہ صورت حال تشویشناک ہے۔ ہم سب کو مل کر اس طرف توجہ کرنی چاہیے اور علم کی دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ہم میں جو لوگ تجارت کر رہے ہیں، یا جنھوں نے کوئی صنعت قائم کر لی ہے، یا کسی دستکاری میں مہارت حاصل کر لی ہے، وہ اپنی ظاہری آسودہ حالی سے مطمئن ہیں۔ ان کے نزدیک تعلیم کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلانا وقت اور پیسے دونوں کا زیاں سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تعلیم حاصل کر کے وہ ان کے کام کے نہ رہیں گے اور اتنا نہ کما سکیں گے، جتنا بغیر تعلیم کے کما سکتے ہیں۔ وہ اس قدر صبر اتنا انتظار نہیں کر سکتے کہ ان کے لڑکے تعلیم مکمل کر لیں۔ ان ننھے ہاتھوں اور ناپختہ ذہنوں کو اپنی آمدنی میں اضافے اور اپنی آسائش کے لئے استعمال کرتے ہیں اور خدا سے نہیں ڈرتے۔ وہ اپنی ذرا سی آسائش اور آمدنی میں معمولی سے اضافے کی خاطر بچوں کو اپنے ساتھ لگا لیتے ہیں اور انھیں تعلیم سے محروم کر

یہ بڑی نادانی ہے، بڑی خام خیالی ہے۔ یہ بچے تعلیم یافتہ ہوں گے، تو کل آپ کے کاروبار کو بہت آگے بڑھا سکیں گے۔ سوچیے کیا بات ہے کہ مال ہم اپنے کارخانوں میں تیار کرتے ہیں، اسے ملک سے باہر بھیج کر لاکھوں روپے دوسرے کماتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہ تعلیم یافتہ ہیں۔ درآمد، برآمد کا فن بڑا پیچیدہ ہے۔ وہ لوگ اس فن سے واقف ہیں۔ درآمد برآمد کی بات بھی جانے دیجیے، سائنس اور ٹکنالوجی بہت تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ آج کل دنیا کا مجموعی علم ہر دس سال میں دوگنا ہو جاتا ہے، زمانہ کی تیز رفتاری کا اندازہ اس سے لگائیے۔ آنے والا زمانہ، ہمارے بچوں کا زمانہ اور بھی تیز رفتار ہوگا۔ صنعت میں، دستکاری میں عجیب عجیب تبدیلیاں ہوں گی۔ نئی نئی ایجادات ہوں گی۔ کتابوں، رسالوں، اور اخباروں کے ذریعے ان کا علم عام ہوگا۔ بے علم لوگوں کی رسائی ان سب چیزوں تک کیسے ہوگی؟ تو جناب یقین کر لیجیے کہ علم حاصل کئے بغیر ہمارے بچے ہمارے کام کو، ہمارے کاروبار کو، ہرگز فروغ نہیں دے سکیں گے۔ نہ ان کی شخصیت کی تعمیر ہو سکے گی، نہ اُن کا کاروبار بڑھ پائے گا۔

اگر آپ میری اس رائے سے اتفاق نہ بھی کرتے ہوں تو ایک اور بات قابل غور ہے۔ کما کر پیٹ بھر لینے میں کوئی کمال نہیں۔ یہ کام تو چرند، پرند سب ہی کر لیتے ہیں۔ لیکن جو چیز انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے، وہ ہے علم اور عقل۔ ان دونوں کا آپس میں گہرا رشتہ ہے کہ علم کے بغیر عقل کو جلا نہیں ہوتی۔ اس میں چمک نہیں آتی۔ کیا ہم یہ پسند کریں گے کہ ہمارے بچے کما کر پیٹ تو بھر لیں، لیکن علم سے محروم رہیں؛ ان میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہ ہو۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ انسان کا نشانِ امتیاز یہ ہے کہ ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر کسے، علم کی روشنی میں پرکھے۔

آخری بات یہ کہ خدا اور اُس کے رسول ؐ نے ہمیں علم حاصل کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ اور خُدا نے ان بچوں کو ہماری تحویل میں دیا ہے، ہمیں ان کا سرپرست مقرر فرمایا ہے۔ بہتر سے بہتر انداز میں ان کی پرورش کرنا ہمارا فرض ہے۔ خدا کے بتائے ہوئے راستے پر ان کا چلانا ہماری ذمہ داری ہے۔ بچپن سے انھیں کاروبار میں لگا کے اور انھیں علم سے محروم کر کے ہم خدا اور رسول ؐ کی نافرمانی کر رہے ہیں۔ مقام شکر ہے کہ ہمارے صنعت کار، تاجر اور اہل حرفہ بیشتر دین دار لوگ ہیں۔ لیکن خدا کا ایک اہم حکم ماننے سے وہ انکار کر دیں، تو ان کی دین داری کس کام کی۔ میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ حشر کے دن جب سوال ہوگا کہ ان معصوموں کو تمھاری تحویل میں دیا گیا تھا، تم نے اپنی ذرا سی آسائش کی خاطر انھیں ایک اہم حکم کی تعمیل سے روک دیا، انکی

شخصیت کے سنورنے اور توانا ہونے کے امکانات کو ختم کر دیا، انھیں علم حاصل نہیں کرنے دیا، تو دوستو!
بتاؤ تمھارے پاس کیا جواب ہوگا؟

خدا تعالیٰ تمھارے کاروبار میں ترقی دے۔ تمھاری دولت میں برکت ہو۔ اللہ تمھیں اور نعمتوں سے نوازے۔ مگر خدارا تم ان بچوں کو اللہ کی ایک اہم نعمت سے محروم تو نہ کرو۔

ہمارے کچھ بھائی ایسے بھی ہیں، جنھوں نے ماشاء اللہ تعلیم حاصل کر لی اور کسی بلند منصب پر فائز ہو گئے۔ اب وہ خوش اور مطمئن ہیں کہ انھیں دولتِ دنیا حاصل ہو گئی۔ ان کے بچے بھی ملک کے بہترین اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ ان بچوں کا مستقبل محفوظ ہے اور ان کے لئے ترقی کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن انھیں قوم کے باقی افراد کا خیال نہیں آتا۔ ان بھائیوں کا خیال نہیں آتا، جو زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں پر ان بھائیوں کا بڑا حق ہے۔ علم کی دولت بس اندازکرنے کے لئے نہیں، بانٹنے کے لئے ہے۔ یہ لوگ جو پسماندہ ہیں یہ بھی تو قوم کا ایک حصّہ، بلکہ بڑا حصّہ ہیں۔ یہ سمجھ لینا کہ ہم ان سے علیحدہ ہیں، دانشمندی نہیں۔ ہم سب ایک شجر کی شاخیں ہیں۔ ٹہنی اس وقت تک ہری بھری اور سرسبز و شاداب رہتی ہے جب تک وہ شجر سے جڑی رہے، علیحدہ ہو جانے کے بعد وہ مرجھا جاتی ہے، کمھلا جاتی ہے۔ پتّے منتشر ہو کر پامال ہو جاتے ہیں اور ٹہنی سوکھ کر آگ کی خوراک بنتی ہے اور آخرکار راکھ ہو جاتی ہے۔ ہمارے شاعر نے کہا تھا:

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ ٭ ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

یہی تعلق فرد و ملّت کا ہے۔ فرد ملّت سے کٹ کے اپنی حیثیت کھو بیٹھتا ہے:

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں ٭ موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

قوم سے ہمارا تعلق استوار رہنا چاہیے کہ اسی میں ہماری بقا ہے۔

ساری خرابی دراصل یہ ہے کہ: کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا۔ جو لوگ احساس کی دولت سے محروم ہیں، جنہیں زیاں کا کوئی احساس نہیں، انھیں کچھ کہنا فضول ہے۔ یہ لوگ اس معنی میں خوش نصیب ہیں کہ نہ یہ کچھ سوچنے کی زحمت کرتے ہیں، نہ انھیں قوم کی بدحالی کا خیال آتا ہے۔ اس لئے وہ ہر طرح کے ذہنی کرب سے محفوظ رہتے ہیں۔ مگر ایک جماعت وہ بھی ہے، جسے اس زیاں کا احساس ہے۔ اس نقصان کا غم ہے، قوم کی زبوں حالی کا صدمہ ہے۔ وہ دکھ جس کا اظہار نہ ہو، آخرکار کینسر بن جاتا ہے اور جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو حرفِ شکایت زبان پر لاتے نہیں تھکتے۔ حکومت کی شکایت، ناساعد حالات

کی شکایت۔ یہ عادت فضول بھی ہے اور مضر بھی۔ شکایت کرکے انسان ہلکا ہوتا ہے۔ اور اپنا وزن اور وقار کھو بیٹھتا ہے۔ کچھ کو فلک ناہنجار سے گلہ رہتا ہے۔ کیونکہ ہر مصیبت اُوپر ہی سے تو نازل ہوتی ہے! قوم کے کھوئے ہوئے اقبال کا یہ بے مصرف ماتم اور بھی مہلک ہے۔ اس سے قوتِ عمل مجروح ہوتی ہے۔ کام کرنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے۔ دل سے ولولہ اور اُمنگ رخصت ہو جاتے ہیں۔ شکوہ و ماتم سے بچنا اور سرگرم عمل ہو جانا وقت کا تقاضا ہے۔ نالہ و فریاد کرنے والے عمل کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک لمحہ برباد کئے بغیر اُٹھ کھڑے ہوں اور کچھ کر گزریں۔ اگر ہم اس خام خیالی میں ہیں کہ آسمان سے کوئی مسیحا اُتر کے ہمارے درد کا درماں کرے گا، کسی "مردے از غیب" کا ظہور ہوگا جو ہمارے بگڑے کام بنا دے گا، تو یہ خود فریبی ہوگی۔ یہ اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ اپنا کام آپ کیے سے ہوتا ہے۔ جو لوگ ہم خیال اور ہمدرد ہیں، جنھیں مسلمانوں کی زبوں حالی بےچین کئے ہوئے ہے، وہ ملک کے گوشہ گوشہ میں ملیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے جوار، اپنے حلقہ میں سب سرگرم عمل ہو جائیں۔ ان کے عمل کی مجموعی طاقت نتیجہ خیز اور بارآور ثابت ہوگی۔ کوئی ہمسایہ مدد کو نہیں آتا۔ ہمیں خود اٹھنا ہوگا، اپنی تقدیر آپ بنانی ہوگی۔

ہمارے ہموطن ترقی کی دوڑ میں بہت آگے نکل گئے۔ ہم اب تک جہاں تھے وہیں ہیں۔ کل تک ہم کارواں سالار تھے، آج گردِ کارواں ہیں اور گرد بھی [illegible] ... آگے۔ یاد رکھیے زمانہ بڑا بے رحم ہے۔ جو اپنا خیال آپ نہ کرے، زمانہ اس کا خیال نہیں کرتا۔ پیچھے رہ جانے والوں کو وہ مڑ کر دیکھتا تک نہیں۔ زندگی کا کارواں بڑا تیز رفتار ہے۔ ہمیں سبک خرامی اور سست روی کو ترک کرنا ہوگا۔ اپنی قوتوں کو مجتمع کرکے دوسروں سے تیز دوڑنا ہوگا کہ آگے نکل جانے والوں کو پکڑ سکیں۔ اس دوڑ میں کمزور مارے جاتے ہیں اور مارے جانا ان کی قسمت ہے۔ ہمارے شاعر نے کہا تھا:

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ؛ ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

"قدرت کا یہ قانون اٹل ہے کہ کمزور کو اس دنیا میں جینے کا حق نہیں۔ یہاں ضعیفی سے جسمانی کمزوری مراد نہیں، مراد ہے علمی، اقتصادی اور تکنیکی پسماندگی۔ جب ہی تو آپ نے دیکھا کہ تندرست و توانا عربوں کو یہودیوں نے جب اور جس طرح چاہا، مات دی۔ یوں کہ یہ قوم بیدار ہے، منظم ہے، تعلیم یافتہ ہے، سائنس اور

ممکنا لوجی پر مکمل گرفت رکھتی ہے۔ ہمیں اس پسماندگی سے نجات پانی ہوگی، جرم ضعیفی کے ارتکاب سے بچنا ہوگا۔ ورنہ وہ دن دور نہیں اور میں اس دن کے تصور سے کانپتا ہوں جب ہم صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جائیں گے۔

ہم اگر پسماندہ ہیں تو جس ملک میں رہیں اس کی دھرتی پر بوجھ بنیں گے اور بے آبرو ہوں گے۔ اگر ہم اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکے اور ملک کی ترقی میں کوئی رول ادا کر سکے، تو آنکھوں پر بٹھائے جائیں گے۔ آپ حضرات جو اس جلسہ گاہ میں جمع ہیں اور جنھیں خدا نے علم کی دولت اور مادی وسائل سے نوازا ہے اور جو میری اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کریں، ان میں تعلیمی بیداری پیدا کریں اور کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ جابجا تعلیمی ادارے قائم کریں اور کسی مسلمان بچے کو اَن پڑھ نہ رہنے دیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس ضمن میں میرے فرائض آپ سے زیادہ ہیں۔ میری ذمہ داریاں آپ سے بڑھ کر ہیں۔ اس لئے کہ میں اس ادارے سے منسلک ہوں، جو ہمارے آپ کے بہت بڑے محسن سرسید علیہ الرحمۃ کے تعلیمی اور اصلاحی مشن کا ایک حصہ ہے۔ سرسید ہمارے کارواں کے وہ سالار تھے، جن کا ہاتھ قوم کی نبض پر اور نظر مستقبل پر تھی۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے اعتماد کی بازیابی کی۔ اُن کی یاس کو آس میں بدلا۔ ان کو اپنی روایات پہ قائم رہنے کی ترغیب دی۔ ہمارے رہنما جذبات سے کھیلتے آئے ہیں۔ ان کی اپیل جذبات سے ہوتی رہی ہے۔ ایک سرسید ہی ایسے تھے جنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو عقل سے کام لینے کی تلقین کی۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کو پستی سے نکالنے کا واحد ذریعہ تعلیم تھی۔ اس لئے انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کا ایک وسیع منصوبہ تیار کیا۔ علیگڑھ میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اتنے بڑے ملک میں صرف ایک کالج مسلمانوں کی تعلیمی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا۔ انھوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی، جس کا مقصد سارے ملک میں جگہ جگہ تعلیمی ادارے قائم کرنا تھا۔ انھوں نے مختلف مقامات پر اس کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقد کیے اور جدید تعلیم کا ذوق عام کرنے کی کوشش کی۔ انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن ان کی چلائی ہوئی تعلیمی تحریک پچاس سال تک کامیابی کے ساتھ چلنے کے بعد مضمحل سی ہوگئی۔ آج اس تحریک کو پھر منظم طور پر زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔

سرسید کو احساس تھا کہ کانفرنس کا اجلاس تو سال میں ایک بار ہوتا ہے۔ یاد دہانی نہ کرائی جائے تو لوگ اس کی تجویزوں اور سفارشوں کو بہت جلد بھلا دیتے ہیں۔ مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے، ان کی سماجی برائیوں کو دُور کرنے کے لئے انھوں نے "تہذیب الاخلاق" نکالا۔ انھوں نے اس رسالے سے یہ کام بھی لیا کہ کبھی مہینے میں ایک بار، کبھی دو بار، گھر گھر پہنچ کر لوگوں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلایا کرے۔ یہ ان کے اصلاحی اور تعلیمی مشن

ترجمان تھا اور مسلمان قوم کو بیدار کرنے میں اس کا جو حصہ ہے، اس سے آپ سب واقف ہیں۔ محسوس ہوا کہ اسے از سر نو جاری کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ فروری ۱۹۸۲ء سے اسے دوبارہ جاری کر دیا گیا، جب محمد ہدایت اللہ صاحب نائب صدر جمہوریہ نے اس کا اجراء کیا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے اچھے نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ یہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کی اشاعت روز افزوں ہے اور یہ ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ رہا ہے۔ یہ رسالہ سراسر تعلیمی اور اصلاحی ہے۔

اس ملک میں ہم اقلیت میں ہیں اور اقلیت کو جانبر ہونے اور باعزت زندگی گزارنے کے لئے میرے خیال میں تین شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اپنے دینی مسلک اور اپنی صالح تمدنی روایات پر ثابت قدم رہے، جو اپنے عقاید سے وفاداری نہیں برتتے، ان کے بارے میں یہ خیال ہوتا ہے اور درست ہوتا ہے کہ یہ اپنے مذہب کے وفادار نہیں، تو ملک کے کیسے ہو سکتے ہیں۔ اور جس میں یہ صفت نہ ہو، وہ عزت کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اقلیت کو اکثریت سے زیادہ محنت و جاں فشانی کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ تیسری اور آخری بات یہ کہ پہلی شرط کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اسے اکثریت سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھنے چاہئیں۔ اس لئے کہ تعلقات خوشگوار اور شگفتہ رکھنے میں دونوں کا بھلا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ ہمارے آئین اور حکومتوں نے مختلف فرقوں کے درمیان جس برابری اور عدم امتیاز کا اعلان کیا ہے، ان کا نفاذ اکثریت کے ان افراد کے ہاتھوں میں ہے جو مختلف شعبوں اور اداروں میں برسر اختیار رہیں۔

میں جہاں کہیں جاتا ہوں مجھ سے مسلم یونیورسٹی کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے۔ آپ بھی یقیناً اس کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ اس ادارے سے ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک جذباتی لگاؤ ہے۔ شکاگو میں علیگڑھ کے ایک پرستار سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے گھنٹوں یہاں کے چپے چپے کا اس تفصیل سے ذکر کیا، جیسے برسوں یہاں رہے ہوں۔ بعد میں یہ معلوم ہو کر حیرت ہوئی کہ انھوں نے کبھی علیگڑھ کی سرزمین پر قدم نہیں رکھا۔

طلبا میں بدنظمی ایک عالمگیر حقیقت ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی علیگڑھ میں ضبط و نظم کی بہتر فضا ہے۔ ریڈنگ روم صبح آٹھ بجے سے رات کے دو دو بجے تک کھلے رہتے ہیں۔ اور پڑھنے والوں کی وہ کثرت ہے کہ بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی۔ اساتذہ کی مستعدی اور طلبا کی محنت سے ہم نے اپنے نقصان کی تلافی کر لی ہے۔ ایک سال برباد ہو جانے کا جو اندیشہ لاحق ہو گیا تھا وہ الحمدللہ دور ہو گیا۔ داخلے صلاحیت کی بنا پر کیے جا رہے ہیں۔ سال بسال داخلوں کی شرائط کو سخت اور معیار کو بلند کیا جا رہا ہے۔ داخلے اور امتحانات پروگرام کے مطابق ہو رہے ہیں

ہیں۔ اقامتی زندگی کو چیرہ دستوں تخریب کاروں اور استحصال آزماؤں سے پاک کیا گیا ہے۔

یونیورسٹی میں بہت سے نئے شعبے قائم ہوئے کیمیکل انجینرنگ کی شروعات پہلے ہو چکی تھی۔ اب اس میں باقاعدہ تعلیم ہو رہی ہے۔ نرسنگ کا کورس شروع کیا گیا ہے۔ ہوٹل منیجمنٹ کی دنیا میں بہت مانگ ہے یہ کارآمد کورس بھی ہمارے یہاں اگلے سال سے شروع ہو رہا ہے، فوڈ کرافٹ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے۔

یونیورسٹی میں عمارات کی کمی تھی، اُسے پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میڈیکل کالج میں ایک سو پچاس بستروں کا ایک نیا وارڈ زیر تعمیر ہے۔ ایک بہت بڑے سہ منزلہ ہوسٹل کی تعمیر مکمل ہونے والی ہے۔ اس میں پانچسو طلبا رہ سکیں گے۔ ایک اور اقامت گاہ نیو ہال میں کمروں کا اضافہ ہوا ہے۔ انتظامیہ عملہ کی عمارت تقریباً مکمل ہو چکی ہے سنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز کی عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ یونیورسٹی پالی ٹیکنک میں نصاب اور داخلوں میں غیر معمولی اضافہ آئندہ سال سے کیا جائے گا۔ لڑکیوں کے کالج میں ۲۰۰ لڑکیوں کے لئے ایک ہوسٹل کی منظوری حاصل کر لی گئی ہے۔ الغرض یونیورسٹی میں سنجیدہ تعلیمی اور تحقیقی فضا کو بحال کر دیا گیا ہے۔ اب نصابوں کی تجدید کی باری ہے، جس کے لئے یہ لمحہ موزوں ہے، کیونکہ یونیورسٹی نے ۱۰ + ۲ + ۳ وضع تعلیم کو قبول کر لیا ہے اٹھان کے لئے ضروری ساز و سامان فراہم ہے۔ اساتذہ سے طلبہ کی توقعات بڑھ رہی ہیں۔ بجا طور پر ضروری ہے کہ یہ توقعات پوری کی جائیں اور ہمارا قافلہ ولولے اور عزم کے ساتھ مقابلہ کی رزم گاہ اور معیار کی منزل کی طرف رواں ہو جائے۔

سامعین کے اس مجمع میں اہل علم ہیں، دانش ور ہیں، فضلا ہیں، صنعت کار اور اہل حرفہ ہیں، نوجوان اور طالب علم بھی ہیں۔ ان سب نے میری اس طویل تقریر کو انہماک اور تحمل سے سنا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں عرض کی گئیں، انھیں وہ قابل توجہ خیال کرتے ہیں اور یہ بیداری کے آثار ہیں۔ دکن کے مسلمان ہم سے پہلے جاگ چکے تھے اور تعمیری کاموں میں مصروف ہیں ہمیں ان کی پیروی کرنی چاہیئے۔ اور خود انھیں بھی کام کی رفتار کو تیز کرنا ہوگا کہ وہ بھی دوسری قوموں سے ابھی پیچھے ہیں۔ ہمیں اپنے پرانے اداروں کو مستحکم کرنا چاہیئے نئے ادارے قائم کرنے چاہئیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر آپ سب نے توجہ کی تو جلد شمالی ہند میں بھی ہمارے اداروں کا جال پھیل جائے گا۔ انشاء اللہ لیکن ہمیں نہ صرف ایسے اداروں میں اضافہ کرنا ہے، بلکہ عام اداروں میں منظم کوشش کے تحت بڑی تعداد میں داخل ہونا ہے۔ اس کے لئے ہمیں سر جوڑ کر کوشش کرنی چاہیئے۔

●●

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں
صدر جمہوریہ ہند کی تشریف آوری

عالیجناب صدر جمہوریہ ہند - جناب والا میں آپ کے خیر مقدم کے لئے اپنے دل میں خوشی، فخر، اطمینان اور امید کی ملی جلی کیفیت محسوس کر رہا ہوں - خوشی آپ کی تشریف آوری پر، فخر اس بنا پر کہ ہمیں اپنے وزیٹر کی زیارت کا موقع مل رہا ہے - اطمینان اس لئے کہ آپ کا وسیع قلب اور کشادہ شانے اس عظیم ملک کی ذمہ داریوں سے غیر جانبداری اور انصاف کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں . اور امید اس بات کی کہ آپ کے قدم مسلم یونیورسٹی کے استحکام، توسیع اور ترقی کے لئے نئی راہیں کھولیں گے -

محترم ! ایک سو آٹھ سال قبل سرسید احمد خاں نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنا ڈالی تھی جو ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کے مرتبے پر پہنچ گیا -

سرسید احمد خاں کا شمار جدید ہندوستانیوں کے بانیوں میں ہے - انھوں نے اس قوم کو جو حکومت کر چکی تھی، جو زندگی سے بیزار اور انصاف سے مایوس اور امید سے محروم ہو چکی تھی، پھر سے زندہ کیا، اُسے جینے کے گر سکھائے اور نئے علوم حاصل کرنے کے لئے اُسے تیار کیا - سرسید نے وہ طریقہ اختیار کیا جو ملک و ملت دونوں کے لئے یکساں سود مند تھا - ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنے سے ملک کی ترقی کی رفتار خود بخود تیز ہو جائے گی -

سرسید احمد خاں نے مسلم یونیورسٹی کی بنیاد وطن دوستی، انسانیت نوازی، اور غیرت ملی پر رکھی - انھوں نے ایم اے - او کالج کا مطمح نظر فراخدلانہ رواداری اور آزاد تحقیق و جستجو کو بنایا تھا اور یہی ان کا مسلک رہا ہے - ان کے تعلقات برادران وطن کے ساتھ نہایت شگفتہ تھے اور انھوں نے کالج کے دروازے اس حسین دُلہن کی دلربا آنکھوں کی طرح جس کا نام ہندوستان ہے اور جس کی ایک آنکھ ہندو ہے اور دوسری مسلمان، ہر مذہب و ملت کے لئے کھلے رکھے -

ابھی چند روز ہوئے پروفیسر اقبال نرائن وائس چانسلر بنارس ہندو یونیورسٹی اپنی فٹ بال ٹیم لے کر علی گڑھ تشریف لائے تھے - انھوں نے یہاں سے جاکر مسلم یونیورسٹی کے طلبا کی شائستگی، انہماک، اور خوشدلی کو خراج تحسین ادا کیا اور اس بات پر خوشگوار حیرت کا اظہار کیا کہ یہاں لائبریری صبح آٹھ بجے سے رات کے دو بجے تک کھلی رہتی ہے اور کھچا کھچ بھری رہتی ہے - علیگڑھ مسلم یونیورسٹی دراصل ہندوستان کی ملی جلی نمائندگی ملک کی دوسری یونیورسٹیوں سے

بہتر کرتی ہے۔ یہاں کی فضا فرقہ واریت، ذاتیت اور علاقائیت کے زہر سے محفوظ ہے۔ اس کے فرزندوں کی فہرست طویل اور درخشاں ہے۔ اس میں ایک سرے پر ظفر اقبال ہیں جو ہندوستان کی مایہ ناز ٹیم کے کپتان ہیں اور دوسرے سرے پر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ہیں جنھوں نے ملک کے جہاز کی کپتانی اپنی غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر وقار کے ساتھ کی جیسا کہ فی زمانہ جناب والا کر رہے ہیں۔

سر سید نے علیگڑھ کو جس تعلیمی تحریک کا مرکز بنایا تھا اس کو اردو سے اور اُردو زبان وادب کو اس تحریک سے بڑا فروغ ملا۔ علیگڑھ کا شمار اردو زبان وادب کے اہم مرکزوں میں ہے۔ اُردو زبان ہندوستان اور ایشیائی زبانوں کا ایک دلنواز سنگم ہے۔

ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے جو لڑائی لڑی گئی اسی زبان کے نعروں اور نظموں کی دھنوں میں لڑی گئی۔ اقبال کا "سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا" اور بسمل کی غزل کا مطلع :

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے ؞ دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

آج تک وطن عزیز کی فضا میں گونج رہا ہے اور ہندوستان کے اندر متحدہ قومیت کا تصور پیدا کرنے میں اُردو زبان کا کردار عہد آفریں رہا ہے۔ یہ ہندوستان کا سب سے بڑا لسانی سرمایہ ہے۔ اُردو زبان تاج محل سے زیادہ حسین، پُر شکوہ اور معنی خیز ہے۔ مجھے امید ہے کہ رواداری کی روایت اور قومی شعور بیدار ہوگا اور یہ مشترک میراث بالآخر مسند اقتدار واختیار پر بٹھائی جائے گی۔

سر سید احمد خاں نے اس یونیورسٹی کو اپنی عدیم المثال بصیرت کی روشنی میں تحصیل کمال علم کے لئے وقف کیا تھا اور آزادی کے بعد ہمارے ماہرین و منتظمین تعلیم نے اس مسلک پر مُہر لگا دی۔ چنانچہ اب اس کا شمار ان قومی یونیورسٹیوں میں ہے جو تعلیم کے قافلے کے کارواں سالار ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ تقسیم کی لائی ہوئی دشواریوں اور سراسیمگی اور اس کے بعد خود مختاری اور کردار کی بازیابی کی مہم اور اس کے بعد داخلی انضباط کے خلاف ایجی ٹیشن کے دور اب ختم ہو چکے ہیں۔ آپ کی حکومت نے ۱۹۸۱ء میں اسے خود مختاری اور اس کا اقلیتی کردار واپس دیدیا ہے۔ اب علی گڑھ میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوا ہے۔ یہ دَور سنجیدگی، ریاضت، انضباط اور انہماک کا دَور ہے۔ گویا طیارہ اب پرواز کے لئے پَر تول رہا ہے۔ محترم وزیر سے میری گزارش ہے کہ اپنی خصوصی توجہ سے ہمارے عزم پرواز کو محکم بنا دیں۔ ہمیں اس وقت بھرپور امداد کی ضرورت ہے۔ اداروں کی زندگی میں بعض لمحات غیر معمولی توجہ کے طالب ہوتے ہیں۔ ہم اپنے

معزز محترم وزیر کو اپنے مطالبات سے گراں بار نہ کرنا چاہیں گے۔ ہم ان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے یونیورسٹی کے وقار کو بحال کیا اور اساتذہ کو میرٹ پروموشن اسکیم کے ذریعے آگے بڑھنے کا موقع دیا۔

عالی جناب! اس یونیورسٹی کا اک فریضہ یہ بھی رہا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر غور وخوض کرے اور ان سے ملک کو روشناس کرائے۔ ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ ہندوستانی مسلمان پیچھے کی طرف جا رہے ہیں۔ ملازمتوں اور روزگار میں ان کا تناسب تیزی کے ساتھ گھٹ رہا ہے۔ ان کی تعلیمی حالت زبوں ہے۔ اس میں قصور ایک حد تک ان کا بھی ہے۔ کیا ہمارا ملک انھیں ان کی حالت پر چھوڑ کر مطمئن ہو سکتا ہے؟ یا آگے بڑھ سکتا ہے؟

جناب والا! اس وقت ملک میں انضباط شکنی، تشدد اور فرقہ واریت کی فضا روز بروز بڑھ رہی ہے۔ یہ بات انتہائی تشویشناک ہے کہ خوں ریزی کا جواز مذہب میں تلاش کیا جا رہا ہے، حالانکہ: "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا" اس وقت جو ہمارے ملک میں انتشار، اور علیحدگی پسندانہ ماحول پیدا کر رہے ہیں، ان کے خلاف ایک محاذ بنانا ہوگا اور اس کے لئے ہماری یونیورسٹی کے طالب علم جو اعتماد، محبت اور رواداری کے لئے معروف ہیں، اس ضمن میں ملک کے صالح عناصر کے ساتھ حکومت کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔

کاش کہ ہم علم کے ساتھ تحقیقی اور سائنسی مزاج بھی پیدا کر سکیں، تاکہ ہم مسائل کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا سیکھ جائیں۔

●●

زندہ دلانِ پنجاب

آج ہم ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ اس حسرت کے ساتھ کہ اس کا آغاز پہلے ہی کیوں نہ ہوا۔ ہمارا روئے سخن ان سفروں کی طرف ہے جو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو وقتاً فوقتاً کرنا پڑتے ہیں۔ بنیت خدانخواستہ سفرنامہ لکھنے کی نہیں۔ ارادہ صرف یہ ہے کہ ان اطلاعات میں جو معنی خیز یا دلچسپ ہوں، تہذیب الاخلاق کے قارئین کو شریک کر لیا جائے۔

۲۷ جون کو پنجاب کی قومی یکجہتی کانفرنس (PUNJAB STATE NATIONAL INTEGRATION COUNCIL) تیسری میٹنگ چنڈی گڑھ میں ہوئی تھی۔ وائس چانسلر کو پہلی میٹنگ میں شرکت کا موقع بھی ملا تھا۔ پہلی میٹنگ بھی تقریباً اسی زمانہ میں ہوئی تھی۔ زاد راہ میں سحری اس بار بھی شامل تھی۔ اس دفعہ موسم خوشگوار ہے۔ مانسون کے چھوٹے موٹے ہراول دستے موسم گرما کے قلعہ میں دراڑیں ڈال چکے ہیں۔ گزشتہ سال میٹنگ سے اُٹھ کر جمعہ کی نماز کے لئے گیا تھا، تو یہ خطرہ لاحق تھا خالی پیٹ ہے کہیں لُو نہ لگ جائے۔ ضعف ایمان کا کیا علاج! چنڈی گڑھ کی جامع مسجد نئی وضع کی ہے اور بہت خوبصورت۔ لیکن جگہ کے استعمال کرنے میں آرکیٹیکٹ نے کفایت نہیں برتی۔ اتنی ہی خوب صورت ایک مسجد میسور میں دیکھنے میں آئی تھی جس میں اس تفارع کا حُسن بھی شامل ہو گیا ہے۔

گزشتہ سال اس میٹنگ میں دارا سنگھ اور پرتھی پال سے ملاقات ہوئی تھی۔ آخر الذکر اب دنیا میں نہ رہے۔ قاتل کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ پرتھی پال سنگھ ہندوستان کے ہاکی کپتان رہے ہیں اور ان کا شمار دنیا کے بہترین کار نمایاں ماہرین میں ہوتا ہے۔ دارا سنگھ مشہور بلند قامت رستم تن پہلوان ہے۔ جو پردۂ سیمیں کی کشش کے آگے سپر انداز ہو گیا۔ ان دونوں کی شرکت سے اندازہ ہوتا ہے کہ پنجاب میں کھیل عوامی زندگی کا جزو ہیں اور انھیں ہنسی کھیل نہیں سمجھا جاتا۔ مہارت کے سامان فراہم کیے جاتے ہیں اور امتیاز کا اعتراف ہوتا ہے۔ آج کی میٹنگ میں بھی ایک صاحب نے ان پنجابیوں کا ذکر کرتے ہوئے جنھیں بین الاقوامی شہرت ملی ہے -

رگوندسنگھ کھوسلا کے ساتھ اشونی کمار کا نام لیا جو غالباً اولمپک ایسوسی ایشن کے نائب صدر مچنے گئے ہیں۔ ایک شہرۂ آفاق سائنس داں کے ساتھ کھیلوں کے ایک ممتاز منتظم کا نام لینا "اسنگت اور ناموزوں لگتا ہے لیکن اس قسم کی لغزش یا غلو کی ایک بڑی برکت یہ ہے کہ اس کی بدولت ہمیں دلوں کے اندر جھانکنے کا موقع مل جاتا ہے اور ایک پوری جماعت کی ترجیحات، رجحانات اور طرزِ فکر کے عوامل اور انداز سمجھ میں آجاتے ہیں۔ پنجاب نے تندرستی اور اس کے لوازمین کھیل کود، کسرت اور غذا کو ہمیشہ اہمیت دی ہے۔

صحت کے ساتھ ایک جلوس چلتا ہے جس میں آپ جینے کے ذوق، بھرپور زندگی بسر کرنے کی اُمنگ، ولولہ، اقدامیت اور آگے بڑھنے اور بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے جذبے، جفاکشی اور خطر جوئی اور مہم طلبی کو پہچان سکتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی راہ میں کسی کو حائل نہیں ہونے دیتے۔ خواہ وہ سستی ہو، یا تذبذب، یا خطرہ، یا وسائل کی کمی، یا رکاوٹوں کی زیادتی، یا اصول اور اقدار کا احترام۔ جو بھی سامنے آیا، ہٹا دیا جائے گا، یا کچلا جائے گا۔ ان کی قوت بازو موانعات کو قبول ہی نہیں کرتی۔ یہ لوگ ڈنکے کی چوٹ کماتے ہیں اور دھڑلے سے صرف کرتے ہیں۔ یہ جہاں پہنچ جائیں، اصلی مالک راہِ ہزیمت اختیار کرے۔ اسی طرح ہر کام جو بابوبل مانگتا ہو، اُسے دوسروں سے بہتر کریں گے۔ فٹ بال کے کھیل سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس میں بھی آگے بڑھ گئے۔ چاول سے انھیں کوئی نسبت نہ تھی۔ اس کی پیداوار میں ہاتھ ڈالا، تو بنگال کے کان کاٹنے لگے۔ غرض یہ کہ کہیں بند نہیں۔ ملکِ خدا تنگ نیست، پائے مرا لنگ نیست کی ان سے زیادہ موزوں مثال تصور میں نہیں آتی۔ یہ لوگ لڑتے جھگڑتے ہیں، تو بھی کام کی لگن اور ترقی کی رفتار دھیمی نہیں پڑتی۔ اس وقت اکالیوں کے ایجی ٹیشن نے ریاست کو دونیم کر دیا ہے، تشدد کا بازار گرم ہے۔ انتہا پسندوں اور نشانہ بازوں اور قاتلوں کی بن آئی ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے مجلس میں ایک صاحب نے دورانِ بیان کی رَو میں کہہ گئے کہ پنجاب کی اقتصادیات تباہ ہوگئی ہے۔ وزیرِ اعلیٰ دربارا سنگھ نے جو بہت ٹھنڈے مزاج کے ہیں اور ہر طرح کی بات کو طمانیت کے ساتھ سنتے ہیں، فوراً احتجاج کیا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ باوجود انتہا پسندوں کی تشدد آزمائی کے ریاست میں اقتصادی ترقی کی رفتار مدھم نہیں ہوئی۔

ایک پمفلٹ میں جسے افتخار نامہ کہیے اور جو کانفرنس میں بانٹا گیا تھا یہ بات بتائی گئی ہے کہ پنجاب دوسری ریاستوں سے کتنا آگے نکل چکا ہے۔ اس میں دیے ہوئے مندرجہ ذیل اعداد و شمار پر غور کیجیے :-

فی کس آمدنی	پنجاب	ہندوستان
فی کس آمدنی (روپیوں میں)	۲۶۴۲	۱۵۳۷
زمین اور فصلوں کا تناسب	۱۶۱	۱۲۳
سینچے ہوئے رقبہ کا مزروعہ رقبہ کے ساتھ تناسب	۸۱	۲۷
ایک ہیکٹر (ڈھائی ایکڑ) میں گیہوں کی زیادہ سے زیادہ پیداوار (کلوگرام میں)	۲۷۸۴	۱۴۳۷
ایک ہیکٹر میں چاول کی زیادہ سے زیادہ پیداوار (کلوگرام میں)	۲۷۳۶	۱۰۸۲
مرکزی بھنڈار کو گیہوں کی زیادہ سے زیادہ فراہمی فیصد	۷۳	
مرکزی بھنڈار کو چاول کی (زیادہ سے زیادہ) فی صد فراہمی	۴۸	
ٹریکٹروں کی سب سے زیادہ تعداد	۱ر۱۰ر۰۰۰	
فی کس دودھ کی زیادہ سے زیادہ یومیہ فراہمی (کلوگرام میں)	۵۴۱	۱۰۶
سال میں فی کس زیادہ سے زیادہ بجلی کا استعمال	۲۱۴	۱۳۰
زراعتی مزدوروں کی زیادہ سے زیادہ یومیہ اجرت	۱۴ روپیہ	
سو مربع کلومیٹر میں پکّی سڑکوں کا تناسب	۵۶ کیلومیٹر	۱۶

اس دَوڑ میں ہریانہ پنجاب کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے اور گاؤں گاؤں میں بجلی لگنے کا جہاں تک تعلق ہے، ہریانہ پنجاب سے جیت بھی گیا۔ شمال مغرب کی ان دو ریاستوں نے غذائی خودکفالت کے میدان میں ہندوستان کی لاج رکھ لی۔

ان ریاستوں کے برعکس حال یوپی اور بہار کا ہے، جہاں زندگی کی رفتاریں ہی بہت دھیمی ہے؛ اور اختلافات اور ذات پات نے اسے اور بھی دھیما کر دیا۔

آج کے جلسہ میں بہت سی تجاویز آئیں۔ کھیل ان میں بھی سرفہرست نظر آئے۔ جسم کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے۔ دماغ سے کچھ عرصے کام نہ لیجیے، زنگ نہ لگے گا۔ جسم کو تھوڑی مدت کے لئے ڈھیلا چھوڑ دیجئے، کام سے جائے گا۔ منگول جنھوں نے چشم زدن میں ساری دنیا کو زیر و زبر کر دیا، جن کی جفاکشی اور سخت کوشی اور سخت جانی ضرب المثل بن گئی ہے، جب وہ ہندوستان آئے تو وہ خود سلطان غیاث الدین بلبن کو خراج دینے سے بانہ ہو سکے۔ جس نے اپنی فوج کو کبھی نچلے بیٹھنے نہ دیا اور جو اس پر برابر لشکر کشی، ورزش اور مہم جوئی

سان رکھتا رہتا تھا۔ کسی جماعت کی ترقی کا راز مقصد کی لگن اور مسلک پر اعتماد کے علاوہ، صحت اور تعلیم بھی ہے۔ افرادی صلاحیت ان ہی دونوں کے زیر سایہ پروان چڑھتی ہے۔ صحت کے گُر کو اہلِ پنجاب نے پا لیا ہے گرہ میں سختی سے باندھ لیا ہے۔ "صحت" اور مہم جوئی نے انھیں ملک کے دفاع میں دخیل بلکہ شریک غالب بنا دیا ہے اور کھیلوں کے میدانوں میں بھی اُن ہی کا سکّہ چلتا ہے۔ پنجاب نے کسان ایسے پیدا کیے جو بنجر زمین کو گلزار بنا دیں۔ دھرتی سے سونا اگوا دیں اور صنعت کار ایسے جنھوں نے گھر گھر کو کارخانوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ شہد کے چھتّے کا سا عالم ہے۔ یہ لوگ خوب کماتے ہیں، خوب کھاتے ہیں اور (ز ولئے قسمت) خوب پیتے ہیں۔ محنت بھی کرتے ہیں اور عیش بھی اور ایک کو دوسرے کی راہ میں نہیں آنے دیتے۔

کھیلوں کا ذکر آیا تو لگے ہاتھوں ایک شکوہ بھی کر دیا جائے۔ ہاکی کو جو ہندوستان کی کلاہ میں پَر کی حیثیت رکھتی تھی، اہلِ پنجاب کے تصرف سے نقصان پہنچا۔ اُنھوں نے ہماری ہاکی کو طاقت دی، دَم دیا، لیکن وہ ذہن نہیں دیا جو ان دونوں کو سلیقہ سے فن کارانہ اور فتح مندانہ کام میں لا سکتا۔ ایسے کلائی اور کر کا وہ جادو نہ دے سکے۔ جس میں اس کھیل کا جمال اور کمال چھپا ہوا ہے۔ اور اپنے نقطۂ عروج پر شکوہ مرحوم کی نقاشی سے پہنچا تھا۔ بہرحال مرحوم ہاکی کا ماتم کب تک کیا جائے۔ اب تو کرکٹ کا جشن منانا چاہیے۔ ہم نے ایک روزہ کرکٹ کے عالمی کپ میں آسٹریلیا، انگلستان اور ویسٹ انڈیز جیسے سورماؤں کو شکست دے کر ٹرافی جیتی ہے۔ بہتوں کے گھمنڈ ٹوٹ گئے اور ہمارا سر فخر سے بلند ہو گیا۔

"کھیل کے تذکرہ سے اتنے صفحات سیاہ کر دیئے"۔ ہمیں قارئین کے خاموش احتجاج کا احساس ہے لہٰذا ہم کھیل کے میدان سے کانفرنس روم میں واپس ہوتے ہیں۔ دبی زبان سے یہ کہتے ہوئے کوئی قوم جسم پر دازی اور جفاکشی اور مہم جوئی اور گوے دچوگاں کے بغیر نہ صحت مند رہ سکتی ہے۔ نہ تیز رو زمانہ کی ہم قدم۔

کانفرنس کی تجاویز ہمہ گیر تھیں۔ ان میں سے بعض آرام کرسی والی بھی تھیں۔ لیکن اہلِ پنجاب ارضی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں؛ بلند پروازی اور نازک خیالی، یادہ گوئی اور ژولیدہ فکری کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر پاتے، سرِ محفل ٹوک دیتے ہیں۔ چنانچہ بات جہاں بیچ سے بیٹی اور دور کس اور دور از کار باتیں ہونے لگیں، وہیں کوئی سردار اٹھا اور کہا جس مقصد سے جمع ہوئے ہو، اس کی باتیں کرو۔ تعلیم اور پرچار ہوتا ہے لا یہ طے کرو کہ جو آگ اس وقت لگی ہوئی ہے، اُسے کیسے بجھائیں۔ پچھلی مجلس کی روداد پر بحث

ہونے لگی' تو معترض نے کہا، روداد کو چھوڑیئے۔ کام کی باتیں کیجیے'۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ایک صاحب نے تو یہ بھی جسارت کی کہ جب وزیراعلیٰ اپنا خطبۂ صدارت پڑھنے لگے تو کہا کہ تقسیم تو ہو گیا ہے' پڑھ کے کیا کیجیے گا۔ آخر میں جب سابق وزیراعلیٰ گفتگو کو پایان پر پہنچا رہے تھے، تو بیچ بیچ میں لوگ بے محابا اعتراض کرتے ہوئے در آتے تھے، اور یہ کسی مخالفت کی بنا پر نہ تھا۔ مساواتی جسارت کے بعض دلکش مظاہرے دیکھنے میں آئے۔

ایک صاحب نے کہا کہ پنجاب میں ۹۰ فی صد کاشتکار سکھ ہیں۔ اور ۸۰ فی صد تاجر اور دکاندار ہندو ہیں۔ ان کی تجویز تھی کہ ان دونوں کو روپے کی امدادی دار و ستد کے ایک نظام میں سلسلے میں اس طرح باندھ دیا جائے کہ باہمی اختلاف دب کر رہ جائیں۔ اس پہلو پر زور دیا گیا کہ اکالیوں اور ہندوؤں کا حالیہ اختلاف مذہبی اختلاف نہیں ہے۔ اس کی جڑیں اقتصادی ہیں اور برگ و بار سیاسی۔ غور کیجیے، ہندو مسلم فسادات میں بھی سیاست اور اقتصادیات گھس آتی ہیں۔

ایک سن رسیدہ خاتون ہمارے برابر بیٹھی تھیں۔ وہ آریہ سماجی ہیں اور اس تحریک کے بانی لالہ لاجپت رائے کے بہت قریب رہ چکی ہیں۔ ان کی لے پالک بیٹی کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ ان کی روایت ہے کہ لالہ لاجپت رائے نے اُنھیں ۱۹۲۵ء میں بتایا تھا کہ "کمبخت" (کمبخت تو ہم نے لکھ دیا ہے۔ اُنھوں نے کوئی زیادہ سخت لفظ کہا تھا، جو راویہ کی زبان پر نہ آیا' تو ہمارے قلم سے کیسے نکل سکتا) انگریز اور یہاں (اُنھوں نے ایک اور نام لیا تھا جس کو حذف کرنا موصوفہ نے قرینِ مصلحت سمجھا) ہمارے ملک کو کوڑھی بنا کر چھوڑیں گے۔ اس کے ٹکڑے ہو کر رہیں گے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ تقسیم سے ۲۲ سال پہلے لالہ لاجپت رائے کو اپنی سیاسی بصیرت کے تحت ایک نئے ملک کے وجود میں آنے کا یقین ہو گیا تھا۔ محترمہ نے مجھ سے سرگوشی میں یہ بھی کہا کہ پنجاب میں جو بھی ہنگامہ اس وقت ہو رہا ہے' اس کے پیچھے پاکستان کا ہاتھ ہے۔ سوءِ ظن کی اس کارفرمائی پر میں مسکرا کر رہ گیا۔

●●

استحصال

استحصال یا کمزوروں کا ناروا استعمال اس قدر عام ہے کہ بسا اوقات ایسا کرنے والوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ فطرت میں خون آلود پنجے اور دانت کا قانون رائج ہے۔ بات "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" سے بڑھ کر "میرا پاؤں تیری گردن" تک پہنچ گئی ہے۔

انگریزی میں اس کے مقابل EXPLOITATION کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ حصول مقصد کے لیے جائز استعمال کو بھی اکسپلوائٹیشن کہہ سکتے ہیں۔ لیکن "گریشم" کے قانون کے مطابق جس طرح کھوٹے سکّے بتدریج اصلی یا خالص سکوں کو نکال باہر کرتے ہیں؛ اسی طرح اکثر ایک لفظ کے بُرے معانی اس کے اچھے معانی کو بیدخل کر دیتے ہیں۔ رائج اگرچہ دونوں معانی ہیں تاہم اکسپلوائٹیشن سنتے ہی ذہن بُرے معانی یا ناروا استعمال کی طرف جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا ضروری نہیں کہ انسان کی فطرت اچھائی کے مقابلے میں بُرائی کی طرف زیادہ جھکی رہتی ہے۔

اُردو میں استحصال بُرے مفہوم میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ تحصیل، حصول، حاصل کرنا، استحصال ایک ہی مادّے سے نکلے ہیں۔ گویا "استحصال" حاصل کرنے کا وہ ڈھنگ ہے جو دوسرے کو محروم کر دے، یا نقصان پہنچائے۔ یعنی کسی کی قبر پر قصر تعمیر کرنا، کسی کے گھر کو جلا کر ہاتھ سینکنا؛ ایک قوم، دوسری قوم، ایک نسل دوسری نسل، ایک فرقہ، دوسرے فرقے، ایک جماعت، دوسری جماعت، ایک گروہ، دوسرے گروہ کا استحصال کرتا ہے۔ اس قسم کے ناروا اجتماعی استحصال کی بات بعد میں آئے گی۔ شروع میں ہم بتائیں گے کہ ایک فرد، دوسرے فرد کو کس کس طرح اپنی منفعت کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو استحصال دو خانوں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک استحصال بالجبر (اگر یہ اختراع جائز ہو) استحصال بالمکر۔ آخر الذکر کی بابت تجربہ کار لوگ کہہ گئے ہیں کہ:

چو احمق در جہاں باقیست کس مفلس نمی ماند

(دنیا میں جب تک بیوقوف بستے ہیں، کوئی غریب نہ رہے گا)

گویا سادہ لوح انسان وہ زمین ہیں جس میں چالاک انسان کھیتی کرتا ہے، یا سونے چاندی کی وہ کانیں ہیں جنھیں اہل دانش کھود کر تحصیل زر کرتے رہتے ہیں۔ "سادہ لوح" کی ترکیب پر غور کیجئے۔ انسان اپنی بات کو کس طرح ادا کرتا ہے، اس پر منحصر ہے کہ اس کی بات قبول کی جائے گی، یا رد کر دی جائے گی۔ کسی کو آپ برملا احمق کہہ دیجئے، آپ کی جان کا دشمن ہو جائے گا اور اگر بائی وہ اسی قدر مضبوط ہے جتنی عقل ناتواں ہے، تو وہیں آپ سے حساب چکالے گا۔ بیوقوف کہہ دیجیے تو بھی آپ کو معاف نہیں کرے گا۔ سادہ لوح کہیے تو انگیز کرلے گا۔ بشرطیکہ خود کو افلاطون نہ سمجھتا ہو۔ اور اگر "نیک نہاد" یا "بھلا مانس" یا "بہت ہی شریف" کہہ دیجیے تو بُرا سرے سے مانے گا ہی نہیں، کیا عجب کہ خوش ہو جائے۔ حالانکہ "احمق" سے "بہت ہی شریف" تک آپ نے جتنی لغات صرف کیں اتفاقیہ قبادلی اور مترادف سمجھتے ہیں۔ بُری بات کو اچھے پیرائے میں کہنا ایک انشا پردازی ہنر ہے۔ انگریزی نے تو اسے ایک اچھا سا نام دے دیا ہے :- EUP-HEMISM) یوفے مزم۔" سادہ لوح" کے اجزائے ترکیبی پر غور کیجیے۔ سادہ یا بے لکھی ہوئی تختی، ایسی تختی جس پر آپ جو چاہیں لکھ دیں، صاف پڑھا جائے گا۔ ایسا معلوم ہوگا کہ وہ تختی بنی ہی اس تحریر کے لئے تھی۔ وہ لوگ جن کے دل و دماغ کی تختی پر تجربہ اور سوجھ بوجھ کی تحریریں ہیں، سادہ لوح نہیں کہلاتے۔ اُس پر کوئی چابکدست لکھنے کی کوشش کرتا ہے تو عبارت جمنے نہیں پاتی۔ حرفِ غلط کی طرح یوں مٹ جاتی ہے جیسے پانی کی سطح پر لکھے ہوئے حروف۔

استحصال بالمکر کا نشانہ سادہ لوح بنتے ہیں۔ آئے دن خبریں سننے میں آتی ہیں کہ ایک شعبدہ باز سادھو یا فقیر کا روپ دھار کر آیا، دروازہ پر دستک دی اور کہا سائیں بابا آ گئے۔ گھر میں جتنا زیور ہے لے آؤ۔ اپنی چمتکار سے دوگنا کردیں گے۔ چمتکار میں شبہ نہیں لیکن اس کا فائدہ سائیں بابا کو ہی پہنچا۔

عطائی دوا فروشوں کا جادو سادہ لوحوں پر اور زیادہ چلتا ہے۔ مہلک سے مہلک مرض سے چھٹکارا دلانے کے وعدوں کو باور کر لیا جاتا ہے۔ یہ نہیں سوچتے کہ اس کی دوا میں اگر یہ تاثیر ہے تو یہ شخص بجائے جوتیاں چٹخانے اور دربدر کی خاک چھاننے لکھ پتی بن کر، محل بنا کر بیٹھا ہوتا۔

یہاں یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ سادہ لوحی مطلق نہیں، اضافی اصطلاح ہے۔ اس کا انحصار اس پر ہوگا کہ ضرورت کتنی شدید ہے اور ترغیب کتنی زبردست۔ ضرورت کی آنچ میں تجربہ اور فراست کے سارے حروف پگھل جاتے ہیں، تختی صاف ہو جاتی ہے تاکہ فن کار اس پر جو کچھ لکھنا چاہے لکھ دے۔

وہ لوگ جو اپنی رجولیت کو کسرِ نفسی کے انداز سے دیکھتے ہیں، عطائیوں کے طلسم ہوشربا میں بہت جلد گرفتار ہو جاتے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں صدیوں تک لوگ اس نسخۂ کیمیا کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ جو مٹی یا تانبے کو سونا بنا دے۔ کچھ خود بیوقوف بنے، کچھ نے دوسروں کو بیوقوف بنایا۔ ترغیب نے انھیں بیوقوف بننے کے لئے اس قدر آمادہ اور مستعد کر دیا تھا جس قدر تیار گرمیوں میں چیڑ کی نوک دار پتیاں (یا سوئیاں) آگ پکڑنے کے لئے رہتی ہیں۔

افراد کا استحصال، زر کی ہوس کے تحت ہی نہیں ہوتا۔ طاقت (ایک سے زیادہ مفہوم میں)، اختیار، اقتدار، نوکری، روزگار، ان سب کی طلب اچھے خاصے ہوشمندوں کو بیوقوف بنا دیتی ہے۔ نوکری دلانے کے بہانے لوگ گھروں کا صفایا کر دیتے ہیں۔ زر نقد کو جب سے فروغ ہوا ہے، ہندوستان میں دھوکہ بازوں کی بن آئی ہے۔ شرح بندھ گئی ہے۔ دس ہزار، پندرہ ہزار، بیس ہزار روپے داخل کر دیجیے، مشرق وسطیٰ میں کام کرنے کے لئے پروانہ مل جائے گا۔ ہزاروں سادہ لوح اس منظم فریب دہی، اس ریکٹ کا شکار ہو گئے۔ بیویوں کا زیور گھر کے برتن بھانڈے بیچے، مہاجن سے قرض لیا تب کہیں اتنا روپیہ جڑا کہ "ہنرمندوں" کی فیس ادا ہو سکے۔ جو پروانہ پا گئے، انھوں نے بھی بساط اور جواز سے کہیں زیادہ روپے ادا کئے۔ اور جو غریب پروانے سے محروم رہے۔ وہ ہمیشہ کے لئے تباہ ہو گئے۔

خیر، ان غریبوں کی تو کوئی غرض بھی تھی، ان دانشمندوں کو کیا کہیے جو صرف مستقبل میں جھانکنے کے لئے بیوقوف بننے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ ہاتھ دیکھنے والوں، جوتشیوں اور نجومیوں کا بازار جیسا آج کل گرم ہے، کبھی نہ رہا ہوگا۔ وزیر سے لے کر فقیر تک سب اسی حماقت کے اسیر ہیں۔ ستارے یا ہاتھ دیکھنے والے نے باہر پوچھ گچھ کر کے اور آپ کو، اور آپ کے گرد و پیش کو دیکھ کر کچھ محکم قیاس آرائیاں کیں، اور کچھ معتبر معلومات حاصل کر لیں۔ آپ کے ماضی کے کچھ صفحات آپ کے سامنے اُلٹ دیے۔ اور آپ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ آپ سمجھ بیٹھے کہ جو شخص گزری ہوئی باتیں بتا سکتا ہے، وہ آنے والی باتیں بتاتے ہوئے بھی نہ چوکے گا۔ آپ کے یقین کو اور پختہ کرنے کے لئے جوتشی جی آپ کے مزاج اور آپ کی ذہنی افتاد کے متعلق کچھ تبصرہ کر دیں گے جو ہر ہوش و گوش والا تھوڑی سی ملاقات کے بعد کر سکتا ہے۔ مستقبل کے متعلق اس کے پاس ابہام اور تعمیم کا ایسا لچکدار

ذخیرہ ہے کہ اس کی پیشینگوئی کو آپ کبھی غلط بتا ہی نہ سکیں گے۔ اور اگر واقعات کو آپ نے پیشینگوئی سے صریحاً متضاد پایا تو آپ غریب حافظے کو الزام دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے کہ جوتشی جی نے ٹھیک ہی کہا ہوگا، قصور آپ سے یا تو سننے میں سرزد ہوا یا یاد رکھنے میں۔

جوتشی، سادھو، پیر، فقیر، پنڈت، مولوی، ان میں سے بہت سے جہالت اور حماقت کا دل کھول کر استحصال کرتے ہیں، عقیدت اور مال دونوں کی شکل میں چڑھاوا وصول کرتے ہیں۔ اس گروہ کا نشان امتیاز یہ ہے کہ یہ دھوکا اپنی شبیہ کو اصل سے مختلف دکھا کر دیتا ہے۔ لوگ ان کا فریب یوں کھاتے ہیں کہ انھیں خدا شناس یا مستقبل شناس سمجھ بیٹھتے ہیں۔ لیکن فریب وہ لوگ بھی دیتے ہیں جو ایک عام انسان کی حیثیت سے آپ کی ہمدردی اور اعتماد حاصل کر لیتے ہیں ——————

ایک بار اعتماد حاصل کر لیا تو میدان ہاتھ آ گیا۔ انسان ذہنی طور پر اسی طرح کاہل اور آرام طلب ہے، جیسے شیر ببر جسمانی طور پر۔ کسی شخص نے کسی انسان پر ایک بار اعتماد کر لیا، تو اس کی ہر بات کو مانتا چلا جائے گا اور ذرا دیر کے لئے بھی یہ نہ سوچے گا کہ وہ بات ماننے کے لائق ہے بھی۔ ذہن کو وہ طاق پر بٹھا دیتا ہے کہ آرام کرو۔ کسی دوسرے کا دماغ، تمہاری خاطر جانفشانی اور ریاضت کر رہا ہے۔ پکی پکائی کھانے کو مل رہی ہے، تو ہم کیوں محنت کریں۔ شیر ببر شکار کے لئے شاذ ہی جاتا ہے۔ گوشۂ عافیت میں آرام کرتا ہے۔ شیرنی کو بھیج دیتا ہے کہ شکار کر کے لائے اور دسترخوان اس کے سامنے سجائے اور جب جنگل کے بادشاہ شکم سیر ہو جائیں تو شیرنی اور بچوں کی باری آئے۔ کھا کر ببر شیر پھر سو جاتا ہے۔ گویا آدمی بادشاہ کی طرح اس کے پاس بھی کوئی کام نہیں ہے۔ سوائے موقع موقع سے بڑے سر، فراخ شانے، شاندار ایال، پتلی کمر، اور درخشاں آنکھوں کی نمائش کے۔ ہاں ایک کا ذہن اور دوسرے کا جسم جب حرکت میں آتا ہے، تو باقی مخلوق تو اس کی گرد بھی نہیں ملتی۔

اجتماعی استحصال کی مثالوں سے تاریخ بھری ہوئی ہے۔ راجہ، مہاراجہ، بادشاہ، امیر، صوبہ دار، والئ ریاست، تعلقدار، زمیندار، مل مالک، ٹھیکیدار، مہاجن، سود خوار۔ غرضیکہ ہر شخص جس کے پاس طاقت، اختیار، یا دولت ہوتی ہے انصاف سے آنکھیں بند کر کے، ان انسانوں کو جن کے پاس ان تینوں میں سے کچھ نہیں ہوتا اور جو اس کے چنگل میں آ جاتے ہیں، آلۂ کار بنا لیتا ہے۔ یہ بات آسانی سے بھول جاتا ہے کہ وہ بھی انسان ہیں۔ اس کی طرح وہ بھی دل، احساس اور خواہشیں رکھتے ہیں۔ ان کا ضمیر ایک کونے میں پڑا ہوا چین کی نیند سوتا ہے

بلکہ سماج، روایت، رسم و رواج اور عادت نے اسے سُلا دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ظالم خود کو محسن، قاتل خود کو منعم اور جان بخش سمجھنے لگتا ہے۔

اکثریت والے اقلیت کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اقلیت کا تحفظ کر رہے ہیں۔ مذہب، رنگ اور نسل کے نام پر استحصال ہوتا ہے۔ اونچی ذات والے نیچی ذات والوں پر ظلم کے پہاڑ توڑتے چلے آئے ہیں۔ ان کا ضمیر مطمئن رہتا ہے کہ وہ پیدا ہی بالادستی کے لئے ہوئے ہیں۔ بالادستی دیکھتے ہی دیکھتے زبردستی میں بدل جاتی ہے۔ مظلوم انصاف طلب کرتا ہے، حقوق مانگتا ہے، دبا رہتا ہے تو باغی اور سرکش، احسان فراموش اور محسن کُش کہلاتا ہے۔ سماج اور سماج کی پروردہ عقل ہر ظلم اور ناانصافی جائز ٹھہراتی ہے، اس کے لئے دلیلیں لے آتی ہے۔

بین الاقوامی استحصال کو استعمار کا نام دیا گیا ہے۔ انگریز تجارت کرنے ہندوستان میں آئے، ہندوستان پر قابض ہو گئے، اسے کنگال کر دیا۔ اس کی صنعتیں تباہ ہو گئیں، اس کی خوش حالی کہانی بن گئی۔ وہ سوچتے رہے اور کہتے رہے کہ ہندوستانیوں کو مہذب بنانے آئے ہیں اور مہذب بنا کر چھوڑیں گے۔ انھیں اور اُن کے ملک کو۔ استحصال اور استعمار، ظلم اور ناانصافی کے حمام میں سب ہی ننگے ہیں، خواہ وہ سرمایہ دار ملک ہو یا اشتراکی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے روس نے افغانستان پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے بہادر اور غیور مجاہدین کو ہولناک جنگی ہتھیاروں کا نشانہ بنا ڈالا۔ اس ننگے حملے کا کوئی جواز نہیں۔ مگر شاطر عقل نے جواز ڈھونڈھ نکالا۔ بھیڑیئے نے میمنے پر حملہ کرنے سے پہلے یہی کیا تھا۔

افراد ہوں یا اقوام اپنے سے کمزور فرد یا قوم کا استحصال کرنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ نظر آتی ہیں۔ خود غرضی طغیانی پر آتی ہے تو نہ ضمیر اس کو روک پاتا ہے، نہ عقل، نہ روشن رائے عامہ، نہ سماج۔ اس کو اگر کوئی روک سکتا ہے، تو وہ دین ہے جس کے آگے شاطر عقل کی پیش نہیں جاتی اور جس کے چھونے سے مردہ ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ دین انصاف کا دوسرا نام ہے اس کے بغیر انصاف کا لیبل ظلم پر چسپاں ہوا ہے اور ہوتا رہے گا۔

استحصال داخلی ہوتا ہے یا خارجی۔ داخلی استحصال کی ایک مثال دے کر ہم ان سطور کو پایانِ تک پہنچا رہے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو قسمت، حکومت، اکثریت سے شکایت ہے۔ ظلم اور ناانصافی کی شکایت میں کچھ حقیقت ہے، کچھ مبالغہ، لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ انھیں گلہ اپنوں سے زیادہ ہونا چاہیئے، غیروں سے کم۔ مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں ہی سے پہنچا ہے۔ یہ قوم دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک چھوٹا سا خوش حال، تعلیمیافتہ، صاحبِ اقتدار طبقہ، باقی اَن پڑھ، جاہل، مفلس۔ پہلا طبقہ، دوسرے طبقے کے استحصال پر کمربستہ ہے۔ اس کا نمائندہ بن کر مراعات، امتیاز اور اثر حاصل کرتا ہے اور اس کے حقوق کو نظر انداز کر کے اپنی ذاتی اغراض پوری کرتا ہے۔ انحطاط آمادہ قوموں میں ہمیشہ ایسا ہوا ہے، اگر ہندوستانی مسلمانوں میں ایسا ہو رہا ہے تو یہ عبرت اور افسوس کا مقام ہے، حیرت کا نہیں۔ ●●

زبان کی اہمیت

اس زبان سے دُور یا محروم ہو جانا جس کا تعلق آپ کے تمدن، تاریخ اور تہذیب سے ہو بہت بڑا ذہنی، جذباتی اور روحانی افلاس ہے۔ اگر یہ محرومی ایک جیتی جاگتی زبان سے ہو تو اس سے زیادہ کربناک محرومی اور مفلسی تصور میں نہیں آسکتی۔ بلکہ ایسی زبان سے بھی جو بظاہر زندہ نہیں ہے، جو اب کہیں بولی نہیں جاتی، دُور ہو جانا، ایسا نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔

امریکہ کے شہر "کنعان نو" میں لاطینی زبان کی ایک معلّمہ نے جن کا نام "کیتھلین کالڈران" ہے، اپنے شاگردوں سے کہا کہ عالمی شخصیتوں کو خط لکھ کر یہ دریافت کریں کہ آیا اس زمانہ میں لاطینی زبان پڑھنے سے کچھ حاصل ہوگا۔

ساتویں جماعت کے طالب علم "کیمسٹن ڈن" کو "ڈاکٹر بارٹلیٹ گیامائی" کی طرف سے یہ جواب موصول ہوا :

"عزیزم مسٹر ڈن ! آپ ہم سے یہ نہ پوچھیے کہ ہم "ایک مردہ زبان کیوں پڑھتے ہیں"؟ لاطینی زبان مُردہ نہیں ہے، یہ جنوبی یورپ کی کئی زبانوں (اطالوی، ہسپانوی، فرانسیسی) کے روپ میں زندہ ہے، خود انگریزی زبان بھی ایک حد تک اسی پر مبنی ہے۔ یہ کلیسا کی زندگی میں جاری و ساری ہے اور مغربی دنیا کی رگوں میں دوڑ رہی ہے۔ یہ ان اکابر کی تصانیف میں سانس لے رہی ہے جنھوں نے قدیم زمانہ سے "بادلیئر" تک اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار اس میں کیا ہے۔ یہ زبان ہمارے دو ہزار سالہ تمدن میں سانس لے رہی ہے۔

ہم لاطینی زبان اس لئے پڑھتے ہیں کہ اس کے بغیر ہم اپنی تاریخ اور اپنے ورثہ سے آگاہ نہیں ہو سکتے اور اسے جانے بغیر ہم خود کو بھی نہیں پہچان سکتے۔ ہم لاطینی زبان اس لئے بھی پڑھتے ہیں کہ اس کے ذریعہ اپنی زبان کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ لاطینی پڑھ کر ہم انگریزی سیکھتے ہیں۔ جب ہم انگریزی الفاظ کے لاطینی مادّوں کو کھوجتے ہیں، تو ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ اُن کے معنی کیا تھے اور

کیا ہیں۔ لاطینی زبان کے ذریعہ ہم قواعد بھی سیکھتے ہیں۔ قواعد بیک وقت وہ دیرینہ فن اور سائنس ہے جو ہمیں اپنے خیالات کو اور اس کے نتیجہ میں اپنی حیات کو صفائی وقار اور سنجیدگی کے ساتھ ترتیب دینا سکھاتی ہے۔

اپنے والدین سے میرا سلام کہیے اور مسز کیلڈران سے اور خود آپ کو دعائیں ہی دعائیں۔ ظاہر ہے کہ مسز کیلڈران بہت اچھی استانی ہیں۔ اس پر تعجب ہونا بھی نہیں چاہیے۔ آخر ان کا نام لاطینی ہے، جیسا کہ آپ سے خطاب اور آپکی قدر کرنے والے اس نامہ نگار کا۔

خیراندیش ——— الف بارٹ لیٹ گیاما ٹی ۳ ؎

انگریزی کے سابق پروفیسر حال وائس چانسلر ییل یونیورسٹی کا مندرجہ بالا خط زبان کی اہمیت کے بارے میں ایک قابل قدر دستاویز ہے۔ زبان ہمیں سوچنے اور بولنے سمجھنے اور اظہار کرنے کے ڈھنگ سکھاتی ہے بلکہ محسوس کرنے کے آداب بھی۔ لہو کی طرح یہ ہمارے رگ و پے میں جاری و ساری ہے۔ نہانخانۂ دل سے لے کر طلسم خانۂ دماغ تک اسی کا سکہ چلتا ہے۔ حواس خمسہ کائنات سے جو کچھ جذب کرتے ہیں، زندگی ماحول سے جو کچھ حاصل کرتی ہے، انسانی وجود کا پیچیدہ نظام جو خبریں، جو پیغام، جو دھمکیاں یا سندیسے دماغ تک بھیجتا ہے، وہ سب زبان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ انسانی فکر کا ارتقا ساری اجتماعی ترقی، تمام ذہنی تسخیرات، ایک حد تک زبان کی دین ہیں۔ ہمارے شدید ترین جذبات اور لطیف ترین احساسات زبان کے ساتھ گتھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دماغ نے جہاں کام کرنا شروع کیا، زبان سرگرم عمل ہو گئی کہ ترجمانی تعبیر اور توضیح پر وہ مامور ہے۔ ٹیلی کمیونیکیشن (جدید ذرائع ابلاغ) کا سارا کاروبار دھرا رہ جائے اگر دوسرے سرے پر کوڈ کو کھولنے اور سمجھنے کا سادھن نہ ہو۔ انسانی وجود کے نظام میں زبان کی اہمیت ایسے ہی سادھن کی ہے۔ انسانی کے حواس کچھ اطلاعات بھیجتے ہیں، ان کے کوڈ کو زبان ہی کھولتی اور ان کے منشا و مفہوم کو زبان ہی سمجھتی ہے۔ نطق (گویائی) اور منطق کا مادہ ایک ہی ہے۔ زبان نہ ہوتی تو نہ صرف فکر بلکہ زندگی، ترتیب، تنظیم، تعدیل، سلیقہ اور استواری سے محروم رہ جاتی۔ زبان انسان کی کائنات میں اس طرح پھیلی ہوئی ہے جیسے بدن میں نسیں۔ کروڑوں، اربوں افراد کے درمیان یہ رشتۂ ارتباط ہے۔ خود اس سے فروغ پاتا ہے، جماعت اس سے تشکیل پذیر ہوتی ہے۔ وہ لوگ بے غیرت ہیں اور فنا آمادہ جو اپنی زبان کو بھلا دیتے ہیں اور خوف طمع یا ناعاقبت اندیشی یا کاہلی کی بنا پر اپنی زبان کو مٹنے دیتے

ہیں۔ انسانی جسم کا خاصّہ ہے کہ خارجی مادّہ کو رد کر دیتا ہے۔ صالح انسانی ذہن بھی اسی طرح خارجی زبان کو اپنے میں پیوست نہیں ہونے دیتا۔ وہ خارجی زبان سیکھتا ہے۔ لیکن اس کی پذیرائی مہمان کی طرح کرتا ہے! اسے غور و فکر، اور ردّ و قبول اور داخلی پیغام رسانی کے کام میں نہیں لاتا۔ ذہن اگر ایسا کرنے لگے تو وہ بےغیرت اور بےحیا ہے۔ اس کی نہ آبرو باقی رہے گی نہ ساکھ۔ گوشت کا ناخن سے جدا ہونا تصور میں آتا ہے۔ لیکن انسان کا اپنی زبان سے جدا ہو کر زندہ رہنا اور اپنے وجود کو برقرار رکھنا سمجھ میں آنے والی بات نہیں: جو زبان کو ٹھکرا سکتا ہے، اُسے اپنی ماں کو دھتکارنے میں بھی کوئی تامّل نہ ہوگا۔

دانس چانسلر کے مذکورہ خط سے زبان کی وسیع اور دلنواز کائنات کے بارہ میں بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ داد و ستد، اشتقاق، خود نگری، خودداری، خود شکنی اور افزائش نسل کا وہ سلسلہ جن سے الفاظ کا سابقہ رہتا ہے، حیرت خیز اور جستجو انگیز ہے۔ الفاظ اپنی صورت اور سیرت، شکل اور معنی صحبت اور سنگت کس طرح بدلتے ہیں، یہ ایک بڑی دلکش داستان ہے۔

ایک آخری جملہ اُس غیر معروف معلّم کے بارہ میں جسے وہ شہرۂ آفاق پروفیسر داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اچھے استاد سبق رٹانے کے بجائے اپنے شاگردوں کے ذہن میں جستجو کو مہمیز دیتے ہیں، اُن کے اُفق کو وسیع کرتے ہیں اور انھیں استفہام، تجسس، تحقیق اور تحیّر کے آداب سکھاتے ہیں۔

●●

علی گڑھ اولڈ بوائز سے دو باتیں

شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ میں تقریر

شبلی نیشنل کالج بھی جیسا کہ آپ سب حضرات جانتے ہیں، علیگڑھ تحریک ہی کا ایک نتیجہ ہے۔
علامہ شبلی سرسید کے دست راست تھے۔ آپ ان کی تاریخوں میں جائیں، یہ تو بہت اہم کالج
ہے، مسلمانوں کے اور کالجز (COLLEGES) بھی ان کا رشتہ بھی کسی نہ کسی طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے جڑتا ہے اور
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اپنا وہ کردار بھی ادا کرنا ہے جو کہا گیا ہے کہ اگر کوئی تحریک ادارہ ہو کر رہ جائے
تو اپنے نقطۂ انجماد کو پہنچ گئی! تو خدا نہ کرے کہ علی گڑھ محض ایک ادارہ ہو کر رہ جائے! یہ ایک تحریک
ہے اور اس تحریک میں آپ اسی طرح شامل ہیں جس طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی
کہ جو ادارہ شبلی نیشنل کالج کو چلا رہا ہے اس کا نام مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہے۔ یہ بھی سرسید کے منصوبے اور
نقطۂ نگاہ کے عین مطابق ہے۔ چونکہ سرسید نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنا اس لئے ڈالی تھی کہ
علی گڑھ کے باہر ہندوستان کے گوشے گوشے میں مختلف کالجوں کا قیام ہو اور جو کالج قائم ہیں ان کی امداد
اور ان کی رہنمائی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کر سکے۔ آپ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس خدا کے فضل سے
کام کر رہا ہے، فعال ہے لیکن آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو اب کروٹ لینی ہوگی۔ کیونکہ بغیر اس کی مدد
کے، یونیورسٹی کے لئے یہ دشوار ہوگا کہ مختلف کالجوں سے جس قسم کا رابطہ ہونا چاہیئے وہ رابطہ قائم ہو سکے۔
مسلم یونیورسٹی کے ترمیمی ایکٹ میں ایک دفعہ ایسی رہی ہے جو یونیورسٹی پر یہ ذمہ داری بھی عائد کرتی ہے
کہ وہ مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی اصلاح اور پیشرفت کے لئے سعی کرے۔ اس دفعہ میں بہت سے امکانات مضمر
ہیں اور خدا نے چاہا تو یونیورسٹی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو ساتھ لے کر ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی
کوشش کرے گی جو علی گڑھ تحریک کے بانی نے اس کو سپرد کی تھی اور جس کی تائید مزید پارلیامنٹ کے ایوان
میں ترمیمی بل کے ذریعہ سے ہوئی۔ یونیورسٹی کے کورٹ کی تشکیل ہونے والی ہے۔ اس میں بھی بڑی ضرورت
اس کی ہے کہ ملک بھر میں جو لوگ اہل فکر ہیں، جو لوگ صلاحیت رکھتے ہیں، وہ یونیورسٹی کے انتظام میں دخیل ہوں،
یونیورسٹی کے کورٹ کی ممبر ہوں یا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ممبر ہوں۔ اس کے لئے علی گڑھ کے اولڈ بوائز کو

اور ان کالجز کو، جن کا یونیورسٹی سے دیرینہ تعلق ہے، کوشاں ہونا پڑے گا۔ اور میری آپ سے اپیل ہے کہ اس بات کی طرف بھی آپ توجہ کریں۔ یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے جو حکومت نے آپ کے مطالبہ پر آپ کو سونپی ہے کہ آپ اپنی یونیورسٹی کا انتظام خود سنبھالیں۔ یہ خوشی کا موقعہ ہے، تہنیت کا موقع ہے، لیکن یہ آزمائش کا موقع بھی ہے! یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے جو ہمیں سونپی گئی ہے اور ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہم اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک پرآشوب دور سے گزری ہے۔ مجھ کو جب یہ ذمہ داری سونپی گئی تو میں نے صرف اس نیت سے قبول کیا کہ میں اپنی بساط کے مطابق اس کے معیار کو اونچا کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہی میرا مقصد ہے، یہی میرا مدعا ہے اور خدا گواہ ہے کہ میں نے اس مقصد سے کبھی انحراف نہیں کیا اور اس مقصد کو ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہیں کیا۔ میرے افعال یا میرے فیصلوں کے نتائج کیا ہوئے، یا ایسے نتائج بھی کبھی کبھی ہو گئے جو میرے تصور سے پرے تھے! اس کے متعلق میں کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔ یہ فیصلہ بہر حال آپ کو خود کرنا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یونیورسٹی اس پرآشوب دور سے نکل آئی ہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ اصلاح کا ہر قدم احتجاج اور بغاوت کو جنم دیتا ہے۔ ایک روش یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انسان اپنا وقت گزار دے: عافیت اس میں سمجھے کہ مدت معینہ کے لئے وہ ایک جگہ پر آیا ہے، اپنا وقت گزار دے اور چلا جائے۔ اس میں کوئی دشواریاں نہیں ہیں، راستہ آسان ہے۔ لیکن یہ راستہ جو میں نے اختیار کیا، یہ ایک پرخطر راستہ ہے۔ میری کوشش یہ رہی ہے کہ ہر آنے والا دن کل سے بہتر ثابت ہو اور مجھے اب بھی یقین ہے اور حالات نے جو کروٹ لی ہے، پچھلے پانچ ماہ میں، جس طرح سے لڑکوں نے جس انہماک سے پڑھائی کی ہے اور جس طرح سے ریڈنگ روم رات رات بھر بھرے رہے ہیں، ایک بڑی نیک فال ہے اور اس سے ہم نہ صرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بلکہ تمام ملت کے لئے بہت سی امیدیں وابستہ کر سکتے ہیں۔ یہ لڑکے جو اس محنت، اور اس انہماک اور اس سنجیدگی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں، کوئی طاقت ان کو پیچھے نہیں ہٹا سکتی۔ یہ جوش میں آ کے بھٹک تو سکتے ہیں، لیکن جب ان پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ ان کی بھلائی کے لئے کیا جا رہا ہے، تو کوئی طاقت ان کو پیچھے نہیں ہٹا سکے گی۔ یونیورسٹی میں بہت سے ایسے لڑکے ہیں جن کے والدین ان کو اپنا

پیٹ کاٹ کر بھیجتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر اس بات پر تکے ہوئے ہیں کہ وہ یہاں سے کیریر بنا کر نکلیں گے اور جب وہ یہاں سے باہر جائیں گے تو فخر اور اعتماد کے ساتھ جائیں گے۔ یہی ان کا مقصد ہے، یہی آپ کی دعائیں ہوں گی، یہی میرا مشن ہے کہ ہمارے لڑکے، ہمارے طالب علم، جب علی گڑھ سے نکلیں تو کسی یونیورسٹی کے طالب علم سے کسی بات میں پیچھے نہ ہوں۔ وہ اپنی لیاقت، صلاحیت اور اہلیت کے بل پر ہر جگہ سرخرو ہوں۔ جس امتحان میں بیٹھیں اس میں کامیاب ہوں اور سرخروئی ان کے قدم چومے! یہی میری تمنا ہے، یہی آپ کی دعائیں ہیں، اور یہی اس عظیم تحریک کے بانی کی نیت تھی۔ سرسید نے جب علی گڑھ تحریک کا آغاز کیا، تو ان کے ذہن میں یہی تھا کہ ایسے بچے یہاں تعلیم پائیں جن کا رشتہ اپنے مذہب اور اپنے تمدن کے ساتھ استوار ہو اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے ذہنی اُفق میں جدید زمانے کے سارے انکشافات اور سارے علوم سما جائیں۔ سرسید نے یہی خواب دیکھا تھا اور اس خواب کی تعبیر اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ایک بات اور عرض کروں: یونیورسٹی کا سیشن کئی سال سے متواتر فرقہ وارانہ کشیدگی کی وجہ سے اور اس سال کچھ اور ہنگاموں کی وجہ سے سیشن کا نظام کچھ برہم ہو گیا ہے۔ یہ نظام انشاء اللہ اگر حالات پرسکون رہے تو ۸۲-۱۹۸۳ء سے معمول پر آجائے گا۔ ۸۱-۱۹۸۲ء کا یہ سیشن کسی قدر چھوٹا ہوگا لیکن علی گڑھ کے اساتذہ نے جس طرح سے طلبا کے ساتھ تعاون کیا، نصاب کی تکمیل کی، اسی طرح اس سال بھی محنت کرنی پڑے گی۔ کم وقت میں زیادہ نصاب کو طے کیا جائے گا، انشاء اللہ ۸۲-۱۹۸۳ء میں یونیورسٹی کا سیشن معمول پر آجائے گا اور اگست سے شروع ہوگا۔

مسلم کالجز اور مسلم اسکولس کے متعلق دو کوششیں ہوئی ہیں۔ ایک کوشش تو احمد رشید شیروانی صاحب نے کی ہے جن کے مضامین آپ اخباروں میں دیکھتے رہے ہوں گے۔ وہ مسلم اسکول اور مسلم کالجز کے نتائج کا تجزیہ کرتے رہے ہیں۔ اس سے بہت اہم اعداد و شمار ہمارے پاس آگئے ہیں۔ دوسری کوشش جناب حکیم عبدالحمید صاحب نے کی ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے ۶۵ کالجز کا سروے کیا ہے۔ ان اعداد و شمار کی روشنی میں ہماری کوشش ہوگی کہ ان کالجز کی ضروریات پر نظر ڈالیں۔ پھر یونیورسٹی جس حد تک مدد کر سکتی ہے اس حد تک خود مدد کرے، جس حد تک حکومت کو توجہ دلا سکتی ہے اسے توجہ دلائے اور جس حد تک عامۃ المسلمین سے اپیل کر سکتی ہے، ان سے اپیل کرے۔ بہر حال یہ نیا رول ہوگا جو یونیورسٹی

کو انجام دینا ہوگا۔ اس رول میں، یونیورسٹی کے اس نئے کردار میں آپ کی حمایت کی اور آپ کے تعاون کی ہر لمحہ ضرورت ہوگی۔

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے مجھے یاد کیا، میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی توقعات ہمیشہ زیادہ ہوتی ہیں۔ یونیورسٹی کے لئے اولڈ بوائز تقویت اور توانائی کا باعث ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ جو لوگ علی گڑھ سے پڑھ کر نکلتے ہیں، ان کی وابستگی ہمیشہ اپنی مادر درس گاہ کے ساتھ باقی رہتی ہے، اور یہی وابستگی علی گڑھ کی طاقت کا نشان ہے۔

علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو ایک کام تو ضرور کرنا ہے، اور کسی اچھے کام میں تاخیر کرنے کی گنجائش نہیں ہوا کرتی: وہ کام ہے اچھے طلبا کو منتخب کر کے ان کو مقابلے کے مختلف امتحانوں کے لئے تیار کرنا۔ دہلی میں ایک اولڈ بوائز ایسوسی ایشن قائم ہوئی تھی۔ اس نے یہ کام کیا اور اب بھی وہ یہ کام کر رہی ہے۔ میں آسام گیا تھا۔ گوہاٹی میں اس زمانے میں اولڈ بوائز نے یہ ایسوسی ایشن قائم کر دی اور یہ کام اپنے ذمہ لے لیا۔ اعظم گڑھ میں یہ کام زیادہ بڑے پیمانے پر، زیادہ سنجیدگی اور زیادہ انہماک کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ میں اولڈ بوائز کے صدر محترم سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس کام کو اپنی رہبری و سرپرستی عطا کریں اور اولڈ بوائز کو جمع کر کے اس بات کے لئے راضی کر لیں کہ وہ اپنا وقت عزیز طلبا کی تربیت اور ان کی کوچنگ میں صرف کریں گے۔ اس سے بڑا فرق ہوتا ہے: اگر آپ اوسط طالب علم کو لے لیجے اور اس کو باقاعدہ تربیت دیدیجے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ کسی اچھے مقابلے کے امتحان میں کامیاب نہ ہو۔ مقابلے کے جن امتحانوں کے نتائج کا تجزیہ کیا گیا ہے اس میں یہ پایا گیا ہے کہ اوسط قسم کے طلبا جنھوں نے ڈھنگ سے محنت کی ہے، وہی کامیاب ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی غیر معمولی ذہانت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اب کوئی اچھی ملازمت بغیر مقابلے کے دستیاب نہیں ہوتی۔ لہٰذا مقابلہ تو کرنا ہے۔ اب یہ بھی ہم پہ واضح ہو گیا ہے کہ انسان معمولی سی، چھوٹی سی ملازمت شروع کر کے سب سے بڑے عہدے تک پہنچ سکتا ہے۔ ایک تو اس زمانہ میں ورٹیکل موبلٹی (VERTICAL MOBILITY) بہت بڑھ گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ چاہے مرکزی حکومت ہو، چاہے صوبے کی حکومت ہو، یہ اجازت دیتی ہے کہ کوئی شخص جو کسی جگہ پہ ملازم ہوا ہے وہ بڑے سے بڑے امتحان میں بیٹھ سکتا ہے۔ امتحانات کے لئے یونین پبلک سروس کمیشن کے علاوہ اور بہت سے کمیشن کھل گئے ہیں، جن میں اسٹاف سیلیکشن کمیشن بھی ہے جو جونیئر ملازمتوں کے لئے ریکروٹمنٹ کرتا ہے۔

پھر کوئی نو کس ریلوے سروس کمیشنز ہیں۔ یہی تعداد بنکنگ سروس کمیشن بورڈ (BANKING SERVICE COMMISSION BOARD) کی ہے۔ پھر ایل آئی سی (L.I.C.) ہے اور دوسری پبلک سیکٹر انڈرٹیکنگ (PUBLIC SECTER UNDER TAKINGS) ہیں، جو اپنے امتحانات کرتی ہیں۔ یہ فرض ہوگا اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا، کہ ان امتحانات، ان امکانات، اور ان مواقع کے متعلق اطلاع فراہم کرے اور اس کو نشر کرے۔ یہ شبلی کالج میں، دوسرے کالجوں میں، اور ایسے لڑکوں کو جنھیں جن کے متعلق امکانات ہوں کہ کسی نہ کسی ملازمت میں وہ کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ بات واضح کر دینی کی ہے کہ کسی ایک مقابلہ کی تیاری دوسرے مقابلے کے امتحان کے لئے ہمیشہ کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ اگر اسسٹنٹ (ASSIS TANT) اور [illegible] کے لئے تیاری کی تو آئی اے ایس (I.A.S) کے لئے بھی وہ تیاری مفید ہوتی ہے، معاون ہوتی ہے۔ مقابلے کے امتحان کا ایک ڈھنگ ہوتا ہے، تکنیک ہوتی ہے۔ ایک مقابلے کے امتحان میں اگر آپ بیٹھ گئے تو دوسرے مقابلے کے امتحانوں کے لئے یہ تجربہ کام کرتا ہے۔ تو، طالب علموں کو اس کی طرف بڑھانے کی ضرورت ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جب سے ان مقابلے کے امتحانات میں دلچسپی شروع ہوئی ہے، دو بار ایسا ہوا ہے کہ دو لڑکے آئی اے ایس میں ہندوستان بھر میں اوّل آ گئے ہیں۔ طالب علموں کو اس کی طرف بڑھانے کی ضرورت ہے۔

خیال کی طاقت

[راقم دولتِ مشترکہ کی یونیورسٹیوں کی انجمن کی طرف سے دوسرے مندوبین کے ساتھ برمنگھم سے آئرن برج (لوہے کا پُل) گیا تھا۔ اس قصبے کا نام لوہے کے ایک تاریخی پُل کے نام پر رکھا گیا ہے۔ دنیا میں لوہے کا یہ پہلا پُل ہے اور آئرن برج کے قصبے کے ساتھ صنعتی انقلاب کی شروعات کا رشتہ جُڑا ہوا ہے۔ آج کل عوام اور حکومت کوشاں ہیں کہ اس تاریخ ساز بستی کو نئے سرے سے اس طرح بسائیں کہ وہ تاریخ ساز عہد زندہ ہو کر نگاہوں کے سامنے آجائے۔

وہاں دوسری عمارتوں اور کارخانوں کے علاوہ ایک پریس بھی دیکھا، جو سترھویں صدی کے مطابع کی طرح آثارِ قدیمہ کی شان رکھتا ہے۔ پریس جو کچھ چھاپتا ہے لوگ اُسے ماضی کا ارمغان سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ راقم نے اس مطبع میں چھپا ہوا ایک پرچہ خریدا جس میں ایک نظم درج تھی، اس کا عنوان تھا "اگر" (IF) اس کا ترجمہ تہذیب الاخلاق کے قارئین کی نذر ہے۔ غالب نے کہا تھا:

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

دراصل انسان کی صلاحیت بیکراں اور اس کے خیال کی تعمیری طاقت گمان و قیاس سے بڑھ کر ہے۔ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم خود پر اعتماد اور کامیابی کا یقین رکھیں۔

سید حامد (برمنگھم، ۱۷ اگست ۱۹۸۳ء)]

اگر تم نے سوچا کہ تم ہار گئے ہو، تو ہار یقینی ہے۔
اگر تم نے سوچا کہ یہ کام تمھارے بوتے سے باہر ہے،
تو یہ کام لازمی طور پر تمھارے بوتے سے باہر رہے گا۔
تم جیت کے خواہاں ہو؛ لیکن تمھارے دل میں
اگر یہ خیال بس گیا کہ تم جیت نہیں سکتے، تو یاد رکھو
کہ تم ہرگز جیت نہیں پاؤ گے۔
جس لمحہ یہ خیال تمھارے ذہن سے گزرا کہ تم

ناکامیاب ہو گے، نوجوان لوکہ تم واقعی اسی لمحے ناکامیاب ہو گئے۔

زندگی کا تجربہ اگر کوئی بات بتاتا ہے تو وہ یہ ہے :

کامیابی خیال کی کوکھ سے، ارادے کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔

کامیابی اور ناکامیابی کا فیصلہ دل و دماغ کرتے ہیں۔

اگر تم نے کمتری کا احساس کیا،

تو تم واقعی کمتر ہو کر رہ جاؤ گے۔

اگر تمھیں اونچا اٹھنا ہے، تو خیال اور حوصلے کو بلند رکھو۔

جب تک خود پر اعتماد نہ کرو گے،

تمھارے ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ زندگی میں وہی لوگ کامیاب ہوں

جو طاقتور اور ذہین ہیں؛

فتح اسی کے قدم چومتی ہے،

جسے آغاز سے ہی اپنی فتح کا یقین ہوتا ہے۔

شیخ الجامعہ کے الوداعی خط
طلبا کے نام

وائس چانسلر لاج
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۶ مارچ ۱۹۸۵ء

میرے عزیز طالب علمو !

ایک لڑکا جولائی ۱۹۳۷ء میں اس یونیورسٹی میں داخل ہوا، گویا آج سے ۴۸ سال پہلے؛ اور پانچ سال گزار کر یہاں سے چلا گیا۔ وہ پانچ سال اس کی زندگی کے بہت اہم سال تھے۔ یونیورسٹی نے اسے بہت کچھ دیا، نہال کر دیا۔ لیکن وہ اس تعلیم و تربیت کا عشر عشیر بھی نہ تھا جو اس کے باپ حافظ سید مہدی حسن صاحب (مرحوم) اور اس کی ماں ستارہ شاہ جہاں بیگم صاحبہ (مرحومہ) نے اسے دی تھی۔ باپ نے شعر و ادب اور تاریخ کا ذوق بخشا اور دیانت، ریاضت، جفاکشی و سنجیدگی دی، ان کی ہدایت تھی کہ بیٹا کھیل اور نماز نہ چھوڑنا۔ ماں نے استقامت، صبر و تحمل، رافت و شفقت سے نوازا۔

انٹر کالج مرادآباد میں ہاکی کی کپتانی کر کے جب علی گڑھ آیا تو لوگوں کو یہ بات انوکھی لگی کہ ایک لڑکا بیک وقت پڑھائی اور کھیل میں امتیاز حاصل کرے اور یونیورسٹی کی پاکیزہ اور خوبصورت مسجد میں بھی پابندی کے ساتھ حاضر ہو۔ پھر اسے اس کا احساس بھی نہ ہو کہ خالق نے اس فرومایہ کی ذات میں چند ایسی صفتیں جمع کر دی ہیں جو فی زمانہ ایک ساتھ کم پائی جاتی ہیں۔ اس کی کوشش یہی رہی کہ کسی کا دل اس کے کسی قول یا فعل سے نہ دکھے۔ اس نے وہ پانچ سال اس طرح گزارے کہ پھولوں کی بارش ہوتی رہی۔ جو کسی کا دل نہ دکھائے لوگ اسے برا کہیں کیسے۔ ۱۹۴۲ء میں جب اس نے یونیورسٹی کو خیرباد کہا تو اس کے گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایک دن یونیورسٹی کو چلانے کے لئے نظر انتخاب اس پر پڑے گی، اور جب اچانک اسے بتایا گیا تو وہ سکتے میں رہ گیا۔

الیٰ خیر! یونیورسٹی بظاہر اس مقام پر پہنچ گئی تھی کہ توازن، صحت، نظم اور لیاقت کی طرف واپسی ناممکن لگتی تھی۔ یہ دراصل اس ایجی ٹیشن کا ثمرہ تھا جو یونیورسٹی کی خودمختاری اور اس کے اقلیتی کردار کی بازیابی کے لئے چلایا گیا تھا اور اس شکست خوردہ ذہنیت کا بھی جو مایوسی اور پسپائی کے دامن میں پناہ لیتی ہے۔ اس اضمحلال اور انحطاط کے لئے ہم کسی ایک انسان کو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے۔ افراد، حالات، حوادث، بےتیمی اور خودغرضی نے مل کر درس گاہ کے مزاج کو بگاڑ دیا تھا، اور اختیارات ارباب حل و عقد کے ہاتھوں سے نکل کر نام نہاد طالب علم رہنماؤں کے ہاتھ میں پہونچ گیا تھا۔ وہ نہ طالب علم تھے، نہ رہنما، وہ علم دشمن تھے اور شرافت و صداقت کے راہزن۔ ان کا مقصد صاف ظاہر تھا جب تک وہ علی گڑھ میں رہیں، طالب علموں کا لہو پئیں اور اپنی مادر درس گاہ سے ناجائز مراعات بزور شمشیر حاصل کریں، البتہ اعلان گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ کرتے رہیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اسلام کی خاطر اور یونیورسٹی کے کردار کے تحفظ میں۔ ان زور خصلت زور آزماؤں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جسے اسلام، اخلاق یا علم سے دور کا واسطہ بھی ہو۔ ان کا دوسرا اور طویل المدتی مقصد یہ تھا کہ اتنا شور مچائیں، اتنی توڑ پھوڑ کرائیں، اس قدر فتنہ برپا کریں کہ کسی نہ کسی پارٹی کے منظور نظر بن جائیں اور یونیورسٹی میں تخریب کاری کر کے ملک کی تعمیر نو کے اہل شمار ہوں۔ یونیورسٹی کی (خدانخواستہ) قبر پر وہ اپنا محل تعمیر کرنا چاہتے تھے۔

ان دوست نما دشمنوں، راہبر نام راہزنوں کی کوششوں کا نتیجہ کیا ہوا؟ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر، جو شائستگی کے لئے مشہور تھی، یہ دھبہ لگا کہ اس کے طالب علموں نے اپنے شیخ الجامعہ نواب علی یاور جنگ پر کورٹ کی میٹنگ میں قاتلانہ حملہ کیا اور اس کے بعد ایجی ٹیشن کے ذریعہ اس کے علمی نظم اور اخلاقی معیار کو گراوٹ کی انتہا تک پہنچا دیا۔ داخلے نااہلوں کے ہوں، حاضری کی تکلیف دہ بیڑیاں توڑ دی جائیں، امتحان حسب سہولت ٹلتے رہیں، ہتھیار بند طالع آزمائی کا بول بالا ہو، مقررہ وہ سمجھے جائیں جنھیں احساس ہی نہ ہو کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور خود ان کے ہم وطن کس تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں، لیکن جو اکسانے بھڑکانے، گمراہ کرنے اور توڑ پھوڑ کرانے کے سارے حربے اپنے زور خطابت میں بھر سکتے ہوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی بدنام ہو گئی، اس کی شہرت بگڑ گئی، اس کے معیار گر گئے، اس کے اسناد کی ساکھ گرنے لگی۔

سرسید کا خواب ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا اور یہ سب کچھ چند نام نہاد طالب علموں، گنتی کے مفاد پرست استادوں اور مٹھی بھر ایمان باختہ اہل کاروں کے سنگٹھن کی بدولت ہوا۔ ملک میں لوگ یونیورسٹی کا نام حقارت کے ساتھ لینے لگے۔ جہاں آئے دن فتنہ وفساد برپا ہوتا ہو، وہاں پڑھائی ہی کیا ہوگی؟ پھر کیا کیا جائے؟ نصاب کا ایک چھوٹا سا حصہ پڑھا دیا جائے اور امتحان اسی میں سے لے لیا جائے، طالب علموں کا سال بھی ضائع نہ ہوگا، ڈگری بھی مل جائے گی۔ دماغ پر کوئی ضرب نہیں پڑے گی، نہ وقت عزیز کو جو بے مقصد یاوہ گوئی کے لئے وضع ہوا ہے، تحقیق اور تحصیل علم پہ ضائع کرنا پڑے گا، اور اگر کوئی سرپھرا اس اختصار، اس انحطاط کے خلاف لب کشائی کرے، تو یا تو اس کو بے تکلف پیٹ دیا جائے، یا اس کی نیت اور عقاید پر شبہ کی لکیر کھینچ دی جائے۔

میرے عزیز! تم ہی سوچو، ادارے اس طرح بنتے نہیں، بگڑتے ہیں۔ بات کی رَو میں ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے! وہ لڑکا جو ۱۹۴۳ء میں یونیورسٹی چھوڑ کر گیا تھا اور جس نے ریاستی سول سروس میں عوامی روابط کا تجربہ حاصل کیا تھا، جس نے مرکزی سول سروس میں ملکی اور بین الاقوامی مسائل اور مذاکرے میں بہم حصہ لیا تھا، وہ لڑکا زندگی کی فولاد آفریں بھٹی سے گزر کر ۳۸ سال بعد اپنی مادر علمی کے قدموں میں واپس آیا، اس کے دل میں نہ جانے کتنی اُمنگیں، کتنے منصوبے ہوں گے، اس کی آنکھیں نہ جانے کتنے خواب دیکھ رہی ہوں گی! وہ بیتاب ہوگا کہ جو کچھ زندگی نے اسے دیا ہے، وہ اپنی ماں کے قدموں میں نچھاور کر دے۔ ستارہ شاہجہاں بیگم کے بعد اس نے اسے ہی ماں کہا تھا، منہ بولی ماں، شفیق، باوقار، دُوراندیش ماں۔ اُس نے طے کر لیا کہ اپنی ماں کو رسوائی سے بچائے گا، اس کی گمشدہ حیثیت اور شہرت اسے واپس دلائے گا، آسمان سے تارے توڑ کر لائے گا اور اپنی ماں کی مانگ میں سجائے گا، لیکن لوگ اس کی بات کیوں سننے لگے، وہ لوگ جن کی عادتیں بگڑ چکی تھیں، جنھیں طاقت، لذت اور نخوت کا چسکہ پڑ چکا تھا، جنھوں نے نقارخانے کا سُر اتنا تیز کر دیا تھا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی، وہاں دردمندی کی آواز، طوطی کی آواز بن گئی تھی۔ پھر اس کی عادت دھیمے سروں میں باتیں کرنے کی تھی، ستارہ شاہ جہاں بیگم نے اسے تربیت دی تھی کہ بیٹا! دنیا آئینہ خانہ ہے، زنہار تمہاری بات سے کسی کا دل نہ ٹوٹ جائے۔

دل ہی سارے تھے یہ اک وقت میں جو کر کے گداز
شکل شیشے کی بنائی ہے کہاں ہے شیشہ

وہ گلستاں سے جو سے نغمہ خواں بن کر گزرا تھا لیکن کوہ وبیاباں سے ٹکرانے کا اسے موقع ہی نہ ملا تھا۔ دنیا کی عادت ہے کہ وہ گفتار کی نرمی کو طبیعت کی کمزوری پر محمول کرتی ہے اس نے جی کڑا کر لیا اور ٹھان لی کہ اس پرانی روش چھوڑ کر سخت فیصلے کرنا پڑیں گے کہ فساد کے بعد اصلاح سے زیادہ سخت اور پر خطر کوئی کام نہیں ہے۔ مقصد صرف ایک تھا طالب علموں کا درس مفاد، یونیورسٹی کی نیک نامی اور پیش رفت، ملت کی عزت اور وطن عزیز کی ترقی اور یہ تینوں مقصد آپس میں گتھے ہوئے ہیں۔

اپنے پرو وائس چانسلر پروفیسر بہاء الدین اور اپنے رفیقان کار یعنی اساتذہ سے مل کر اس نے سمت عثمانی کو متروک و منسوخ ٹھہرایا اور ہمہ جہت و ہمہ گیر کوشش اصلاح تصفیہ، تزکیہ، ریاضت اور ارتقائے معیار و انضباط کے لئے کی۔ کوتاہ اندیشوں اور ہوس پرستوں نے اس کوشش کی سخت مخالفت کی اور الزام تراشی، دروغ بافی اور افواہ سازی وعید و تہدید اور زدوکوب کے سارے امکانات کو شیخ الجامعہ اور صالح اساتذہ وطلبہ کے خلاف بے دریغ استعمال کیا۔ لیکن جھوٹ کی گرد بیٹھ کر رہتی ہے، چنانچہ بیٹھ گئی اور یونیورسٹی نے ڈھیل ڈھال اور ضابطہ شکنی اور ہوس طرازی سے اپنا ناتا توڑ لیا اور چند سال کے اندر یونیورسٹی کا کھویا ہوا وقار، اور اہل علم کی انجمنوں میں اس کی عزت برقرار ہو گئی اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر یونیورسٹی کو فتنہ و فساد سے پاک کرنے کے لئے بعض ایسے علم دشمنوں کو یونیورسٹی نکالنا پڑا، جو ہر وقت اس کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں صرف اس لئے لگے ہوئے تھے ان کم نگاہ، کوتاہ قامت، کینہ پرور، نخوت گزیدہ افراد کی انا کو تسکین پہنچا سکتے۔ (یافتہ طلبہ میں سے اگر کسی نے ذرا بھی پشیمانی کا ثبوت دیا، تو اس کو واپس بلا لیا گیا۔ ان میں سے چند ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنے اوپر توبہ کے دروازے کو بند کر لیا تھا۔ (ا دلوں پر مہر لگ گئی تھی۔ جہل مرکب کے پیکر ابوجہل اور ابولہب کا نقش ثانی تھے، جو شقاوت اور دنائت میں نقوش اول سے بازی لے گئے تھے صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ

حق اور انصاف، پاکیزگی اور خیر خواہی، انفعال اور پشیمانی کی طرف ان کی واپسی کی راہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی تھی قانونِ قدرت اور مشیت الٰہی کے تحت !

طالب علموں پر بالآخر یہ بات واضح ہو گئی (جیسا کہ ان کے سرپرستوں پر بہت پہلے ہو چکی تھی) کہ اگر یونیورسٹی میں امن وامان اور نظم وضبط قائم رہتا ہے تو ان کا مستقبل بن جائے گا اور اگر فتنہ وفساد برپا ہوتا ہے تو ان کا مستقبل بگڑ جائے گا چنانچہ انھوں نے تخریب کاروں کے بہکاوے میں آنا بند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی کا نام ملک بھر میں اونچا ہوا، سوائے ان لمحات کے جب اعدائے جامعہ بعض صحافیوں کو غلط بیانیوں پر آمادہ کر دیتے تھے؟ یا پھر کہیں آتشبازی چھوڑ دیتے تھے۔

طالب علموں کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد دین اور وطن، شائستگی اور تہذیب کے یہ دشمن اپنے "معلمین ملکوت" کے اشارے پر ہتھیار بند مجرموں کو لیکر میدان میں کود آئے اور انھوں نے نہتے استادوں پر گوریلا حملے کر کے انھیں بے عزت[1] کر کے دہشت کی ایک فضا قائم کی اور یہ کہنا شروع کیا کہ پولیس اب تم میں سے کسی کی حفاظت کے لئے کیمپس میں داخل نہیں ہوگی۔ ان گم کردہ راہوں کے مطیعین اور معاونین کون تھے، اس پر سے جلد ہی پردہ اٹھایا جائے گا۔ عبرت ناک انکشافات کے لئے عزیز طالب علموں کو تیار رہنا پڑے گا۔

آخری کوشش ان تخریب کاروں نے یہ کی کہ موجودہ شیخ جامعہ کی سبکدوشی پر نظام انتظام ایسے دو بڑے اشخاص میں سے کسی ایک کے ہاتھ میں چلی جائے جن میں سے ایک صاحب مفاد پرستی کے علاوہ خبث باطن اور کینہ پروری کے لئے پہچانے جا چکے ہیں اور دوسرے بزنگ اصول طالع آزمائی اور اراذل کی طرح دریدہ دہنی اور دشنام طرازی میں امتیاز حاصل کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جس طالب علم کا ذکر میں نے تم سے اس خط کے آغاز میں کیا تھا اس کے ہاتھوں آخری کام یہ انجام پایا کہ یونیورسٹی کو اس طرح زچ کھانے، اس کو برباد اور پامال کر دینے کا یہ منصوبہ مسمار ہو گیا اور تمہاری یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے لئے ایسے تین اکابرین کے نام چنے گئے جو علم کے آسمان پر مہر وماہ کی طرح چمک رہے ہیں اور جن میں ہر ایک (جس کا بھی بالآخر

---

[1] یہ تو ضابطۂ اخلاق ہی بتائے گا کہ در اصل بے عزت کون ہوا۔

انتخاب ہو) اس خط کے لکھنے والے سے بدرجہا بہتر ہے اور جو یونیورسٹی کو تیز رفتاری کیساتھ ترقی کی راہ پر لیجائے گا۔ مگر شرط ایک ہے! تم یونیورسٹی کے دشمنوں کے بہکانے میں نہ آنا۔ اس کی مدد کرنا جو تمہاری مدد کرنا چاہتا ہے، اس کو پورا تعاون دینا۔ یہ شرم کی بات ہے کہ پندرہ، سولہ ہزار نوجوان، صداقت پیشہ حوصلہ مند نوجوان، چھ سات ہزار جرائم پیشہ لوگوں سے ڈر جائیں اور بے غیرتی کے ساتھ اپنے استادوں کو بے عزت ہونے دیں۔

اس وقت جبکہ میں یونیورسٹی کا قلمدان اپنے رفیق کار جناب بہاء الدین صاحب کو دینے جا رہا ہوں، میں اپنے عزیز طالب علموں سے اپیل کروں گا کہ انھیں اور ان کے بعد آنے والے وائس چانسلر کو جان و دل کے ساتھ تعاون، ادب، اور احترام دیں کہ یہی راہ اپنے مقدر کو سنوارنے اور یونیورسٹی کو آگے بڑھانے کی ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ مجھ سے بعض فیصلوں میں غلطیاں ہوئی ہوں گی (میں انسان ہوں، فرشتہ نہیں ہوں، اس لئے معلم الملکوت بھی نہیں بن سکتا) میں اپنے غلط فیصلوں کے لئے اپنے پروردگار کے سامنے جوابدہ ہوں۔ لیکن مجھے ایک بات کا بفضلہٖ تعالیٰ اطمینان ہے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، بغیر کسی آمیزش کے یونیورسٹی اور طلبہ کی بہتری کی نیت سے کیا ہے۔ اس میں میری ذاتی غرض کبھی شامل نہیں ہوئی۔

میں نے اپنی کوتاہ قامتی کے باوجود، علیگڑھ تحریک کے احیا کے لئے قدم اٹھائے ہیں، ان کی داستان پھر کبھی دہرائی جائے گی۔ میں نے یونیورسٹی کو دوبارہ "سید والا گہر" کی عدیم المثال روایت پر چلتے ہوئے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی اصلاح کا مرکز بنایا ہے، اور میں خوش ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بڑا کام اپنے اس ناتواں اور حقیر بندے سے لیا۔ میں نے یہ کوشش بھی کی کہ مسلمان، وطن عزیز اور عام انسانیت کی خدمت کے لائق اور اس کے لئے آمادہ ہو جائیں، اور ان کے تعلقات سارے طبقوں خصوصاً ہندوؤں کے ساتھ خوش آیند اور شگفتہ ہو جائیں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ یونیورسٹی، دن دونی، رات چوگنی ترقی کرے، اور تم میں سے ہر ایک اپنے خاندان اور اپنی درسگاہ کا نام اپنے کردار اور امتیازات اور اکتسابات سے روشن کرے۔ آمین

۲

اساتذہ کے نام

وائس چانسلر لاج
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۶ مارچ ۱۹۸۵ء

میرے محترم رفیق، سلام و نیاز!

پہلے مجھے شکریہ ادا کر لینے دیجیے اس کشادہ دلی کا جس کے ساتھ آپ نے میری پذیرائی کی، اور اس چشم پوشی کا جو آپ نے میری کوتاہیوں کے لیے روا رکھی۔ میں آپ سے مل بھی نہ سکا، اس انداز سے جیسے ملنے کا حق تھا۔ میری محرومی کہ شیخ جامعہ کو اب وہ فراغت میسر نہیں جو اس زمانہ میں حاصل تھی جب یونیورسٹی میں ڈھائی تین سو استاد ہوتے تھے اور چار پانچ ہزار طالب علم اور ڈیڑھ دو ہزار کے قریب غیر تدریسی اور چوتھے درجے کے اہل کار، اور جب کم صبحیں ایسی طلوع ہوتی تھیں جو دماغ سوز، اعصاب آزما، اور زہرہ گداز مسائل کو اپنے ساتھ لائیں اور کم شامیں ایسی ہوتی تھیں جنھیں دن کا غبار گرد آلود کر جاتا۔ یہ سب کچھ بھی گوارا ہوتا، مگر الجھن اور تشویش میں ڈال دینے والی جو بات صبر آزما اور سکون ربا ثابت ہو رہی ہے، وہ یونیورسٹی کے دور رس مفاد سے بہت سے لوگوں کی بے تعلقی اور کچھ لوگوں کی اس مفاد کے ساتھ کھلی دشمنی ہے۔ صحت مند جسم ایسے خارجی مادے کو خارج کر دیتا ہے۔ ہم نے ایسے مادہ کو انگیز بلکہ جذب کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ہمارا معاشرہ صالح نہیں رہا، اس کے لہو میں فاسد مادہ شامل ہو گیا ہے، جو کبھی کبھی پھوٹ بہتا ہے۔

پچھلے نو برسوں میں مجھے یونیورسٹی کے اساتذہ اور دوسرے ارباب علم سے ملنے کے مواقع ملے اور ہر گفتگو اس فیصلے پر ختم ہوئی کہ یونیورسٹی اساتذہ کے دم سے چلتی ہے اور ان کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔ اگر اساتذہ رفعت جو اور پرواز خو ہیں تو معیار اونچا ہوگا، اور اگر وہ ہرزہ خو، تن آسان اور شر پسند ہیں تو معیار گرے گا اور جوتیوں میں دال بٹے گی، اور شرکت

کی یہ ہانڈی سربازار پھوٹے گی کسی معاشرہ اور کسی جماعت کے سب افراد اچھے نہیں ہو سکتے۔ انسانی قماش خیر و شر کے تار و پود سے بنی ہے۔ انسانیت باقی جبھی تک رہتی ہے جب تک خیر، شر پہ غالب رہتا ہے۔ شر چھا جائے تو انسان اور کائنات فنا ہو جائے۔ لیکن رونا اس صورت حالات پر آتا ہے جب اکثریت خیر کے ساتھ ہو لیکن حکم چلتا ہو شر کا۔ اور وہ بھی اس لئے کہ شر دلیر ہے، چور ہے، سینہ زور ہے اور خیر بزدل ہے عافیت جو ہے، خوفزدہ ہے اور خیر عزت، غیرت اور اقدار کے لئے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ خیر کا اصل کردار یہ نہیں ہے، اگر یہی کردار ہوتا تو دنیا قائم کیسے رہتی۔ بدی کی بنیاد پر جو دیوار بنے گی، ٹیڑھی ہو گی ٹھہر نہ پائے گی۔ جیت آخر میں سچائی اور انصاف کی ہی ہوتی ہے۔ جھوٹ اور نا انصافی کا ببلہ پھولتا ہے اور پھوٹ جاتا ہے۔

آپ نے ضرور سوچا ہوگا کہ فرد جماعت کے ربط سے قائم ہے اور جماعت کا فائدہ ہی در اصل فرد کا فائدہ ہے۔ جو افراد ذاتی فائدہ حاصل کرنے کے لئے جماعت کے مفاد کے خلاف جاتے ہیں، بالآخر جماعت کے مجروح ہو جانے کی وجہ سے خود خسارے میں رہتے ہیں۔ جماعت شکن خود غرضی، خودکشی کے سوا کچھ نہیں۔ غور کیجیے ہم نے اس یونیورسٹی میں اجتماعی مفاد کو گھائل کر کے بارہا انفرادی فائدہ کا تعاقب کیا ہے۔ زر لفت کی چمک نے ہم میں سے بعض کی نگاہوں کو اس حد تک خیرہ کر دیا کہ ہم بنیادی ترجیحات کو بھی ٹھیک سے نہیں دیکھ سکے، نہ ان کی صورت پہچان سکے۔ ہم میں سے بعض تدریس و تحقیق کو بیچ منجدھار میں چھوڑ کر ایسے ملکوں کو سدھار گئے جو نہ ہمارے وقار کی ضمانت دیتے ہیں نہ ہمارے علم کو فروغ دینے کے امکانات فراہم کرتے ہیں۔ سامری کی پرستش نے سرسوتی کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور ہم نے اپنے بدیسی قیام کو معمول اور اجازت سے زیادہ طول دیدیا۔ مجھے بتایا گیا کہ دوسری یونیورسیٹیاں بیک وقت اساتذہ کی تعداد کے ۱۰ فیصد سے زیادہ کسی شعبہ سے استادوں کو دوسرے ممالک میں عارضی ملازمت کے لئے جانے کی اجازت نہیں دیتیں۔ ہم بیک وقت بنا آنکھ جھپکائے ۳۲ فی صد کو باہر جانے کی اجازت دے دیتے، بیک وقت تین سال تک اور مدت ملازمت میں پانچ سال تک۔ لیکن ہم نے اس فیاضی کو جو اسراف کی سرحدوں میں داخل ہو گئی ہے، کافی نہیں سمجھا اور اس پر اپنی مرضی سے،

دیدہ دلیری کے ساتھ اضافے کیے۔ اور جب ان ضمیموں کو تسلیم نہ کیا گیا اور ہم میں سے بعض کو اپنی ملازمتوں کو خیرباد کہنا پڑا، تو ایک طوفان بپا ہو گیا۔ کسی نے یہ نہ کہا کہ یہ سب کچھ یونیورسٹی میں تحقیق و تدریس کی فضا بنائے رکھنے اور طالب علموں کی زندگی بنانے کے لئے ضروری تھا۔ ہمدردی کی تو منفعت جوئیوں کے ساتھ کی۔

اساتذہ کی انجمن نے کبھی ایسے گنے چنے اساتذہ کی مذمت نہیں کی جو کنڈے دار کلاس لیتے ہیں، جو لیکچر دینے سے پہلے تیاری نہیں کرتے، یا جو ناانصافی اور جانبداری اور جنبہ داری کرتے ہیں، یا طلبہ کو دوسرے استادوں یا انتظامیہ کے خلاف اکساتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ انجمن نے کبھی طالب علموں کے مفاد کی سرے سے کوئی بات کی ہی نہیں؛ جیسے طلبہ اور اساتذہ کے مفادات کہیں ملتے ہی نہ ہوں؛ جیسے دونوں کا مفاد مشترک نہ ہو۔ ہم غور کریں گے تو اس نتیجہ پر پہنچنا لازمی ہے کہ طالب علموں سے الگ ہو کر استاد خسارے میں ہی رہیں گے۔ طالب علموں کو فروغ نہ ہو گا تو استادوں کی علمی بالیدگی رُک جائے گی۔ ان کے تعلیمی ضمیر کا نخل کملا جائے گا، ان کے ذہن کی دھار کُند ہو جائے گی، ان کے اخلاقی اقتدار پر نشانِ اشتباہ لگ جائے گا۔

صورتِ حالات کا بڑا ستم یہ ہے، بلکہ اسے انسانی فطرت کا المیہ کہئے کہ انسان چند مثالوں کو پھیلا دیتا ہے، اسے عمل تعمیم کہتے ہیں۔ دو چار، پندرہ بیس ٹیچر اگر غلطی کریں تو اسے بارہ سو پر پھیلا کر دیا جاتا ہے۔ ہمیں عمل تعمیم سے بچنا چاہیے کہ یہ کام انصاف کے خلاف ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم ایسا کرتے چلے آئے ہیں۔ زر نقد کی طلب، کلاسوں میں جستہ جستہ حاضری، نتائج میں ناانصافی، عزیزوں اور چاپلوسوں کی پرورش، طالب علموں کے ساتھ بے التفاتی، ہم سب ان گناہوں کے مرتکب نہیں ہیں لیکن بدگمانی برگد کے پیڑ کی طرح پھیلتی ہے اور سب کو اپنے سایہ میں لے لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علم اس خوش عقیدگی اور خیراندیشی سے محروم ہوتے جا رہے ہیں، جو انسانیت اور شرافت کا منبع ہے۔ بدگمانی نے انھیں اقتدار آشام اور اخلاق سوز شک اور انتقام دشمن بے حسی میں مبتلا کر دیا ہے۔ استاد کی عزت دل میں نہیں رہی اور اس کا حسنِ نیت اور اخلاص مشکوک ہو گیا تو باقی کیا رہا؟ خود غرضی، ہوس، ندطلبی!

میں نے آپ کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے یونیورسٹی سے کوئی شکایت نہیں ہے،

یہاں میرا ایک لمحہ بھی بے کیف نہیں گزرا اور اساتذہ اور طالب علموں نے مجھے عزت دی، سہارا دیا، بڑھاوا دیا۔ اساتذہ اور طلبا کی اکثریت نے میرا ہاتھ بٹایا، میرے ہاتھوں کو مضبوط کیا اور میری پالیسی کے ان حصوں کی تائید کی جنھیں انھوں نے صحیح سمجھا۔ لیکن ایک شکایت ضرور ہے، ذاتی شکایت نہیں۔ ہمارے رفقا نے (اور ان کی دیکھا دیکھی بعض طالب علموں نے) یہ رخ اختیار کر لیا ہے کہ جو استاد یونیورسٹی کے انتظامی امور میں شامل ہو جائے اس کو وہ حلقہ سے خارج کر دیتے ہیں۔ جس کسی نے انتظامیہ میں جز وقتی کام کر لیا وہ داغدار ہو گیا، استاد رہا ہی نہیں۔ آپ سوچیے کہ اس روش کا نتیجہ کیا ہوگا؟ استاد انتظامیہ میں آنا پسند ہی نہیں کریں گے۔ پھر یونیورسٹی کا انتظام کیسے چلے گا؟ کیا باہر سے منتظمین اس کے لئے بلائے جائیں گے کہ پرووسٹ، وارڈن، پراکٹر نیز اور دوسرے انتظامی اور نیم انتظامی عہدے سنبھالیں؟ اور کیا یہ یونیورسٹی کے حق میں اچھا ہوگا؟ کیا اس طرح استاد اور شاگرد کا فاصلہ بڑھ نہ جائے گا؟ آپ جانتے ہیں کہ حال میں بعض بدبخت اور کور باطن تشدد آمادہ اور اخراج یافتہ طالب علموں نے اپنے جرائم پیشہ اور ہتھیار بند حلیفوں اور گماشتوں کے ذریعہ بعض ان محترم اساتذہ پر حملے کیے جو یونیورسٹی کو صحیح خطوط پر چلانے کے لئے انتظامیہ میں جز وقتی طور پر شامل ہو گئے تھے۔ ان کی تحقیر اور جراحت پر بہت سے اساتذہ نے احتجاج کیا ہی نہیں، اور کچھ نے تو بغلیں بجائیں کہ آگئے نا بالآخر ہوش ٹھکانے۔ لطف یہ کہ جب اسی نوع کا نازیبا حملہ ایک ایسے استاد پر کیا گیا، جن کا انتظامیہ سے کوئی سروکار نہ تھا تو ارشاد ہوا کہ "اب حدود سے تجاوز ہو گیا، اس بیچارے کا کیا قصور تھا۔" ہمیں اس قسم کی فارو التفریق "منتظم" اور "غیر منتظم" استاد کے درمیان کرنی ہی نہیں چاہیے؛ ورنہ ہمارا شیرازہ تو بکھرے گا ہی، یونیورسٹی چلانی دوبھر ہو جائے گی۔

ان استادوں کا تذکرہ کرنا بیسود ہوگا جنھوں نے طلبہ کو اُکسایا، بھڑکایا اور تشدد اور تخریب پر آمادہ کر دیا، جنھوں نے وائس چانسلر کے خلاف عدالت اور ایوان اور کوچہ و بازار میں تسوہین اور مراعات طلبی، دشنام اور الزام کا فتنہ کھڑا کر دیا۔ اساتذہ میں سے کسی ایک نے بھی اس جہل اور گمراہی کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی روایتوں کا ادارہ ہے۔ استادوں کے احترام کی دیرینہ روایت

کو مٹھی بھر تیرہ بختوں نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ یہ سیہ روز افراد یونیورسٹی کو برباد کرنے کے درپے ہیں۔ تباہ کاریوں کے باوجود انھیں ہمدردیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا بڑا المیہ ہے۔ جب خود کیمپس میں باخبر رائے عامہ نہیں ملتی، تو اس کے باہر کیا حال ہوگا۔ اساتذہ ذمّہ دار ہیں کہ صحت مند رائے عامہ بنائیں۔ اساتذہ کی انجمن کے رول کو مطالبہ سے مواخذہ کی طرف موڑنا ہوگا۔ خود سے بازپرس کرنے میں برکت ہے: غلطی کی بروقت اصلاح ہو جاتی ہے اور بھٹکے ہوئے افراد راہ راست پر واپس آجاتے ہیں۔

آپ مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ زندگی کی رفتار میں ہوش ربا تیزی آگئی ہے، اور علوم تو بجلی کی طرح تیز گام ہو گئے ہیں۔ ہمیں ان کا ساتھ دینا ہے، ورنہ ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ ہماری یونیورسٹی کو علم کے ہراول دستہ میں اپنی جگہ بنانی ہوگی۔ اس وقت عالم یہ ہے کہ جو ایک پل کے لئے رُکا، وہ صدیوں پیچھے ہو گیا۔

یونیورسٹی کو دوبارہ ایک تحریک کا مرکز بنانے کے جتن کئے گئے ہیں۔ ناخواندگی کو دُور کرنے کی تحریک، جہالت کو مٹانے کی تحریک، روشنی اور عقل کو عام کرنے کی تحریک، علیحدگی کو خیرباد کہنے کی تحریک، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور انسانیت کے لئے خیرسگالی کی تحریک! یہ چھوٹے چھوٹے قدم ہیں جو اٹھائے گئے ہیں۔ ہمیں یونیورسٹی میں مقید ہو کر نہیں رہنا ہے۔ اتنی لیاقت بہم پہنچانا ہے کہ دوسری یونیورسٹیاں ہماری پیروی کریں، اور دنیا سے جو کچھ ہم حاصل کریں یا تجربہ، علم اور بصیرت کے عنوان سے جب ہم واپس آئیں تو اپنی مادر درسگاہ کے قدموں میں ڈال دیں۔ بند پانی میں فساد کی بو آتی ہے۔ ہمیں اپنی درسگاہ کو تکدّر اور تعفن سے بچانا ہوگا۔ تازہ ہوا کے دریچے اس پر کھول دیجیے کہ اس کی اور آپ کی صحت کے لئے یہ ضروری ہے۔ خاندان میں ہی شادیاں کرتے رہنا، نسل کی بالیدگی اور تندرستی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ دوسری یونیورسٹیاں بھی اس بیماری سے محفوظ نہیں ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں یہ کچھ زیادہ ہی زور پکڑ گئی ہے۔

کسی یونیورسٹی کے مزاج کا اندازہ لگانا ہو تو ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ ان باتوں پر کان دھرے جائیں، جو فرصت کے اوقات میں استاد کیا کرتے ہیں۔ اگر یہ قرب و جوار، ملک و ملت، بر اعظم، دنیا، علوم اور انسانیت کے مسائل ہیں جنھیں موضوع بنایا گیا ہے تو سمجھ لیجیے کہ یونیورسٹی صراط مستقیم

پر چل رہی ہے۔ اور اگر یہاں مسائل کی جگہ شخصیات پر بحثیں چھڑی ہوں اور شخصیات بھی یونیورسٹی سے متعلق اور ان شخصیات کو شرانگیز جستجو اور اختراعاتِ خانگی سے نوازا جا رہا ہو تو فیصلہ کر لیجیے کہ یہاں نہ روشنی کا گزر ہوگا، نہ علم پنپ سکے گا۔ اپنا اور اس یونیورسٹی کا مقدر آپ کے ہاتھ میں ہے آپ چاہیں تو اسے علم کا گہوارہ بنا دیجیے چاہے جہل مرکب اور سازش کا۔

جس طرح طالب علموں کے داخلوں میں ہم نے اول و آخر صلاحیت کو تسلیم کیا ہے، اسی طرح استادوں کے انتخاب میں بھی صلاحیت کو بالادستی دی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سلیکشن کمیٹی کی سفارشوں پر بعض اوقات احاطہ میں جو رد عمل ہو تا رہا ہے وہ منصفانہ نہیں تھا۔ کاغذ اور صلاحیت میں وہ وہ تفاوت دیکھنے میں آئے کہ بعض اوقات استاد کی قدر و قیمت نگاہوں سے گر گئی۔ اگر صرف استاد پر جانا ہو تو سلیکشن کمیٹی کے تمام جھام کی کیا ضرورت تھی۔ انسانوں کے انتخاب کا کوئی معروضی یا میکانکی طریقہ آج تک دریافت نہیں ہوا۔ باخبر اجتماعی صوابدید پر انحصار کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

ہم نے کوشش کی ہے، یونیورسٹی کی زندگی کے ہر شعبہ میں اچھے، ذہین اور لائق لوگ اُوپر آئیں اور نالائقوں اور بُردوں کی کڑی نہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائے۔ اچھے طالب علموں کو منظر عام پر لایا گیا، ان کا حوصلہ ہر عنوان بڑھایا گیا، غیر تدریسی کارگزاریوں کو سراہا گیا کہ ان میں تربیت کے بیشمار پہلو ہیں۔ وہ لڑکے جو "داداؤں" کے ظلم سے سہمے ہوئے تھے، انھیں اعتماد کی وہ انمول دولت پھر سے حاصل ہو گئی جو کبھی ہمارے طالب علموں کی پہچان تھی اسی طرح اساتذہ میں ایسے افراد ڈھونڈ ڈھونڈ نکالے گئے جو تحقیق کا رجحان رکھتے تھے اور جو ہمت افزائی کے فقدان کی وجہ سے مرجھا رہے تھے۔ ان جستجو پیشہ تحقیق پردازوں نے ہماری یونیورسٹی کا نام اُونچا کیا اور علم کی سرحدوں کی بادیہ پیمائی کر ڈالی۔ تحقیق کی اس روایت کو مضبوط کرنا ہے۔

میں نے جا بجا الوداعی تقریروں میں کہا تھا کہ میں یونیورسٹی سے مطمئن اور شاد کام جا رہا ہوں۔ مجھے حسرت صرف دو باتوں کی ہے: کاش مجھے آگ بجھانے میں نہ اُلجھایا جاتا، تا تعمیری کام زیادہ ہو سکتا۔۔۔ دوسری حسرت زیادہ شدید ہے؛ بسا اوقات میرے دل میں

یہ خیال آیا کہ میری وجہ سے بعض رفیق اساتذہ کو خطرات، تشدد، تحقیر اور دشنام کا سامنا کرنا پڑا
ان پہ گرد آبرو باختہ، اخراج یافتہ، شقاوت پیشہ طالب علموں اور ان کے جھاڑے کے بدمعاشوں
نے سفاکانہ حملے کیے اور میں انھیں نہیں پہچان سکا۔ ان دونوں حسرتوں کا داغ میں دل
میں لے کر جا رہا ہوں۔

ایک بات اور دہراؤں گا، ہماری یونیورسٹی کے پاس وسائل کی کوئی کمی نہیں۔ حکومت
کی طرف سے کوئی مداخلت نہیں کی جاتی۔ یہاں طالب علموں کی اکثریت نظم کی خوگر ہے۔ سارا
اختیار ہمارا ہے کہ اپنے اس بیش بہا ادارہ کو سنواریں، نکھاریں، نوک پلک سے درست
کریں اور تعلیم و تربیت و تحقیق میں اسے نشانِ امتیاز تک پہنچا دیں۔ اسے اپنے خوابوں اور اس
کے عظیم بانی کے منصوبوں اور بصیرت کے مطابق ڈھالیں۔

اگر ہم نے اس نادر موقع کو ہاتھ سے جانے دیا اور اس بیش بہا سرمایہ کو برباد ہونے دیا
تو آنے والی نسلیں ہم پہ نفریں کریں گی۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ یونیورسٹی کو وہ اخلاص، دیانت،
ایثار اور بصیرت دیجیے جس کی اسے ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ادارہ کو مصئون
و محفوظ رکھے اور آپ کو اس کی بے غرض اور بیش بہا خدمت کی توفیق اور مواقع عطا فرمائے۔

●●

وائس چانسلر
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۶ مارچ ۱۹۸۵ء

محترم سرپرست، سلام مسنون!

یہ سطور خدا حافظ کہنے کے لئے لکھ رہا ہوں۔ آپ نے ہر قدم پر میری یاوری کی، اظہار سپاس کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ہر نازک موڑ پر میں نے آپ سے رجوع کیا اور آپ نے اپنے شایانِ شان جواب دیا، اس وقت بھی جب افواہوں اور دروغ بافیوں سے فضا کو زہر آلود کر دیا گیا تھا! آخر ایک غریب الدیار کے ساتھ اتنی ہم آہنگی کیسی؟ وجہ ظاہر ہے آپ کا اور میرا مقصد ایک ہی تھا یعنی آپ کے بچوں کو اچھی تعلیم اور تربیت ملے اور ان کا مستقبل درخشاں ہو اور زندگی کے عبوری دور کی یہ مدت رزمگاہِ حیات کے لئے تیاری میں صرف ہو، اس کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے پائے۔ لوگوں نے طلبا کو بہکایا اور بھڑکایا۔ گرم خون سوچنے سمجھنے اور اونچ نیچ دیکھنے کی اجازت کب دیتا ہے۔ نوجوان بہکانے میں آگئے، وہ بھول گئے کہ تیاری کے دور کو برباد کرنا اپنے امکانات کو ختم کر دینا ہے۔ جس نے ۱۶ سال سے ۲۴ سال کی عمر کے دوران پسینہ نہ بہایا وہ باقی تمام عمر آنسو بہاتا رہے گا، اگر اشکباری نہ کرے گا تو فریب کاری میں لگ جائے گا۔

میں نے گراں بار منصب، یہ سنگلاخ راستہ اس لئے قبول کیا تھا کہ یونیورسٹی کو خود غرضی، طوائف الملوکی، تنگ معیاری اور ہنگامہ پروری کے گرداب سے نکالوں، اور تربیت کردار اور رفعت معیار کی منزل مقصود تک پہنچاؤں۔ ان نام نہاد طالب علموں نے میرے خلاف ہنگامہ برپا کیا جن کو سنجیدگی، محنت، راست روی اور تحصیلِ علم ایک آنکھ نہ بھاتی تھی انہوں نے یونیورسٹی کی روایات، اس کے معیار اور شہرت کو برباد کرنے کا تہیہ کر لیا کیسی ایک طریقہ

انھیں آتا تھا اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو دوبارہ حاصل کرنے اور مجھے اکھاڑ پھینکنے کا! وہ طاقت اور ہدایت بعض گمراہ محروم اختیار استادوں سے حاصل کرتے تھے۔ انھوں نے معصوم لڑکوں کو تصادم کی آگ میں جھونک دیا اور خود قلعہ بند ہو کر تماشا دیکھتے رہے۔

اخراج یافتہ لڑکوں میں سے جس کسی نے بھی زبان سے یا عمل سے ذرا دیر کے لئے بھی پشیمانی کا ثبوت دیا اس کا اخراج منسوخ کر دیا گیا اور اسے داخلہ اور امتحان کی سہولت مل گئی۔ لیکن جو لوگ گھمنڈ اور تباہ کاری میں پکے ہو چکے تھے اور جن کا مقصد تحصیل علم نہ تھا، استحصال اور قیادت اور سیاست تھا، ان کی شقاوت اور دریدہ ذہنی دن بدن بڑھتی گئی اور انھوں نے وہ سب کچھ کر ڈالا جو اگر سید والا گہر زندہ ہوتے تو ان کے کلیجے کو چھلنی کرنے کے لئے کافی ہوتا۔ ان کی روح باوجود ان اعلیٰ مراتب کے جن سے اللہ تعالیٰ نے فردوس بریں میں انھیں سرفراز کیا ہوگا، انگاروں پر لوٹ رہی ہوگی کہ الٰہی یہ تربیت کدہ، یہ تعلیم کا مرکز، یہ خوابوں اور تمناؤں کا محور، کیا اسی دن کے لئے بنایا گیا تھا!

اسلام کے نظام عقوبت پر نئی روشنی والے آئے دن اعتراض کرتے ہیں کہ شریعت میں سزائیں سخت رکھی گئی ہیں، وحشیانہ ہیں! وہ نہیں جانتے کہ سزا کا خوف راست روی کے ذوق سے کہیں زیادہ عام انسانوں کو برائی سے روکتا ہے۔ امریکہ کی نئی نسل تباہ اس لئے ہو رہی ہے کہ وہاں ایک عرصہ تک نوجوانوں کو سنگین جرائم کے لئے بھی سزا سے محفوظ رکھا گیا۔ ایک جائزہ کے مطابق وہاں سنگین جرائم ۵۰ فی صد سے زیادہ ان نوجوانوں سے سرزد ہوتے ہیں جن کی عمر ۱۲ اور ۲۲ کے درمیان ہے! جرم کرنے میں طاقت کا احساس ہوتا ہے، جس میں نادانی انفعال کو شامل کر دیتی ہے۔ یہ لڑکے نہ گھر میں کسی کی سنتے ہیں، نہ باہر۔ سرزنش کے بغیر بگڑے نہادوں کی اصلاح ناممکن ہے۔ عجیب بات ہے کہ جب تخریب کار، تشدد پیشہ، دشنام شعار اور بہتان تراش لڑکوں کے خلاف تادیبی کارروائی کی جاتی ہے تو ملت اسلامیہ کے کئی ہمدرد اور اس کے صحافی چلا اٹھتے ہیں کہ بچوں پر بڑا ظلم ہو گیا۔ یہ عمر ہنسنے، کھیلنے، شرارتیں کرنے کی ہے۔ اس وائس چانسلر کے سر میں کیا خناس ہے کہ معصوم شرارتوں پر سزا دیتا ہے، لڑکوں کا مستقبل بگاڑ دیتا ہے۔ وہ بات کے لئے مجبور ہوا ہے کہ بگاڑنے کے لئے ایک شور مچ جاتا ہے۔ یہ نادان دوست یہ نہیں سمجھتے کہ وہ

شریعت کے اصول جزا و سزا سے صریح اور پُر خطر انحراف کر رہے ہیں اور ان اخراج شدہ طالب علموں کو برائی پر راسخ کر رہے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ایک پلّہ میں کوئی ۱۶ ہزار طالب علم اور ان کا قیمتی سال اور سند اکیریہ ہے یہ ترازو کے دوسرے پلے میں ۸۔۱۰ تخریب کار ہیں۔ جنھوں نے یونیورسٹی کی ہر صالح روایت کو موت کے گھاٹ اُتارا ہے اور استادوں کی تواضع جوتوں، گالیوں، دھکیوں اور دھکوں، لاٹھیوں اور آتشزنی سے کی ہے۔ فیصلہ کر لیجیے ۱۶ ہزار سنجیدہ اور بھلے لڑکوں کی آپ فکر کریں گے کہ آدھی درجن اخلاق باختہ اراذل کی۔ اگر مسلمانوں کے پاس باخبر رائے عامہ ہوتی تو ہر شخص ایک آواز ہو کر ان رہزنوں اور ان کے ہدایت کاروں کی مذمت کرتا۔ میں نے ایک مضمون موقر جریدہ "دعوت" کے لئے لکھا تھا جس میں یہ کلیہ نکال کر رکھ دیا تھا۔ یہ دعوت کے ایک بے بنیاد اداریہ کے جواب میں تھا۔ قاصد سے بار بار کہا گیا کہ وائس چانسلر کا مضمون ضرور چھپے گا، بلکہ اس کے لئے ایک خصوصی شمارہ نکالا جائے گا۔ مہینوں تک وعدہ ہوتے رہے اور بالآخر پتہ چلا کہ وہ مضمون کھو گیا ہے: ع

گم ہو وہ نگیں جس پہ کھدے نام ہمارا

میں نہایت ادب سے کہوں گا کہ یہاں ایک ایسے اخبار نے جس کی عزت کرتا ہوں صحافتی ذمہ داری اور امانتی روایت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ الزام لگایا ہے تو ملزم کو صفائی پیش کرنے کا موقع بھی دیجیے۔ یکطرفہ کارروائی کسی منصف مزاج کو زیب نہیں دیتی۔ مجھے شاید ہی اپنی کسی چیز کے کھونے کا اتنا افسوس ہوا ہو جتنا اس مضمون کے گم ہو جانے کا۔ اس میں نہ جانے کتنے امور کی وضاحت تھی، جو میں نے کرب کے عالم میں قلم برداشتہ قلمبند کی تھی۔ اب میں وہ مضمون کبھی نہ لکھ سکوں گا اور کفِ افسوس ملتا رہوں گا۔ ایک بات جو اس مضمون میں لکھی تھی اس کا ذکر کرتا چلوں میں نے اس مضمون میں کہا تھا کہ میں نے اپنے طالب علموں کو ماں کی محبت نہیں دی ہے، باپ کی محبت دی ہے۔ باپ کی محبت زبان پر نہیں آتی؛ وہ اظہار کا تحمل نہیں کرتی، وہ دُور اندیش اور سخت گیر اور تربیت پیکر ہوتی ہے۔ وہ اولاد کے لئے سارے ساز و سامان تعلیم و تربیت اور تشکیل شخصیت کے فراہم کرتا ہے، لیکن نگاہ کڑی رکھتا ہے۔ اچھائیوں اور کامیابیوں پر پیٹھ ٹھونکتا ہے؛ لیکن گمراہیوں، بداعمالیوں، غفلتوں، سرکشیوں پر سزا دیتا ہے۔ باپ کی کڑی نگاہ اگر نہ ہو تو ماں کی اُمنڈتی ہوئی محبت بچّوں کو بگاڑ دے۔ وہ یا تو گمراہ ہو جائیں، یا نرم پڑ جائیں۔

مرزا پھوکیاں بن جائیں، چھوئی مُوئی ہو جائیں۔ ان میں زندگی سے نبرد آزمائی اور زمانہ کے مقابلہ کی طاقت نہ رہے اور وہ اس احساس تناسب سے محروم ہو بیٹھیں، جو دوسروں کے ساتھ زندگی گزارنے اور ان کو برتنے کے آداب سکھاتا ہے۔

اخباروں اور تقریروں میں یونیورسٹی کے نوجوان طالب علموں کو بار بار بچے کہا گیا ہے۔ ان کو بچے کہنا ان کی توہین کرنا ہے اور اس اعتماد سے انھیں محروم کر دینا ہے جو جوانی جسے اپنے ساتھ لاتی ہے اور جو کردار کو مضبوط کرتا ہے اور حوصلہ کو مہمیز لگاتا ہے۔ نوجوانوں کو شیر خوار سمجھنا وقت کا رخ پیچھے کی طرف موڑ دینا ہے۔ یہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے حال اور مستقبل سے روگردانی کی ہے اور ماضی میں بسیرا لیا ہے۔ نوجوان اپنے اعمال اور افعال کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسے بچہ کہیے اور امریکن نوخیزوں کی طرح اسے جزا و سزا کے قانون سے بری کر دیجیے، انجام ظاہر ہے۔ یونیورسٹی کے احاطہ میں ان "بچوں" نے وہ سب کچھ کر دکھایا، امریکن نوجوان جس کے لئے بدنام ہیں۔ جو قوم شکست عنان ہو جاتی ہے اس کی پیڑھیاں ایسی ہی اٹھتی ہیں۔ زندگی میں ضرورت ہے ریاضت کی، جانفشانی کی، کمر کس کر میدان میں اترنے کی، حیات کے اکھاڑہ میں خم ٹھونک کر آنے کی۔ ادب اور لحاظ اور نظم و ضبط کی۔ وہ کوئی جوان میں جوان نہیں جن کی ریڑھ کی ہڈی ذرا میں لچک جاتی ہو جو لجلجے اور تنک حوصلہ ہوں جن کی شجاعت کا معیار صرف یہ ہو کہ مجرموں کو کرایہ پہ لے آئیں اور استادوں اور طالب علموں کو ان کے حوالے کر دیں؛ جن کی بہادری کا میدان ان کی زبان ہے! بڑھ بڑھ کر کھوکھلے دعوے اور شعلہ افشاں تقریریں ان سے جب چاہے کرا لیجیے۔ کوئی معقول بات، کوئی چھوٹا سا کام، کوئی غور و فکر، کوئی سوجھ بوجھ ان کے بس کی بات نہیں۔ دعوے کیے اور بارہا کیے کہ ہم حکومت کا تختہ الٹ دیں گے، ہم کانگریسی مسلمان امیدواروں کو انتخاب میں شکست فاش دلائیں گے۔ دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے اور اپنا سا منھ لے کر یہ سورما میدان جنگ سے کان پکڑ کر بھاگ آئے۔ ان کی ساری بہادری اپنے استادوں اور یونیورسٹی انتظام کے خلاف امکان سے وجود میں آتی ہے؛ ضلع کی انتظامیہ کے آگے جا کر یہ سجدہ کرتے ہیں تاکہ ان کو کیمپس میں تہدید و تشدد کے مواقع فراہم رہیں، شاہ کو دعا دیتے رہیں، وظیفہ خوار جو ٹھہرے! کتنے کھوکھلے، کیسے بے پیر ہیں یہ لوگ جو استادوں کو گالیاں دیتے

ہیں، مارتے پیٹتے ہیں اور اقتدار کے آستانہ پر ماتھا رگڑتے ہیں۔ یہ ننگِ ادارہ اسلحہ سے ڈرتے ہیں اور ڈراتے ہیں، یہ ننگِ اسلاف یونیورسٹی اور ملتِ اسلامیہ کی عزت اور ساکھ کو مٹی میں ملانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنے دَور میں کیا کیا اور کیا نہ کر سکا، اس کا فیصلہ وقت اور تاریخ پر چھوڑنا پڑے گا۔ البتہ ہندوستان اب یہ مانتا ہے کہ علی گڑھ میں نظم و ضبط اور تعلیم کی فضا بحال ہوگئی، داخلہ اور پڑھائی اور کھیل کے معیار اونچے ہوگئے۔ اقامت گاہیں طالع آزماؤں اور خنجر آزماؤں سے خالی کردی گئیں۔ رہائشی ہالوں کی زندگی میں کشادگی، ستھرائی اور باقاعدگی آگئی۔ وہ روایتی تقاریب اور جلسے جو زیرِ زمیں چلے گئے تھے، اس طرح ابھرے جیسے موسمِ بہار آگیا ہو۔ طالب علموں نے پھر کر ہمت مقابلہ کے لئے باندھ لی اور اس کے نتائج نکلنا شروع بھی ہوگئے۔ یونیورسٹی نے فکر و نظر کے دریچے کھول دیئے، اور ہندوستان کے ہر گوشے سے اس میں تازہ ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ علیحدگی پسندی کو ٹھیس لگی، اور ہمکاری اور تعاون اور ہم آہنگی کو بڑھاوا ملا۔ حاضری، امتحان، تعلیمی سال، طاقِ نسیاں سے اتر کر مسندِ حقیقت پر بیٹھ گئے۔ اساتذہ کے تقرر میں بغایت انصاف برتا گیا، کوئی سفارش اور کوئی دباؤ قبول نہیں کیا گیا، اور اس طرح بہت سے جوہرِ قابل ہاتھ آگئے جو عام حالات میں نامراد واپس جاتے۔

شعبوں کی توسیع ہوئی، نئے نئے شعبے کھلے۔ زراعت میں ایم۔ ایس۔ سی کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اب زراعتی انسٹی ٹیوٹ کھولنے کی تیاری بھی ہو رہی ہے۔ اسکول آف نرسنگ کو کھلے اب تین سال ہوگئے۔ کیمیکل اور پیٹرولیم انجینرنگ کا انسٹی ٹیوٹ کھلا۔ کمپیوٹر سائنس میں اعلیٰ نصاب کے دو نئے کورس کھولے گئے۔ بائیو ٹیکنولوجی کا ایک کثیر العلوم کورس کھولا گیا جو ہمیں جدید علم کی سرحد تک لے جاتا ہے۔ الکٹرونکس اور کمپیوٹر کی فیکلٹی کو اکیڈمک کونسل نے منظوری دیدی۔ میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس کے داخلے ابھی تک ۵۰ تھے، اب امید کی جاتی ہے کہ سو ہو جائیں گے۔

ایک عرصۂ دراز کے بعد اقامت گاہوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ۵۰۰ طالب علموں کے لئے ہوسٹل ریکارڈ وقت میں بنا۔ اس میں ۷۰۰ طالب علم بہ آسانی رہ سکیں۔ ویمنس کالج میں دو سو طالبات کے لئے ہوسٹل کی تجویز منظور ہوئی اور اس کی تعمیر کا کام شروع ہوگیا۔ ڈاکٹر سر ضیاءالدین ہال میں سو مزید طالب علموں کے لئے تعمیر ہوئی۔ محسن الملک ہال کی گنجائش میں ترمیم کے ذریعہ ۶۰ کا اضافہ

ہوا۔ مختصر یہ کہ گزشتہ تین سال کے دوران ہوسٹلوں میں تقریباً ۱۲۰۰ مزید طلبہ کے قیام کا انتظام کیا
گیا۔ میڈیکل کالج اسپتال میں ایک اور عمارت تعمیر ہوئی جس میں ڈیڑھ سو مریضوں کے ٹھہرنے کا انتظام ہوگا۔
آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ علیگڑھ تحریک کا اس دور میں احیا ہوا ہے۔ تین سال ہوئے
سرسید کا رسالہ "تہذیب الاخلاق" پھر جاری کیا گیا۔ ابھی ۲۰ دن ہوئے اس رسالہ کے ہندی روپ
کا اجرا "نشانت" (निशान्त) کے نام سے نائب صدر جمہوریہ ہند نے کیا۔ یہ رسالہ ہندوؤں
اور مسلمانوں میں باہم آشتی اور ہم آہنگی کی فضا پیدا کرے گا۔ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی
میں بھی دوبارہ روح پھونکی گئی ہے۔ شیخ جامعہ نے کوشش کی ہے کہ وہ بدعت ختم ہو کہ سرسید
کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد ہر وہ کام کیا جائے جو ان کے مزاج، روش اور مسلک کے خلاف
ہو۔ سرسید کی عظمت اور ان کے بنیادی پیغام سے ملک کو از سر نو روشناس کرانے کی طرف
قدم اٹھائے گئے۔ طالب علموں کو تیار کیا گیا کہ ضرورت سوجھ بوجھ، پھٹک اور پرکھ کی ہے۔ جذبات
کے دلدل میں لوٹتے رہنے سے انسان ناکارہ ہو جاتا ہے۔ مسائل شتر مرغ کی طرح ماضی کی ریت
میں سر چھپانے سے حل نہیں ہوتے، بلکہ ہر آن بدلتی ہوئی دنیا کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے سے
قابو میں آتے ہیں۔

اسلامی دارالعلوم، جامعات اور مدرسوں سے علی گڑھ کا رابطہ استوار کیا گیا۔ مدارس
کی اسناد کو یونیورسٹی میں داخلے کے لئے تسلیم کیا گیا۔ اس مقصد کے لئے ایک مجلس تساوی
(EQUIVALENCE COMMITTEE) قائم کی گئی جو نصاب میں چھان بین کرنے کے بعد
سفارش کرتی ہے۔ ناخواندگی دور کرنے کی مہم چلائی گئی۔ علاوہ بریں ہندوستانی مسلمانوں کی
صورت حال اور ان کے مسائل پر جائزہ اور تجزیہ کے انداز سے غور و خوض شروع ہوا۔ سوشل
سائنسز (سماجی علوم) کی فیکلٹی میں ایک اکائی ایسے جائزوں کے لئے قائم کی گئی۔ علاوہ بریں
ان اسکولوں اور کالجوں کی ضروریات اور کمیوں کو دریافت اور ان کی تشریح کرنے کے لئے، جنھیں
مسلمان چلا رہے ہیں، سروے کا کام شروع کیا گیا۔ یہی نہیں، اس منصوبے کے تحت ریاضی اور
سائنس کے استادوں کو اپ ڈیٹ کیا جائے گا۔

ایک اور اہم توسیعی کام جو یونیورسٹی نے علیگڑھ تحریک کے تحت شروع کیا ہے، وہ ہے

اہل حرفہ کی صورتِ حال کا جائزہ اور ان کی مالی، تعلیمی اور تکنیکی مدد۔ علی گڑھ، مراد آباد، میرٹھ، خورجہ اور فیروز آباد میں اس کام کی ابتدا ہو گئی ہے۔ اس کے نتائج بھی انشاء اللہ دور رس ہوں گے۔ اس طرح ایک طرف یونیورسٹی کے معیار کو اٹھایا اور اس کی شبیہہ کو چمکایا گیا، دوسری طرف اسے آئوری ٹاور سے نکال کر زندگی کے زیر و بم سے آشنا کیا گیا اور خدمتِ خلق اور اصلاحِ ملت اور حب وطن کے لئے اسے کمربستہ کیا گیا۔

آپ غور فرمائیں ہم نے جس سمت میں قدم اٹھائے اقلیتی کردار کی طرف وہ لے جائیں گے یا وہ بدکلامیاں، الزام تراشیاں، دشنام طرازیاں، غیر ذمہ داریاں اور بداطواریاں جن کے مظاہرے آئے دن یہ نام نہاد فرزندانِ و ہمدردانِ علیگڑھ اور مدعیانِ اسلام کر رہے ہیں؟ سر سید علیہ الرحمۃ سرگریباں ہوں گے کہ یہ لوگ کیسے فاترالعقل ہیں کہ انھوں نے اقلیتی کردار کی بازیابی کے لئے جان کی بازی لگادی، بغیر یہ جانے کہ اقلیتی کردار ہے کیا! جو بات اپنے بس کی ہو، اسے دوسروں سے کیا مانگیں۔ ہمیں اقلیتی کردار کے نام سے کیا ملا؟ ایکٹ میں ایک ایسی ترمیم جو اپنے اندر یونیورسٹی کو سُست گام کرنے اور پیچھے کی طرف لے جانے کی ساری صلاحیت رکھتی ہے۔ ۱۸۰ افراد پر مشتمل ایک کورٹ جس میں بھلے بُرے، قابل، نالائق، عالم، جاہل، صلح جو، جھگڑالو، شائستہ، بدزبان، وسیع القلب، تنگ نظر، ہر طرح کے افراد جمع ہیں؛ جو لوگ نالائق ہیں اور بُرے ہیں وہ ہر جگہ اچھوں کو دبا کر انجمن پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ میں نے یونیورسٹی کورٹ کے چار جلسوں میں شرکت کی۔ پہلی بار ۱۹۶۵ء میں جب اس وقت کے وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا؛ اور جو پتھر اراکین پر برسائے گئے اُن کا کوئی شمار نہیں۔ پھر ۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۴ء میں جب گلے پھاڑے گئے، دانت پیسے گئے، ڈرایا گیا، شور مچایا گیا۔ دو سال کے اس عرصہ میں ایک بات بھی ہماری انجمن اعلیٰ نے ایسی نہیں کی جسے اقلیتی کردار سے تعبیر کرسکتے ہیں، یا اقلیتی کردار کی تشکیل یا یونیورسٹی کی پیش رفت میں معاون سمجھ سکتے ہیں۔ اور قانون کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ بادی النظر میں کورٹ کے اراکین یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ انھیں یونیورسٹی میں سیاہ وسفید کا پورا اختیار ہے۔ وائس چانسلر اور یونیورسٹی کی دوسری اختیاریہ (AUTHORITY) کے ہر فیصلہ کو وہ اُلٹ سکتے ہیں، اس پر نظر ثانی کرسکتے ہیں۔ جتنے منھ اتنی باتیں۔ اس طرح

ی ادارہ کبھی چلا ہے! کہرام مچ جائے گا! سیلاب آجائے گا! یونیورسٹی باطل کی زد پر ہے!! اگر
یورسٹی کو چلنا ہے تو کورٹ کو اپنے وقار کو برقرار رکھنا ہوگا۔ کورٹ کی حیثیت نگراں، منصوبہ ساز
ور راہنما کی ہے۔ وہ اگر روزمرہ میں اُلجھ گیا تو اپنے مقام سے اُتر آئے گا، اور آستین چڑھا کر ہر
ں و ناکس کو دعوت مبارزت دے گا۔ حاشا کہ کورٹ کا یہ منصب نہیں، یہ مقام نہیں کورٹ، ملک
لت کی نمائندگی کرتا ہے اس سے امید کی جاتی تھی کہ یونیورسٹی کی توسیع و پیش رفت کی طرف
عیان دے گا۔ اس کے خاکے میں اقلیتی کردار کے آب و رنگ بھرے گا۔ یونیورسٹی کو آگے بڑھائیگا۔
ے وقت میں اس کے کام آئے گا۔ ترجمانی کرے گا، رہنمائی کا دم بھرے گا۔ انتظامیہ کو راہ دکھائیگا
س کا حوصلہ بڑھائے گا مداخلت نہیں کریگا، معاونت کریگا۔ حکم نہیں دے گا، ہدایت کریگا۔ ٹانگ نہیں
ھینچیگا پیٹھ پر ہاتھ رکھے گا۔ واحسرتا کہ اس نے وہ سب کر ڈالا جو اسے نہ کرنا چاہیئے تھا۔ گذشتہ ماہ مجھے
ڈی کی یونیورسٹی سینٹ (SENATE) میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا۔ میں دوسرے کام چھوڑ کر جان کر گیا کہ دیکھیں
ن کے اجلاس ہمارے کورٹ کی طرح پُرخروش، ہنگامہ پرداز اور جارحانہ ہیں یا۔ دل پر چوٹ سی لگی جب
سے اس کے برعکس پایا۔ ساری روداد انتہائی شائستگی کے ساتھ پایۂ اختتام کو پہنچی۔ الہٰی غزا نے
ور پھاڑ کھانے کے لئے ہم ہی چُنے گئے ہیں! برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر !!

ہم نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ یو، جی، سی کمیٹی نے سینٹ اور کورٹ کو ختم کرنے کی سفارش
ی ہے۔ اگر ہمارے کورٹ کا کردار منفی رہا، تو پھر اس کی بقا کی ضمانت کون کرے گا؟ کورٹ ہماری
خصوص صورت حالات کی وجہ سے ہمارے لئے ضروری ہے۔ لیکن اگر یہ راہ راست پر نہ آیا تو
یونیورسٹی کو زبردست نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس ایکٹ میں اور بھی کئی دفعات ایسی ہیں جو یونیورسٹی
کے مفاد کے خلاف ہیں۔ ان کے تذکرے کے لئے ہمارے پاس وقت نہیں۔

میں ان الوداعی اور تشریحی کلمات کے بعد آپ سے اجازت لوں گا احساس امتنان اور اس امید
کے ساتھ کہ آپکی باخبر تائید ہمیشہ یونیورسٹی کی شریک حال رہے گی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہمارا سب سے
قیمتی سرمایہ ہے۔ آپ کی مدد اور ہمدردی اس کو سیلاب بلا سے بچا سکتی ہے۔ اسے ترقی کے راستے پر
گامزن کر سکتی ہے۔ کھلے ہوئے اور دوست نما دشمنوں سے اس کی حفاظت کر سکتی ہے جو اپنی چھریاں تیز
کر رہے تھے کہ سید حامد ہٹے اور اس ادارے کا گلا کاٹ دیں۔ بیگانے شہ دے رہے ہیں اور حفظ اندوز
ہو رہے ہیں! اللہ تعالیٰ اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے!! الوداع ●●

خدابخش تصوّف مخطوطات سیمنار

علی گڑھ سیشن کا خطبۂ افتتاحیہ

خواتین وحضرات ——— مجھ سے تصوّف اور مخطوطات کے متعلق کچھ عرض کرنے کے لئے کہا گیا، تو مجھے سعدیؒ کا ایک قطعہ یاد آیا : ؎

آن شنیدی کہ صوفیٔ میکوفت   زیرِ نعلین خویش میخی چند
آستینش گرفت سرہنگی   کہ بیا نعل بر ستورم بند

میرے خیال میں ہمارے اس جلسے میں جو حضرات شریک ہیں ان کے لئے اس کے ترجمے کی کوئی ضرورت نہیں، اور اگر میں اس کا ترجمہ اُردو میں کروں گا، تو عرب ممالک سے جو حضرات آئے ہوئے ہیں، وہ نہ سمجھ سکیں گے میں انگریزی میں اس کا ترجمہ کیے دیتا ہوں :

Sa'di has said (Sa'di, the great Persian poet) that a Sufi (here he means a poor man) was putting some nails in the sole of his shoes. A soldier going that side drove him by his collar and said: Come and fix horseshoe of my horse.

So, I do not claim to be a Sufi, but a ghair-Sufi has been caught by the Sarhangs that were surrounding him and they harassed him to say something about Tasawwuf.

1

میں آگے بڑھنے سے پہلے اس کو اپنا خوشگوار فرض تصور کرتا ہوں کہ آپ سب خواتین و حضرات کی پذیرائی کروں، خصوصاً ان خواتین و حضرات کی، جو بیرونی ممالک سے یہاں تشریف لائے ہیں اور انھوں نے ہماری عزت افزائی فرمائی ہے، اور معذرت کروں اس تکلیف کے لیے جس سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔ میں سُنا کرتا تھا، بلکہ کہا بھی کرتا ہوں، مجھے ہندوستان کے مختلف گوشوں میں جانے کا موقع ملتا ہے اور تعلیم کے سلسلے میں مسلمانوں سے بالخصوص خطاب کرنے کا، تو میں نے ان سے بارہا کہا ہے اور اتنی بار کہا ہے کہ یہ جملے نوک زبان ہو گئے ہیں کہ ——— ہم کبھی علم کے قافلے کے کاروان سالار تھے اور اب ہم گردِ کاروان بن گئے ہیں، تو علم کے قافلے کا استعمال میں ایک مبہم طریقے سے کیا کرتا تھا۔ اب اس ابہام میں صراحت پیدا ہو گئی، کیونکہ یہ علم کا قافلہ ہے جو پٹنہ سے چلا، علی گڑھ آیا، علی گڑھ سے دلی جائے گا۔ یعنی علم کا یہ سلسلہ متحرک ہو گیا ہے۔ اس کو بھی ایک عنوان سے کاروانِ علم کہہ سکتے ہیں۔ علم، سکوت کے منافی ہے! سکون کے بھی منافی ہے۔ علم تقاضا کرتا ہے حرکت کا اور یہ سلسلہ جو سمینار کا شروع ہوا ہے، حرکت پر مبنی ہے۔

مخطوطات کے متعلق جیسا کہ فرمایا گیا، ہمارا رویہ اکثر "مار بر سر گنج" کا سا رہا ہے۔ ایک روایت ہے کہ خزانے پر سانپ بیٹھ جاتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی ہماری خوش فہمی ہے، ہم اتنی بھی حفاظت نہ کر سکے جتنی کہ سانپ خزانے کی کرتا ہے۔ ہمارے بہت سے ذخائر، بہت سے خزائن مخطوطات کے تلف ہو چکے اور یہ قدم، دراصل اس کی بڑی افادیت یہ ہے کہ جو مخطوطات ہمارے پاس محفوظ ہیں وہ مندرج ہو جائیں، قلم بند ہو جائیں اور اس کے بعد اہلِ تحقیق اور اہلِ علم ان سے استفادہ کر سکیں۔ سب سے بڑی اہمیت اس سلسلۂ سیمنار کی یہی ہے۔ تصوف کے سلسلے میں ایک کام جو بہت ضروری نظر آتا ہے وہ غالباً یہ ہے کہ ہم کسی طرح ان کیفیات کی ترجمانی بھی کر سکیں، تصوف جن کا حامل ہے (کیونکہ اگر ہم نے چھاننا شروع کیا تو کیفیات ایسی چیزیں نہیں ہیں، جو چھلنی میں رہ جائیں) اور ان کیفیات کے جو رمز شناس ہیں، ان سے رجوع کرنا اور ان سے استفادہ کرنا، اور یہ آسان کام نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ لوگ پہلے تو طلب کی آزمائش کرتے ہیں اور ایسے لوگ اب کم رہ گئے ہیں۔ مگر جو حضرات رہ گئے ہیں، وہ مغتنم ہیں۔ اور ان سے کیفیات کی پہلی سطح پر اور اصطلاحات کی دوسری سطح پر ہمیں تشریح لینی ہوگی، اور اس تشریح کو زبانِ قلم سے جس حد تک محفوظ کیا جا سکتا ہے وہ محفوظ کرنا ہوگا۔ لیکن یہ قدم بعد میں اٹھایا جائے گا۔

اس وقت تو جو کام درپیش ہے وہ خود اتنا اہم ہے کہ وہ وقت کا طالب ہے، توجہ کا طالب ہے، کاوش کا، جد و جہد کا، اور انتھک محنت کا طالب ہے۔ ہم نے بالعموم 'من حیث القوم' فی زمانہ ریاضت سے جی چرایا ہے، لیکن تحقیق کا کام سرسری نگاہ کو کبھی گوارا نہیں کرتا۔ اس میں تو لگن درکار ہے، عرق ریزی درکار ہے۔ اور میری اپیل آپ سب اہل علم حضرات سے یہی ہے کہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک اس انداز سے پہنچائیں، جو اس مضمون کا حق ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں، تصوف ظاہر سے باطن، ہیئت سے معنی، جسم سے روح کی طرف سفر کرنا ہے۔ تو وہ اجسام اور وہ قالب جو ہم تیار کریں، ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ روح سے، معنی سے، باطن سے محروم نہ رہے۔

مخطوطات کے متعلق ایک بات میرے ذہن میں آئی، وہ میں پیش کیے دیتا ہوں، وہ یہ کہ مخطوطات کی حیثیت، میری دانست میں دانے میں بیج کی سی ہے۔ کلام مجید میں آپ نے اکثر ذکر سنا ہوگا جزائے اعمال کے سلسلے میں، کہ ایک دانہ سے نہ معلوم کتنی بالیاں نکلتی ہیں۔ "سنابل" کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کے لئے! تو، مخطوطہ بھی دراصل ایک دانہ ہے، اور جب وہ طبع ہو جاتا ہے تو ہزاروں گنا بڑھ جاتا ہے۔ عمل صالح کی طرح مخطوطہ بھی اس کا طالب ہے کہ اس کی طباعت ہو، اس کی اشاعت ہو، وہ ایک بیج ہے اور فصل آپ جبھی کاٹیں گے، جب آپ کتابوں کی شکل میں اسے عام کردیں گے، منتشر کردیں گے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے متعلق جیسا کہ ہمارے معزز مہمانوں نے فرمایا، وہ اس سے واقف ہیں، اس سے وابستگی رکھتے ہیں اور کوئی تعارف یونیورسٹی کا کرانا، ان کے سامنے، میرے خیال میں ان کی وابستگی اور ان کی معلومات کی توہین ہوگی۔ تاہم دو ایک باتوں کا ذکر میں ضرور کروں گا۔

علی گڑھ یونیورسٹی کو ۱۹۸۱ء کے ترمیمی ایکٹ کے ذریعہ وہ کردار ملا جس کو مختلف انداز سے اقلیتی کردار، تاریخی کردار، روایتی کردار کہتے ہیں۔ اقلیتی کردار کا حق ادا کرنے کے لئے، یونیورسٹی کو کوشش کرنی ہوگی کہ مشرقی علوم میں یہ ایک ایسا مرکز بن جائے جس سے دنیا کے سارے اہل علم رجوع کریں اور شاید یہی نقطۂ آغاز بن جائے۔ ہمارے یہاں جیسا کہ آپ کو علم ہے، ایک اسلامی درسیات کا شعبہ ہے، ویسٹ ایشین اسٹیڈیز کا ایک مرکز ہے؛ اس کے علاوہ ہمارے یہاں دینیات کے شعبے ہیں، سنی، دینیات، شیعہ دینیات، اور ہمارے یہاں تاریخ کا شعبہ ہے جو قرون وسطیٰ پر غالباً دنیا

میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ ہمارے یہاں ہندی اور سنسکرت کے شعبے بھی ہیں۔ ہمارے پاس سارے وسائل، سارے ذخائر ہیں کہ ہم اسلامیات پر اور شرقیات پر ایسا کام کرسکیں جو سارے عالم میں ممتاز ہو۔ اور میں اپنے رفقا سے اپیل کروں گا، جو میں نے پہلے بھی کی ہے کہ اس کام کو وہ اپنے ذمّے لیں۔ ہمارے پاس وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے اور کوئی علمی مہم، کوئی تحقیقی مہم جو ہمارے ذہن کے احاطے میں آسکتی ہے اس کی مالی امداد پہلے ہی سے فرض کی جاسکتی ہے۔ اس میں نہ تو یو۔جی۔سی کو کبھی تامّل ہوگا اور نہ وزارت کو، اور ان امور میں کسی قسم کی مداخلت کسی حلقہ سے آج تک نہیں ہوئی ہے۔ سارے وسائل فراہم ہیں، آگے بڑھنے کی دیر ہے، قدم سے قدم ملاکر اور سر جوڑ کر اگر آگے بڑھنے کے لئے تیار ہوجائیں، تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انشاء اللہ ہم پیچھے مُڑکر نہیں دیکھیں گے۔

اس یونیورسٹی نے ابھی چند ماہ سے ایک کام اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ اہلِ حرفہ کی ترقی، پیشرفت اور خوشحالی کے لئے کوشش کرے۔ پہلے ۷ سات اضلاع میں ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یعنی علی گڑھ، مرادآباد، میرٹھ، فیروزآباد، خورجہ، مؤ، بنارس جہاں اہلِ حرفہ کی بڑی آبادی ہے۔ اور، اہلِ حرفہ کا شعار یہ ہے اور وہ یہ کرتے ہیں کہ جب ہمارا بچہ ہمارا کام کرکے ہر دفتر میں کام کرنے والے سے زیادہ کما سکتا ہے تو کیا ضرورت ہے کہ ہم اس کو تعلیم دلائیں۔ ان حضرات کے ذہن سے اس خیال کو دُور کرنا، ہے تو جُوئے شیر لانا، لیکن جوئے شیر کی جھلک کبھی کبھی نظر آجاتی ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ لوگ باتیں سُن رہے ہیں یونیورسٹی کے اساتذہ اس جائزے میں، اس سروے میں لگے ہوئے ہیں اور اُن کے نتائج بھی برآمد ہونے لگے ہیں۔ نتائج برآمد ہونے سے میری مراد یہ ہے کہ بیداری کے آثار پیدا ہوچکے ہیں۔ ہم نے انتظام کیا ہے کہ ان کاریگروں کو، ان اہلِ حرفہ کو، جن کے پاس وسائل نہیں ہیں ان کو بینکوں کے ذریعہ روپیہ دلایا جائے اور، بینکوں نے ہمارے سروے کو، ہماری رپورٹ کو، تسلیم کرلیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یونیورسٹی جس بارے میں یہ کہہ دے گی کہ یہ آدمی اس لائق ہے کہ اس کو مشینیں دی جائیں، ہم اس کو دلا دیں گے۔ چنانچہ علی گڑھ میں ایسا ہوا ہے، میرٹھ اور مرادآباد وغیرہ میں بھی ہم یہ کریں گے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی ان کی صحت، ان کی تعلیم کا بندوبست بھی حکومت کے تعاون کے ساتھ کرے گی۔

میں نے ذکر کیا تھا یونیورسٹی کے کردار کا۔ یونیورسٹی کے کردار کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کا رشتہ اس کے عظیم بانی کی پالیسی، ان کی حکمتِ عملی کے ساتھ جوڑ دیا جائے، اور علی گڑھ تحریک کا احیا اسی

عنوان ممکن ہے !

دوسرا اہم جو کیا گیا وہ ہے مسلم اسکول اور کالجوں کا ایک سروے، جو اس وقت ہو رہا ہے اور ان کے لئے وہ تربیتی کلاس جو ریاضی اور سائنس کے استادوں کے لئے منعقد کیے جا رہے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ان مضامین میں جہاں کچھ زیادہ کمزوری محسوس کی گئی، ہم ان اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کو جدید ترین معلومات سے لیس کر دیں۔

یونیورسٹی کو اب کسی منارے میں بند نہیں رکھ سکتے۔ یونیورسٹی کو اپنے فیض کو نہ صرف اپنے حدود کے اندر عام کرنا ہے، بلکہ معاشرے تک براہ راست پھیلانا ہے۔ اور اس کی طرف قدم اٹھائے جا چکے ہیں! یہ جان کر، میں سمجھتا ہوں آپ کو اطمینان ہوگا۔

آغاز میں ذکر انفعال کا آیا تھا۔ میں اپنی گفتگو کو اسی پر ختم کروں گا۔ اقبال کے بعض اشعار زبان زد خاص و عام ہیں اور ان میں سے ایک مصرع یہ بھی ہے : "اگر نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی" لیکن یہ مصرع ہمیشہ پڑھا جانا چاہیے، اقبال ہی کے دوسرے شعر کے ساتھ : آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ یہ مٹی نم کیسے ہوتی ہے، اقبال نے ہی کہا تھا :

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اور یہ مٹی اگر نم ہوگی تو عرقِ انفعال سے ہوگی۔

معذرت چاہتا ہوں، میں اپنے مضمون سے کچھ بہک گیا، لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ یونیورسٹی کے توسیعی کام سے آپ کو روشناس کرا دوں۔ میں اس سیمنار کا افتتاح کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں اور فخر بھی، اور میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کی مساعی مشکور ہوں۔

●●

ہندی 'تہذیب الاخلاق'

'نشانت' کے اجراء کے موقع پر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اپنے عظیم المرتبت بانی کی تعقل نواز، ترقی پسند اور لچک دار روایات کی امین ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کبھی کبھی بعض لوگوں کی قیادت میں جو بانیٔ درسگاہ کا سا اندازِ فکر نہیں رکھتے تھے یہ درسگاہ اپنے معینہ اصولوں سے دور ہو گئی اور عقلیت کا راستہ چھوڑ کر جذباتیت کا شکار ہو گئی لیکن اس حالت پر زیادہ وقت نہیں گزرا کہ یونیورسٹی نے اپنے دل کی توانائی سے کام لے کر کھوئی ہوئی منزل کو دوبارہ پا لیا۔ یقین اور تعقل کی گہرائیوں کا سہارا لے کر پائدار گراؤنڈ کھڑی ہوئی۔ میری رائے میں یونیورسٹی کو صرف تدریس، تحقیق اور تبلیغ علم ہی کا مرکز ہونا چاہیے جس کی بدولت اس کے گرد و نواح اور اس کے زیرِ اثر حلقوں کی اصلاح ہو سکے، انھیں روشنی نکل سکے اور وہ بلند سے بلند تر ہو سکیں ورنہ وہ اپنے مقصد کا ایک بڑا حصہ کھو دے گی۔

نشانت دوسرے رسائل و جرائد کی طرح محض ایک رسالہ نہیں ہے بلکہ اس میگزین کے ساتھ ایک مقصدیت، ایک تاریخ اور ایک علامت نما عظمت وابستہ ہے۔

تہذیب الاخلاق کی روزافزوں کامیابی سے متاثر ہو کر ٹرسٹ نے ارادہ کیا کہ اس کے اغراض و مقاصد کی مزید نشر و اشاعت کے لئے اس کا ہندی اڈیشن بھی پیش کیا جائے۔ اس کے ذریعہ ہندو اور مسلمانوں میں پھیلی ہوئی مستقل غلط فہمیاں بھی دور ہوں گی اور ابلاغ کا خلا بھی پُر ہوگا۔ اکثریتی جماعت اس کے صفحات کے ذریعہ مسلمانوں کے میلانات و مسائل اور افکار و احساسات سے باخبر ہو سکے گی۔ اس میگزین کا نام خاص طور سے نشانت رکھا گیا ہے جس کے معنی ہیں اندھیرے کا خاتمہ ـــــ جہالت، مجبوری، بے حوصلگی اور بے اعتمادی کا اندھیرا ـــــ رسالے کے رہنما اصول میں، جیسا کہ اس کے اردو ایڈیشن سے بھی ظاہر ہے کہ باہمی ہمدردی، قومی استحکام اور رواداری کو فروغ ہو۔ ہر ایسی چیز جس سے کسی بھی طبقہ کی دل آزاری ہو ممنوع ہے۔ تلخی اور نخوت سے پرہیز کیا گیا ہے، جو کچھ اس میں کہا جائے گا ترغیب کا انداز لئے ہوگا نہ کہ جارحیت اور تلخی کا۔ اس کو پڑھنے کے بعد قاری ہندوستان کی مشترکہ میراث پر بجا طور سے فخر کر سکے گا اور اس کے دل میں انسانیت کے لئے جذبۂ محبت پیدا ہوگا۔

••

مطبوعات خدابخش لائبریری، پٹنہ

قیمت

۱۔ ایک مشرقی کتابخانہ: خدابخش لائبریری کا تعارف از اسکاٹ او کونار (انگریزی) 10/-

۲۔ خدابخش: خدابخش لائبریری کے بانی کی ایک مختصر مگر جامع سوانح از سر جدو ناتھ سرکار اور صلاح الدین خدابخش (انگریزی) 10/-

۳۔ مصوری کا تاج محل: خدابخش لائبریری میں محفوظ عہد مغلیہ کے ایک نادر مخطوطہ تاریخ خاندان تیموریہ کا تعارف اور نمونے کی ۱۲ رنگین تصاویر۔ (انگریزی) 15/-

۴۔ مجموعہ مقالات پروفیسر سید حسن عسکری، پہلی جلد: شیخ ارشدی، شرف الدین یحییٰ منیری، زین بدر عربی اور ملک بیو پر مضامین۔ (انگریزی) 10/-

۵۔ تدوین متن کے مسائل: خدابخش سیمینار کے مقالات اور مباحثے (اردو) 15/-

۶۔ پنڈت موتی لال نہرو کا خطبہ صدارت: انڈین نیشنل کانگریس کی یو پی کی پہلی صوبائی کانفرنس (۱۹۰۷) میں: ایک اہم دستاویز (اردو) 10/-

۷۔ فرہنگ آصفیہ مولفہ سید احمد دہلوی پر تبصرہ عظیم محقق قاضی عبدالودود کے قلم سے (اردو) 10/-

۸۔ بہار اردو لغت جلد اوّل: فرہنگ بلخی از یوسف الدین احمد بلخی (م ۱۹۶۱ء): بہار میں عام طور پر بولے جانے والے الفاظ اور محاورات کی ایک اہم لغت (اردو) 15/-

ترتیب و تدوین

۹۔ مجمع النفائس از سراج الدین علی خان آرزو (م ۱۱۶۹ھ): بارہویں صدی ہجری کے فارسی شعراء کا ایک اہم تذکرہ (فارسی) 10/-

۱۰۔ بیاض معانی از نقش علی (م ۱۱۴۴ھ): بارہویں صدی ہجری کے فارسی شعراء کا دوسرا اہم تذکرہ (فارسی) 10/-

۱۱۔ صحف ابراہیم از علی ابراہیم خان خلیل (م ۱۲۰۸ھ) بارہویں صدی ہجری کے شعراء فارسی کا تیسرا اہم تذکرہ (فارسی) 10/-

۱۲۔ مثنوی تصویر محبت از میر شمس الدین فقیر (م ۱۱۸۳ھ) عظیم آبادی ایک داستان محبت جو میر کی شعلۂ عشق کا ماخذ بنی (فارسی) 10/-

۱۳۔ شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان از مرزا جان طپش (م ۱۲۲۹ھ): شاہ عالم کے عہد کی محاورات اردو کی لغت 10/-

۱۴۔ تاریخ ہائے پیدائش و وفات معاصران: قطعات حسرت از شمس العلماء محمد حسرت عظیم آبادی (م ۱۳۰۴ھ) (فارسی) 10/-

۱۵۔ کنز تواریخ: شاہ غلام یحییٰ عظیم آبادی (م ۱۳۰۲ھ) کے قطعات تاریخی (فارسی) 10/-

۱۶۔ تذکرہ کاملان رام پور: مرتبہ حافظ احمد علی خاں شوق (م ۱۹۳۳ء) (عکسی اشاعت) امیر مینائی کی انتخاب یادگار کے بعد اب تک رامپور کے مشاہیر اور روہیلوں کی تہذیبی تاریخ کا تنہا ماخذ، تقریباً ۵۳۱ مشاہیر رامپور کا تذکرہ تصحیح و اضافہ کے ساتھ۔ (اردو) 50/-

رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت

۱۷۔ جلد اوّل: ادیب الٰہ آباد: نوبت رائے نظر کے ماہنامہ 'ادیب' الٰہ آباد کے مکمل فائل (۱۹۱۰-۱۳ء) سے ادبی، علمی، تہذیبی، لسانی اور سیاسی مضامین کا ایک انتخاب۔ 45/-

۱۸۔ جلد دوم: العصر لکھنؤ: پیارے لال شاکر کے ماہنامہ 'العصر' لکھنؤ (۱۹۱۳-۱۷ء) کے تمام و کمال اکہتر شماروں کا انتخاب جس میں ادبی، علمی اور تاریخی مضامین کے علاوہ فلسفہ، سائنس اور صنعت و حرفت پر بھی مضامین شامل ہیں۔ ۳۲ مشاہیر کی نادر عکسی تصاویر کے ساتھ 45/-

۱۹۔ جلد سوم: صبح امید لکھنؤ: برج نرائن چکبست کے ماہنامہ 'صبح امید' لکھنؤ (۱۹۱۸-۲۱ء) کے مکمل فائل سے ادبی، علمی، اور تاریخی مضامین کے علاوہ تحریک آزادی کی معاصر دستاویزات اور انقلاب روس کے ہندوستان پر اثرات سے متعلق مضامین کا انتخاب 45/-

قیمت

۲۰- ۱۹۳۶ء میں قاضی عبدالودود کا معیار: قاضی عبدالودود کے مشہور اردو ماہنامہ 'معیار' پٹنہ (۱۹۳۶ء) کے مکمل تاریخی عکسی اشاعت: ایک بھرپور تجزیاتی اشاریہ کے اضافہ کے ساتھ 45/-

۲۱- جدید غزل گو: ۱۹۴۱ء کی ایک دستاویز نیاز فتحپوری کے ماہنامہ 'نگار' ۱۹۴۲ء کے خاص نمبر کی عکسی اشاعت ۱۹۴۰ء تک کے غزل گو شعراء کا خود انتخاب کردہ کلام، خود نوشت سوانح، شعراء کی اسی عہد کی تصاویر اور خود نوشت تحریریں۔ 35/-

• خدابخش سلسلۂ خطبات

۲۲- عہد سلطنت (۱۲۰۶-۱۵۲۶ء) کے صوفی ادب پر ایک طائرانہ نظر: از ڈاکٹر بروس لارنس (امریکا) (انگریزی) 10/-

۲۳- عہد نبوی کی تقویم کی تشکیل نو: از ڈاکٹر ہاشم امیر علی (انگریزی) 10/-

۲۴- فارسی اور ہندوستان: از پروفیسر نذیر احمد (اردو) 10/-

۲۵- میری تنقید: ایک بازدید از پروفیسر کلیم الدین احمد (اردو) 10/-

۲۶- صوفیہ کے مکتوبات و ملفوظات: سماجی سیاسی تاریخ کا ایک اہم ماخذ از پروفیسر سید حسن عسکری (انگریزی) 10/-

۲۷- اسلام کی چودہ صدیاں مکمل ہونے کی تقریب میں: چند مسلم مسائل اور اسلام و عصر جدید کے بارے میں چند خیالات از بدرالدین طیب جی (انگریزی) 10/-

۲۸- فارسی ادبیات میں ہندوستان کا حصہ: جدید تحقیقات کی روشنی میں از ڈاکٹر امیر حسن عابدی (انگریزی) 10/-

۲۹- فکر اسلامی: بدلتی دنیا میں از پروفیسر سید وحیدالدین (انگریزی) 10/-

۳۰- مشرق وسطیٰ: (بشمول شمالی افریقا اور مشرق وسطیٰ) از پروفیسر آصف فیضی (انگریزی) 10/-

۳۱- بین المذاہب مخاطبتی مکالمہ: ایک تاریخی چیلنج بھی اور ایک مذہبی واردات بھی از ڈاکٹر آری روئسٹ کرولیس (انگریزی) 10/-

۳۲- افکار رومی: از عبدالسلام خاں (اردو) 40/-

• فہارس مخطوطات خدابخش

۳۳- مفتاح الکنوز: جلد اول ـــ سوم (فہرست مخطوطات عربی) فی جلد 10/-

۳۴- مرآۃ العلوم: جلد اول ـــ سوم (فہرست مخطوطات فارسی) فی جلد 10/-

۳۵- فہرست مخطوطات اردو جلد اول 10/-

• توضیحی کیٹلاگ: مخطوطات خدابخش (انگریزی)

۳۶- جلد اول و دوم: مخطوطات فارسی (شعر فارسی) جلد ۸: مخطوطات فارسی (تاریخ ہند)
جلد ۲۹: مخطوطات عربی (قرآنیات) جلد ۳۰: مخطوطات عربی (حدیث)
جلد ۳۱: مخطوطات فارسی (شعر فارسی، تاریخ، سوانح اور قصص) جلد ۳۲: مخطوطات فارسی (دائرۃ المعارف، سائنس، طب، منطق اور اخلاقیات)
جلد ۳۳: مخطوطات عربی (فقہ اسلامی) فی جلد 50/-

• خدابخش لائبریری جرنل (سہ ماہی)

۳۷- خدابخش لائبریری جرنل: اردو، انگریزی، عربی و فارسی چاروں زبانوں میں مضامین شائع کرنے والا ایک سہ ماہی تحقیقی جرنل، ۱۹۷۷ء سے جاری، اب تک ۳۹ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔

قیمت فی شمارہ: 15 روپے

سالانہ: 60 روپے (ہند)، 12 ڈالر (ایشیا)، 24 ڈالر (دیگر ممالک)

A rational interpretation of the essential tradition, the need for *ijtihAd* and the understanding and appreciation of the role of *muAmlAt* (dealings with men) *in religion are the basic features of Sir Syed's view of Islam.* He differentiated between the essential Islam and historic Islam. If we apply Sir Syed's method today, it is possible to see that Islam enables man to rise to his full stature and move with the times, retaining a moral vision, a feeling for justice among men, and a strength to control the forces that power over nature has unleashed. Sir Syed aims at turning knowledge into wisdom.

Sir Syed has been criticized for tying to twist religion to suit the needs of his day. The charge is made by those who are afraid of change or opposed to it. The attempt to see what is relevant and what is not, to one's needs, is a perfectly legitimate one. Many of the arguments that Sir Syed advances are not important. What is important *is the spirit and the attitude behind them.* Iqbal understood this when he said in his lectures, "The claim of the present day generation of muslim liberals to reinterpret the foundational legal principles, in the light of their own experience and the altered conditions of modern life, is in my opinion perfectly justified. The teaching of the Quran that life is a *process of progressive creation necessitates that each generation, guided* but unhampered by the work of its predecessors, should be permitted to solve its own problems". Sir Syed just tried to do the same. He was bold for his age in his thinking. It is high time that we ponder over the message in his *tahzibul akhlAq* and *tafsir* and face squarely the problems and challenges that confront us today.

(Source : Proceedings Aligarh Seminar ● Traditionalism & Rationalism in Islam Feb. '1982

Sir Syed's main interest was not in religion but in culture and education. But he realized that religion, in this case Islam, was basic to the issue and no significant questions could be posed and answered without looking at things from the religious point of view. For this, a new interpretation was vital, and Sir Syed procceeded to provide it. It is because of Sir Syed's interest in culture and education that Mujib has called him secular. Sir Syed emphasises the secular aspect, but the secular aspect is in keeping with his view of religion. In his Patna speech he said that, "If you discard *Din*, the world is not lost, but if you discard the world, *Din* is also lost". His story of the worldly wise (*dunyAdAr*) and the ignorant man of God (*nAdAn KhudA Parast*) illustrates the point. The former builds a mosque, the latter a school. The former is trying for a berth in heaven, the latter wants to make a heaven on earth. The Prophet did not want to be with God for ever, he preferred to live with men and teach them the right path.

It must be admitted that when Sir Syed visited England he was dazzled by the glory of the west but undoubtedly he was able to see some essentials also. He realized what science and technology had done for the west. He could see the intellectual advance which the west had made. He could sense the forces behind social awareness and economic progress. Hence *tahzibul-akhlAq*, on the lines of spectator and Tatler and hence his zeal for civilizing his people.

KhutbAt-e-Ahmadia, tahzibul-akhlAq and tafsirul-QurAn broadly encompass his religious writings. The last two met with bitter opposition, because Sir Syed was attacking the medieval concept of "learning, accepting and repeating". He was questioning old beliefs, rituals, customs and practices. *Wahabism* also stressed essentials, and worked for doing away with accretions of later days But Sir Syed was a *Wahabi* with a sense of history and an awareness of the laws of change and an acute consciousness of "what science had come to mean for man.' Sir Syed is the first of our moderns but he is not a modernist. He believes that continuity is also necessary while changing. For continuity he insists on a basic tradition and interprets this tradition in such a way that it helps to prepare for a change.

The days of nineteenth century rationalism are no more. Science is no longer arrogant. It knows its bounds. With our greater knowledge of man and society and our growing control over nature, we do realize that Sir Syed's rationalism appears a bit naive today, but its great merit lies being in tune with the voice of history, and in his insistence on reason as a guide for human behaviour. Reason has its limitations too but it is mainly through this useful guide that man has progressed. Sir Syed is the first of our intellectuals and without him we cannot think of Shibli, Azad, and Iqbal.

Like Shah Wali Ullah, Sir Syed made a distinction between *Din* and *Shariat*. Maulana Azad amplified the point. The rigidity of *Shariat* gave rise to Sufism. Sufism rendered great service to religion but it degenerated later into what Iqbal calls *mizAje khAnqAhi* (the temper of the monastry). Sir Syed while insisting on a rational interpretation of *Shariat* pleaded for *ijtihAd*. Azad and Iqbal did the same.

SIR SYED'S VIEW OF ISLAM

Traditionalism is adherence to tradition as authority, specially in matter of religion. In this case all knowledge of religious truth is derived from divine revelation and received by traditional instruction. Tradition is handed down from generation to generation in the form of statements, beliefs or customs, by mouth, practice or writing. There may be an essential earlier tradition, to which later traditions may be added. A traditionalist, may accept some part as essential and regard the rest as not-relevant for him

Rationalism refers to the principle and habit of accepting reason as the supreme authority in matters of opinion, belief or conduct. Reason alone is the source of knowledge here and is independent of experience. It can guide us to all attainable truth.

Sir Syed did not accept the whole of Islamic tradition; for him the essential and authentic tradition was that of the Quran and the part of the sayings of the prophet which have been accepted as genuine. He believed that the essential tradition is true and there is correspondence between the word of God and the work of God, that is nature.

Sir Syed conveniently interpreted certain incidents, phenomenon or stories in the Quran, as metaphorical or symbolic. This had been done before him also He insisted that they should not be taken literally. Reference to the sky, heaven or hell, the jinii. the ascent of the prophet to the heavens, miracles, and the like were all placed by Sir Syed in this category.

Sir Syed believed that God is one and eternal and the sole creator of the universe. His word and the word of his prophet cannot be against reality and against nature. The Quran is the word of God and all that is said in it, is correct and true. Anything which appears against nature or contradictory, appears so, due to our lack of understanding. Only the prophet's word and deed are the recognized authority in religious matters. We should make a distinction between those sayings which pertain to religious matters and those which deal with worldly matters. Only the former, found to be authentic, have to be followed. Man is only accountable for those deeds which are in his power.

Religion consists of belief, practices in the light of this belief, and dealings with fellow men (aqAid, ibAdat, muAmalAt). Sir Syed sees the essential tradition of belief and essential religious practices as eminently reasonable but he feels many of the practices sanctioned by custom and the pattern of behaviour that has become hallowed by time, have tobe critically examined in the light of reason and their usefulness in changing times.

Sir Syed had been influenced by the *Wahabi* movement He even called himself a *Wahabi* His scholarly persuits, his association with the British, his sharp intellect, his great love for his people, his capacity to absorb new ideas, made him initiate a move first for finding common points between Islam and christianity and then arousing his people from the mental lethargy into which they had fallen, so that they could see what was happening in the world. The Scientific Society and the Institute Gazette were intended to open up people's minds and make them aware of the new wave of reason and science.

Small wonder that the followers of Islam bacame the torch-bearers (knowledge and free inquiry. They studied Greek philosophers and th(observed nature. On this amalgam they brought to bear the fait dynamism and vision imparted by Islam. The result was a massi\ renewal and effervescence of knowledge which eventually triggered c and got dovetailed into the European Renaissance.

I need not dwell on the development of Islamic thought through tl ages. This is in fact the area which the distinguished scholars, whom it our privilege to have with us, will traverse. But I would like to state tl obvious fact that over the last four centuries a steep decline has take place in the Muslim intellect. It is not as if traditionalism has won ov rationalism. In point of fact rationalism completely uprooted from trad tion would shrink and wither, and would result in infructuous academ exercises culminating in insecurity, cynicism and non-balance. Similarl traditionalism completely bereft of the enlivening and broadening influen of rationalism would be frozen into mere dogma divorced from progress.

The situation that we are in is not that of traditionalism but of sta(nation. We have to make a concerted effort to lift ourselves from tl morass of intellectual lethargy, narrowness and obscurantism. We have ensure that religion becomes again for us an enlivening, energisin inspiring and emancipating force. To that end we have to shed th capacitating accretions. We have to demonstrate to the world again th Islam brings a message of peace and harmony, good conduct and goo neighbourliness. large-hearted tolerance and quest of knowledge. considers all humanity as the family of God. It is essentially mobil dynamic and progressive It stands for uplifting rhe weak and the dow trodden It believes in even distribution of resources and opportunities.

I deem it a privilege to welcome the distinguished participant The seminar, I trust, will spend sometime considering a programme for well-organised long-range gamut of studies designed to secure a bett understanding of Islam not only among its votaries but also among peop professing other faiths. Recent times have witnessed world-wide resu gence of interest in Islam. What is cardinally important such a situation is a coordinated effort so that sporadic ar overlapping work is avoided and optimum and integrated use is mac of available scholarship and existing research facilities. I would reque that the present seminar may also address itself to evolving a mechanis for collection and dissemination of knowledge about the work bein currently done on Islam in various parts of the globe gnd i coordination. The next step should be to identify areas where work is y to be done and make a plan for a coordinated research effort. Th endeavour, of necessity, will be of long gestation.

May I also suggest to the distinguised delegates to utilise their vis for an appraisal of the work done so far by our Institute of Islam Studies. Suggestions about reorientation of sights, removal of deficienci and restructuring of the teaching and research programme would t received with deference and considered w th earnestness.

Inaugural Address of the Aligarh Seminar on Traditionalism & Rationalis in Islamic Thought, Feb. 1982 (source : Proceeding)

RATIONALISM AND TRADITIONALISM IN ISLAMIC THOUGHT

We should at the outset distinguish between Islam and the Muslims. Islam as a creed, as a way of life, is unchangeable. It is enshrined in the Quran and the Traditions. Muslims have, necessarily over the ages, undergone changes. Even at the best of times they have only inadequately reflected their faith. At the worst of time their conduct has been the antithesis of what is enjoined. It would therefore be erroneous to work ? back from the behaviour of the Muslims and make from it inferences about Islam. Therefore, in order to avoid blurring of perspective, the subject of discussion should be divided into two parts : **1. Elements of Rationalism** and Traditionalism in Islamic thought as embodied in *Quran* and *Hadith*. 2. Rationalism and Traditionalism in the thought of followers of Islam during different periods upto date.

As regards the tenets of Islam, it insists initially on a few basic articles of faith : Unity of God, ultimate Prophethood of Mohammad (Peace be on him), Revelation, Answerability of the individual for his deeds, Day of Judgment. Beyond these articles of faith it leaves the mind of a Muslim free to observe, assimilate, contemplate and draw inferences. It suggests physical and mental mobility. There is no other religion which exhorts its followers categorically and repeatedly to seek knowledge through observation, experimentation and studies It goes, as is well known, to the extent of rating the scholar's ink higher than the martyr's blood The Quran for its acceptance invokes evidence and argument (*burhAn*), intelligence (*aql* and *hikma*). There are more verses in the Quran stressing the need for observing closely the manifestations of Nature, contemplating them, and finding in them the key to unravelling the Divine scheme of things than on any other subject. Nowhere else the quest of knowledge has been considered as a duty enjoined by religion. Man was declared superior to the Angels because God had taught him "the nature of all things" which remained unrevealed to the Angels :

"Wa 'allama Adam al-asmA'a kullahA, thumma 'araDahum ala' l-malAikah; fa-qAla anbiUni bi-asmA'i hA'ulA'i in kuntum SAdiqin" (*al Baqarah* : *31*)

Thus, it is knowledge and the quest of knowledge that places man in the top echelon of creation.

"Inna fi khalqis samAwAti wa l-arDi, 'wa-ikhtilAfi' l-lail w'a'nnahaAri wa'al fulk al-lati tajri fi'l baHr bimA yanfa'un-nAs wa mA anzal al-lAHhu min-as samA'i', mAinfa-ahyA bihi'l arD ba'da mautihA wa bathth fihA min kulli dAbbah wa taSrif ir-riyAHi wa-as-saHAbi -al-musakhkhari bain as-samAi wa al-arD'i la-AyAtun li' qaumin y'aqilUn" (*Baqarah* : *164*)

Behold ! In the creation of the heavens and the earth; in the alternation of the Night and the Day; in the sailing of the ships through the Ocean for the profit of mankind; in the rain which God sends down from the skies and the life which He gives therewith to an earth that is dead, in the beasts of all kinds that he scatters through the earth ; in the change of the winds and the clouds which they trail like their slaves between the sky and the earth (here) indeed are signs for a people, that have wisdom (that think) — (*al Baqara, II.* 164.)

are gullible; and, what is needed and what Syed Ahmad Khan tried to instil into the Muslims, is a rational approach. That rational approach has alluded the Muslims. They can be excited easily on an issue; but to expect them to be steadfast and work hard for a particular purpose would be asking too much. In fact what is needed is that all the Muslim institutions of education, whether they label themselves as institutions of general educational stream or whether they label themselves as school of *Dini Talim* or whatever institutions exist; they should be encouraged; and what is even more important is that we should ensure that in the, general run of the schools, Muslims should get adequate admission because the most important step which can lift the Muslims out of the morass in which they have fallen is the spread of education. They are perhaps educationally the most backward people in the country; and as long as they remain educationally backward they will not move forward on any other front. So my plea is that every step should be taken to make them move forward educationally.

I would also submit that it has happened a number of times that they have settled down. They settle down, they look forward; they move forward and then suddenly they are disturbed by the incidents of communal riots. It has already been mentioned that I want to impose discipline; but as an administrator I have not the least doubt that if the District authorities want to stop a riot, they can do it in 12 hours. These communal riots have disturbed the confidence of the Muslims; and if they are put an end to ! (they cannot be put a complete end tc.) There would be disturbances, there would be clashes, but they can certainly be handled; and there are administrators who have demostrated it in recent times also. Even in Aligarh, administrators have demonstrated that riots could not be prolonged beyond a couple of days. This has been done and there should be strict instructions in this regard; and once there is peace and security, the best would come out of the communities including the minority community.

Intellectuals meet on the problems of Muslims, New Delhi, June 5, 1983, organised by AICC. Young Intellectuals Congress.

administrative level we discover that the benefit of these policies does not reach the minority community to the extent to which it should have reached. Now, this situation can be remedied only by an understanding between the minority and the majority community and that ought to be developed. This is the second plane on which the minority community should operate. And the third plane is the plane to which we have been addressing ourselves all the time, i. e., Government. We have to intimate to government that there are areas in which we require assistance. You know, as a developing country. we went to the Committee of Nations, we demanded from the advanced countries that we should be helped out. Similarly, within our own country as a backward community we have a right to ask the government and we have a right to ask the more developed communities to help us out. In my earlier incarnation as Chairman of the Staff Selection Commission I went from one corner of the country to the other interviewing candidates and I was shocked to discover that the number of Muslims who qualified for the interview for the junior posts for which I was catering, was minimal It was negligible and in point of interview I discovered that, more often than not, the scheduled caste candidates faired better than the Muslim candidates. This is the present situation. I would not like to be considered as Prophet of Doom, that is not my intention in mentioning this; but I do want to give a jolt to the collective conscience of the nation that Muslims have slided backward and it is incumbent not only on Muslims but on all right-thinking people in the country to try to arrest that slide; because unless we do it, we might come across a situation where Muslims become a great drag on the progress of the nation Look at any sphere of life in the country : we will not discover any eminent person among the Muslims (there are a very few people who have assumed national dimensions) and this situation which I submit has to be fought. Now in respect of education we are backward and the tradition of social work of constructive leadership among the Muslims has withered The tradition was started by the greatest Indian Muslim that this country has witnessed during the last 200 years. I am referring to Sir Syed Ahmad Khan; and, after him, no Muslim paid any heed, whatsoever, to the education of Muslims and to their social uplift. They all were drawn into the vortex of politics.

I will just make yet another point and conclude my observations. Muslims are an emotional community. They are excitable and they

THE DILEMMA OF INDIAN MUSLIMS

The subject is colossal. To compress it within the short span of a few minutes would certainly be very difficult. I would just touch upon a few points.

It is very clear that Indian Muslims are sliding back. The magnitude of the slide-back is unknown. It is impressionistic but it is nonetheless true. But if it were known, the collective conscience of the nation would be jolted and shot into taking some action. To me it seems that action has to be taken on three planes. One is the community's own plane; and I am one of those who believes that the shortcoming is very often from among ourselves. This is due partly to an aftermath of incidents for which we were not responsible and a hang-over of the past and partly to a dearth of leadership among the Muslims. Whenever a community is backward, those who acquire influence and affluence become exploiters and this is what has happened, by and large, to the Muslims. Those who acquire influence, those who acquire education, those who acquire affluence, they cut themselves aloof from the masses and they establish a sort of exploitative relationship with the masses and get interested in the perpetuation of that relationship. This is one of the major problems. In fact I have been telling my Hindu friends that it is not the problem of Muslims alone and if the Muslims have displayed bankruptcy of leadership and bankruptcy of judgement, it is for Hindus to come forward and help them out.

So the first plane is community's own plane. Any minority that wants to survive and thrive with self-respect has to do three things in my estimation. One is that it should try to preserve its culture and traditions. This is absolutely essential and this is in conformity with the constitution of our country which directs that every community will have the freedom to pursue its goals and to preserve its culture and traditions. This diversity in unity which is the hallmark of our constitution and our country does require that a minority should be in a position to preserve its culture and traditions. That is number one. Number two is that minority should, by dint of hard work, excel other communities in the country. And the third and perhaps one of the most essential conditions is that the minority should have the most cordial relations with the majority community. We are faced with a situation that a government that wants to be fair to all the communities issues directive based on policies and when these policies trickle down to th

of the mystery that still surrounds the decline of the Indian Muslims. They will bring to bear on some of the apparently intractable problems a scientific attitude and an incisive intellect. Now, may I suggest that the learned participants may assume that their papers have been read and bring out in the course of their intervention only the very significant points. This will not only save time but keep the discussion in focus and facilitate the emergence of an integrated plan within a broad framework. We have to avoid generalisation; we have to eschew repetition: we have to exclude platitudes and pious hopes. What is needed is an open-eyed, candid and ruthless appraisal of the situation followed by a plan of action. This last should be specific and down-to-earth. We should resist the temptation of blaming our plight on others and indulging in self-pity. We need do only two things these days :

1. Identify the gaping deficiencies in the information base and suggest selective surveys and studies to remove them;

2. formulate a practical plan comprising—

   (a) collection, tabulation, analysis, storage and retrieval of data;

   (b) action programmes for eradicating, removing or reducing the factors responsible for decline and continued backwardness.

Our action plan should not in fact await the completion of the studies and surveys and analyses that we decide to embark upon. Both should run concurrently. On behalf of my colleagues and my students I renew the pledge of the great founder of this University and consecrate this institution once again to the educational uplift and economic rehabilitation of Indian Muslims within the framework of a secular, progressive and enlightened country, to the inculcation of understanding, amity and goodwil, and to dissemination of sanity, awareness and enlightenmont.

---

and cultural uplift of Indian Muslims. In pursuance of this objective, suitable provisions should be made both in the plan and budget of the University.

The setting up of coaching and guidance and employability improvement centres in various parts of the country should be undertaken. These can attract financial assistance from government.

While concerning ourselves with the problems of Muslims, we should study them against the total national context. There are so many problems that are common to all the communities and the Muslims should endeavour along with their countrymen to resolve these problems. They should not allow insularity to limit their horizon or to alienate their countrymen. Their endeavour should be to strive ceaselessly for the goals that the country has set itself and to bring themselves through the process of education within the mainstream of national progress.

I have no doubt that Dr. A. R. Kidwai, who is known for vision and practical commonsense and who has great achievements to his credit, will set out investigative endeavour on the road to meaningful success and purposive fruition. His wise counsel will certainly save the seminar from lapsing into a mere academic exercise or a talking session, give it direction, thrust and a cutting edge. I also trust that the Chairman of the Minorities Commission will try to convert the Commission into an instrument of recovery and reform. He should be able to make on this momentous occasion, observation which should strike a responsive chord in the mind of Indian Muslims and which should help release a national effort for their uplift. He should be able, in due course, to persuade the Registrar-General to include in the design of the decennial census columns which would yield significant information about the comparative status and progress of the different communities and which could make redundant many of the surveys and studies that the seminar may envisage or the social scientist and the educational planners may hanker for. I do hope that the distinguished participants will make very significant contributions to the unravelling

them better for living successfully in a society where unemployment and under-employment have become endemic but also induce a change in attitude without which no progress is possible. The second important step should be to organise time-bound studies and surveys and data collection which would not only delineate with some precision their educational, social and economic status but also provide clues to factors culminating therein. For creating a stir and triggering reform, it is necessary to identify a few persons in every town who can be depended upon for selfless work. Without such persons nothing can be achieved. Their call evokes immediate response. Very much more important than policy and programme is the availability of dedicated and socially-motivated men.

Reverting now to the task before this seminar, I would suggest that it should address itself to specific areas. The general situation is much too well-known to deserve any but a passing mention. We should have a business-like session where generalities should be tabooed. The areas for survey study, investigation and research should be inensified and assigned to proper agencies and institutions. Impressions should be discounted. A well-coordinated plan of collection of relevant data should be framed and tasks parcelled out. The identification, collection and analysis of significant data, and the emerging follow-up action should be closely monitored.

The seminar should formulate an action plan and assign a period within which that plan is to be completed. This plan should, on the one hand, aim at removing statistical deficiencies and on the other at crossing the hurdles in the way of the educational, social and economic uplift.

Nuclii should be established in the North and the South for coordinating the statistical and action plans of the various relevant organisations and institutions. One of these could be located in the Aligarh Muslim University and the second in Hyderabad. Incidentally, the Aligarh Muslim University (Amendment) Act of 1981 provides specifically that the University will be concerned with the educational

adequately represented in the corridors of power. They miss the sense of participation. The excitement that the adventure of national reconstruction and development bring eludes them.

(7) Partly because of lack of education, partly because of sulking insularity, and partly because of swollen individuality, many Muslims have lost the sense of proportion. They would wrangle over petty matters, very often non-issues and ignore matters of moment. The entire perspective has got invitiated. If ever there was a tradition of social service among them, it seems to have been completely lost. No society can progress if members grudge effort for its welfare and uplift. Organised and sustained endeavour, also, is far beyond our ken.

(8) At many levels they are discriminated against. This discrimination is against the principles enshrined in the Constitution and the policy laid down by the government. It stems not so much from antipathy as from the general situation of poverty and acute unemployment and caste consciousness in the country.

I should like to reiterate here what I have said on other occasions: For a minority to survive and thrive, three conditions are essential:

(1) It should be steadfast in adherence to its religion, culture and traditions. This is not only permitted but encourged by our Constitution.

(2) It should excel the majority community by dint of hard work.

(3) It should maintain very cordial relations with the majority community, for, the goodwil of the majority community is one ef its greatest assets.

It is, therefore, imperative that the community go all-out to remove its educational backwardness. This would virtually amount to the revival of Sir Syed's great movement. Education will not only equip

(1) Apathy to education as aggravated by poverty. The former is reflected in low enrolment and the latter in high percentage of drop-outs.

(2) Resistance to change and failure to come to terms with the modern age.

(3) There is little in common between the Muslims educated in modern schools on the one hand, and those educated in Madrasas and the uneducated masses, on the other. This gulf has to be bridged and the community, which has a split personality, made whole before any movement of special and educational reform among Muslims can succeed.

(4) We seem to have lost the capacity to work together and to run institutions. Without this capacity no progress in any sphere whatsoever can be achieved.

(5) In a community where the poor and illiterate masses predominate, the small group of educated affluent and well placed persons tend to become exploiters. Thus they are deprived of dedicated and enlightened leadership and the urge to move forward.

(6) The sense of insecurity which dogs the Muslims' psyche muffles ambition, zest and hard work. This sense of insecurity is fueled by the communal riots and by the apprehension that there are threats to religion, language, traditions and culture. It also leads to the persecution complex which stands in the way of resilience and endeavour towards self-improvement. It feeds on itself and induces apathy, listlessness and despair. It can partly be traced to the hangover of the Partition. It is this persecution complex, this alienation from other communities, this retreat into one's shell that has eroded confidence and destroyed among Indian Muslims the spirit of competition. Our Constitution guarantees equality to all Indian citizens. In actual practice, however, Muslims find that they are not

ing their duties to the best of their capacity but the results achieved so far do not appear to have made any dent on the Muslim problems. The central Minorities Commission has often concerned itself with day-to-day problems which have loomed large at a given moment, with the result that the urgent has often elbowed out the important. It seems to me that the most important work which the Commission and Panel should undertake relates to collection of data and commissioning of investigations, surveys and studies. The data available so far is abysmally obscure and inadequate. The reaction of the Muslims to their situation is more often than not, based on impressions. These impressions may eventually turn out to be correct, by and large, but they cannot either be the basis for a plan of action or a foundation on which the fabric of policy relating to Muslims can be raised. If data can be collected, analysed and disseminated, two results would follow :

(1) The collective conscience of the nation would receive a jolt which can well prompt a rethinking among the other communities and government about the Muslims;

(2) It may break the smugness and apathy which plague this community.

I should like in this connection to draw attention to N. G. Saxena's paper on Public Employment and Educational Backwardness among Muslims in India. A glance at the very first table would reveal that the proportion of Muslims (who constitute 12% of India's population). in the I. A. S. and the I. P. S., declined respectively from 4.5% in 1960, to 2.9% in 1981 and 4.05% in 1960 to 2.85% in 1981. The figures given in that paper, on the basis of sample surveys and studies of items picked up at random, such as a share (a) in petrol pumps, and (b) in loans and advances are shockingly low. The paper rightly suggests that the economic backwardness of Muslims stems from their educational backwardness and cites disconcerting figures in support of the latter. Saxena has posed the agonising question why Muslims, in spite of initial advantages, are today far behind non-Muslims.

Anyone who has been concerned about the decline of Muslims cannot fail to notice that it is due primarily to the following factors:

Problems of Employment & Education of Muslims

There is a general realisation now that Indian Muslims are sliding back. The edge of the realisation was dulled for some time by the increase in the artisans' wages and inflow to some families of remittances from the Middle-Eastern countries. Facts, however, are coming to light which have made a dent, howsoever peripheral, on the apathy and complacence of the Muslims. It is being recognised that their contribution to and share in the development of their country and in its governance is declining at a fast pace.

The Aligarh Muslim University, which was the centre of the movement for modernising Indian Muslims, should concern itself with their problems—this is the assumption which, though not unjustified, remains largely unfulfilled. It can, therefore, be considered a good augury that the Aligarh Muslim University is now poised for making meaningful and purposive studies and investigations into the educational, social and economic status of the Muslims of India. It has entered into a collaboration with the Business and Employment Bureau, founded by Hakim Abdul Hameed Saheb of Delhi who is perhaps the most pragmatic and far-sighted Indian Muslim of the second-half of the 20th century. The first seminar in the series, jointly organised by the Bureau and the University, was held at New Delhi on October 9, 1982. The second seminar is being inaugurated this morning by Dr. A. R. Kidwai, Governor of Bihar. It is going to be addressed also by Mr. Justic M. H. Beg, Chairman of the Minorities Commission. The papers to be read in the seminar cover a sizable range and have been contributed by distinguished scholars from various parts of the country. Although the seminar is concerned with problems of the employment and education of Muslims, the major stress appears to be on employment, and rightly so.

The Central Government set up two High Power Organisations for studying the problems of Muslims and making suitable recommendations, namely, the Minorities Commission and the High Power Panel on Minorities. A number of State Governments have also set up their own Minorities Commissions. These Commissions have been perform-

I should conclude by saying a few words about the Anjuman-i-Taraqqi-i-Muslimin, North-East India. It has evinced sincerity, zest and competence. Its objectives are sound. The Hijra function which it organised and to which it invited people from different corners of the country has heen a success. I would, in all humility, make a few suggestions for the Anjuman's consideration :

1. The Anjuman should concentrate on social and educational work. It should not allow politics to enter its domain. Any attempt to give political overtones to the Anjuman should be scrupulously resisted ; for, the moment politics enters, quiet unified constructive work makes its exit. Politics is ephemeral, transient, evanescent; social work aimed at educational uplift; is abiding, enduring, lasting.
2. The initial success registered by the Anjuman may arouse envy, discord, disruptive effort. These should be guarded against.
3. The organisers appear to be a band of self-less workers. All precautions should be taken against vested interests infiltrating. The moment of success is fraught with dangers. Let us fortify ourselves against them.
4. The Anjuman should not strike an aggressive stance. It should aim at amity, cordiality, communal harmony. Its programme is not directed against any coummunity ; it is designed to help the Muslims in the North East of India, move forward educationally, economically, culturally. The Hijra celebrations as well as the turn of the Century is a good starting point. I would, therefore, exhort the members of the Anjuman and all those assembled here to take up with all sincerity and earnestness and without fanfare, the programme of removing the educational backwardness of Muslims in the North-East. This should be taken up on the basis of voluntary effort in all towns and villages. I have no doubt that the cumulative effect of modest and unobtrusive efforts made at myriad points will be tremendous. I appeal to you to go out and kindle the torch of learning in each village and in each hamlet. This is the torch that has been bequeathed to you by the Holy Prophet (May peace be on him).

(Speech delivered on November 8, 1981 at a function organised by Anjuman-i-Tarraqi-i- Muslimin, North East India, Gauhati, to celebrate the Advent of Fifteenth Century of Hijra).

have tasted the fruits of progress continue stepping up the momentum; for another, those who are left behind have no incentive to move forward. Poor and backward parents tend to deprive their children of the means of removing backwardness. Poverty induces them to make their children earn rather than learn. Poverty propagates poverty; ignorance aggrevates ignorance.

The situation in the North-East demands a two-pronged action; *Ulema* should din it into the ears of their followers that pursuit of knowledge is a religious obligation. If they fail to do so they would have made a culpable omission. They would have failed to convey and stress the revealed word. A ceaseless campaign for education should be organised, It should be brought home day after day that it is a sin to remain uneducated. Let us now discuss what concrete steps can be taken.

In the *madrasas* or religious schools, general education should be imparted along with education in religion and in Arabic. Similarly, for the large body of Muslim students who are in the general stream of education, an opportunity should be provided beyond school hours for acquiring religious education. Special arrangements in each village and in each locality should be made for providing part-time education in religion.

Unity in diversity is the motto of our country. It is a matter of pride for India that there is no regimentation, no drab uniformity. Within the frame-work of nationhood a variety of races, religions, castes, languages, cultures do exist, thrive and flourish. These account for the richness of our cultural heritage, for the breadth of the national mainstream. Anyone who objects to this variegated pattern, this adherence to the principle of co-existence, is short-sighted, anti-national, unpatriotic. We cannot be a party to the impoverishment of our heritage or to the narrowing down of the mainstream. Patriotism and national pride therefore demand that Muslims should take necessary steps for adherence to their religion and culture and for their development. Muslims should be in the vanguard of national progress rather than act as a drag on it. The key to this is education and persistent hard work. What is required of them is sweat not blood; endless toil not momentary effervescence. The building has to be raised brick by brick; it cannot be switched into existence. The national fabric has some other strands as well but Hindus and Muslims, the two major communities, are the warp and the woof. Separating the warp from the woof is a totally hurtfull exercise just as trying to make a fabric on warp alone would be a ridiculously futile effort.

Now, adversity can generate two kinds of reactions : first, spur one to a massive effort in order to surmount adversity: second, caving in and succumbing to gloom and despair. The question readily frames itself in a defeatist mind: why make an effort at all if the future is seemingly bleak; why not take things easy ? This is obviously a wrong question to ask. The question to ask is: if the end is ordained, what would one prefer: an ignominious or a valiant end; dying struggling or cringing.

The major cause of the social and economic backwardness of Muslims is that they are lagging behind in education. No other religion has laid as much stress on pursuit of knowledge as Islam. Ironically, it is the Muslims who are the least concerned about education. The relevant traditions of the Prophet (Peace be on him) appear not to have received the attention of *Ulema*. How can one otherwise explain the phenomenon of most of their ardent followers remaining uneducated.

Education cannot be divorced from employment prospects. This suggests that students attending religious schools should, in addition, be provided general and, where possible, vocational education. Otherwise religious education will attract mediocrity and would eventually suffer grievously on that account. These Traditions of the Prophet ought to be highlighted, stressed and implemented. Here a great responsibility rests on the religious leaders.

It is, again, ironical that a religion which has laid the utmost stress on observation, contemplation, experimentation and induction; which has emphasised dynamism, initiative, analysis; which is forward-looking, optimstic and movement-oriented, should have become the refuge of blind imitation and stagnation and despair.

The ringing out of the Fourteenth Century after Hijra provides a point in time for appraisal and stock-taking and planning. The outgoing century could not arrest the decline that set in among the Muslims four centuries ago. Over this period they relapsed from the intellectual leadership of the world to the status of camp-followers. They started reading into Islam the very antithesis of what it stands for. They reduced it to dogma, look wistfully and wastefully backwards instead of bringing it confidently and constructively forward. It is, therefore, essential that Islam is re-interpreted; that our version of Islam is purged of impurities, distortions and accretions; that is, it is freed from bondage.

There is no task more difficult than making a backward country or community catch up with the advanced ones. For one thing, those who

MUSLIMS & EDUCATION

Allow me at the very outset to express my gratitude for the invitation you were pleased to extend to me. By inviting me you have reiterated the fact that the Aligarh Muslim University continues to occupy a central place—that too not only in the hearts of Indian Muslims but also in the scheme of their educational upliftment.

As you know, ladies and gentlemen, Sir Syed Ahmad Khan holds an eminent position in the galaxy of the builders of modern India. He longed to see India emerge out of ignorance, fatalism and poverty and to take its place among the advanced nations who had benefitted by science and technology. He found that whereas Hindus were taking to modern education and moving forward, Muslims, who were sulking under the crushing blows inflicted on them by the British after the first war of independence of 1857, had slided back into their shell and shut themselves off from modern influences, Sir Syed made a firm resolve to pull them out of the shell and put them on the road to progress; for, he realised that if they remained backward, the progress of the entire country would be retarded. Therefore, an ardent nationalist to the core as Syed Ahmad was, he concentrated his efforts on the social and educational uplift of Indian Muslims. However, the M. A. O. College, which he set up and which later developed into the Aligarh Muslim University, was and has always been open to members of all communities. Jawaharlal Nehru in his *Discovery of India* has endorsed the wisdom of Sir Syed's policy. An ardent patriot, Sir Syed used to call Hindus and Muslims as two eyes of a comely damsel, that is, India.

M A.O. College was only one of the projects on which Syed Ahmad embarked. He established a Scientific Society. He founded the Muslim Educational Conference. He brought out a magazine *Tahzibul Akhlaq,* patterned on the *Tatler* and the *Spectator* of England, for effecting reforms in manners and morals. He reinterpreted religion and waged a fight against fatalism, ignorance, superstition and obscurantism. He triggered off a ferment, a stir, an awakening, a movement of reform and a modernising process. To him India in general and the Indian Muslims in particular owe a deep debt of gratitude. Alas, the momentum of the movement that he had sparked has been lost. Muslims are again sliding back. The aftermath of the partition mauled them. They again sulked; they withdrew. Conservatism has them fully in its grip.

Where are men who could be equal to this task ? Nowhere. The chasm between the temporal and the spiritual in the Muslim world is so wide that the denizens of the two hemispheres do not ever nod acquaintance. Those who are at home in religion appear to be out of place in this modern world. Is it not a tragic irony that the religion which demolished the barrier between the physical and the spiritual world, which recognised and developed the concept of an integrated being in whom the spiritual, the intellectual and the physical are evenly blended, should end up with a totally reversed and fragmented image among those who claim to profess it. Nor can we expect that persons brought up in modern education which is permeated with Euro-Christian concepts, can develop real insights into Islam. They are not equipped to carry out the revaluation and reinterpretation of Islam that the socio-economic complexities of the modern age demand.

It is, therefore, imperative that conditions are created for the emergence of a group of persons steeped in Islam and its social and cultural traditions and literature who are equally at home in the modern world with its complexities, compulsions, attitudes and aspirations. There is no established church in Islam. It is good in so far as no intermediaries are imposed between the individual and his Creator It is also good in that it prevents creation of vested interests in religion. It is not so good where meeting the challenge of the modern age and adjustment to the changed milieu are concerned. In the absence of such an institution a substitute should be devised. It should be in a position to make it worth the while of bright and diligent boys to take up religion as a career. In an age of specialisation it seems all the more necessary.

Will it be possible for Islam to save modern man from lop-sided development to temper progress with morality, to round off the fragmented man, to redeem him from living on the periphery of existence, to take him back to the core of life : resilient vibrant, steadfast ? These are questions which inevitably spring to mind. One is driven to the conclusion that Islam is relevant, cardinally relevant to the modern age but Muslims are not.

---

living force. Islam, soon after its advent, transformed its followers and transformed the world. Did Islam owe its earlier triumph to the people who first embraced it ? It is difficult to find an answer to these questions. Once a religion has descended from the commanding heights can it secure obedience through appeals and exhortations ? Can it again become the mainspring of great deeds and the source of spiritual regeneration and temporal triumphs ? The question which eludes an answer is how to spark the process of change, how to convey again to the world convincingly and dynamically the message of Islam. The last revealed religion is there, for all time to come, enshrined in the Quran and Tradition. But the people who profess the faith are lifeless, stagnant—the very antithesis of what this revolutionary religion stood for.

Islam being the consummation of revealed religion, the concluding and crowning link in the glorious chain comprehends them all. It is in that sense catholic and eclectic : "Acquire what is pure, reject what is polluted "*(khuz ma safa, da' ma kadar)*.

For a Muslim it is an article of faith to revere all the prophets. He expects and finds goodness in other religions. This catholicity, this tolerance, this comprehension and endorsement of the tenets of other faiths, enhances Islam's relevance for our time when the divisions of mankind are faced with the choice between co-existence and non-existence. It inculcates the attitude of tolerance and respect for the other man's point of view.

The process through which religion affects the conduct and attitudes of its followers is complex. It is, the efore, difficult to predict to what extent Islam will influence the lives of those who embrace it as well as those who are born to it. Its relevance will consequently depend not only on the two aspects I have had the occasion to discuss viz., (1) shared traits, and (2) principles calculated to correct the dis-tortions and aberrations of our age.

It will also depend on whether it can again acquire its pristine vigour and dynamism, power to enthuse, stimulate, and activise. Is the present generation capable of transforming itself so as to be able to carry Islam's message ? I think not. True, there is evidence of a stir, a ferment in the Muslim world. But is there any one tall enough to canalise this ferment into a mighty heave and a great forward movement? No one is in sight. For the regeneration and expansion of the Muslim world a thaw is essential in attitudes frozen for half a millennium. Islam has to be reinterpreted in the present-day context.

goodness, that power should subserve justice and affection, and to spend wealth in the way of God, i. e., in the service of humanity." (1)

Muslims never deprecated science nor persecuted scientists as Christendom did. Martin Luther reacted to the heliocentric theory of Copernicus by exclaiming "The fool will overthrow the whole art of astronomy. Joshua commanded the sun to stand still and not the earth." It is unfortunate that after rekindling the torch of knowledge the Muslims receded into darkness. Otherwise the advent of science would have found among them its greatest champions.

Islam strikes a balance between the requirements of body and soul, the demands of this world and the Hereafter for which this world is the preparation. According to the Quran life is an unending creative evolution. Every generation, therefore, has the right to resolve its problems according to its lights consistently with the basic tenets of religion. Religion, according to Islam is a perennial spiritual movement. One of Islam's most sign'ficant contributions is the integration of the physical and the spiritual world.

Apropos to the so-called barbarous penalties an assessment is yet to be made whether the reformatory softness is all that good; whether it is vindicated by results, whether in the larger interests of society the element of deterrence in penalties is to be reinforced or eliminated.

The modern age is a critical period. Advances in technology and phenomenal development of mass media of communication have revolutionised society and transformed values, attitudes, and motivations. The Catholic church has been sriving to mitigate the traditional opposition to the world and evolve a philosophy of socio-economic development. This is reflected in the Encyclical letters captioned" The progress of People and Peace on Earth."

Curiously, Muslims have made no effort at re-orientation and adjustment. Far from bringing about revolutionary changes, they have failed to keep pace with them, They have cut themselves off from the main-stream of human progress, A people whose vision and mobility knew no barriers, in a sad reversal of attitude and ideology, withdrew into a narrow shell. Islam continued to influence other people but ceased to influence its own followers.

Here the question arises as to how a religion can continue to be a

1. Syed Abid Husain.

It is generally realised that during the last four centuries the followers of Islam have travelled far from the spirit of their religion. They are flawed mirrors that reflect a grotesque image of Islam, a religion that was unique in respecting and recognising other faiths - 'All creatures belong to God's family *(al-khalq Ayalul-ah)*. Sufficient unto you is your faith, to me mine *(Lakum Dinokum wa liya Din)*. There is no coercion in religion (*la ikraha fi 'd-Din)*.

It is a travesty of facts that fanaticism and intolerance are being ascribed to it. Even the well-meaning critics of Islam tend to commit one mistake ; They confuse Muslims with Islam and, from the former's degenerate state, derive inferences derogatory to the latter. But for the label, there is nothing Islamic about the vast majority of present-day Mu slims. They have reduced their concept of religion to dogma and ritual.

A perusal of the Quran reveals that its appeal is primarily addressed to reason. Accept the axioms; thereafter the entire trend of the Book is ratiocinative. What is sought to be proved is argued out. Illustrations from history and nature are drawn upon to drive home a point. The burden often reads like: 'Will you not contemplate', 'will you not give thought', 'will you not ponder'. Questions are frequently asked in order to set in motion the process of thinking. The reader feels all the time that he is being addressed and forgets that it is the people of another age, another clime. The appeal invariably is to reason "Say Call upon other (gods) whom you fancy besides God. They have no power, not the weight of an atom in the heavens or on earth". (*Qul ud'-ul-lazzin-a-za'amtum min dun-i-llah, la yamlikuna misqala zarratin fi's-smawat wa la fi'l-Arz*).

The next step from appeal to reason is the quest of knowledge. It is because of these injunctions that Muslims kindled the torch of learning and released forces which eventually rang out the Dark Ages and ushered in the Modern age. One of the traditions of the Holy Prophet is to the effect that an hour's contemplation is better than sixty years spent on worship.

"The Quran does not consider the world of sense-experience either as illusory or evil : it is true and real' [1] the first link in the chain of life which culminates in the hereafter : 'Our Preserver, thou hast not created this world in vain *(Rabbana ma khalaqta haz batilan)*.

"Man has been directed to acquire knowledge, power and wealth but with the stipulation that knowledge should subserve truth and

1. Alam Khundmiri

3. it threatens the fabric of the economic system by disallowing interest ;
4. it is rigid, conservative and imitative; not flexible, progressive and innovative;
5. it encourages dogma, ritual, fanaticism and intolerance;
6. it is anchored on tradition and neglects reason;
7. it segregates the sexes and takes away the charm of social intercourse. In the process it denies one half of the human race the opportu-nity to grow, lead a full life and contribute to human progress;
8. it prescribes barbarous punishments.

Some of the objections are too trivial to attract attention. If the modern man finds it difficult to bring to bear devotion and obedience on his relationship with religion the loss is his : Regarding paucity of time and energy for religious observances, are we sure that optimum use of time is being otherwise made? If the observance is on the mechanical and superficial plane waste of time is involved. If it is on a plane of sincerity and comprehension, if it leads or points towards communion, then it edifies, ennobles and strengthens; then every moment spent in religious observances is worth it—even in the sense of temporal well being. As regards the ban on interest it seems inconvenient only because the modern civilization has reversed the relationship between man and money. The latter has become the master and the former its slave. Interest is the device for getting unearned money and for concentration of wealth in the hands of the few and deprivation of the many. Investment, where expectation of profit is not offset by fear of loss and where money attracts money without effort, cannot be justified particularly when a large section of the people toil hard and do not get a square meal. Doubts have been expressed whether monetised economy can survive without interest. It has been argued on the other side that it can, and experimens are afoot in support. Their outcome is awaited. In the interest-oriented economy which grips the world, the success of such an experiment, restricted to a few countries, becomes problematic. But that does not take away from the inherent invidiousness of the interest-based economic system. It is generally recognised that Banks' allocative policies are not guided by the society's needs for productive enterprises and its priorities in their regard. Wnat is desirable, but seems unattainable is a switch-over from interest to profit-sharing.

dignity of man and insists on his answerability within the confines of compulsions and limitations. *"Man-ya'mal misqala zarratin khairan-yarah; wa man ya'mal misqala zarratin sharran-yarah"*

All Man's deed, the smallest particle of good and of evil, will be accounted for on the Day of Judgment.

For the cynicism, scepticism, disbelief and mistrust rampant in our time there could be no surer remedy than the certitude and contentment that Islam brings. Nothing can be achieved without conviction. Doubt breeds diffidence, it blurs the perspective, it paralyses the will. It leads to inaction and retards the pace. Conviction generates confidence; It breeds the urge to demolish hurdles and move forward. Conviction culminates in conquests.

Never before in history has man as an individual become so insignificant. Ironically, at the very moment when man acquired tremendous powers due to the advances made by science and technology, his status as a man touched its lowest depth. Sandwiched between a ruthless and unsympathetic society and an all powerful and indifferent State, the individual has lost personality, security, self-respect. In fact it was Islam that established unequivocally and proclaimed categorically the dignity of man and freed his mind from superstitious fear and from reliance on intermediaries. It made man keep his head erect. It made him aspire and realise his aspirations. It gave him at once the humility and pride of being in direct contact with his Creator and the consciousness of being his vicegerent on earth. At a time when man has become dessicated, disjointed and fragmented, Islam promises a full-blooded life, a well-rounded personality and an unified, integrated, well-adjusted existance falling in pace in the scheme of the universe. This religion which follows the golden mean; which treats human personality as indivisible, which abolishes duality between the physical and the spiritual, which protects the joy of living from the idea of sin, which enjoins restraint and moderation, does provide the remedy for the pervading disease of split personality which afflicts our age.

The last revealed religion has been criticised on a number of scores:

1. it expects a degree of devotion and obedience which the modern man finds difficult to offer;
2. it demands spending of considerable time and energy in the discharge of religious observances like *Salat* and *Saum* (prayers and fasting);

nationalities hostile to eech other, deserve to be demolished. Islam accepts patriotism but rejects chauvinism.

True, Muslim countries have fought and at this moment are fighting among themselves. But this is inspite of Islam. When Pakistan was carved out in 1947 its Prime Minister, Mr. Liaqat Ali Khan, had proclaimed "Pakistan for us is a laboratory and we will show to the world how good and effective the 1300 years old teachings of Islam still are." Mercifully, the assassin's bullet prevented him from witnessing how events belied his hope and pledge. As far as living up to Islamic teachings is concerned, Pakistan fared no better than many other Muslim countries in our time. The defect is not in the teachings but in the weak-need and half-hearted adherence to them.

"Meritocracy" would not be an appropriate word in the present context: but the recognition of merit and the rejection of all other considerations is one of Islam's abiding and most significant contributions to social justice. Islam stoutly and explicitly refuses to be swayed by considerations of caste, colour, country, race, social status It recognizes merit, piety, rectitude.

The consciousness of God's presence, and the belief that on the Day of Judgment everyone will have to render account of his action in this life, invariably exercises a restraining and chastening influence This consciousness, this sense of answerability, this feeling of being face to face with the Creator, has been unusually intense and vivid among the followers of Islam. It has prevented genuine Muslims straying from the path of good conduct One of the greatest miracle attributed to religion is the intimate relationship, the constant presence, the perennial consciousness which Muslims secured in respect of an invisible, abstract, formless God. He became for the Believers a greater reality than the physical world, a dearer Being than the dearest kith and kin. They held Him in great awe and yet loved him as they loved no one else. His love inspired and motivated them His fear restrained them, regulated their actions, and prevented the straying from the straight path. Being face to face with God became the greatest reward, the profoundest bliss to which they could aspire The consciousness of His immediate presence became the unfailing deterrant from evil doing.

Islam discourages monasticism. It refuses to consider the world as an illusion. It holds man responsible for his deeds and deprives him of alibis. There is no faith which in an equal degree safeguards th

sanctions, the fear of retribution, the consciousness of inexorable answerability. Another corrosive evil which is becoming as fashionable in our age as drinking is gambling. It has assumed a myriad attractive and insidious forms. In Islam it is totally tabooed.

Modern age thus needs Islam also because of its disciplinary bias, its corrective and remedial qualities, i. e., its uncompromising ban on drinking, gambling and permissive sex. These three account for most of the crime that afflict humanity—directly or indirectly.

Yet another evil that plagues our society is the uneven distribution of income and the concentration of economic power in a few hands resulting in exploitation of the poor. This is brought about, *inter alia* by interest on which the modern economic system is based. Islam tabooes interest and deprecates and discourages accumulation of wealth

People wielding political power, bureaucrats and business executives, often exploit their position for personal gain. The line between public and private expenditure often gets blurred. True followers of Islam have set the highest standards of integrity and probity which could very well serve as eternal models for they bowed to God and none else, and believed in His ubiquitious and omniscient presence. A believer can never lose sight of the discrimination between *Halal* (the permitted) and *Haram* (the forbidden). There are instances of several Muslim rulers refusing to draw upon the treasury for their personal needs. They eked out a living by transcribing the Quran or by stitching caps.

Strident nationalism has been responsible for the world wars in the first half of this century. These resulted in colossal devastation. God's land has been parcelled out into warring territorial units and blocks. It has, moreover, led to stock-piling of arms and the diversion of means of production to destructive purposes. In the less developed countries defence-spending has crippled development plans and retarded the progress of projects designed to reduce poverty and alleviate the plight of the vast majority of the people. The world is alternating between hot war and cold war. The latter breeds tension and apprehension, and leads to frayed tempers and to risks round the corner.

Islam strikes at the root of blind nationalism. B otherhood of man is its motto. It considers humanity as indivisible. 'The people are the family of God." Who among the mortals dare divide God's family ? The political barriers splitting up mankind into so many

the Renaissance, in the fourteenth and fifteenth centuries which later culminated in the scientific and technological revolution.

Let us now identify the traits that Islam shares with the modern age, or to put the chronological record straight, which the modern age owes to Islam. One may first mention the concepts of liberty, equality and fraternity; the dignity of man, the stress on acquisition of knowledge, the refusal to believe that the worldly existence is unreal and illusory; the insistence on partaking of the legitimate joys of life, the emphasis on reason and moderation; the urge to move forward, to bring about *change* which according to the Quran is the greatest of all the signs of God. Movement, adventure, dynamism, rationality and mobility at once characterise Islam and the modern age.

But shared characteristics, while establishing affinity and relevance, would not have a *remedial* thrust. A society that is visibly ill, cries for remedial action. Here the great Islamic taboos, the incomparable devices of self-discipline, swing into operative relevance. Mankind is groaning under the evils of a permissive society. Intemperate and illegitimate sex is eroding the basis of civilized existence. Civilization, having turned full circle, is telescoped into bestiality. Woman has been pulled down from the pedestal of dignified distance, stripped and scorned. Widespread promiscuity is taking a heavy toll of values and jeopardising security, purity, sanctity. The most important social unit, the bulwork of ethics and morality, viz., the family, is in disarray. In societies that are not permissive instances are occurring of women being gang-raped. Islam elevated the status of women, for respect for women is the key to civilized behaviour. It kept the sexes at a civilized distance from each other. Its injunctions gave to society the hallmark of a compact well-knit family unit. Violations of chastity were heavily penalised.

Intoxicating drinks are similarly prohibited. Liquor is rated as the mother of evils. It has ruined countless families. It has been the scourage of mankind down the ages. In our times, addiction to liquor has assumed menacing proportions. Intoxication goes against the principle of restraint and discipline so cardinal to Islam. Islam alone, among religions, totally prohibits this source of physical and moral ruination. Bans imposed by the legislature and implemented by the executive have invariably failed. What can be effective is moral

ISLAM'S RELEVANCE TO MODERN AGE

Religion is facing a crisis of relevance. Is religion outmoded, has it lost its validity for modern man ? these are questions which everyone who can think puts to himself. The answer one gives or gets is very often in the affirmative. The answer is incorrect. It is based on a superficial knowledge and a misconceived notion of religion. It flows from an exaggerated stress on the material advantages accruing from scientific and technological achievements. Overawed by these achievements and inured to material comforts, we tend to forget how miserable and empty a life divorced from religion is apt to become. The consuming greed, the uninhibited passion, the ennui, the frustration, the discontent, the envy, the restlessness, the morbidity, the desperation and defiance that envelope our existence are there because the protective shield of religious feeling has worn away. Mankind is moving towards its own destruction. The inglorious end may come not necessarily from nuclear war, as most of us fear. but from slow self poisoning, from erosion of morality and from the blind disruption of ecology summarised as ecocide. In either case it is the progress of science and technology, and the unrestrained sway over Nature which it has brought in its wake, that may terminate life on earth just as it has determined happiness. Says Barbara Ward: "We have become involved in a new movement of seismic change in the topography of the human race. All of us are moving forward to the modern society based on science and technology. And this change is even greater and far more sudden a break with the past than the shift from nomadic life to the settled life of agriculture millenniums ago".

Of the great world religions Islam is the youngest. Its origin and development are not shrouded in mystery. Its advent took place in the glare of midday sun. It is there for every one to see; it is there for no one to distort. Its sources are there unsullied and unconcealed. Islam's relevance to the modern world rests not only on its chronological proximity It also ushered the modern age. The quest for truth and the passion for knowledge, the need for observation and experimentation, the habit of contemplation and the process of induction which it encouraged, put its earliest followers, the Arabs in the vanguard of learning and progress. It is they who sparked the rebirth of learning,

MR. SAIYID HAMID b. March 28, 1920, Muradabad (U.P.), B. A. 1939, M. A. (English Literature), 1947, Aligarh Muslim University. Selected for the State Civil Service 1943 and the Indian Administrative Service, 1950. Held a number of important posts in the Districts, the State Secretariat, the Central Government and Planning Commission. Was Joint Secretary, Industries and Commerce at the Centre. As Joint Secretary, (Co-ordination), formulated the National Fourth Five Year Plan. Attended a number of international conferences. Negotiated trade agreements with some of India's Trading Partners. Organised and headed the Staff Selection Commission. Delivered lectures in a number of Universities on literary topics and on man power planning. Was Secretary, Delhi Higher Education Society, which manages Anglo-Arabic and Shafiq Memorial Secondary Schools. Founded the Crescent Education Society, Delhi, and under its aegis established the Crescent School in Daryagunj on the lines of a public school with religious teaching and Urdu being compulsory. Contributed a number of critical articles to literary magazines. Is an Urdu poet. Took over as Vice-chancellor of Aligarh Muslim University in 1980. Represented India at the UNESCO Conference on Education held in Belgrade in October, 1980. Attended a course on Development planning at the University of Sussex in 1959. Is on the Jury or Nehru Award for International Understanding.

Revived the *Tahzibul Akhlaq* in February, 1982. This fortnightly Urdu journal is pursuing the goals set for it by Sir Syed Ahmed Khan, Represented India at the 1000th Anniversary of Jam'i-i-Azhar, Cairo. Delivered lectures in U. K. and the United States (1982), Completed his term of Vice-Chancellorship of Muslim University on March 26, 1985.

SAIYID HAMID

movement for bringing about an all-out social, economic, religious, educational and cultural revolution in the community: with a view that if a part of the nation lags behind, it would adversely affect the whole and retard the progress of the entire nation.

In the 19th century, Sir Syed, initiated the *movement*. In the 20th, Azad and Iqbal inspired the thinking and, combinedly, produced Zakir Husain who led the *movement* in post-independence period. Syed Hamid, who headed the institution for five years, revived the *movement* with the same devotion Zakir Husain had invested in his own days. His successor, Syed Hashim Ali, now carries the cross.

The series of documents on contemporary Islam, taking up Indian Islam first, starts with the most recent past; and, the latest phase of the Aligarh Movement is being represented through a bunch of writings, mostly selected from its mouthpiece, *Tahzibul Akhlaq*, and occasionally from other sources. Syed Hamid, being the most vocal idealogue of the period, naturally gets the lion's share.

The volume opens, by way of Inaugural, with a beautiful speech by Gyani Zail Singh, President of India. It proceeds with a few relevant extracts from Sir Syed, and from Abul Kalam Azad, which appeared in the Aligarh publications during the last 5/6 years : symbolically signifying the extent of identification, Aligarh has got today, with its Founder, ard with one of its *critics*. It follows a selection from the writings of Muizuddin Ahmad, who edited the new series of *Tahzeebul Akhlaq*, and other old boys for whom Aligarh is still a live inspirational-force. Tyabji, a former Vice-Chancellor, and Hashim Ali, the present VC are also included in the volume: the former passionately 'converted' to, and won over by, the movement, during his two-years historic sojourn; and, the later now leading the movement.

It is hoped that this volume will go a long way in understanding the currents and cross-currents in contemporary Islam.

— Editor

Foreword

Man has become a mere political animal today. It may, therefore, be surprising to many to see a collection of ideas, by and large socio-cultural, going in the name of *Documents*.

The Arab world, the Turkish and the Persian-speaking West and Central Asia, and the Malay-Indonesian South East Asia are thoroughly documented, so far as their politics is concerned. On non-political plane, however, little is done to understand the mind of contemporary Islam.

And, of all the Islamic regions, the history of the ideas of contemporary *South Asia* is the least known to the world of scholarship, While Arabic, Indonesian, Turkish and Persian languages are widely known even outside their homes, the case of the region using Urdu as its medium of communicating its ideas remains, to a large extent, unrepresented.

In South Asia. Indian Islam, from various points of view, is the most powerful and dynamic current in contemporary Islam. It was therefore thought desireable that the series should give preference to the Indian scene and deal with other regions subsequently.

In Indian Islam, the main custodians of ideas may be categorised into the Ulama (Madrasa-educated, bearded, intellectuals) and the Fuzala (University-educated intellectuals), Aligarh partly representing the latter. Somehow or the other, Aligarh still occupies the central place in the scheme of the priorities of the Muslim community in India. The first of the series is therefore being devoted to Aligarh.

Aligarh-the-Institution, was born in 1875/77 as a result of *Aligarh-the-movement* which, in post-1857 India, aimed at enabling the Muslim community to regain its lost confidence. It found itself involved in the same process once again in post-1947 India. (History seldom repeats. But it seems to have repeated itself in case of Indian Muslims). Aligarh movement was a multi-dimensional

CONTENTS

Printers : Liberty Art Press, New Delhi and Patna Litho Press, Patna
Publisher : Mahboob Husain for Khuda Bakhsh Library, Patna.
Editor : Dr. A. R. Bedar
Annual subscription : Rs. 60.00 (Inland), 12-00 Dollars (Asian Cou
24 Dollars (other countries) Rs 45-00 per copy

KHUDA BAKHSH LIBRARY

JOURNAL

37-38-39

Khuda Bakhsh Oriental Public Library

Patna